جاتی ہے۔ بلکہ بدبختی کی یہ انتہا ہے کہ وہ خود اپنے ملک اور خود اپنے گھر میں بھی ذلیل سمجھی جاتی ہے۔

محکومیت و غلامی ایک ایسی بے درماں زبوں حالی، اور ایک ایسی شدید لعنت ہے کہ دُودمانِ شیطانی کے سب سے بڑے شریر و شقی رُکن تک کو اُس پر ترس آتا ہوگا۔

محکومی کا جسم لاغر، رُوح مُردہ، چہرہ زرد، پیشانی پُرشکن، سینہ تنگ، دل سرد، ولولے پا بزنجیر، اور ذہنیت پست و ملدر ہوتی ہے۔

کسی قوم کے اندر یہ سینوں کو بھینچ دینے والا احساس کہ میں محکوم ہوں ایک ایسا آہستہ رو قاتل زہر ہوتا ہے جس کے اثر سے اُس کے ولولے ایڑیاں رگڑتے اور اُس کی اُمنگیں دم توڑتی رہتی ہیں۔

محکومی کی ہر منزل، منزلِ اول، اور محکومی کا ہر نفس، نفسِ آخر ہوا کرتا۔ محکوم کا حضر اور سفر، دونوں مساوی طور سے ناقابلِ برداشت ہوتے ہیں۔ حضر کی حالت میں، فاتح قوم کی حکومت اُس کی عزت کو ابھرنے کا موقع نہیں دیتی۔ اور سفر میں دوسری آزاد قومیں "تو کار زمیں را نکو ساختی؟" کے تحت اُس کی پرچھائیں کی بھی روادار نہیں ہوتیں۔

جب اثنائے سیاحت میں پیچھے پیچھے داغِ آگے آگے رسوائی ہوئی۔

سکہ عرف میں ڈوبے ہوئے غلام فرد سے اُس کے ملک کا نام پوچھا جاتا ہے، اُس وقت اُس پر ایک ایسی نا گہانی سے متاثر ہونے کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جس کا تجربہ صرف اُس لمحہ میں کیا جا سکتا ہے۔ جب رات رات بھر زدو کوب کا سلسلہ جاری رکھنے والی پولیس کے بے امان تشدد سے تنگ آ کر کوئی شخص کسی بدترین جرم کے ارتکاب کا اقرار کرنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے —— اور جب آزاد قوموں کے کانوں میں اس غلام کے وطنِ حقیر کا نام پڑتا ہے تو اُن کی آنکھوں میں بے ساختہ لازم آمدہ نفرت و احتراز کے ڈورے اُبھر آتے ہیں —— اور اگر کوئی ڈیسینٹ قسم کا غلام (جس کی متعدد نظیریں موجود ہیں) آزاد قوم کو کوئی مشورہ دینا چاہتا ہے تو وہ "تو بہ خویشتن چہ کردی" کے تحت سننے سے قطعی انکار کر دیتی ہے۔

ہم ہندوستانی محکوم و مغلوب ہیں، اور چونکہ قوانینِ قدرت کسی کو مستثنیٰ نہیں کیا کرتے، اس لئے ہم بھی اُن تمام بے عزتیوں میں مبتلا ہیں جن سے ایک محکوم قوم دوچار رہتی ہے۔

بیرونِ ہند اب تک ہماری جو جو بے عزتیاں اور رسوائیاں ہو چکی ہیں، اور خود اندرونِ ہند اس مئی ۱۹۳۸ء سے بیشتر تک جن ذلتوں میں ہم مبتلا کئے جا چکے ہیں۔ ان تمام بیرونِ در، اور اندرونِ خانہ بے عزتیوں کو میں اس وقت دُہرانا نہیں چاہتا۔

البتہ اس بیسوی صدی کی مئی ۱۹۳۸ء کے ایک شرمناک اور اہانت آمیز واقعہ سے آپ کو مطلع کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

ہر چند ہمارے پابزنجیر بر اعظم میں یہ اہانت آمیز واقعات ایسے ہی ہوا کرتے ہیں، کہ ذیل میں ہزاروں بارش آ چکے ہیں، اور جس واقعہ کو میں ابھی بیان کرنا چاہتا ہوں، اپنی نوعیت کی سنگینی میں کچھ ایسا عجیب واقعہ بھی نہیں ہے جس کی اس سرزمین پر کوئی نظیر نہ مل سکتی ہو۔

لیکن اب، جب کہ "اپریل فول" والی یکم اپریل کو وفاق کے ایک حصے کا ہندوستان میں بڑے طمطراق سے اعلان کیا جا چکا ہے اور ہم سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تم عنقریب اپنے ملک کی زمامِ اختیار اپنے ہاتھ میں لے لینے والے ہو، عین اس دورِ مسعود، اور اس عہدِ مبارک میں کسی معمولی سے واقعہ کا بھی پیش آ جانا جس سے ہندوستانی قوم کی ذلت ہوتی ہو۔ انتہائی خونت، نفرت، غیظ اور مایوسی کے ساتھ محسوس کئے جانے کے قابل ہے۔

اب وہ واقعہ سنیئے۔

ہندوستان ٹائمز (۱۴ مئی ۱۹۳۸ء) وقائع نگار جبل پور اطلاع دیتا ہے کہ اسٹیشن مذکور پر دو یورپین مسافروں نے جو بمبئی میل سے سفر کر رہے تھے، ایک ہندوستانی، آئی سی ایس، آفیسر مسٹر دوی کا تھ، سب ڈویژنل آفیسر نرسنگ پور کو فرسٹ کلاس میں داخل ہونے سے جبراً روک دیا۔ نہ صرف روک دیا، بلکہ ان دونوں یورپینوں نے (جو یورپ کے باشرکت غیرے مالک تھے) مسٹر کامتھ کی شریفانہ اور جائز درخواست پر اُن کے ساتھ نہایت اہانت آمیز برتاؤ بھی کیا —— اور اسٹیشن کے خداوندانِ نظم و نسق سے جب امداد کی درخواست کی گئی تو وہ سب کے سب، کامل اقتدار کے باوجود مسٹر کامتھ کی دستگیری کے معاملے میں "قطعی بے دست و پا" ثابت ہوئے۔

غور فرمائیے یہ ہے ہماری عزت اور یہ ہے خود ہمارے گھر کے اندر ہمارا احترام۔

ریلیں ہمارے ہی روپے سے چلتی ہیں۔ ریل کی پٹریاں ہمارے ہی مزدور بچھاتے ہیں، اور ہماری ہی زمین پر بچھاتے ہیں۔ اسٹیشن بھی ہمارے ہی خون سے تعمیر کئے گئے ہیں، اور ریلوے کے اعلیٰ و ادنیٰ ملازم بھی ہماری ہی جیب سے تنخواہیں پاتے ہیں۔ لیکن جب ہم اُس ریل میں، مفت نہیں، ٹکٹ کے پورے دام دے کر سفر کرنا چاہتے ہیں تو غیر ملک کے دو مردک ہمیں درجے میں داخل نہیں ہونے دیتے، صرف یہی نہیں بلکہ ہمیں ہزاروں آدمیوں کی موجودگی میں، خود ہمارے بھائیوں کے ایک گروہِ عظیم کے سامنے ذلیل بھی کرتے ہیں، اور ایسے الفاظ زبان سے نکالتے ہیں جس سے نہ صرف ہماری ذاتی عزت و خودداری مجروح ہوتی ہے، بلکہ ہمارا تمام ملک ذلت میں غرق ہو جاتا ہے، اور جب اسٹیشن کے اربابِ بست و کشاد سے داد رسی کی جاتی ہے تو وہ ہماری امداد میں قطعی بے دست و پا ثابت ہوتے ہیں۔

چیست یارانِ طریقت! بعد ازیں تدبیر ما؟

میں جبل پور کے اسٹیشن ماسٹر صاحب اور دیگر عالی مرتبت ریلوے عمال سے دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اگر معاملہ اس کے برعکس ہوتا، یعنی کسی وسیع درجے میں صرف دو ہندوستانی ہوتے، اور وہ فرسٹ کلاس کے نہیں بلکہ تھرڈ کلاس کے انگریز مسافر کو اپنے درجے میں آنے سے جبراً روک دیتے، اور اس پر اکتفا نہ کرتے ہوئے وہ اُس کی اہانت بھی کرتے، اور وہ انگریز ان حضرات کی بارگاہ میں جا کر فریاد کرتا تو اُس موقعے پر ان کا طرزِ عمل کیا ہوتا؟

کیا وہ انگریز بہادر کی دستگیری کے معاملے میں بھی ایسے ہی قطعی بے دست و پا ثابت ہوتے؟ یا پھر یہ ہوتا کہ پولیس کے مشہورِ خلائق اور ہر دل عزیز ڈنڈے کی مدد سے وہ انگریز تو بصد احترام درجے میں بٹھا دیا جاتا، اور ان دونوں "غیر مہذب" و "قانون شکن" ہندوستانیوں کو اسی اسٹیشن پر بے عزتی کے ساتھ اُتار کر حوالات میں بند کر دیا جاتا؟

اگر امریکہ، جرمنی، یا فرانس وغیرہ میں اس قسم کا کوئی واقعہ کسی انگریز کو پیش آ جاتا تو برطانیہ کے سفارت خانے سے لے کر پارلیمنٹ کے ایوان تک میں زلزلہ آ جاتا، اور ملکۂ بر و بحر حکومتِ برطانیہ زخمی شیرنی کی طرح چنگھاڑنے لگتی، اور جب تک اس کی تلافی نہ کر دی جاتی انگریزی حکومت اور انگریزی قوم پر خواب و خور حرام رہتا ——— اور اگر یہ کہا جاتا کہ اس کی تلافی نہیں کی جا سکتی ہے تو انگریزی بری فوج خشکی پر، اور بحری بیڑے سمندر میں خوفناک صورت سے حرکت کرتے نظر آتے۔

لیکن یہ تمام خامہ فرسائی، اور یہ تمام رونا دھونا بیکار ہے۔ قدرت کے احکام کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ قدرت کا حکم ہے قوی رہو، ورنہ پیس ڈالے جاؤ گے۔ آزاد رہو، ورنہ ہر سانس میں موت کا مزا چکھو گے۔

لیکن بدقسمتی سے ہم کمزور بھی ہیں اور محکوم بھی۔ خطا ہماری ہی ہے، ساری خطا ہماری ہے۔ قاتل کو میں بُرا نہیں کہتا، کیونکہ یہ خود مقتول ہے۔ جو قاتل کو اُس کا سر اُڑا دینے کا لائسنس دیا کرتا ہے۔

اس دنیا میں ظالم ہونا کوئی عیب ہو کہ نہ ہو، لیکن مظلوم ہونا مسلّم طور سے عیب اور سب سے بڑا عیب ہے۔

ہاں ہم محکوم ہیں، اور برضا و رغبت محکوم ہیں۔ اور یہ محکومی ہمیں اس قدر عزیز ہے کہ اُس کے ناپاک شعلوں کو ہم اپنی باہمی آویزشوں کے دامن سے برابر ہوائیں دیتے چلے جاتے ہیں۔ اور اس ہوا دینے کے شغل سے کبھی نہیں تھکتے۔

یہ ہمارے شعلہ ہائے محکومی کو ہوائیں دینے والے "پوتر" ہندو، اور "مقدّس" مسلمان کتنے عجیب انسان ہیں۔

ہندوستان وہ زبوں قسمت برِ اعظم ہے جس کی عظیم پہنائی کے اندر سب کچھ موجود ہے۔ مگر ایک "ہندوستانی" نہیں پایا جاتا۔ یہاں تو بستے ہیں گائے، باجے، مسجد، مندر، گردوارے، مدحِ صحابہ اور تبرّے کی سی چیزوں پر کٹ مرنے والے ہندو، مسلمان، سناتن دھرمی، آریہ سماجی، جینی، سکھ، وہابی، حنفی، سُنّی اور شیعہ ——— جن میں ایک بھی "ہندوستانی" نہیں ہے۔

کیا ان مذاہب گزیدہ اور ادیان خوردہ ہندو مسلمانوں کی کھوپڑیاں اتنی چھوٹی ہیں کہ اُنھیں صرف ناخن ہی سے اُٹھایا جا سکتا ہے؟ کیا ان اللہ کے نیک بندوں کی عقلیں اتنی دُبلی ہیں کہ خوردبین کے بغیر اُنھیں دیکھا ہی نہیں جا سکتا؟ اور کیا اس مقدّس روحانی گروہ کی ذہنیت، اس درجہ لاغر و موہوم ہے کہ ہمارے بسترِ مرگ پر پڑے ہوئے غزل گو شعراء کی طرح ایک ایسا غیر مرئی تارِ بستر بن کر رہ گئی ہے کہ اجل سرہانے آتی ہے اور اپنے شکار کو موجود نہ پا کر ناکام واپس چلی جاتی ہے؟

میں پُوچھتا ہوں، اے خدا کے نیک بندو! اگر تم اس قدر مُردہ المزاج اور غیرت مند واقع ہوئے ہو کہ گائے، باجے، مدحِ صحابہ اور تبرّے کی سی باتوں پر جامے سے باہر ہو جاتے ہو تو خدارا بتاؤ کہ جس وقت تمہارے ملک کی اہانت کی جاتی ہے، تمہارے آباؤ اجداد کو گالیاں دی جاتی ہیں اور براہِ راست خود تمہاری ناک پر بھی حملہ کیا جاتا ہے، اُس وقت تمہاری گرم مزاجی اور تمہاری غیرت مندی کس چوہے کے بِل میں جا کر روپوش ہو جاتی ہے؟ اور اُس وقت سراپا برق و آتش بن جانے کے عوض تم برف کی قاش سے بھی زیادہ ٹھنڈے کیوں ہو جاتے ہو؟

میں حیران ہوں کہ جس موقعے پر تمہیں بجلی بن جانا چاہیے اُس موقعے پر تم یخ پارہ بن جاتے ہو، اور ایسا یخ پارہ کہ اگر اُسے کرۂ زمہریر کے آغوش میں رکھ دیا جائے تو سردی کی شدت سے تمام کرّے کو جُوڑی آجائے۔

ببیں تفاوتِ رہ، از کجاست تا بکجا!!

کیا تم مجھے اپنے متعلق یہ رائے قائم کرنے کی اجازت نہ دو گے کہ تمہارا گائے اور تبرے پر کٹ مرنا، غیرت مندی اور بہادری پر نہیں، بلکہ اُس مخصوص شرارت پر مبنی ہے جو ہر غلام قوم کی فطرت میں اُبھری ہوئی معلوم ہوتی ہے، اور تمہارا اپنے ملک کی اہانت کے موقعے پر خاموش رہنا، رواداری و شرافت پر نہیں بلکہ اُس مخصوص بے حیائی و بزدلی پر مبنی ہے جو ہر محکوم قوم کی سیرت میں سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہے؟

ہماری صحافت

آخر ہماری صحافت، سمجھ میں نہیں آتا، اس قدر شریر و فتنہ پرور کیوں واقع ہوئی ہے۔

ہماری صحافت کو دُنیا بھر کے تمام نام، توڑ دیئے جا سکتے ہیں، لیکن اُن تمام ناموں میں سے جو نام اُسے کبھی نہیں دیا جا سکتا۔ وہ بدقسمتی سے صحافت اور صرف صحافت ہے۔

صحافت، نام ہے قوموں کو صحیح راستے پر چلانے کا ——— صحافت کا کام ہے اقوام کے عروج و زوال کے خفیہ اسباب کی پیمائش، اور ابنائے زمانہ کے رجحانات کی جانچ پڑتال، نیز ضروریات و مقتضیاتِ وقت کا گہرا مطالعہ ——— صحافت کا فرض ہے کہ وہ افراط و تفریط سے دامن کشاں رہتے ہوئے صراطِ مستقیم پر قائم رہے اور دوسروں کو بھی قائم رکھے وہ ایک اعلیٰ نباض کی طرح قوم کے امراض کی تشخیص کرے، اور ایک حاذق طبیب کی صورت ایسا نسخہ استعمال کرائے کہ ازالۂ مرض ہو جائے۔

لیکن ہماری صحافت ایسا نہیں کرتی، کیونکہ ایسا کر نہیں سکتی جس کے متعدد وجوہ ہیں۔

(۱) ناقص اور غلط تعلیم، گمراہ کن تربیت، اور علمِ صحافت سے عدمِ واقفیت ہمارے ایڈیٹروں کو اندھا بنائے ہوئے ہے۔

(۲) اس کوچے میں وہی قدم رکھتے ہیں جن کی ناکارہ ہونے کی وجہ سے کہیں پرسش نہیں ہوتی، اور مفلس و نا اہل ہونے کے باعث کوئی دوسرا پیشہ بھی نہیں کر سکتے۔

(۳) صحافت کو روٹی کی خاطر اختیار کرنے سے بے اصولی پیدا ہوتی ہے جو ایڈیٹر کی افادیت کو معدوم کر دیتی ہے۔

(۴) اکثر اخبارات، سرمایہ داروں، خوشامدیوں، جاہ پرستوں، اور غداروں کے روپے یا دوسرے خفیہ سرمایوں سے چلتے ہیں۔ جن کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ ملک میں فساد و فتنہ برپا کر کے حق کو کمزور، باطل کو قوی اور اپنے کو زردار بناتے رہیں۔

(۵) پریس ایکٹ، زبانی زجر و توبیخ، اور ضمانت طلبی، ہماری صحافت کا گلا گھونٹے رہتی ہے، اور ان حالات میں جادۂ صحیح پر گامزن رہنا صرف جواں مردوں کا کام ہے، جو اس محکوم قوم میں تقریباً معدوم ہیں۔

(۶) سیاسی حالات نے لیڈری کا شوق ہر دل میں پیدا کر دیا ہے۔ قوم کا ہر فرد لیڈر سے نیچے درجے کا تصور ہی نہیں کرتا جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہماری صحافت ان خود ساختہ فاطر العقل لیڈروں کا میدانِ جنگ بن کر رہ گئی ہے۔

(۷) بعض اخبارات ایسے ہیں جن کا نام کچھ اور ہے اور پالیسی کچھ اور، یعنی اگر پرچے کا نام "خیر" ہے تو پرچے کی پالیسی "شر" ہوتی ہے، اور اگر نام "آزاد" ہے تو پرچے کی پالیسی "قید و محکومی" ہوتی ہے۔ اس صفتِ تضاد نے بھی پبلک کو دیوانہ سا بنا رکھا ہے۔

کیا اب بھی وقت نہیں آیا ہے کہ ہم اپنی بیمار اور کمینہ صحافت کی جانب توجہ مبذول کریں۔ جاہل و خود غرض ایڈیٹروں کو کرسیٔ ادارت

سے گرا دیں ؟ اور پبلک مذاق کو اس قدر بلند کرنے کی سعی کریں کہ شر پسند قسم کے اخبار خود اپنی ہی موت مر جائیں ؟

ہر قوم کی باگ اس کے مفکروں اور ایڈیٹروں کے ہاتھ میں ہوتی ہے، لیکن ہماری حالت بالکل اس کے برعکس ہے، یہاں مفکروں، اور ایڈیٹروں کی باگ قوم کے ہاتھوں میں رہتی ہے۔

اکثر ایڈیٹروں کو یہ کہتے سنا گیا ہے کہ کیا کریں، خود ہم اپنی تحریروں سے بیزار ہیں، لیکن اگر ہم اس کے خلاف روش اختیار کریں تو پبلک ہمارا اخبار خریدنا چھوڑ دے۔ یہ کتنی خطرناک صورت حال ہے، اور اس کے نتائج کس قدر خوفناک ہیں!

آئے دن ہمارے اخباروں میں چھپا کرتا ہے کہ

"فلاں مسلمان نے فلاں ہندو کو ذبح کر ڈالا"

"فلاں ہندو نے فلاں مسلمان کو تہ تیغ کر ڈالا"

"ہندوؤں مسلمانوں میں جنگ ہو گئی"

"ایک مسلمان ایک ہندو دیوی کو لے کر بھاگ گیا"

"ایک ہندو نے ایک مسلمان لڑکی کی بے آبروئی کی"

"ایک مسلمان گٹھڑی چرا کر فرار ہو گیا"

"ایک ہندو ایک تھیلی لے کر غائب ہو گیا"

"ایک مسلم غنڈے کے کرتوت" اور "ایک ہندو لفنگے کی حرکتیں"

ذرا ان فتنہ پرور ایڈیٹروں سے دریافت فرمائیے کہ آپ کیا کسی خبر کو "ہندو" "مسلم" سرخی سے علیحدہ کر کے شائع ہی نہیں کر سکتے؟

آخر ہر بات میں "ہندو" "مسلمان" کیوں آ جاتا ہے؟

کیا کوئی خبر اس سادے اور فطری انداز سے شائع نہیں کی جا سکتی کہ

"ایک آدمی چوری کر کے بھاگ گیا"

"ایک شخص نے دوسرے شخص کو مار ڈالا"

"ایک بدمعاش کے کرتوت" اور "ایک غنڈے کی حرکتیں"؟

آخر یہ "ہندو" اور "مسلمان" لکھے بغیر ہمیں مزا کیوں نہیں آتا؟

کیا "ہندو" "مسلم" الفاظ کے باہر ہم میں سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی ہے؟

ہم شاید اس سب سے بڑی حقیقت کو بھول چکے ہیں کہ ہم انسان ہیں۔ اگر ہم اسے نہ بھول چکے ہوتے تو ہر موقع اور ہر محل پر اپنے کو "ہندو" "مسلمان" ہی کے نام سے کیوں پکارتے۔

یا بات یہ ہے کہ انسان کا لفظ ہماری نگاہوں میں اس قدر حقیر ہو چکا ہے کہ ہم اپنے کو انسان کہنے سے شرمانے لگے ہیں۔

اگر کوئی فرانسیسی کسی تانگے والے سے لڑ پڑے اور ہمارے ایڈیٹر صاحبان کو اس خبر کے چھاپنے کی ضرورت ہو تو کیا وہ اس خبر کے شائع کرنے سے پیشتر اس فرانسیسی آدمی کے پاس اپنا نمائندہ بھیجکر یہ معلوم کریں گے کہ تو "رومن کیتھولک" ہے یا "پروٹسٹنٹ" اور جب تک اس کی تحقیقات نہ ہو جائے گی وہ اس خبر کی اشاعت کو معرض التوا ہی میں رکھیں گے اور کیا اس کے یہ معنی نہ ہوں گے سرخی اگر قائم ہو سکتی ہے تو اسی طرح کہ "ایک رومن کیتھولک" یا "پروٹسٹنٹ" کی مڈبھیڑ ایک "آریہ سماج" یا "وہابی" تانگے والے سے" اور کیا یہ خبر وہ "ایک فرانسیسی کی تانگے والے سے لڑائی" کی سرخی سے شائع نہیں کی جا سکتی؟

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ خدانخواستہ ہندوستان پر مذہب اس قدر غالب ہے کہ یہاں کا ہر عالم کسی شخص کو محض انسان کہنے پر قناعت نہیں کر سکتا اور جب تک کسی کے مذہب اور فرقے اور اس کے انفرادی عقائد کا نام نہ آئے اس وقت تک اس کی مذہب زدہ ذہنیت کو آسودگی ہی محسوس نہیں ہو سکتی۔

یہ ہر بات میں مذہب کا دخل، اور ہر شخص کے ساتھ "ہندو" "مسلم" کی تخصیص محض اس کمینہ ذہنیت پر مبنی ہے کہ ہندو مسلم اکھاڑے قائم کئے جائیں۔ تسبیح و زنار کو الجھایا جائے۔ داڑھی اور چوٹی کی کشتیاں دیکھی جائیں، اور دھوتیوں پائجاموں کو دست و گریبان کر دیا جائے تاکہ اس ہنگامے سے ہمارا اخبار ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو، ہمیں خطابات ملیں۔ چندے حاصل ہوں، ہر موقع پر کثرت سے ووٹ ملیں، اور ہماری لیڈری مستحکم ہو جائے۔

کیا آپ اس قوم کو مجسمہ انطرنیوں اور شریف و صالح سمجھنے پر تیار ہیں، جس کے عوام نہیں بلکہ خواص تک اپنے ذاتی اغراض پر اپنی قوم کا خون بہا دینا جائز سمجھتے ہیں؟

ہمارے یتیم خانے

یتیم خانوں کے قیام کی غرض یہ ہوتی ہے کہ وہ بچے جو والدین سے محروم ہو چکے ہیں، پالے جائیں۔ اور اُنھیں صحیح تعلیم و تربیت سے آراستہ کرکے اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ جوان ہو کر کم سے کم بھوکوں نہ مریں۔

یتیم خانے میں رہنے والا یتیم، اُس بدقسمت بچے کو کہتے ہیں جو والدین کی شفقت سے محروم ہو کر خوش قسمتی سے اپنی قوم کا فرزند ہو جاتا ہے۔ اور یتیم خانہ اُس ادارے کو کہتے ہیں جو ایک باپ اور ایک ماں سے محروم ہو جانے والے بچے کے واسطے کئی لاکھ باپ اور کئی لاکھ مائیں مہیا کر دیتا ہے۔

لیکن ہمارے بدبخت ہندوستان کے تمام اداروں کی طرح یہ کئی لاکھ باپوں، اور کئی لاکھ ماؤں والا ادارہ بھی اس قدر مفلوج و ناکارہ ہے کہ اس سے ہمارے یتیموں کی بدبختی میں ذرّہ برابر بھی کمی نہیں ہوتی۔ معاملہ اگر صرف یہیں تک ہوتا تو شاید کچھ دن صبر بھی کر لیا جاتا، لیکن مصیبت، تو یہ ہے کہ ہمارے اس ادارے سے یتیموں کی بدبختیوں میں کمی ہونا تو درکنار اُن کی بدبختیاں اور بھی بڑھ جاتی ہیں۔

اس بات کے کہنے میں ہچکچانا نہ چاہیے کہ ہمارے مذہبی ملک میں یتیم خانے تک اُن بزرگواروں کی چراگاہیں بنے ہوئے ہیں جن کی مقدس دوکانوں میں "خدا" و "رسول" تک نمائشی بکس (Show-case) میں "برائے فروخت" رکھے ہوئے پائے جاتے ہیں۔

کسی یتیم خانے کے بانی، یا مہتمم ہونے کے لئے صرف اس کی ضرورت ہے کہ سفید ڈاڑھی کو ذرا سا مہندی سے رنگ لیا جائے، پائجامہ کسی قدر ٹخنوں سے اُونچا کر دیا جائے، اور ہر جامع مسجد سے لے کر ہر دروازے پر یتیموں کی بیکسی و ناچاری کا رونا رو دیا جائے، اور جب بھولے بھالے، غذا آتا سے ڈرنے والے جاہل مسلمانوں سے روپیہ اینٹھ لیا جائے، اور مستقل چندے مقرر ہو جائیں تو تمام روپے کو اپنی اور اپنے بال بچوں کی پرورش پر صرف کرتے ہوئے کاسۂ گدائی کو ہمیشہ بلند رکھا جائے اور یتیموں کے متعلق آیاتِ قرآنی پڑھ پڑھ کر نیز یتیموں کے باب میں شعراء کی نظمیں گا گا کر نئے دن نئے نئے دفینہ ہائے سیم و زر کے کھودنے میں مسلسل مصروف رہا جائے لیکن اس تمام پدرانہ محبت اور مادرانہ شفقت کے کاروبار میں اُس شئے پر سب سے کم توجہ مبذول کی جائے جن پر یتیم خانے کی بنیاد واقع ہوئی ہے۔

جس یتیم خانے میں نکل جائیے آپ یہی اندھیر پائیں گے کہ یتیموں کو نہ تو اچھی غذا ہی دی جاتی ہے، نہ اچھی پوشاک، نہ اچھی تعلیم ہی دی جاتی ہے، نہ اچھی تربیت۔

اربابِ یتیم خانہ ہمارے بچوں کو اسی طرح استعمال کرتے ہیں جیسے بڑے شہروں کے چالاک گداگر اپنی ٹانگ کو۔ اُس بے داغ ٹانگ کو جسے وہ گھٹنیوں تک پٹیوں سے لپیٹ کر پاک کے جذبۂ رحم کو یہ دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ اُن کی ٹانگ سڑی ہوئی ہے۔

اس دنیا کا نظم و نسق ہی ایسا واقع ہوا ہے کہ یہاں ہر شر میں خیر، اور ہر خیر میں شر کا عنصر موجود رہتا ہے۔ ہمارے یتیم خانے بھی اس محکم قانونِ عالم سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ اپنی بے شمار خرابیوں کے باوصف، یہ غنیمت معلوم ہوتا ہے کہ یہاں لاوارث بچوں کو دھوپ اور بارش سے بچانے کے لئے ایک چھت میسر آ جاتی ہے۔ بھوک کے شدائد سے بچنے کی خاطر ایک وقت کا بُرا بھلا سیٹھا پیٹ کا کھانا مل جاتا ہے، اور ستر پوشی کے واسطے پھٹے پرانے کپڑے بہم پہنچ جاتے ہیں۔ یہ افسوسناک صورتِ حال برداشت کر لی جاتی، اگر اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ نہ دیکھتے کہ بچوں کو یہ معمولی آسانیاں نہ کہ آسائشیں، بہت بڑی قیمت دے کر خریدنا پڑتی ہیں۔ بچوں کو ان معمولی آسانیوں کے خریدنے میں جو غیر معمولی قیمت دینا پڑتی ہے وہ اُن کی صحت تعلیم و تربیت، اور اُن کی خودداری ہوتی ہے، اور بعض اوقات تو ان ارزاں آسانیوں کی قیمت اس قدر گراں ہو جاتی ہے کہ بچوں کو اُنھیں اپنے اخلاق، اور اپنے چال چلن سے خریدنا پڑتا ہے۔

ایک بڑے مشہور شہر کے لڑکیوں کے یتیم خانے کو خود میں نے دیکھا تھا۔ جہاں پہونچتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ میں ایک بڑے چکلے میں آ گیا ہوں، اور جس وقت یتیم خانے کے "مولوی صاحب" کا سامنا ہوا تو مجھے ایسا معلوم ہوا گویا میں ایک مردِ نائکہ کی ملاقات کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔

یہی حال لڑکوں کے یتیم خانوں کا ہے جہاں بدچلن صحبتوں کے نمایاں افراد اکثر و بیشتر نزولِ اجلال فرماتے رہتے ہیں۔ جس سے خاصی آمدنی ہو جاتی ہے۔

ان ہولناک عیوب کے ساتھ ساتھ ہم نے دن یہ بھی مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ یتیم خانوں کے اربابِ حل و عقد، یتیموں کے جلوس نکالا کرتے ہیں۔ اس حالت میں کہ ان کے پاؤں میں جوتے بھی نہیں ہوتے۔

یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ یتیموں میں سے بعض کے پاس خیراتی جوتے ہوتے ہیں۔ مگر جلوس کے وقت اُنھیں جوتے پہننے سے اس لئے حکماً روک دیا جاتا ہے، تاکہ دیکھنے والوں کے دل پسیج جائیں۔ اور وہ یتیم خانے کے فرش پر زر و گوہر کی بارش کر دیں۔ اور اس سونے چاندی کی بارش کا تمام پانی اربابِ یتیم خانہ کے کھیتوں میں دے دیا جائے۔

شاید ایک ہفتہ ہوا ہوگا دوپہر کا وقت تھا، آپ کو معلوم ہے کہ یہ شدید گرمی کا زمانہ ہے، نہایت سخت لُو چل رہی تھی کہ یکایک میں نے اپنے زنانے مکان کے صحن میں کئی بچوں کے قرآن گانے کی آواز سُنی۔

باہر نکل کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ لاہور کے کسی یتیم خانے کے بچے ہیں جنھیں اربابِ یتیم خانہ نے اس چلچلاتی دھوپ میں برہنہ پا در در بھیک مانگنے کے لئے باہر نکالا ہے۔

یہ دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ میں نے خیال کیا کہ یہ معصوم بچے اس دھوپ میں در در بھیک مانگتے پھر رہے ہیں، اور ان کے اربابِ حل و عقد اس وقت ان کی بدولت خس خانوں میں لیٹے ہوں گے۔

لعنت ہے ایسے یتیم خانوں پر، اور تُف ہے ان یتیم خانوں کے اربابِ بست و کشاد پر!

جو قوم اپنے یتیموں کو ننگا بھوکا رکھتی ہے۔ جو قوم اپنے یتیموں کو ننگے پاؤں پھراتی ہے، جو قوم اپنے یتیموں کو تعلیم و تربیت سے محروم رکھتی ہے، جو قوم اپنے یتیموں کو دوسروں کے گھروں میں بے اجازت در آنہ گھس پڑنے کی تعلیم دیتی ہے۔ جو قوم یتیموں میں یہ ذہنیت پیدا کرتی ہے کہ وہ آیاتِ قرآنی سے کاسۂ گدائی کا کام لیں۔ جو قوم اپنے یتیموں کو بھیک مانگنے کی انتہائی شرمناک عادت ڈلواتی ہے، جو قوم اپنے یتیموں کو اپنی معاش کا ذریعہ بناتی ہے اور جو قوم اپنے یتیموں کو اپنی نفسانی خواہشوں کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھانے کا ارتکاب کرتی ہے۔ وہ قوم، وہ قدرت کی مبغوض و مغضوب قوم اس قابل ہے کہ اسے ہلاک کر دیا جائے۔ اُس کی ہڈیوں تک کو توڑ ڈالا جائے۔ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں میں آگ لگا دی جائے اور پھر اُن ناپاک ہڈیوں کی راکھ کو دوزخ میں جھونک دیا جائے۔

ہماری پولیس

جرائم کے سلسلے میں پولیس کا اِس قدر، اور صرف اس قدر فرض ہے کہ وہ کسی جُرم کی رپورٹ ملتے ہی، پہلے تو اس کی تحقیقات کرے کہ آیا رپورٹ صحیح ہے کہ غلط، اور اگر صحیح ہے تو اِس کا پتا چلائے کہ کس شخص یا کن اشخاص نے اس کا ارتکاب کیا ہے۔

اثنائے تحقیقات میں پولیس کے پیشِ نظر یہ خیال سب سے زیادہ شدّت کے ساتھ رہنا چاہئے کہ دس ہزار مجرموں کا رہا ہو جانا اِس سے کہیں بہتر ہے کہ کسی ایک معصوم کو سزا ہو جائے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ پولیس کو چاہئے کہ وہ اس نظرئے کو بھی ہمیشہ یاد رکھے کہ ہر شخص قانون کی نظر میں بے خطا ہے، جب تک اُس کی خطا بدیہی طور سے ثابت نہ ہو جائے۔ نیز جب پولیس کامل ایمانداری، اور خالص غیر جانبداری کے ساتھ تحقیقات کر چکے تو اُس کا یہ ایک نہایت ہی صحیح، مفید، خوشگوار اور راہبرانہ فریضہ ہے کہ وہ اپنی تحقیقات کے تمام کمزور و قوی، مشتبہ و یقینی، منفی و مثبت، اور تاریک و روشن پہلوؤں کو ایک خالص تحقیقات کنندہ اور کامل جُویائے صداقت و معدلت ادارے کی حیثیت سے ایسی عاقلانہ، احتیاط آمیز اور شریفانہ تفصیل و ترتیب کے ساتھ عدالت کی میز پر رکھ دے کہ جج معاملے کے ہر ہویدا و پنہاں رُخ کو دیکھ کر ایسا فیصلہ کرے کہ اُس کا قلمِ انصاف کے کانٹے پر سونے کی طرح تُل جائے۔

مگر یہ دیکھ کر ماتم کرنے اور اپنے سر کو اپنے ہاتھوں سے کاٹ کر پھینک دینے کو دل چاہتا ہے کہ ہماری پولیس کبھی، اور کسی معاملے میں بھی، بلکہ ایک بار بھی ایسا نہیں کرتی۔

ہماری پولیس تو مُنھ کھولے یہ دیکھا کرتی ہے کہ کسے شکار کیا جائے۔ اور کس خدا کے نیک بندے کو سُولی پہ چڑھوا کر منصب اور گریڈ بڑھوایا جائے۔

ہماری پولیس کی اِس شرمناک اور شقاوت آمیز روش کے مختلف اسباب ہیں۔ جن میں دو سبب نمایاں معلوم ہوتے ہیں۔ پہلا سبب تو یہ ہے کہ ہماری پولیس کے چوکیدار، محرر، کانسٹیبل، ہیڈ کانسٹبل، سب انسپکٹر

اور انسپکٹر وغیرہ ہندوستان کے پست، اور چھوٹے طبقوں سے تعلق رکھنے والے جُہلا ہوتے ہیں جو حق و انصاف کے عوض، معدہ و منصب ہی کو دیکھا کرتے ہیں،

اور دوسرا سبب یہ ہے کہ محکمۂ پولیس کی یہ روایت ایک مُدّتِ دراز سے سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہے کہ جو پولیس والا پبلک کو سب سے زیادہ ستاتا ہے، لوگوں کے سب سے زیادہ چالان کرتا ہے اور ملزموں کو سب سے زیادہ سزائیں دلاتا ہے وہی سب سے زیادہ اور سب سے جلد ترقی کرتا ہے۔ اور جو پولیس افسر ایسا نہیں کرتا اُسے ترقی نہیں ملتی، اُس کے سر پر تنبیہہ و تخویف کے بادل گرجتے رہتے ہیں۔ اور اگر وہ اصول پر مصر رہتا ہے تو اُسے ملازمت سے علیحدہ کرکے برباد کر دیا جاتا ہے۔

پولیس کے جور و ستم کے متعلق حکومت کو بارہا توجہ دلائی جا چکی ہے اور یہ فریاد کا غلغلہ کہ پولیس، پبلک پر حد سے گزری ہوئی سختیاں کرتی ہے، غریب مخلوق کے حلقے سے نہیں، بلکہ سرکاری عدالتوں کی حلق سے ہزار بار بلند ہو چکا ہے، لیکن حیرت ہے کہ حکومت اِن فریادوں کو ایک کان سے سُنتی ہے، اور دوسرے کان سے اُڑا دیتی ہے۔

ہندوستان ٹائمز مورخہ ۱۰ رمئی ۳۸ء میں "جبریہ اقرارِ جرم" کی سُرخی سے ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں اس امر پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ ہماری پولیس "تحقیقات" کے سلسلے میں کیا کیا شدائد روا رکھتی ہے۔

اُس مضمون کے بعض حصوں کا خلاصہ ملاحظہ فرمائیے۔

"ہائی کورٹ نے پولیس کی معروف روش پر جسے ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا ہے، اکثر اعتراضات کئے ہیں۔ لیکن آج تک حکومت یہ کہنے کے لئے سامنے نہیں آئی ہے کہ اُس نے ان اعتراضات کو سُنا یا جانچا ہے، یا یہ کہ وہ اس کی اصلاح کر رہی، یا اُس نے کسی خاص پولیس افسر کو اس کی بدعنوانیوں کی یہ سزا دی ہے۔

اب جب کہ بلند بانگ "پراونشل اٹانمی"

بعض صوبوں میں، کسی نہ

سی طرح کام کر رہی ہے، کیا یہ امید کرنا حد سے متجاوز ہونے کے برابر ہوگا کہ حکومت اب اُن لوگوں سے بازپُرس کرنے میں پس و پیش نہ کرے گی، جو اقتدار کے نشہ کے باعث مُردم آزاری پر ہر وقت کمر باندھے رہتے ہیں؟

لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس "سر ڈگلس ینگ" نے ایک لڑکے کے قتل کے مقدمے کے سلسلے میں جو تھوڑے ہی دن ہوئے کہ اُن کے روبرو پیش ہوا تھا، یہ لکھا ہے کہ اِس وارداتِ قتل میں پولیس نے چند چماروں پر شُبہ کیا، اور اُنھیں تحقیقات کی خاطر نمبردار کے حوالے کر دیا۔

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس شے سے دوچار ہو کر جسے "شدید تحقیقات" کہا جاتا ہے آخر کار ایک چمار نے اقرار کر لیا کہ وہ قاتل ہے۔

لیکن تحقیقاتِ مابعد نے عدالت پر یہ ثابت کر دیا کہ قتل کرنا تو درکنار چمار اِس بات سے بھی واقف نہیں ہے کہ واقعہ در اصل کیا تھا۔

وہ تحقیقات کس قدر "شدید" ہوگی جس کی تاب نہ لا کر ایک معصوم و بے گناہ انسان اُس جرم کا اقرار کر لیتا ہے جس سے وہ آگاہ تک نہیں ہوتا، اور ایسے ہولناک جرم کا اقرار کر لیتا ہے جس کی سزا موت ہو سکتی ہے!

پولیس کی ان "کارگزاریوں" کا وہی لوگ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں جو اس امر سے واقف ہیں کہ اس مُلک میں یہ محکمہ کیا کیا سختیاں کرتا رہتا ہے۔

سر ڈگلس کے نزدیک ایسا شُبہ کرنے کے بہت سے دلائل موجود ہیں کہ صرف اسی مقدمے میں نہیں، بلکہ اکثر و بیشتر مقدموں میں مجرموں سے جبریہ اقرارِ جرم کرایا جاتا ہوگا۔

سر ڈگلس، پولیس کی اِس روش کے نتائج کو سخت خطرے کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، کیونکہ اِس سے یہ شدید خطرہ ہے کہ مقدمات کی عمارتیں غلط بُنیادوں پر قائم ہو جائیں گی اور اُس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ معصوم و بے خطا لوگ پھانسی کے تختوں پر لٹک جائیں گے۔

آگے چل کر ہز لارڈشپ تحریر فرماتے ہیں کہ معدلت گستری کا یہ ایک زرّیں اصول ہے کہ ملزم کو اُس وقت تک برابر معصوم سمجھا جائے جب تک کہ اُس کا جرم روزِ روشن کی طرح نہ ثابت ہو جائے۔ اس کے علاوہ ہندوستانی عدالتوں میں اس نظریے پر بھی کوئی توجہ نہیں کی جاتی کہ پولیس اور وکیل سرکار کا کام یہ نہیں ہے کہ ملزم کو اقراری مجرم بنا لیا جائے۔ یا عدالت کو ایسے مغالطے دئے جائیں کہ وہ دھوکا کھا کر ملزم کو سزا دیدے، بلکہ اس کے برخلاف پولیس اور وکیل سرکار کے ذمّے صرف اس قدر کام ہے کہ تمام ممکن الحصول واقعات کو بجنسہٖ عدالت کے روبرو پیش کرکے فیصلہ جج پر چھوڑ دے۔

ہندوستان میں، اتباع کی بہ نسبت، اِن دونوں متذکرۂ بالا اصول کی، اُنھیں توڑ کر زیادہ عزّت افزائی کی جاتی ہے

جرائم کی تحقیقات میں، صداقت دریافت کرنے کے عوض، تحقیقات کرنے والوں کی تمام قوتیں اسی پر صرف ہو جاتی ہیں کہ ملزم کو کسی نہ کسی طرح مجرم ٹھہرایا جائے۔

اس شرارت کا سدِّباب صرف اس ایک صورت سے ہو سکتا ہے کہ حکومت اس کی بیخ کنی پر آمادہ ہو جائے۔

پولیس سے یہ صاف صاف کہہ دیا جائے کہ تیری ڈیوٹی صرف اِس قدر ہے کہ تو واقعات کی اصلیّت کو معلوم کرنے کی کوشش کرے، اور صحیح مجرم کا صحیح طریقوں سے پتا چلائے۔ یہ کس کور باطن نے تیرے کان میں پھونک دیا ہے کہ تو آنکھیں بند کر کے کسی ایک شخص کو پکڑ لے، اور اس پکڑ لینے کے عمل کے بعد تمام ایڑی چوٹی کا زور اس پر صرف کر دے کہ اُس غریب کو خواہ مخواہ اقرار کر لینا پڑے کہ وہ سارق، ڈاکو، اور قاتل ہے۔

اس امر سے بھی پولیس کو آگاہ کر دیا جائے کہ جان بوجھ کر جھوٹ بولنے، اور عدالت کو گمراہ کرنے کی پاداش میں اُسے عبرتناک سزائیں دی جائیں گی "

یہاں تک تو لاہور کے چیف جسٹس کا ریمارک تھا، اب آئیے، لگے ہاتھوں اِسی سلسلے کی ایک اور چیز بھی ملاحظہ فرمایئے۔

بائیسویں مئی ۳۰ء کے ہندوستان ٹائمز میں یہ واقعہ شائع ہوا ہے کہ ایک شخص نے اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی خاطر اپنے کو روپوش کر لیا، اور اِس طرح روپوش کیا کہ پولیس کو اُس کے دشمنوں پر یہ شبہ ہو گیا کہ اُنھوں نے اُسے قتل کر دیا ہے۔

بس یہ شبہ ہوتے ہی ایک قیامت بپا ہو گئی، شرارت آمیز اُچھل کود شروع کر دی گئی اور اضافۂ منصب و مال کی اُمیدیں دلوں میں کروٹیں لینے لگیں ——

پولیس نے اپنے مخصوص "آلاتِ تحقیقات" اُٹھا لئے، اور جادو کی لکڑی گھمانا شروع کر دی —— یہاں تک کہ مقدمۂ قتل اپنے تمام ثبوتوں اور اپنی تمام شہادتوں کے ساتھ عدالت میں پیش کر دیا گیا۔

مفروضہ مقتول کے خون آلود کپڑے اور خون میں لتھڑا ہوا گنڈاسا عدالت کے روبرو پیش کیا گیا۔ اور خون آلود اُسی کے ساتھ ساتھ وہ گواہ بھی پیش کر دئے گئے جنھوں نے اس واقعۂ "قتل" کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ الغرض واقعاتی اور عینی تمام شہادتوں کے ذریعے سے یہ بات ثابت کر دی گئی کہ روپوش آدمی قتل ہو چکا ہے، اور اُس روپوش کے وہی لوگ قاتل ہیں جنھیں پولیس نے گرفتار کیا ہے۔

لیکن ہنوز مقدمے کی سماعت کا کاروبار جاری ہی تھا، اور پولیس اپنے ایماندارانہ فرائض میں سرگرمی سے مشغول تھی کہ "مقتول" عدالت کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا گیا۔ اور چشم زدن میں یہ حقیقت آشکار ہو گئی کہ یہ تمام تر مقدمہ پولیس کی تخیلِ خونی کے ایک ادنیٰ سے کرشمے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

تصوّر کیجیے اس ہولناکی کا۔ اور ماتم کیجیے اس شقاوت پر۔

اگر "مقتول" عدالت میں حاضر نہ کر دیا جاتا تو نتیجہ کیا ہوتا؟

اور اگر "مقتول" اپنے معصوم "قاتلوں" کے سُولی پا چکنے کے بعد نمودار ہوتا تو دنیا کی وہ کون ایسی زبردست قوت تھی جو انصاف کے دل کو ٹوٹ جانے اور معدلت گستری کے سینے کو شق ہو جانے سے بچا لیتی!

کاش حکومت کسی صورت سے محسوس کر سکتی کہ وہ پولیس جو اُس کی نظروں میں بہت زیادہ عزیز ہی نہیں بلکہ اُس کی چہیتی اور لاڈلی بیٹی ہے جو "باغیوں" اور سرکشوں کے سروں پر لاٹھی چارج کر کے ہندوستان کے مشہور خلائق امنِ عامّہ کو قائم رکھتی ہے اور "دہشت انگیزوں" کے سروں پر آرے چلا کر وطنِ عزیز کے نیک نام نظم و نسق کو بحال رکھتی ہے۔

وہی پولیس، ہندوستان کے باشندوں کے حق میں ایک ایسی ہولناک وبا بنی ہوئی ہے کہ ہر طرف سے یہ دردناک صدائیں چلی آرہی ہیں کہ یا تو پولیس کی اصلاح کر دیا پھر ہم سب کو چوراہوں پر سُولیاں کھڑی کر کے پھانسی پر لٹکا دو۔

ایک معذرت

"کلیم" کے مئی نمبر میں "غزل گوئی" پر جو مضمون شائع ہوا ہے ہر چند جہاں تک نفسِ مضمون کا تعلق ہے، میں اُس سے کلیتہً متفق ہوں، لیکن جہاں تک کہ اس مضمون کے لہجے کا تعلق ہے میں افسوس کے ساتھ لکھنے پر

مجبور ہوں کہ مجھے اُس سے شدید اختلاف ہے۔

اور اس اختلاف میں شدت کا عنصر اس وجہ سے اور زیادہ ہو گیا ہے کہ اس کا رُوئے سخن میرے قابلِ احترام دوست حضرت حکیم آزاد انصاری کی طرف ہے، جو میری نگاہوں میں قابلِ احترام ہی نہیں قابلِ عقیدت و محبت بھی ہیں۔

اس کے علاوہ جن جن حضرات کو اس کے لہجے سے تکلیف پہونچی ہو میں اُن تمام حضرات سے معافی کا خواستگار ہوں۔

آزاد صاحب سے اس لئے معافی کا طالب نہیں ہوں کہ میرے اُن کے تعلقات ان امور سے بالاتر واقع ہوئے ہیں۔ اور وہ میری رُوح سے بخوبی واقف ہیں۔

اگر یہ مضمون، اشاعت سے قبل میری نظر سے گزر جاتا تو اس کا لہجہ بالکل مختلف ہوتا۔ لیکن ہی نمبر کی ترتیب کے وقت، میں کچھ ایسے حالات میں گرفتار رہا کہ بعض مضامین جن میں یہ مقالہ بھی ہے میری نظر سے گزر ہی نہیں سکے۔

اس کے علاوہ میں یہ بھی ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ آزاد جس شاعری کے حامی ہیں وہ روشِ عام سے اس قدر مختلف واقع ہوئی ہے کہ عام شعراء کو اُس کی ہوا تک نہیں لگی ہے۔ اور میرے اور آزاد صاحب کے نظریئے میں یہ اختلاف ہے کہ وہ نیک نیتی سے محض غزل کی اصلاح چاہتے ہیں اور میں نیک نیتی سے انعدام۔

آگ اور پانی

آئی ہیں گھٹائیں نغمہ خوانی کے لئے　　سو رنگ لئے ہوئے جوانی کے لئے
دے بادہ کہ سب بڑھکے موزوں ہے ندیم　　یہ آگ، برستے ہوئے پانی کے لئے

بُوندیں

بیلوں پہ جھلک رہی ہیں بُوندیں، ساقی　　خوشوں سے ٹپک رہی ہیں بُوندیں، ساقی
دے جام کہ برگہائے سبز و تر پر　　رہ رہ کے کھنک رہی ہیں بُوندیں، ساقی

مستوں کی بادشاہی

ہنگامۂ انوارِ الٰہی دیکھو　　گل رنگ ہے رات کی سیاہی، دیکھو
پہلو میں صنم ہے، اور سبو میں صہبا　　دیکھو، مستوں کی بادشاہی، دیکھو

جوش ملیح آبادی

گھٹا

اُٹھی گھٹا، وہ، رنگ و بُو کا کارواں لئے ہوئے
جلو میں کائنات کی، جوانیاں لئے ہوئے

لئے ہوئے پیامِ جاں، ہر ایک رس کی بُوندیں
ہر ایک رس کی بُوندیں، پیامِ جاں لئے ہوئے

لئے ہوئے ہوا کے نرم بازوؤں پہ بوستاں
ہوا کے نرم بازوؤں پہ، بوستاں لئے ہوئے

دُھواں دھواں لئے ہوئے بلندیوں پہ چرخ کی
بلندیوں پہ چرخ کی، دُھواں دُھواں لئے ہوئے

زمینِ تشنہ کام کی جماہیوں کے سامنے
شرابِ لالہ رنگ کی گُلابیاں لئے ہوئے

وفورِ سُود و ساز میں، ہجومِ پیچ و تاب سے
رقیق و نرم دامنوں میں بجلیاں لئے ہوئے

ہر ایک سُو رَواں دَواں، کبھی یہاں، کبھی وُہاں
بُتانِ شوخ و شنگ کی سی، شوخیاں لئے ہوئے

صدائے برق و رعد میں، ہوائے تند و تیز میں
نزاعِ جوش و ہوش کی کہانیاں لئے ہوئے

ہوائیں اینڈتی ہوئی فضا میں جھومتی ہوئی
تحمل و شکیب کی تباہیاں لئے ہوئے

بہشتِ حسن و عشق کو، جہانِ رقص و کیف کو
فضائے آب و رنگ میں کشاں کشاں لئے ہوئے

حریمِ کیف و سرخوشی میں، پردہ ہائے رنگ میں
سُبو بدوش مغبچوں کی مستیاں لئے ہوئے

ادا و ناز و دلبری کی رنگ بیز چھاؤں میں
نئی نئی جوانیوں کی جھلکیاں لئے ہوئے

لئے ہوئے ہواؤں پر سیاہ و سرخ کشتیاں
ہوائے تند کشتیوں کے بادباں لئے ہوئے

لئے ہوئے بلندیوں پہ ولولے حیات کے
حیات بخش ولولے بلندیاں لئے ہوئے

سیاہیوں کے سلسلے میں، تیرگی کی موج میں
جُنوں فروش کاکلوں کی داستاں لئے ہوئے

کدھر ہے جوشؔ! بدلیاں رواں ہیں سوئے میکدہ
سیاہیوں کے حاشیے پہ سُرخیاں لئے ہوئے

جوشؔ ملیح آبادی

پانچ سو مذاہب کی سرزمین

چمن لال صاحب سیاح جاپان

ترجمہ محمود علی خاں

دنیا میں اگر کوئی ملک مذہبی رواداری کی زندہ مثال ہے تو وہ جاپان ہے، جہاں ایک ہی گھر میں عیسائی مذہب، بودھ مت، شنٹو دھرم اور کیمونزم، کے پیرو ایک خاندان کے افراد اور بھائی بھائی کی حیثیت سے رہتے ہیں، وہ لوگ ہندوستان کی طرح مذہب کو آلہ کار نہیں بناتے، جاپان میں مذہبی جھگڑوں کا کبھی نام بھی سننے میں نہیں آتا۔ مجھ سے اکثر حضرات دریافت کرتے ہیں کہ ہندوستان کے مذہبی دیوانے آخر جاپان والوں کی پیروی کیوں نہیں کرتے؟ میرا جواب صاف ہے یعنی "مختلف مذاہب کے خودساختہ لیڈر حکومت کی امداد اور سرپرستی میں اپنے ذاتی اغراض کے لئے مذہب کو ایک بہانہ بناتے ہیں اور عوام میں ابھی تک یہ احساس پیدا نہیں ہوا ہے کہ وہ ان نام نہاد مذہبی رہنماؤں کو ملک کا حقیقی دشمن سمجھ سکیں؟ اگر آپ پوچھیں کہ جاپان کا مذہب صرف ایک لفظ میں بتاؤ تو میں بلا تامل بول اٹھوں گا "وطن پرستی"۔

ہندوستان کی طرح جاپان میں وطن پرستی محض ایک جذبہ کی حیثیت نہیں رکھتی، بلکہ یہ اُن کا مذہب ہے، خواہ اُن کے روحانی عقائد کچھ بھی ہوں۔ اور خواہ وہ بودھ ہوں یا عیسائی یا شنٹو، لیکن وہ اپنے وطن سے انتہائی محبت رکھتے ہیں۔ اور اپنی جانیں بھی اُس پر سے قربان کر دینے کو ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔

مذہبی عقائد کے لحاظ سے ان میں بے شمار فرقے ہیں۔ اور شاید آپ کو یہ سن کر تعجب ہو کہ اب ان کی تعداد پانچ سو تک پہونچ گئی ہے، اس فرقے

میں جاپانیوں کے مذہبی عقائد میں عجیب و غریب تبدیلیاں ہوئی ہیں اور آئے دن مختلف اضلاع سے نئے نئے مذاہب کی اطلاع آتی رہتی ہے، یہاں تک کہ محکمہ تعلیم کے مذہبی بیورو کے پاس اوسطاً ہر ہفتہ ایک نئے مذہب کے جاری ہونے کی اطلاع آجاتی ہے، مقامی گورنروں نے اس صورتِ حال کی تحقیقات کی اور وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ عوام تو مالی مشکلات کی وجہ سے کسی معجزے یا عجیب و غریب چیز کی تلاش میں رہتے ہیں اور تعلیم یافتہ حضرات موجودہ مذاہب سے مطمئن نہیں ہیں، اس لئے تلاشِ حق میں سرگرداں رہتے ہیں اور وہ سپاہی جو منچوریا سے صحیح و سالم واپس آگئے ہیں سمجھتے ہیں کہ وہ کسی قدرتی ہاتھ یا مذہبی فیض کی امان میں رہے اور بخیر و عافیت واپس آگئے [illegible] تمام چیزوں سے مل جل کر نئے نئے مذاہب کی ابتدا ہوتی ہے۔

اس وقت جاپان میں کوئی پانچ سو مذاہب یا فرقے ہیں بعض مذاہب کے تو صرف معدودے چند پیرو ہیں۔ یہ لوگ اپنی عبادتگاہوں میں جو روپیہ نذر کرتے ہیں اس سے بھی ایک بڑی رقم جمع ہو جاتی ہے، دراصل بعض مذاہب کا مقصد ہی صرف روپیہ جمع کرنا ہے۔ ان میں سے سات مذاہب تو ایسے ہیں جو لمیٹڈ کمپنی کے انداز پر چلائے جاتے ہیں۔ ان مذہبی فرقوں اور جماعتوں کی نگرانی کے لئے ایک قانون بھی ہے، لیکن اُس میں اصلاح کی کافی ضرورت ہے، اس لئے مسٹر متسودا وزیر تعلیم کا ارادہ ہے کہ اُن کی معقول اور مکمل نگرانی کے لئے عنقریب ایک مؤثر قانون بنائیں۔

اگرچہ جاپان کے مذاہب کے متعلق کتابوں پر کتابیں لکھی جا سکتی ہیں، لیکن اس مختصر سی کتاب میں تفصیل کے ساتھ ان سب کا تذکرہ کرنے کی گنجائش نہیں ہے، اس لئے میں وہاں کے تین خاص خاص مذاہب کا ذکر کروں گا۔

شنٹو مذہب

شنٹو مذہب کا خاص اصول نیچر اور بزرگوں کی پرستش کرنا ہے، اُن کے کوئی اسّی لاکھ دیوی دیوتا ہیں، لیکن خاص الخاص سورج کی دیوی ہے، جو شاہی خاندان کی جد امجد تصور کی جاتی ہے، اور جس کی نسل ہزار ہا برس سے مسلسل جاپان پر حکمرانی کرتی رہی ہے۔ اگرچہ اس مذہب میں سمندر کی دیوی، ندیوں کی دیوی، پہاڑوں کی دیوی۔ ہوا کی دیوی، آگ کی دیوی، سب تسلیم کی جاتی ہیں، اور قوم کے جانباز سپاہیوں اور شاہی خاندان کے وفادار خادموں کی بھی پرستش ہوتی ہے۔ لیکن شنٹو مذہب کا اصل اصول شاہی خاندان کی سب سے پہلی بزرگ دیوی، اس کے رشتہ داروں اور اس کی اولاد کی پوجا کرنا ہے، اسی عقیدے کا نتیجہ ہے کہ جاپانی اپنے بادشاہ کے سچے وفادار اور اس پر دل وجان سے فدا ہیں۔

شنٹو عبادت کا خاص اصول پاکیزگی ہے، اس لئے مذہباً یہ لازمی قرار دیا گیا ہے، کہ عبادت سے پہلے منہ ہاتھ دھو لئے جائیں، شنٹو پروہت اور پیرو اکثر و بیشتر غسل کیا کرتے ہیں۔ یہ بھی اسی پاکیزگی اور صفائی کے مذہبی اصول کا ثبوت ہے۔ لاش، انسانی خون اور برے خیالات کو ناپاک تصور کیا جاتا ہے، ہر قسم کے قدرتی حوادث مثلاً طوفان، ٹنڈی، وبا۔ آندھیاں زلزلے وغیرہ سے اور قومی آفات مثلاً تیرھویں صدی کے منگولیا کے حملہ وغیرہ سے محفوظ رہنے کے لئے خدا سے دعائیں کی جاتی ہیں۔

شنٹو میں مبادیات مذہب کا کوئی باضابطہ نظام نہیں ہے، در اصل یہ صحیح معنوں میں کوئی مذہب نہیں ہے۔ بلکہ ایک حلقہ ہے، جس میں تیرہ فرقے ہیں، یہ انسانی ضمیر کو دیوتا تصور کرتا ہے، اور اس کا خاص حکم یہی ہے کہ "اپنے اندر کی سچی آواز کی پیروی کرو" عالم جاودانی کی بھلائیوں اور عالم فانی کی برائیوں کی نسبت اس کی تعلیم واضح نہیں ہے، لیکن یہ صاف صاف تسلیم کیا گیا ہے کہ روح اس دنیا کی موت کے بعد بھی زندہ رہتی ہے، شنٹو مذہب میں رہبانیت کو دخل نہیں ہے، اس کے پروہت بھی عوام کی طرح ازدواجی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور گوشت کھانے سے پرہیز نہیں کرتے، عورتیں بھی مندروں اور مزاروں پر ناچتی گاتی ہیں، لیکن فقیری نہیں لیتیں، دیوتاؤں کو عموماً چاول، پھل، ترکاریاں اور خاص خاص مواقع پر کپڑا بھی چڑھایا جاتا ہے۔

دسمبر ۳۲ء میں جاپان خاص میں آئسے کے بڑے مندر سے لے کر چھوٹے چھوٹے مندروں تک ہر قسم کے کل ۱۱۰۲۸۳ مندر تھے۔ شنٹو کے تیرہ فرقوں میں تیشہ فرقہ اور شنیری فرقہ زیادہ مقبول ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے ۴۰ لاکھ سے زیادہ پیرو ہیں۔ اس کے بعد آنتاگے فرقہ کے ۲۰ لاکھ پیرو ہیں، پھر شنزی اور شنٹو فرقوں کا نمبر ہے، جن میں سے ہر ایک کے دس لاکھ پیرو ہیں۔ غرضکہ باقی آٹھ فرقوں کو شامل کرکے شنٹو مذہب کے پیروؤں کی مجموعی تعداد ۱۰۷۲۰۵۰۰۳۷۴ ہے۔

بودھ مت

بودھ مذہب ۵۵۲ء میں جاپان میں آیا، جب کہ کوداراا (کوریا) کے بادشاہ نے اپنے یہاں کی طوائف الملوکی سے پریشان ہو کر جاپان کی امداد چاہی۔ اور جاپان کے بادشاہ کنی کو سوتر (مقدس کتب) اور مورتیاں تحفہ میں پیش کیں، علماء نے ان کتابوں کو پڑھا اور ان پر عمل شروع کیا۔ اور صناعوں اور کاریگروں نے ان مورتیوں کو دیکھا اور فن سنگ سازی میں اُن کی پیروی کی، بادشاہ نے خود اپنے وزیر کو ہدایت کی کہ اس نئے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کرے۔ پھر کوئی پچاس برس کی سخت جد و جہد کے بعد شاہ سوئیکو کے دور میں (۵۹۲ء تا ۶۲۸ء) شہزادہ شنٹونکو نے بودھ مذہب کو تمام سلطنت میں مقبول و مستحکم بنایا، بودھ مت کو جاپان میں مقبول عام بنانے کے سلسلے میں شنٹونکو نے وہی خدمت انجام دی جو ہندوستان میں اشوک نے اور سلطنت روما میں عیسائیت کی تبلیغ کے سلسلے میں قسطنطین نے انجام دی تھی، اسی لئے اکثر اسے جاپان کا قسطنطین کہا جاتا ہے۔

سب سے پہلا بودھ فرقہ ۶۲۴ء میں شروع ہوا، اس کے بعد اور فرقے بنے، لیکن ۱۴۰ برس تک اس کا تخیل بالکل چینی رہا۔ پھر شانچو بانی تندائی فرقہ اور کوکئی بانی شنگن فرقہ نے اسے قومی رنگ دیا، یعنی

یعنی شنٹو مذہب کے دیوتاؤں کو بودھ اور بودستو کا مظہر مان لیا، اس طرح بودھ اور شنٹو مذہب ایسے مل جل گئے گویا ایک ہی مذہب کے دو رُخ ہیں اس کے بعد بودھ مت نے پورا عروج حاصل کیا، اور اس کے دو مرکز بن گئے نارا کے قریب کویا پہاڑ کی خانقاہ میں شنگن فرقے کے مخفی فلسفے کی تعلیم دی جاتی تھی، اور کیوٹو کے پاس ہئی پہاڑ کی خانقاہ میں تندئی فرقہ کی تلقین کی جاتی تھی۔

۱۹۳۰ء میں بودھ مت کے پیرؤں کی تعداد ۴۰،۷۹،۰۰۱۴ اور مندروں کی تعداد ۳۲۲۳۷۰۰۱ تھی، اب سب سے بڑا فرقہ شِن ہے، جس کے ایک کروڑ تیس لاکھ پیرو ہیں۔ اس کے بعد زین فرقہ کا نمبر ہے جس کی تین شاخیں اور ۹۰ لاکھ پیرو ہیں۔ پھر شنگن فرقہ ہے، جس کے ۸۰ لاکھ پیرو ہیں۔ پھر جوڈا اور نچیرن ہے، جس میں سے ہر ایک کے تیس لاکھ ماننے والے ہیں۔ اس میں سے ہر فرقہ کے مبادیات بیان کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ اول الذکر اور آخر الذکر (شِن اور نچیرن) فرقے سب سے زیادہ جمہوریت پسند ہیں۔ بہرحال ہندوستان کے علماء نے اکثر یہ کہا ہے کہ ہندوستان میں جہاں مہاتما بدھ نے جنم لیا تھا اُن سے اتنی عقیدت کا اظہار نہیں کیا گیا جتنا جاپان میں ہوا۔

جاپان والے مذہب کے پابند ہیں، اور اپنے مندروں اور مزاروں کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ آپ جہاں جائیں مندر اور مزار ضرور ملیں گے، اس کے باوجود بعض سیاح یہ کہتے ہیں کہ وہ مذہب کی زیادہ پروا نہیں کرتے، عبادت کے لئے کوئی خاص دن مقرر نہیں ہے۔ اس لئے عموماً ساتوں دن دوکانیں کھلی رہتی ہیں، اور کاروبار جاری رہتا ہے، البتہ بعض دوکانیں مہینہ میں دو بار بند ہوتی ہیں۔ تاکہ ملازمین کو آرام کا موقع مل جائے، مندروں میں عیسائیوں کی طرح عبادت کا کوئی باضابطہ طریقہ مقرر نہیں ہے۔ لوگ اکثر تنہا یا چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں درشنوں کے لئے جاتے رہتے ہیں۔ شنٹو مندر میں تو یہ طریقہ ہے کہ لوگ خاص دروازے کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ گھنٹی کی ڈوری کھینچ کر اسے بجاتے ہیں۔ پھر تین بار تالی بجا کر گویا دیوتا کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے ہیں۔ اس کے بعد کچھ نذرانہ صندوقچی میں ڈالتے ہیں۔ سر جھکا کر دعا کرتے ہیں اور واپس چلے آتے ہیں۔ بودھ مندر میں پہلے ایک چھوٹی سی لکڑی سے گھنٹہ بجاتے ہیں، تاکہ دیوتا اُن کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ اُن کے ہاتھوں میں ایک گلدستہ ہوتا ہے اُسے گھماتے جاتے ہیں اور دعا مانگتے ہیں، اس میں صرف آدھ منٹ صرف ہوتا ہے اور بظاہر اس سے ایک لاپرواہی ثابت ہوتی ہے۔ لیکن چاہے شنٹو مندر ہو یا بودھ مندر، حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ ان کا بے انتہا احترام کرتے ہیں۔ کوئی بودھ جب شنٹو مندر کے سامنے سے گزرتا ہے تو اپنی ٹوپی اُتار کر ایسے ہی جھک جاتا ہے جیسے وہ بودھ مندر کے سامنے جھکتا ہے۔ اسی طرح ایک شنٹو جب بودھ مندر کے سامنے آتا ہے تو بالکل اپنے مندر کی طرح اُس کا بھی احترام کرتا ہے۔

جاپانی اپنے مذہب کے بڑے پابند ہیں، لیکن اُس کے ساتھ دوسرے مذہب والوں سے انتہائی روا داری کا سلوک کرتے ہیں، ہر بہار و خزاں کے زمانے میں یاتریوں کے غول کے غول صاف شفاف کپڑے پہنے ہوئے مندروں کے درشن کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، یہ منظر بھی کتنا خوشگوار ہوتا ہے۔

جاپانی اُن ہزاروں لاکھوں مندروں اور مزاروں کو اپنی پشت پناہ تصور کرتے ہیں، اور خواہ وہ روزانہ درشن کے لئے نہ جائیں لیکن عقیدہ یہی رکھتے ہیں کہ یہ مقدس مقامات مختلف دیوتاؤں کے اور ان کے درمیان کی ایک کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ سالانہ مذہبی تیوہاروں اور مختلف تقریبوں کا بڑے ذوق شوق سے انتظار کرتے ہیں، کیونکہ اُن سے مذہبی ہدایات کے علاوہ ایک جگہ جمع ہونے، گھومنے پھرنے مختلف چیزیں خریدنے، غرضکہ خود تفریح کرنے اور بچوں کو بہلانے کا اچھا موقع ملتا ہے۔

عیسائی مذہب

تقریباً ایک صدی تک یعنی ۱۵۴۹ء سے ۱۶۳۸ء تک رومن کیتھولک مشنری جاپانیوں کو عیسائی بنانے کی کوشش کرتے رہے۔ ۱۵۴۹ء میں سوسائٹی آف جیزس کے ایک بانی فرانسیس اکسیویئر یہاں آئے تھے، اور ۱۶۳۸ء میں تمام مشنری یہاں سے نکال دیئے گئے، ۸۹ برس کے اس عرصے میں تقریباً دو لاکھ جاپانی عیسائی ہو گئے ان میں بڑے بڑے جنرل اور اعلیٰ طبقے کی تعلیم یافتہ خواتین بھی شامل تھیں۔ شروع شروع میں نوبوناگا

نے ان کی حمایت کی. پھر ہدے یوشی نے ان پر چند پابندیاں عائد کیں، اس کے بعد آئیے یاکو نے اُن کی تمام سرگرمیاں سختی سے روک دیں۔ بالآخر وہ جاپان سے خارج کر دئے گئے ۱۶۳۲ء میں کیوشو کے ۲۰ ہزار عیسائیوں نے طرح طرح کے مظالم کے خلاف بغاوت کی، یہ شیبارا کے غدر کے نام سے مشہور رہے۔

اس کی وجہ کچھ تو مقامی بدنظمی تھی، اور کچھ مذہبی اختلافات، چونکہ عیسائی مشنریوں نے غیر معمولی جوش و خروش کا اظہار کیا، اس لئے خواہ مخواہ بادشاہوں کے رویہ میں سختی پیدا ہوتی تھی۔ بہرحال ۱۶۳۸ء میں عیسائیوں کے قتل عام کے بعد یہ غدر ختم ہوا، اس واقعہ سے ظاہری طور پر جاپان میں دو صدی کے لئے عیسائیت کا قلع قمع ہوگیا۔ کیونکہ ہسپانوی اور پرتگالی مشنریوں کے بنائے ہوئے رومن کیتھولک عیسائیوں کے سوا اس وقت وہاں اور کوئی عیسائی نہ تھے، بالآخر ۱۶۳۹ء میں عیسائیت کا خاتمہ کر دیا گیا، اس کے بعد جو عیسائی بچ رہے اُن پر طرح طرح کے مظالم توڑے گئے سینکڑوں کو صلیب دی گئی۔ اور ہزاروں کو زندہ جلا دیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود کیوشو کے علاقہ میں عیسائیت کبھی بیخ و بنیاد سے فنا نہیں ہوئی، بلکہ خاموشی سے اپنا کام کرتی رہی، اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب ۱۸۶۵ء میں ناگاساکی میں رومن کیتھولک گرجا تعمیر ہوا، اور عیسائیوں کی تلاش شروع ہوئی تو ہزاروں عیسائیوں نے اپنے اس مذہب کا علی الاعلان اقرار کیا، جسے وہ پشتہا پشت سے اپنے دلوں میں محفوظ رکھے چلے آئے تھے۔

اس کے بعد ۱۸۵۹ء میں پھر رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مشنریوں کو اپنا کام شروع کرنے کی آزادی ملی۔ لیکن شروع شروع میں اُنھیں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، ۱۸۷۳ء میں عیسائیت کے خلاف تمام امتناعی احکامات واپس لے لئے گئے۔ بالآخر ۱۸۸۹ء کے آئین کے مطابق سب کو مکمل مذہبی آزادی مل گئی۔

۱۹۳۶ء میں جاپان میں عیسائیوں کی تعداد ۲۰۵۴۰۳۰۸ تھی، اُن میں زیادہ تر رومن کیتھولک ہیں، اب ان کی مالی حالت بھی اچھی ہے، اور اُن کے تمام گرجا فارغ البال ہیں۔

کاش ہمارے مذہبی رہنما ایک مرتبہ جاپان کا دورہ کریں اور اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ وہاں کتنی مذہبی رواداری ہے، اور اس کے مقابلہ میں ہندوستان میں اُن کی بدولت مذہب کس طرح بدنام ہو رہا ہے۔ اگر جلد اُنھوں نے اپنے اطوار نہ بدلے تو اندیشہ ہے کہ یہاں کے لوگ بھی روس کی طرح مذہب سے متنفر ہو جائیں گے۔

پیغامِ وطن

طبقۂ حکام رس کی خدمت میں

اے معزز طبقۂ حکام رس ۔۔۔ اے گروہِ کامگار و کام رس
اے حکومت کی نظر میں لائقو ۔۔۔ اے وفاکیشی میں سب پر فائقو
اے اصولِ زرکشی پر عاملو ۔۔۔ اے حصولِ منفعت میں کاملو
اے خوشامد کے ہنروں سے واقفو ۔۔۔ اے غلامی کے گُروں سے واقفو
اے اجانب سے وفا پر مائلو ۔۔۔ اے وطن کی مخلصی کے حائلو
اے خلاصی کی لگن کے دشمنو ۔۔۔ اے خود اپنے ہی وطن کے دشمنو
اے بدیسی چال سے ناواقفو ۔۔۔ اے خود اپنے حال سے ناواقفو
اے ہمارے دشمنوں کے دوستو ۔۔۔ اے ہمارے گوشتو اے پوستو

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

میں نے یہ مانا کہ تم لائق بھی ہو ۔۔۔ فرد بھی، ممتاز بھی، فائق بھی ہو
تم خطابوں سے بھی سرافراز ہو ۔۔۔ مقتدر عہدوں پہ بھی ممتاز ہو
تم کسی سے مال میں بھی کم نہیں ۔۔۔ اوج یا اقبال میں بھی کم نہیں
ملک کے صاحب وقاروں میں بھی ہو ۔۔۔ سلطنت کے دوستداروں میں بھی ہو
موردِ الطاف سرکاری بھی ہو ۔۔۔ آلۂ کارِ ستمگاری بھی ہو
اختیاراتِ ستم رانی بھی ہیں ۔۔۔ فوجداری بھی ہیں دیوانی بھی ہیں
اِس طرف تقدیرِ سیم و زرفشاں ۔۔۔ اُس طرف صاحب بہادر مہرباں
ٹھیک ہیں، جو جو اُمنگیں جی میں ہیں ۔۔۔ خوبیٔ قسمت سے پانچوں گھی میں ہیں
لیکن اک تشویش اک اُلجھن میں ہوں ۔۔۔ کیا اجازت ہے کہ اِتنا پُوچھ لوں
~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

تم ہیں سو گُن، تم میں لاکھوں رکھ رکھاؤ
تم سبھی کچھ ہو، مگر یہ تو بتاؤ

لب پر آہِ سرد بھی ہے یا نہیں
دل میں قومی درد بھی ہے یا نہیں

قوم مدت سے ذلیل و خوار ہے
مُلک مُدت سے مصائب زار ہے

ابتلا پر ابتلا ہے، اور مُلک
ازدحامِ صد بَلا ہے اور مُلک

آفتیں ہیں اور دُنیائے وطن
شامتیں ہیں اور ابنائے وطن

جس کو دیکھو، بندِ آفت کا اسیر
جس کو پوچھو بینوا مفلس، فقیر

کوئی بیکاری کے غم سے جاں بلب
کوئی ناداری کے سَم سے جاں بلب

مُلک کا مُلک آفتوں سے ادھ مُوا
قوم کی قوم اور غُلامی کا جُوا

دوستو! وہ پاسِ عزّت کیا ہوا
وہ سرِ احساسِ عزّت کیا ہوا

یوں نہ بے شرمی کی مٹّا نی چاہیئے
اب تمھیں بھی غیرت آنی چاہیئے

شرم کھو کر وقت ٹالا بھی تو کیا
پت ڈبو کر پیٹ پالا بھی تو کیا

زیست کا لطف آبرو کے ساتھ ہے
اور اپنی عزّت اپنے ہاتھ ہے

خودکشی کرنے سے کچھ حاصل نہیں
جیتے جی مرنے سے کچھ حاصل نہیں

جورِ باطل سے نہ ڈرنا چاہیئے
حق پہ جینا، حق پہ مرنا چاہیئے

قوم کے یارو مدد کا وقت ہے
مُلک کے پیارو مدد کا وقت ہے

آؤ کارِ نیک میں سبقت کریں
آؤ مُلک و قوم کی خدمت کریں

آؤ قومی درد کا درماں کریں
آؤ مُلکی مشکلیں آساں کریں

آؤ ہر بندِ فلاکت کاٹ دیں
آؤ ہر غارِ ہلاکت پاٹ دیں

آؤ پھر تا منزلِ مقصد بڑھیں
آؤ پھر تا بامِ آزادی چڑھیں

آؤ پھر مِل جُل کے جانیں آڑ دیں
آؤ پھر عزّت کے جھنڈے گاڑ دیں

آؤ قومی غم کی شب دن کر دکھائیں
آؤ ناممکن کو ممکن کر دکھائیں

دوستو! آزاد نے بالکل کھُلا
تم کو پیغامِ وطن پہونچا دیا

اب قبول و رَد کے تم مختار ہو
اپنے نیک و بد کے تم مختار ہو

از۔ آزاد انصاری

مبتلائے محبت ہونے پر

مترجمہ معین الدین حسن بی اے، کاکوری

(رابرٹ لوئی اسٹیونسن کے ایک دلپذیر اور دلکش مضمون (　　) کا ترجمہ)

"میرے مالک یہ فانی انسان بھی کیسے احمق ہوتے ہیں" (شیکسپیر)

انسان کی زندگی کا صرف ایک سانحہ ایسا ہے جو اُس کے بنے بنائے اصول کو آن کی آن میں مٹا کر اُسے واقعی حیرت و سراسیمگی میں مبتلا کر جاتا ہے اور بھی ہزاروں واقعاتِ زندگی ہیں، لیکن نہ تو ان میں کوئی غیر متوقعہ پریشان کن بات ہوتی ہے اور نہ وہ کسی گہرے شدید جذبے کے ماتحت ہوتے ہیں، زندگی کے لیل و نہار میں یک رنگی اور ہر آنے والا دن گزرے ہوئے دن سے مشابہ ہوتا ہے، ہم راہ و رسم دوستی میں اپنے محبوب دوستوں کی حیلہ نوازیوں اور غفلت شعاریوں کے خوگر ہو جاتے ہیں اور جب کوئی ایسی بات پیش آجاتی ہے تو اُس کے لئے ہمہ تن تیار۔ لیکن رازِ محبت کی کنہ و حقیقت نہ تو ذہن رسا اور نہ دوسروں کے تجربوں ہی سے ایک حق جو کی سمجھ میں آسکتی ہے، میرا خیال ہے کہ محبت کے مسئلے پر ایک انسان جب تک خود دل پر چوٹ نہ کھائے نہ تو صحیح طور پر کچھ سوچ سکتا اور نہ لکھ ہی سکتا ہے، ایک فرانسیسی فلسفی کے بارے میں مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے، ایک دفعہ وہ اپنے حلقۂ احباب میں محبت کے موضوع پر مصروفِ بحث تھا، اُس کے دوستوں نے اُس پر اعتراض کیا کہ حضرت آپ تو محبت سے ہنوز ناآشنا ہیں، یہ سُننا تھا کہ وہ دوستوں کے مجمع کو چھوڑ چھاڑ چل کھڑا ہوا، اس تہیے کے ساتھ کہ اب وہ آئے گا تو چوٹ ہی کھا کے آئے گا، تھوڑی دیر کے بعد وہ یہ کہتا ہوا نمودار ہوا کہ اب میں اس قابل ہو گیا ہوں کہ بحث کے سلسلے کو جاری رکھ سکوں، شاید اُس نے عشق کے مسئلے پر ایک غائر اور عمیق نظر ڈالنے کی زحمت کبھی گوارا نہیں کی بہر حال یہ واقعہ ہمیں صحیح طور پر فکر کی دعوت دیتا ہے، اور اس مضمون کے ناظرین کے لئے نہایت ہی سبق آموز،

آخر کار جب چشمِ باطن سے پردے اُٹھ جاتے ہیں اور انسان کی آنکھ عاشق ہو کر کھلتی ہے تو وہ اپنی قلب ماہیت سے حیران اور سراسیمہ ہو کر رہ جاتا ہے، ابھی تک تو اُس کے احساسات میں سکون اور جذبات میں اعتدال قائم تھا، لیکن محبت کے بعد بزم ہستی میں اک طوفان بپا ہو جاتا ہے، قلب میں وہ تڑپتی ہوئی تمناؤں اور بے قرار آرزوؤں کا ہجوم، ایسے ایسے محتاج اثر و درد شوق اور خلشِ غم کے امکانات پاتا ہے کہ جن کا گمان اور تصور بھی کبھی اُسے نہ ہوا ہوگا، اس دنیا میں ہر شے منطق اور استدلال کے تحت وقوع پذیر ہوتی ہے۔ تنہا محبت کی کرشمہ سازیاں اور فسوں کاریاں عقل و منطق کے ذریعوں سے بے نیاز اور بالاتر ہیں۔ محبت کے اثرات اور وجوہ بے حد حیرت افزا اور تحیر خیز ہوتے ہیں۔ دو ہستیاں ممکن ہے کہ اُن میں سے ایک بھی نہ محبت کے کرنے کے قابل ہو، نہ بہت قبول صورت، آپس میں یک جا ہوتی ہیں۔ ذرا دیر باہم محو تکلم رہتی ہیں، اک دوسرے سے نظر سے نظر ملا کر وارداتِ قلب کا جائزہ

لیتی ہیں اور عاشق محبوب کی اداؤں اور اُس کے حُسن کی کافرناجزائی سے مسحور ہو کر پکار اُٹھتا ہے۔

ہم نے پالا مدّتوں پہلو میں، ہم کوئی نہیں
تم نے دیکھا اک نظر سے دل تمہارا ہو گیا
(تسلیم)

ایسے مواقع اُن کی زندگی میں بارہا آئے ہوں گے، بغیر کسی خاص نتیجے کے، لیکن اس مرتبہ تو دلوں کی دُنیا ہی بدل جاتی ہے، اور وہ اُس عالم میں پہونچ جاتے ہیں، جہاں ایک کی ہستی دوسرے کی مرکزِ تمنا۔ اُس کی زندگانی کا حاصل بلکہ کل کائنات کی وجہِ تخلیق بن جاتی ہے اور اُن کی آن میں عمر بھر کے اصول اور جان سے زیادہ عزیز نظریوں کو اپنے برق پاش تبسم سے خاک میں ملا دیتی ہے ؎

پھر آ کے اُس نے کفر کا اقرار لے لیا
مُدّت ہوئی تھی دل کو مسلماں کئے ہوئے
جوشؔ

ہمارے خیالات اور مشاغل زندگی اپنے پیکرِ محبت سے کچھ اس طرح منسلک اور وابستہ ہو جاتے ہیں کہ زندگی کی ادنیٰ ادنیٰ سی مصروفیتیں ہماری نظر میں ایک خاص اہمیت رکھنے لگتی ہیں، زندگی سے خود لطف پیدا ہو کر دل میں یہ تمنا مچلنے لگتی ہے کہ کاش اپنے محبت آفریں کے ساتھ ہمیشہ وقفِ نشاط اور اس گلشنِ حیات میں ہمیشہ مصروفِ گلگشت رہیں۔

یا زندگی سے الفت پیدا ہونے کے خیال کو ظالم جگرؔ کس انداز سے ادا کر گیا ہے ؎

ترے حُسنِ حیات افروز کو جس دن سے دیکھا ہے
بہت مجھ کو عزیز اُس دن سے اپنی زندگانی ہے

اس رنگینی و شوخی کے عالم میں جب دو روحیں مصروفِ راز و نیاز ہوتی ہیں، اک دوسرے کو دادِ عشق دیتی ہیں تو اُن کے دوست آشنا آپس میں متعجب ہو کر اُن کی آشفتگیٔ عشق پر انگشت بدنداں ہوتے ہیں۔ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرتے ہیں، کوئی کہہ اُٹھتا ہے کہ فلاں شخص نے فلاں عورت میں کیا خاص بات دیکھی، یا فلاں عورت اس شخص پر کیوں اس طرح جان چھڑکنے پر آمادہ ہے، اکثر یہ نکتہ چیں حضرات پوچھ بھی بیٹھتے ہیں ؎

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانئے تو نے اُسے کس آن میں دیکھا

میں سچ کہتا ہوں کہ میری سمجھ میں خود یہ بات نہیں آتی کہ صنفِ نازک کو کیا ہو جاتا ہے اور وہ کس طرح اِس جنونِ محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے، اگر اپالو (سورج کا دیوتا) باصد ہزار رعنائی و زیبائی اپنے اوج و رفعت کے تخت سے اُتر کر اُسی شانِ خداوندی کے ساتھ اس دنیا میں جلوہ گر ہو جائے تب یہ ایک حد تک ممکن بھی ہے، ورنہ یہ کریہ المنظر یہ قابلِ نفرت انسان۔ توبہ کیجئے! بھلا اس میں کوئی تو محبت کے قابل ہوتا! کسی کتاب میں بھی میری نظر سے نہیں گزرا، کہ عالمِ شباب میں (Goethe) "گوئٹے" اور "لی نارڈو ڈی ونسی" کے علاوہ انسانوں میں کوئی محبت کے قابل ہوا ہو۔

ہاں عورتوں کی سیرت و صورت کے متعلق میری رائے اس کے بالکل برعکس ہے، لیکن یہ شاید اس وجہ سے کہ قدرت نے مجھے مرد بنا دیا ہے۔

بہت سے زندگی کے امور ایسے ہیں جن میں آپ قضا و مشیت پر بھی ایک حد تک قادر ہو سکتے ہیں۔ بلند خیالی، ذوقِ سرفرازی، اور عالی حوصلگی، ایک شخص کو اُس کے دلی مقاصد اور آرزوؤں سے ہم کنار کر سکتی ہے، لیکن مبتلائے عشق ہو جانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں خصوصاً وہ زرد چہروں والے لاغر اندام اور فیشن پرست حضرات جو بعد شان و وقار اس کرّے کو آباد کئے ہوئے ہیں، اُن میں ایک بھی اس قابل نہیں کہ اُس سے محبت کی جا سکے۔ سچ عرض کرتا ہوں، ایک بھی نہیں جس طرح ایک بھیگے کپڑے پر آگ دکھانے کا کوئی اثر نہیں ہوتا جس طرح ایک کورِ چشم سے یہ امید کہ وہ رُومانی اور رنگین مناظر سے لطف اندوز ہو سکتا ہے ایک خیالِ محض ہے، اسی طرح ان حضرات سے یہ اُمید رکھنا کہ ان میں عشق و محبت کی بھی صلاحیت ہو سکتی ہے، اک خیالِ خام ہے، علاوہ بریں اکثر محبت کرنے والی ہستیاں اک دوسرے سے محرومِ ملاقات رہتی ہیں، اور اگر ملتی بھی ہیں تو اُس وقت جب اُن کا ستارا موافق نہیں ہوتا، پھر اگر نیک ساعت میں یہ عشق والے ملے بھی تو اظہارِ محبت کی نازک اور فیصلہ کُن گھڑی کا سامنا ہوتا ہے، محبت کے بہت سے واقعات فطری شرمیلے پن یا موقع نہ ملنے کے باعث اظہارِ محبت سے پہلے ہی تمام ہو جاتے ہیں، ایک ذی عقل ہے جو موقع اور محل دیکھ کر اظہارِ عشق کرتا ہے اور کامیاب ہو جاتا ہے، دوسرا ہے کہ رفتہ رفتہ

دل گدبر کرتا ہے اور اصرارِ پیہم سے آخر قبولیت حاصل کر لیتا ہے۔ شاید ہی صنفِ نازک میں کوئی ایک ایسی ہستی ہو جو ایسے شخص سے شادی کرنا پسند نہ کرے۔ بیشک وہ شخص قابلِ قدر ہے جس میں ثابت قدمی کی صلاحیت ہو، اس لئے کہ یہ شادی کی التجائے پیہم کچھ اخلاق کو گرا دیتی ہے، اور اکثر ایسی زبردستی کی شادیاں کامیاب بھی نہیں ہوتیں، دو محبت کرنے والی ہستیوں کو جذبۂ عشق سے از خود رفتہ ہو کر دوسرے کے لئے آغوش وا کر دینا چاہئیے۔ معراجِ محبت یہی ہے کہ دو ہستیاں لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے شاہراہِ محبت پر مصروفِ خرام ہوں۔ ہاں! بالکل اُسی طرح جیسے کسی تیرۂ و تاریک کمرے میں دو شخص ناہموار اور مبہم احساس کے ساتھ ایک دوسرے کے لئے گرمِ تلاش ہوتے ہیں، ملنے کے لئے آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہیں ؎

رہنما کی کیا ضرورت شوقِ کامل چاہئیے
دل جہاں تڑپے، سمجھ لینا وہی ہے کوئے دوست

ایسے مواقع پر اظہارِ عشق کی چنداں ضرورت نہیں۔ اُن کے خیالات میں ایسی ہم آہنگی ہو جاتی ہے کہ جو ایک کے دل پر گزرتی ہے، اُس کی اطلاع معاً دوسرے کو بھی ہو جاتی ہے، ایک کے جذبات کا پرتو دوسرے کے دل پر نظر آتا ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا
غالبؔ

زندگی کا آفتاب جس وقت لبِ بام ہوتا ہے، جوانی کی دوپہر ڈھل کر بڑھاپے کی پُرماتم اور المناک رات کی ابتدا ہوتی ہے، جذبات میں افسردگی، عناصر میں اعتدال باقی نہیں رہتا، اُس وقت محبت کی شرابِ رنگیں، جذبات کو از سرِ نو جگا دیتی ہے، یہ وہ دولتِ بیدار ہے جو پژمردہ قلب میں رنگین خیالات اور تازہ اُمنگیں پیدا کر دیتی ہے، تازہ بتازہ نو بنو آرزوؤں کا سیلاب دل میں اُمنڈ آتا ہے، اور نت نئی تمناؤں کی یورش سے دل میں ہلچل سی مچ جاتی ہے، محبت کی چوٹ سے پیشتر انسان، احساسِ درد سے بے پروا، سوزِ غم سے ناآشنا رہ کر جہانِ رنگ و بُو کی لطافتوں سے اس طرح بے نیاز ہوتا ہے گویا دُنیا میں اُن کا کہیں وجود ہی نہیں ہے، اس طرح وہ زندگی کی پُرشور رہگزر میں اس دنیا کی دلفریب دلچسپیوں سے دُور رہتے ہوئے ایک احساسِ پندار کے ساتھ اپنی دنیا آپ تعمیر کر لیتا ہے، لیکن نیشِ عشق سے تڑپ اُٹھنے کے بعد اُس کے خیالات کی دُنیا میں ایسی ہی تبدیلی ہو جاتی ہے، جیسے سینٹ پیٹر کے خیالات میں عیسائیت قبول کرنے کے بعد انقلاب برپا ہو گیا تھا۔

دل جو کچھ مدت پیشتر اپنی معمولی رفتار سے جنباں تھا، بہ یک جنبش زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے، نبضوں میں خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے اور اُسے یہ محسوس ہوتا ہے گویا اس سے پہلے نہ اُس میں احساسِ شنوائی تھا اور نہ بینائی کی طاقت۔ حضرتِ جوشؔ نے جوشِ محبت کے کیفیات و واردات کتنے دل کش انداز اور کتنے دھڑکتے ہوئے لفظوں کے لباس میں اپنی نظم "جوانی کی ستم رانیوں میں" ادا کیا ہے، مجھے اجازت دیجئے کہ اس کے چند اشعارِ رنگیں آپ کو سنا دوں ؎

کسی کے مسکراتے ہی یکایک دیکھتا کیا ہوں
کہ میں گویا ہزاروں بجلیوں کی زد میں بیٹھا ہوں
کلیجہ ہل رہا ہے اشتیاقِ کامرانی کا
وہ عالم ہے غرورِ حسن پندارِ جوانی کا
نظر سے حال اوجھل ہو گیا ماضی نے منہ ڈھانپا
سنی آوازِ مستقبل، اُڑے اوسان، دل کانپا
یکایک بزمِ ہستی میں وہ طوفاں ہو گیا برپا
جو کانوں نے سنا تھا اور نہ آنکھوں ہی نے دیکھا تھا
نرالا درد، انوکھی کشمکش ناآشنا ہلچل
نظر ملتے ہی میرے دل میں گرجے سینکڑوں بادل،
جہاں کا ذرہ ذرہ دیدۂ حیراں نظر آیا
میں خود اپنے کو اک بدلا ہوا انساں نظر آیا
وہ بھڑکی آگ سینے میں رگ و پے کو تپا ڈالا
زباں سے میری یہ بے ساختہ نکلا "جلا ڈالا"
دکھائی اک نئی دنیا نے کچھ یوں اپنی برباڈی
یکایک آ رہے چشمِ کور میں جس طرح بینائی

الغرض زندگی کے گزشتہ واقعات ماضی کے نقوشِ خیال کے پردۂ سیمیں پر

ایک بھولے ہوئے خواب کی طرح نظر آجاتے ہیں، قلب احساس درد سے اتنا چُور، اور نورِ عشق سے اس قدر بے چین اور بیتاب ہوجاتا ہے کہ انسان کو اُن کے برداشت و ضبط کا یارا نہیں رہتا۔ بسا اوقات طرح طرح کی وارفتہ ادائیں اور انوکھے مشاغل اختیار کرلیتا ہے، اکثر تنہائی کے لمحات میں مستیٔ عشق کے کیف سے پہروں آپ ہی آپ مسکرایا کرتا ہے، اور کبھی کسی خیال میں کھویا ہوا گھنٹوں، چاند اور ستاروں کی طرف تکتا رہتا ہے، یہ ایک نثر نگار کے اختیار میں کہاں کہ وہ اس والہانہ جذبے کا مرقع الفاظ کے ذریعے سے کھینچ سکے۔ ٹینی سن ( ) اور ہین (نے اپنی پُر جذبات نظموں میں۔ اس کیف رنگین کو کامیاب انداز میں ادا کیا ہے، رومیو اور جولیٹ بھی انتہائی وارفتگی کے ساتھ ایک دوسرے پر فریفتہ تھے، غرض اس موضوع پر شاعری میں تشنگانِ ذوق کے لئے سامان سیرابی مہیا ہے، اگر ہمارا سازِ دل مضرابِ محبت کی جنبش کا منتظر ہے، اور عشق کے نغمے اُس کے تاروں سے نکلنے کے لئے مضطر اور بے چین ہیں تو پھر ہم وادیٔ محبت کی پُر لطافت فضا، اور دیارِ عشق کی رعنائی اور زیبائی کا نظارہ کرتے ہوئے خوش آیند امید دل۔ دھڑکتی ہوئی تمنائیں اور لطف آمیز خلشِ غم کے مزے لُوٹ سکتے ہیں۔

پہلی ہی نظر میں جو احساساتِ عشق دل میں گھر کرلیتے ہیں، اُن کی مصوری ذرا مشکل ہے، زندگی کے ہر پہلو میں مسرت اور سرور کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ وہ چاہے خواب ہو کہ بیداری، حرکت ہو کہ سکون، محبت کے خیالات رنگین دل کی دنیا کو بسائے رہتے ہیں۔ محبت کی تڑپ، نیشِ عشق کی سوزش سے کچھ محبت کرنے والوں ہی کو سزا نہیں ملتی بلکہ اس محبت کے جادو سے محبت کرنے والی ہستیاں اس جذبے کو ایک عالم میں پھیلا دیتی ہیں اور پھر لمحاتِ راز و نیاز میں موسم تو سہانا اور خوشگوار ہوتا ہی ہے بقول جگر؎

یہ موجِ دریا، یہ ریگِ صحرا، یہ غنچہ و گل، یہ ماہ و انجم
ذرا جو وہ مسکرا دئے ہیں یہ سب کے سب مسکرا رہے ہیں

وہ اس خیال میں مست رہتے ہیں کہ یہ آفتاب منور اور ضیا پاش ہے تو صرف اُن کی محبت کی بدولت اور اس نیلگوں آسمان کی نیلگونی کو ثبات ہے تو صرف اُن کی محبت کے سبب سے۔

ایک تو گرفتارِ عشق بڑی ہی میٹھی نگاہ سے صنفِ نازک سے پیش آیا ہے، لیکن اس انداز میں کچھ احساسِ غرور و خودی بھی شامل ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر انسان دنیوی عز و شان کے بلند ترین مناصب مثلاً ڈیوک کا خطاب یا کلیسا کا سب سے بلند مرتبہ حاصل کرلے تو اس کے دماغ میں سودائے تمکنت اور احساسِ پندار پیدا ہی ہوجاتا ہے، عشق سے بڑھ کر سر پھرانے کا سودا اور کوئی نہیں، اک شخص سے جو شدید جذبۂ عشق میں گرفتار ہو سادہ مزاجی بہت مشکل ہوجاتی ہے، معلوم نہیں عورتوں کو مردوں کا یہ انداز پسند ہوتا ہے کہ نہیں۔ ہزاروں واقعاتِ عشق کو دیکھنے کے بعد میری تو آج تک سمجھ میں نہیں آتا کہ عورتوں کا معیارِ پسندیدگی ہے کیا؟

محبت کرنے والے دوسروں کے افسانہائے محبت کو بڑے شوق سے سنتے ہیں اور چاہتے ہیں اوروں کی داستانِ محبت بھی چھڑی رہے، عشق کی یہ فسوں کاریاں اور محبت کی یہ کرشمہ سنجیاں اُن لوگوں کے لئے بھی باعثِ لطف و تفریح ہوتی ہیں جو خود اس مزے سے ناآشنا، اور خلشِ عشق سے بیگانہ ہوتے ہیں، وہ لوگ جنھیں کاروبارِ ہستی سے سر اُٹھانے کی فرصت نہیں ہوتی وہ بھی غروبِ آفتاب کے کافر و دلفریب نظارے سے بیتاب ہو ہی جاتے ہیں۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ اُس شخص کے پہلو میں دردمند دل کے عوض برف کی اک قاش ہے، جسے اس دلفریب جنون سے ہمدردی اور اس جذبۂ رنگین کی ادا نوازیوں سے دلچسپی نہ ہو۔ آپ یوں چاہے کتنے ہی بے حس اور "امن نواز" کیوں نہ ہوں، لیکن یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی جنگ کی شورش کا حال سنکر آپ کی رگوں میں خون کی گردش تیز نہ ہوجائے یا دو روحوں کو کسی کنج میں مصروفِ راز و نیاز دیکھ کر آپ کا دل دھڑکنے نہ لگے۔

یہ احساسِ عشق دوسروں کے لئے مفید ہو یا نہ ہو، لیکن خود ان پرستارانِ الفت کے لئے تو ضرور سامانِ راحت اور پیغامِ مسرت ہوتا ہے۔ اس دردِ شوق کی تفسیر اور اس کے جذبات کا تجزیہ کیسے ہو، پیکرِ محبت کی اک نگہِ بندہ نواز، اُس کے پُرتسکین اور پُرمحبت دستِ رنگین کی خفیف سی تھپک متاعِ صبر و شکیب کو غارت کرکے دل میں تڑپتے ہوئے محسوسات کو جگا دیتی ہے، محبت کے بعد ہماری زندگی نو بہ نو

شاغلِ رنگیں میں بسر ہونے لگتی ہے، جسم کی آرائش و زیبائش کا خیال، حلقۂ احباب میں بہ ہزار انداز و طمطراق جاہ و دبیائی کا شوق، غرض ہر وہ صورت جو اُسے دوسرے کی نظروں میں بڑا ثابت کرسکے وہ اختیار کرتا ہے، ان محبوب مشغلوں سے اُس کا واحد مقصد اپنی ذات کی آرائش و زیبائش نہیں بلکہ ان سب کو وہ "بارگاہِ حسن" میں بطور انتساب پیش کرتا ہے۔ آخر یہ محبت کا جذبہ بڑھتے بڑھتے عاشق کو سراپا بے نیاز ربط و ضبطِ حسن و عشق کر دیتا ہے، اور وہ خشک تکلفات کی حدیں توڑ کر اپنے ذات و صفات کی پنہاں حقیقتوں کو اپنے پیکرِ محبت اور جانِ جان کے سامنے بے نقاب کرکے یہ چاہتا ہے کہ محبوب اس سے اس کی خوبیوں کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف اس کی ذات سے محبت کرے۔ حسن و عشق کی رنگین داستانوں کا بیان بہت دشوار لیکن اس سے مشکل ترکیفیاتِ دلی اور جذباتِ پنہاں کی ترجمانی ہے۔ ہمارے الفاظ کے معنی کچھ کے کچھ پہنا لئے جاتے ہیں، اور اغیار ہمارے اصل مطلب و منشا سمجھنے کے عوض غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور ہم بھی اسے گوارا کر لیتے ہیں، لیکن محبت کے بعد عاشق کی ہر نظر التجائے مجسم ہو کر اور اس کی ہر ادا شکوۂ پیہم ہو کر اپنے محبوب کے دل سے گرد کدورت مٹانے میں کوشاں اور منہمک ہو جاتی ہے۔

زمانۂ گزشتہ کی یاد تازہ اور گزری ہوئی لطافتوں اور رنگینیوں کا تصور کرتے ہوئے دل میں بڑا درد ہوتا ہے، عاشق کا یہ تصور کہ اُس کی زندگی کے کچھ ماہ و سال اُس پیکرِ محبت اور اُس جانِ تمنا کے بغیر صرف ہوئے یا یہ خیال کہ اُس کی ملاقات سے پہلے اُس کے محبوبِ دلنواز نے کسی دوسرے کو نگاہِ محبت سے دیکھا تھا، ایک ایسا بار ہے جو اُس کی عزتِ نفس اور احساسِ خودداری سے اُٹھ نہیں سکتا۔ اور اُسے صرف اپنی ہی زندگی اپنی نظر میں نہیں کھٹکتی، بلکہ محبوب کے عہدِ ماضی کی یاد بھی اُس کی روح پر ایک خلش دوام بن کر رہ جاتی ہے، یہ احساس تو اذیت رساں ہی ہے کہ اُس نے اپنی فراق کی زندگی کے تلخ اور ناخوشگوار دن کسی نہ کسی طرح گزار دئے، لیکن یہ کس قدر دردناک تخیل ہے کہ وہ معشوق جو عاشق کی آرزوؤں کا تنہا مرکز، اُس کی زندگی کا واحد مقصد ہے، وہ کسی دوسرے کی تمناؤں کا خوابِ زریں رہ چکا ہے۔

بہت سے لوگ جذبۂ رشک کو تصنع آمیز اور تکلیف دہ جذبے سے تعبیر کرکے اُسے لائقِ ملامت سمجھتے ہیں۔ یہ مناسب نہیں ہے، اس لئے کہ جذبۂ رشک جس جذبے کے ساتھ پیدا ہوتا ہے وہ محبت اور صرف محبت کا جذبہ ہے۔ محبت بھی رشک کی طرح اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب فطرتِ انسانی اپنے کمال پر ہوتی ہے، محبت اور حبِ وطن کے احساسات قلب میں اُس وقت موجزن ہوتے ہیں جب شباب کی رُکتی ہوئی امنگوں میں بربط و چنگ و ستار کا جوش و خروش پیدا ہو جاتا ہے، محبت تاریخی واقعات کی چھان بین کی تاب نہیں لاسکتی۔ اور کوئی نہیں بتا سکتا کہ اس کی ماہیت اور حقیقت کیا ہے۔ بہرحال رشک آلِ الفت ہے اور آپ اس سے چاہے خوش ہوں یا ناخوش، اس کی موجودگی یقینی ہے۔

جب ہم عاشقی کے زمانۂ ماضی کا تصور کرتے ہیں تو ہمیں اپنی معشوقہ کی طرف سے طرح طرح کے وہم پیدا ہو جاتے ہیں کہ کہیں اُس نے ہم سے پیشتر تو کسی سے معاشقہ نہیں کیا ہے، اُسے خط نہیں لکھے ہیں۔ اور وہ کسی اور کے آغوش کی گرمی تو نہیں بن چکی ہے، ان اوہام سے دل میں کھٹک اور خلش پیدا ہو جاتی ہے، اور پھر ہم یہ تمنا کرنے لگتے ہیں کہ کاش ہماری زندگی کے دور کا آغاز ساتھ ساتھ ہوا ہوتا۔ کیونکہ اُس وقت ایک دوسرے کے جذبات اور احساسات کو سمجھنا سہل تر ہوتا اور اُس وقت نہ ایسے واقعات پیش آتے نہ ایک دوسرے کے خیالات کسی دوسرے کی طرف بھٹکنے پاتے، اور نہ محبت کی رو میں رکاوٹ پڑ سکتی۔ دل کو اطمینانِ کامل ہوتا کہ معشوقہ کی زندگی ہمارے ہی ساتھ بسر ہوئی ہے۔

اکثر لوگوں کو یہ خوف شب و روز، آٹھوں پہر لگا رہتا ہے کہ کہیں موت کے بے رحم ہاتھ ہمیں ہمیشہ کے لئے محبوبۂ حیات آفریں کی محبت سے محروم نہ کر دیں۔ کسی نے کیا خوب لکھا ہے کہ محبت کے اثر سے انسان روح کو لافانی اور زندگی کو جاودانی سمجھنے لگتا ہے، اس لئے کہ اس مختصر عرصۂ حیات اور اس تھوڑی سی زندگی میں اس جذبۂ بے پایاں کی سمائی نہیں، محبت کرنے والوں کے وہم و خیال میں بھی نہیں آسکتا کہ عشق کے تند و تیز جذبات صرف چند ماہ و سال کے لئے ہیں اور بس۔ لیکن مختلف واقعات سے یہ بات ہماری سمجھ میں آجائے گی کہ فی الواقع عشق جاودانی کی تائید دیتا ہے اور یہ خیال ہمارے دل کو ڈھارس دئے رہتا ہے کہ ہم نہ صرف اس دنیا میں بلکہ ایک غیر فانی عالم میں بھی اس جذبۂ شوق سے ہم کنار اور

نوشِ عشق سے لذت یاب ہوں گے،
وہ تیر و کمان والا، نوخیز اور اندھا لڑکا جسے لوگ کیوپڈ کے نام سے یاد کرتے ہیں متبسم باغوں کے بلند گوشوں سے ہنس ہنس کے بہار سے رواں اور فانی قافلۂ حیات پر تیر پہ تیر چلانے میں مصروف ہے، جس عشرت سر سے وہ مصروفِ تیراندازی ہے، اتنی ہی تیک روی سے نسل انسانی کا کھیل بھی تمام ہوتا چلا جا رہا ہے، ابھی ایک نے پیکانِ الفت کی لذتِ خلش اُٹھائی بھی نہ تھی کہ دوسرا نوشِ عشق کی لذت سے پیشتر ہی فنا کے گھاٹ اُتر گیا۔ ابھی یہ زد پہ آیا ہی تھا کہ اسے لیجئے وہ جاتا رہا۔ ابھی ایک تازہ بسمل کو نیشِ عشق گوارا کرنے کی مہلت ملی بھی نہ تھی کہ ان سب زخم خوردگانِ عشق کی زندگیاں بھولے ہوئے فسانے ہو گئیں ؎

ایک عمر چاہئے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذتِ زخمِ جگر کہاں

جب زندگی کی شام فنا کی رات میں تبدیل ہو جاتی ہے، جب وجود عدم کے دامن میں پناہ لیتا ہے جب بازی گاہِ عالم سے سب سامانِ حیات اُٹھا لیا جاتا ہے اور حیات، موت کے دوش پر رختِ سفر باندھتی ہے اُس وقت آپ بجا طور پر پوچھ سکتے ہیں کہ وہ نشۂ عشق سے چور ہستیاں جو محبت کو فنا کے نام سے منسوب و موسوم کرنے پر برافروختہ اور چیں بہ جبیں ہوتی تھیں، آج کہاں گئیں، اُن کے لیے چھوڑے محبت کے دعوے اور لافانی محبت کے جذبات کدھر چلے گئے، اس کے جواب میں عشاق کیا پیش کر سکتے ہیں، گزری ہوئی محبت کے چند گیتوں اور عشق کے چند پُرسوز نغموں کے سوا اُن کے پاس باقی ہی کیا رہ گیا ہے! کچھ جوانی کے رنگین نقوش کا تصور اور کچھ اپنی شکل و صورت کی جیتی جاگتی تصویریں یعنی چھوٹے چھوٹے بچے جن کے عادات و اطوار اپنے والدین کی زندہ مثالیں ہیں، اور بس!

اے محبت! ہے تری لے دے کے اتنی کائنات!!

اقوالِ حکیمانہ

(ڈاکٹر غلام سرور ایم اے، پی ایچ ڈی)

(۱) میں نے کتابِ محبت کا مطالعہ بہت دقتِ نگاہ سے کیا ہے، اُس کے مسرت بخش و سرور انگیز صفحات بہت ہی کم تھے، گویا تمام اوراق حسرت خیز و اندوہ فزا واقعات سے پُر تھے۔ وصال کی فصل بہت معمولی اور مختصر اور فراق کی نہایت اہم اور طویل تھے۔ لیکن کشتگانِ عشق و جانبازانِ مہرِ جاناں کی سرگزشت بے پایاں تھی۔ "گوئٹے"

(۲) حکیم معروف سیسرون نے جب تجرد سے تاہل اختیار کیا تو اُس کے احباب نے اِس تغیرِ مسلک کا سبب پوچھا، اِس پر اُس نے کہا، "حکمت طائفہ نسواں سے امتزاج نہیں رکھتی۔"

(۳) ایک نیک سیرت اور خوش اخلاق بیوی کا حصول بیشک ایک بڑی سعادت ہے، اگر مجھے اس بات کا علم ہو جائے کہ میں ایسی گرانبہا نعمت کے حصول میں کامیاب ہو جاؤں گا تو میں کل ہی تلاش میں مشغول ہو جاؤں۔ "لافونٹین"

(۴) ازدواج لاٹری یا جوئے کے کھیل سے مشابہ تھے، اس کھیل میں مرد اپنی آزادی اور عورتیں اپنی نیک بختی ہارتی ہیں۔ "میڈم ڈوریو"

(۵) ایک کشتی تصور کیجئے جس کے ملاح صرف دو ہیں۔ اگر وہ متفق ہو کر چپو چلائیں تو کشتی بآسانی تند و تیز موجوں کو کاٹتی ہوئی چلی جاتی ہے، اور اگر وہ اپنے کام میں متفق نہ ہوں تو دریا کا تلاطم نہ فقط کشتی کو لرزا دیتا ہے بلکہ اکثر اوقات اُسے تباہ بھی کر دیتا ہے، میری عزیز بیٹی! یہ کشتی ازدواج ہے اور اس کا عملہ زن و شوہر ہیں۔ جو دریائے زندگانی کی سطح پر سیاحت کرتے ہیں۔ اگر دورانِ کار میں وہ ایک دوسرے سے متفق نہ ہوں گے تو اُس کا لازمی نتیجہ عدم توازن ہوگا اور وہ انواعِ مصائب سے دوچار ہوں گے۔ "لبو"

(۶) اقوامِ متمدنہ کے لئے قانونِ طلاق احتیاجاتِ مبرمہ میں سے ہے۔ (مانٹسکیو)

(۷) ازدواجِ ناموافق کی زحمتِ ابدی سے ہمیشہ کے لئے نجات پانے کا بہترین چارۂ کار طلاق ہے۔ "الفونس کار"

(۸) جس قدر ایک مردِ خردمند حُمق و جنون سے ڈرتا ہے اُسی قدر ایک عورت زوالِ حسن و جمال سے ہراساں ہے۔ "پوپ"

نیاؤ یا ٹھکرائی؟[له]

خواجہ غلام السیدین

تو بہ فرمایاں، چرا خود توبہ کمتر می کنند؟

موٹر بہت تیزی کے ساتھ چلی جا رہی تھی، مگر باتوں کی رفتار اس سے بھی زیادہ تیز تھی۔ مدت کے بعد دونوں دوستوں کی ملاقات ہوئی تھی، ایک دوسرے سے بہت کچھ کہنا سننا تھا۔ ایک دوسرے کے خیالات کو ٹٹولنا تھا، دنیا بھر کے مسائل کی چھان بین کرنی تھی، سوچا تھا کہ اس کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہوگا کہ شکار کو چلیں اور روزمرہ کے معمول اور دوستوں کی ملاقات اور مداخلت اور ظاہر داری کے اخلاق اور گفتگو سے بچ کر جنگل کی تنہائی میں شکار بھی کھیلیں اور باتیں بھی کریں۔ خیر شکار تو ابھی ہی واجبی ہوا تھا، لیکن دل کھول کر باتیں کرنے کا موقع مل گیا تھا، اب وہ گھر کی طرف واپس ہو رہے تھے، شاہد موٹر چلا رہا تھا اور کلیم اس کے برابر بیٹھا تھا، نوکر پیچھے کی سیٹ پر بیٹھا اونگھ رہا تھا، موٹر کے سامنے دور تک تارکول کی سڑک تھا جس پر ابھی تک بارش کا اثر باقی تھا، کسی حبشی کے تندرست رخساروں کی طرح چمک رہی تھی، دونوں طرف ہرے بھرے کھیت لہلہا رہے تھے اور آسمان پر ہلکے بھورے رنگ کے بادل دوستانہ انداز میں کشتی لڑ رہے تھے، کبھی کبھی دور سے کسی دیہاتی گیت کی تان سنائی دیتی تھی، جو بہت جلد موٹر اور ہوا کے شور میں گم ہو جاتی تھی۔

شاہد کہہ رہا تھا:

"مگر میں تو اس بات کو نہیں مانتا، ہماری ساری تہذیب کی بنیاد ظلم اور ناانصافی اور زبردستی پر قائم ہے، جس کی لاٹھی اس کی بھینس، ہر معاملے میں روپے، اثر، رسوخ، قوت انھیں چیزوں سے کام چلتا ہے، حق اور انصاف کی کوئی پوچھ نہیں۔"

کلیم نے بیچ میں ٹوک کر کہا "پھر آخر قانون کس مرض کی دوا ہے، آخر قانون تو سب لوگوں کے ساتھ ایک سا سلوک کرتا ہے۔"

شاہد: "بیشک قانون ایک ہے، اور اس کی نظر میں امیر غریب، ظالم مظلوم، کمزور اور قوی سب برابر ہیں، لیکن یہ تو محض احمقوں کو دھوکا دینے کی باتیں ہیں، یہ سب برابر کیسے ہو سکتے ہیں؟ اور انھیں برابر سمجھنا اور ان کے ساتھ ایک سا سلوک کرنا کہاں کا انصاف ہے؟ ایک شخص کے پاس دولت ہے، اچھا کھانا، اچھے کپڑے، مکان، سیر و تفریح سب کچھ میسر ہیں، اور دوسرے کو صبح کا کھانا نہیں ملا۔ اور شام کو ملنے کی امید نہیں، اور بیوی بچے اسی بے بس پر آس لگائے بیٹھے ہیں، وہ محنت مزدوری کرنے کو تیار ہے، لیکن کام نہیں ملتا، اب قانون کا انصاف دیکھیے، قانون کیا ہے؟ جو شخص کسی کی جیب کترے گا وہ امیر ہو یا غریب، بدہضمی کا مریض ہو یا بھوکا، قید میں جائے گا، اب آپ یہ بتائیے کہ آپ کا خوش حال، خوش پوشاک، خوش خوراک دوست کیوں کسی راہ چلتے کی جیب کترے گا، یہ جرم تو اسی غریب سے سرزد ہوگا جس پر خدا کی وسیع دنیا میں اور تمام راستے بند ہو گئے ہیں، جس کے اس "جرم" پر اس کی بیوی بچوں کی فاقہ کشی کا انحصار ہے، مگر انصاف آنکھوں پر پٹی باندھے بالکل

له انصاف، یا بے انصافی

غیر جانبداری کے ساتھ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکے گا، اور جو کوئی جیب کترنے کے جرم میں پکڑا جائے گا، اسے جیل خانے کے سپرد کیا جائے گا۔ بھلا اس میں امیر اور غریب کی تمیز کرنے کے کیا معنی؟ قانون دونوں کے لئے ایک ہی ہے: اب یہ بے چارے جج اور ڈپٹی کا کام نہیں کہ وہ قانون کے اصول کی چھان بین اور اپنے فیصلے کے تمام نتائج پر غور کرے، اگر وہ ایسا کرنے لگے تو عدالتوں کے کاروبار کا خاتمہ ہی ہو جائے! وہ کوئی خدائی فوجدار نہیں کہ مجرم کے بیوی بچوں کا حال معلوم کرتا پھرے اور ان کا پیٹ بھرنے کی فکر کرے، وہ تو ایک مشین ہے کہ چلتی رہتی ہے۔ اگر کوئی حماقت سے اس کے اندر ہاتھ ڈالے گا تو اس کا ہاتھ کٹ جائے گا۔

کلیم۔ مگر تم نے پھر حسبِ عادت ایک لکچر دے ڈالا۔ آخر یہ تو معلوم ہو کہ تم چاہتے کیا ہو، کیا چوروں، اچکوں، جیب کتروں، لفنگوں، بدمعاشوں کسی کو سزا نہ دی جائے؟ انھیں بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے کہ اپنا کاروبار کھلم کھلا اور بے روک ٹوک انجام دیا کریں۔ پولیس اُنھیں گرفتار نہ کرے اور اگر کبھی ایسی غلطی ہو بھی جائے تو عدالت پولیس کو ڈانٹ ڈپٹ کر اور آئندہ کے لئے اس سے نیک چلنی کی ضمانت لے کر اُنھیں معذرت اور سر جانے کے ساتھ رہا کر دے، آخر تمہارے ذہن میں سوسائٹی کا تصور کیا ہے؟

شاہد۔ سوسائٹی کا تصور تو ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، جس کو میں موٹر میں بیٹھے بیٹھے حل نہیں کر سکتا، علاوہ اس کے تمہیں پہر شکایت ہوگی کہ میں نے ایک لکچر دے ڈالا۔ لیکن میں کم از کم دو باتیں ضرور چاہتا ہوں۔ اول تو یہ کہ چوروں، اچکوں، جیب کتروں، لفنگوں، بدمعاشوں کی جو جماعت تم نام کرتے ہو، اس میں ہر قسم کے چور اچکے، جیب کترے وغیرہ شامل ہوں، میں اس بات کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ اگر کوئی جاہل، بدنصیب، فاقہ زدہ آدمی جس کے پاس ایک میلی دھوتی کے سوا کچھ بھی نہ ہو کسی کی جیب میں سے ایک روپیہ نکال لے تو اس کو چھ مہینے کے لئے جیل بھیج دیا جائے اور پولیس ہمیشہ کے لئے اس کی دشمن اور نگراں بن جائے، اور اگر کوئی شریف، سفید پوش، موٹر میں بیٹھنے والا کمپنی کھولنے کے نام سے ہزاروں آدمیوں کا روپیہ لے کر اس کو چالاکی کے ساتھ ہضم کر جائے یا بازار میں غریبوں کی روزی اور کھانے پینے کی چیزوں کے ساتھ جوا کھیلے تو اس کا بال بیکا نہ ہونے پائے، بلکہ اگر وہ اپنی چوری کی دولت کے ذریعے حکام سے اچھے تعلقات رکھے تو اُسے خان بہادر کا خطاب مل جائے، اور آنریری مجسٹریٹ بنا دیا جائے! چور، اُچکے، جیب کترے تو ہر قسم کے ہوتے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ جو شخص ایک وقت کی روٹی چلانے کی خاطر ذرا سی چوری کرے تو وہ مجرم قرار دیا جائے، اور جو شخص "کاروبار" کے نام سے نہ صرف لاکھوں روپے کے وارے نیارے بلکہ لوگوں کی زندگیاں تباہ کر دے وہ سوسائٹی کا مفید اور معزز رکن سمجھا جائے۔

کلیم۔ اچھا آپ کا ایک تو چھوٹا سا مطالبہ یہ ہے کہ ہر قسم کے کاروبار کا گلا گھونٹ دیا جائے، اور دوسرا؟

شاہد۔ واہ میں نے یہ کب کہا کہ ہر قسم کے کاروبار کا گلا گھونٹ دو اور اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ آج کل ہر قسم کا کاروبار اسی قسم کا ہے اور اس میں مردم آزاری لازمی ہے، تو تم مجھ سے کہیں آگے بڑھے ہوئے ہو۔۔۔ مگر خیر اس بحث کو چھوڑو۔ دوسری بات میں یہ چاہتا ہوں کہ مجرم کو سزا دیتے وقت اس کے تمام حالات کا، اور اس کے ماحول کے اثرات کا لحاظ رکھا جائے۔

کلیم۔ یعنی

شاہد۔ یعنی یہ کہ جہاں تک ممکن ہو یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے کہ اس کے ذاتی اور خاندانی حالات کیا ہیں، وہ کیا واقعات تھے جنھوں نے اس جرم کرنے پر مجبور کیا یا جرم کی رغبت دلائی، اگر جرم کرنے کی اصل وجہ بیکاری یا بھوک یا جہالت یا کوئی دماغی خرابی ہے تو جیل خانے میں رہنے سے ان سب چیزوں کا علاج کیسے ہو سکتا ہے، سوسائٹی کا محض یہ کام نہیں کہ لوگوں کو سزا دیا کرے، ظاہر کو دیکھے اور اسباب کی طرف سے نظر پھیر لے، اس کا کام تو دراصل یہ ہے کہ تمام لوگوں کے لئے ایک ایسا ماحول ترتیب دے کہ وہ مفید، مشغول اور خوشی کی زندگی بسر کر سکیں اور اُنھیں جرم کرنے کے لئے کوئی معقول عذر ہی نہ ملے، ورنہ جب تک آج کل کی سی حالت رہے گی اور لوگوں کو افلاس اور جہالت سے نجات نہ ملے گی، جرم کا سلسلہ ختم نہ ہوگا۔ اور قانون جرم کو کم کرنے کے عوض اس کو اور بڑھاتا رہے گا۔

کلیم اس پیش گوئی کو سن کر چپ ہو گیا اور دونوں کچھ دیر تک خاموش بیٹھے۔ اس آن دیکھی دنیا کا تصور کرتے رہے، جس میں سے افلاس، جہالت اور جرم کو شہر بدر کر دیا جائے گا۔ بہت دور افق کے قریب دو تین بیل گاڑیاں قسمت کی چکی کی طرح آہستہ آہستہ چلتی دکھائی دے رہی تھیں۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کلیم نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"مگر یہ تو بتاؤ کہ ایسی دنیا کس طرح وجود میں آ سکتی ہے۔"

شاہد نے جواب دیا، "بھائی یقین اور تفصیل کے ساتھ تو یہ بتانا بہت مشکل ہے، لیکن میں جہاں تک سمجھتا ہوں اس کے لئے ایک زبردست انقلاب کی ضرورت ہوگی جو ایک طرف تو بہت سے خارجی حالات اور انتظامات کو بدل دے گا، اور دوسری طرف لوگوں کے دل اور دماغ کی کایا پلٹ کر دے گا، جب تک لوگ روزی کی خاطر پاگلوں کی طرح ایک دوسرے کا گلا کاٹنے میں مصروف رہیں گے اور ذاتی نفع کی خاطر دنیا کی ساری اچھی چیزوں کو قربان کرنے پر آمادہ ہوں گے، ان میں حقیقی تہذیب اور انصاف پسندی اور روحانیت پیدا ہی نہیں ہو سکتی، اور یہ قصہ اس وقت تک چلے گا جب تک سوسائٹی کا موجودہ نظام قائم ہے جس میں مل جل کر کام کرنے اور اپنی محنت سے خود پورا فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں جس میں ایک کا فائدہ دس کا نقصان ہے، ہمیں تعلیم کے ذریعے اور صحیح خیالات کی اشاعت کے توسط سے ملک کا اقتصادی نظام تبدیل کر کے لوگوں کی خود غرضی، رقابت، حسد، اور تنگ نظری کو دور کرنا ہوگا۔ ان کے لئے ایسے حالات مہیا کرنا ہوں گے جن میں وہ محسوس کریں کہ سب ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ایک کی ذلت اور نقصان سب کی ذلت اور نقصان ہے، جب تک سوسائٹی میں ایک بھی ایسا شخص موجود ہے جو اپنے جائز انسانی حقوق سے محروم ہے، سوسائٹی بیمار اور ناقص ہے، اور باقی سب لوگوں کی تہذیب و شائستگی، علوم و فنون، عیش و آرام، دولت اور فراغت، چوری اور ریاکاری کا نتیجہ ہیں۔ دنیا میں انصاف کی حکومت قائم کرنے کے لئے انسانی شخصیت کا احترام سکھانے کی ضرورت ہے، یعنی یہ کہ ہم دوسروں کے دکھ درد اور ان کی ضرورت کو اتنا ہی اہم سمجھیں جس قدر اپنے دکھ درد اور ضرورت کو سمجھتے ہیں۔"

دفعتہً ایک دردناک اور بھیانک چیخ سنائی دی اور ایک آٹھ نو برس کا لڑکا ہوا میں اچھلا، اور لڑھکتا ہوا سڑک کے ایک طرف جا گرا۔ پیچھے سے نوکر نے گھبرا کر کہا "میاں گاڑی روکنا، لڑکا موٹر سے ٹکرا گیا ہے"۔ شاہد نے معاً رفتار کم کی، لیکن پیچھے سے بیل گاڑی والوں کی وحشت زدہ اور غضبناک آوازیں سنائی دیں، اس نے پھر موٹر کا پیڑول بڑھا دیا، اور موٹر فرّاٹے بھرتی ہوئی نکل گئی۔

کلیم نے بدحواسی کے لہجے میں کہا "شاہد، شاہد گاڑی روک کر دیکھنا چاہیئے، کیا ہوا ہے؟"

شاہد۔ "نہیں اس وقت رکنے کا کوئی موقع نہیں، اگر ہم رک گئے تو یہ گاڑی والے لاٹھیاں لے کر ہم پر پل پڑیں گے، اور موٹر کے بھی ٹکڑے کر دیں گے۔"

"مگر شاید لڑکے میں کچھ جان باقی ہو ہم اسے تو اسپتال پہنچا سکتے ہیں۔"

نوکر پیچھے سے بولا "نہیں میاں جان کیسے باقی ہوگی۔ گاڑی چالیس پینتالیس میل کی رفتار سے جا رہی تھی اور لڑکا بالکل موٹر کے سامنے آگیا تھا، ٹکر سے اس کے بدن کی ہڈی پڈی چورا ہو گئی ہوگی"۔ شاہد چپ چاپ گاڑی چلا رہا تھا، کبھی کبھی مڑ کر پیچھے دیکھ لیتا تھا کہ کہیں گاڑی والے بیلوں کو پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھگاتے اس کو پکڑنے کے لئے تو نہیں آ رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد بولا۔

"آخر تم ہی بتاؤ کہ اس میں میرا کیا قصور تھا۔ میں نے گاڑیوں کے پاس سے گزرتے وقت کئی دفعہ ہارن بجایا۔ گاڑیاں ایک طرف ہٹ گئیں، لیکن جب میں بالکل ان کے برابر سے نکل رہا تھا، لڑکا دو گاڑیوں کے بیچ میں سے ہو کر دفعتاً سامنے آگیا، جب تک میں اسے بچانے کی کوشش کروں وہ موٹر سے ٹکرا چکا تھا۔"

"نہیں شاہد اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ آخر ان لوگوں کو اتنی بھی تمیز نہیں کہ اپنے بچوں کی دیکھ بھال کر سکیں، اگر کوئی خودکشی پر آمادہ ہو تو کوئی اسے کیسے بچا سکتا ہے، تم نے اپنی سی پوری احتیاط کر لی تھی، اور کیا کر سکتے تھے"۔ مگر اس کے ضمیر میں ابھی کھٹک باقی تھی، اور اسے دور کرنا ضروری تھا، بولا

"اور کلیم میں اسے گاڑی میں ڈال کر اسپتال پہنچا دیتا، لیکن اس

میں تو کچھ باقی ہی نہ رہا تھا، اور خواہ مخواہ اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے اور چار ہزار کی موٹر تڑوانے سے حاصل؟ اتنے میں پیچھے سے ایک ہارن کی آواز آئی اور ایک دوسری گاڑی بہت تیزی سے آتی ہوئی دکھائی دی، دونوں کا رنگ فق ہو گیا اور دل کی حرکت بڑھ گئی۔ لیکن گاڑی برابر سے گزر گئی۔ ان کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی، اب انھیں یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں گاؤں کے لوگ کسی دوسری موٹر والوں سے کہہ کر ان کا پیچھا نہ کرائیں مگر شاہد نے خود ہی یہ کہہ کر دل کو تسلی دی کہ موٹر کا پتہ چلانا دشوار ہے۔

کلیم بولا: اگر کسی موٹر والے نے نمبر دیکھ لیا اور گواہی دے دی تو، شاہد نہیں اتنی تیز رفتار پر نمبر کون پڑھ سکتا ہے۔ مگر احتیاطاً اس نے گاڑی کو سڑک پر سے اتار کر تھوڑی دیر کیچڑ میں چلایا، تاکہ نمبر پلیٹ کیچڑ سے ڈھک جائے۔ لیکن نئی دنیا کے ان بہادر شہسواروں کو اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ رک کر دیکھتے کہ اس کوشش میں کامیابی ہوئی ہے یا نہیں۔------

موٹر تیزی کے ساتھ میلوں کو نگلتے جا رہی تھی، اور شاہد موٹر کو ایک دوسرے راستے سے گھما کر گھر کے قریب پہنچ گیا تھا، شکار کا پروگرام خلاف توقع طور پر پورا ہو گیا تھا، شہر کی روشنیاں ٹمٹماتی ہوئی نظر آ رہی تھیں،

دونوں دوستوں کی وحشت اور پریشانی بھی بہت کم ہو گئی تھی، شاہد نے نوکر کو مخاطب کر کے کہا۔

"جمن میرے خیال میں لڑکا مرا تو نہیں ہوگا"

"نہیں میاں، مرا نہیں۔ صرف چوٹ آئی ہوگی، گاڑی تو اس وقت مشکل سے پندرہ بیس میل کی رفتار سے جا رہی تھی، اور گاڑی کا مڈگارڈ اس کے کندھے میں لگا تھا، شاید کندھے کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو"

کلیم، ہاں امید تو یہی ہے، یہ گاؤں کے لڑکے بہت سخت جان ہوتے ہیں، لوٹ پوٹ کر کسی نہ کسی طرح اچھے ہو جاتے ہیں، ان کی ہڈی بھی زیادہ مضبوط ہوتی ہے، اس لئے چوٹ کو اچھی طرح جھیل لیتے ہیں، یہ تو امیروں کے بچے ہیں، جن کو ہر وقت بسم اللہ کے گنبد میں رکھ کر نازک اور ریکمزور بنا دیا جاتا ہے

موٹر شہر کی ناہموار سڑکوں پر اچھلتی کھڑکھڑاتی چلی جا رہی تھی، اور شاہد اسے بہت احتیاط سے دس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلا رہا تھا، مرغی بھی سامنے آتی تو گاڑی روک لیتا تھا، دور سے کسی کے گانے کی آواز آ رہی تھی

نیائے نہ کین، کین ٹھکرائی

کین ٹھکرائی ---- کین ٹھکرائی -------

تاثراتِ کشمیر

مسلمِ کشمیر

دور تجھ سے جلوۂ جانانۂ کشمیر ہے	مسلمِ کشمیر تو بیگانۂ کشمیر ہے
تجھ کو بزمِ عیش کی حاصل نہیں پروانگی	تو مگر بے بال و پر پروانۂ کشمیر ہے
وہ کہاں شامِ نشاط و صبحِ شالامار میں	جو ترے افلاس میں افسانۂ کشمیر ہے

شاہی چشمہ کو دیکھکر

چاندی سونا پگھل رہا ہے تو کیا	محلوں میں چراغ جل رہا ہے تو کیا
اہلِ کشمیر سیر و سیراب نہیں	شاہی چشمہ ابل رہا ہے تو کیا

نجم آفندی

شاعر کی تمنّا

بزم میں آئے ہیں آج اک بات کہہ جانے کو ہم ایک گُر بھولا بھلایا پھر سے بتلانے کو ہم
یہ نہ سمجھے کوئی ہیں جذبات بھڑکانے کو ہم وہ نہیں جو یاس کے لے بیٹھیں افسانے کو ہم

ہم نہیں وہ جن کی امیدوں کا مرقد دل میں ہے
ہم کو حاصل منفعت ہر سعیٔ لاحاصل میں ہے

السلام اے نکتہ سنج اے شاعرِ شیوا بیاں! اے کہ نغموں سے ترے معمور ہے سارا جہاں!
اے تخیّل کے دھنی! اے والیٔ علم و زباں آج کرنی ہیں تری خدمت میں کچھ گستاخیاں

ہم تمنا پر تری اک تبصرہ کرنے کو ہیں
آج تیری آرزو کا تجزیہ کرنے کو ہیں

سب سے پہلے تو یہی ہے ایک تیرے دل کی چاہ مشعرے میں شعر پر تیرے ہو شورِ واہ واہ!
سب کہیں مضمون نیا، اسلوب کی دلکش ہے راہ درد ہو تو اس قدر۔ ہو سامعیں کے لب پر آہ!

تیرا اک اک لفظ بیٹھے دل میں اہلِ بزم کے
تذکرے ہوں بزم کے یا معرکے ہوں رزم کے

پھر یہی ہے، نا۔ تمنا تیری اے معجز رقم ہو رسالوں پہ ترا اور تجھ پہ ہو اُن کا کرم
اور پھر یہ چاہتا ہے تُو۔ مرے اہلِ قلم صاحبِ دیواں بھی ہو جائیں کہیں جلدی سے ہم

جب تلک پُڑیوں میں بندھ جاتا نہیں تیرا کلام
تُو سمجھتا ہے کہ ہے محروم ابقائے دوام

داعیہ تیرا بلند، اونچا ہے تیرا حوصلہ یہ تمنّا ہے ترے دل کی۔ یہی ہے ولولہ
ہر کہیں دنیا میں ہو تیرے سخن کا غلغلہ مات چُورن والے کی بانی ہو جس سے برملا

تجھ سے سما کے ستاروں کی بھی شہرت ماند ہو
چرخ پر تشہیر کے تُو چودھویں کا چاند ہو

تجھ کو اُٹھتی ہے تصوف کی بھڑک بھی گاہ گاہ اولیا اللہ کا بن بیٹھتا ہے خضرِ راہ
جو سُنا ہے یا پڑھا، کرتا ہے خوب اس کا نباہ تُو خدائی اور خودی دونوں کو کرتا ہے تباہ

مادیت کی ترے پیروں میں گو زنجیر ہے
پر سخن دیکھو تو قرآں وید کی تفسیر ہے

تُو غلو سے کام لے، اے دوست! یا مطلق نہ لے راہ پر تُو واقعیت کی، کہ فطرت کی چلے
گائے یا دکھلائے تُو کتھک کے فن کے چونچلے یہ جو کچھ بھی ہیں، فقط ہیں ابتدائی مرحلے

ابتدا ناقص ہے تیری، انتہا بھی نادرست
مبتدا بے ربط ہو، تو ہو خبر کس طرح چست

وہ تمنا کیا ہے جو ہو فرض سے ناآشنا برق رفتاری وہ کیا جب بوجھ کندھے سے گرا
نغمہ وہ کیسا ہے بادی سُر ہو جس کا بے پتا کیا وہ نقاشی ہے جب ہو کارٹون اس پر فدا

تُو ہی کہہ وہ کیفیت جو تجھ پہ وارد ہی نہیں
کیا سروکار اس کی عکاسی سے تجھ کو نکتہ بیں

یہ ترے افعال اور ایسی تمنّائیں فضول تجھ کو ٹھہرا کر رہیں اس جُون میں اپریل فُول
ایک ہی چھینٹے میں بہہ جائیں گے یہ کاغذ کے پھول کام کی اک بات بتلاتے ہیں، سُن، اس کو نہ بھول

تجھ کو حاصل ہے وہ فن جادو کا ہے جس میں اثر
چھوڑ دے وہمی تمنّا۔ آ ادھر، کچھ کام کر

تجھ کو تو تخئیلِ عالی پر بہت کچھ ناز ہے　　سرمستی کا در ترے منہ پر ہمیشہ باز ہے
جذب اور تاثیر سے بھی تجھ کو سوز و ساز ہے　　چھینٹے میں دل کے تیرا کلک سحر انداز ہے

اُٹھ! یہ میدانِ عمل ہے، دوست، تیرے سامنے
قوتوں سے اپنی خدمت میں وطن کی کام لے

حریت قطعاً سیاسی اور ملکی ہی نہیں　　حریت دنیاوی آزادی و دینی ہی نہیں
حریت ایمان کی اور اعتقادی ہی نہیں　　حریت خود اختیاری، اقتصادی ہی نہیں

حریت تخئیل کی بھی اک حقیقی چیز ہے
اس کو حاصل کر اگر تجھ کو ذرا تمیز ہے

یہ تمنا جب ترے سینے میں گھر کر جائے گی　　جو تشخص کی تجھے حسرت ہے وہ مرجائے گی
کُل فضا پیارے وطن کی امن سے بھر جائے گی　　جو بُری ساعت وطن پر ہے، مقرر جائے گی

کاش یہ دھن ہو تجھے، اور یہ تمنا دل میں ہو
جوش اخوت اور حُب کا دیس کی محفل میں ہو

سچ جو پوچھو، سچے شاعر کی تمنا ہے یہی　　کردے جو کو ترے مستغنی وہ صہبا ہے یہی
جس سے روشن ہو جہاں وہ طورِ سینا ہے یہی　　مست کردے انس وجاں کو، وہ ترانہ ہے یہی

اُٹھ ہلا دے تُو عزیزوں کے دلِ بے جوش کو
صُورِ اسرافیل کر دے بربطِ خاموش کو

حضرۃ کیفی دتاتریہ

مذہب کی نگاہ میں خدا خالق ہے
حکمت کی نظر میں مادہ خالق ہے
لیکن کسے معلوم یہی خالق ہیں
یا اور کوئی ان کے سوا خالق ہے

حکیم آزاد انصاری

غزل مسلسل

کوئی اس طرح ساون گا رہا ہے
دلِ ناشاد اُمڈا آ رہا ہے

سُروں میں ڈوبا لہرا بانسری کا
قیامت پر قیامت ڈھا رہا ہے

ٹہوکے دے رہی ہیں بھیگی تانیں
کلیجا منھ کو پیہم آ رہا ہے

پپیہا ٹیرتا ہے کہہ کے پی ہو
یہ پاپی اور بھی تڑپا رہا ہے

اُدھر آوازیں لگتی ہے پتّی
اِدھر دل ہے کہ بیٹھا جا رہا ہے

بھری برسات اور یہ گھُپ اندھیرا
اندھیرا آپ سر ٹکرا رہا ہے

کسی کو تیل میں جیسے ڈبو دُ
یوہیں سینے میں دم گھبرا رہا ہے

اندھیری رات میں کوندا لپک کر
دبی جو آگ تھی بھڑکا رہا ہے

اُدھر چنگھاڑتے ہیں مور، اِدھر دل
پچھاڑوں پر پچھاڑیں کھا رہا ہے

چمکتے اب نہیں جگنو ہوا میں
فلک چنگاریاں برسا رہا ہے

مسلسل نغمہ تھی جھینگر کی جھنکار
دل اب آزار جس سے پا رہا ہے

سہاگن رات کا ڈھلتا ہے کاجل
مرا اک رُواں تھرا رہا ہے

یہ رات اور یاد آثر اک بے وفا کی
بس اب رہنے دو، رونا آ رہا ہے

اُردو کی شستگی و نفاست میں آگرے کا حصہ

ل ، احمد اکبر آبادی

مغربی تمدن کی ترقی کے ساتھ علوم و فنون نے جو ارتقائی مدارج طے کئے ہیں وہ آج ہمارے سامنے ہیں۔ محض روایت کو ناکافی و غیر مفید دیکھ کر تاریخ نویسی کا دستورِ قدیم مسترد ہوا، اور اس کی بنا درایت پر مستحکم کی گئی، ہمارے مورخوں نے بھی قدیم طرزِ واقعہ نگاری کی شکایتیں کیں، اور جدید اسلوب اختیار کر لیا۔ مگر جب ہم زبانِ اردو کے جدید مورخین کی تالیفات پڑھتے ہیں تو سخت حیرت میں پڑ جاتے ہیں۔ قدیم تذکرہ نویسوں سے اگر کچھ فروگزاشتیں ہوئیں تو ان کی طرف سے متعدد و معقول عذر لائے جا سکتے ہیں۔ لیکن عہدِ حاضر کا واقف فن لسانی مورخ اپنی تنگ نظری و فقدان درایت کی کیا توجیہہ پیش کر سکتا ہے؟

اس مقالے میں ہم اس فروگزاشت کی تصریح اور ازالے کی کوشش کریں گے کہ اردو کے ارتقا، شستگی و صفائی میں آگرے کی اربابِ علم و ہنر نے ہر دور میں نہایت معقول حصہ لیا ہے، اور اس ذیل میں آگرے کی خدمات نہایت وزنی ہیں، لیکن ایک صفیر بلگرامی کے سوا ہمارے مورخوں نے ارتقائے اردو کی تاریخ قلمبند کرتے وقت آگرے کی ان خدمات کو نظر انداز کیا ہے۔ اور اگر کہیں یہ ذکر ناگزیر طور پر آ گیا ہے تو اس طرح بیان کیا ہے کہ آگرے کا نام نہ آنے پائے۔ متقدمین میں سے ہم مثال کے طور پر میر امن دہلوی کے دیباچہ، باغ و بہار سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔

"جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدردانی و فیض رسانی اس خاندانِ لاثانی کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئے۔ لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدا جدا تھی، اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال جواب کرنے کے لئے ایک زبان اُردو مقرر ہوئی۔"

ہر چند میر امن نے یہ عبارت مورخ کی حیثیت سے نہیں لکھی، لیکن وہ ایک تاریخی بیان ضرور ہے، ہمیں اُن سے تعرض نہیں کہ اُنھوں نے اکبر کے پایۂ تخت کا نام لینا کیوں روا نہ رکھا، وہ فی الحقیقت کوئی تاریخ مرتب نہیں کر رہے تھے، اور کہا جا سکتا ہے کہ وہ جدید فنِ تاریخ نویسی سے واقف بھی نہ تھے، لیکن اگر عہدِ حاضر کا کوئی مورّخ اس فروگزاشت کا اعادہ کرے تو باز پرس لازمی ہو جاتی ہے، اس کی ایک مثال ہم شعر الہند سے دیتے ہیں۔

"...... تیمور کے بعد شمالی ہند میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے قدرتی اختلاط کے علاوہ اکبر کے زمانے میں مختلف قوموں کے اختلاط کا ایک مصنوعی سبب اور پیدا ہو گیا، یعنی اکبر نے قلعے میں ایک زنانہ بازار قائم کیا ......"

ہمیں تسلیم ہے کہ صاحبِ شعر الہند کی نیت بخیر تھی، لیکن اس عبارت کے پڑھنے سے یہ سوال از خود پیدا ہوتا ہے، کہ اکبر کا یہ قلعہ جہاں وہ بازار قائم ہوتا تھا، کس مقام پر واقع تھا؟ اور جب یہ ظاہر ہے کہ وہ مقام آگرے

کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تو ہمارے مورخ کو آگرے کا نام لیتے کیا قباحت محسوس ہوتی تھی؟

ہمارے اس بیان سے کسی کو یہ خیال نہ ہونا چاہیے کہ ہمارا مدعا آگرے کا تفوق قائم کرنا یا اس کی مرکزیت تسلیم کرانا ہے۔ اس سے ہمارا مقصود صرف ایک تاریخی فروگذاشت کا ازالہ کرنا ہے۔

اردو کی تاریخوں کے مطالعے سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ شمالی ہند میں زبان کا وہ دَور تو متعین ہے، جب مختلف زبانوں کے الفاظ مخلوط ہو رہے تھے، اور نصف ہندی و نصف فارسی اشعار کی مثالیں بھی بہم پہونچ گئی ہیں۔ لیکن اس کے بعد ڈھلی ڈھلائی اور صاف شستہ زبان میں اساتذۂ دورِ اول کے دیوان ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ امیر خسرو کی مثالوں کے بعد مخلوط زبان کے دس پانچ شعر ملتے ہیں، اور پھر دفعتاً دکنی شعراء کا کلام پیش ہو جاتا ہے۔ شمالی ہند میں ڈھونڈھنا چاہتے ہیں، اور معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ مخلوط زبان نے زبان کی حیثیت پا کر صاف و شستہ کہاں ہوئی، اور وہ کونسا مرکز تھا جہاں یہ عمل ہوتا رہا کہ جس نے دَورِ اول کے اساتذہ مہیا کر دیئے؟

اگر بعض فلاسفہ کی اس رائے کو پیشِ نظر رکھا جائے کہ واقعات کے اخذ و التقاط میں ایک مورّخ اپنے رجحانِ طبع و پسند کو ترک نہیں کر سکتا اور اس لئے تاریخ ایک فردِ واحد کی رائے اور مذاقِ طبیعت کا آئینہ ہونے سے زیادہ نہیں، تو ہماری سمجھ میں آجاتا ہے کہ آگرے کو نظر انداز کر دینے کا سبب سوا اس کے دوسرا نہیں ہو سکتا کہ دہلی و لکھنؤ کی مرکزیت کا خیال ہمارے مورخین زبان و ادب کے دماغوں میں عصبیت کی حد تک راسخ ہو گیا ہے، اور اُن کو اس ذیل میں کسی تیسرے مقام کا نام لینا بھی گوارا نہیں۔

تاریخی مباحث سے گفتگو کرتے وقت "پسند و رجحان" کے کلیے سے ہم اپنے آپ کو بھی محفوظ نہیں سمجھتے، لیکن بایں ہمہ یہ حق ہم کو ضرور حاصل رہتا ہے کہ ہم ایک مورّخ کے کسی واقعے کو قلمبند کرنے یا قلم انداز کر دینے پر جرح و تعدیل کر سکیں۔

یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے کہ اردو کی ابتدا کہاں سے ہوئی اور اس کی جنم بھومی بننے کا فخر دکن کو حاصل ہے، یا پنجاب کو، لیکن اس کے آغاز کے متعلق چند اشارات ناگزیر ہیں، ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مسلمانوں کے تداخلِ ہند کے ساتھ جس مخلوط زبان کی بنا پڑی اس نے علمی صورت اختیار کرنا کب سے شروع کیا؟ اگر غور کی نظر ڈالی جائے گی تو اردو کے علمی جامہ پہنے کی ابتدا اس وقت سے نظر آئے گی، جب سکندر لودھی نے آگرے کو پایۂ تخت بنایا اور ہندوؤں نے فارسی زبان سیکھنا شروع کیا، منتخب التواریخ سے اس عہد کے بیان میں ہمیں پنڈت ڈونگر مل کا نام ایک فارسی گو شاعر کی حیثیت سے ملتا بھی ہے جو غالباً فارسی کا پہلا ہندو شاعر تھا۔

بہرحال اس امر کے ثبوت میں کافی و وافی شہادت ملتی ہے کہ اس مخلوط زبان نے عہدِ اکبری میں ایک شکل اختیار کرنا شروع کر دیا تھا، جس میں اکبر کا مینا بازار معقول حد تک ممد و معاون ثابت ہوا، یہ حقیقت ہمارے پیشِ نظر ہے کہ قریب قریب اسی عہد میں یہی کام دکن میں بھی جاری تھا، اور کہا جا سکتا ہے کہ اردو کی تشکیل میں مغلیہ و قطب شاہی درباروں کو برابر کا درجہ حاصل ہے، لیکن دقتِ نظر کے ساتھ دیکھنے پر یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اردو جس زبان کا نام ہے وہ برج بھاشا کی ترقی یافتہ صورت ہے اور اس کی تشکیل آگرے ہی میں ہو سکتی تھی، کیونکہ آگرہ خود برج میں داخل ہے، دکن میں جو زبان بن رہی تھی اس کی بنا برج بھاشا نہیں بلکہ اس وقت کی دکنی بولی ہو سکتی ہے، ہمارا خیال ہے کہ مولفِ آبحیات کو اس معاملے میں مغالطہ ہوا اور مورخین مابعد آنکھ بند کر کے ان کا اتباع کرتے رہے۔ نہ سپہر میں امیر خسرو کے بیان سے یہ بات مصدق ہے کہ دکنی ایک جداگانہ بولی تھی، یہ بھی ایک دوسری بحث ہو گی کہ آیا دکنی اور بھاشا میں کوئی تعلق تھا یا نہیں اور دکنی شاعری اردو شاعری میں کب اور کیسے مدغم ہو گئی؟

تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ بات مخفی نہ ہونا چاہیے کہ شاہجہاں نے دہلی آباد کر کے جب اپنا پایۂ تخت آگرے سے وہاں منتقل کر لیا تو اس کے بعد بھی بہت عرصے تک آگرہ نہ صرف علمی و ادبی مرکز بنا رہا، بلکہ سیاسی چالوں اور ریشہ دوانیوں کا تماشا بھی آگرے ہی کے اسٹیج پر کھیلا جاتا رہا۔ اور اس امر کی شہادت بھی تلاش کرنا نہ پڑے گی کہ دکن میں اورنگ زیب کی وفات تک دہلی برائے نام پایۂ تخت تھا، ورنہ تمام سیاسی واقعات و امور آگرے ہی میں رونما ہوتے اور طے پاتے رہے، اور اربابِ فضل و کمال

کی جو محفل عہد اکبری سے قائم تھی وہ اس وقت تک آگرے ہی میں جمی رہی، اس لئے ناگزیر طور پر یہ مستنبط ہو جاتا ہے کہ شمالی ہند میں تشکیل اردو کا عمل اسی مجلس کے ہاتھوں سرانجام پاتا رہا، یہ ہمارے محقق مورخوں کا کام تھا کہ ان تاریخی واقعات پر نظر کرتے، شواہد کی جستجو کرتے، اور اس کڑی کو شمالی ہند ہی کے اندر ڈھونڈھ نکالتے، اگر آگرے کے ساتھ یہ بے اعتنائی نہ برتی گئی ہوتی تو ہمارا خیال ہے کہ ارتقائے زبان کی یہ گم شدہ کڑی منطقی نتائج کی صورت میں از خود مل گئی ہوتی۔ بہر حال ایک لسانی محقق کے لئے یہ میدان آج بھی کھلا ہوا ہے،

اُردو زبان کے ارتقار کا مختصر خاکہ ذیل کے اقتباس میں پیش کیا جاتا ہے، صغیر بلگرامی جلوۂ خضر میں لکھتے ہیں۔

"امیر خسرو نے اس طفل نو خیز کو نظر توجہ سے دیکھا، مگر اکبر نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور چاہا کہ اس کو سرفرازی کا خلعت بخشا جائے اور اس خلعت کی طیاری میں مصروف ہوا، راجاؤں کی بیٹیاں گھر میں لایا، ہزاروں سہیلیوں سے اپنا محل بھر دیا۔ علمار سے ہندی کتابوں کا فارسی ترجمہ کرایا، ہنود کو دربار میں دخل دیا اور اُن سے بات چیت کا موقع ہر طرح رکھا، بیربل کی شوخیاں مشہور عام ہیں۔ مکانات اور اوقات اور اشیار کے نام ہندی یا ہندی فارسی آمیز رکھے، اور محل میں (مینا) بازار بنوایا، یہ سب خلعت اردو کے سامان ہیں، مگر اس کو بھی زندگی نے مہلت نہ دی کہ ابھی خلعت ناطیار تھا کہ اکبر تمام ہوا، حقیقت میں جیسی توجہ بدل اکبر نے ہندیوں کی طرف کی تھی، اگر وہ اور زندہ رہتا تو اردو کی صورت اسی وقت میں سب کو نظر آتی، اور دربار میں بھی یہی زبان شائع ہو جاتی، مگر یہ بھی واضح رہے کہ اکبر نے اپنا پایۂ تخت اکبر آباد میں مقرر کیا تھا اور وہیں رہتا تھا، دہلی کو اس فیض اکبری سے چنداں حصہ نہ ملا"

- جلوۂ خضر کے صفحہ نمبر ۵۵ پر درج ہے۔
"جہانگیر کے وقت میں بھی مینا بازار قائم رہا۔ شاہجہاں کے دور میں اور ترقی ہوئی کہ یکایک اکبرآباد سے شاہجہاں کا دل اُچاٹ ہوا، اور دہلی جا بسا یا۔ آگرے میں شاہجہاں کے وقت میں اردو کی صورت قائم ہونا اچھی طرح ثابت ہوتا ہے۔ بادشاہ کے دربار و دفتروں کی زبان فارسی تھی مگر اردو اس کے عہد میں زبانوں پر آچلی تھی۔۔۔۔۔ میں نے شاہجہاں کی ایک تحریر اردو دارا شکوہ کے نام دیکھی ہے جو اس وقت یاد نہیں "

اب ہم مخلوط زبان کے چند ایسے شعر پیش کرنا چاہتے ہیں جو اردو کی تشکیل کو مصدق کرنے کے ساتھ اس کا بھی ثبوت ہیں کہ آگرے میں مغلیہ دربار قائم رہنے تک زبان میں روانی آچلی تھی اور اس منزل میں تھی جس کے بعد دور اوّل کے شعرار کا کلام ہونا مستبعد نہیں رہتا، اور یہ کہ شمالی ہند میں اردو کا استحکام بلاواسطہ ہوا، اور اس میں دکنی شعرار کا کوئی حصہ نہ تھا،

صاحب جلوۂ خضر نے تزک جہانگیری کے حوالے سے اکبر کی ایک رباعی نقل کی ہے جو اس نے جہانگیر کی درخواست معذرت پر لکھدی تھی،

پوچھی جو گھڑی مجھ سے براہِ عادت
تو وصل کو ساعت کی نہیں کچھ حاجت
ہو جاتی ہے ملنے سے مبارک ساعت
ساعت کا بہانہ نہیں، خوش ہر ساعت

خندۂ گل کے مولف نے ملا ابوالحسن دو پیازہ کا ذیل کا شعر نقل کیا ہے،

وہ گورا گورا لڑکا بامن کا شوخ گھونا
ایسا لگے ہے مجھ کو جوں کھانڈ کا کھلونا

مغل اور اردو میں جلوۂ خضر کے حوالے سے نورجہاں سے بھی دو شعر منسوب ہیں۔

دیں جگہ زخمِ وفا کو دلِ صد چاک میں ہم
دیکھیں گر کچھ بھی وفا اُس بتِ بیباک میں ہم
نقشِ پا کی طرح اے راحتِ جانِ عاشق
تیرے قدموں سے جدا ہو کے ملے خاک میں ہم

خمخانۂ جاوید میں پنڈت چندربھان برہمن کے اکبرآبادی جو دارا شکوہ

کے میر منشی تھے، کچھ شعر نقل کئے گئے ہیں۔ ایک شعر یہاں درج کیا جاتا ہے،

خدا نے کس شہر اندر ہمیں کو لائے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے، نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے

مغل اور اردو میں جلوۂ خضر کے حوالے سے زیب النسا سے منسوب تین شعر درج ہیں۔ ایک شعر پیش کیا جاتا ہے۔

جدا ہو مجھ سے مرا یار یہ خدا نہ کرے
خدا کسی کے تئیں دوست سے جدا نہ کرے

اسی سلسلے میں کہ دکن کی شاعری کے دہلی میں متعارف ہونے سے قبل شمالی ہند میں شعر کس درجے پر تھا، اور بھی چند مثالیں پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

میر حسن نے اپنے تذکرے میں ایک شاعر متخلص بہ خاکی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ دہلی میں درویشانہ زندگی گزارتا تھا، صاحب گلِ رعنا کا قول ہے کہ "اس وقت تک دلی میں اردو شاعری کا سراغ نہیں ملتا"، لیکن بقول صاحب گلِ رعنا سید محمد بن جمال الدین قادری متخلص بہ خاکی کا ایک ردیف وار مکمل دیوان مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے کتب خانے میں ملتا ہے اور دیوان کے علاوہ خاکی کی ایک مثنوی موسوم بہ فیض عام مورخہ ۱۱۲۰ھ بھی ہے۔ صاحب گلِ رعنا کا خیال ہے کہ میر حسن نے جس خاکی کا ذکر کیا ہے وہ یہی خاکی ہے، جس کے تین شعر ہم گلِ رعنا سے یہاں نقل کرتے ہیں۔

جائز نہیں تھیں ہجر کے شب کی شکائتیں
مجھکوں حصول آج تو نقد وصال تھا

اپنے معشوق سنگ ہو رہنا ایک دل ایک رنگ ہو رہنا
خوش یہی حال ہے فقیری کا نفس و دل بیچ جنگ ہو رہنا

مرزا عبدالقادر بیدل کے دو شعر اکثر تذکروں میں آئے ہیں، ایک شعر یہ ہے۔

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم ہیں
اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم ہیں

قزلباش خاں اُمید کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

در و دیوار سے اب صحبت ہے یار بن گھر میں عجب صحبت ہے
تیری آنکھوں کو دیکھ ڈرتا ہوں الحفیظ الحفیظ کہتا ہوں

مذکورہ بالا اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ شمالی ہند میں عہدِ عالمگیری ہی میں اردو زبان شعرائے دکن کی محمد شاہی عہد کی زبان سے کہیں زیادہ صاف و شستہ تھی، وَلی کی اس زبان سے بھی جب کہ اُس نے دہلی کا اثر قبول نہ کیا تھا، یہاں یہ فراموش نہ ہونا چاہئیے کہ اگر شاعری اس وقت دکن ہی میں تھی تو دہلی میں وہ کونسی خصوصیت تھی جس کی طرف شاہ گلشن نے وَلی کو توجہ دلائی۔ اور وہ کیا شے تھی، جس کے اختیار کرنے سے زبان اس قدر نکھر گئی؟

اب ہمیں اس بات کو دیکھنا ہے کہ زبان میں یہ سلاست و روانی پیدا ہو جانے کا مرکز کہاں تھا؟ جس قدر تلاش و جستجو کی جائے گی، جتنی شہادتیں فراہم ہو سکے گی، اس سے یہی نتیجہ نکلے گا کہ وہ مرکز آگرے کے سوا دوسرا نہیں تھا، ورنہ پھر سوال یہ پیدا ہو گا کہ آبرو، مضمون، آرزو، اور مظہر نے زبان کہاں حاصل کی اور ان کے مذاقِ شعری نے کہاں تربیت پائی کہ دہلی پہنچکر صدر بزم شعر و ادب بن سکے؟

محمد شاہ کے عہدِ سلطنت میں ظاہر ہے کہ آگرے کا اجتماع قائم نہ رہ سکتا تھا، کچھ لوگ شاہجہاں کے ساتھ گئے، کچھ اورنگ آباد کے دربار میں جا پہونچے۔ رہے سہے اب دہلی پہونچنے لگے، کیونکہ آگرہ درباری سرپرستی سے محروم، اور وہاں کے اربابِ فن قدر دانی سے مایوس ہو گئے تھے جن لوگوں کو کس مپرسی ناپسند اور وطن کی گوشہ گیری نامطبوع تھی وہ رفتہ رفتہ دہلی کو آباد کرنے لگے۔

شاہ مبارک آبرو عالمگیری عہد کے لوگوں میں سے تھے، شعر و ادب کے پرستاروں میں یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے نقلِ وطن کیا، اسی زمانے میں میاں شرف الدین مضمون، مولوی عبد الرب، نواب اسدیار وغیرہ باری باری سے دہلی جا پہونچے، اُس وقت، دہلی میں زبان و شعر کی حیثیت جعفر زٹلی کے کلام سے مترشح ہو سکتی ہے، لیکن جب آبرو و مضمون نے وہاں پہنچ کر شعر و سخن کی بساط بچھائی تو دہلی میں زبانِ اُردو نے تشخص حاصل کیا، اور بلا ریب دہلی کی بزم زبان و ادب کے بانی یہی لوگ تھے، اور شعر اردو کا دورِ اوّل انھیں ہستیوں سے عبارت ہے، یہ بتانے کے لئے کہ اس دور میں اِن بزرگوں کو کیا مرتبہ حاصل تھا، اُردو کے

مستند تذکرہ نویسوں کے چند اقتباس پیش ہیں۔ آبرو کے ذکر میں میر تقی
نکات الشعرا میں فرماتے ہیں۔

"شاعرے نادرہ گوئے ریختہ، میگویند کہ طبع شوخے داشت
غرض مستغنی وقت خود بود۔"

میر حسن لکھتے ہیں۔

"از ابتدائے جوانی مشق سخن میکرد۔ شاعرے خوش گوئی
در وقت خود بود۔"

آبِ حیات میں ہے۔

"یہ اپنے زمانے میں مسلم الثبوت شاعر زبان ریختہ کے
اور صاحب ایجادِ نظم اردو کے شمار ہوتے تھے۔"

گلِ رعنا کی عبارت ہے۔

"اور حق تو یہ ہے کہ دہلی میں اردو شاعری کا باقاعدہ
آغاز انھیں سے ہوا۔"

میاں شرف الدین مضمون کے متعلق نکات الشعرا کا بیان ہے،

"حریف ظریف، بشاش بشاش، ہنگامہ گرم کن مجلسہا،
ہرچند کم گو بود، لیکن بسیار خوش فکر و تلاش لفظ تازہ
زیادہ۔"

میر حسن فرماتے ہیں۔

"از اکبرآباد آمدہ بشاہجہاں آباد، در زینت المساجد
استقامت ورزید، ہرچند کم گو لیکن خوش گو۔"

جب ان باکمالوں نے دہلی میں شعر و ادب کی محفل ترتیب دی تو وہاں
کے جوہرِ قابل کو بھی اُبھرنے کا موقع ملا۔ دورِ اول میں جن دہلوی شعرا
کے نام چمکے، اُن میں تاجی، یکرنگ و احسن نمایاں ہیں، ان حضرات کے
متعلق اردو کے مستند تذکرہ نویسوں کی رائیں پیش کی جاتی ہیں، تاجی کے
ذکر میں میر حسن کا خیال یہ ہے۔

"مردے ظریف بود، اکثر لطائف و ظرائف آں مردماں
را خندہ می آورد۔ خود ہم خندید تبسمے میکرد، تلاش
صنعت ایہام بسیار داشت۔"

نکات الشعرا میں ہے۔

"مزاحش بہ ہزل مائل بود۔"

شعر الہند کا بیان ہے۔

"اُن کی حیثیت جعفر زٹل سے زیادہ نہ تھی۔"

تذکرۂ قدرت کے الفاظ ہیں:-

"ہرچند پر گو فاما بسیار پوچ گو است۔"

گلِ رعنا کی عبارت ہے۔

"کم سال و کہنہ مشق تھے، مگر باوجود اس کے حضرت مظہر
رحمۃ اللہ علیہ کو کلام دکھلانے آتے، مشورہ سخن کرتے تھے،
مصحفی نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ ایک قول کے مطابق
وہ خانِ آرزو اور ایک قول کی بنا پر شاہ مبارک آبرو
کے شاگرد سمجھے جاتے ہیں۔"

آبرو مضمون کے زمانے ہی میں آگرے سے نقل وطن کرنے والوں میں
خان آرزو و مرزا مظہر جانجاناں کے نام بھی ہیں۔ اردو کے استحکام و شستگی
میں، دورِ متقدمین، جو مرتبہ سراج الدین علی خاں آرزو کو حاصل ہے وہ ذیل
کے اقتباسات سے ظاہر ہے۔

"سراج الدین علی خاں آرزو بعد امیر خسرو دہلوی چنیں
صاحب کمال پر گو و خوش گو، بسامع عالمیان نرسید،
ہفت دیوان داد کہ ہر یکے پہلو بہ نظیری و فغانی می زند،
فکر صائب اور تزلزل و ردکان مضامین مبتذل انداختہ
شاعر فارسی، عالم فاضل شہرہ آفاق، در سخن فہمی طاق،
استادانِ ریختہ شاگرد اویند۔" (تذکرہ میر حسن)

"ہمہ استادان مضبوط فن ریختہ ہم شاگردان آن بزرگوارند"
(نکات الشعرا)

"خانِ آرزو کو زبانِ اردو پر وہی دعویٰ پہنچتا ہے
جو کہ ارسطو کو فلسفہ منطق پر ہے، جب تک کہ کل منطقی ارسطو
کے عیال کہلائیں گے تب تک اہلِ اردو خانِ آرزو کے
عیال کہلاتے رہیں گے۔ خانِ آرزو وہی شخص ہیں جن کے
دامنِ تربیت سے ایسے شائستہ فرزند پرورش پاکر
اُٹھے جو زبانِ اردو کے اصلاح دینے والے کہلائے اور

جس شاعری کی بنیاد حکمت اور ذومعنی لفظوں پر تھی اُسے کھینچ کر فارسی ادائے مطلب پر لے آئے، یعنی مرزا جانِ جاناں، مرزا رفیع۔ میر تقی، خواجہ میر درد"

(آبِ حیات)

مرزا مظہر جان جاناں کے متعلق میر حسن کی رائے یہ ہے،

"مرزا مظہر از فصحائے زماں و بلغائے دوراں شاعریست مقدس و بزرگ، خوش تقریر بمرتبہ الیست کہ در تحریر نمی گنجد۔ یقین و حزیں شاگردان اوبند"

مولف آبِ حیات کی عبارت ہے:۔

"زبان کی اصلاح و اندازِ سخن اور تحریر کی ایجاد میں اُنھیں ایسا ہی حق ہے، جیساکہ سودا و میر کو"

تذکرۂ قدرت کے الفاظ ہیں۔

"میگویند کہ اول کسے کہ طرزِ ایہام گوئے را ترک نمودہ ریختہ را در زبان اردوئے معلیٰ شاہجہاں آباد کہ الحال پسند خاطر عوام و خواص گردیدہ مروج ساختہ مرزا مظہر جانجاناں متخلص بہ مظہر مردیست فرشتہ صفت"

گلِ رعنا کی رائے ہے،

"مرزا جان جاناں مظہر نے اس خار زار کو ایسا چمن بنایا کہ شاعری ساحری بن گئی، پھر اپنی زورِ طبع و خداداد قابلیت سے اچھوتے مضمون اور فارسی ترکیبوں اور اردو کے دلکش محاوروں کو اس طرح پر ترتیب دیا اور وہ خوبی پیدا کی کہ ایہام اور تجنیس وغیرہ صنائع لفظی جو ہندی دوہوں کی بنیاد تھے اُسے سب بھول گئے۔ حزیں، بیاں، حسرت، فقیہہ، دردمند نے اُن کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور میر و مرزا وغیرہ نے ان کا تتبع کرکے اردو شاعری کو معراجِ کمال پر پہنچا دیا، یہ اردو شاعری کے مورخ کی سخت بے انصافی ہے کہ اس نے مرزا صاحب کے اس احسان کا اعتراف نہیں کیا، بلکہ اُن کی کمال شاعری کو دبانے کی ہر جگہ بے سود کوشش کی ہے"

ان باکمالوں کے بعد میر تقی کا نام آتا ہے، اس خدائے سخن کے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے، میر نے اردو شعر میں وہ شے شامل کر دی، جس کے بغیر شعر شعر نہیں ہوسکتا تھا،

اس پر مرزا رفیع سودا کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جن کو آبحیات میں شاہ حاتم کا شاگرد بتایا گیا ہے، لیکن آبِ حیات کے اس بیان کی تائید کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہوتی، البتہ اس بات کو متعدد مورخین نے لکھا ہے کہ مرزا سودا نے خان آرزو سے استفادہ کیا۔ ہر چند اس وقت تک سودا فارسی میں مشقِ سخن کرتے تھے، لیکن اردو میں شعر کہنے کا مشورہ ان کو خان آرزو ہی سے ملا تھا،

سودا نے اپنے کلام میں شاہ حاتم کی شاگردی یا تقلید کی طرف کہیں اشارہ نہیں کیا ہے، البتہ آبرو و مضمون کے طرز کے معترف نظر آتے ہیں۔

اسلوب شعر کہنے کا تیرے نہیں ہے یہ
مضمون و آبرو کا ہے سودا یہ سلسلہ

میر کے ذکر کے بعد ہی مرزا غالب کا نام لینا پڑتا ہے کہ پیغمبر سخن تھے، غالب کے ذکر میں ہم صرف ایک اشارہ کریں گے اور وہ یہ ہے کہ اُن کے رنگِ شاعری کی آج پرستش ہوتی ہے اور امتداد وقت کے ساتھ اس پرستش میں خشوع وخضوع بڑھتا جائے گا، غالب کی شاعری کے بغیر اردو شاعری جس مرتبے کی ہوتی اُس کا اندازہ بآسانی ہوسکتا ہے، اردو نثر میں مرزا غالب نے جو انقلابی بنیاد رکھی وہی اس تعمیر کی تکمیل بھی تھی، کہ آج تک اس سے زیادہ سلیس زبان کا تصور نہیں بندھ سکا ہے، اس ذکر میں یہ بتا دینا بے محل نہ ہوگا کہ غالب کے رقعات کی تاریخ ۱۸۵۷ء ہے لیکن غالب کو رقعات مرتب ہونے سے چار سال پہلے خان بہادر ذوالقدر خواجہ غلام غوث اکبرآبادی کے خطوط جو ویسی ہی سادہ و سلیس زبان میں ہیں مرتب ہو چکے تھے، لیکن ان کی اشاعت ۱۸۹۵ء سے قبل نہ ہو سکی، اور خواجہ غلام غوث ہی وہ بزرگ ہیں جنھوں نے اصل میں عودِ ہندی کو جمع و مرتب کیا ہے،

مولوی عبد الرب صاحب اکبرآبادی کا نام اوپر لیا جا چکا ہے یہ عہدِ محمد شاہی میں آگرے سے دہلی پہونچے اور ۱۱۳۶ھ میں شاہی رصدگاہ میں بیٹھ کر علمِ مساحت پر ایک کتاب اردو میں لکھی، مگر اس سے بھی قبل وہ

ایک رسالہ ریاضی پر لکھ چکے تھے، اور اس طرح اردو نثر کے اولین مصنف ہونے کا استحقاق مولوی عبدالرب کو پہنچتا ہے،

شیخ قلندر بخش جرأت بھی اُن ہنرمندان آگرہ میں سے ایک ہیں، جنھوں نے ترک وطن کرکے شعر سخن میں اپنا درجہ قائم کیا ہے، جرأت کے متعلق مولانا آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے کہ وہ صاحب طرز وایجاد تھے، اور آج تک ان کا طرز بیان ان ہی سے مخصوص ہے۔

ہم نے بخیال طوالت متقدمین ومتوسطین شعرائے اکبرآباد کے تلامذہ کے ذکر کو قلم انداز کردیا ہے۔ لیکن ایک جستجو کرنے والے کو تذکروں کے مطالعے سے بآسانی پتا چل سکتا ہے کہ ان باکمالوں کے دریائے فیض سخن نے کتنی ندیاں اور نہریں جاری کردیں اور ان ندیوں اور نہروں نے کتنے بڑے رقبے کو سیراب کیا، یہاں ہم میر تقی کے ہم عصر اساتذہ وادبائے اکبرآباد کے چند نام لیں گے۔ جو آگرے سے باہر نہیں گئے۔

میر امجد علی اصغر　صاحب دیوان تھے، صاحب گلشن بیخار نے تذکرہ کیا ہے۔

میاں نظیر اکبرآبادی	
قاضی واجد علی خاں واجد	نغمۂ عندلیب میں ذکر ہے
میاں محمدی بیدار	صاحب دیوان تھے اکثر تذکروں میں ذکر آیا ہے،
مرزا اکبر علی	تذکرہ میرحسن
شرف الدین علی پیام	״
جنون	״
میر محمد سجاد، سجاد	״ میر تقی ان کی شاعری کے بڑے مداح تھے۔
محمد محسن، محسن	״
محمد عارف، عارف	״
مجرم	گلشن بیخار
سید حسن خاں محو	نغمۂ عندلیب
بقاء اللہ بقا	تذکرۂ سرخوش

میاں نظیر اکبرآبادی کی [illegible]صیات شاعری پر اس عہد میں کچھ توجہ ہوئی ہے، مگر ان کے متعلق ہنو[illegible] کام ہونا ہے۔

اس مضمون میں یہ اشارہ کردینا کافی ہوگا کہ آج سے کم وبیش سو سال قبل میاں نظیر نے اس صنف کلام کی بنا ڈالی، جو اس زمانے میں باوجود اس قدر مقبول ہونے کے اتنی مکمل صورت اختیار نہیں کرسکی ہے۔ فطرت نگاری کو ابھی اتنا حقیقی اور سچا ہونے میں دیر لگے گی جس مقام پر اس کو نظیر پہنچا گئے ہیں، ہماری آنکھیں اس زمانے کو دیکھ رہی ہیں جب اردو زبان کے بولنے والے متقدمین میں تنہا ایک نظیر کو اردو کا فطری وحقیقی شاعر مانیں گے، نظیر کے متعلق ایک مزید اشارہ شاید بے محل نہ ہو اور وہ ان کی فرہنگ سے متعلق ہے نظیر کے یہاں ہمارے خیال میں الفاظ کی اتنی کثرت اور بہتات ہے، جو کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہ ملے گی، نظیر کا مطالعہ کرنے والے کے لئے ان کی فرہنگ ایک مفید موضوع تحقیق ہوسکتا ہے، اس ذیل میں ہم ایک نکتہ اور پیش کریں گے، آج لکھنوی زبان کی خصوصیات میں زری بھی زرا سٹیٹ لکھنؤ کا لفظ باور کیا جاتا ہے، مگر یہ لفظ نظیر کے یہاں بار بار استعمال ہوا ہے، اور اس کے علاوہ بھی بعض الفاظ اور محاورے نظیر کے کلام میں ملتے ہیں جو آج لکھنؤ کی زبان کے ساتھ مخصوص ہیں۔

عہد غالب میں ان کو ہم عصر اساتذۂ اکبرآباد میں سے بعض کے نام یہ ہیں۔

خلیفہ اسیر خلف میاں نظیر اکبرآبادی	صاحب دیوان تھے،
مرزا اعظم علی بیگ اعظم	صاحب دیوان ہونے کے علاوہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔
انعام اللہ انعام وساحر	خمخانۂ جاوید میں تذکرہ ہے
شیخ نیاز علی پریشاں	مصنف مثنوی سرمایۂ عشق وواسوخت وتذکرۂ شعر وسخن
سید مدد علی تپش	مصنف خزینۃ القواعد وجغرافیۂ منظوم
مولوی نبی بخش حقیر	صاحب دیوان تھے اور سخن فہمی کے لئے غالب کے ممدوح ہیں
مہاراجہ بلوان سنگھ	صاحب دیوان تھے۔
مرزا خانی رنج	واسوخت ومثنویاں یادگار ہیں
غلام محمد رہا	صاحب دیوان
سید بلاقی زر	دو دیوان دو واسوخت اور مثنوی دو فرعون یادگار ہے،

قطب الدین خاں باطن	صاحبِ دیوان ہونے کے علاوہ تذکرہ گلستانِ بیخزاں، نسخہ تقویم مرآۃ خیال، مثنوی غمِ دلربا اور خمسہ مثنوی میر حسن کے مصنف ہیں۔
وحمد خاں شیفتہ	مثنوی یادگار ہے۔ نغمۂ عندلیب میں ذکر ہے۔
منشی جواہر لال جواہر	مثنوی جواہر البیان یادگار ہے اور زبدۃ التاریخ کے نام سیر المتاخرین کا خلاصہ بھی لکھا ہے۔
میر سعادت علی سعید	صاحبِ دیوان تھے۔
مولوی اصغر علی اصغر	مصنف مثنوی شورشِ عشق، مثنوی بہارِ خود، وقائع منصور الزماں۔ نیرنگِ فرنگ، مفتاح الفرائض، لغات اصغر علی وغیرہ۔

اس مقالے میں اتنی گنجائش نہیں کہ ہم اساتذۂ اکبرآباد یا صرف میر و غالب کے ہم عمر شعراء و ادبا کو کلام نظم و نثر کا دوسرے مرکزوں کے اساتذہ سے مقابلہ کرسکیں۔ اس کے لئے ایک پورے دفتر کی ضرورت ہے، یہاں ہم دو چار بزرگوں کے متعلق چند اشارات کافی سمجھتے ہیں، ان میں ایک ہستی میر اعظم علی اعظم کی ہے، یہ میر امن کے ہمعصر ہیں، اور جس زمانے میں باغ و بہار چھپی اس سے آٹھ سال قبل اعظم اسی قسم کا ایک افسانہ موسوم بہ فسانۂ سرور افزا لکھ چکے تھے، لیکن افسوس کہ یہ کتاب زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہوسکی۔ لیکن اعظم کا کارنامہ ایک دوسری کتاب ہے جس میں انھوں نے اس وقت تک کی فارسی و اردو کتابوں پر تبصرہ کیا تھا، مگر حیف کہ وہ کتاب بھی مسودے کی ہی صورت میں رہی۔

دوسرا نام قطب الدین خاں باطن کا ہے، جو صاحبِ دیوان ہونے کے علاوہ تذکرہ گلستانِ بیخزاں یا نغمۂ عندلیب کے مولف ہیں، یہ تذکرہ نواب شیفتہ کے تذکرے کے جواب میں لکھا گیا تھا، کیونکہ شیفتہ نے میاں نظیر کا ذکر اہانت آمیز لہجہ میں کیا تھا، اس تذکرے کی قدر و قیمت مطالعے کے بعد معلوم ہوسکتی ہے، باطن نے اس کے علاوہ بھی کئی تصنیفیں چھوڑی ہیں۔

پھر مولوی اصغر علی اصغر کا نام آتا ہے جو کم و بیش ستر کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں نصف کے قریب غیر مطبوعہ رہیں۔ وقائع منصور الزماں سات جلدوں میں بجواب بوستانِ خیال لکھی تھی، لیکن اس کی صرف پہلی جلد شائع ہوسکی، غالباً یہ کتاب پہلی نہیں تو چند پہلی کتابوں میں سے ہے جو سادہ غیر مقفیٰ زبان میں تصنیف ہوئیں۔ ورنہ اس وقت تک اردو نثر مقفیٰ و مسجع عبارت ہی میں لکھی جاتی تھی۔

یہاں تک کے بیان سے یہ بات واضح ہوجانا چاہیئے کہ آغازِ اردو سے لے کر اس وقت تک جب کہ شعر اردو مضمون و تخیل کے اعتبار سے شعر بنا، آگرے کے ہنرمند و اہلِ کمال نہ صرف پیش پیش رہے، بلکہ ہر عہد میں اردو کا پرچم انھیں کے ہاتھوں میں لہراتا رہا ہے، لیکن مورخوں نے آگرے کی ان خدمات کو ایسی ہٹ دھرمی کے ساتھ پامال کیا کہ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی سا بزرگ بھی بیتاب ہوگیا، مقدمہ نکات الشعراء میں مولانا شروانی لکھتے ہیں۔

"دہلی و لکھنؤ کی ہنگامہ آرائیوں میں آگرہ گرہ در گلو ہے مگر اس کی بے زبانی صاف کہہ رہی ہے کہ تیسرے دَور تک جو بلاکشانِ محبت بزمِ سخن میں آئے اُن میں سے اکثر کے دماغ اس کی بادۂ کہن سے پُرکیف تھے، شاہ مبارک آبرو، شرف الدین مضمون، سراج الدین علی خاں آرزو، مرزا مظہر قدس سرہٗ، میر تقی کی ذات پر اول اکبرآباد کو ناز ہے، اس کے بعد دہلی و لکھنؤ کو، جب مرزا غالب بھی بزم آرا ہوجائیں پھر آنکھ ملانا آسان نہیں رہتا۔

اب ہم ایک اقتباس مولانا شرر مرحوم کے مضمون سے دیتے ہیں جو نقاد مئی ۱۹۱۹ء میں شائع ہوا تھا،

"واقعہ یہ ہے کہ اردو زبان آگرہ و دہلی میں پیدا ہوئی، اردوئے معلیٰ میں نشو و نما پاکے اُس نے اپنی موجودہ صورت پیدا کرلی، شجاع الدولہ، آصف الدولہ اور سعادت علی خاں کے زمانوں میں دربارِ دہلی کی کمزوری و بے استطاعتی اور لکھنؤ [illegible] بار کی دولتمندی و قدردانی کی وجہ سے تمام [illegible] کمال لکھنؤ پہنچ گئے، مرزا رجب علی بیگ سرور اکبرآباد میں پیدا ہوئے، وہیں

وہیں نشو و نما پایا، ناثرِ بے ہمتا بننے کے بعد لکھنؤ میں گئے":

صفیر بلگرامی کی رائے بھی سن لیجئے۔ جلوۂ خضر میں لکھتے ہیں۔

"نثر میں لکھنؤ نے بہت کم محنت کی، سرور کے بعد کوئی
ایسی تحریر نظر میں نہیں آتی جس کی مثال دی جائے، ہاں
قبل غدر ایک رسالہ حدیقۂ شہدا، مولوی امیر علی شہید کے
واقعے کا لطیفہ رنگ نہ فسانۂ عجائب لکھا گیا، اور ایک لوزتن
مہجور نے لکھا۔"

فسانۂ عجائب کا قبول عام اس سے ظاہر ہے کہ بہت مدت تک تالیف و تصنیف میں وہی طرزِ انشا اختیار کی جاتی رہی، اور جس طرح آبرو و مضمون آرزو و مظہر وغیرہ نے دہلی پہنچ کر زبان کو زبان اور شعر کو شعر کے درجے پر پہنچا دیا، اسی طرح سرور نے آگرے سے کانپور پہونچ کر فسانۂ عجائب لکھی، اور اس کے ذریعے سے لکھنوی زبان کی اساس قائم کردی۔

جاٹوں کی ترکتازی نے آگرے کی جو خانہ ویرانی کی وہ تاریخوں سے ظاہر ہے، اور اس کے بعد علمی و ادبی مشاغل کا پتا آگرے میں ڈھونڈھنا فضول ہے۔ متاخرین کے زمانے میں آگرے کی مجلسِ علم و ہنر قطعاً برہم ہوگئی تھی۔ لیکن صدر نظامت کے باعث ایک اُجڑی اجڑائی محفل ضرور تھی، جب ہائیکورٹ بھی آگرے سے الہ آباد کو منتقل ہوگیا تو عدم سرپرستی و ناقدر دانی نے آگرے کی مخلوق کو ہر قسم کے علمی و ادبی مشغلے سے بے پروا کردیا۔ لیکن اس ہمت شکن و حوصلہ فرسا زمانے میں بھی آگرے میں شعر و سخن اور علم و فن کی پرستش موقوف نہ ہوئی، اس عہد کے بعض بزرگوں کے نام یہ ہیں، جن کو زمانے نے اُبھرنے کا موقع نہ دیا۔

مولوی احمد علی خاں شوقی	صاحب مینا بازار
مولوی جمیل الدین ہجر	صاحب آرسی مصحف
مولوی نثار علی بیگ	مصنف قواعد فارسی و اُردو و سفرنامہ حجاز و یورپ
مرزا خادم حسین رئیس	صاحب دیوان
ماسٹر توصیف حسین واصف	صاحب دیوان
مولوی احسن اللہ خاں ثا[illegible]	صاحب قند پارسی
کالے خاں بقلی وغیرہ	

رئیس، واصف اور نثار اپنے وقت کے اساتذہ میں سے تھے، قلتِ وقت ہمیں ان کے کلام پر سرسری نظر ڈالنے سے بھی باز رکھتی ہے، لیکن ان کا مرتبۂ شاعری اس سے ثابت ہے کہ مولوی نجم الغنی رامپوری جو متعدد کتابوں کے مصنف اور مشہور بزرگ ہیں، اپنی تصنیف بحر الفصاحت میں ان بزرگوں کو داغ سے بہتر شاعر مانتے ہیں، ان کی یہ تصنیف فنِ عروض پر ہے، اس کتاب میں انھوں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ رعایت لفظی جو کسی زمانے میں اُردو شعرا اور اس طرح لکھنؤ اسکول کا طرۂ امتیاز تھا، اور جو امانت و ناسخ کے عہد میں بد مذاقی کی حد کو جا پہنچی۔ دراصل شعرائے اکبرآبادی ہی کی ایجاد و اختراع تھی، اس کی تائید میں صاحبِ تصنیف نے اکبرآبادی اساتذہ کے کلام کی مثالیں بھی پیش کی ہیں، جن کی اس زمانے کے دہلوی شعرا تقلید کرتے تھے۔

فنِ صحافت کے ذریعے سے زبان کی جو خدمت ہوسکتی ہے، اس میں بھی اہلِ آگرہ بہت نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، ہم صرف میر اکبر علی فیروزآبادی ایڈیٹر ادیب اور خواجہ یوسف علی اکبرآبادی کے نام پیش کریں گے، ادیب اردو کے اولین رسالوں میں سے ہے، جس کے مضمون نگاروں میں مولوی چراغ علی اور مولوی ذکاء اللہ کے نام نظر آتے ہیں، اسی زمانے کے بزرگوں میں مولوی عبد الرزاق صاحب البرامکہ و نظام الملک طوسی، مرزا فاضل بیگ مصنف الخاتون، مولوی سعید احمد مصنف مرقع اکبرآباد، اُمرائے ہنود و بوستانِ اخبار کے نام ہیں۔

عہد حاضر میں جو آگرے کا تاریک ترین دَور ہے شاہ نظام الدین دلگیر مرحوم ایڈیٹر نقاد کی خدماتِ ادب مخفی نہیں۔ مولانا سیماب اکبرآبادی کی قدرت و کمالِ شاعری سے کون واقف نہیں؟ حضرت عاشق حسین بزم اکبرآبادی اس وقت محاوراتِ زبان کے ماہر اور مرثیہ گوئی میں اعلیٰ مرتبے کے مالک ہیں۔ مرزا انجم آفندی کے قصیدے اس زمانے میں اُن کو برترین منصب کا سزاوار بناتے ہیں، مفتی انتظام اللہ پچاس سے زیادہ کتابوں کے مؤلف و مصنف وسیع المطالعہ بزرگ ہیں۔ محمد محمود محمود اکبرآبادی کی ادبیت مسلم ہے، اور خادم علی خاں احقر اکبرآبادی، شوخ اکبرآبادی، رعنا اکبرآبادی و حضرت محمد علی شاہ میکش کہنہ مشق و مخصوص شعرا ان میں سے ہیں۔

ضرورتِ اختصار نے اس مضمون کو نہایت تشنہ رکھا ہے، لیکن اگر زمانے نے فرصت دی تو مکمل صورت دے کر اسے ایک کتاب کی شکل میں پیش کیا جائیگا، مگر جن حضرات کو تحقیق و جستجو کا ذوق ہے، ان اشارات کی مدد سے مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے تک باسانی پہنچ سکیں گے کہ آگرے کے اربابِ فن نے اردو زبان کی نہایت قابل قدر خدمت کی ہے، اور اس کا اعتراف نہ کیا جانا سخت نا انصافی ہے۔

شرابِ پرتگالی

گھٹائیں وہ اُٹھیں قبلے سے کالی　　اُمورِ شرع کا اللہ والی

خطا کیا ہے، اگر میں جام بھر کر　　غمِ دُنیا سے دل کرتا ہوں خالی

بہار آئی ہے اُٹھ لے بادہ کش اُٹھ　　برغمِ توبہ فرمایانِ عالی

شرابِ تلخ میں، آ، غرق کر دیں　　خطیبِ شہر کی شیریں مقالی

دو عالم کی جوانی پر ہے بھاری　　مئے انگور کی پیرانہ سالی

نہ جانے کون تھا وہ مومنِ پاک　　یہاں جس نے بنائے کفر ڈالی

خدارا پھینک دے تشریفِ ناموس　　بوضعِ عاشقانِ لاُابالی

ترے اشعار کے شیشوں سے اے جوش
چھلکتی ہے شرابِ پُرتگالی

جوش ملیح آبادی

شہیدِ وطن ایک ایکٹ کا ڈرامہ

امین حزیں، بہاول پور

افرادِ ڈرامہ

رومیو	"فرار شدہ" انقلاب پسند نوجوان سلطنت کا اصلی وارث
سرقیس	رومیو کی ماں
شارزین	رومیو کی بہن
برنیل	رومی افواج کا سپہ سالار
کپتان	اور سپاہی وغیرہ

پہلا سین

پہاڑی منظر ——— تاریک رات

ایک بلند پہاڑی کے اوپر ایک تنہا بوسیدہ مکان ہے جس میں سرقیس اور شارزین ایک چھوٹی سی پتھریلی انگیٹھی کے پاس بیٹھی آگ تاپ رہی ہیں۔ انگیٹھی میں آگ جل رہی ہے، ان کے بائیں جانب ایک پرانے صندوق پر مٹی کا ایک چراغ ٹمٹما رہا ہے،

شارزین۔ (بیتابی سے) اماں! کیسی غضب کی سردی پڑ رہی ہے، سرد تیز ہوا کس طرح اس خاموشی کا سینہ چیر رہی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ سردی کے دیوتا، دنیا پر اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ نازل ہو گئے ہیں....

(چند لمحات کی خاموشی کے بعد)

امی! اگر بھائی اس سردی اور تاریکی میں آ رہا ہو..........!

سرقیس (مصنوعی مسکراہٹ سے) نہیں بیٹی! وہ اتنا بیوقوف نہیں ہے.... بھلا اس سردی میں۔؟

شارزین۔ اماں! ممکن ہے!........ میرا خیال ہے کہ چراغ کھڑکی میں رکھ دوں، تاکہ اس تاریکی میں روشنی اس کی رہنمائی کر سکے......؟

چراغ کھڑکی میں رکھنا چاہتی ہے، کہ ایک گولی سنسناتی ہوئی زور سے کھڑکی کی چوکھٹ پر لگتی ہے، شارزین دوڑ کر ماں سے لپٹ جاتی ہے۔

یکدم گولیوں کی بوچھاڑ سے کھڑکی نیچے گر جاتی ہے دور پہاڑی کی ڈھال سے اترتے ہوئے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آ رہی ہے۔ شارزین استفساراً نگاہوں سے ماں کو دیکھنے لگتی ہے۔

دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ سرقیس بیٹی کو دروازہ کھولنے کا اشارہ کرتی ہے، وہ سہمی ہوئی اٹھتی ہے اور دروازے کی طرف جاتی اور اُسے کھولتی ہے، ایک طویل القامت نوجوان جو زرق برق فوجی لبادے میں

---

[1] مسز فرگوسن کا "کیمبل آف کلو" میں نے فروری ۱۹۴۴ء میں پڑھا تھا، اس سے جو تاثرات میرے دل پر ہوئے اُن سے مجبور ہو کر میں نے جنوری ۱۹۴۵ء میں "شہیدِ وطن" لکھا، ممکن ہے اس میں "کیمبل آف کلو" کی کہیں کہیں جھلک نظر آئے۔ مگر اسے اس کا چربہ نہیں سمجھنا چاہئے۔ — حزیں

ملبوس ہے، تیزی اور جوش سے اندر داخل ہوتا ہے،
شارنین خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹتی ہے، پھر آگے بڑھ کر تیزی
سے دروازہ بند کرنا ہی چاہتی ہے کہ وہ آگے بڑھ کر
اُسے اُٹھا لیتا ہے، اور اُسے اپنے گھوڑے کے آگے
ڈال کر مخالف سمت وادی میں غائب ہو جاتا ہے۔
شارنین امداد کے لئے چلّانے لگتی ہے۔

شارنین ۔ ہائے ...... ہائے ...... بھائی! پیارے بھائی رومیو!
...... مجھے وحشی درند......
آگے کچھ بولنا چاہتی ہے کہ سوار اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ
دیتا ہے۔

سوار ۔ بیہودہ چھوکری! میرے زبردست ہاتھوں میں پھنس کر امداد کے
لئے چلّانا، اپنی روح کو ناحق پریشان کرنا ہے ....
بے سود اپنے دماغ کو اُلجھنوں میں نہ ڈال! ...... اب
تیری حیات اور موت کا میں واحد مالک ہوں۔
گھوڑا بدستور سرپٹ جا رہا ہے، جس کے ٹاپوں کی آواز
کہسار کی خاموش فضا میں ایک تلاطم برپا کر رہی ہے،
یکایک گولی چلنے کی آواز آتی ہے ...... سوار گر
پڑتا ہے اور لڑکی بیتھرلی زمین پر آ رہتی ہے اور بیہوش
ہو جاتی ہے، چند لمحات کے بعد قریب کی جھاڑیوں
سے ایک نقاب پوش نمودار ہوتا ہے، اور اس لڑکی
کو لے کر مخالف سمت بھاگ جاتا ہے۔

دُوسرا سِین

منظر ———— دوسری رات

جھونپڑے میں شارنین، سرقیس اور رومیو بیٹھے ہوئے ہیں
آگ بدستور جل رہی ہے۔

شارنین ۔ بھائی جان! آپ نے گذشتہ رات مجھے خوب بچایا! ....
ورنہ میں ...... (سر جھکا لیتی ہے)
بھائی جان! آپ وہاں کیسے پہنچے؟

رومیو ۔ اندھیری رات میں جب برف پورے زور سے پڑ رہی تھی ...
اور ہوا دیوانوں کی طرح سرگرداں چل رہی تھی ...... میں اسی
سڑک کی نچلی پگ ڈنڈی سے گھر کی طرف چلا آ رہا تھا ————

شارنین ۔ (چلبلے پن سے بات کاٹ کر) دیکھو اماں! میں کہتی نہ تھی کہ بھائی
چلا آ رہا ہوگا۔ (مگر سرقیس بے اعتنائی سے سر ہلا کر پھر رومیو کی طرف
متوجہ ہو جاتی ہے) کیونکہ میری تلاش میں بہت جاسوس گشت
لگا رہے تھے، اور میں اُن سے بچ کر اپنے گھوڑے کو آہستہ
آہستہ چلا رہا تھا ———— یکایک مجھے گھوڑے کی ٹاپوں
نے چوکنا کر دیا، میں فوراً اپنے گھوڑے کو ایک درخت سے
باندھ کر ایک قریب کی جھاڑی میں چھپ گیا۔ اور رائفل سے
فائر کر دئے ......

سرقیس ۔ بیٹا! اب یہاں ہماری جانیں خطرہ سے خالی نہیں ......
بہتر ہے کہ ہم کسی اور جگہ کو اپنا مسکن بنائیں ......

رومیو ۔ نہیں امی! مجھے صبح ہونے سے پیشتر یہاں سے دو سو میل کے
فاصلہ پر ہونا چاہیئے ...... اور مارسے کی بندرگاہ پر
مجھے اُن سے ملنا ہے، ———— اگر میں نے وعدہ خلافی
کی، تو ان سب کو اپنا پروگرام تبدیل کرنا پڑے گا ...... جو
...... جو خطرہ سے خالی نہیں، ...... پھر مکان بدلنا
یا نہ بدلنا ہمارے اختیار سے باہر ہوگا۔

شارنین ۔ پیارے بھائی! آزادی کی راہ ...... اتنی دشوار گزار اور
پُر خار جھاڑیوں سے وابستہ ہے ———— یہاں پتھر
کا کلیجا، کوہ فگن ہمت اور غیر فانی جرأت و استقلال کا
کام ہے ......!

رومیو ۔ (بات کاٹ کر) بھولی بہن! اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟
———— کیا میں ان مصیبتوں کے طوفان سے گھبرا کر اپنے عزم
غیر متزلزل کے جھنڈوں کو سرنگوں کر دوں؟ ———— آزادی
کی غیر فانی اور حسین زندگی کو غلامی کا مکروہ جامہ پہنا کر مسخ کر دوں
اپنے آزاد ضمیر کو دوسروں کا تابع فرمان کر دوں! ......
یہ مجھ سے کسی صورت نہیں ہو سکتا ......

شارمین:۔ پیارے .... دیکھو! تم میرے تنہا بھائی ہو .... اور
...... اب تک ہم نے بہت دُکھ اُٹھائے ہیں ......

رومیو:۔ بھولی بہن! ایسی بے معنی گفتگو سے دماغ کو پریشان نہ کرو ......

سرقلیس:۔ بیٹی خاموش رہو ....

(یکایک دروازے پر دستک ہوتی ہے)

ایک آواز:۔ شاہ روم زندہ باد!

دوسری آواز:۔ دروازہ کھولو!

رومیو بلا کسی خوف و تردد کے تمام وہ چیزیں جن سے
اس کی موجودگی کا شبہ ہو سمیٹ کر دوسرے ایک تنگ
و تاریک کمرے میں چھپ جاتا ہے، لڑکی دروازہ کھولنے
کو جایا ہی چاہتی ہے کہ والدہ اُسے اشارے سے روک
کر خود جاتی ہے اور دروازہ کھولدیتی ہے ....
سالار اعظم کپتان اور چند سپاہی اندر داخل ہوتے ہیں،

سالارِ اعظم برنیل:۔ (سرقلیس کے سامنے ٹھہر کر اُس پر قہر آلود نگاہیں ڈالتے ہوئے) بڑھی گھنی! اس سے پیشتر تونے ہمیں زبردست دھوکے دیئے ہیں ______ ممکن تھا کہ ہماری زندگیاں بھی ان دھوکوں کی نذر ہو جاتیں! ....

کمر کے پیچھے ہاتھ باندھکر کچھ سوچنے لگتا ہے، اور بیٹھنے
کے ارادہ سے قدم بڑھانا چاہتا ہے، کہ ایک ٹین کا
چمچہ اُس کے پاؤں سے ٹکرا کر آواز پیدا کرتا ہے و

برنیل:۔ (اسے اُٹھا کر مصاحبوں کو متوجہ کرتے ہوئے) دغاباز .... عیار ...... رومیو! اب ہمارے ہاتھوں سے بچ کر کہاں جاسکتا ہے؟ ...... (کپتان سے) وہ یقیناً یہیں موجود ہے، اس سے اس نے کھانا کھایا ہے ......

کپتان:۔ (سپاہیوں سے) گھر کی تلاشی شروع کردو ......

سرقلیس:۔ (نفرت آمیز لہجہ میں، نشۂ اقتدار میں مست انسانو! کیوں اس قدر بدگمانی کرتے ہو۔ اس میں میں نے کھانا کھایا ہے ...... آپ ناحق گھر کی تلاشی نہ لیں، میرے اور بیٹی کے سوا یہاں اور کوئی نہیں ......

برنیل:۔ بڑھیا! تو اُن کی نگاہوں کو دھوکہ دینے کی کوشش کر رہی ہے جو بال کی کھال اُتارنے، آثار سے نتائج مرتب کرنے، لاینحل گتھیوں کو سلجھانے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں، ہمیں کامل یقین ہے کہ اب کی دفعہ ہمارا مطلب حل ہو کر رہے گا۔

تھوڑی دیر بعد سپاہی رومیو کو رسیوں میں جکڑے
ہوئے اندر سے برآمد ہوتے ہیں۔

برنیل۔ آہاہا! خوب!! چالاک بڑھیا! .... کیوں، یہ فریب! دغاباز عورت سُن! تُو نے ہمارے پنجے سے اپنے بیٹے، سلطنتِ روما کے غدار بیٹے کو بچانے کی بہت کوشش کی ...... مگر ہماری دوربین نگاہوں نے تیرے پردۂ راز کو تار تار کرکے حقیقت کی زبردست آندھیوں کی نذر کر دیا ہے۔ ہم نے تیرے فرسودہ خیالات آزادی کے فلک بوس قلعوں کو ناکامی کی آتش سے جلا کر خاکستر کر دیا ہے .... تو آج دیکھے گی کہ تیرا لختِ جگر تیرے سامنے ذبح کر ڈالا جائے گا!

شارمین:۔ نہیں نہیں! میرے پیارے بھائی کی قیمتی زندگی کسی قیمت پر بھی ضائع نہیں کی جاسکتی .... ظالمو! رحم کرو (نصف بے خودی کے عالم میں) میں اپنی دنیائے غربی و بیکسی کے غبار آلود آسمان پر صرف یہی ایک ستارہ رکھتی ہوں ...... جو میری قسمت کی رہنمائی کر رہا ہے۔ جو اپنی مدہم روشنی سے میری تنہائی اور سوگوار راتوں کو راحت اور عشرت سے بدل دیا کرتا ہے ...... نہیں نہیں! میں اپنے بھائی کو ہرگز ...... ہرگز جدا نہ ہونے دوں گی ..... اس کے بغیر میری دنیائے تمنائیں تاریکی کے ہیبت ناک طوفان چھا جائیں گے۔ (روتے ہوئے) ظالمو! تمہارے ظالم ہاتھ ہم پر کیوں زندگی تنگ کر رہے ہیں؟ تم نے ہمیں بستیوں سے دُور جنگلوں اور پہاڑوں کی ناقابلِ برداشت سردی اور طوفانوں میں رہنے پر مجبور کیا ہے ...... تم نے ہمیں تمام دنیوی عیش و آرام سے محروم کرکے تنہائی اور بیکسی کے ذلت آمیز غار میں ڈھکیل دیا ہے .... آخر یہ سب کس لئے ہے؟ کیا اس لئے کہ میرا بھائی تخت کا حقیقی وارث ہے؟ کیا اس لئے

کہ ہماری آزاد گردنیں، ایک کمینہ خصلت، لالچی، خواہشوں کے غلام اور جذبات کے فرمانبردار چچا کے آگے نہیں جھکنا چاہتیں؟ ظالمو! خدا سے ڈرو .... ڈرو .... ڈرو اور دیوتاؤں کے عذاب سے ڈرو! پیشتر اس کے تمہارے ظالم ہاتھ ٹوٹ جائیں ...... تمہاری خونی آنکھیں پھوٹ جائیں .... آہ! دیوتاؤں کے نام پر، میری عصمت کے نام پر معاف کردو .....

برنیل:- (کپتان کی طرف شرارت آمیز ہنسی سے دیکھتے ہوئے) تمہارے جذبات کی آواز انتہائی دردناک ہے .... میں واقعی اس سے متاثر ہوا ہوں ...... ہاں! تمہارے بھائی کو معافی مل سکتی ہے ...... مگر ایک شرط پر ....

سرقیس - کیا ایک شرط پر میرے بچے کی رہائی؟

شارتین:- ایک شرط؟!

برنیل:- ہاں! ایک شرط ....

شارتین:- وہ کیا؟

برنیل:- وہ یہ کہ جو تمہارے بھائی سے پوچھا جائے، اس کا جواب بلا کم و کاست صحیح صحیح دیا جائے ....

(سپاہی رومیو کو سالار اعظم کے سامنے لاتے ہیں)

برنیل:- دیکھو! رومیو!! تم کو اس مقام کا بخوبی علم ہے، جہاں تمہارے ساتھی پناہ گزین ہیں ...... وہ شاہی مجرم ہیں ...... اس لئے تمہیں اس جگہ کا پتہ دینا ہے، اور اپنی باغی جماعت کے متعلق واقفیت ہمیں بہم پہنچانی ہے ....

(برنیل جواب کا منتظر رہتا ہے، رومیو خاموش رہتا ہے)

کپتان:- خاموش کیوں ہو؟ سالار اعظم کے سوال کا جواب دو!

رومیو - (بے اعتنائی سے) جواب؟ آہ! مجبور ہوں، میرے دل کے خلاف میری زبان جنبش کرنا بھی گناہ سمجھتی ہے ....!

برنیل:- دیکھو! اس ضد کو، جو عقل کے اندھے رہنا، اور جذبات کی فرسودہ خصلت ہے ...... چھوڑ دو ...... اور اپنی زندگی کو موت کی آہنی گرفت سے بچالو ....

رومیو - آہا ہا! زندگی اور موت ...... زندگی کی قیمت آزادی سے اور موت کی عزت وطن پر قربانی سے ہے! .... تمہارے خیالات جو تمہاری روحوں کا فریب آمیز، مگر رنگین جامہ ہیں، عزت کے بازار میں آزادی کا سودا نہیں جانتے .... آزادی کے علمبردار موت کی دہشت کے سامنے اپنے سربلند علم نگوں نہیں کیا کرتے ....

برنیل - بیوقوف چھوکرے! ذی ہوش انسان زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ اپنے ارادوں اور خیالات میں بھی تبدیلی کرتے چلے آئے ہیں، (قدرے نرمی سے) بہتر ہے کہ اپنی ناتجربہ کاری پر اپنی قیمتی زندگی قربان نہ کرو ....

رومیو - لیکن میں اپنی ناتجربہ کاری کو آپ کی تجربہ کاری کا سیاہ جامہ پہنانا نہیں چاہتا، اور اپنی "قیمتی زندگی" کی قربانی کے لئے اسی "ناتجربہ کاری" کو ہی خوش آمدید کہتا ہوں ...... میں اپنے "ارادوں اور خیالات" میں کسی قسم کی تبدیلی کرنا اپنے عقائد کے خلاف جنگ، فطرت کے خلاف دشمنی، عزت کے لئے تباہی سمجھتا ہوں ...... آپ میرے سمجھانے کی بے سود کوشش نہ کریں .... ہم جن فرائض کی انجام دہی پر مامور کئے گئے ہیں اُنہیں کے اتمام کے لئے ہماری زندگیاں ختم ہونی چاہئیں ..... ہم دونوں کی راہیں مختلف ہیں۔ آپ کی کامیابی ایک آزاد روح کو غلام بنانا ہے، اور میری کامیابی اپنی اور اپنے وطن کی آزادی کے لئے جان کی قربانی کرنا ہے۔

برنیل، کپتان کی طرف مایوسانہ نگاہوں سے دیکھتا ہے، کپتان سپاہیوں سے اشارہ کرتا ہے، سپاہی اس کو دوسرے کمرے میں لے جاتے ہیں، شارتین بھی بیتابانہ اپنے بھائی کے ساتھ چلی جاتی ہے، اب سالار سرقیس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

برنیل - (نرم لہجے میں) دیکھو بڑی بی! تمہاری آرزوؤں کا روشن انجام، شفقت مادری کا حسین راز، تمہاری بوڑھی ہڈیوں کا سہارا رومیو اور صرف رومیو ہے .... بہتر ہے کہ اسے دنیا کی رنگینیوں سے محروم نہ کرو، اور اپنی بوڑھی حیات کو چین سے

گزارو...... میرے مشورے سے فائدہ اُٹھاؤ اور اس ضدی
چھوکرے کو سمجھاؤ۔

سرقیس۔ میں آپ کے مشورے سے فائدہ اٹھانا، ایک لعنت آمیز گناہ کا
ارتکاب سمجھتی ہوں.......

برنیل۔ دیکھو! ہم نے بہت سی توقعات تم سے وابستہ کی ہیں۔

سرقیس۔ فضول توقعات سے دل و دماغ کو دھوکہ نہ دو.......

برنیل۔ ہیں؟

سرقیس۔ ہاں!

برنیل۔ (دانت نکالتے ہوئے) بڑھیا پاگل ہو گئی ہے!

کپتان۔ آخر بڑھاپا ہے!........ آپ سمجھائیں، سمجھ جائے گی...

سرقیس۔ میری شام زندگی کا مذاق اُڑانے والے! اندھو!! اپنی عقل
کا جائزہ لو....... تمہاری غلام روحیں جن میں سچائی مردہ،
ناموس گم، اور جذبات آزادی فنا ہو چکے ہیں۔ میرے بوڑھے
مگر آزاد دل کو دیکھ کر بھسم کیوں نہیں ہو جاتیں،.........
جو مصائب کے طوفانوں کا، حوادث کی دوزخ کا، تمہارے
مظالم کے فریب آلودہ کارناموں کا ہنستے ہوئے مقابلہ کر سکتا
ہے....... موت؟...... آہ! تم میرے نوجوان...
آزاد نوجوان........ بیٹے کی موت کا سامان کر رہے ہو!
.... کیا تمہیں ہماری کس مپرسی اور بیکسی پر رحم نہیں آتا...
..... آہ! مظلوموں کی آہوں کے شعلے تمہیں خاکستر کر دیں گے
.... رحم کرو!...... رحم!.....

برنیل۔ (غصے اور بے چینی سے) زبان دراز! ذلیل!!........ تو
ہماری مہربانیوں سے غلط فائدہ اُٹھا رہی ہے، تیری بیہودہ
باتیں۔ تیری مزید بکواس، ہمارے آہنی عزائم میں کسی قسم کی تبدیلی
کرنے سے قاصر ہے!...... ہمارے زبردست ہاتھوں میں پھنس کر
تمہارے لئے صرف دو ہی راستے ہیں...... موت یا حیات
.... اور بس!......

سرقیس۔ فرعونیت اور شوکت کی رنگینیوں میں کھوئے ہوئے انسان!
کچھ ہوش کی خبر لے..... موت شہیدانِ آزادی کے لئے ایک
ایسی ابدی زندگی اور راحت ہے جس کی تمہارا گمراہ دماغ کوئی
قیمت نہیں سمجھتا۔

برنیل:۔ (شدتِ غصہ سے) بس! اب نتائج کے انتظار کی ہم میں مزید تاب
نہیں...... پھینک دو اس نابکار کو برف پر اور اس کے ملعون
بیٹے کو لاؤ۔

دو آدمی لپک کر سرقیس کو اٹھاتے ہیں، اور کھڑکی سے
باہر پھینک دیتے ہیں۔ ایک خوفناک چیخ بلند ہوتی ہے،
پھر مکمل سکوت چھا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد رومیو سامنے
لایا جاتا ہے۔ اسے کتے کی موت مار دو!

سپاہی بندوقیں اُٹھاتے ہیں اور اُن کا مُنہ رومیو
کی طرف کرتے ہیں، شارنین بے تحاشا برنیل کے قدموں
پر گر جاتی ہے۔

شارنین:۔ (ملتجیانہ آواز میں) رحم..... رحم...... رحم

برنیل:۔ تمہاری رحم کی آواز کے لئے میرے کان بند ہیں۔

شارنین۔ کس لئے...... کیوں؟.......

برنیل:۔ بس اسی لئے کہ تمہارا بھائی میرے کانوں کو اپنے افشائے راز
سے کھولنا نہیں چاہتا.......

شارنین۔ (پریشانی میں چاروں طرف مبہوت نگاہوں سے دیکھتی ہے)
آہ! مجبور ہوں........ ایک طرف بھائی کی حسین زندگی.....
دوسری طرف سینکڑوں زندگیاں...... اور وطن......
ظلم اور فساد سے آزادی!...... کیا کروں؟..... کچھ سمجھ
میں نہیں آتا.... !

برنیل۔ سپاہیو!

شارنین۔ نہیں!....... نہیں!..... ٹھہرو!

برنیل۔ کس لئے؟

شارنین۔ میں بتائے دیتی ہوں.......

کپتان۔ شاباش!...... بھائی کی محبت!؟...... واقعی تم
بہت اچھی بچی ہو.......

شارنین۔ مگر ایک وعدہ!

برنیل ۔ وہ کیا ؟
شارنین ۔ میرے بھائی کی جان بخشی .... وعدہ کرو !
برنیل ۔ تم مجھ سے قسم لے سکتی ہو ....
شارنین ۔ اچھا !

(سالار اور کپتان شارنین کے نزدیک آجاتے ہیں)

شارنین ۔ (انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے) وہ یہاں سے دُور ....
مغرب کی طرف .... وہ اُس پہاڑی کی وادی کے پرلے
سرے پر .... اس دریا کے اُس طرف بندرگاہ سے
آدھ میل کے فاصلے پر ....

برنیل ۔ بندرگاہ سے مشرق کی طرف ؟
شارنین ۔ (سر ہلاتی ہے)
برنیل ۔ ہاں ! ہاں !! اب میں سمجھ گیا (سب کو اشارہ کرتا ہے، سب
جانا چاہتے ہیں)
شارنین ۔ (راستہ روک کر) میرے پیارے بھائی کی زندگی، اب تو
محفوظ ہے نا ؟
برنیل ۔ بیشک ! ہمیشہ کے لئے محفوظ ....
شارنین ۔ لیکن آپ اسے لئے کہاں جا رہے ہیں ؟ !
کپتان ۔ کہیں نہیں ! دروازے کے باہر اسے چھوڑ دیں گے ۔

سب دروازے سے گزر کر باہر جاتے ہیں، شارنین
اپنے بھائی کے انتظار میں کھڑکی سے جھانکنے لگتی ہے،

یکایک گولی چلنے کی آواز آتی ہے، سرقیس باہر سے
لڑکھڑاتی ہوئی اندر داخل ہوتی ہے۔ شارنین گھٹنوں
میں سر دئے سسکیاں بھر بھر کر رو رہی ہے ۔

سرقیس ۔ قاتل دنیا کے مجرم غلاموں نے آزادی کی جوری روح کو پامال
کر دیا .... میری آرزوؤں کا رنگین خواب ختم ہو گیا ۔ میری
غریب اور تباہ دنیا کے افق پر میرا چاند اپنی آخری کرنیں سمیٹ
کر غروب ہو گیا .... بیٹی نہ رو ! .... ہم تو یہ
بندوقوں کے فائر اس وقت تک سُنتے رہیں گے جب تک سامنے
والی پہاڑیوں پر چرواہوں کی بانسریوں اور ان کی بھیڑوں
کے گلوں میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی آوازیں ہمیں یہاں سنائی
دیتی رہیں گی .... صبر کرو ! .... آنکھوں سے
جاری ہونے والے چشموں کو رومیو کے ماتم میں خشک کر دو !
.... وہ آزادی کا ایک رنگین خواب تھا .... وطن
کی محبت اُس کے رگ و ریشہ میں رچی ہوئی تھی .... تاریخ
کے صفحات پر تمہارے بھائی کی زندگی اور اس کی قربانی سنہری
حروف میں لکھی جائے گی .... آزادی کے علمبردار اس کی اس
دلیرانہ موت پر فخر کریں گے .... دنیا کی مائیں اپنے بچوں کو ایسا
بنا سکھائیں گی .... (آگے بڑھتے ہوئے) اُٹھ ! بدنصیب
بھائی کی بدنصیب بہن !! اُٹھ ! تیرے بھائی کو اندر لے آئیں،
باہر سردی پڑ رہی ہے !

عالم کی بنا کیا ہے، یہ مجھ سے پوچھو
اصلِ دوسرا کیا ہے، یہ مجھ سے پوچھو
مذہب کا خدا کون ہے، یہ تم جانو
حکمت کا خدا کیا ہے، یہ مجھ سے پوچھو

حکیم آزاد انصاری

گُناہ؟

جی، اے مجتبیٰ الہ آباد یونیورسٹی

جاڑا پورے شباب پر تھا، کرسمس کی چھٹیاں ہونے والی تھیں، میرا ارادہ تھا کہ شہر جا کر کچھ تحفہ خرید لاؤں، آخر جب چھوٹی روزی دوڑتی ہوئی گاڑی تک آئے گی اور مجھ سے چمٹ جائے گی تو میں اُسے کیا دونگا، اور جب شریر جولیا میرا بیگ چھین کر بھاگے گی اور سوغات کی اُمید میں میرے سارے کاغذات فرش پر بکھیر دے گی تو اُسے کیا ملے گا، کچھ تو ضرور ہونا چاہئے۔ شہر کی خوشنما چیزیں قصبے میں کہاں ملا کرتی ہیں۔

شام کا وقت تھا، سردی بھی زیادہ پڑ رہی تھی، میں نے اپنا اُورکوٹ لیا اور شہر کی طرف پیدل روانہ ہوگیا، اگر پورا دو میل کا چکر بچ رہا ہو تو کیا بُرا ہے ——— میں نے شاہراہ چھوڑ کر گلیوں کا پُرپیچ مگر کم فاصلہ راستہ اختیار کیا، ہر طرف دھواں سا چھایا ہوا تھا، میونسپلٹی کے زرد نحیف روشنی والے لیمپ کہیں کہیں راستے میں ٹمٹماتے ملتے تھے، میں دل ہی دل میں تعطیل کو بہترین طریقے سے صرف کرنے کی ترکیبیں سوچ رہا تھا ——— مُرغابیوں کا شکار میرے لئے کتنا مسرت آفریں خیال تھا ——— جولیا پروں کے لئے جان دیتی ہے، اُس نے دو بڑے بڑے تکئے بنا لئے ہیں۔ ابکی بار جب تک وہ میرے لئے بھی پروں کے تکئے بنانے کا وعدہ نہ کرے میں اُسے شکار چھونے بھی نہ دونگا، ——— شریر جولیا — بوڑھے چوکیدار پوَل کی موٹی بیوی اپنے "ماسٹر" کے آنے سے کتنا خوش ہوتی ہے، جھریاں پڑا ہوا چہرہ مسکراہٹ سے شگفتہ ہو جاتا ہے۔

اِنھیں خوشگوار خیالات سے لطف اندوز ہوتا میں سنسان گلیاں طے کر رہا تھا کہ ایک ہلکی سی سیٹی نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

میں نے دیکھا کہ شام کے دھندلکے میں وہ دروازے سے لگی کھڑی تھی، اُس نے مجھے ہاتھ ہلا کر بلایا، اور جب میں اُس کے قریب گیا تو اُس نے آنکھ سے اندر آنے کا اشارہ کیا، میں نے اُس کے اشارے کی تعمیل کی، مگر نہیں بتا سکتا کیوں؟ وہ رخساروں اور ہونٹوں پر بہت زیادہ سُرخی لگائے ہوئے تھی، اُس کا لباس چُست اور بہت شوخ رنگ کا تھا۔ کمرے میں بہت معمولی قسم کا فرنیچر تھا۔ صرف ایک لیمپ جل رہا تھا جس میں سے دُھواں نکل رہا تھا، وہ میرے نزدیک بیٹھ گئی، خود ایک سگرٹ جلایا اور مجھے بھی پیش کیا۔ اُس نے میرے متعلق کچھ دریافت کرنا چاہا، مگر میں نے کہدیا کہ میں سیّاح ہوں اور دو ایک دن میں شہر کے آثار قدیمہ دیکھکر چلا جاؤں گا۔ میں نے کیوں اپنی شخصیت چھپائی، میں نہیں کہہ سکتا ——— شاید یہی کہ میں اُسے بتانا نہیں چاہتا تھا کہ میں کون ہوں؟

اُس نے کمرے میں چاروں طرف دیکھکر کہا، یہاں سردی ہے، آئیے، دوسرے کمرے میں چلیں، وہاں آتشدان میں آگ روشن ہے۔ ——— "آئیے نا" اُس نے میرے کاندھوں کو دباتے ہوئے کہا میں ٹھٹکا۔ کمرے میں اندھیرا تھا، آگ کی دھیمی سُرخ روشنی میں صرف ایک پلنگ نظر آرہا تھا، اُس نے میرے چٹکی لی، اور ہاتھ پکڑ کر

اندر رہ گئی۔

میرا سارا بدن کانپ رہا تھا، میں نے جوتے کا فیتہ تک نہیں باندھا، اور کوٹ لے کر میں تیزی سے باہر نکل گیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں کدھر جا رہا تھا، سخت جاڑے کے باوجود میں پسینے میں شرابور تھا، میرے دونوں کان جل رہے تھے ——— ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ میرا دم گھُٹ جائے گا ——— اور میں اپنے ضمیر سے پوچھ رہا تھا، کیا گناہ اسی کو کہتے ہیں؟

نسخۂ شفا

کنگ جارج ہاسپٹل لکھنؤ کا ایک مشاہدہ

جہاں انسان سوتا ہے بچھا کر موت کے بستر　　جہاں زورِ مرض سے زندگی ہوتی ہے مشکل تر

جہاں مُردوں کی صورت زندہ پیکر سانس لیتے ہیں　　جہاں جرّاح کے ہاتھوں میں نشتر سانس لیتے ہیں

جہاں اک مردنی سی چار جانب چھائی ہوتی ہے　　جہاں ہر صبح، شامِ مرگ کی انگڑائی ہوتی ہے

جہاں ملتی ہے دوزخ کی سزا موجِ تنفّس کو　　جہاں زہر آب ہوتا ہے عطا موجِ تنفّس کو

وہاں تُو اے مجسّم زندگی کیوں کر چلی آئی؟　　یہ تیری نوجوانی اور یہ رنگین رعنائی!

شہابی کوٹ پر چہرے کا یہ پرتو گلابی سا　　یہ لب سورج کی قاشیں سی، یہ ماتھا ماہتابی سا

یہ شوخی اور اُس پر بے حجابی واہ کیا کہنا　　پھر اُس پہ ہر طرف فتنہ خرامی آہ کیا کہنا

خبر تجھکو نہیں، کیونکر نظر پہ چھائی جاتی ہے　　تجھے معلوم کیا، تو کتنے دل برمائے جاتی ہے

وہ میرا دیکھنا مُڑ مُڑ کے تیری نوجوانی کو　　وہ تیرا چھیڑنا رہ رہ کے سازِ زندگانی کو

نہ اپنا ہوش ہے تجھکو نہ اپنی نوجوانی کا　　ابھی سر بند ہے شیشہ شرابِ ارغوانی کا

پلائے جا مریضوں کو مئے صحت پلائے جا　　یونہیں اِس غمکدے میں پھول بن کر مسکرائے جا

شفا جن کو نہیں ملتی کہیں، اُنکی شفا تُو ہے
خدا رکھے مریضانِ محبّت کی دوا تُو ہے

خانصاحب حکیم محمود علیخاں ماہر

رباعیاتِ خیام

عطاء اللہ، پالوی

بیا ور ید گر اینجا بود سخنداںے
غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد
(غالب)

فی زمانہ ہماری غلامانہ ذہنیت نے اس قدر ترقی کر لی ہے، اور موجودہ دور میں ہمارے معیار کو مغربیت نے اس قدر پست یا بلند کر دیا ہے کہ ہم مغرب کے مقابلے میں مشرق کی کوئی حقیقت ہی نہیں سمجھتے، شکسپیر کا ساحرانہ کلام پڑھ کر تو ہم جھومنے لگتے ہیں، لیکن انیس کی جادو بیانی ہم پر کوئی اثر نہیں کرتی، ملٹن و بائرن کا کلام پڑھ کر تو ہماری رگیں پھول اور رگو بھرا تی ہیں، لیکن اقبال و جوش کے اشعار ہمارے جامد خون میں ہیجانی کیفیت نہیں پیدا کرتے، اپیکوریس کے عیش پسند خیالات تو ہمیں مخمور کر دیتے ہیں لیکن ریاض خیرآبادی کے کلام کی شیرینیت ہمیں مسرور نہیں کرتی "آشنین" میں تو ہماری دلچسپی کے سامان بہت نظر آتے ہیں، لیکن "احسان" و "انقلاب" میں ہم کوئی جاذبیت نہیں محسوس کرتے، حالانکہ اگر انگریزی اور اردو ادبیات کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے، تو ہمیں اردو زبان میں بیشتر جواہر پارے ایسے ملیں گے جن پر ہم بجا طور سے فخر کر سکتے ہیں، اور انگریزی ادبیات میں بعض چیزیں ایسی ملیں گی جو غائت سربلند ہونے کے باوجود بھی ہر طرح ناقص ہیں، مثال میں "رباعیاتِ خیام" کو لیجئے، باوجودیکہ خیام یورپ کا مقبول ترین شاعر ہے، مگر اب تک وہ کلیتہً سمجھا نہیں گیا ہے، اور باوجودیکہ خیام کی رباعیات یورپ میں معراج قبولیت حاصل کر چکی ہیں، مگر اُن کا اصلی حسن نہیں نکھرا ہے، برخلاف اس کے اردو زبان میں رباعیاتِ خیام اپنی ساری رعنائیوں اور تمام سحر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو گئی ہیں، مگر اس کا کیا جواب کہ ہم مغربی ادبیات کی عالمگیری سے اس قدر مرعوب اور غلامانہ ذہنیت سے اس درجہ مغلوب ہیں کہ اُنسے پیش کرتے یا مغربی ادبیات کے ناقص نسخوں کے خلاف زبان ہلاتے ہوئے ڈرتے ہیں، بہرکیف آج اس امید میں کہ

کیا عجب میری نوا ہائے سحر گاہی سے
زندہ ہو جائے وہ آتش کہ تری خاک میں ہے
(اقبال)

میں اس عنوان پر کچھ لکھنے بیٹھ گیا ہوں، اور اگر مواقع نے اجازت دی تو آئندہ بھی اس موضوع پر روشنی ڈالوں گا۔

انگریزی ادب نے بیشک معراجِ کمال حاصل کر لیا ہے، اور یورپ نے تحقیق و تدقیق میں لاریب عدیم المثال کامیابی حاصل کی ہے، مگر اس کے باوجود عمر خیام کے معاملے میں یورپ کی ساری تحقیق و تدقیق اب تک بمنزلہ صفر ہے، مثلاً اگر یہ سوال کیا جائے کہ عمر خیام کب اور کہاں پیدا ہوا، کب اور کہاں مرا، وہ کس مشرب کا آدمی تھا، اور اُس کی

رباعیات تعداد میں فی الحقیقت کتنی ہیں تو یورپ کوئی جواب نہ دے سکے گا حالانکہ یورپ میں سب سے زیادہ شرف قبولیت خیام ہی کو حاصل ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ یورپ کا کوئی گھر ایسا نہیں جس میں رباعیاتِ عمر خیام کے متعدد ترجمے موجود نہ ہوں، یا یہ کہ یورپ میں جو قبول عام عمر خیام کو حاصل ہوا وہ کسی ایشیائی شاعر کو نصیب نہ ہوا۔ پھر ایسی صورت میں جب کہ وہ اپنے محبوب ترین اور مقبول ترین شاعر کے متعلق بھی کوئی تشفی بخش جواب نہیں دے سکتے۔ ان کی ہر بات پر ایمان لے آنا یا یہ کہ اُن کی ہر چیز کے مقابلے میں اپنی چیز کو خواہ مخواہ ناقص خیال کر لینا کس قدر افسوسناک اور شرمناک بات ہے؟

یورپ کو نظر انداز کیجیے، آج ساری دنیا میں کوئی مہذب زبان ایسی نہیں جس میں رباعیاتِ خیام کے متعدد ترجمے موجود نہ ہوں، عربی ترکی، جرمنی، فرانسیسی، لاطینی اور روسی غرض ہر زبان میں کئی کئی ترجمے موجود ہیں جس کی مختصر فہرست جناب میر ولی اللہ اپنی تصنیف "کاس الکرام" میں اور طویل فہرست جناب کاشی پرباگی اپنے مضمون "عمر خیام" میں پیش کر چکے ہیں، لیکن یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ دوسری کل زبانوں سے زیادہ ترجمے انگریزی زبان میں ہیں، چنانچہ حضرت آغا شاعر اپنی تصنیف "خمکدۂ خیام" میں اپنا ایک واقعہ اس طرح لکھتے ہیں۔

"جب راقم الحروف نے صرف ایک جلد انگریزی ترجمے کی دیکھنے کی غرض سے طلب کی تو بینی وبین ربہ میں یہ دیکھکر حیران رہ گیا کہ منیجر کتب خانہ نے ایک لمبی چکلی میز صرف عمر خیام کے ترجموں سے بھر دی جو مختلف ڈیزائن اور مختلف مذاق کی تصویروں سے آراستہ تھے۔"

حقیقت یہ ہے کہ انگریزی زبان میں "رباعیاتِ خیام" کے جتنے ترجمے ہوئے ہیں اور کسی تصنیف کے نہیں ہوئے، ان بیشمار تراجم میں صرف ایڈورڈ فٹز جرلڈ ہی (   ) کا ترجمہ ایسا ہے جسے تمغۂ اولیت و افضلیت اور عدیم المثال مقبولیت حاصل ہے، چنانچہ عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ خیام کو یورپ سے روشناس کرانیوالا پہلا شخص ایڈورڈ فٹز جرلڈ ہے۔

اس سلسلے میں شاید یہ عرض کرنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ ہندوستانیوں نے بھی رباعیاتِ خیام کے ترجمے انگریزی زبان میں کئے ہیں۔ جن میں سب سے بہتر ترجمہ "رابندر ناتھ ٹیگور" کا ہے۔ مگر جہاں ہر دماغ پر "فٹز جرلڈ" کی قابلیت کا سکہ جما ہوا ہو اور جہاں غلامانہ زندگی نے دماغی توازن ہی بگاڑ دیا ہو وہاں "رابندر ناتھ ٹیگور" کی دماغ سوزیوں کی کون قدر کر سکتا ہے، رابندر ناتھ کا ترجمہ ہزار بہتر سہی، ہم جرلڈ کے ترجمے پر اُسے محض اس لئے فوقیت نہیں دے سکتے کہ وہ ایک "مشرقی" شاعر کے دماغ کی پیداوار ہے، اور مشرقی شاعر کسی طرح قابلِ اعتنا نہیں ہو سکتا۔

ایڈورڈ فٹز جرلڈ کی بلند حوصلگی اور اُس کا علمی تبحر مُسَلَّم اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ جرلڈ کا ترجمہ بعض وجوہ سے دیگر تراجم پر فوقیت رکھتا ہے، لیکن نہ تو یہ صحیح ہے کہ یورپ سے خیام کو روشناس کرانے والا پہلا شخص جرلڈ ہے اور نہ یہ کہ وہ رباعیات خیام کا سب سے بڑا اور سب سے بہتر مترجم ہے، کیونکہ جرلڈ سے بہت قبل عمر خیام کے خیالات یورپ میں پیش کئے جا چکے تھے، خود جرلڈ کے استاد پروفیسر "ایڈورڈ بیلز کول" نے اس قدر بہتر طریقے پر یہ خدمت انجام دی ہے کہ اُسے فراموش نہیں کیا جا سکتا، ہاں اس قدر یقینی صحیح ہے کہ جرلڈ ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے "رباعیاتِ خیام" کا منظوم ترجمہ پیش کیا، لیں؛ رہی ترجمے کی خصوصیت تو اس کا حال یہ ہے کہ اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے اور ترجمہ کی تمام خصوصیات کو پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ ترجمے کے لحاظ سے جرلڈ کا ترجمہ سب سے زیادہ مہمل اور ناقص ہے، کیونکہ "جرلڈ" نے ترجمہ نہیں کیا ہے، بلکہ خیام کے خیال کو اپنے الفاظ میں ادا کیا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ یورپ نے خیام کو خوش آمدید کہا، ورنہ اگر صحیح معنی میں ترجمہ ہوتا تو شاید اسے وہ مقبولیت نہ حاصل ہوتی، جو اس وقت ہے۔

اس سلسلے میں جرلڈ کی "ایمانداری" بھی خاص طور سے مثالاً پیش کی جاتی ہے، اور کہا جاتا ہے کہ اُس نے خیام کے کلام کے ساتھ ایمانداری برتی، یعنی اُسے "خیام کا خیال" کہہ کر پیش کیا، ورنہ اگر وہ اس موقع پر خاموشی اختیار کر لیتا تو دُنیا اس کو اُسی کے دماغ کی پیداوار سمجھتی۔ ممکن ہے یہ حسنِ ظن صحیح ہو، مگر میں سمجھتا ہوں کہ جرلڈ ایمانداری کا لحاظ کئے بغیر بھی ایسا

کبھی نہ کرتا، کیونکہ اُس کا نکتہ رس دماغ سمجھتا تھا اور اُس کی باریک بین آنکھیں دیکھتی تھیں کہ زبانوں کا عروج و زوال قطعی ہے، ایسی صورت میں جب کسی دوسری زبان کی ترقی کا دَور آئے گا، یہ بھانڈا پھوٹ کر رہیگا، اور ظاہر ہے کہ اس وقت جو سُبکی ہوگی وہ اس دَور کی شہرت سے بدرجہا بدتر ہوگی۔

بہرکیف ترجمے کی خوبی یہ ہے کہ بجز زبان کے اور کوئی چیز بدلنے نہ پائے، اندازِ بیان، لب و لہجہ اور الفاظ و خیال اُسی طرح رہیں جس طرح اصل میں ہیں، پھر زبان کی خوبی بھی اپنی جگہ اٹل ہے، ورنہ اگر ترجمے کی زبان ناکارہ ہوگی تو ترجمہ کبھی مقبول نہ ہوگا، غرض مترجم اُسی وقت تک مترجم ہے جس وقت تک کہ وہ مصنف کے طریقۂ تخاطب، اسلوب نگارش اور زورِ بیان غرض اصل تصنیف کے کل محاسن کو برقرار رکھے، ورنہ اگر مترجم نے اس سے آگے قدم بڑھایا تو پھر وہ مترجم نہیں ہے، اور جرلڈ کا ترجمہ اسی طرح کا ہے۔ اُس نے رباعی کا ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ رباعی کو دیکھکر اُس خیال کا ایک دھندھلا سا عکس اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف صحیح راستہ سے بھٹک گیا ہے بلکہ اُس نے غلط سلط ترجمہ کرکے خیام کے حسنِ کلام کو اس طرح غارت کر ڈالا ہے کہ استغفر اللہ۔ بہرکیف جرلڈ کے ترجمے کے متعلق جناب میر ولی اللہ فرماتے ہیں، کہ

فِز جرلڈ کے ترجمے کو تو عام اصطلاح میں ترجمہ کہہ ہی نہیں سکتے۔ فِز جرلڈ کی ایک انگریزی رباعی دیکھیئے، اور پھر رباعیات عمر خیام میں وہ رباعی ڈھونڈھیئے جس کا وہ ترجمہ ہے، بڑی کوشش اور کاوش کے بعد کوئی قریب قریب خیال کی رباعی مل جائے، تو ملجائے اور بعض صورتوں میں تو بالکل کوئی رباعی عمر خیام کی ایسی نہ ملے گی جس کا اس انگریزی رباعی سے دُور کا بھی تعلق ثابت ہوسکے۔

حقیقت یہ ہے کہ جرلڈ کی ایک رباعی بھی ایسی نہیں ملے گی جسے خیام کی رباعی کا صحیح ترجمہ کہا جاسکے، مثلاً چند رباعیاں ملاحظہ ہوں، عمر خیام کی ایک رباعی ہے ؎

صبح خوش مجزم است خیز اے ساقی   در شیشۂ کن شراب از شب باقی

ایں یکدم عمر را کہ فسرد اخاکی   جامے بن ارو خوش غنیمت میدان

جرلڈ نے اس رباعی کا ترجمہ اس طرح کیا ہے

Ah, fill the Cup:- what boots it to repeat-
How Time is slipping underneath our feet
Unborn Tomorrow, dead Yesterday
Why fret about them if To day be sweet-

یہ رباعی تو خیر ایک حد تک ملتی جلتی ہے بھی۔ لیکن جرلڈ صاحب کی ستم ظریفی دوسری جگہ ملاحظہ ہو، خیام کی ایک رباعی ہے،

یک چند بکودکے باستاد شدیم   یک چند باستادیٔ خود شاد شدیم
پایانِ سخن شنو کہ مارا چہ رسید   از خاک برآمدیم و برباد شدیم

جرلڈ اس رباعی کا اس طرح ترجمہ کرتا ہے

With them the seed of wisdom did I sow
And with my own hand laboured to grow
And this was all the Harvest that I reaped-
"I Came like Water, and like Wind I go"

استغفر اللہ، یہ ہے ترجمہ اور یہ ہے سب سے بڑے مترجم کی تضیع اوقات کا نتیجہ، کوئی مصرع بھی ایسا نہیں جو صحیح ترجمہ کے تحت آتا ہو، مزید لطف یہ ہے کہ جرلڈ کو یہ بھی خبر نہیں کہ جس رباعی کا ترجمہ کیا گیا ہے وہ خیام کی رباعی ہے بھی یا نہیں؟ کیونکہ با دنیٰ تفاوت، یہ رباعی دیوان مولانا روم میں اس طرح درج ہے۔

یک چند بکودکے باستا دشدیم   یک چند بردے دوستاں شاد شدیم
پایاں حدیث ما تو بشنو کہ چہ شد   چوں ابر در آمدیم و چوں باد شدیم

جرلڈ کا مصرعۂ آخر خیام کی رباعی کا تو نہیں، لیکن مولانا روم کی رباعی کے مصرعۂ آخر کا ترجمہ البتہ کہا جاسکتا ہے۔

ایک اور رباعی ملاحظہ ہو، خیام کہتے ہیں

لہ جرلڈ کی رباعیاں بجنسہٖ انگریزی زبان میں پیش کی گئی ہیں، تاکہ ان کی اہمیت کا اندازہ ہوسکے، ترجمہ اس لئے نہیں پیش کیا گیا کہ اس سے وہ بات جاتی رہتی جسے میں دکھانا چاہتا ہوں۔ (عطاء اللہ)

امشب مئے جام یکمنی خواہم کرد — خود را بدو جام مے غنی خواہم کرد
اول سہ طلاق عقل و دیں خواہم گفت — پس دختر رز را بزنی خواہم کرد

اس کو تو نظر انداز کیجیے کہ ترجمہ درست نہیں، جتنی رباعیاں منتخب کی گئی ہیں وہ سب کی سب معمولی درجے کی تھیں۔ عمر خیام کی ایک بھی اچھی رباعی ایسی نہیں جو جرلڈ نے چنی ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو جرلڈ خیام کو خوشنام نہیں کرنا چاہتا تھا، بلکہ اس کی شوخ رباعیوں کا ترجمہ کرکے اس کو سنجیدگی و متانت سے بے نیاز ثابت کرنا چاہتا تھا، یا پھر یہ کہ اُسے فارسی زبان سے ذرا بھی مس نہ تھا۔ آخر میں یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ جرلڈ کا ترجمہ "ترجمہ" نہیں ہے بلکہ خیام کے خیالات کا ایک ادنیٰ خاکہ ہے جو اصل رباعی سے اڑا کر بھل طریقے سے پیش کیا گیا ہے اور اس لئے اُسے رباعیات خیام کا سب سے بڑا مترجم نہیں کہہ سکتے۔

جس طرح دوسری زبانوں میں "رباعیاتِ خیام" کے ترجمے ہوئے ہیں، اردو زبان میں بھی اُن کی رباعیاں ترجمہ ہوئی ہیں، اور بقدر طاقت خود اکثروں نے اس میدان میں گھوڑے دوڑائے ہیں، مگر شہسواری ہر شخص کا کام نہیں۔ پھر کامیابی ہو تو کیسے؟ جناب کاشی پریاگی (الٰہ آباد) نے رباعیاتِ خیام کا جو ترجمہ کیا ہے وہ بہت مشہور ہے، لیکن مجھے نہ تو ان کا ترجمہ پسند ہے اور نہ ان کی تحقیق سے اتفاق ہے، کیونکہ انھوں نے خیام کی پیدائش "۵۱۰ھ اور ۵۳۰ھ ق کے درمیان" بتائی ہے، یہ ایک ایسی تحقیق ہے جس پر ایک بچہ بھی ہنس دے گا۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ خیام "مسلمان" تھا، اور اُس کی پیدائش حضرت محمد صلعم کی ہجرت سے چار سو سال بعد یقینی ہے۔ پھر ایسی صورت میں حضرتِ کاشی پریاگی کی تحقیق کے آگے کس طرح سرِ تسلیم خم کیا جا سکتا ہے؟

ترجمہ کا حال یہ ہے کہ کہیں کہیں لفظ تو لفظ پورا پورا مصرع اُسی طرح رکھ دیا گیا ہے۔ کہیں فارسی کا لفظ اس طرح لایا گیا ہے کہ ترجمہ کی لطافت غائب ہو گئی ہے۔ اور کہیں ایسا بھی ترجمہ کیا گیا ہے کہ جرلڈ کے ترجمہ کی طرح محض مفہوم یا خیال ادا کر دیا گیا ہے۔ مثلاً چند رباعیاں ملاحظہ ہوں، کاشی صاحب نے خیام کی ایک رباعی اس طرح لکھی ہے۔

شیخے بزنِ فاحشہ گفتا مستی — ہر لحظہ بدام دگیری پابستی
گفتا شیخا ہر آنچہ گوئی ہستم — ایا تو ہر آنچہ مینمائی ہستی

حالانکہ یہ رباعی اس طرح ہے۔

شیخے بزنے فاحشہ گفتا مستی — کز خیر گسستی و بہ شر پیوستی
زن گفت چنانکہ مینمائم ہستم — تو نیز چنانکہ مینمائی ہستی؟

اس رباعی کا ترجمہ کاشی صاحب اس طرح کرتے ہیں۔

اک شیخ نے رنڈی سے کہا مست ہے تو — گرماتی ہے ہر گھڑی نیا اک پہلو
کہنے لگی جو کہتے ہو سب کچھ ہوں میں — تم میں تو حقیقت کی نہیں نام کو بُو

اس ترجمہ میں "فاحشہ" کا ترجمہ "رنڈی" کیا گیا ہے جو صحیح تو ضرور ہے، لیکن اچھا نہیں معلوم ہوتا، بجائے اس کے "فاحشہ" ہی رہنے دیا جاتا تو بہتر تھا، نیز مصرعۂ ثانی و چہارم ایسا ہے جو کسی طرح بعید تاویلوں کے بعد بھی ترجمہ کی تحت میں نہیں آتا۔

کز خیر گسستی و بہ شر پیوستی

کا ترجمہ۔ ع

گرماتی ہے ہر گھڑی نیا اک پہلو

اور۔ ع

تو نیز چنانکہ مینمائی ہستی؟

کا ترجمہ ع

تم میں تو حقیقت کی نہیں نام کو بُو

میری سمجھ سے باہر ہے۔ اسی طرح خیام کی ایک رباعی کاشی صاحب نے اس طرح لکھی ہے۔

در کارگہ کوزہ گری رفتم دوش — دیدم دو ہزار کوزہ گویا و خموش
ناگاہ یکی کوزہ برآورد خروش — کو کوزہ گر و کوزہ خر و کوزہ فروش

حالانکہ یہ رباعی اس طرح ہے

در کارگہ کوزہ گرے بودم دوش — دیدم دو ہزار کوزہ گویا و خموش
ہر یک بزبانِ حال با من گفتند — کو کوزہ گر و کوزہ خر و کوزہ فروش

کاشی صاحب نے اس رباعی کا ترجمہ اس طرح کیا ہے،

آئے میں جو کل رات گیا رفتۂ ہوش — دیکھے ان گنت کوزے گویا و خموش
نالہ کیا اک کوزے نے با جوش و خروش — کو کوزہ گر و کوزہ خر و کوزہ فروش

"کارگہ کوزہ گرے" کا ترجمہ "آدسے" کیا گیا ہے جو اگر درست نہیں تو غلط بھی نہیں ہے۔ لیکن "دوش" کے معنی جو "کل رات" بتایا گیا ہے وہ یقینی غلط ہے، پھر دوسرے مصرع میں "دوہزار" کا ترجمہ "اَن گِنت" تو داد سے مستغنی ہے، تیسرا مصرعہ معلوم نہیں حضرت کاشی نے کہاں سے لاکر لکھا؟ پھر ان سب پر مزید "رفتہ ہوش" "گویا وخموش" اور کوزہ گر و کوزہ خرد کوزہ فروش" کا علیٰ حالہٖ استعمال سونے پر سہاگہ ہے۔ غرض سارے ترجمے کا یہی حال ہے، ایسی صورت میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ حضرت کاشی پر یاگی رباعیاتِ خیام کے کامیاب مترجم ہیں۔

~~~~~~~~~~

سنہ ۱۹۳۲ء میں جناب آغا ظفر علی بیگ قزلباش شاعر دہلوی نے "رباعیاتِ خیام" کا ترجمہ "خمکدۂ خیام" کے نام سے شائع کیا ہے، اس خمکدۂ میں دوسو رباعیوں کے ترجمے دلّی کی ٹکسالی زبان میں پیش کئے گئے ہیں، جو ہر طرح قابلِ ستائش ہیں، حقیقت یہ ہے کہ آغا شاعر نے امید سے زیادہ کامیابی حاصل کی ہے، اُن کے جتنے ترجمے ہیں وہ اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ اس قابل ہیں کہ اُنھیں سب سے بہتر ترجمہ کہا جاسکے اور آغا شاعر نے جس صلاحیت کا ثبوت اس ترجمے میں دیا ہے وہ اس بات کی مقتضی ہے کہ اُنھیں رباعیاتِ خیام کا سب سے بڑا مترجم کہا جاسکے، مثلاً چند رباعیاں ملاحظہ ہوں۔

(خیام)

در دیدۂ تنگ مور نور است از تو
در پائے ضعیف پشہ زور است از تو
ذاتِ تو سزا است مر خداوندی را
ہر وصف کہ ناسزا است دور است از تو

~~~~~~~~~~

(شاعر)

چیونٹی کی ذراسی آنکھ میں تیرا نور
مچھر کے ضعیف پاؤں میں تیرا زور
بیشک ہے خداوندی کے لائق تری ذات
جتنی کہ برائیاں ہیں سب تجھ سے دور

علاوہ اس کے کہ پوری رباعی کا بالکل سلیس اور بامحاورہ ترجمہ اُسی بحر میں موجود ہے، تیسرے مصرع کا زور بدستور قائم ہے۔ "مر" میں جو زورِ پنہاں تھا "بیشک" میں وہی زور کارفرما ہے، نتیجہ یہ ہے کہ اصل رباعی کا سارا حسن ترجمہ میں موجود ہے۔

~~~~~~~~~~

(خیام)

مارا گویند دوزخی باشد مست
قولیست خلاف دل درونتواں بست
چوں عاشقِ مست دوزخی خواہد بود
فردا بینی بہشت ہمچوں کفِ دست

~~~~~~~~~~

(شاعر)

سب کہتے ہیں مجھکو دوزخی ہے مستان
دل کو نہیں لگتی بات، یہ ہے بہتان
جب عاشقِ مست دوزخی سب ٹھہرے
کل دیکھنا جنّت کو بھی چٹیل میدان

اس کو تو جانے دیجئے، کہ رباعی کا سارا زور ترجمہ میں موجود ہے الفاظ کا صحیح ترجمہ ملاحظہ کیجئے، دوسرے مصرعے کا ترجمہ کس قدر صحیح اور برجستہ کے ساتھ ساتھ بامحاورہ ہے؟ پھر چوتھے مصرعے میں "ہمچوں کفِ دست" کا ترجمہ "چٹیل میدان" داد سے مستغنی ہے، یہ ہے ترجمہ اور یہ ہے کمالِ فن،

~~~~~~~~~~

(خیام)

ہشدار! کہ روزگار شور انگیز است
ایمن منشیں! کہ تیغ دوراں تیز است
در کام تو گر زمانہ لوزینہ نہند
زنہار! فرو مبر کہ زہر آمیز است

~~~~~~~~~~

(شاعر)

ہشیار ذرا! زمانہ ہے شور انگیز
بے فکر نہ بیٹھ، تیغِ دوراں ہے تیز
حلوے کا بھی لقمہ دے زمانہ منہ میں
ہرگز نہ نگلنا اُس کو ہے زہر آمیز

اس رباعی کے ترجمے میں خوبی یہ ہے کہ ایک ایک لفظ کا ترجمہ کردیا گیا ہے، پھر اس خوبی کے ساتھ کہ کہیں بھی کوئی لفظ بھدا نہیں معلوم ہوتا، البتہ تیسرا مصرعہ ایسا ہے جو پڑھتے وقت ترجمہ نہیں معلوم ہوتا۔ مگر اس کی وضاحت چوتھے مصرعے سے بخوبی ہوجاتی ہے، درحقیقت "در کامِ تو

گر زمانہ سوزنیہ نہد "کا ترجمہ" حلوے کا بھی لقمہ دے زمانہ منہ میں "سے بہتر ہو ہی نہیں سکتا۔

(خیام)

طور الیست کہ صد ہزار موسیٰ دیداست
دیر الیست کہ صد ہزار عیسیٰ دیداست
قصر الیست کہ صد ہزار قیصر بگذشت
طاق الیست کہ صد ہزار کسریٰ دیداست

(شاعر)

وہ طور ہے دہر، لاکھ موسیٰ دیکھے
وہ دیر ہے، سو ہزار عیسیٰ دیکھے
اس قصر میں سو ہزار قیصر آئے
اس طاق نے لاکھ لاکھ کسریٰ دیکھے

اصل رباعی کے پہلے مصرعہ میں "دہر" محذوف تھا، مترجم نے اس کو ظاہر کرکے اصل رباعی میں چار چاند لگا دئے ہیں، اصل رباعی کے ہر چہار مصرعوں میں لفظ "صد ہزار" غلط تو نہیں لیکن بُرا ضرور معلوم ہوتا تھا، ترجمہ میں یہ عیب بھی جاتا رہا، یعنی "سو ہزار" اور "لاکھ" کے لفظی فرق نے رباعی کے ظاہری حُسن میں جو خوبی پیدا کردی ہے، لائق ستائش ہے۔ اور میں یہ کہنے کے لئے تیار ہوں کہ "ترجمہ" اصل سے کہیں بہتر ہے۔

غرض اسی طرح آغا شاعر کے سارے ترجمے ایک سے ایک ہیں جنھیں فرداً فرداً نہ تو گِنا یا جاسکتا ہے اور نہ اس کا موقع ہے پھر بھی آیئے یورپ کے سب سے بڑے شاعر "فز جرلڈ" اور "شاعر" کا مقابلہ کرکے دیکھ لیجئے کہ درحقیقت کون سب سے بڑا مترجم ہے، خیام کی ایک رباعی ہے،

آں قصر کہ بہرام درو جام گرفت
آہو بچہ کرد و شیر آرام گرفت
بہرام کہ گور می گرفتے ہمہ عمر
بنگر کہ چگونہ گور بہرام گرفت

دیکھی آپ نے فضول کی بکواس؟ رباعی میں نہ تو کہیں "جمشید" ہے اور نہ اُس کی شراب نوشی کا ذکر، مگر جرلڈ صاحب "جمشید" کی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔ اس رباعی کا سارا حُسن لفظ "گور" کی رعایت میں ہے، ظاہر ہے کہ یہ حُسن انگریزی میں باقی نہ رہ سکتا تھا، لہٰذا اس کا انتخاب فضول تھا، مگر اس کو رذاقی کا کیا جواب کہ اس رباعی میں لفظ "جام" دیکھا اور کھینچ تان کر ایک مفہوم پیدا کرنے کے لئے اُس کو چُن لیا؛ برخلاف اس کے آغا شاعر کا ترجمہ سنئے۔

جس قصر میں بہرام نے ہے رنگ رچا
اب شیر کا کھبٹ ہے وہ ہرن کا باسا
بہرام جو کرتا تھا سدا گور شکار
اب دیکھ، اُسے گور نے کھایا کیسا؟

سبحان اللہ! یہ ہے وہ ترجمہ جس میں اصل کی ساری رعنائیاں، ساری خوشنمائیاں اور سارا حُسن موجود ہے، پھر زبان کا تو کچھ کہنا ہی نہیں ہے، اب اس کے بعد بھی یہی کہا جائے، کہ "رباعیاتِ خیام" کا سب سے بڑا مترجم "آغا شاعر دہلوی" کی بجائے "ایڈورڈ فز جرلڈ" ہے تو ایسے کہنے والے کو میرا اسلام، میری ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ ہے، اور میں بہانگِ دہل یہ کہنے کے لئے تیار ہوں کہ "رباعیاتِ خیام" کا سب سے بڑا، سب سے بہتر، اور سب سے اعلیٰ مترجم دہلی کا مایۂ ناز شاعر "شاعر" ہے

[illegible] نہ پوچھیے
نشیمن نہ پوچھیے
[illegible] نہ پوچھیے
[illegible] کی قسمت نہ پوچھیے
[illegible]

[illegible] زیدی

چونکہ فز جیرلڈ کے ترجمے کی یہ رباعیات ہزاروں جگہ شائع ہو چکی ہیں اس لئے ہم نے اُن کا لکھنا مناسب نہ سمجھا

ہند میں تجارت کی پستی

رامیش نرائن ماتھر، ایم اے آگرہ

شکایتِ زمانہ کے موضوع پر ہر شاعر نے دلچسپ پیرایہ میں طبع آزمائی کی ہے اور اکثر اوقات اُن کا بیان حدِ اعتدال سے تجاوز کر گیا ہے لیکن اس نازک موقع پر جبکہ تمام سرزمینِ ہند اور دنیا میں مجموعی طور پر ایک عجیب تحیّر خیز ہیجان واقع ہوا ہے، فلکِ کج رفتار کی ظلم شعاری اور اپنی بے کسی ولاچاری کا حالِ زار بیان کرنا بے محل نہ ہوگا۔

ہر ایک ملک میں آجکل بیکاری کا دور دورہ ہے، تجارت تنزل پر ہے، کاروبار کے مختلف شعبوں میں بے چینی نظر آتی ہے، سیاسی، تمدنی اور مالی حالت خراب و خستہ ہے، گویا تمام مصائب ایک بلائے ناگہانی کی طرح سے ہر ایک ملک پر نازل ہوئے ہیں۔ لہٰذا میرا مقصد ان سب اسباب کا اجمالاً ذکر کرنا ہے جس کی وجہ سے یہ باتیں ظہور پذیر ہوئیں اور ایسے کارآمد مشورے بھی پیش کرنے ہیں جو مفادِ قومی کے ضامن و حامی ہوں۔

متمدن دنیا میں اس بلا کو ہم رستخیز بیجا سے تعبیر کرتے ہیں، پہلا اثر اس انقلاب کا یہ ہے کہ صنعتی حرفتی اشیاء و نیز زراعتی اشیاء کی قیمتوں میں زبردست تخفیف ہوئی ہے جس کی وجہ سے تجارت میں تنزل واقع ہوا اور کاریگروں کی افلاس میں ترقی ہوئی۔ دنیا میں آجکل بیکاروں کی تعداد چالیس کروڑ ہے۔ کلکتہ کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ اشیاء کی قیمتوں میں چالیس فیصدی تخفیف ہوئی ہے۔ ہندوستان میں اشیاء کی قیمت میں کمی مختلف اسباب سے ہوئی۔

پہلا سبب یہ تھا کہ بیرونی تجارت کے لین دین میں ہمارے روپیہ کے سکہ کو انگلستان کے رائج الوقت سکہ سے اس طرح منضبط کر دیا گیا کہ قیمت کا تعین اُسی سے ہوتا ہے، انگلستان کے سکہ کی قیمت روز بروز گھٹ رہی ہے، اور اُس کی قوتِ خرید بہت کم ہو گئی ہے، اس لئے اس کو ڈپریشیڈ کرنسی ( ) کہتے ہیں اس لئے ہمارے روپیہ کی بھی قوتِ خرید گھٹ گئی۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ انگلستان نے ہندوستان سے تجارتی معاہدہ کیا ہے جس کو میثاقِ ہند و برطانیہ ( ) کہتے ہیں۔ ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے اور اُس کی زراعتی پیداوار کے سب سے زبردست خریدار غیر برطانوی ممالک ہیں، لیکن اس تجارتی معاہدہ کی رُو سے ہندوستان غیر برطانوی ممالک کی پیداوار یا صنعتی و حرفتی اشیاء پر بہت زیادہ ٹیکس لگا دیا جس کا ہندوستان کی ہی تجارت پر نہایت ناخوشگوار اثر پڑا، ہندوستان کی تجارت صرف انگلستان تک محدود ہو گئی اور چونکہ زراعتی پیداوار کی رسد مانگ سے زیادہ ہے، اس لئے قیمت میں بہت زیادہ ارزانی واقع ہو گئی۔

جس کا کہ پیشتر ذکر ہو چکا ہے کہ یہ رستخیز بیجا صرف ہند کے لئے نہیں بلکہ تمام دنیا کے ممالک کو محیط ہے۔ اس لئے ہم کو اس کے اسباب کا ذکر کرنا چاہیئے۔ مجلسِ اقوامِ عالم کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ تھوک فروشی

میں اشیار کی قیمتوں میں تخفیف پینتیس فیصدی واقع ہوئی اور زراعتی پیداوار کی قیمتوں میں ۷۰ فیصدی کمی واقع ہوئی۔ صنعتی کارخانوں نے قیمت کی کمی کا تو بار اُٹھا لیا، لیکن زراعتی پیداوار کی کمی کا بار کسانوں سے نہ اُٹھ سکا، اسی بنا پر پروفیسر کپیٹر نے کہا کہ اگر حرفتی کاروبار میں پستی نہ ہوتی تو زراعتی کاروبار میں بالضرور ہوتی۔

مسٹر کولے کا خود بیان ہے کہ گزشتہ صدیوں میں ایسی بلائے ناگہانی سے کبھی سامنا نہ ہوا تھا اور دنیائے متمدن کی سیاسی و مالی حالت اس قدر خستہ جیسی کہ موجودہ زمانہ میں ہے کبھی نہ ہوئی۔

۱۹۲۵ء میں جنگِ عظیم کی وجہ سے جو تباہی ہوئی اُس کی تلافی مکمل طور پر ہو گئی تھی، سلطنت کی ترقی ہوئی، تجارت، صنعت و حرفت کی ترقی سے تمام ممالک متمول ہو گئے۔ ہر ایک ملک طلائی معیار پر قائم رہا، ساٹھ فیصدی ایسے سکے استعمال کرتے تھے جو طلائی معیار سے ملحق تھے، جب کہ سیاسی و تمدنی حالت اس طرح سے مستحکم ہو رہی تھی، یکایک وال اسٹریٹ امریکہ میں ایک ایسا تجارتی طوفان آیا جس کو اسپیکولیشن (سٹہ بازی کہتے ہیں اُس نے دنیا کی حالت تباہ کر دی۔

سٹہ کے بازار میں منافع کی اُمید پر تجارت ہوئی، کروڑوں آدمیوں نے لاکھوں روپیہ غارت کر دیا اور بالآخر ۱۹۲۹ء میں یہ سٹہ بازی ناکامیاب ہوئی۔ اس کا پہلا اثر یہ ہوا کہ زرِ رائج کے معیار میں پیچیدگیاں اور دشواریاں پیدا ہوئیں اور کرنسی کی دقتوں نے تجارت کو پست کر دیا، اسی وجہ سے انگلینڈ اور امریکہ نے طلائی معیار ترک کر دیا، ڈالر اور انگلستان کے سکہ کی قیمت گھٹتی اور بڑھتی رہی۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ تجارتی سامان کثرت سے تیار ہوا اور زراعتی اور صنعتی و حرفتی پیداوار کی رسد مانگ سے زیادہ ہو گئی اور قیمتوں میں بے حد کمی واقع ہو گئی۔ تیسری بات یہ ہوئی کہ چاندی کی قوتِ خرید بہت گھٹ گئی جس سے چین اور ہندوستان کو بہت نقصان ہوا۔ چوتھی بات مختلف ممالکِ عالم میں زر کی مساوی حصوں میں تقسیم نہ ہونے سے ظہور پذیر ہوئی اُس کو ہم مال ڈسٹری بیوشن آف گولڈ ( ) سے تعبیر کرتے ہیں، فرانس اور امریکہ نے خود غرضی سے ۳/۴ حصہ سونے کا اپنے قبضہ میں کر لیا اور سونے کو دیگر ممالک میں نہ جانے دیا۔ پانچویں بات یہ ہوئی کہ جنگِ عظیم میں جو روپیہ امریکہ و فرانس سے بطور قرض لیا گیا تھا، اُس کی ادائیگی کا تقاضہ ہونے لگا، مجبوراً دوسرے ممالک نے ٹیکس بڑھا دئے، اِن کے سامانِ تجارت پر ٹیکس بڑھ جانے سے اور امریکہ و فرانس کی روپیہ کی ادائیگی سونے میں چاہنے سے بین الاقوامی تجارت کو زک پہنچی۔

اسبابِ متذکرۂ بالا نے دُنیاوی مالی حالت کو تباہ کر دیا ہے، کسی کو جرأت نہیں کہ اپنے روپیہ کا صحیح استعمال کر سکے، باوجودیکہ امریکہ میں سب سے زیادہ زر ہے، تاہم وہ اس بلائے ناگہانی کا شکار بنا ہوا ہے، لہٰذا ہم کو معلوم ہونا چاہیے کہ کیا مناسب باتیں عمل میں لائی جائیں، جن سے دنیا از سرِ نو متمول اور خوشحال ہو جائے۔

میرا پہلا مشورہ یہ ہے کہ اشیار کی قیمتیں ۱۹۲۹ء کے درجہ تک بڑھا دی جائیں، تاکہ تجارت میں پھر جان آجائے، لوگ بہت سے بڑے بڑے کارخانے کھولیں اور نفع اُٹھائیں۔ دوسرا یہ کہ لوگ فلاحِ عام کے لئے کام کریں خود غرضی کو برطرف رکھدیں، محبت اور ہمدردی کے جذبہ کو کام میں لائیں، سونے کو آزادی سے ایک ملک سے دوسرے ملک تک جانے دیں، ممالکِ غیر کے سامانِ تجارت سے محصول ہٹا کر قدرتی طور پر تجارت کو چلنے دیں، بین الاقوامی فلاح و بہبود کو مدِ نظر رکھ کر اپنی قومی خود غرضی کو ترک کر دیں۔ ایسا کرنے سے ممالک کی سیاستِ مدنی میں بڑی ترقی ہوگی۔ تیسرا یہ کہ زراعتی قیمتوں میں اضافہ ہو جانا چاہیے۔

اگر ان مشوروں پر عمل کیا جائے اور ایک عام کرنسی معیار قائم ہو جائے جو بین الاقوامی ہو تو امید قوی ہے کہ دنیا میں پھر سے وہی تازہ روح آجائے، اگر بین الاقوامی محبت کے اصلی جذبات ہمارے دلوں کو مشتعل کر دیں، اگر ہمدردی کے اعلیٰ خیالات ہماری رگوں میں سما جائیں، اگر ملکی و دنیاوی بہبودی ہمارے پیشِ نظر ہو، اگر خود غرضی ایثار میں متبدل ہو جائے تو مجھے کامل یقین ہے کہ تجارت دنیا ہی نہیں بلکہ ہند کی بھی از سرِ نو تازہ ہو جائے گی، اور بیکاری کا مسئلہ باکاری سے حل ہو جائے گا ؎

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

علمِ کیمیا

محمد یوسف کشور کلکتہ

اگر علومِ جدیدہ کی کوئی تاریخ ترتیب وار لکھی جائے تو اس میں سب سے پہلا باب تقسیم علوم کا ہوگا ———

قدما کی ایک بنیادی غلطی یہ تھی کہ وہ علوم کی کوئی صحیح تقسیم اور اُن کے حدود کا صحیح تعین نہ کر سکے تھے، اور طبعیات کو جسے فی الحقیقت تجربات اور مشاہدات کا نتیجہ ہونا تھا ان چیزوں سے ملا دیا جو محض زمانۂ قدیم کے ابتدائی اوہام باطلہ اور قیاسات ذہنیہ کا نتیجہ تھیں۔ متاخرین کو نئی راہ کا سُراغ مل گیا، اور اُنھوں نے سب سے پہلے علوم کی تقسیم اور صحیح تعین حدود میں کامیابی حاصل کی۔ در اصل یہی اولین کام حکمائے جدید کو ممتاز حیثیت دینے کا باعث ہوا، اب علوم کے اقسام کا نقشہ بالکل بدل گیا ہے، اور گو بہ نسبت احصار قدیمہ کے بیشمار نئی نئی شاخیں پیدا ہو گئی ہیں تاہم اصولاً ان کی تقسیم و حدود ایک صحیح بنا پر قایم اور اپنی مختصر تعداد کے باوجود ان تمام علوم کا احاطہ کئے ہوئے ہے، چنانچہ موجودہ زمانہ میں تمام علوم دس بارہ غیر اصولی حصص کی جگہ صرف ان تین حصوں میں تقسیم کر دئے گئے ہیں۔

(۱) علم حیوانیہ (۲) علم نفسانیہ (۳) علم طبعیہ

ان تینوں قسموں میں سے میرا موضوعِ بحث علوم طبعیہ کا پہلا باب کیمیا ہے۔

اُممِ قدیمہ میں سے جن جن قوموں کی تاریخ میں ہمیں علم کیمیا کا تذکرہ ملتا ہے وہ مصری، فینیقی، یہودی، یونانی، رومی اور عرب ہیں۔ ان قوموں میں سے مصری سب سے پہلے گزرے ہیں۔ اس لئے غالباً فنِ کیمیا کا اولین سرچشمہ مصر ہی ہے۔

کیمیا کس زبان کا لفظ ہے اور اس کے کیا معنی ہیں؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے، بعض کا بیان ہے کہ کیمیا "کیمی" سے مشتق ہے، جس کے معنی سیاہ زمین ہے، قدیم زمانے میں مصر کا یہی نام تھا اور چونکہ اس فن کا گہوارہ مصر تھا، اس لئے اس کا بھی یہی نام پڑ گیا، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ کیمیا کو فارسی میں فنِ مصری بھی کہتے ہیں، مگر بعض کا خیال ہے کہ یہ ایک عبرانی نژاد لفظ سے مشتق ہے، جس کے معنی راز یا اخفا کے ہیں۔

اصل میں یہ لفظ غالباً شامان ہے۔ اہل یونانی مصر کو سام ابن نوح کی نسبت سے شامیا کہتے تھے۔ ایک تیسری جماعت کو ان تینوں رایوں سے اختلاف ہے، اسکے نزدیک یہ لفظ در اصل سیمیا تھا، سیمیا کے معنی بھی اخفا اور پوشیدگی کے ہیں، بہر نوع کیمیا کا مشتق خواہ کچھ بھی ہو اور اس کے معنی خواہ سیاہ زمین ہوں یا اخفا، اس قدر یقینی ہے کہ یہ ایک پوشیدہ فن تھا جسے صرف علماء مذہبی ہی جانتے تھے، اور اُس کی دلیل یہ ہے کہ خود ہیکلوں اور عبادت خانوں کے اندر یا ان کے قرب و جوار میں کیمیا دی دار العمل ([illegible]) نکلے ہیں۔ جس طرح

دنیا میں تمام علوم کی ابتدا افراد الناسیہ کی غیر منضبط اور توہم آمیز معلومات سے ہوئی ہے اور رفتہ رفتہ تمدن و عمران کی ترقی نے ان میں ترتیب اور انضباط پیدا کیا ہے اسی طرح فن کیمیا کی بھی ابتدا ہوئی۔

اس میں شک نہیں کہ اس فن کی ابتدا ایک خاص اور غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ شاید ہی کسی علم کی ابتدا اس درجہ توہمات اور خلاف مقصد کوششوں سے آلودہ رہی ہو جس درجہ کہ اس نہایت قیمتی اور ضروری فن کی تاسیس نظر آتی ہے۔ اس کی ابتدا نہ صرف غلط بنیاد پر غلط مقاصد کی تکمیل کے لئے ڈالی گئی جیسا کہ انقلاب ماہیت معدنیات کی کوشش سے ظاہر ہوتا ہے، بلکہ بہت کچھ انسانی جرائم و معاصی کی ان افسوسناک سرگزشتوں سے بھی اس کا تعلق رہا ہے، جو دنیا کے گزشتہ تاریخی زمانوں کی وحشت انگیز یادگاریں ہیں، اور جن سے افسوسناک صداقت کی تصدیق ہوتی ہے کہ بہتر سے بہتر اور اشرف سے اشرف آلہ و وسیلہ بھی انسان کے ہیجی جذبات کے ماتحت بدترین لعنت و عذاب بن جاتا ہے۔

فن کیمیا کے جو ابتدائی تجارب ہیں وہ دنیا نے صرف دو طریقوں پر حاصل کئے ہیں (۱) بہت سے لوگوں کا خیال پیدا ہوا کہ ادنیٰ درجہ کی دھاتوں کو کسی خارجی ذریعہ سے اعلیٰ درجہ کی دھاتوں میں منقلب کر دیا جائے، مثلاً تانبے کو سونا بنا دیا جائے یا قلعی اور پارہ کو چاندی کی صورت اور خواص میں بدل دیا جائے، اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے بڑی بڑی علمی اور تجاربی کوششیں شروع ہوئیں اور صدیوں تک بڑے بڑے علماء اور علمی ادارے عملی تجربے کرتے رہے۔ وہ اپنے مقصد میں تو کامیاب نہ ہو سکے۔ لیکن ان کے تجارب کی روشنی میں ضمناً بہت سے قیمتی انکشافات ہوئے، جو فن کیمیا کے لئے ایک بہترین ابتدائی سرمایہ ثابت ہوئے۔

یہ تو معلوم ہو چکا کہ اس فن کی ابتدا کیوں کر ہوئی، اب یہ بتانا ہے کہ غلط مقاصد کی تکمیل کا خیال اور ارتکاب جرائم کیوں کر اس فن کے حصول کا باعث ہوئے (جس کی جھلک ایک محقق کو عصر جدید سے لے کر ازمنۂ مظلمہ کے بعد تک برابر نظر آتی ہے) تاریخ کے مطالعہ سے ان شریر اور جرائم پیشہ اشخاص اور جماعتوں کا پتہ چلتا ہے جو اپنے علم و حکمت کو اس راہ میں صرف کر کے اپنے بڑے بڑے ذاتی فوائد حاصل کرنا چاہتی تھیں، یہ جماعتیں اور اشخاص وہ تھے جو اپنے ذاتی اہم مقاصد کے خلاف طاقتور دشمن رکھتے تھے اور ان کو شخصی اور ناقابل گرفت ذرائع سے ہلاک کرنے کے لئے نئے نئے زہروں اور قاتل ادویہ کی تلاش میں رہتے تھے۔ بڑی بڑی اقتدار طلب اور حکومت خواہ جماعتیں تھیں جو ایسی ادویات اور مرکبات تیار کرتی تھیں جن کے ذریعے ان تمام طاقتور اشخاص کو پوشیدہ ہلاک کر سکیں، جن کا وجود ان کے حصول مقاصد میں حارج ہے، متعدد بت پرست اقوام کی مذہبی جماعتیں اور ان کے بعد قرون وسطیٰ کے متعصب اور جرائم پیشہ گوشہ نشینان خانقاہ بھی اس سلسلے کی ایک مضبوط کڑی ہیں۔ جنھوں نے اپنے گرجوں اور قلعہ نما خانقاہوں کے تہ خانوں میں انسانی ہلاکت اور وحشیانہ جرائم کو صدیوں تک قائم رکھا، اور جن کے مظالم کی لعنت سے صرف چند صدی پیشتر ہی دنیا کو نجات ملی ہے، زمانۂ گزشتہ کی پُر اسرار کہانت اور مذہبی پیشواؤں کی خوفناک قوتیں بھی بہت کچھ اس فن کے پوشیدہ تجربوں کی معاون تھیں، یہ لوگ پہاڑوں کے غاروں کے اندر اور قلعوں اور تہ خانوں کے گرجوں میں اپنے علم و تلاش کو ان چیزوں کے لئے صرف کرتے تھے، جن کے خواص عام طور پر اس زمانہ میں معلوم نہ تھے، اور پھر ان کے ذریعہ خود کو غیر معمولی اور پُر اسرار قوتوں کا مالک ظاہر کرتے تھے۔ روم اور جرمنی کے قدیم پادریوں، اور رومن کیتھولک راہبوں کی خوفناک قوتوں کا تفصیلی تذکرہ تواریخ میں موجود ہے۔ ان کے پاس عجیب عجیب قسم کے قاتل زہر ہوتے تھے، جو مختلف غیر محسوس طریقوں اور مقررہ ساعتوں کے اندر مقدس جماعت کے دشمن کو ہلاک کر دیتے تھے۔

روم میں کارڈینل پادریوں کے گروہ کی (جن میں سے نیا پوپ منتخب کیا جاتا ہے) عجیب الخواص ادویات مہلکہ کے لحاظ سے پوشیدہ اور علمی جرائم کی ایک پوری تاریخ ہے ان میں سے جو لوگ اپنے تئیں پوپ اور روم کا تاجدار قرار دینا چاہتے تھے، ان کے بڑے بڑے پوشیدہ حلقے موجود تھے، اور انھوں نے اس عہد کے پوشیدہ علوم و حکمت کے جاننے والوں کی مدد حاصل کر کے ایسے مرکبات معلوم کرلئے تھے، جن کے استعمال کے نتائج اس عہد میں بالکل غیر معلوم تھے۔

مسلمانوں کے بعد اسپین میں مسیحی حکومت قائم ہوئی اور اس سے مشہور و معروف عدالت روحانی (   ) کے ذریعہ

انسانوں کے لئے سب سے بڑی مسیحی لعنت کا وحشت ناک سلسلہ شروع ہوا۔ اس عدالت کے خوفناک کارندے اور ممبر تمام مسیحی یورپ میں پھیل گئے تھے۔ اور ان کے خوفناک اقتدار کا ذریعہ منجملہ مخفی اسباب و علل کے فنِ کیمیا کے غیر معروف تجارب بھی تھے، اس چودھویں صدی عیسوی سے لیکر سولہویں صدی کے اواخر تک روم اور جرمن میں پادریوں کی اس مخفی اور خوفناک عدالت کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں اور ان کے ممبر اور کارندے پوشیدہ پوشیدہ تمام یورپ میں منتشر ہوگئے تھے اور بادشاہوں سے لے کر عام باشندوں تک پر کافی اقتدار رکھتے تھے۔ ان کی نسبت بیشمار شہادتیں موجود ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی ہلاکت کے لئے بہت سے کیمیائی عرق کا انھیں علم تھا۔ اور اس کی تجربہ گاہیں اس عہد کے ویران قلعوں بڑے بڑے گرجوں اور خانقاہوں میں موجود تھیں۔ وہ طرح طرح کے خوفناک طریقوں سے مفردات اور عناصر کی ترکیب و تجربہ کا تجربہ کرتے تھے۔ اور انھوں نے ایسے ایسے آلات بھی ایجاد کیئے تھے جو آج کل کیمیائی تجارب کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں، وہ زہریلے جانوروں کے اعضا سے زہر نکالتے اور درندوں کو زندہ لٹکا کر اُن کے پیٹ چاک کرکے طرح طرح کے حیوانی مواد اور منترابوں کے عرق کھینچتے تھے، یہ ایک وحشیانہ اور خونخوارانہ تجربہ تھا، لیکن اسکی وجہ سے فنِ کیمیا کے اکثر راز معلوم ہوگئے اور گو پوشیدہ علم کی پُراسرار معلومات ہونے کی وجہ سے اُن کا بڑا حصہ غیر معلوم ہی رہا تاہم جس قدر بھی معلوم ہوسکا وہ اس فن کی ابتدائی معلومات کا حقیقی ذخیرہ ہے۔

دنیا میں جب تک کوئی شے زندہ رہتی ہے اس وقت تک برابر اس میں تغیر و انقلاب کا سلسلہ جاری رہتا ہے، لیکن جب وہ مر جاتی ہے تو یہ سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے۔ یہی حالت علوم کی بھی ہے، جب تک زندہ رہتے ہیں، اس وقت تک ہمیشہ اس میں حذف و اضافہ ترمیم و اصلاح ہوتی رہتی ہے۔

یہ مضمون کیمیا کی مکمل تاریخ نہیں بلکہ اس کا صرف ایک مختصر مطالعہ ہے اس لئے میں مجبور ہوں کہ صرف علم کیمیا کے اہم دوروں کو لے کر اسی پر نہایت اختصار اور اجمال کے ساتھ بحث کروں۔

دورِ اول

اس دور میں لوگوں نے علمی یا کم از کم باقاعدہ تجارب کے ذریعہ کیمیاوی ظواہر و آثار کا مطالعہ نہیں کیا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ صحیح نتیجہ پر نہ پہونچ سکے۔ اس دور میں لوگوں کا تمامتر مقصد یہ تھا کہ جس طرح ہوسکے کم قیمت دھاتوں کی قیمتی دھاتوں مثلاً سونا۔ چاندی وغیرہ کی صورت میں منتقل کر دیا جائے۔ یہ کوشش اہل مصر میں پہلی صدی عیسوی تک جاری رہی، یہاں تک کہ کہا جانے لگا کہ کیمیا اس علم کا نام ہے جس کے ذریعے سونا اور چاندی بنائی جاسکے۔ اس کے بعد عہدِ علمی شروع ہوا، اور اس میں بھی گو ابتدا میں اس غلط خیال کی اشاعت ہوئی اور اس کا سلسلہ برابر قائم رہا لیکن انھیں کے حکمائے محققین نے پہلے اس کی تغلیط بھی کی اور فنِ کیمیا کو اصلی مقاصد اور علمی شکل میں مدون کرنا چاہا۔ مگر یورپ میں یہ دور سولہویں صدی عیسوی تک برابر جاری رہا۔ چاندی سونے کے مدعی ہزارہا انسانوں کو دھوکا دے کر لوٹتے رہے۔

دورِ ثانی

اس کو ہم دورِ طبی بھی کہہ سکتے ہیں، کیونکہ اس دور میں ماہرانِ فنِ کیمیا کے مقاصد مختلف اور بجائے اس کے کہ اربابِ فن کا مقصد عملاً چاندی اور سونے کے ساتھ مخصوص ہونا اب اُن کے پیشِ نظر صرف ادویہ کی تیاری تھی، اس دور میں طب اور کیمیا پہلو بہ پہلو تھے، عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ صحت و مرض تغیراتِ کیمیاوی ہی کا نام ہے۔ اس لئے جب کوئی شخص بیمار ہوجائے تو اس کی صحت یابی کے لئے ضروری ہے کہ اُس کے بدن میں کوئی ایسا کیمیاوی اثر پیدا کیا جائے جو ان تغیرات کو اُن کی اصلی حالت پر لاسکے۔

سیراسلس (   ) سب سے پہلا شخص ہے جس نے اس اصول کا صُور پھونکا۔ اس زمانے کے لوگوں میں وین ہلمینٹ جیسے زبردست عالم تک نے اس مذہب کو قبول کر لیا تھا۔ اس انقلاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے مرکباتِ کیمیا و بہ خصوصاً فلوزی مرکبات ایجاد ہوئے۔ یہ دور سترہویں صدی کے وسط میں ختم ہوجاتا ہے۔ اور دور میں کامیابی کا سہرا تمامتر مسلمانوں کے سر رہا۔

دورِ ثالث

اس کو ہم دورِ احتراق (Phlogiston period) کہہ سکتے ہیں۔

عربی میں اُس کو عصرِ السعیر کہا جاتا ہے، یہ سترہویں صدی کے وسط سے شروع ہو کر اٹھارہویں صدی کے آخر میں ختم ہو جاتا ہے، اس عرصہ میں بہت سے علمائے کیمیا نے اس کو ایک مستقل فن کی حیثیت دینے کی کوشش کی، اس لحاظ سے کیمیا کی تاریخ رو برٹ بوائل (Robert Boyle) کے وقت سے شروع ہو جاتی ہے، رو برٹ بوائل کا یہ کلیہ تھا کہ یہ فن محض ترکیبِ اجسام کی معلومات کا مخزن ہے۔

اس دَور میں اربابِ بحث و تحقیق کے خیالات چند خاص مسائل کے حل کرنے میں منہمک تھے۔ جن میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ احتراق کا ہے اور اس لئے میں نے اس دَور کا نام "دورِ احتراق" رکھا ہے، اس دَور کے علمائے کیمیا کا یہ اعتقاد تھا کہ جب کوئی شے جلتی ہے تو اس میں سے ایک عنصر نکلتا ہے جسے فلوجسٹن (Phlogiston) کہتے ہیں۔ فلوجسٹن ایک فرضی شے ہے جس کے متعلق فرض کیا گیا ہے کہ وہ خالص آگ ہے، اور آتشگیر اجزاء سے ملو ہے، یہ اعتقاد عرصے تک قایم رہا۔ یہاں تک کہ ایک مشہور کیمیا دی عالم ([illegible]) نے اس خیال کو باطل کر دیا۔ اور اُس وقت سے چوتھا یعنی موجودہ دور شروع ہوا۔

دَورِ رابع

یہ دَور لویڈیر کے عظیم الشان کارناموں سے شروع ہوتا ہے، اس جلیل القدر ماہرِ کیمیا نے اپنے تجارب سے ثابت کر دیا کہ اشیاء کے جلنے میں ہوا کو بہت بڑا دخل ہے، نیز یہ کہ احتراق اور فلوجسٹن کے متعلق قدماء کے جو اعتقادات تھے وہ کچھ بہت زیادہ نہیں۔ اس ایک اصول کے دریافت ہو جانے سے دفعتاً نظریہ احتراق کی بنیادیں اس طرح ہل گئیں کہ پھر قائم نہ رہ سکیں۔ درحقیقت لویڈیر نے وہ عظیم الشان خدمت اس فن کی انجام دی ہے جس کی وجہ سے اس کا نام ہمیشہ تاریخ کیمیا کے صفحات میں محفوظ رہے گا۔ اس کے اس کارنامے کی عظمت کا اندازہ صرف اس سے ہو سکتا ہے کہ اہلِ فن نے اس موجودہ فنِ کیمیا کا "موجدِ حقیقی" کا لقب دیا ہے، مگر افسوس قسمت نے اس کا ساتھ نہ دیا، انقلابِ فرانس کے عہدِ کشت و خون میں حکومت فرانس نے اسے قتل کرا دیا۔ لویڈیر ہی وہ شخص تھا جس نے سب سے پہلے ترکیب اجسام کے نقشے کی ترتیب کی۔

اس عہد کے اربابِ فن میں ڈالٹن (Dalton) اور برزیلیوس (Berzelius) بھی ہیں، اول الذکر ایک انگریز حکیم ہے جس نے ذرّات کا وہ عظیم الشان نظریہ وضع کیا جو آج علوم کیماویہ کا سب سے بڑا محور ہے۔ ثانی الذکر سویڈن کا باشندہ تھا، اس کا سب سے بڑا کارنامہ مختلف عناصر کے جو آج تقریباً ۹۰ کے قریب ہیں، (کا اُن اوزان کا جو ذرات (Atomic Theory) سے پیدا ہوتا ہے) اندازہ کرتا ہے۔ اس کے بعد عہدِ آخر کے اربابِ کمال کی جماعت ہے جس میں سویڈن کا ارہی نس (Arrhenius) ہالینڈ کا وانٹ ہوف (Van't Hoff) جرمنی کے برنوسٹ (Bernweigeet) اور اسٹوالڈ (Ostwald) انگلستان کا فرینک لینڈ (Frankland) اور سر ولیم ریمیز (Sir William Ramsay) مشہور صنادید فن ہیں۔ ان میں سے چار اول الذکر علماء نے کیمیا کی ایک نئی شاخ کی بنیاد ڈالی جس کو کیمیائے طبعی (Physical Chemistry) کہتے ہیں، کیمیائے طبعی میں مرکبات کے خواص طبعی اور ترکیب کیماوی کے باہم تعلق سے بحث ہوتی ہے۔

---

[1] اس نظریے کی بنا، پندرہویں اور سولہویں صدی کے وسط میں پڑی تھی، لیکن لویڈیر نے اس کا قلع قمع کر دیا۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ لکڑی یا دیگر جلنے والی اشیاء کے جلنے سے اُن کے اوزان میں کمی ضرور ہو جاتی ہے۔ لیکن کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جن کے اوزان میں کمی کے بجائے زیادتی ہو جاتی ہے۔ مثلاً تانبے کو جب ہوا میں پھونکا جائیگا تو اُس کا وزن قدرے بڑھ جائے گا۔ اس تجربے پر دیگر تجربوں سے لویڈیر نے ثابت کر دیا ہے کہ فلوجسٹن کوئی حقیقت نہیں رکھتی بلکہ ہر چیز کے جلنے میں ہوا کو دخل ہے۔ یعنی جلنے سے یا تو کسی چیز سے کاربون کا وہ حصہ جو اس میں موجود ہوتا ہے اس چیز سے نکل کر ہوا میں مل جاتا ہے۔ (یہی وجہ ہے کہ کسی چیز کے جلنے کے بعد ہوا کے اندر کاربونک ایسڈ گیس کی زیادتی ہو جاتی ہے۔) یا اس میں ہوا کی اوکسیجن جذب ہو جاتی ہے جس سے اُس کا وزن بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ تانبے کو اگر پھونکا جائے تو وہ کیوپرس اوکسائڈ ( ) بن جائے گا جو تانبے کے وزن سے زیادہ ہوگا۔

(بقیہ مضمون نوٹ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے)

دنیا

شور لکھنوی

چندوسی کے اسٹیشن پر ایک غریب سادھو گاڑی میں چڑھنے لگا، ایک سیٹھ صاحب کا سامان ڈبے میں بھرا ہوا تھا۔ سیٹھ صاحب نے اُسکو اندر آنے سے روکا۔ اور دروازہ بند کردیا۔ سادھو نے منت سماجت کرتے ہوئے کہا: میری لڑکی سخت بیمار ہے میں اُس کو دیکھنے جا رہا ہوں، صرف کھڑے ہونے کی جگہ دیدیجے۔ اگلے اسٹیشن پر اُتر جاؤں گا۔ ایشور آپ کا بھلا کرے گا۔

سیٹھ:۔ بھلا کیا خاک کرے گا۔ جو ہے وہ اسی میں، جو ہے وہ اسی میں، کیا گاڑی بھر میں کہیں اور جگہ نہیں۔

سادھو:۔ جگہ تو ضرور ہوگی۔ مگر دیکھئے میں ایک بوڑھا آدمی ہوں بڑی مشکل سے یہاں تک پہونچا ہوں۔ یہ ایک معمولی گاؤں ہے۔ یہاں صرف دو منٹ گاڑی ٹھہرتی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دوسرے ڈبے کی تلاش میں گاڑی چھوٹ جائے اور میں اپنی لڑکی کو دیکھنے سے محروم رہ جاؤں۔

سیٹھ:۔ تو آپ کا مطلب یہ ہے کہ سامان کو تو اٹھا کر نیچے پھینک دوں اور آپ کو یہاں جگہ دے دوں، کیوں؟

سادھو۔ نہیں بابو جی آپ کا سامان میں اپنے سر پر رکھ لوں گا آپ کو مطلق تکلیف نہ ہوگی، ایک کونے میں کھڑا ہو جاؤں گا۔ صرف ایک ہی اسٹیشن کی تو بات ہے۔ پھر تو مجھے اُترنا ہی ہے۔ دیکھئے بابو جی گاڑی چل چکی ہے، دروازہ کھول دیجئے، کھول دیجئے۔

سیٹھ۔ کھول دیجئے۔ بڑا آیا وہاں سے —— اچھا مجھے زور —— اُوں —— تو لے ——

اس جد و جہد میں کمزور ہاتھوں سے سلاخ چھوٹ گئی اور وہ کافی اونچائی سے پتھر پر گرتا ہے۔ (خون نے پتھروں کو رنگ دیا۔ اُس کی تمنا۔ اُس کا اشتیاق۔ اُس سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ اُس کی پیاری بیٹی ایک میلے کچیلے بستر پر پڑی اُس کو بلا رہی ہے، اور وہ اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہے۔ وہ کس اُمید میں گھر سے نکلا تھا کس بیچینی سے اپنی لڑکی کو دیکھنے چلا تھا جس کی زندگی کا سہارا جس کی مسرت اور آسائش کا مرکز صرف ایک لڑکی ہے وہ اس کو دیکھنے سے پہلے اس دنیا سے جا رہا ہے۔

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) ؎ اس کا بانی جیسا کہ نفس مضمون سے ظاہر ہے۔ ڈالٹن ہے۔ اس نظریئے کے مطابق دنیا کی ہر وہ چیز جو حالت عنصریہ ( ) میں ہے بہت چھوٹے چھوٹے ذروں سے بنی ہے۔ یہ ذرّے اس قدر باریک ہیں کہ بہترین خوردبین بھی ان کو دائرۂ بصارت میں لانے سے قاصر ہے۔ یہ ذرّے کسی عنصر میں زیادہ ہیں اور کسی میں کم یہی وجہ ہے کہ مختلف عناصر کے خواص میں فرق ہے۔ لیکن موجودہ نظریئے کے مطابق یہ چھوٹے چھوٹے ذرّے ریم ( ) بھی شکستی ہیں اور ہر ذرہ ان چھوٹے چھوٹے ذرات سے بنا ہے۔ جن کو الکٹرون و پروٹون (برق پارے) ( ) کہتے ہیں۔

جاڑوں کا زمانہ ہے۔ بارش موسلا دھار ہو رہی ہے۔ آثار قدیمہ کی ایک شکستہ عمارت میں لوگوں کی کثیر تعداد بارش سے بچنے کے لئے پناہ گزین ہے۔ ایسے وقت میں ایک خاکروب ہاتھ میں جھاڑو لئے ایک پھٹی دھوتی گھٹنوں تک باندھے ایک پھٹا کوٹ پہنے جو بارش سے بالکل بھیگ گیا تھا، آتا ہے، اس کا جسم جاڑے کی وجہ سے کانپ رہا ہے، اُس کے دانت سردی کے باعث بج رہے ہیں۔ وہ عمارت کے اندر داخل ہونا چاہتا ہے، لوگ اس کو روکتے ہیں۔ بائیں! ہائیں، یہاں کہاں آ رہا ہے۔ دیکھتا نہیں یہاں پر سب شریف آدمی کھڑے ہیں۔

خاکروب۔ سرکار میں سردی کے مارے مرا جا رہا ہوں۔ پاس کوئی بھی ایسی جگہ نہیں جہاں بارش سے بچ سکوں۔ ذرا دھیمی ہو جائے تو چلا جاؤں گا۔

ایک نیک دل۔ اچھا ایک طرف کھڑا ہو جا۔

ایک خاں صاحب۔ واہ جناب واہ! آپ بھی کمال کر رہے ہیں۔ ایک بھنگی اور ہم لوگوں میں کھڑا ہو جائے۔ آپ کو کہتے وقت اتنا بھی خیال نہ ہوا۔ چل بے یہاں سے۔ نہیں تو.........

خاکروب۔ حضور! اس وقت میں کہاں جاؤں۔ اگر اندر نہیں گھسنے دیتے تو دیوار کے پاس ہی کھڑا ہو جانے دیجئے۔

دوسرا۔ آخر تو سامنے پیڑ کے نیچے کیوں نہیں چلا جاتا۔

خاکروب۔ سنتا ہوں کہ پیڑوں پر بجلیاں گرتی ہیں۔ میں بھی اپنی بوڑھی ماں کا سہارا ہوں۔ اُس کی خدمت کرنے والا اور کون ہے؟

خاں صاحب۔ نامعقول کہیں کا، اب جب کہہ دیا کہ یہاں جگہ نہیں ہے تو جاتا کیوں نہیں۔ مار کا بھوت بات سے تھوڑا ہی بھاگتا ہے۔ ہوش و حواس درست کر دوں کیا؟

(اُن لوگوں کی آنکھیں بند تھیں۔ مگر خداوند دیکھ رہا تھا، وہ ایک غریب کو بارش سے بچنے کے لئے بھی جگہ نہیں دیتے۔ تو خدا اُن کو اپنی پناہ میں کیوں رکھے! بجلی گری اور اُس کے ساتھ ساتھ مکان کی بوسیدہ چھت بھی گری۔ آئیے دیکھئے ایک ذلیل انسان کے چاروں طرف کتنی شریف، کتنی اعلیٰ مرتبہ ہستیاں پڑی ہیں، جو کبھی اپنے قیمتی لباس کو اس کے گندے کپڑوں سے مس بھی نہ ہونے دیتے تھے، آج اُنھیں کپڑوں کو بھنگی کا گندہ پیر خراب کر رہا ہے۔ جو کبھی اس کے جسم کو اپنے جسم سے ملنے میں ایک بڑا گناہ سمجھتے تھے، آج بدن کا ہر حصہ اُن سے ملا ہوا ہے۔ ایک رُوح نکل جانے کے بعد بھی امتیازی حیثیت قایم رہتی ہے؟

امین آباد پارک لکھنؤ میں ایک غریب ایک جوڑی جوتے لئے سڑک کے کنارے کھڑا تھا، شہر کے شرفار کا ایک گروہ ادھر سے گزرا۔

ایک۔ کیوں میاں اس کی کیا قیمت ہوگی؟

وہ۔ لیجئے دیکھئے تو۔

دوسرا۔ اماں یار تم بھی کہاں ٹہر گئے۔ کیا یہ گنوارو جوتے خریدو گے؟

ایک۔ یار تم بھی بالکل بے وال کے بودم ہو۔ (آہستہ سے) قیمت معلوم کرنے میں کیا ہرج ہے۔

ہاں بھائی تو قیمت ایک ہوگی۔

غریب۔ آپ اسے دیکھیں تو آپ سے کیا زیادہ لوں گا۔ دیکھئے کتنا پائدار ہے، میں نے تین دن کی محنت میں بنایا ہے۔

دوسرا۔ اور پھر بھی اتنا بھدا!

غریب۔ تو حضور یہ ہاتھ مشین تو نہیں ہو سکتے۔ آپ میری محنت دیکھئے، چمڑا اور پائداری دیکھئے۔ صرف خوبصورتی پر مت جائیے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ اُن مشین کے جوتوں سے زیادہ چلے گا جو دیکھنے میں تو خوبصورت ہوتے ہیں، مگر بہت جلد ٹوٹ جاتے ہیں۔

پہلا۔ جانتا ہوں، دوکانداری کی باتیں خوب جانتا ہوں۔ اب آپ قیمت بتلایئے قیمت۔

غریب۔ جناب پانچ روپیہ ہوں گے۔

دوسرا۔ پانچ روپیہ (قہقہہ لگا کر) بھئی واللہ کمال کر دیا۔ پانچ روپیہ۔ یہ بھی ایک ہی رہی۔ ارے بھائی اس میں پانچ روپیہ کی کیا بات ہے۔ اجی حضرت بس رہنے بھی دیجئے۔ کیوں ہمارا اُلو بنانا چاہتے ہیں۔ پانچ روپے میں تو جناب کو پانچ جاپانی جوتے مل سکتے ہیں، فرمائیے کیا ضرورت ہے۔ (قہقہہ) چلو بھی یار۔ کہاں وقت ضائع کیا۔ (مڑ کر) کیا آپ بارہ آنے پر قناعت فرمائیں گے؟

غریب۔ بارہ آنہ۔ تین دن کی محنت اور بارہ آنہ، نہیں جناب

معاف کیجئے۔ یا خدا تیرا شکر ہے۔

بارش نہ ہونے کی وجہ سے ریاست جے پور میں ہیضہ پھیل گیا ہیلتھ
آفیسر کا حکم نامہ آیا کہ فوراً شیخاوالی چلا جاؤں اور وہاں اس مرض کے
تدارک کی کوشش کروں، چنانچہ حسب الحکم وہاں پہونچا، پتہ چلا کہ اراولی
پہاڑ کی وادی میں ایک چھوٹی سی بستی ہے وہاں یہ واقعات زور شور سے
وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔ فوراً ضروری سامان اونٹ پر لاد کر اور خود بھی
ایک ہنڈل بنا ہوا اونٹ پر لد گیا۔ پیچھے پیچھے اردلی اور میں اونٹ پر ہچکولے
کھاتا بستی کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ خطرناک تھا، دونوں جانب گھنے
جنگل تھے، جن میں کثرت سے شیر تھے، ایک تو دھوپ کی شدت دوسرے
اونٹ کی سواری عجیب مصیبت تھی۔ شام ہوتے ہوتے بستی کا دردھویا دا آگیا،
آخر تھک کر گر تر پڑا۔ پہاڑ کے دامن میں ایک چھوٹا سا مندر تھا، رات گزارنے
کے خیال سے وہیں رک گیا۔ اردلی نے کھانے کی فکر شروع کر دی۔ اور
میں حواس درست کرنے کی خاطر مندر کے چبوترے پر ٹہلنے لگا۔ میں نے
دیکھا کہ دور کچھ آدمی ہاتھوں میں مشعلیں لئے پہاڑ کے ایک غار میں جا رہے
ہیں۔ بہت سوچنے پر بھی میں کسی نتیجہ پر نہ پہونچ سکا کہ آخر وہ کہاں جا رہے
ہیں۔ اس لئے ارادہ کیا کہ چل کر دیکھنا چاہئے، میں اردلی سے یہ کہہ کر کہ
کھانا تیار کرو میں ابھی آتا ہوں، غار کی طرف روانہ ہو گیا۔ تاریکی چاروں
طرف پھیل چکی تھی۔ ببول کے درختوں اور جنگلی جھاڑیوں سے ہوا ٹکرا کر
ایک مہیب آواز پیدا کر رہی تھی۔ آسمان بالکل سیاہ تھا اور دور تک
پہاڑوں کی دھندلی دیوار پھیلی ہوئی تھی۔ جیسے جیسے میں غار کے قریب
ہوتا جاتا تھا ڈھول کی آواز تیزی سے میرے کانوں میں آئی۔ میں قریب
پہونچا اُس وقت سب اندر داخل ہو چکے تھے غار میں بالکل اندھیرا تھا۔
میں ٹٹولتا ہوا آگے بڑھا، تھوڑی دور چلنے کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک
کشادہ جگہ پر بہت سے راجپوت جمع ہیں اُن کے ہاتھوں میں مشعلیں ہیں اور
سر درگا دیوی کے سامنے جھکے ہوئے ہیں۔ ڈھول بند ہوا اور پجاری نے
جو دیوی کے قدموں میں کھڑا تھا کہا "ہیضہ تمام گاؤں میں پھیل چکا ہے روزانہ
چالیس پچاس آدمی مرتے ہیں۔ یہ اُس وقت تک کم نہ ہوگا جب تک کہ دیوی
پر (نر بلی) نہ دیا جائے گا، اس لئے آپ لوگوں کو یہاں بلایا گیا ہے جو شخص
خوشی سے اپنے آپ کو دیوی پر قربان کرنا چاہے وہ باہر آ جائے اس کی
وجہ سے ہم لوگ مصیبت سے بچ جائیں گے، اور ایشور اُس کو سُورگ میں
جگہ دے گا: چاروں طرف خاموشی طاری تھی۔ ایک شخص مجمع سے باہر نکلا،
اور دیوی کے قدموں میں جھک گیا، پھر اُس نے خوشی سے اُٹھ کر کہا،
"میں خوشی سے قربان ہونے کو تیار ہوں" اُس کی لڑکی اُس سے آکر لپٹ
گئی اور روتے ہوئے کہا "پتا جی! آپ کو کیا ہو گیا! آپ مجھے کس پر چھوڑے
جا رہے ہیں"

پتا۔ ایشور پر بیٹا! تم نہیں جانتیں، مذہب کے لئے، وطن کے لئے،
گاؤں کے آرام اور چین کے لئے اگر میری جان جاتی ہے تو کچھ پروا نہیں،
موت ایک نہ ایک دن ضرور آتی ہے، بیٹا پھر کیوں نہ وطن پر جان دے
دی جائے، جس سے ہمیشہ ہمیشہ دنیا میں نام رہے۔ اور دوسری دنیا میں
بھی جا کر آرام اور سکون نصیب ہو، بیٹا تم ان آنسوؤں کو پونچھ ڈالو۔
کہیں ایسا نہ ہو کہ اُن کو دیکھ کر تمہاری محبت، وطن اور قوم کی محبت پر غالب
آ جائے۔

بیٹی۔ مگر پتا جی۔ آپ کے بغیر میں کب زندہ رہ سکتی ہوں۔ اگر آپ
دیوی کے پاس جاتے ہیں تو مجھے بھی ساتھ لیتے چلئے۔ میں کیسے دیکھ سکوں گی۔
نہیں پتا جی آپ نہیں جا سکتے ہیں۔ آپ کو ہرگز نہ جانے دوں گی۔

پتا۔ صبر کرو بیٹا، تم سمجھتی ہو، موت مجھکو تم سے جدا کر دے گی نہیں بیٹا
محبت کا رشتہ کبھی نہیں ٹوٹتا، دنیا ایک جنگل کا کنواں ہے جس پر مسافر آتے
ہیں اور اپنی پیاس بجھا کر چلے جاتے ہیں۔ میں تم سے ایک نہ ایک دن ضرور
جدا ہوتا، اب ان آنسوؤں کو روکو، تم نہیں جانتیں، جو شخص قوم اور وطن
کے لئے جان دیتا ہے وہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ اُس کا نام سنہری حرفوں
سے صفحۂ تاریخ پر لکھا جاتا ہے، اور سدا اُس کے گھروں میں چرچے رہتے
ہیں۔ تم کو تو خوش ہونا چاہئے کہ تمہارا پتا ایک ایسا کام کر رہا ہے جس سے
سیکڑوں کی جانیں بچ جائیں گی، اس لئے بجائے اس کے کہ تمہارے
آنسو گریں تم مسکرا دو۔ تاکہ اس دنیا سے جاتے وقت میرے ہونٹوں پر
بھی مسکراہٹ ہو۔ (لڑکی خاموش ہو جاتی ہے، اُس کے آنسو رک جاتے ہیں)

پتا۔ (گلے سے الگ کر) ایشور تم کو سدا خوش رکھے۔ اس کو کبھی نہ
بھولنا، اور دوسرے ایشور اپنے پتی کی سیوا کو اپنا دھرم سمجھنا، کیونکہ یہی

کی خدمت تمہارے لئے نجات کا باعث ہوگی۔ اچھا بیٹا تم کو ایشور کے سپرد کیا۔ پجاری نے دعا پڑھی، بہادر راجپوت نے کھانڈا اُٹھایا، اور ایشور کا نام لے کر ایک ہاتھ میں اپنی گردن اُتار کر دیوی کے قدموں میں ڈال دی۔

یہ ہے قومی محبت کی سچی اور چشم دید مثال، علم سے بے بہرہ، تہذیب سے ناواقف، ایسے اعلیٰ اخلاق کے مالک ہیں۔ مگر افسوس کہ ہم لوگ جس قدر تعلیم یافتہ ہوتے جاتے ہیں انسانیت کا مادہ فنا ہوتا جاتا ہے، خودغرضی اور بے مروتی ہر طرف پھیلی ہے، اپنے مطلب اور غرض کے سوا اور کچھ نہیں سجھائی دیتا۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا ترقی کر رہی ہے، کیا اسی کا نام ترقی ہے۔ آئے دن کی لڑائیاں، آئے دن کے جھگڑے، ذرا ذرا سی باتوں پر دشمنی، غرض دنیا بھر کی بُری باتیں ہم میں ہیں۔ جو شخص جس حال میں ہے اُس سے آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کرتا۔

اے ہند والو! اب جاگ جاؤ، تفرقہ چھوڑو۔ سب ہندی ایک ہیں، بھائی بھائی ہیں۔ مذہب خدا تک پہونچنے کی راہیں ہیں، جو شخص جس راہ پر چلتا ہے چلے، مگر ناقوس و اذان کی مشترکہ آواز پر سب ایک میدان میں جمع ہو جائیں۔

کیا یہ باتیں ہماری گزشتہ شہرت کو واپس نہیں لاسکتیں؟

تاثراتِ کشمیر

شاعر کی دُعا

پھولوں کا چمن ہیں آشیانہ کر دے — اللہ حقیقت کو فسانہ کر دے

انسان کے ہاتھوں اسے برباد نہ کر — کشمیر کو فردوس روانہ کر دے

سرزمینِ گُل

بہار خطۂ کشمیر اے معاذ اللہ — گُلوں کا ایسا خزانہ کہیں نہیں دیکھا

نظر کو جان سجاتے ہوئے یہیں پایا — زمیں کو لعل اُگلتے ہوئے یہیں دیکھا

صبحِ کشمیر

چشمے کی طرح صبح اُبلتی ہوئی دیکھی — سُورج کی کرن برف پہ چلتی ہوئی دیکھی

مشرق کے مسافر نے جہاں آنکھ دکھائی — چاندی سی پہاڑوں پہ پگھلتی ہوئی دیکھی

نجم آفندی

عورت، مرد و محبّت

ہر کتاب پُرانے زمانے میں خدا کے نام سے شروع کی جاتی تھی، اُس کی برکت حاصل کرنے کے لئے اس کے بعد یہ طریقہ نکلا کہ کسی بڑے مگر بیوقوف آدمی کے نام معنون کی جانے لگی، اُس سے مالی مدد حاصل کرنے کے لئے۔ فریب دینے والے سب کو فریب دیتے ہیں، خدا کو اُس کی حمد و ثنا کر کے، اور اُمرا جو ظل اللہ ہیں اُن کو کتاب معنون کر کے، میں اپنے اس چھوٹے سے قصّے کی ابتدا ایسے شخص کے نام سے کرتا ہوں جو نہ بڑا ہے نہ بیوقوف، میرا ممدوح وہ ہے جس کی ذات اُن تمام خطاؤں سے مملو ہے جو انسان کو دلچسپ انسان بناتی ہیں۔ وہ ہے جسے اچھا کہنے والے شاید دو ہی چار ہوں، یا نہ بھی ہوں۔ لیکن دلچسپ کہنے والے بہت ہیں، خوش مذاق ہے، لطیف ذہن رکھتا ہے، اکثر بہت مزے کی باتیں کرتا ہے، بس اور کیا چاہیئے، کوئی کسی کو بخشوانے تو جاتا نہیں! انسان عبادت کے لئے خلق کیا گیا ہے، کیا مزے کی باتیں کرنا یا مزے کی باتیں سننا عبادت نہیں ہے؟ جو نہ سمجھتے ہوں نہ سمجھیں میں تو اسے عبادت سمجھتا ہوں۔

انھیں خیالات کی بنا پر میں اپنے اس قصّے کی ابتدا محمد علی ردولوی کے نام سے کرتا ہوں، جو انسانیت کو فرشتگی سے جدا رکھنے والا، مزے کی باتیں کرنے والا، اور نکاح پر نکاح کرنے والا ہے، خدا اُس کو حاجی سے ناجی کرے، جیسے راجہ جہانگیرآبادی، ایس، آئی، سے کے، سی، آئی، ای ہوئے، اور مجھ عبادت گزار کو زیادہ عبادت گزار بنائے،

آمین یا الٰہی

عبدالوالی فرنگی محلی

گذارش

خیال مکان و زمان کی قید سے بری ہے، خیال کی تصویر میں بھی مکان و زمان نہ ڈھونڈا جائے، کوئی یہ نہ پوچھے کہ کس زمانے کی سوسائٹی یا کس جگہ کی سوسائٹی کی تصویر اس قصّے میں کھینچی گئی ہے، کیونکہ یہ ایک خیال کی تصویر ہے، ایک خیال کے خدوخال اس میں دیکھو، کسی سوسائٹی کے خدوخال دیکھنے کا قصد نہ کرو۔

خیال کا ایک رُخ پیش کیا جاتا ہے، پڑھنے والوں کو پسند آیا تو ان کی اور میری دونوں کی نجات کا سلسلہ قائم ہو جائے گا، ورنہ میری عبادت تو جاری رہے گی، جو لکھنا ہے لکھتا رہوں گا، جو نہیں پسند کرتے پڑھکے معصیت میں نہ گرفتار ہوں، جو گانا کانوں کو بھلا لگے رُوح میں ارتعاش پیدا کرے اُس کا سننا ثواب، اور جو کانوں کو کھلانے لگے اور رُوح کو پژمردہ کرے اُس کا سننا عذاب ہے، (عاصی عبدالوالی)

پہلا رُخ

رقیہ۔ خسرو نے میری تصویر کیسی ستیاناس کر ڈالی۔ میں کیا جانتی تھی، جب میری شکل بن چکی تھی اُسی وقت اُن سے چھین لاتی تو اچھا ہوتا، یہ تصویر اب میری نہیں رہی، کسی اور چیز کی تصویر ہو گئی۔ میری شکل صرف اس میں آگئی ہے۔

نایاب بیگم، کیسی حسین تو تصویر ہے، تم کہتی ہو تصویر کو ستیا ناس کر دیا۔ تمہیں بدلی کا چاند کرکے دکھایا ہے،

رقیہ ۔ مگر میری تصویر تو نہیں رہی، بدلی کے چاند کی ہو یا بہار کی۔ رقیہ کی تصویر نہیں ہے، کوئی اسے دیکھ کے کہے گا کہ رقیہ کی تصویر ہے؟ رقیہ تو تصویر کا ایک خفیف سا جزو ہے،

نایاب ۔ عالم بہار کا تمہیں جزو بنا کے دکھایا ہے، اس پر بھی تم خفا ہو، ایسی لاجواب تصویر کی تم نے یہ قدر کی۔

رقیہ ۔ بہار مجھ پر چھا گئی ہے۔ اُس نے مجھے فنا کر دیا ہے، اس کے روپ کے آگے میرا روپ مٹی میل ہو گیا۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصور کو بہار کے روپ کی زیادہ فکر تھی، میرے روپ کی فکر نہ تھی۔ تصویر میں میری شکل تو ہے، مگر میں نہیں ہوں، میں تصویر کی بُرائی نہیں کرتی، یہ کہتی ہوں کہ خسرو نے تو میری تصویر بنانے کو کہا تھا، یہ میری تصویر کب ہے، درخت کے پتوں کی سبزے میں جان ہے، بادلوں کے اُودے پن میں جان ہے، نہیں ہے تو میری شکل میں، خسرو کو مجھ سے غرض نہیں، میرے حُسن سے سروکار ہے، میرے حسن کو مجھ سے الگ کرکے دکھایا ہے، آگ لگے اس حُسن کو، میری شکل اور میرا حُسن ہے مگر میں ندارد، تصویر سے صاف غائب، خسرو! کیا کوسُوں تجھے اور تیرے کمال کو، کیسا میرا دل دُکھایا ہے۔

نایاب دل میں خوش ہوتی ہے، ایک نئی حقیقت اُس پر افشا ہو رہی ہے، دنیا جانتی تھی کہ خسرو اور رقیہ ایک دوسرے کے عاشق ہیں، یہ ایک نیا راز کُھل رہا ہے، کہ خسرو کے دل میں رقیہ نہیں ہے خسرو کی جان کو سبز پتیوں اور اُودے بادلوں سے زیادہ تعلق ہے کہ پتیوں اور بادلوں کی تصویر میں خسرو کی جان کی لپک پہونچ جاتی ہے، اور ان بے جان چیزوں کی تصویر اس کی جان سے جان پکڑ لیتی ہے، رقیہ کی تصویر بناتا ہے اور اُس کی جان کی آگ شعلہ نہیں دیتی، کوئی لپک اس تصویر تک نہیں پہنچتی۔ نایاب کی خوشی کا باعث یہ تھا کہ خسرو کو وہ اپنا کرنا چاہتی تھی، گو وہ جانتی تھی کہ اس کی صورت میں وہ آب و تاب اور وہ کشش نہیں ہے جو رقیہ کی صورت میں ہے۔ پھر رقیہ کے ذہن و ذکاوت کا بھی وہ کسی نہج سے مقابلہ نہیں کر سکتی تھی، مگر وہ یہ خوب جانتی تھی کہ خسرو کے ذہنی ہیجان اور اُس کے صنعی احساسات کی دہکتی آگ کو سکون اور ٹھنڈک اگر کوئی عورت پہنچا سکتی ہے تو وہ۔ وہ خوب سمجھتی تھی کہ خسرو کے لئے ایسی عورت کی ضرورت ہے جو اُس کے پیچھے اپنے کو تج دے۔ خسرو کو چاہنے والی عورت کی ضرورت ہے، چھوانے والی عورت کی نہیں۔ جذبات کی آگ سے وہ اپنے صنعی احساسات کو گداز کرتا ہے کہ تخلیقی صناعی کرے، خلاقی قدرت دکھائے کسی عورت کے واسطے جذبات کی آگ میں جھلسنا اُس کا کام نہ تھا۔ کوئی عظیم کام کرنے والا جذبات کی آگ میں نہیں پھاندے گا، دُور سے خالی تماشہ دیکھے گا، جذبات جسم و ذہن دونوں کو بھسم کر دینے والی چیزیں ہیں۔ جذبات کی آگ ذہن کو تیز اور جسم کو محرک کر سکتی ہے، جب مقدار ان کی مناسب اور موزوں ہو۔ مقدار بڑھ جانے سے ذہن و جسم دونوں کو ختم کر دے گی، جذبات سے کھیلنا آگ سے کھیلنا ہے، صنعتگر یا کوئی بڑا کام کرنے والا یہ کھیل نہیں کھیل سکتا۔

نایاب کم علم تھی کم فہم نہ تھی، اُس کو یہ سب باتیں دھندلی دھندلی دکھائی دیتی تھیں۔ مگر اس کی سمجھ جو کچھ اُسے سمجھاتی تھی وہ اُسے اپنا کر لیتی تھی، اور اپنی زندگی کے دستور العمل میں اُنھیں داخل کر لیتی تھی۔ لطیف و نازک ذہنی نکات اُس کی سمجھ سے باہر تھے، اس لئے اُن پر کبھی غور بھی نہیں کرتی تھی۔ رقیہ صنعتگر شاعرہ تھی، نزاکت میں ذہن رکھتی تھی حسن و عشق کو اپنی دنیا بنا رکھا تھا۔ اپنے حسن کی شمع کے گرد پروانے دیکھنا چاہتی تھی، اور خود بھی حسن کی قدر کرتی تھی، جسے اپنے خیال میں وہ عشق سمجھتی تھی۔ نایاب کو حسن و عشق کے رموز سے کوئی واقفیت نہ تھی، وہ زندگی کو سمجھ سکتی تھی، کیونکہ اُسے محسوس کرتی تھی، اپنی زندگی کو بامراد بنانے کی خواہش اس میں شدت کے ساتھ تھی۔ اور ہمہ وقت اُسی کی کوشش میں رہتی تھی، زندگی کو بامراد کرنے کا اُس کے ذہن میں سیدھا سادہ راستہ یہی تھا کہ ایک عظیم ہستی رکھنے والا مرد اُسے ملے، اُسے اپنی مرضی کا بنائے اُس مرد سے اولاد پیدا کرے، پھر اُن کو اپنی مرضی کے موافق بنائے، وہ اپنی نسائی طاقتوں سے بے خبر نہ تھی، اور اُنھیں کامل طور سے استعمال کرنا بھی جانتی تھی۔ رقیہ سے اُس کو رشک و حسد نہ تھا، کیونکہ وہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ رقیہ اور وہ دو مختلف قسم کی عورتیں ہیں، رقیہ کا راستہ دوسرا ہے اور اُس کا بالکل دوسرا۔ اُس سے اور رقیہ سے تصادم

ہو ہی نہیں سکتا۔ رقیہ کو وہ سمجھ گئی تھی، ایسا مرد درکار ہے جو اُس پر فریفتہ ہو، اُس کی پرستش کرے۔ اسے ایسے مرد کی تلاش ہے جس پر یہ فریفتہ ہو، اور اپنی مرضی کا بنائے۔ اس کی نظرِ انتخاب خسرو پر اس لئے پڑی کہ بغیر دلیل اسے کسی طرح یہ پتہ چل گیا کہ خسرو اپنے جذبات کا مصرف یہ نہیں سمجھتا کہ عشق عاشقی کی جائے، وہ اپنے جذبات کو صناعگری میں صرف کرنا چاہتا ہے۔ اُسے خسرو کے حُسن سے مطلب تھا نہ ذہنی کمالات سے بلکہ خسرو کی ذات سے اُسے غرض تھی۔ کسی طرح اُسے یہ یقین ہو گیا تھا کہ خسرو کو وہ اپنا کرکے چھوڑے گی۔ اس لئے یہ حُسن کے اور سمجھ کے کہ خسرو کا دل رقیہ کی طرف نہیں مائل ہے، وہ اپنے یقین اور خیال کی ایک سیڑھی پر گویا اوپر چڑھ گئی۔

جب نایاب نے رقیہ کو بہت افسردہ خاطر دیکھا تو سمجھانے لگی اور کہا "تصویر کوئی بڑی اہم چیز ہے جس پر اتنے غم اور غصّے کا اظہار کرتی ہو؟" رقیہ نے جواب دیا "نایاب! تم نہیں جانتیں میرے دل کی کیا حالت ہے، تم اسے ذراسی بات سمجھتی ہو، میرے لئے زندگی کا یہ اہم واقعہ ہے، میری اس میں کوئی خطا نہیں کہ میری طبیعت حساس واقع ہوئی ہے" نایاب نے کہا "حساسی کو جتنا بڑھاؤ گی بڑھتی جائے گی، طبیعت کو بے لگام کیوں چھوڑو۔ طبیعت ہمارے قابو میں ہونا چاہیئے نہ کہ ہم طبیعت کے قابو میں۔ زندگی کی تکلیفوں کی جڑ، میرے خیال میں طبیعت کا بے قابو ہونا ہے" رقیہ بولی "تم کیا جانو، بے قابو طبیعت زندگی کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے، زندگی کی پوری شاعری اور پورا مزہ اسی تڑپ اور بے قابو پن میں ہے" نایاب رقیہ کا جواب پاکے چپ ہو رہی، اتنے میں خسرو اور ناصر آ گئے۔

خسرو۔ کہو اس وقت کس مرد کا ذکر ہے! تم عورتوں کو تو ہر وقت مرد ہی کا رونا رہتا ہے۔

رقیہ۔ کیسے مرد کا رونا عورتیں نہ روئیں، عورتوں کو پُرلطف خواب سے تم لوگ چونکا دیتے ہو، ان کی بہشت کو دوزخ بنا دیتے ہو، چاہ اور پیار سے اُن کا دل لے لیتے ہو، اور جب وہ دل کھو بیٹھتی ہیں تو دامن جھٹک کے الگ کھڑے ہو جاتے ہو۔

- میری پیاری شاعرہ! تو مرد و عورت کے باہمی تعلقات پر اپنی شاعری کیوں ضائع کرتی ہے، اپنے پاکیزہ ذہن کو اس آلائش و گندگی میں ڈال کے کیوں ناپاک کرتی ہے، ایسا حسن اور ایسا ذہن رکھنے والی عورت مرد کا رونا روئے یہ اس کی شان کے خلاف ہے،

رقیہ۔ کوئی شان کو لے کے کیا کرے، جب زندگی کی مراد پوری نہ ہو، شان کو دیکھے یا مراد کو۔ بے شان کی زندگی لطف کے ساتھ گزر سکتی ہے، لیکن نامراد زندگی قہر و عذاب ہے۔

خسرو۔ شاعری کی مراد زندگی شعر ہے۔ اُس کی نامرادی شعر کا نہ نکلنا، اور خیال کا نہ آنا ہے، حافظ نے سمرقند و بخارا ایک کالے تل پر نثار کیا تھا، شاعر اپنے خلق کئے ایک شعر اور ایک خیال پر دونوں جہان کی نعمتیں نثار کر دے تو بھی کم ہے، تم پر اس وقت عورت پن غالب ہے، یہ عورت پن یہ باتیں تم سے کہلا رہا ہے، دیکھو تصویر میں میں نے تمہارا عورت پن کیسا چھپایا ہے، بادلوں میں اسی لئے دکھایا ہے کہ تمہیں خاکی سے افلاکی کر دوں (تصویر پر نظر پڑتی ہے، اُٹھا لیتا ہے) یہ دیکھو! میری حسین رقیہ کتنی بلند ہے، بلکہ بلندی سے بلندی پر جانے کے لئے آمادہ ہے، عرش سے خیال لا کے بادلوں کی بلندی میں شعر پیدا کرے گی، اور کثیر ارضی آدمیوں کے دماغ منور کرنے کو نیچے پھینک دے گی۔

رقیہ۔ خدا کے لئے تصویر کا ذکر نہ کرو۔ اس تصویر اور ان باتوں سے مجھے نفرت ہوتی ہے۔ میں اس خواب و خیال میں تھی کہ تم مجھے چاہتے ہو۔ میں کیا، دنیا یہی سمجھتی تھی۔ اس ناشاد و نامراد تصویر نے مجھے ایک مزے کے خواب سے جھنجھوڑ کے جگا دیا۔ جو دنیا میرے خیال نے بنائی تھی پاش پاش ہو گئی۔ تم نے مجھے دھوکا دیا۔ میری تصویر بنانے کو کہا اور نہ معلوم اپنے کس خیال کی تصویر بنا دی۔

خسرو۔ میں نے دھوکا نہیں دیا، تمہاری ہی تصویر بنانے بیٹھا تھا۔ پہلے تمہاری ہی شکل کنوس پر بنی تھی۔ پھر نہ معلوم کیا ہوا۔ میں نہیں جانتا کون تصویر میرے دماغ میں تھی، جو کنوس پر آ گئی۔ تم جانتی ہو صناع اپنے اوپر قابو نہیں رکھتا۔ اُس سے حکم دے کے کوئی چیز نہیں بنوائی جا سکتی۔ وہ تو دل کی رَو کے تابع ہے جو رَو آئی اُسی پر چلنے کے لئے مجبور ہے، یہ بات تمہیں خود سمجھ لینا تھی۔

رقیہ ۔ مگر مجھے یہ کیا خبر تھی کہ رقیہ خسرو کے دل میں نہیں ہے، صرف
زبان پر ہے۔ رقیہ تو یہ جانتی تھی کہ خسرو کے دل کی رُو رقیہ کے قابو میں ہے،
کس شوق اور کس قلق سے میں تصویر لائی، کہ اپنے کو تمہارے ہاتھ سے بنا ہوا
دیکھوں۔ یہ دیکھوں کہ خسرو کی رقیہ کیسی ہے، میرے دل پر کیا گھونسہ پڑا
ہوگا، خیال کرو۔ جب میں نے یہ دیکھا کہ تصویر سے میں غائب ہوں، جو شکل
دکھائی گئی ہے میری لاش تک کی نہیں ہے۔ میری صورت سے ملتی جلتی کسی
فرشتے یا جن کی تصویر دکھلا دی گئی ہے، خسرو تم نے مجھ پر ایسا ظلم کیا جس
کی تلافی ناممکن ہے۔

خسرو ۔ خسرو کی رقیہ تو اس تصویر میں موجود ہے، البتہ وہ رقیہ نہیں
ہے جو سونے والے کمرے میں ٹکائی جائے۔ رقیہ غور کرو جنسی معاملات جسے
محبت کے نام سے پکارا جاتا ہے اس میں کیا رکھا ہے، جس طرح پانی میں
کنکری پھینکنے سے دائرے پر دائرے بننے لگتے ہیں، اسی طرح لفظ منہ سے
نکلنے سے خیالات کے دائرے پر دائرے بننے لگتے ہیں، محبت کا لفظ منہ
سے نکلا کہ معانقے چمٹنے، پیار کرنے دوسرے جسم کو دبوچنے کے خیال آنے
لگے، اور ہیجان بڑھا تو ایک طرف سے انکار دوسری طرف سے اصرار،
گوشے اور کونے ڈھونڈھنا، پھر گندگی اور آخر کار، ناپاکی دور کرنا،
یہ سب خیالات لفظ محبت کے گرد دائروں کی صورت میں چکر لگانے
لگتے ہیں، محبت ایک مادی حاجت کا شاعرانہ نام ہے، ویسی ہی حاجت
جیسے کھانا کھانا، آنتوں سے غیر ضروری چیز خارج کرنا وغیرہ۔ شاعری
یا کسی اور صنعت کو عشق و محبت پر صرف کرنا صنعت کی ستیاناسی نہیں
تو اور کیا ہے۔ کھانا کھانے کی خواہش ہر شخص کو ہوتی ہے مگر طعام کا عشق
کسی کو ہوتے نہیں دیکھا، اسی طرح پانی پر کسی کو عاشق ہوتے نہیں دیکھا،
گو پانی پیاس بجھاکے بجد تفریح جسم کو پہنچاتا ہے۔ کھانا کھانے کا کام بجائے
خود کوئی پُرلطف کام نہیں، گو نتیجہ اُس کا جسم کے لئے مفید ہو، اگر منہ میں
چبا ہوا کھانا کوئی دیکھے تو غیر ممکن ہے کہ گھن نہ آئے، عشق و محبت کا آخری
نتیجہ بھی کس قدر گھنونا ہے اور بالکل آخر نتیجہ بچہ پیدا ہونا کوئی دلکش منظر
نہیں پیش کرتا۔

رقیہ ۔ کس طرح کی واہیات باتیں تم کر رہے ہو،

ناصر ۔ کہاں لطائف ذہنی اور کہاں یہ گندی باتیں۔

خسرو ۔ یہی تو کہتا ہوں، کہ لطائف بھی سراسر گندگی ہیں، منہ سے
نکالو یا نہ نکالو، اس پر خاموشی کا پردہ ڈال کر اپنے ذہنوں کو دھوکہ دو،

ناصر ۔ فطرت کے تقاضوں پر پردہ ڈالنے اور نہ ڈالنے سے
کوئی فرق نہیں آتا۔

خسرو ۔ ناصر کیسا ظلم کرتے ہو، فطرت کی طلب میں بھی جانتا ہوں،
ناگزیر ہے تم اس طلب کو ذہنی لطائف سے سجا کر اس کی گندگی کو بھی چھپا دیتے
ہو، مجھے اس پر اعتراض ہے، نر و مادہ دائمی اور لابدی حقائق ہیں، جانور
اور انسان دونوں اس سے واقف ہیں، مگر جانور اسے روحانی فعل نہیں
بناتا، اس کے گرد ذہنی لطائف کے دائرے نہیں قائم کرتا، شاید اُس کی
گندگی سے باخبر ہے، تم اس کی گندگی پر پردہ ڈالتے ہو، طلب کو طرب
بناتے ہو، پوری انسانی صنعت اس پر صرف کرتے ہو، نتیجہ اس کا عورتوں
عورتوں کی بدکاری، مردوں مردوں کی بدکاری، امراض، نامردی،
کمزوری، موت۔

رقیہ ۔ مجھے قائل کرنے کی کوشش نہ کرو، تمہاری باتیں جراحت
پر نمک کا کام دے رہی ہیں، مجھے تم سے نفرت ہو گئی،

خسرو ۔ صرف تم کو نہیں، ناصر کو بھی نفرت ہو گئی ہوگی، کیا میں
پوچھ سکتا ہوں۔ نفرت کی کیا وجہ ہے، یہی نا کہ تمہارے حسن کو تم سے الگ
کرکے جو دکھایا!! اپنی شہوانی خواہشوں کو اس میں شریک نہیں کیا، اس وجہ
سے؟ رقیہ تم اپنے کو اس درجے گرا رہی ہو کہ مرد کی شہوانی خواہشات سے
اپنے حسن کی جانچ کرتی ہو، جہاں تک عورت کا تعلق ہے مرد بادہ کے بندے
ہیں، ان بادہ کے بندوں کی آنکھ سے تم اپنے حسن کو دیکھنا چاہتی ہو، میں
تمہارے حسن کو صنعت کی روشنی میں دیکھتا ہوں، اگر کسی دوسری روشنی میں
دیکھوں تو وہ حسن میرے لئے حسن نہ رہے، ہر بچہ دینے والی مادہ کی طرح
تم بھی ہو جاؤ۔ جو تکلیف و مایوسی میں اپنی تصویر دیکھ کے ہوئی وہی تکلیف
اور دکھ مجھے ہو، اس سے مجھے انکار نہیں کہ دوسری عورتوں کی طرح
تم بھی ایک عورت ہو حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے، مگر یہ بھی حقیقت
ہے کہ انسانی ذہن مادی عالم سے ایک غیر مادی عالم پیدا کر سکتا ہے،
اسے دل فریب دھوکا سمجھو، لیکن اس حقیقت کے وجود سے تم انکار نہیں
کرسکتیں، جسے ایسا ذہن عطا ہوا ہو کہ یہ دلفریب دھوکہ پیدا کرسکے،

تو ان سے کیوں نہ مزے اُٹھائے۔ شہوانی خواہشات سے چھٹکارا اتنا ہی مشکل ہے جیسے بھوک یا اجابت کی ضرورت سے، ان فطری خواہشوں کو ذہن کی مدد سے تیز اور دھار دار کرنا جب ذہن اور لطائف بھی پیدا کرسکتا ہے حماقت نہیں تو اور کیا ہے، میں اپنی شہوانی خواہشات کی مدد سے تمہیں ایسا بنا دیتا کہ ہر مرد کی تم پر رال ٹپکتی تو کیا تم خوش ہوتیں؟

باہ پرست مرد اور باہ پسند عورت دنیا بس تیری ہے: تیرے ہی گیت دنیا گاتی ہے، مگر مجھے باہ کے گیت گانے کی فرصت نہیں، میں معاف کیا جاؤں۔

رقیہ۔ تم سے کون بات کرے۔ تم تو ایک جملہ کے جواب میں داستان کی داستان سنانے لگتے ہو،

خسرو۔ اب مجھ سے نفرت تو نہیں ہے، ناصر سے پوچھو وہ کیا کہتے ہیں۔

ناصر۔ جو عورت تم سے محبت کرے اُس کی مٹی خراب ہے،

خسرو۔ اس چھوٹے سے جملے میں معانی کی دنیا پنہاں ہے۔

(رقیہ کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ پیدا ہوتی ہے، مگر منہ پھیر کے چھپا لیتی ہے)

ناصر۔ معانی پنہاں نہیں بالکل آشکار ہے، ذہن کے نازک نکات اور ان کے لطائف کے پیچھے تم پھرو، اور تمہارے پیچھے وہ بدبخت عورت، ایسی عورت کی زندگی برباد نہیں تو آباد ہوگی؟

خسرو۔ مجھے اپنی فکر سے چھٹی نہیں، دوسروں کی آبادی یا بربادی کی ذمہ داری کیسے لوں۔ میرے لئے عورت عذاب ہے،

نایاب۔ اچھا یہ قصہ کبھی ختم بھی ہوگا، اپنی فکر اگر تمہیں ہے تو پہلے جان و جسم کی خبر لو، تین دن سے گھر میں کھانا نہیں کھایا ہے، ہوٹلوں میں کھانا کھا کے صحت قائم رہ سکتی ہے؟ پھر ٹھیک وقت نہیں، صبح کا کھانا دوپہر کو، دوپہر کا شام کو، کپڑوں کو دیکھو تین مہینے سے ایک ہی سوٹ پنڈے پر ہے، نازک ذہنی نکات کے لئے یہ باتیں بھی کیا ضروری ہیں؟

خسرو۔ یہ بالکل دوسری قسم عورت کی ہے، رقیہ سے بالکل مختلف نایاب قسم کی عورت نہایت خطرناک ہوتی ہے، رقیہ قسم سے تو پیچھا چھڑانے کی فکر کی چنداں ضرورت نہیں، کیونکہ وہ از خود خفا ہوکے الگ ہو جاتی ہے لیکن دایا عورت جسے مرد کے کھانے اور کپڑے کی فکر ہو وہ اس اژدہے کی طرح ہے جو لپٹ کے ہڈی پسلی توڑ دیتا ہے، جو عورت شفقتِ مادرانہ کرنے پر آمادہ ہو جائے اس کی پناہ نہیں ہے، (نایاب سے) آپ کو میرے سوٹ اور میرے پیٹ کی فکر کیوں ہے؟

نایاب۔ فکر کیسے نہ ہو، ایک شخص ہے کہ اپنی جان گنوائے دے رہا ہے، کچھ خیال نہیں کرتا، اگر صحت خراب ہوگئی تو آپ کے ذہنی نکات سب غائب ہو جائیں گے۔

خسرو۔ اچھا تو انسانی ہمدردی کا جذبہ جوش زن ہے، لوگو آؤ، اور اس ہمدردِ انسان عورت کا نظارہ کرو! نایاب زندہ باد! انسانی ہمدردی زندہ باد!

نایاب۔ مجھ پر تمہاری ان تیزابی باتوں کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔ تمہاری کوشش بیکار ہے۔

خسرو۔ یہی تو میں کہتا ہوں کہ یہ ہمدردِ انسان عورتیں بہت خطرناک ہوتی ہیں جس کو تاکیں اُس کو ماریں اور ایسا ماریں کہ اُٹھ کے پانی نہ پئے۔ اچھا نایاب! کچھ کھانے کو دو، بہت بھوکا ہوں۔

نایاب۔ میں سمجھ گئی تھی، یہ تیز و ترش باتیں بھوک کا نتیجہ ہیں۔ میں نے چہرہ دیکھ کے معلوم کرلیا تھا، ذہن کے بہت سے کرشمے معدہ کی کیفیت سے تعلق رکھتے ہیں۔

خسرو۔ دایا عورت حقائقِ مادی سے خوب آگاہ ہوتی ہے، مادی قوانین اُس کی گرفت میں رہتے ہیں۔ اُسے ذہن کی تراوشوں سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔

نایاب۔ ناشتہ تیار ہے۔ سب لوگ کھانے کے کمرے میں چلیں گے یا یہیں برآمدہ میں منگایا جائے۔ اماں نے دوپہر کو کھانے کے وقت انتظار کیا، جب تم نہیں آئے تو کہا کہ ناشتے کا پورا انتظام کرلو۔

خسرو۔ ایک اہل اللہ اپنے زعم میں کہہ اُٹھے تھے "جو میں چاہتا ہوں وہی خدا کرتا ہے" ان بزرگ کا تو خالی خولی زعم تھا، مگر نایاب بغیر کہے وہی کراتی ہے جو چاہتی ہے: "اماں نے دوپہر کو کھانے کے وقت انتظار کیا" یہاں تک ممکن ہے ٹھیک ہو، مگر یہ کہ "کہا کہ ناشتے کا پورا انتظام کرلو" اس میں ایسا نازک اور لطیف دروغ ہے کہ جس کی پناہ نہیں ہے، نایاب

کی اماں کو میری صورت سے نفرت ہے مجبور ہیں، گھر سے نکال نہیں سکتیں، سگی خالہ ہیں بھانجے کو کیسے نکالیں۔ نایاب! کیا اُنھیں اچھا معلوم ہوتا ہے کہ تم میری خاطر اور میرا خیال کرتی ہو، مگر سنگ آمد و سخت آمد کا معاملہ ہے جو تم چاہتی ہو اُن سے کرا لیتی ہو، یہ بھی تم نے کہوا لیا ہوگا کہ ناشتہ تیار رکھو، نایاب قسم کی عورت اپنی مرضی نہیں ظاہر کرتی، کسی سے کہتی نہیں کہ یہ کرو، وہ نہ کرو۔ وہ ایسی صورتیں پیدا کر دیتی ہے کہ اُس کی مرضی کے خلاف کوئی بات ہو ہی نہ سکے وہی ہو جو اُس کی مرضی ہے۔

نایاب تیری پناہ نہیں ہے! آنکھوں والو دیکھو! کانوں والو سنو! نایاب کہتی ہیں خالہ اماں کے حکم سے میرے لئے ناشتے کا انتظام ہوا ہے، جو نایاب دکھائے، اور جو سنائے، ہمیں دیکھنا اور سننا ہے! (رقیہ و ناصر ہنستے ہیں نایاب کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ ہے مگر فاتحانہ مسکراہٹ) یہ عورت خلاق صنعتگر ہے، اس کی صناعی کا مال مسالہ وہ نہیں ہے جو شاعروں مصوروں اور بُت تراشوں کا ہوتا ہے، اس کا مال مسالہ مرد ہے اس کے بعد بچے۔ اس کو مرد حاصل کرنے کی فکر ہے، ایسا مرد جس پر وہ اپنی صنعتگری صرف کرے، اُس کو جیسا چاہے ویسا بنائے۔ اپنا مال مسالہ وہ خود ڈھونڈ کر حاصل کرنا چاہتی ہے دوسروں کا دخل اس کام میں نہیں چاہتی۔ مرد پاکے اُسے بنائے گی جیسے حوا نے آدم کو بنایا تھا۔ خدا کی خالی حمد و ثنا کرنے والے۔ مناظر قدرت سے مست ہونے والے، خیالات میں محو رہنے والے آدم کو دنیا دار گنہگار، خاطی، انسل پرور آدم بنایا تھا۔ نایاب پوری حوا ہے، اپنی قسم کا نمونہ ہے۔ وہ مرد جن کے دماغ آسمان کی بلندیوں تک اُڑنے والے ہیں، نایاب قسم کی عورت اُنھیں اپنی کاریگری کا مال مسالہ سمجھتی ہے جیسے معمار اینٹ چونے کو، کمہار مٹی کو، لوہار لوہے کو، مصور رنگ اور کنوس کو، لوگو، ڈرو اور پناہ مانگو!!

نایاب۔ یہ اسا لی کبھی ختم بھی ہوگی یا عورتوں کا رونا روتے ہی رہوگے۔

رقیہ۔ جب تشریف لائے تھے تو یہ فرماتے آئے تھے کہ عورتوں کو ہر وقت مردوں کا رونا رہتا ہے، اب تو میں یہ دیکھ رہی ہوں کہ مردوں کو عورتوں کا رونا رہتا ہے۔

خسرو۔ اس وقت دو مختلف النوع عورتیں اکھٹا ہیں۔ اس لئے خیالات کو تحریک ہوئی۔

رقیہ۔ دو مختلف النوع مرد بھی تو اکھٹا ہیں، عورتوں کے خیالات کو بھی تحریک ہو تو کیا بیجا ہے، ایک مرد وہ جو اپنے سوا دوسرے کی چھان نہیں دیکھتے، دوسرے وہ جو اوروں کے لئے اپنی پروا نہیں کرتے،

خسرو۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتیں، ایک قسم کا نمونہ خسرو دوسرے قسم کا نمونہ ناصر۔

رقیہ۔ میں اقسام کا ذکر کرتی ہوں، افراد کا نہیں۔

خسرو۔ ناصر! تمہارے لئے اپنی دلی مرادیں حاصل کرنے کا زرّیں موقع ہے،

بازے چنیں بدست و شکارے منی کنی

رقیہ۔ ناصر ایسے نہیں ہیں کہ اپنے دل کی باتیں ہتھیلی پر لئے پھریں۔

خسرو۔ ہاں یہ رموزِ عشق ہیں، دل کی باتیں دلوں سے ہوتی ہیں۔ زبان پر اُن کا آنا عشق کو رسوا کرنا ہے، یہی بات ہے نا! عشق کو عشق کہو، کسی دوسرے نام سے نہ پکارو، اس کو رسوائی سے بچاؤ، مسجد کو اینٹ چونے کا مکان کہنا اس کی رسوائی اور توہین ہے، بُت کو پتھر کہنا اُس کی رسوائی ہے، انسان جس چیز کو چاہے عزت دے، جس کو چاہے ذلیل کرے۔

رقیہ۔ وہی سلسلہ پھر شروع ہو گیا، نایاب بہن اِنھیں جلدی کچھ کھلا دو۔ منہ چلے تو زبان بند ہو۔

سب لوگ کھانے کے کمرے میں ناشتے کے لئے گئے، خسرو واقعی بھوکا تھا، ناشتے پر ٹوٹ پڑا، اسے ناشتے پر اس طرح ٹوٹتے دیکھکر ناصر نے کہا "خسرو! انسان باد کا بندہ ہے یا پیٹ کا؟"

خسرو۔ کیا دونوں باتیں صحیح نہیں ہو سکتیں؟

ناصر۔ میں تو ایک ہی بات صحیح جانتا ہوں کہ انسان پیٹ کا بندہ ہے، کیونکہ ہر بات اس کے بعد آتی ہے، مذہب، تہذیب، صنعتگری حسن پرستی، یہ سب پیٹ بھرے پن کے ڈھکوسلے ہیں، ذہن کے کرشمے اور کرتوت پیٹ میں غذا پہنچنے کے تابع ہیں۔ انسان کے لئے سب سے پہلا مسئلہ روٹی کا ہے۔

خسرو، مسائلِ انسانی سلسلے اور انتظام کے تابع نہیں، میں کسی مسئلے کے متعلق اول و آخر کہنا ٹھیک نہیں، جس چیز کی شدت احتیاج ہو اُسی کا مسئلہ مقدم ہے، علمی کتابوں میں ترتیبِ مسائل جو ہوتی ہے اُس سے ہم سب دھوکہ کھاتے ہیں۔ اول و آخر کی بحث میں پڑ جاتے ہیں، وہ ترتیب صرف سمجھانے اور ذہن میں اُتارنے کے لئے ہے، بات چیت میں صغریٰ و کبریٰ کی ترتیب نہیں ہوتی، بھوکوں کے لئے روٹی کا مسئلہ یقیناً مقدم ہے، مگر جن کو روٹی آرام سے اور کثرت سے ملتی ہے اُن کے لئے یہ مسئلہ مقدم نہیں ہے، ناصر کے لئے رقیہ کا مسئلہ مقدم ہے، نایاب کے لئے خسرو کی خبرگیری کا مسئلہ مقدم ہے، میرے لئے پیٹ بھرنے کا مسئلہ اس وقت مقدم ہے، کسی عورت کا بچہ رو رہا ہو اس کے لئے دودھ پلانے کا مسئلہ مقدم ہے، کسی کو زور کا پیشاب لگا ہو اس کے لئے پیشاب کا مسئلہ سب سے مقدم ہے، ناشتہ کرنے کے بعد مجھے اپنی تصویر جس کی رقیہ تحقیر کرتی ہیں جان سے زیادہ عزیز ہو جائے گی، انسان کے لئے اس کی زندگی کی مراد حقیقی چیز ہے، اور باقی سب چیزیں آنے جانے والی ہیں، آؤ ہم سب اپنی اپنی زندگی کی جے منائیں۔

خود را نہ پرستیدی و ایماں چہ شناسی
کافر نہ شدی لذتِ عرفاں چہ شناسی

(شاعر کی رُوح میری ترمیم سے نہ شرمائے، میری راہ دوسری ہے اُس کی راہ دوسری تھی)

(دوسرا رُخ آئندہ)

خلوتِ رندان

تجی پور چل کہ یار غزل خواں ہے آجکل — یعنی چراغ خلوتِ رنداں ہے آج کل
اپنی جفاؤں پہ وہ پشیماں ہے آجکل — تجدیدِ اشتیاق کا ساماں ہے آج کل
پھر مہرباں وہ خسروِ خوباں ہے آجکل — پھر ہوش و عقل شعلہ بداماں ہے آج کل
ساقی نے پھر بُلائے ہیں احباب بادہ نوش — یعنی شکستِ توبہ کا فرماں ہے آج کل
آزاد ہیں زمان و مکاں کے قیود سے — ہر لحظہ سجدۂ درِ جاناں ہے آج کل
ساقی کے التفات سے مستی فضا میں ہے — ہر اک گدائے میکدہ سلطاں ہے آج کل
اُس شاہدِ خیال کی رنگینیٔ خرام — قدموں میں جس کے ایک گلستاں ہے آج کل
اللہ رے اُس مُغنیٔ آتش نفس کی لے — توبہ! کہ اس سے رُوح بھی رقصاں ہے آج کل

کیا پوچھتے ہو رنگِ ضیا اہلِ میکدہ
سجادہ و قبائے زرافشاں ہے آج کل

محمد ضیاء الاسلام ضیا بی۔ ایس سی
بجنور

محبّت

جی، اے، مجیبیٰ، الہ آباد

مست بھونرے نے نیم باز کلیوں کے بوسے لیے، ان کے گرد منڈلا منڈلا کر محبت کے گیت گنگناتا رہا ——— اُس نے کلیوں سے بڑی عاجزی کی ——— بہت گڑگڑایا ——— معصوم کلیاں اُس کے دام میں آگئیں۔ انھیں پہلے پہل محبت کا راز معلوم ہوا تھا، وہ بیخودی میں سب کچھ بھول گئیں، شرم و حیا سب بیخودی نے جذب کر لیا۔ خزاں کا کچھ بھی خوف نہ رہا ——— محبت میں سرشار نوشگفتہ کلیاں... انھوں نے اپنی پنکھڑیاں کھول دیں اور ہوا میں جھومنے لگیں ——— بالکل اسی طرح جیسے ایک سانپ بین کی آواز پر مست ہو جاتا ہے۔

سیاہ بھونرے نے ان کی پنکھڑیوں کو چھوا، اپنے پروں کی ہلکی ہلکی ہوا سے ان کو پنکھا جھلتا رہا ——— پھر وہ ان پر بیٹھ گیا ——— پھولوں کے بیچ میں۔ اس نے دھوکا دے کر اُن کا سارا رس چوس لیا، اور پھر ——— پھر وہ اُڑ گیا ——— اپنی کامیابی پر گنگناتا اور محبت کے پُرانے افسانے دہراتا ہوا۔

کلیاں بہت دنوں تک اس کا انتظار کرتی رہیں۔ مگر وہ واپس نہ آیا۔ اُنھوں نے سمجھ لیا کہ سخت فریب کھایا، بھونرے نے ان کو چُل دیا ——— انکا سب کچھ لُوٹ کر چلتا بنا۔ اُنھیں بہت صدمہ پہونچا ——— وہ بہت روئیں اور اس وقت تک روتی رہیں جب تک کہ بادِ خزاں کے تند جھونکوں نے اُن کی پنکھڑیوں کو ہوا میں منتشر نہ کر دیا۔

محبت صرف کمزوروں کو ستاتی ہے۔ مرد صنفِ نازک سے محبت کرتا ہے ان کو کھلونا سمجھ کر ایک وقت تک کھیلتا رہتا ہے ——— پھر اُنھیں چھوڑ دیتا ہے ——— وہ بالکل بھول جاتا ہے کہ اس کی دلچسپی کا ذریعہ کون تھا ——— مگر عورت ——— اس کی محبت لازوال ہے، ——— وہ اُس پر قربان ہو جاتی ہے۔

تا ابتداست سرشتۂ ما
ہم تیرہ و [illegible] ہمی ہستی سرشتہ
تکلیف بہ راحت ہمی ہستی سرشتہ
جنگل ترا فردوس ہے ہستی دوزخ سرشتہ
اعراف ہے گویا ہستی سرشتہ

[illegible]

نقد و نظر!

(ادارہ)

طنزیاتِ مانپوری: حصہ اوّل، مجلد، ناول سائز ضخامت، ۱۳۱ صفحات، کاغذ و کتابت و طباعت بدرجۂ اوسط، قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ، منیجر ندیم، گیا (بہار)،

میرزا غالب نے اپنے ایک مکتوب میں کسی جگہ کہا ہے کہ "اگرچہ ظرافت کو میری دیکھا دیکھی سارا ہندوستان لے اڑا ہے، لیکن آج تک یہ چیز بلا شرکت غیرے، میری ہی متاعِ ادب بنی ہوئی ہے!" (بروایت بالمعنیٰ!)

ہم دیکھتے ہیں کہ غالب کا یہ خیال اک نہایت وسیع حقیقت کا عنوان ہے، یہی چیز ہے، جس نے اک مغربی نقاد کی زبان پر یوں اظہار پایا ہے کہ، "ہر موضوع پر اک ضخیم تصنیف لکھ ڈالنے کی جرأت عموماً وہی لوگ کیا کرتے ہیں جو اُس موضوع پر قلم اٹھانے کے سب سے زیادہ نا اہل ہوتے ہیں"

حافظ کا مشہور نوحۂ نقالی اسی بے مایہ شغلِ "میمونیت" پر وقف ہے۔

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند　　　نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند

دہانِ یار کجا و زبانِ سوسن کو؟　　　نہ ہر گلے کہ بخندد مقرری داند

ہزار نکتۂ باریک تر ز مو اینجاست　　　نہ ہر کہ مو بتراشد قلندری داند

اور یہی حقیقت ہے جو اپنی پوری رفعت، نیز اپنی پوری شدت میں اس طرح اک صدائے غفلت شکن بنتی ہے کہ ؎

قیامت ہے کہ احمق اس جگہ بھی دوڑ جاتے ہیں
فرشتوں کے قدم جس سرزمیں پر ڈگمگاتے ہیں!

اردو طنزیاتِ جدیدہ میں جناب رشید صدیقی اور پروفیسر پطرس کے بعد مشکل کسی قابلِ ذکر نام کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ ملا رموزی نے تو ما شاء اللہ اس میدان میں عالمگیر فتوحات کا پھریرا اڑانا چاہا، لیکن بہت جلد اُن کی ہمہ جہت دست افشانی و پاکوبی، "طلبُ الکلّ فوتُ الکلّ" کی مثال بن کر رہ گئی، لیکن وہ ہیں کہ طنزیات پر کتابیں کی کتابیں تصنیف کئے جاتے ہیں۔ کیوں نہ ہو! بلا آں باشد کہ چُپ نہ شود!

معلوم ہوتا ہے کہ اب حضرت مانپوری اسی معرکہ گاہ میں اس بلند آہنگ داعیۂ طبع آزمائی کے ساتھ اُترنا چاہتے ہیں کہ ؎

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی!

کیسی رونے کی بات ہے کہ جس شخص کو دیکھئے ذرا شوق چرایا، اور لبوں پر لک آورد کا تبسم طاری کیا۔ اک فرمائشی قہقہہ لگایا، اپنے شانے "پرکھانے وں کا کھٹا کھٹا" رکھا ——— جو عبارت ہے اُن کے خامۂ ظرافت شمامہ سے!

——— اور ادبی بذلہ سنجی کی بزمِ خاص میں دَر آیا! اب مان نہ مان، میں تیرا مہمان! . . . . ہمیں خوف ہے حضرت "مان پوری" بھی اس ضیافتِ طبع کی دعوت گاہ کے کچھ ایسے ہی "ناخواندہ مہمان" ہیں! مناسب ہو کہ وہ اپنی جولانی طبع کے لئے کوئی اور موزوں تر گوشہ منتخب کریں! ہم کو اک دوسرے شخص کی سی شہرت کی آرزو ہو سکتی ہے، لیکن اس کا میدانِ عمل ہمارا میدانِ عمل نہیں ہو سکتا، یکساں درجے کے کارنامے مختلف محاذوں پر بھی انجام دیئے جا سکتے ہیں، لیکن اس حقیقت کو کبھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے

کہ ایک میدان کا مرد دوسرے میدان میں بچوں کی طرح گھٹنوں کے بل چلنے سے بڑھکر کچھ نہ کرسکے گا، جو بزرگ اپنے موضوعِ ذوق کو نہیں پہچانتے، امتیاز و شہرت کبھی اُن کو نہ پہچانیں گے، ع ہر کسی را بہر کارے ساختند!

مانپوری صاحب نے کچھ شعرگوئی بھی فرمائی ہے ——— بھلا ممکن ہے کہ ہندوستان کا مسلمان ہو، اور شاعر نہ ہو؟! الغرض اکبر الہ آبادی مرحوم پر، بزعمِ خویش، اک نقشِ ثانی" بہم پہنچاتے ہوئے "فیشنیات" کے تحت وہ ایک جگہ کہتے ہیں۔

قیس، فیشن نہیں اب چاکِ گریباں ہونا
سیکھ اب عقل کے دیوانوں سے عریاں ہونا

مگر افسوس! طنزیات کی قلمرو کے "اکبرِ اعظم" کی سند نشین پر قابض ہونا اتنا آسان نہیں جتنا ہمارے "آسان پسند" بزرگوں نے فرض کر رکھا ہے! اکبر حسین مرحوم کی یہ شوخی کوئی کہاں سے لائے گا کہ ؎

پریوں کے عاشقوں کو سودا ہوا سوں کا
جو پھاڑتے تھے جامہ، اب کوٹ سی رہے ہیں

(ا۔ا۔خ)

( ) اسٹوڈینٹس ٹری بیون (انگریزی) جوڑا

رسالہ جاتی سائز، ضخامت ۵۰ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت اعلیٰ، عام گیٹ اَپ صناعانہ، متعدد تصاویرِ اربابِ ادب و صحافت و سیاست، مقامِ اشاعت لاہور، قیمت فی کاپی ۸؍

"اسٹوڈینٹس ٹری بیون" ہندوستان کے نوجوان طالبعلموں اور نوخیز جوانوں" کا آرگن ہے، جس کی گرمیٔ زندگی اور ہنگامِ رستخیز کی بلند بانگی میں جواہر لال کے با اقبال سنینِ صدارتِ کانگریس و قیادت تو منے برف در صدف کے ـ مثلاً ہر پیدا کر دیئے ہیں! ہم بحیثیت اک مستقل قلمی معاون کے بھی "راشٹرا پتی" کے قلمِ جواہر رقم کو "ٹری بیون" کے صفحات میں جولاں پاتے ہیں! مہاتما گاندھی بھی اِس مرقع میں جلوہ گر ہیں! مزید برآں رابندر ناتھ ٹیگور اپنے شانتی نکیتان (مسکنِ امن) کی "وادیٔ امن" سے اکثر اپنے "پیاماتِ کلیمی" سے روح پروری کرتے رہتے ہیں! رسالہ قدرۃً ہندو مسلم کی تفریق سے بالا و برتر ہے، اور اسکی بزمِ قلم و رقم میں ہر مذہب و ملت کے زندہ دلوں کی نمائندگی نظر آتی ہے، بشرطیکہ وہ غیرت و حریت، عزیمت و سبقت کے کلمۂ مشترک کے قائل ہوں!

رسالہ اک نعمتِ غیر مترقبہ نظر آتا ہے۔ وہ سیاست و معیشت ہی کے ذکر و فکر پر محدود نہیں، وسیع صحافت اور ہمہ گیر ثقافت کے ادبیات سے بھی ہم آغوش ہے! طالبعلموں سے ہمیں صرف اتنا کہنا ہے کہ وہ اِس کی ایک کاپی امتحاناً خرید دیں، اور وہ دیکھینگے کہ وہ بیک نظر اُس کے دائرہ شیدا ہو گئے ہیں! ہمیں خوف ہے کہ اگر ہم یونہی نمایاں اُس کی صوری و معنوی خوبیوں اور گیرائیوں کی تصویریں کھینچینگے تو اگرچہ وہ محض اظہارِ حقیقت ہو نگی لیکن مبالغہ کی طرح مسموع ہو نگی! ضرورت "شخصی مس" کی ہے۔

(ا۔ا۔خ)

دیوانِ غالب

"طاہر ایڈیشن" مجلد باتصویرِ غالب و منظرِ مزار و عکسِ تحریرِ قلمی مرزا مرحوم و مغفور، ضخامت ۲۰۰ صفحات، کتابت اعلیٰ نستعلیق نوک پلک کی، طباعت منشیٔ بلاک کی۔ کاغذ دبیز، سفید، چکنا، نام کتاب منقوش بخطِ زر برلوح، عام گیٹ اَپ دیدہ زیب، قیمت عہ ـ ملنے کا پتہ: آغا طاہر نبیرۂ مولٰینا محمد حسین آزاد مرحوم، کوچہ چیلان، دہلی۔

اُردو کتابوں کی طباعت، اور اشاعتی ہیئت اک رُسواکُن معاملہ رہا ہے! حد یہ ہے کہ لوحِ محفوظ کا قرآنِ عظیم جب زمین پر نازل ہوتا ہے تو بکثرت صورتوں میں ایسے کاغذ و جلد کے پیکر میں کہ اس سے زیادہ "توہینِ الہامِ محمدی" کی دنیا کے سارے بدزبان بے ادب لوگ اور پُرعناد نقاد اپنی تمامی زہرچکانیوں اور حریفانہ کاوشوں میں بھی نہیں کرسکتے! بلاشبہ اس کا ذمہ دار مسلمانوں کا افلاس، بے ترتیبی، اور عام بد مذاقی و فقدانِ ذوقِ جمال ہی ہے، تاہم تمام مسلمان قوم یکسر ایسی نہیں، اور اُن کے اک خاص حلقے کی خدمت و ضیافتِ طبع کے لئے باسلیقہ و خوشنما کتابوں کی اشاعت و فراخت کے کافی

موقعے ہیں، مگر اِن ستّی صورتوں میں بھی ہمیں عام ناشرینِ اُردو کی دون ہمتی دلپست فطرتی مایوس کر دیا کرتی ہے، وہ گھاس کی فراہمی اور اس کی بکثرت بکری کی گرم بازاری میں ایک مختصر ترین "تختۂ زعفران" بھی ہم نہیں پہنچاتے، ان حالات میں جو لوگ اس کسمپرس ضرورتِ ذوق کو پورا کرنے کا اقدام کرتے ہیں۔ یہی نہیں کہ شاہراہِ عام سے انحراف کے مرتکب بنتے ہیں۔ بلکہ سرد بازاری کے اک خطرے کو بھی دعوت دیتے ہیں! ——— آغا طاہر صاحب کا یہ کارنامہ ایسی ہی خطرناک قسمت آزمائی ذوق تکلف ہے!

دیوانِ غالب کے "طاہر ایڈیشن" کے خصوصیات و امتیازات مختصر اسرنامے میں بتائے گئے ہیں۔ اِن میں سرِمو مبالغہ کو دخل نہیں! سچ تو یہ ہے کہ ہمیں خوف ہے کہ ان مجمل تفصیلات سے آیا قارئینِ کرام اس باصرہ نوازِ عروسِ ادبی کی قرار واقعی صورتگری اپنی لوحِ دماغ پر کرسکیں گے یا نہیں۔ بیشتر اردو کتابیں جب ناقد کے سامنے آتی ہیں تو یکسر اک "نغمۂ کا پیام" ہوتی ہیں۔ بہت کم ایسی ہوتی ہیں، جو اپنی اشاعت کی کم و بیش اک معذرت سی ہوتی ہیں! لیکن شاذ و نادر ایسی جلدوں کی زیارت نصیب ہوا کرتی ہے، جو اردو ادبیات کے "سیاہکار" اداراتِ اشاعت و طباعت کی پوری تلافی کر دیتی ہیں! دیوانِ غالب کا زیرِ تبصرہ "طاہر ایڈیشن" اسی نوازشِ دل و نظر کی اک نظیر ہے! بلاشبہ آغا صاحب تمام خوش ذوق اُردو کتاب خوانوں کی طرف سے شکریے کے مستحق ہیں۔ اور ناقدین کی جانب سے مبارکباد کے حقدار! ع

اے وقتِ تو خوش کہ وقتِ ما خوش کردی!

بعض چیزیں حُسنِ قبول کی بلجی بن کر محتسب کے سامنے آتی ہیں۔ لیکن خود محتسب کو اُس کے تمام اسلحہ خانۂ نقد و جرح سے غیر مسلح کر دیتی ہیں۔ اور اگرچہ آتے ہوئے اک "سائلِ نظر" ہوتی ہیں۔ لیکن جاتے ہوئے اک "فاتحِ قلب و روح" ثابت ہوتی ہیں۔ ہمارے پاس دیوانِ غالب "طاہر ایڈیشن" کی آمد و شد کا ماجرا ایسا ہی دلچسپ رہا۔

غالب مرحوم کی جو تصویر دی گئی ہے وہ اپنے خط و خال میں انفرادیت و اصلیت کی آئینہ دار نظر آتی ہے۔ قبرِ غالب کا فوٹو ہر دیوان خواں کو اک روحی کیف اور ادبی سعادت بہم پہنچائے گا، اور غالبِ اعظم کے خط کی "عکسی شبیہ" تو دیکھنے والوں کو غالب کی شاعرانہ زندگی کے اُن مخصوص و نادر لمحوں سے وابستہ کر دیگی جن کی شانِ نزول یہ ہوتی ہے کہ ع

انگلیوں پر اک جلالی شان آتی ہے نظر!

محولۂ بالا تحریر، غالب کے قلم سے حضرت سید ذوالفقار الدین حیدر الموسوی المعروف بہ حسین مرزا کے متعلق ہے جو غالب کے مشہور جامع کلام و مرتب انتخاب ہیں (بتصریحات، اردوئے معلیٰ) یہ بزرگ، آغا طاہر صاحب کے براہِ راست اجداد میں سے ہیں! اُنکا یہ نسخہ آغا صاحب کے خاندانی تبرکات کا نقشِ نگین ہے۔ غالب کی دیباچہ نما تحریر اُن کے دستخط و مُہر سے مزین ہے، صاحبِ تحریر کا خاتمے کا یہ شعر آج کتنا حسبِ حال اور عبرت انگیز ہے کہ ؎

یکون الخط فی القرطاس دھرا
وکاتبہٗ رمیم فی التراب

(ا۔ا۔خ)

"تیج" کا افسانہ نمبر

"تیج" کا افسانہ نمبر جس آب و تاب سے شائع ہوا ہے، میں اُس پر اپنے دوست گپتا صاحب کو دل سے مبارکباد دیتا ہوں ——— رسالہ ظاہری اور باطنی دونوں خوبیوں سے بدرجۂ اتم آراستہ ہے ——— افسانوں کا انتخاب نہایت اعلیٰ اور تصویریں بھی نہایت موزوں ہیں ——— علامہ کیفی اور لطیف احمد صاحب اکبرآبادی کے رشحاتِ قلم پر "تیج" جس قدر ناز کرے کم ہے ——— ۱۹۸ صفحوں کے باوجود اس کی قیمت صرف دو آنے ہے۔ جو ہر لحاظ سے بہت کم ہے۔ "نرخ بالا کُن کہ ارزانی ہنوز"۔ افسوس کہ وقت بہت کم ہے، اس لئے اس پرچے پر حسبِ مراد تبصرہ نہیں کیا جاسکتا ——— میں قارئین سے پُر زور سفارش کرتا ہوں کہ اگر انہیں اعلیٰ افسانے اور اپنے بلند پایہ ادیبوں کے دیگر ادبی شاہکار کے مطالعے کا شوق ہے تو وہ "تیج" کے افسانہ نمبر کو ضرور پڑھیں۔

"مدیر کلیم"

رفتارِ وقت

ادارۂ کلیم

مسئلہ سرحد

سرحد کا سیاسی اضطراب، حربی خلفشار، اور ہندو شرفار کی لڑکیوں کا بعض اہلِ قبائل کے ہاتھوں اغوار، گزشتہ دو ایک مہینوں کے اندرونِ ہند کے اہم حوادث رہے ہیں۔ جن کی وقعت و نزاکت کا طغرائے امتیاز یہ ہے کہ خود کانگریس پریزیڈنٹ، پنڈت جواہر لال نہرو، کی توجہ کو اُس نے منعطف کیا۔ جنھوں نے اک مفصّل اور نقادانہ بیان اِن واقعات و مسائل پر شائع کرایا۔

مسئلۂ سرحد، برطانوی سلطنت ہند کے جسم کا اک ناسور ہے، جو کم و بیش تین ربع صدی سے رِس رہا ہے۔ یہ مظہرِ سیاسی اک مستقل آزار تھا، جس کے لئے اک اصولی، بیخکن مُعالجے کی ضرورت تھی۔ برٹش گورنمنٹ کے میڈیکل ہال میں اس کا جو نسخۂ شفا رہا ہے اُس کے اجزا رہیں وقتاً فوقتاً فوجی کارروائیاں، تادیبی مہمیں، سردارانِ قبائل کے نذرانے، اور کبھی کبھی اس نرم طریقہ کار ردِّ عمل اتنی گرمی سے کہ پٹھان ملکوں کو پیشکش کئے جانے والی اشرفیوں کا نازائیدہ لازمی اُن جسم پاش اور خانہ برانداز ہوائی جہازوں کے گولوں سے ہے جن کا آماج کوہستان نشین قبائلی دیہات کی آبادیاں اور جھونپڑیاں بنتی رہی ہیں! ؎

درکینہ دررزمی تعفیدہ دشتے
درمہربانی بُستاں سرائے

یہ طریق جتنا طول طویل، جتنا خونریز و زرپاش، اور جتنا پیچیدہ و ژولیدہ رہا ہے، وہ اُس کی غلط روی و گمرہی کو اُس کی ساری عُریانی میں بے نقاب کرتا ہے! لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سامراج اپنی طینت و سرشت ہی میں کجروی و بد تدبیری کے رگ و ریشے رکھتا ہے اور وہ اُس کی ہستی و زندگی کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں! حد یہ ہے کہ یہی چیزیں اُس کی ترقی و بالیدگی کے بھی ساز و برگ ہیں۔ جوع الارض اور الحاقِ اقطاعِ زمین، قیصریت کی غذائیں بھی ہیں اور اُس کے زہر بھی! جہانگیریت اک بلانوش اور پُرشکم و شحم جسم ہے! وہ جس چیز سے موٹی تازی ہوتی ہے اُسی سے ضعف کا معنوی ہُزال بھی اخذ کرتی ہے! ایک قہرمان سلطنت اپنے جن بھاری بھرکم بر و دوش سے کمزور قوموں کو ڈرایا کرتی ہے، وہی بالآخر خود اُسے انحطاط و انہدام کے خطرۂ جانستان میں گرفتار کر دیا کرتے ہیں! حکمت زارِ فطرت کی عدل گاہ میں اسی طرح ہر غلط کاری کی پاداش ایسی ہی لازم و ملزوم ہے جیسی کہ زہر خوری کا خمیازہ خودکشی!

وسیع و عریض "ماورائے بحر و کوہسار سلطنت برطانیہ کے عوج بن علق کے سے جسم ابوالہول کے ایک ایک رگ و ریشہ میں آج جو درد، سوزش، ورم، دنبل، اور سرطان نمایاں ہیں وہ ماشاء اللہ اُسی نیک تنی" کے اثار شیریں ہیں، جس پر انگلستان کے کشورکشاؤں اور وسعت پسندوں کو ناز رہا ہے! ؎

نہ ہو خوش فربہیٔ تن سے غافل
سُبک کرتی ہے مُردے کو گرانی

سلطنت، عالمگیری اختیار کر کے وہ "مطلع الانوار" نہیں بنا کرتی جس پر "آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا"! وہ، وہ گرانبار جسم بنتی ہے جو اپنے

گلاں سری (Top-heaviness) کے نتیجے
میں انجام کار نقل کو کر جب لڑکھڑاتا ہے تو رعایا و برایا کے مفلس، بھوکے
طبقوں کی پتلی ٹانگیں اُسے ہرگز سادہ نہیں سکتیں اور لے ڈوبتی ہیں۔

خواجہ در بند زیب ایوان است
خانہ از پائے خویش ویران است

ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد پر جُز ز یہی کیفیت اُس سامراجی
کارنامے سے ظہور میں آئی ہے جسے حکومتِ ہند کی "فارورڈ پالیسی" کا
عنوان بھی دیا جاتا ہے!

کیسی بوالعجبی اور ستم ظریفی ہے کہ سرحد پر آئے دن کے فوجی تصادم،
شورہ پُشت آزاد قبائلِ افغانان کی دراندازیوں اور اُن سوزیوں کے
نتیجے کہے جاتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ خود اِن نیم وحشی
قبائل ہی کو وکوہاٹ کو علمبرداران تہذیب کیمبرج و آکسفورڈ سے عین
یہی شکایت کہیں زیادہ منطقی دلائل کی بنا پر ہے" پیشقدم حکمت عملی" کیا
ہے، اگر "مداخلتِ بیجا بیجا" کی سیاسی تعبیر نہیں ہے؟!

لیکن تاریخ انسانی کی عبرتوں نے تمام دوسرے مقامات کی طرح
یہاں بھی اپنی جلوہ نمائی کی ہے: انگلستان کی سیاسی وحربی پالیسی
کے جیسے معکوس نتائج سرحد پر ظہور میں آتے ہیں وہ ایک دیدنی سبق رکھتے
ہیں۔ انگریز نے اُن سرحدیوں کو مغلوب و پابزنجیر کرنا چاہا جن کی ناممکن
التسخیری سکندر اعظم کے سے کشورکشا کے وقت سے مسلم، غیر مجروح ہے!
جن جنات صفت لوگوں نے شہاب الدین محمد غوری کا چراغ حیات ایک
پھونک میں گل کر دیا! جنھوں نے اکبر اعظم کی فوج ظفر موج کو حشرات الارض
کی طرح تتر بتر کر دیا! جن سرحدی اہلِ قبائل کا اک شاعر ـــ خوشحال خاں
خٹک ـــ اپنے چند ہمنفس و دلدادۂ حریت و استقلال نوجوان
رفیقوں کے سامنے اس طرح اپنا سینۂ غیرت عُریاں کرتا ہے کہ:۔

کہوں تجھ سے اے ہم نشیں دل کی بات؟
وہ مدفن ہے خوشحال خاں کو پسند
اُڑا کر نہ لائے جہاں بادِ کوہ
مُغل شہسواروں کی گردِ سمند

اور ہاں جس علاقۂ آزاد کا اک بچہ برطانی حکومتِ ہند
کی قہرمان ہوائی طاقت کے عُقاب ہیبت ـــ بمبار طیارے ـــ
کے متعلق کہہ دیتا ہے کہ ہم تمہاری "چڑیا" سے ڈرتے نہیں۔

الغرض "پٹھان" کا "گرگے" میں قلب ماہیت ہو جانا آسان ہی
نہ تھا! انگریز اس بے سود کاوش میں آج بھی گرفتار ہے!

پھر دیکھئے کہ حریفوں نے کیا سوچا تھا اور کیا ہو گیا۔ سرحد کو انگلستان
نے اپنی سلطنتی افواج کی تربیت کے لئے اک "ٹریننگ گراؤنڈ" کی طرح استعمال
کرنا چاہا، لیکن اس عمل نے خود پٹھان کو عہد جدید کا پورا پورا بالِ ماہر پیکار
بنا دیا ـــ ایسا کہ اُس کے شاہد عادل ہندوستان کے برطانوی
کمانڈر انچیف تک رہ چکے ہیں۔

انگلستان نے سرحد کے دامنوں میں گرفت حاصل کر کے "رسوائے عالم
"روسی خطرے" کا سدِباب کرنا چاہا، لیکن یہ خطرہ خطرناک تر ہو گیا، اور
اپنی جدید العہد نمود میں اُس نے اک اور رُخ سے دھمکی دینی شروع کی
ہے، جس کے نتیجے میں گورنمنٹ ہند کو اپنا محاذ کچھ تبدیل کر کے اور کچھ وسیع
کر کے گلگت کے برفانی وحشت زار میں اک فوجی ناکہ قائم کرنا پڑا ہے!

برطانیہ نے خونناک "وفادی راوڑا" کا نام لے لے کر ہندوستان
کے ہندوؤں کو خوب ڈرانا چاہا، لیکن قسمت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ سرحد
نے اپنی امن پسندی اور ہندوستان دوستی کے مظاہرے میں اپنی خاک
سے اک "سرحدی گاندھی" کو کھڑا کر دیا!

خواتین کے اغوا کے پُراسرار حوادث کی تشہیر کی زہرپاشی سے ہندو
مسلمانوں کے قلوب میں ایک ناقابلِ عبور خلیج پیدا ہو جانے کا اندیشہ تھا لیکن
یادش بخیر ڈاکٹر خاں صاحب اور ان کے بکثرت محترم و باسوخ افغان سردار
دوستوں نے ہندوؤں کی مصیبت زدہ لڑکیوں کو "اپنی محبوب بیٹیاں" کہکر
خطاب کیا۔ اور خاص اسی اسپرٹ میں اُن کے معاملے میں دلچسپی لی، اور
اُن کی بازیافت میں کاوش کا ثبوت دیا!

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند!

پھر اگر ایک طرف بھائی پرمانند کے سے ہندوؤں کے نادان دوست
ان واقعات پر مختل الحواس ہو گئے تو دوسری طرف پنڈت جواہر لال نہرو
نے اپنی پوری "جنگجو یانہ دیوانگی" پر اپنی تمامی "مدبرانہ فرزانگی" کو مستزاد
کر کے اس سارے خطرناک ڈرامے کا پردہ چاک کر ڈالا! الغرض کہ

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد !

ہمارے ہندو برادرانِ وطن کو معلوم ہونا چاہئے کہ خود مسلمان سرحد کے ان مجلسی جرائم کو اسلام کے لئے اس سے بمراحل زیادہ مضرت رساں سمجھتے ہیں جتنے کہ وہ ہندو بھائیوں کے لئے دل خراش ہوں گے! لیکن ہم ساتھ ہی اس کے اُن پر یہ امر بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ وہ یگانہ و بیگانہ کے درمیان فرق کرنا سیکھیں: انگریزی "پریس" دورانِ جنگِ عظیم میں خود "مسیحی جرمنوں" کے افریقہ کے بعض مسلم علاقوں پر توڑے جانے والے خالص مذہبی ظلم و ستم پر اپنے گویا مسلمان "ہم مذہبوں" کی اتنی ہمدردی و دلسوزی فرما چکا ہے کہ سرحد کے ہندوؤں کو ابھی وہ مقامِ مشفقیت نصیب بھی نہیں ہوا ہے ــــــ حالانکہ یہی برطانوی اخبارات تھے جنھوں نے بغداد و بیت المقدس کی تسخیر اور حجاز و حرمین شریفین کی تخریب پر بغلیں بجائی تھیں !! ــــــ اور ان کارناموں کو بیک وقت مسلمان سپاہیانِ افواجِ ہند کا "جہاد" اور برطانوی گوروں کی "فتح صلیبی" کا نام دیا تھا!

پھر شاید آپ کو اس بات کا تو یقین بھی نہ آئے کہ جنگِ عظیم ہی کے دوران میں ترکوں کی شرکتِ جنگ کے بعد ایک دفعہ محی الملۃ و شریعت پناہ حضرت پاؔیونیرؔ نے انورؔ پاشا اور طلعت بے کی جرمن تعلیم و تربیت اور نتیجۃً اُن کے الحاد پرستانہ اور اسلام فروشانہ میلانات پر شرلینٹ نگہ کے لب و لہجہ میں ماتم کیا تھا: انگریزی اخبارات تو ہماری خوش قسمتی سے ہماری ماؤں سے بھی زیادہ ہماری پیاری مائیں (گُٹنیاں) واقع ہوئے ہیں!

فتنے سب سچ سہی قیامت کے
لیکن آگے تمہاری قامت کے !! (ا - ا - خ)

مسئلۂ فلسطین

فلسطین کے برطانوی کمیشن کی رپورٹ شائع ہو چکی ہے حسبِ توقع اس نسخۂ سیاست کا عنوان "ہوالشافی" "بھی پھوٹ ڈالو اور راج کرو" ہے برطانوی "کاتبانِ تقدیرِ اقوام" کے لئے یہ کتنا دلکش و دلربا کھیل ہے کہ تمام سامی ادیان کی "ارضِ مقدس" اور "مشترک قبلۂ شریعت" کی محراب کی یوں اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے! اور مدبرینِ عالم کے مشاعرے پر داد طلبانہ نظریں ڈالی جائیں ع

مُوقر ہندوستانی (انگریزی) جریدۂ ہندوستان ٹائمز کے روشناس مشرق و مغرب کارٹونسٹ ــــ شنکر ــــ نے اخبار مذکور کی ہمروزہ اشاعت میں "برٹش جسٹس" کے اس کارنامے کی کیا خوب مرقع کشی کی ہے، جب کہ اُس نے اک خنجر بکف جلاد کی تصویر بنائی ہے، جس کے دوسرے ہاتھ میں اک لرزاں و ترساں شیر خوار بچہ ہے۔ جسے وہ برابر حصوں میں اپنے تیغ تیز سے تقسیم کر دینے کا حکم اک چنگیز صورت انسان دے رہا ہے، اور جو اپنے فرمان کی تفصیل یوں کرتا ہے کہ "آدھا بچہ پاس کھڑی ہوئی دو عورتوں (مدعی ماؤں) میں سے ایک کو دیدو اور آدھا دوسری کو"! ــــــ یہاں جلاد "فلسطین کمیشن" ہے، فرمان فرما "برطانوی امپیریلزم" بچہ "فلسطین" ہے، اور مائیں "عرب و یہود"! جہاں لوازِ سرنامہ اس منظر ہوشربا کا ہے "عدلِ سلیمانی"!

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند!

اور پھر اربابِ کمیشن صاحب لوگوں کی نظریں اسلامی دُنیا کی مخفل سیاسیات پر اس طرح پڑ رہی ہیں جو ان آدابِ تماشا کی تلقین کرتی ہیں کہ ؎

رہے نہ جان تو قاتل کو خونبہا دیجیے!
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے!

معاملے کی تفصیلات میں جانے سے پہلے ہم یہاں اس ماجرے کے متوقع انجام کی نسبت اپنے اس ایمان و حق الیقین کا اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ مشرق کی تاریخ میں بیسویں صدی تفرقہ و تفریق کے "ارتکاب" کا دَور ہو، تفرقہ و تفریق کے "کامیاب" ہونے کا دَور نہیں! ــــ تقسیم بنگالہ، تقسیم ایران، تقسیم مصر و سوڈان، تقسیم ترک و عرب، تقسیم عرب و ایران، تقسیم سعودی عرب و یمن، تقسیم اعراب و قبائل کُرد (در عراق) تقسیم ہند و مسلم (در ہند) وغیرہ وغیرہ عموماً اسی تاریخی نتیجے پر منتج ہوئے ہیں کہ ع

آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک!

پس خواجۂ اہل فراق "اقوام و ممالکِ عالم کو پارہ پارہ کرنے کی جتنی ہی عرق ریز سعی و کاوش کرے۔ اُس کے کاروبار کے مآل کا تعین اب اسی

سنتِ الٰہی کے تحت عمل میں آئے گا، کہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِیْنَ:

فلسطین کا قضیۂ نامرضیہ بلاشبہ اس سرزمین کے عربوں کے مطالبات کے لئے آسان نہیں ہے۔ لیکن وہ اس مصنوعی "وطن الیہود" کے صیہونیوں اور برطانوی جہانگیریت پرستوں کی آرزومندیوں کے لئے بھی کوئی نانی جی کی آغوش نہیں ہے! اعرابِ فلسطین کی راہ میں جو سنگِ راہ ہے وہ برطانی "استقامت" نہیں، برطانی "پابستگیٔ سازش و ریشہ دوانی" ہے! انگلستان نے مشرقی بحرالروم اور مشرقِ قریبہ میں اپنی غافلانہ کجروی سے جن خطرات کی "مالامال فصل" اُگائی ہے، وہ یہ نہیں کہ اُسے دھمکی نہیں دے رہی ہے، بلکہ مشکل یہ آپڑی ہے کہ اگر وہ اس "دھمکی" کی رعایت کرے تو براہِ راست اک "مرگِ مفاجات" کا جامِ زہر اپنے ہونٹوں سے لگائے! اِس دوگونہ رنج و عذاب میں اُس نے مرضِ مہلک کے سریع السیر تسلسل کو اختیار کرلیا ہے، اور مستقبلِ قریب کی ناگزیر موت سے اک "عارضی مہلت" لیلی ہے! ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو؟

اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے!

حیفہ کی حریفِ مارسیلز بندرگاہ، قائم مقامِ اسکندریہ مستقرِ بحری، موصل کی پائپ لائن کی نکاسی کے دہانے، انگلستان کی یوروپی ایشیائی ہوائی لائنوں کی شہرگ کے مرکز گلو والے نقطے، نہرِ سویز کے نقشِ ثانی "حیفہ بصرہ" والی ہوائی و بری نہر کے نقطۂ آغاز وغیرہ وغیرہ کی گوناگوں حیثیتوں اور اہمیتوں اور مصلحتوں کی بنا پر انگلستان، فلسطین سے عربوں کو کتنا ہی مُدت دراز تک محروم رکھے، اتنی ہی مُدت دراز تک اعرابِ فلسطین اور محتہ لیس پشت کی عربی دُنیا، نیز عام عالمِ اسلامی انگلستان پر اُس کا سیاسی خواب و خور حرام رکھے گا۔ ممکن ہے مدتوں کے بعد فلسطین، برطانیہ کے پنجے سے چھوٹے۔ لیکن پھر جب چھوٹے گا تو انگلستان کے "معلوم کتنے کثیر التعداد اہم قوی کو قطع و بُرید کرتا ہوا الگ ہوگا! "مقروضِ سیاست" انگلستان شوق سے "مدیونِ ڈگری" کو ٹالے۔ لیکن وہ اپنی میزانِ قرضہ و ہرجہ کو بھی المضاعف کر رہا ہے! ممکن ہے دیارِ مشرق پر واقع ہونے والے فلسطین کا معاملہ جب طے ہو تو ساتھ ہی سارے مشرقی اعمال نامہ کا حساب بھی انگلستان کو چکانا پڑے! پس پورے شوق و عزم و ایمان بالغیب کے ساتھ فلسطین کے آغشتۂ خاک بخون عرب بھی انگلستان سے کہہ رہے ہیں کہ ؎

نہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی

امتحاں اور بھی باقی ہو تو وہ بھی نہ سہی

دیکھیں "مخذول و منکوب، مغضوب و مقطوع فی الارض" یہودی تارون برطانیہ کے "نجات دہندہ" ثابت ہوتے ہیں یا بے سروسامان لیکن سرشار اُسوۂ موسوی عرب مجاہد اُس کے حادیٔ مشرق و مغرب سامراج کے "جانستاں" بنتے ہیں! ؎

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز

آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر

قضیۂ فلسطین کا جو تاریخی "پس منظر" ہے اُسے اک نامور انگریز ہی مُدبر، مسٹر بالفور سابق مشیر مالیات ایران، و مصنف کتاب "شیونِ ایران و مشرقِ قریبہ بایام بعد جنگِ عظیم" کی زبان حق ترجمان —— نیز قلمِ الہام رقم! —— سے سنیئے۔

"یہودی ریشہ دوانیوں کے جال میں پورا فلسطین پھنس گیا ہے اور اس دامِ سخت میں مرغِ بسمل کی طرح پھڑک رہا ہے! تجویز یہ ہے کہ "ارضِ مقدس" کو یہودیوں کا "قومی نشیمن" بنایا جائے گا۔ اور اس سلسلے میں انگلستان کو یہ شرف حاصل ہوگا کہ اس یہودی وطن کی تعمیر کے اخراجات کے ایک معتدبہ حصے کی فراہمی میں برطانوی ٹیکس دہندوں کو شرکت کی سعادت نصیب ہوگی! سوال یہ ہے کہ حضرتِ موسیٰؑ کی یہ ہدایت یافتہ اُمت بیت المقدس کی طرف اس ہجرتِ عظمیٰ کا ثواب آخر کیوں کمانا چاہتی ہے؟ نہایت معقول جواب یہ ہے کہ قومِ یہود کی یہ متفقہ اور عالمگیر تمنا ہے کہ ارضِ یہوداکے اُجڑے گھر کو پھر بسائیں۔ لیکن عرض یہ ہے کہ اس "بستی" کے ساتھ موجودہ اہلِ خانہ کی جو "خانہ ویرانی" لازم و ملزوم نظر آتی ہے اُس کے لئے کیا سندِ جواز ہے؟ کسی ملک میں توطن پزیرانہ حیثیت سے قدم رنجہ فرمانے کی صرف آرزو اُس ملک کا "ملکیت نامہ" تحریر نہیں کراسکتی! دنیا پوچھنا چاہتی ہے کہ اس عظیم الشان تحریک کی دعوت کو حق بجانب قرار دینے کے لئے کون سے دلائل و براہین ہیں؟

"اگر اہلِ مغرب کو خدا نے ایسی ہی توفیق دی ہے تو "حق بحقدار رسانیدن" کی اس مہم کو کسی دوسری جگہ سے شروع ہونا چاہیئے! قبل اس کے کہ یہودی بابِ بیت المقدس میں داخل ہوں، مراکش کے مورش عربوں کو

قرطبہ و غرناطہ میں، اور امریکہ کے سرخ ہندوستانیوں کو واشنگٹن و نیویارک میں

قدم نماؤ فزوو آکہ خانہ خانۂ تست

کی صلائے شیریں دینا چاہیئے! لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزوں اور امریکنوں کے جذبات معدلت گستری و محروم نوازی کی رگ یہاں حرکت میں نہیں آتی: آہ بیچارے مورش عرب اور "ریڈ انڈینز" یہودیوں کی طرح دنیا کے صرافے پر تو قابض نہیں ہیں، جس کے زور پر وہ سلطنتوں اور حکومتوں کے نظار تہائے خارجہ کے ایوانوں میں بیٹھکر ملکوں اور قوموں کی تقدیروں کی املا کرایا کرتے ہیں۔

"برطانیہ ماشاء اللہ اس بات کا پورا سکن قلب اطمینان دلاتی ہے، کہ وہ فلسطین میں عدل نوشیروانی کا سکہ چلائے گی۔ لیکن ابھی تک تو یہ تمام بشارتیں "دروغ مصلحت آمیز" سے بہتر ثابت نہیں ہوئیں۔ فلسطین کے عربوں پر اس "یہود شاہی" میں جو بیت رہی ہے وہ ایک طویل اور دردناک داستان ہے، ہم فلسطین کے عربی وفد کے اظہارات و معروضات کے اہم نقاط کو (ملخصاً) یہاں نقل کرنا چاہتے ہیں۔ ارکانِ سفارت نے کہا تھا۔

" واضح رہے کہ ہم اعرابِ فلسطین اپنے قلوب میں کسی قسم کے منافئ "سامیت" جذبات نہیں رکھتے؛ واقعہ یہ ہے کہ ہم یہودیوں کے لئے اُس وقت مامن و ملجا رہے ہیں جب کہ مغرب کے مسیحی ممالک میں وہ کُشتنی و سوختنی سمجھے جاتے تھے! ہمارے لئے جو چیز ناقابل برداشت ہے وہ یہودیت کے بجائے "صیہونیت" (Zionism) ہے، جو فلسطین کے اندر مہمان بن کر آنا نہیں چاہتی، مالکانہ بلکہ فاتحانہ حیثیت سے داخلہ چاہتی ہے۔

" عبرانی زبان جو مشکل سے ملک کی ایک فیصدی آبادی کی بولی ہوگی، فلسطین کی سرکاری زبان بنائی جاتی ہے! صیہونی نو وارد مزدور، عرب غربا کو ان کی قوتِ لایموت سے محروم کرتا ہوا آتا ہے! وہ عرب کے مقابلے میں نصف کام کرتا ہے اور ڈبل اجرت پاتا ہے۔ تعمیراتِ عامہ کے قریبًا سارے ٹھیکے یہودی سرمایہ داروں کی اجارہ داریاں ہیں، جن کے سامنے غریب عرب "نرخِ بالا کُن" کی مُبارزت میں ٹھہر نہیں سکتا۔ فلسطین کا ہائی کمشنر، معتمدِ قانونی، خزینہ دار ذخائر ملکی، ڈائرکٹر تجارت و حرفت اور صیغۂ ہجرت کا افسر اعلیٰ سب یہودی ہیں، اور صیہونی مسلک و مشرب کے یہودی! اسی طرح تمام دفاتر و محاکم میں نو آموز و ناتجربہ کار یہودیوں کی یورش ہے! سارا دفترِ تشریعی یہود نوازی اور عرب کُشی کی رُوح سے معمور ہے! حق گو اخبارات کی ناطقہ بندی کی جاتی ہے۔ حُبِ وطن اور دلسوزئ مُلک کا نعرہ بلند کرنے والے عرب قائدین ملت کو اس عذر پر طوق و سلاسل میں جکڑ بند کیا جاتا ہے کہ ان کی سرگرمیاں امن عامہ کے لئے خطرہ ہیں؛ اُن مزارعین و فلاحین سے جو صحیح معنوں میں نسلًا بعد نسل، قرنہائے قرن سے "فرزندانِ زمین" بنے ہوئے ہیں، یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی اراضیات کا بعینامہ حکومت کے نام کردیں، اس لئے کہ ترکی سلطنت کے جائز وارث کی حیثیت سے جملہ حقوقِ زمین نئی حکومت کے حق میں منتقل ہو گئے ہیں! یہ بعینامہ نما "ضبطی" بعد میں یہودی کاشتکاروں اور زمینداروں کے لئے "عطیۂ جاگیرات" بنا کرتی ہے۔

"شریعتِ اسلامیہ کے مسلمہ و اعلان کردہ آئین کو پامال کرکے صیہونیت آب یہودی حکومت فلسطین کے اسلامی اوقاف کے نظم و نسق میں بیباکانہ مداخلت کے درپے ہے! یونانی راسخ الاعتقاد کلیسا کے وہ تمام اوقاف جن کو ترکوں نے "ملکِ خدا" سمجھکر کبھی ہاتھ نہ لگایا، آج بحقِ حکومت ایک ضبط شدہ جائداد قرار پاتے ہیں: اور سرکاری کمیشن کے زیر اہتمام عمدًا اتنی بڑی بڑی مقداروں میں وائر نیلام کئے جاتے ہیں کہ سوائے یہودی قارونوں کے کوئی دوسرا اُن سے عہدہ برآ نہو سکے۔

"اور یہ محض اک مشتے نمونہ از خروارے ہے، عرب روزانہ اپنے آنکھوں کے سامنے ایسی ایسی بیشمار کارستانیاں اور ریشہ دوانیاں دیکھتا ہے، جس سے اُس کے قلب کے اندر خون اُبال کھاتا ہے:

"عرب لوگ انگلستان اور ساری مہذب دنیا سے سوال کرنا چاہتے ہیں کہ آیا اُن کی یہ ساری تلخ نوائیاں شکوہ ہائے بیجا ہی ہیں؟"

باوجود یکطرفہ ہونے کے یہ سارے بیانات حق بجانب ہیں! برطانوی پبلک کو بالکل تاریکی میں رکھا گیا ہے، ورنہ سیاہ و سفید کے مختار لوگ اتنا اندھیر کرنے میں ذرا متامل ہوتے! لیکن "ڈاؤننگ اسٹریٹ" (برطانوی دارالوزارت عظمیٰ) میں یہودیوں کو جو رسوخ حاصل ہے وہ اس اپیل کو اب بھی بیسود رکھے گا! متمدن دنیا کے "دارالعدل" میں جو استغاثہ کیا گیا ہے یقینًا وہ بھی صدا بصحرا ثابت ہوگا! بیشتر مغربی ممالک بظاہر اس

"کار نیک" کے سلسلے میں درحقیقت اپنے اپنے ہاں کی آبادی کے اُس عنصر سے گلو خلاصی کی فکروں میں ہیں۔ جو اُن کے لئے صدیوں سے ایک لعنت بن رہا ہے! پھر اس سے بڑھکر کیا بات ہوگی کہ برطانیہ تنہا "خونِ دو عالم" اپنی گردن پر لینے کو تیار ہے! تاہم "کشتوں کا یہ خون" مستقبل قریب میں بڑے ہولناک طریقے سے رنگ لائے گا۔ اور اُس وقت برطانوی حکومت کے موجودہ کارپردازوں کو معلوم ہوگا کہ وہ کونسی مہلک راہ پر گامزن تھے۔

"کیسی بوالعجبی ہے کہ یہ سلوک عربوں کو جنگِ عظیم کی اُن فتوحات کا انعام ہے جن کے حصول میں اصل فاتحکار آلِ عربوں کی "جان دا یان" کی وہ قربانیاں تھیں جو اس فریب خوردہ قوم نے اتحادیوں کو عموماً اور برطانیہ کو خصوصاً پیش کی تھیں!

"انگریزی وزارت جو پالیسی اختیار کئے ہوئے ہے وہ یقیناً بہت ہی اندوہناک ہے! بیت المقدس کے اک برطانوی افسر سے جب میں نے اس بارے میں مبادلۂ خیالات کیا تو اُس نے فی الفور کہا۔

"یہ نہ سمجھئے کہ فلسطین کے سات لاکھ عرب ستر ہزار یہودیوں کے مظالم و مفاسد کا غیر معین زمانے تک اپنے کو تختۂ مشق بنائے رکھیں گے! اُن کی یہ قومی مصیبت بلاشبہ ناقابلِ برداشت ہے اور جلد یا بدیر اُن کی تلوار سے اک قتلِ عام کا فوارۂ خونی بہ نکلے گا!" بدقسمتی یہ ہے کہ یہ آفت یہیں تک محدود نہ رہے گی، جواب میں یقیناً برطانوی جنگی بیڑہ حرکت میں آئے گا، اور برطانوی سنگینیں فلسطین کے تمام عربوں کو ذبح کر ڈالیں گی۔ ملحقہ ممالکِ عرب اور نیز اسلامی ہندوستان کے مطلع پر ان خونچکاں حوادث کا جو عکس پڑے گا اُس کو چشمِ تخیل بآسانی دیکھ سکتی ہے!

"برطانیہ میں جتنے لوگ "ماہرینِ مشرق" کہلانے کی اہلیت رکھتے ہیں اُن کا بیشتر حصہ اس روش کو سخت مخدوش کہتا ہے۔ لارڈ سڈنہم نے اُس تقریر لنچ کے دوران میں جو فلسطینی وفد کی آمد کے وقت اُنھوں نے کی تھی، کہا تھا۔

" لارڈ بالفور نے صیہونی یہودیوں کو اپنے مشہور اعلان میں جو گلدستہ پیش کیا ہے وہ اس جماعت کے لئے اک "ڈائنامیٹ کا گولہ" ثابت ہوگا، فلسطین کے خرمنِ امن میں اس حرکت سے جو شرارہ لگے گا وہ تمام مشرق میں اتنی وسیع آتشِ جدال و قتال مشتعل کرے گا کہ ہمارے سارے وسائل اسے سرد کرنے میں سوخت ہو جائیں گے!"

(۱۰۱۔ خ)

ضروری اطلاع

چونکہ قرول باغ سے دفتر تبدیل کر دیا گیا ہے

لہذا جملہ خط و کتابت پتہ ذیل سے کیجئے

دفترِ رسالہ کلیم، جنتی نواس نمبر ۴، دریا گنج، دہلی

نوٹ:۔ پتہ صاف اور خوشخط لکھا کیجئے، ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف۔

(مینیجر کلیم)

شاعرِ انقلاب حضرتِ جوش ملیح آبادی

کی

چار پُرانی تصانیف

حضرتِ جوش نے ایک مدت ہوئی چار چھوٹے چھوٹے رسائل طبع کرائے تھے، لیکن ان کی شاعرانہ بے نیازی نے اس کی اجازت نہ دی کہ انھیں شایع کرتے۔ اتفاق سے یہ چیزیں میری نظر سے گزریں تو مناسب معلوم ہوا کہ ان کی قیمت غیر معمولی طور پر کم کرکے انھیں شائقین کے ہاتھوں تک پہنچا دیا جائے۔

(۱) **جذباتِ فطرت** } حضرتِ جوش کی وہ معرکۂ آرا نظم ہے جس میں مظاہر قدرت کی طرف سے شعرائے اردو کی خدمت میں یہ اپیل کی گئی ہے کہ وہ پرانی روش کو ترک کر دیں قیمت ۳ر رعایتی ار

(۲) **اوراقِ سحر** } یہ حضرتِ جوش کے اُن لطیف چھوٹے چھوٹے جملوں کا مجموعہ ہے، جس میں سحر خیزی کے محاسن بہت لطیف پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت ۵ر رعایتی ۲ر

(۳) **آوازۂ حق** } یعنی معرکۂ تسلیم و رضا کے سب سے زبردست اور عدیم المثال ہیرو اور جنگ حق و باطل کے سب سے بڑے ساونت حسینؑ ابن علیؑ کے خونِ ناحق اور صبر و استقلال کا ایک عظیم الشان مرقع اور آپ کی اخلاقی اور روحانی تعلیم کا ایک نہایت درخشاں آئینہ قیمت ۸ر رعایتی ۳ر

(۴) **مقالاتِ زرّیں** } یہ حضرتِ جوش کے نادر کلمات فلسفیانہ اقوال اور ادبی لطائف کا دلچسپ اور کارآمد مجموعہ ہے۔ قیمت ۱۱ر رعایتی ۴ر

پورے سٹ کی رعایتی قیمت ۱۰ر محصول ڈاک ۲ر۔ وی۔پی منگانے کی زحمت نہ فرمائیں۔ بلکہ ڈاک کے ٹکٹ بھیج کر طلب کریں۔

ملنے کا پتہ:- **مینیجر کلیم بکڈپو، حینی نواس نمبر ۴ دریا گنج دہلی**

شاعر کی راتیں

شاعرِ انقلاب نے چند راتوں کی مختلف کیفیتوں کو اپنے خاص وجد آفرین اور کیف آور انداز میں بیان کیا ہے، جنھیں پڑھکر ہر شخص اپنے کو اسی ماحول میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ راتوں کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

مست رات	بدمست رات	راز و نیاز کی رات	انتظار کی رات
اندھیری رات	چاندنی رات	جوانی کی رات	تصورات کی رات
التفات کی رات	خدائی کی رات	اشکوں کی رات	برسات کی رات
ربودگی کی رات	بیخودی کی رات	سرشار رات	بھیگی ہوئی رات
تصورات کی رات	بچپن رات	پیاہن ناگن کالی رات	

قیمت صرف آٹھ آنے

پیغمبرِ اسلام

خواجۂ دو جہاں سرورِ کائنات آنحضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ولادت اور رسالت پر شاعرِ انقلاب حضرتِ جوش ملیح آبادی کا وہ غیر فانی شہ پارہ جس کی رفعت و عظمت کے سامنے قصرِ کفر سرنگوں ہوتا ہے۔ ثبوتِ پیغمبری کے باب میں اس لافانی شاہکار کے انوکھے استدلال دل میں تیر کی طرح اُترتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے ازلی الہامات سے دماغ میں یزدانی نور سرایت کر جاتا ہے۔ اس کے دلائل قاطع کے سامنے ادراک منطق چھاپنا بھول جاتا ہے۔ شاعرِ انقلاب پر جب ایک خاص سرشاریت کا عالم طاری ہوا، اُسی وقت اُنھوں نے یہ نظم کہنا شروع کر دی۔ عالم بیخودی میں چار روز کی ریاضتِ شاقہ اور یکسوئی قلب سے جو کچھ حاصل ہوا صرف وہی صفحۂ قرطاس پر تحریر کیا گیا۔ جب تک یہ نظم مکمل نہ ہوئی حضرتِ جوش نے کچھ کھایا نہ پیا۔ اور نہ خلوت سے باہر تشریف لائے۔ قیمت صرف آٹھ آنے

ملنے کا پتہ:- **مینیجر کلیم بکڈپو، حینی نواس نمبر ۴ دریا گنج دہلی**

انشائے لطیف

ادیب العصر حضرت لطیف الدین احمد اکبرآبادی کے افسانے

اردو ادب میں صاحب "لالہ رُخ" کا نام محتاجِ تعارف نہیں اور افسانہ نویسی کا جو معیار ل احمد نے پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ تنہا ایک مثال ہے، اُن کا افسانہ علم وحکمت، جذبات، واردات اور نفسیاتِ حسن وعشق کے نازک ترین اشارات کا حامل ہوتا ہے، ان کا طرزِ انشا شعریت اور تفلسف اردو ادب میں مستقل اضافات ہیں، ل احمد صاحب کے افسانے بلاشائبہ تغلیط ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں رکھے جاسکتے ہیں۔ انشائے لطیف ل احمد صاحب کے پندرہ شہ پاروں کا مجموعہ ہے، جو اکثر نگار اور دیگر مجلاتِ علمیہ وادبیہ میں طبع ہو کر مقبولیت و دوام حاصل کرچکے ہیں۔ اس لئے اگر آپ کو سلاست ولفاستِ زبان کے ساتھ نفسیاتِ شباب اور جذباتِ حسن وعشق کی صحیح نقاشی سے کوئی خاص لگاؤ ہے، اگر آپ ادب و شعریت کا ذوقِ سلیم رکھتے ہیں تو اس مجموعہ میں آپ کو اپنی طلب وتشنگی کے لئے مکمل سامانِ سیرابی نظر آئے گا۔ طباعت وکتابت روشن و بہترین ہونے کے ساتھ کراؤن سائز پر تقریباً ڈھائی سو صفحات کی ضخامت، نفیس جلد اور

قیمت صرف دو روپے (عـہ) علاوہ محصولڈاک

نغمات

نثر کی شاعری

ادبِ اردو میں جناب ل احمد کی تنہا وہ ہستی ہے جس نے حسن وعشق کی واردات اور نفسیات کو انتہائی مطالعۂ فکر کیساتھ اپنے ذاتی تاثرات وکیفیات کے ماتحت شعریت موسیقی یا موسیقیتِ شعر کی صورت میں صفحاتِ سادہ کو فردوسِ خیال بنا دیا ہے، اس مجموعہ میں جنابِ لطیف کے ساتھ مختصر ترین فسانے اور ادب پارے شامل ہیں، جنھیں نثر کی شاعری کے شہ پاروں کا ایک وجد آفریں کارنامہ کہا جاسکتا ہے، یہ کتاب بھی مکمل ترتیب وتہذیب کے بعد تیار ہوچکی ہے، اگر آپ اپنی زبان کی نزاکت ولطافت کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ضرور منگائیے۔ قیمت صرف ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

ملنے کا پتہ۔ **مینیجر کلیم بک ڈپو، جینتی نواس نمبر ۴ دریا گنج دہلی**

ساغر نظامی کا کلیاتِ نظم وغزل

بادۂ مشرق

وہ تاریخی کتاب جس کے دیباچے مشرقی ومغربی علوم کے ماہرین وسربرآوردہ انشا پردازوں نے تحریر فرمائے ہیں۔ حجم ۴۰۰ صفحات، کاغذ دبیز چکنا ۳۰ پونڈ سائز پیام مشرق۔ کتاب ۱۲ ابواب میں منقسم ہے۔ ہر باب کا سرورق رنگین ومصور ہے، غیر مجلد ٹائیٹل۔ اُبھری ہوئی رنگین ڈائیوں سے مرصع ہے، اور مجلد ٹائیٹل سنہری ڈائی سے مزین۔ جلد کا کور ست رنگا ہے۔

ساری کتاب ہندوستانی شاعری کے جدید پاکیزہ تخیل کی حقیقی تصویر ہے، زندگی اور جوانی، حبِ وطن اور آزادی کے وہ آتشین نغمات اس کتاب میں پائے جاتے ہیں، جنھوں نے قوم میں نئی زندگی پیدا کردی ہے، اس کے باوجود اس کی قیمت کتاب کے حسن وجمال اور ضخامت کے لحاظ سے بالکل حقیر ہے، یعنی

صرف پانچ روپے علاوہ محصول

سو شعر کا سٹ

جوش۔ جگر۔ اصغر۔ حسرت۔ میر۔ درد۔ غالب۔ مومن۔ داغ

کے

ایک ایک سو بہترین اشعار

ہر شخص کو ہر شاعر کا سب کلام پڑھنے اور اُس کی شاعری کے متعلق رائے قائم کرنے کا موقع نہیں ملتا ہے۔ اسی خیال سے یہ سلسلہ جاری کیا گیا ہے۔ ہر کتاب میں دورِ جدید یا دورِ قدیم کے ایک ممتاز شاعر کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام سے منتخب کرکے بہترین سو شعر دئے گئے ہیں۔ ساتھ ہی سوانح حالات اور کلام پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے۔ باوجود اختلافِ مذاق کے نصف سے زیادہ اشعار آپ کو اپنی پسند کے ملیں گے۔ جیبی سائز۔ کاغذ۔ کتابت۔ طباعت دیدہ زیب۔ سرورق خوشنما جس پر ہر شاعر کی تصویر بھی ہے۔ قیمت فی کتاب چار آنے علاوہ محصول

ملنے کا پتہ۔ **مینیجر کلیم بک ڈپو۔ جینتی نواس نمبر ۴ دریا گنج، دہلی**

معارفِ جمیل

حضرت حکیم آزاد انصاری کا پہلا مجموعۂ کلام

جو غزلوں، مسلسل غزلوں، نظموں، قطعوں، اور رُباعیوں پر مشتمل ہے!

وہ حضرات جو اُردو شاعری کے ہر دَور، اور ہر دَور کے طرزِ بیان کا گہرا مطالعہ کر چکے ہیں اس حقیقت پر متفق ہیں کہ حکیم آزاد اردو میں جس طرزِ بیان کے موجد و خاتم ہیں اُس کی نظیر ولی سے لے کر اس وقت تک کی اُردو شاعری میں کہیں نہیں مل سکتی۔

اگر آپ بالکل انوکھے طرزِ بیان کا مطالعہ فرمانا چاہتے ہیں تو آج ہی آرڈر دیجئے، اس مجموعے میں آپ کو تغزل، تفلسف، حسن و عشق، رندی و سرمستی، اور رنگینی و رعنائی ہر شعر کے اندر جھلکتی ملے گی، اور ہر رنگ اتنا گہرا ہوگا کہ آپ کے دل و دماغ پر ایک سُرور سا چھا جائے گا۔

کاغذ چکنا، طباعت و کتابت روشن۔ سائز کراؤن صفحات ۲۵۶

قیمت مجلد عہ غیر مجلد عہ

ملنے کا پتا

مینیجر کلیم بک ڈپو، جنیتی نواس نمبر ۱۲ دریا گنج، دہلی

بلاک برائے فروخت

دفتر کلیم میں وہ تمام بلاک جو اب تک ہر ماہ کلیم میں چھپ چکے ہیں، برائے فروخت موجود ہیں اور اگر کوئی صاحب کسی بلاک کو کرایہ پر لینا چاہیں تو بھی مل سکتے ہیں۔

جملہ خط و کتابت بنام مینیجر کلیم جنیتی نواس ۱۲ دریا گنج دہلی ہونی چاہیے۔

مشرقی عظمت کا عَلَم بردار

جاپان

مصنفہ:۔ چمن لال سیاح جاپان

مترجمہ:۔ محمود علی خاں (جامعی)

آج سے صرف اسی برس پہلے جاپان جس سے اب ایشیا کا نام روشن ہے وہ بالکل گمنامی میں پڑا تھا، لیکن اس مختصر مدت میں اُس نے وہ حیرت انگیز ترقی کی کہ اس کا شمار دنیا کی زبردست طاقتوں میں ہونے لگا، اس انقلاب کی داستان اس تصنیف میں ملاحظہ کیجئے جس کے متعلق ڈاکٹر سنڈرلینڈ (امریکہ) فرماتے ہیں کہ یہ کتاب جدید جاپان کے متعلق سب سے زیادہ پُر از معلومات کتاب ہے۔ صفحات ۲۵۰ بلاک کی ۳۰ تصاویر۔ مجلد عہ غیر مجلد عہ ۱۱ تصاویر عہ

کائنات

مصنفہ محمود علی خاں (جامعی)

اس کتاب میں علم ہیئت کے راز آسان سے آسان زبان اور سادہ سے سادہ اسلوب بیان میں بچوں کو ایسی مثالوں اور دلچسپ دلیلوں سے سمجھائے گئے ہیں کہ فوراً ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔ ہمارا کرۂ ارض کیا ہے، سورج و چاند ستارے کیا ہیں، ان کا ایک دوسرے سے کیا تعلق ہے۔ قیمت ۴ر

مینیجر کلیم بک ڈپو، جنیتی نواس ۱۲ دریا گنج دہلی

بنام قوت وحیات

کلیم

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجھکو صد حیف یہ حکم

آگے کئی صدیوں ہے فسانہ اپنا
بہروں کو سُنائے جا ترانہ اپنا

سالانہ چندہ چھ روپے
ششماہی چندہ تین روپے آٹھ آنے

منظور شدہ گورنمنٹ میسور وپٹیالہ
قیمت فی پرچہ نو آنے

جلد ۴ | فہرست مضامین ماہ ستمبر ۱۹۳۷ء | نمبر ۳

(جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر کلیم جینتی نواس ۵۰۸ دریا گنج دہلی سے شائع کیا)

اشارات

میرے ایک "اللہ والے" دوست

مجھے بھی یہ فخر حاصل ہے کہ میرے بھی ایک دوست ہیں "اللہ والے" جن سے مجھے محبت بھی ہے۔ اور ہمدردی بھی۔

یہ میرے دوست، یادش بخیر، ایک زمانے میں صاحبِ فکر، اور صاحبِ نظر نوجوان تھے۔ انھیں فلسفے کا بھی شوق تھا، اور ادبیات کا بھی۔ وہ ایک فطری انسان کی طرح ہشاش بشاش رہا کرتے، اور اربابِ علم وادب کی صحبتوں میں وقت کا کافی حصہ صرف کیا کرتے تھے،

اُن کے تحقیقی میلانات کے تیور ایسے خوش آیند تھے کہ ہندوستان کے ذہنی مستقبل کو اُن سے بڑی بڑی امیدیں پیدا ہو چلی تھیں —— کہ یکایک وہ "اللہ" کی محبت میں گرفتار ہو گئے۔

چنانچہ اب اُن کا یہ عالم ہے کہ وہ قرآنی تعلیم یعنی کارخانۂ عالم میں تدبر و تفکر کو کفر سمجھتے ہوئے "شبانہ روز" اوراد و وظائف" ہی میں مُبتلا نظر آتے ہیں۔

کثرتِ طاعت نے اُن کے جسم کو کاہیدہ، چہرے کو خشک و تُرش، اور معدے کو برباد کر دیا ہے —— اور ترکِ لذّات کی لَے اِس قدر بڑھ چکی ہے کہ وہ "اللہ" کی بخشی ہوئی "حلال اور طیب" نعمتوں تک سے گریز کرتے ہیں، اور "کلوا واشربوا" سے سرتابی کا ذوق یہاں تک پرورش پا چکا کہ اگر شوربہ لذیذ ہوتا ہے تو اس کی لذّت کو مجروح کرنے کی خاطر وہ اُس میں پانی ملا دیتے ہیں۔

"اللہ" کی محبّت بھی کتنی کمزور شَے ہے کہ اِدھر لذیذ شوربے کا ایک لُقمہ معدے میں گیا، اُدھر "اللہ" کی محبت دل سے نکل گئی۔

کیا "اللہ" کی محبت، کیلے کی جڑ سے بھی زیادہ کمزور، اور ہندوستانی ریاستوں کی نوکری سے بھی بڑھ کر نااستوار واقع ہوئی ہے؟

مسلمانوں کے سامنے سب سے بڑا نمونہ پیغمبرِ اسلام کی ذاتِ مبارک ہے۔

کیا رسولِ اکرم نے کثرتِ طاعات، اور ترکِ لذات کا ارتکاب کر کے اپنے جسم کو لاغر، چہرے کو خشک و خوفناک اور اپنے جسمِ مبارک کے جوڑوں کو بہ آسانی کھلنے سے محروم فرما دیا تھا؟ اور کیا رسولِ اکرم بھنے ہوئے گوشت میں مٹی، اور کھجوروں میں مٹی کا تیل ملا لیا کرتے تھے؟

اس کے علاوہ اِسلام ایک عسکری مذہب ہے۔ کیا عسکری مذہب کے کسی پیرو کو اِس کا لائسنس دیا جا سکتا ہے کہ وہ کثرتِ طاعت، اور ترکِ لذّت کی غیر شرعی بے اعتدالی میں مُبتلا ہو کر ایسا کمزور ہو جائے کہ اسلام کی بہترین عبادت یعنی جہاد کے وقت چار آدمی اُسے گھوڑے پر بٹھائیں، اور ایک آدمی اُس کی ڈبلی کلامی پکڑے رہے، تاکہ وہ تلوار کے وزن سے مُڑ کر نہ رہ جائے؟

کاش اِن حلقوں کی مرطوب ہوا میں سانس لینے والے بیماروں کو

مُدیر

کوئی یہ بات سمجھا سکتا کہ علیل آدمی کی رُوح بھی علیل ہوتی ہے، اور کوئی علیل رُوح، اتنی طاقتور نہیں ہوسکتی کہ معرفت کے منازل کو بہ احسن الوجوہ طے کرسکے۔

تندرستی، سب سے بڑا ایمان، اور بیماری سب سے بڑا کفر ہے ——— اسلام، طاقت چاہتا ہے، اور شمس و قمر کو مسخر کرلینے کی طاقت چاہتا ہے، اور شمس و قمر کو مسخر کرلینے کی طاقت چاہتا ہے، اس لئے اُس کے دائرے میں طاقت بہترین دین ہے، اور ناطاقتی بدترین بے دینی۔

اسی کے ساتھ یہ بات بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ جو شخص اپنے کو درست نہیں رکھ سکتا، وہ دوسروں کو کیا خاک درست رکھ سکے گا۔ اور جو نہ اپنے ہی کام آسکتا ہے، نہ دوسروں ہی کے، سوسائٹی کو ایسے شخص کی قطعاً ضرورت نہیں۔

مذہب کا کام بھی سوسائٹی ہی کو درست حالت میں رکھنا ہے، جو شخص سوسائٹی کے کام کا نہیں، مذہب کی نگاہ میں بھی ناکارہ ہے۔

میرے "اللہ والے" دوست ایک زمانۂ دراز سے سوسائٹی کو فراموش کرچکے ہیں، اور اُنھیں اس سے بھی کوئی سروکار نہیں رہا ہے کہ اِن کا وطن، اور اُن کے ابنائے وطن زندہ بھی ہیں، کہ مرگئے ——— اب تو وہ ہیں، اور عوُد سے مہکتا ہوا حُجرہ، اور رُوحانی عیاشیاں۔

ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے کہ میں نے اُن سے میاں نظیر اکبرآبادی پر مضمون لکھنے کی فرمائش کی تھی ——— آپ کو معلوم ہے اُنھوں نے کیا جواب دیا؟ سُنئے:۔

وہ تحریر فرماتے ہیں کہ جو شخص "کلامِ بے نظیر" میں محو ہو، وہ، وہ کسی "نظیر" پر کیا لکھے۔

آپ اس عارفانہ تبختر آمیز جواب کا مفہوم سمجھے؟ آیئے میں سمجھاؤں، میں اپنے دوست اور اس قبیل کے تمام عارفانِ عالی مقام کی ذہنیت کو خوب سمجھتا ہوں۔

میرے "مولیٰنا" دوست نے بہ الفاظِ دیگر یہ جواب دیا ہے کہ جو لوگ "اللہ والے" ہوجاتے ہیں، وہ "اللہ" کے بندوں کو اس قدر حقیر، اور ناقابلِ التفات سمجھنے لگتے ہیں کہ اُن کی طرف دیکھنا بھی اُنھیں اہانت آمیز معلوم ہوتا ہے۔

بات یہ بات یاد آتی ہے تحصیل پلیج آباد میں ایک ٹھاکر صاحب دفعہ ایک سو دس کے بدمعاش تھے، لیکن جنگِ عظیم کے موقع پر اپنے "خدماتِ جلیلہ" کے باعث آنریری مجسٹریٹ بنا دیئے گئے تھے۔ آنریری مجسٹریٹ بنا دئے گئے تھے، آنریری مجسٹریٹ بننے کے بعد اُنھوں نے اپنی برادری والوں تک سے گفتگو کرنا ترک کردیا۔ اور جب اُن کے اقربار نے اعتراض کیا تو وہ بگڑ کر بولے کہ ہم جس مُنھ سے صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر سے باتیں کرتے ہیں، اُسی مُنھ سے تم سے کیونکر باتیں کریں۔

میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا میرے "کلامِ بے نظیر کے دلدادہ" دوست "کسی نظیر" کی جانب اسی مندرجۂ بالا دلیل کی بنار پر متوجہ ہونا پسند نہیں فرماتے؟

یہاں یہ سُوال بھی اُٹھایا جاسکتا ہے کہ جو شخص "اللہ" سے رشتہ جوڑ لیتا ہے، کیا اُس کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ "اللہ" کے بندوں سے تمام تعلقات منقطع کرے؟

اگر ایسا ہے تو پھر نبوت و رسالت کے باب میں کیا رائے قائم کی جائے؟ کیونکہ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ نبوّت و رسالت "اللہ" کے بندوں سے اس قدر شدّت کے ساتھ وابستہ رہتی ہے کہ اُس کا ہر قول، ہر فعل، یہاں تک کہ اُس کے تمام تصورات تک اُنھیں سے وابستہ، اور اُنھیں کے واسطے وقف رہا کرتے ہیں۔

اِس کے علاوہ قاعدہ ہے کہ انسان جس سے محبّت کرتا ہے، اُس کی گلی کے کتوں تک سے اُسے محبت ہوتی ہے۔ لیکن یہ "اللہ" کے چاہنے والے دُنیا سے نرالے ہیں کہ "اللہ" کو تو چاہتے ہیں، اور "عیال اللہ" کے نام تک سے اُنھیں وحشت ہوتی ہے۔

ابراہیم ادھمؒ کے متعلق مشہور ہے کہ اُنھوں نے ایک روز فرشتوں کو خواب میں دیکھا، جو ایک زرّیں رجسٹر لئے ہوئے تھے ——— ابراہیم نے پوچھا یہ رجسٹر کیسا ہے۔ فرشتوں نے جواب دیا عاشقانِ الہٰی کا۔ ابراہیم نے کہا اس میں میرا بھی نام ہے؟ ——— فرشتوں نے کہا "نہیں" ——— ابراہیم نے کہا اچھا تو پھر بندوں کے دوستوں کے رجسٹر میں میرا نام درج کرلو ——— دوسرے دن فرشتے پھر آئے، اور ابراہیم یہ دیکھکر خوشی سے اُچھل پڑے کہ عاشقانِ الہٰی کے رجسٹر میں اُنکا نام زرّیں حروف میں سب سے اُوپر لکھا ہوا ہے ———

یہ ہے "اللہ" کے بندوں سے محبت کرنے والوں کا مقام!

میرے "اللہ" والے دوست! اب بھی سویرا ہے، للّٰلہ خدمتِ خلق کو اپنا شعار بنایئے کہ یہی بہترین عبادت ہے، اور "اللہ" کے درماندہ بندوں کی دستگیری فرمایئے کہ یہی اعلیٰ ترین بندگی ہے۔

جو شخص زمین، اور اہلِ زمین سے رشتۂ اخوّت و محبت منقطع کرلیتا ہے، "عرش و کرسی" والے اُس سے مُنہ پھیر لیتے ہیں۔ اور جو "اللہ" کے بندوں کے دُکھ درد میں شریک نہیں ہوتا، "وحدہٗ لاشریک اللہ" اُس کی عبادت کو قبول نہیں فرماتا۔۔۔۔

یہ یاد رکھئے، بلکہ گرہ میں باندھ لیجئے کہ اگر "حشر و نشر" کوئی شئے ہے تو آپ کا یہ "رندِ قدح خوار" "مالکِ یوم الدین" سے سرِ حشر اپنے اس قول کی تصدیق کرا دوں گا کہ خدمتِ خلق، کائنات کا سب سے بڑا دین ہے، اور خدمتِ خلق سے رُو گردانی کرکے ایک کاہل انسان کی طرح "اوراد و وظائف" کے مزے لُوٹتے رہنا، دنیا کی سب سے بڑی عیاشانہ خودکامی اور دنیا کا سب سے بڑا شیطانی مسخراپن ہے۔

عبادت بجز خدمتِ خلق نیست!

ایک دوستانہ خط

غلام احمد صاحب پرویز نے حضرت اسلم جیراجپوری کے ہات موسم گرما میں ایک خط بھیجا تھا، جس کا خلاصہ ہجومِ مشاغل کے باعث اب شائع کر رہا ہوں۔ علیحدہ جواب دینے میں طوالت ہوتی اور وقت بھی صَرف ہوتا، اِس لئے خط کے اندر ہی جواب کے طور پر چند سطریں جابجا لکھدی گئی ہیں۔

پرویز صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ:-

"کلیم" بابت مارچ ۳۶ء کے اشارات میں آپ نے قوم کے مُنکرین کو دعوت دی ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ انسانوں کو یہ سبق دیں کہ نیکی۔ نیکی کی خاطر کرنی چاہیے۔ "اُمّارجزا" کی ترغیب اور "عُقوبات و سزا" کی تخویف، نیکی کرنے اور بُرائیوں سے مجتنب رہنے کی مُحرّک نہ ہونی چاہیے۔ یعنی مذہب کے خلاف سب سے بڑا اعتراض یہ عاید ہوتا ہے کہ اس میں نیکی کرنے اور بدی سے روکنے کے لئے جنت کے لالچ، اور جہنم کے خوف کو کام میں لایا گیا ہے۔ حالانکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ جب سے "کلیم" جاری ہوا ہے، آپ اُس میں مُسلسل اپنی قوم کے لوگوں کو متنبہ کرتے چلے آ رہے ہیں، کہ۔۔۔۔۔۔۔ اگر تم نے یہ نہ کیا، وہ نہ کیا، تو فطرت تمہیں۔۔۔۔۔ ذلت کے گڑھے میں گرا دے گی۔ کیا آپ کا مسلسل وعظ یہی نہیں کہ آپ لوگوں کو عزت و وقار کا لالچ دے کر اُنھیں نیک اعمال کرنے پر آمادہ کرتے ہیں؟

فرمایئے آپ یہی کہیں تو وہ عین علم و بصیرت ہو، لیکن مذہب یہی کہے تو وہ یکسر دقیانوسیت و کور بینی ہو۔

بسوخت عقل ز حیرت۔۔۔۔۔۔۔۔"

جواب

پہلا جواب تو یہ ہے کہ آپ کا سوال محض اعتراضی جواب ہے، اور اعتراضی جواب کے متعلق دُنیا جانتی ہے کہ وہ کس قدر کمزور ہوا کرتا ہے۔

جب کسی کا اعتراض اُٹھائے نہیں اُٹھتا تو پھر یہ ترکیب کی جاتی ہے کہ خود معترض کی روِش پر اعتراضات وارد کئے جانے لگتے ہیں، اور یہ کہا جاتا ہے کہ تو فلاں بات کس مُنہ سے کہے گا، تو بھی تو فلاں فلاں باتیں کرتا ہے۔۔۔ اور اس ترکیب سے یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ معترض اپنے عیوب پر مطلع ہو کر اعتراض ترک کر دے گا، یا یوں کہئے کہ جب یہ امر واضح ہوجائے گا کہ معترض بھی وُہی فعل کرتا ہے جس پر اُسے اعتراض ہے، تو وہ فعل قدرتی طور سے صحیح ثابت ہوجائے گا۔۔۔۔۔۔ فرض کیجئے زَید، بکر پر یہ الزام لگاتا ہے کہ تو ریاکار ہے، اور بکر اپنی صفائی پیش کرنے کے عوض زید سے بگڑ کر یہ کہتا ہے کہ تو خود بھی تو ریاکار نہیں ہے؟ ۔۔۔۔۔۔ اور کیا ضمنی طور پر اس سے یہ بھی مترشح نہیں ہوتا کہ جب زید کا سا بڑا آدمی بھی ریاکار ہے، تو زید کا سا مردِ حقیر اگر ریاکار ہے تو اُس میں مضائقہ ہی کیا ہے؟

اب دوسرا جواب ملاحظہ ہو۔۔۔۔۔

انسان کو نیکی کی طرف مائل، اور بدی سے نافر کرنے کی صرف دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں۔

(۱) یا تو اُس سے کوئی حاکمِ اعلیٰ یہ کہے کہ اگر تو نیکی کرے گا تو میں تجھے پچاس روپے دوں گا، اور اگر بدی کرے گا تو سو کوڑے ماروں گا۔

(۲) یا دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی اُسی کا بھائی اُس سے یہ کہے کہ اگر تو نیکی کرے گا تو خود نیکی کے اندر یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ تجھے سربلند کردیگی، اور اگر بدی کرے گا تو خود بدی کے اندر یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ تجھے ذلیل کردے گی۔

اِن دو صورتوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں نیکی بدی کی ماہیت اور اُس کے تمام تصوّرات سے بیگانہ محض رہتے ہوئے، انسان، ترغیب کی خاطر نیکی کرتا اور تخویف کے باعث بدی سے مجتنب رہتا ہے، یعنی یا تو وہ نیک بنتا ہے، اس لالچ میں کہ اُسے اچھی مزدوری ملے گی، یا بدی سے بھاگتا ہے، اِس بزدلی کے باعث کہ اُسے مارا جائے گا۔

اور جس وقت ترغیب و تخویف کا سحر کسی صورت سے باطل ہوجاتا ہے، تو پھر انسان نیکی و بدی کے تمام قوانین سے آزاد ہو کر بہائم کی سی زندگی بسر کرنے لگتا ہے جس کے بیشمار شواہد ان لوگوں کی زندگیوں میں پائے جاتے ہیں، جن کے قلوب پر مذہبی گرفت ڈھیلی پڑ چکی ہے۔

لیکن دوسری صورت میں یہ خطرناک حالت پیدا نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اِس صورت میں نیکی بدی کی ماہیت اور اُس کے قدرتی نتائج کی واقفیت کی بنا پر انسانی نفس میں ایک ایسا قومی اخلاقی شعور پیدا ہوجاتا ہے کہ وہ نیکی بدی کو ایک کاروباری، اور تاجرانہ متاع کے طور پر نہیں، بلکہ اپنی اور اپنی نوع کی فلاح و بہبود کا آلہ سمجھ کر اختیار کرتا ہے —— اور یہ اخلاقی شعور اُس کے نفس میں اِس قدر محکم و استوار ہوجاتا ہے کہ مذہب کی تبدیلی، یا سرے سے لامذہبی بھی اُس کی بُنیاد کو ہلا نہیں سکتی۔

یہ صحیح ہے کہ انسان ایک خود غرض و خودکام حیوان ہے، اور اُس وقت تک کسی فعل کے ترک و اختیار کا ارادہ نہیں کرتا، جب تک وہ یہ نہیں سمجھ لیتا کہ فلاں فعل کے ترک و اختیار سے میرے یا میرے خاندان کو یہ یہ فوائد حاصل ہوں گے۔

لیکن نیکی بدی کی تعلیم کی، جیسا کہ اوپر عرض کیا جاچکا ہے، صرف دو ہی صورتیں ہیں —— پہلی صورت تو وہی سیدھی سادی صورت ہے کہ کسی "قوتِ اعلیٰ" کا تصوّر پیدا کرکے انسان کو سزا و جزا کے چکر میں ڈال دیا جائے۔

لیکن اِس صورت میں، جیسا کہ بیان ہوچکا ہے یہ بڑا خطرہ ہے کہ جیسے ہی "قوتِ اعلیٰ" کا تصوّر کمزور پڑ جائے گا اُسی وقت آزاد منش و سرکش انسان نیکی بدی کے دہانوں کو توڑ کر چوکڑیاں بھرنے لگے گا۔ اور دُنیا اخلاقی قوانین سے یکسر آزاد ہو کر رہ جائے گی۔

لیکن دوسری صورت میں اِس کا مطلق اندیشہ نہیں ہے۔ کیونکہ اِس دوسری صورت میں مُزد و جزا، اور عقوبت و سزا کا تعلق کسی "قوتِ اعلیٰ" سے نہیں، بلکہ خود نیکی بدی کی حقیقت و ماہیت اور اُس کے قدرتی نتائج سے ہوتا ہے، اور ظاہر ہے کہ انسان جب کسی شے کی حقیقت سے واقف ہوجاتا ہے تو پھر اُس سے منحرف ہونے کا امکان ہی باقی نہیں رہتا۔

فرض کیجیے کوئی باپ اپنے بچے سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ اگر تم روز صبح کو ایک فرلانگ دوڑا کرو گے تو میں تمھیں دو لڈو دیا کروں گا ——

چنانچہ بچہ روز دوڑتا اور روز دو لڈو حاصل کرلیتا ہے —— ہرچند بچے کی صحت کو باپ کے دو لڈوؤں کے باعث، روزانہ دوڑنے سے وہی فائدہ پہونچتا ہے جو ورزش سے پہونچنا چاہیئے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ بچہ صرف لڈوؤں کی خاطر دوڑتا ہے، اور اِس حقیقت سے قطعی واقف نہیں ہوتا کہ خود دوڑنا ایک اعلیٰ درجے کی ورزش ہے، اور ہر ورزش سے انسانی صحت کو کثیر فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اور بچے کے اس جہل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب امتدادِ زمانہ کے باعث اُس کے دل میں لڈوؤں کا شوق، یا باپ کی اطاعت کا خیال باقی نہیں رہتا، تو وہ دوڑنے کی مشق ترک کرکے اپنی صحت کو خود اپنے ہی ہاتھوں بگاڑ لیتا ہے۔

اب اِس کے بعد میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کیا پرویز صاحب میرے کلیم کے اشارات میں سے، جنھیں وہ "وعظ" کا خطاب دیتے ہیں، ایک کلمہ بھی ایسا نکال کر دکھا سکیں گے جس میں میں نے اپنی قوم سے یہ وعدہ کیا ہو کہ اگر وہ خودداری، جفاکشی، خودشناسی، اور آزادی کے میدان میں سعی کریں گے تو میں اُنھیں یہ یہ انعام دیا کروں گا۔ ہر سال ملیح آباد کے اِتنے آم، اور لکھنؤ کے اِس قدر خربزے عطا فرماؤں گا، اور اگر اُنھوں نے میری یہ بات نہ مانی تو میں اپنے تمام ملیح آبادی پٹھان بھائیوں کو جمع کرکے اُنھیں پٹواؤں گا؟

اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً ایسا نہیں ہے تو پھر آپ کے اِس اعتراض میں کیا وزن رہ جاتا ہے کہ میں بھی وہی کہتا ہوں جو مذاہب تعلیم دیتے ہیں،

نیکی کو نیکی کی خاطر کے سلسلے میں ایک چھوٹی سی پیش پا اُفتادہ بات اور عرض طلب ہے،

فرض کیجئے ایک شخص اپنی محرمات پر اس لئے ہاتھ نہیں ڈالتا کہ اُس کے بچوں کی صحت اور اُس کے اخلاقی شعور کے حق میں اُس کے نزدیک یہ فعل نہایت مضر ثابت ہو گا۔ اور دوسرا شخص اپنی محرمات پر صرف اس لئے ہاتھ نہیں ڈالتا کہ دیکھ لیا گیا تو اُسے زدوکوب کیا جائے گا۔

اِن دونوں شخصوں میں کیا فرق ہے؟ کیا اول الذکر شخص ایسا معتبر نہیں ہے کہ محرمات کی عصمت کے باب میں اُس پر کامل بھروسا کیا جائے، اور کیا ثانی الذکر اس قدر خطرناک نہیں ہے کہ موقعہ پاتے ہی محرمات پر ہاتھ ڈال دینے میں باک نہیں کر سکتا ہے۔ دونوں میں بہتر کون ہے۔ پرویز صاحب ہی فیصلہ کریں۔

آگے چل کر پرویز صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ "کیا آپ نے کبھی ایسا کیا ہے کہ بداعمالیوں کے فطری عواقب کو سامنے لائے بغیر، اُن بُرائیوں سے اجتناب کی تلقین کی ہو۔ یا نیک اعمال کے لازمی نتائج کو اُجاگر کئے بغیر، نیک اعمال کرنے کی ترغیب دی ہو"؟

جواب

پرویز صاحب، یہاں تو آپ میری پوری پوری حمایت فرما رہے ہیں، یعنی آپ خود بھی اِس کے مُقر ہیں کہ میں نے "بداعمالیوں کے فطری عواقب" اور "نیک اعمال کے لازمی نتائج" کو پیش نظر رکھ کر اپنی قوم کو تعلیم دی ہے، کیونکہ یہی ایک حکیمانہ اور فطری طریقۂ تعلیم ہے ـــــ میں نے اس کے عوض اپنی قوم کو نیکی بدی کے "لازمی نتائج" اور "فطری عواقب" سے بے خبر رکھتے ہوئے یہ کہہ کر نیکی کی طرف کبھی نہیں بلایا کہ میں یہ جزا دوں گا، اور بدی سے یہ کہہ کر باز نہیں رکھا کہ میں یہ سزا دوں گا۔

پرویز صاحب پھر تحریر فرماتے ہیں!

"البتہ مذہب کا یہ تصور ضرور ہے کہ وہ انسانی زندگی کو عناصر کے اُسی ظہور ترتیب تک ہی محدود نہیں رکھتا بلکہ وہ کہتا ہے کہ انسان کی موجودہ ہیئت وحیات اِس کائنات کے سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی نہیں، بلکہ اُسے اور بھی منازل طے کرنے ہیں۔ اس لئے مکافاتِ عمل کا قانون صرف اِسی زندگی تک ہی محدود نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

جواب

مذہب اور مذہب کا فرمودہ سر آنکھوں پر، ہم سب کے آبا و اجداد، اور ہم سب کی کتابیں یہی کہتی چلی آئی ہیں، لیکن اگر کوئی بدبخت دلائل و براہین کی روشنی میں ان اُمور کی تصدیق کرنا چاہتا ہے تو آپ اُسے مذہب کُش کا لقب کیوں دیتے ہیں۔

طبائع مختلف ہوتے ہیں کوئی کسی بات کو محض اس بنا پر تسلیم کر لیتا ہے کہ ہمارے خاندان کی فلاں محترمہ نے اِس کی تصدیق کی تھی، اور کوئی کسی بات کو اِس بنا پر تسلیم کرتا ہے کہ فلاں مولوی صاحب نے ایسا فرمایا ہے، یا فلاں "نورنامے" یا فلاں "راہِ نجات" میں ایسا لکھا ہوا ہے، آپ ان میں سے کسی کو بُرا نہیں ٹھہراتے، لیکن اگر کسی کمبخت کے دماغ کی ساخت اِس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ وہ کسی بات کو اُس وقت تک تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ تفکر و تدبر اور دلائل و براہین کی رُو سے وہ بات اُس پر واضح نہیں ہو جاتی، تو آپ اُسے دشمن خدا و رسول کہہ کر کیوں مطعون فرماتے ہیں؟

آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کی سمجھ میں یہ بات آ چکی ہے کہ "عناصر کیا ہیں، اُن کی ماہیت اور تعداد کیا ہے" "انسان کی موجودہ ہیئت وحیات اِس کائنات کے سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی نہیں" اور یہ کہ "مکافاتِ عمل کا قانون صرف اِسی زندگی ہی تک محدود نہیں۔۔۔۔۔"

میں بدبخت ہوں کہ "عناصر" "کائنات" "دیگر منازل" اور "مکافاتِ عمل" کی حقیقت، اور اُن کی ترتیب کا مجھے اب تک پتا نہیں چلا ہے۔

آپ مجھے سمجھانے کی سعی فرمائیں، نہ سمجھوں تو میرے حق میں دُعا کریں، لیکن ہرگز مناسب نہیں کہ آپ مجھ سے خفا ہو جائیں۔ اور مجھے ہادم ادیان کے نام سے پکارنے لگیں۔

آپ جواں بخت ہیں کہ منزل تک پہونچ چکے ہیں، میں بدقسمت ہوں کہ ہنوز راہوں میں بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ لیکن اسے کبھی نہ بھولئے کہ مجھے بھی اُس منزل کی تلاش ہے جو آپ کو ہر شے سے زیادہ محبوب ہے۔

پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ

"نیکی نیکی کی خاطر۔ آرٹ، آرٹ کی خاطر ـــــ اور اس قسم کے چند ایک اور مجھلے محض نظری کھلونے ہیں ـ

"منکرین کے استادانِ ازل یعنی حکمائے مغرب، مشرق کی طرف اس قسم کے نظری کھلونے لڑھکاتے رہتے ہیں کہ بچے ان سے جی بہلاتے رہیں۔"

جواب

یہ بحث بہت طویل ہے، جس کی اشارات میں گنجائش نہیں نکل سکتی، بہر حال دُنیا میں دو گروہ دوش بدوش پائے جاتے ہیں، ایک گروہ نیکی کو نیکی کی خاطر ـــــ اور آرٹ کو آرٹ کی خاطر، کا نظریہ رکھتا ہے، اور دوسرا گروہ نیکی کو کام کی خاطر، اور آرٹ کو فائدے کی خاطر، کا قائل ہے،

آپ نے اپنے مکتوبِ گرامی میں صرف اپنا عقیدہ بیان فرما دیا ہے، اور بس ـــــ اپنے قول کے ثبوت میں دلائل نہیں پیش کئے ہیں ـــــ اس لئے جواب اس قدر ہو سکتا ہے کہ صاحب آپ کو آپ کا اعتقاد مبارک ہو۔

ہاں اتنا اور اضافہ کر دینا چاہتا ہوں کہ نیکی کو نیکی کی خاطر نہیں بلکہ سزا و جزا کی خاطر اختیار کرنا نفسِ انسان کی انتہائی توہین کے سوا اور کچھ ہو نہیں سکتا۔

پرویز صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ

"البتہ اگر نیکی۔ نیکی کی خاطر سے یہ مراد ہو کہ نیکی کر، دریا میں ڈال، یعنی نیک اعمال کی وجہ سے کبھی دل میں غرور و تکبر، نعرت و نخوت نہ پیدا ہو، لوگوں پر اپنے زہد و تقدس کا احسان نہ جتاتا پھرے، تو یہ چیز بھی مذہب ہی نے سب سے پہلے پیش کی ہے۔"

جواب

آپ کا یہ پارا میرے موضوع سے کسی حد تک خارج ہے، اس لئے اس پر زیادہ خامہ فرسائی کو ضروری نہیں سمجھتا،

البتہ صرف اس قدر عرض کروں گا کہ مذاہب نے تو سرے ہی سے نیکی کو نیکی کی خاطر کا سبق ہی نہیں دیا ہے، بلکہ جنت، دوزخ، اور خوشنودیٔ خدا کی خاطر نیکی کی تلقین فرمائی گئی ہے ـــــ یعنی جو شخص جس قدر زیادہ نیکی کرے گا اُسی قدر خُدا اُس سے خوش ہوگا۔ اور اُسی مقدار سے وہ قُربِ خدا حاصل کرتا جائے گا ـــــ چنانچہ جو لوگ اپنے خیال میں کثرت سے نیکیاں کرتے رہتے ہیں، اُن کے دل میں اس خیال کا آنا بالکل ایک قدرتی چیز ہے کہ خدا اُن سے خوش ہے اور وہ قربِ خُدا حاصل کر رہے یا کر چکے ہیں ـــ اور یہ خوشنودیٔ و قُربِ خدا کا خیال، ظلوم و جہول، اور ضعیف البُنیان انسان کی کمزور فطرت کے حق میں ایک ایسی تُند شراب ہے جو غرور و نخوت کا نشّہ پیدا کئے بغیر رہ نہیں سکتی۔

قُربِ خدا تو بڑی چیز ہے ـــ جن لوگوں کو اس دُنیا میں قُربِ سلطانی حاصل ہو جاتا ہے اُن میں سے کتنے ہیں جن کے ہوش و حواس درست رہتے ہیں؟

اس لئے نیکی کو کسی قوتِ اعلیٰ کے تقرّب کا ذریعہ بنانا انسانی سیرت کے حق میں نہایت ہی مُضر چیز ہے۔

پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ

"معاف فرمایئے اگر میں اتنا عرض کرنے کی بھی جرأت کروں کہ مذہب کی بوسیدہ عمارت کی تخریب کے لئے جو حضرات اس قدر بلند آہنگ دعاوی کے ساتھ اُٹھتے ہیں، اُنھوں نے از خود مذہب کا مطالعہ بہت کم کیا ہوتا ہے ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ؟

جواب

آپ کے حسبِ مُراد جو زبان کھولے وہ عالم، حسبِ مراد جو کلام نہ کرے وہ عامی ـــــ

یہ آپ کا حُسنِ ظن ہے ـــ میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔

پرویز صاحب فرماتے ہیں کہ

"اگر آپ کو (معاف بفرمائید) مذہب کے نام سے ایسی ہی چڑھ نہ

پیدا ہو چکی ہو؟"

جواب

حاشا کہ مجھے مذہب کے نام سے کوئی "چڑھ" نہیں پیدا ہو چکی ہے۔

مذہب کوئی انسان نہیں، جس نے مجھے کبھی دُکھ پہونچایا ہو، نہ حیوان ہے جس نے کبھی مجھے سینگ مارا ہو ـــــ مذہب تو عقائد و احکام کے ایک مجموعے کا نام ہے۔ اِس سے "چڑھ" کیونکر پیدا ہو سکتی ہے؟

اگر تحقیقات کے بعد یہ ثابت ہو جائے گا کہ مذہب نے ہمیشہ انسان کا خُون بہانے کے عوض اُس کی خدمت کی ہے تو میں وہ پہلا شخص ہونگا جو مذہب کو سب سے پہلے بڑھکر گلے لگائے گا۔

آپ مطمئن رہیں جو دل اپنے "دشمنوں" تک سے محبت کرتا ہے وہ ایک نظر ہے، یعنی مذہب سے کیونکر عداوت رکھ سکتا ہے۔

سب سے آخر میں پرویز صاحب فرماتے ہیں

آپ ایک اچھے شاعر ہی ہو سکتے ہیں، زیادہ سے زیادہ ایک ادیب، لیکن ہمارے ہاں یہ مصیبت ہے کہ جونہی کوئی شخص کسی ادبی رسالے کا ایڈیٹر ہوا لوگ اُسے ہر قسم کا لیڈر بننے پر مجبور کر دیتے ہیں .... نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا اصلی راستہ کھو بیٹھتا ہے .... یہی غلطی نیاز فتحپوری نے کی اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آپ بھی اس پر مجبور کئے جا رہے ہیں، اور وہ دن افسوسناک ہوگا جب یہ سُننے میں آئے گا کہ ایک اچھا شاعر مُفت میں چھن گیا۔"

جواب

میں آپ کے لہجے کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے اپنے مفہوم کو نہایت شائستہ پیرائے میں بیان فرمایا ہے ـــــ لیکن اِس کا یقین فرمائیے، بلکہ میں قوت و حیات کی قسم کھا کر عرض کرتا ہوں کہ مجھے نہ تو یہ شوق ہے کہ میں لیڈر تسلیم کیا جاؤں نہ میری یہ تمنّا ہے کہ میری سوسائٹی مجھے ہمہ داں سمجھ لے۔

میں اِن دونوں باتوں کو نہایت ہی پست و حقیر سمجھتا ہوں۔

میں آپ کو کیوں کر اپنا دل کھول کر دکھاؤں کہ اسرارِ کائنات کی جستجو نے میرا کیا حال کر رکھا ہے اور یہ اسرارِ کائنات کی جستجو کا شوق ہی نہیں، بلکہ جنون ہے جو میرے قلم سے ایسی باتیں لکھواتا، اور میری زبان سے ایسے کلمات نکلواتا ہے جو میرے بعض احباب کے دلوں میں یہ شُبہ پیدا کر دیتے ہیں کہ میں مذاہب کا مخالف یا خُدا کا منکر ہوں، یا مجھے ایڈیٹری کے ساتھ ساتھ یہ شوق بھی چرّایا ہے کہ میرے اہلِ مُلک مجھے لیڈر یا ہمہ داں بھی سمجھ لیں۔

اسی کے ساتھ آپ اس کا اندیشہ بھی ہرگز نہ کریں کہ میں ایک دن شاعر کی حیثیت سے مفقود ہو جاؤں گا۔

پرویز صاحب اوّلاً تو ابھی یہ فیصلہ بہت قبل از وقت ہے کہ میں درحقیقت شاعر بھی ہوں کہ نہیں، یہ فیصلہ تو آئندہ زمانہ ہی کر سکے گا ـــــ اور اگر میں یہ خیال ابھی سے قائم کر لوں کہ آپ کے حسبِ قول میں شاعر ہوں تو اِس کا یقین رکھئے کہ کوئی شاعر مفقود نہیں ہو سکتا، اور یہ بھی سمجھ لیجئے کہ اسرارِ کائنات کی جستجو اور تفکر و تدبّر ایسی چیزیں نہیں ہیں جنھیں شاعرانہ مذاق یا شاعرانہ تخیلات کے منافی و مخالف سمجھا جائے۔

اگر کوئی شخص شاعر ہے، تو یہ اُس کے لئے ناممکن ہے کہ وہ حقائق کی جستجو نہ کرے، اور اِس کا مزاج حکیمانہ نہو۔ جس طرح بجلی کے پازیٹو اور نیگیٹیو کرنٹ ملنے سے روشنی پیدا ہوتی ہے۔ اُسی طرح شاعرانہ جنون اور حکیمانہ تفکر کے نقطۂ اتصال سے شعر پیدا ہوتا ہے ـــــ حکمت و شعر دو متخالف و متضاد چیزیں نہیں ہیں کہ آپ کی موجودگی میں دوسرے کی بقا کو ناممکن سمجھ لیا جائے ـــــ بلکہ اِس کے برخلاف اِن میں چُولی دامن کا ساتھ ہے۔

میں ایسے "ہر شاعر" کو شاعر ماننے پر طیار نہیں ہوں جس کا جُنون حکمت سے خالی ہو۔ اور جس کا دماغ حقائق کی جستجو میں صرف نہوتا ہو۔

پرویز صاحب، ہر شاعر، حکیم ہوتا ہے، لیکن ہر حکیم شاعر نہیں ہو سکتا ـــــ

~~~~~~~~

[illegible] ہستی خاموش
[illegible] راز و ہستی خاموش
[illegible] ہستی کے خلاف
[illegible] ہستی خاموش
[illegible]
(رحیم)
~~~~~~~~

دورِ پیشیں کی تقویمِ پارینہ

انقلابِ فرانس کا سب سے زیادہ متین و غیر جذباتی مطالعہ!

ترجمہ از اسرائیل احمد خان

۱۸۵۶ء میں، یعنی الیگزس ڈی ٹاک ول کی کتاب "جمہوریۂ امریکہ" کی اشاعت کے اکیس سال بعد، فاضل موصوف کی دوسری عظیم تصنیف ——— "عہدِ انقلاب سے مین ماقبل کا لمحہ" ——— منصۂ صحافت پر نمودار ہوئی۔ اس آخر الذکر کتاب کا انگریزی ترجمہ اِس طویل الذیل عنوان کے تحت شائع ہوا ——— "انقلاب ۱۷۸۹ء سے پہلے فرانس میں ہیئتِ اجتماعیہ کی حالت، اور اُن اسباب کی تصریح جو تاریخ کے اِس سانحۂ عظیم کا پیش خیمہ ثابت ہوئے"! ——— اگر تام و کمال نہیں تو قریب قریب ضرور اِس کتاب نے اپنی پیش رَو کی مقبولیت حاصل کی، "انقلابِ فرانس" کے متعلق جو صحیح و صالح تصور، فلسفۂ تاریخ کے دماغ نے بعد میں قائم کیا۔ یہ کتاب اُس حکیمانہ تشخیص کی صحیح بسم اللہ تھی: دفاترِ تاریخ میں اِس کی اہمیت یہی ہے! یہی تصنیف ہے جس کے صفحات میں پہلی مرتبہ یہ نکتہ واضح کیا گیا کہ: جدید العہد فرانس کی مرکزیت انقلابِ فرانس کی پیداوار نہ تھی؛ بلکہ یہ خیرِ سابقۂ مُلوکیت کے شر کا ثمر تھی؛ نیز یہ کہ فرانس کے طبقۂ امارت کے خلاف جو برہمی برپا ہوئی تھی اُس کا محرک اِس قدر اُنکا اقتدار نہ تھا جس قدر کہ اُنکا فقدانِ اقتدار!

علاوہ اِس کے اس تحریک کی علمبرداری بالکل بے بال و پَر عامۃ الناس نے کبھی نہ کی، بلکہ اُن عوام الناس نے کی جو پہلے ہی سے حاملینِ ملکیت بن چکے تھے، ڈی ٹاک وِل وہ پہلا صاحبِ قلم ہے جس نے اُنیسویں صدی کے نیمۂ اول کی راسخ الاعتقاد حریتِ فکر کے تصورات کو اک جاذبِ نظر صورت میں پیش کیا۔ ٹاک وِل کی یہ دونوں نگارشیں غالباً سیاسیات کے ادبیاتِ عالیہ کے زُمرے میں شمار کی جائیں گی!

(۱)

دَورِ جاگیرداری کے ایامِ آخرین!

فرانسیسی قوم نے ۱۷۸۹ء میں وہ عظیم ترین جد و جہد انجام دی جس کا اقدام نسلِ بشری کے کسی قبیلے نے زمانِ تاریخی کے کسی عہد میں کیا، اور جس کا مقصود یہ تھا کہ یہ قوم اپنی شاہراہِ تاریخ کے اِس مرحلۂ خاص پر اپنے مقدرات کو گویا دو واضح و قاطع حصوں میں تقسیم کر دے! اور اِن دو حصوں کے درمیان ایک فراخ خلیج حائل کر دے! ہمارا رُوئے سخن جس پہلے حصے کی طرف ہے وہ تو وہ حالات ہیں جن میں یہ قوم ابھی تک ——— رہی تھی، اور دوسرا حصہ وہ مجوزہ

نظامِ حیات عمرانی تھا جس کا فتح باب وہ کرنا چاہتی تھی۔

جن بلدیاتی اداروں نے تیرھویں اور چودھویں صدی میں جرمنی کے بڑے قصبوں اور شہروں کو مرفہ حال اور روشن خیال جمہوریتوں میں تبدیل کر دیا تھا، وہ اب اٹھارہویں صدی میں بھی علیٰ حالہٖ قائم تھے۔ تاہم یہ صورت صرف برائے بیت تھی۔ یہ ادارات اپنے ماضی کا محض اک پیکرِ بیجان رہ گئے تھے۔

قرونِ متوسطہ کی وہ تمام دیگر قوتیں بھی جو ہنوز بقیدِ حیات تھیں، اسی عارضے سے ماؤف معلوم ہوتی تھیں! سب کی سب ایک ہی قسم کے اضمحلال و زوال کی مورد نظر آتی تھیں!

پھر جہاں جہاں صوبجاتی مجالس نے اپنا دستورِ قدیم سلامت و باامانت رکھا تھا، وہاں بھی وہ الٹی، تہذیب کے تقدم میں سنگِ راہ ثابت ہو رہی تھیں، نہ کہ اُس کی شمعِ راہ!

قرونِ مظلمہ میں ملوکیت کی جو شان رہی تھی اُسے اِس دَور کی شاہی سے کوئی نسبت نہ تھی۔ بلاشبہ اُسے دوسرے مخصوص مراعات حاصل تھے۔ وہ اک مختلف موقف و منصب کی حامل تھی۔ اک مختلف روح سے دمساز تھی۔ نیز مختلف جذبات کی روح پروری کرتی تھی۔ لیکن بہرحال یہ چیزیں اک بدلے ہوئے عالم سے تعلق رکھتی تھیں! مرکزی ریاست کا نظم و نسق شش جہت میں اپنی شاخیں پھیلا رہا تھا، اور یہ سارا نو تعمیر قصر، سابقہ مقامی اقتدار و حکومت کے مسمار شدہ قلعوں کے ملبوں پر بن رہا تھا! جدید العہد پبلک حکام کا اک آراستہ پیرا تھا، جو اُمرائے ذیشان کی فرماں فرمائی کو بیدخل کر رہا تھا۔

صورتِ حال کا یہ مرقع، جو براعظم یورپ کے تمامی طول و عرض میں بھی بعینہٖ اُسی طرح جاری و ساری تھا جس طرح کہ فرانس کی حدود کے اندر، اُس شے کے فہم و احاطہ کے لئے ناگزیر تھا جو اب پردۂ غیب سے ظہور میں آنے والی تھی! اِس لئے کہ جس شخص نے فرانس کی سرگزشت کے اِس مخصوص لمحے کا جائزہ کماحقہ نہ لیا ہو، وہ میرا دعویٰ ہے کہ انقلابِ فرانس کی مورخانہ نباضی نہیں کر سکتا!

سوال یہ ہے کہ اِس انقلاب کی حقیقی علت اور غایت کیا تھی؟ اُس کی مخصوص ماہیت کیا قرار دی جا سکتی ہے؟ عین کونسا منطقی محرک اُس کے پس پشت واقع ہوا ہے؟ پھر جس شے کو وہ معرضِ وجود میں لایا وہ سچ مچ کیا تھی؟ — انقلابِ فرانس کی غرض یہ نہ تھی، جیسا کہ بعض مبصرین کا مفروضہ ہے کہ اعتقادِ دینی کے استناد کے ستون کو منہدم کر دیا جائے! سارے فریب انگیز ظواہر و قوالب کے علی الرغم وہ اک اجتماعی اور سیاسی انقلاب ہی تھا! اور اپنے اِن اجتماعی و سیاسی ادارات و تشکیلات کے چہار گوشے کے اندر اُس نے کسی ایسے خلقی میلان کا ثبوت نہ دیا جو بدعملی و طوائف الملوکی کو تقویت یا مداومت بخشنے والا ہو، یا جو —— جیسا کہ انقلاب فرانس کے اک شدید دشمن نے اُسے متہم کیا ہے، —— صرف بدنظمی میں اک انضباط پیدا کر دینے والا ہو!

انقلابِ زیرِ بحث کتنا ہی انقلاب انگیز رہا ہو، اُس کی جدت کاریاں حقیقتہً اُس سے بدرجہا کم تھیں جتنی کہ عامیانہ طریقے سے فرض کر لی گئی ہیں! میں اِس تاریخی مسامحت کو آئندہ بے نقاب کروں گا! جو کچھ صداقت و امانت کے ساتھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اُس نے عہدِ عتیق کے اُس راسخ نظامِ ہیئتِ اجتماعیہ کے قصر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، جس کا سنگِ بنیاد امارت و جاگیرداریت کے ہیولیٰ سے بنا تھا! انقلابِ فرانس کا یہ فاتحکار کارنامہ اب بھی جاری ہے! اِس لئے کہ اُس کا عمل شکست و ریخت ابھی اِتمام کو نہیں پہنچا ہے۔

لیکن اصل سوال یہ ہے کہ ۱۷۸۹ء کا یہ انقلاب، جس کے کوندے اُس وقت کے یورپ کے ہر ملک کے اُفق پر لپک رہے تھے، اُس کا نزلہ سب کو چھوڑ کر فرانس ہی پر کیوں گرا؟! اک دوسرا ذیلی قضیہ یہ بھی ہے کہ ایسا کیوں ہوا کہ اُس نے بعض مخصوص مظاہر ایسے پیش کئے جو براعظم کے دوسرے خطوں میں نمودار نہ ہو سکے، یا اگر ہوئے بھی تو اُن کی نمود محض جزوی نظر آتی ہے؟!

اک ماجرا ایسا ہے جو بیک نظر دیکھنے سے حیرت طاری کرتا ہے! انقلاب جس کا مخصوص مقصد یہ تھا، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قرونِ متوسطہ کے ادارات حیات کے باقیات کو جہاں جہاں وہ ملیں، محو کرتا چلا جائے۔ اُس کا نزول اُن ممالکِ یورپ میں نہ ہوا جن میں یہ ادارات بہتر حالتِ حفاظت میں تھے، اور جہاں لوگ اُن کی عائد کردہ قید و بند اور اُن کے پیدا کردہ مفاسد و شدائد سے نسبتہً کہیں زیادہ نالاں تھے! بلکہ اُس کا مورد براعظم کا وہ گوشہ بنا جہاں اذیت کا یہ سامان کمتر واقع ہوا تھا! بالفاظِ دیگر جس جگہ بارِ مصائب خفیف ترین تھا وہیں وہ سب سے زیادہ ناقابلِ برداشت محسوس ہو رہا تھا! یہ کیا بوالعجبی تھی؟!

مثال کے طور پر اس بات کا ذکر کیا جا سکتا ہے کہ اٹھارویں صدی کے خاتمے تک بھی جرمنی کے کسی علاقے میں رسمِ غلامی کا استیصال کامل نہ ہوا تھا۔

لیکن فرانس اِس قسم کی ہر لعنت کے وجود سے مدتِ مدید سے ناآشنا ہو گیا تھا! اپنی مملوکہ آراضی پر کاشتکار کی آمد وشد خرید و فروخت، محنت ومشقت، بے غل وغش جاری تھی۔ وہ اپنی اِس محدود قلمرو یا قلبہ رو میں اپنے کو "شہر خود و شہر یارِ خود" محسوس کرتا تھا! فرانس کے جس گوشے میں غلامی کے آخری باقیات سئیات پائے بھی جاتے تھے تو وہ اِس مملکت کے وہ مشرقی صوبے تھے، جن کا بذریعۂ تسخیر، فرانس سے الحاق عمل میں آیا تھا! تاہم یہاں بھی یہ مثلاً ہر اپنی اک نہایت تنگ ہی نمود رکھتے تھے، جن کو اک متجسس نظر ہی دیکھ سکتی تھی! باقی فرانس کا چپہ چپہ اِس ناشدنی علت سے پاک ہو چکا تھا! فرانسیسی کاشتکار، نہ صرف یہ کہ اک غلامِ بیدام نہ رہا تھا، بلکہ وہ "مالکِ زمین" ہو گیا تھا!

عرصۂ دراز سے یہ اعتقاد راسخ ہو گیا ہے کہ فرانس کے اندر حقیقتِ آراضی کی تقسیم در تقسیم کا سر آغاز ۱۷۸۹ء کا انقلاب ہے۔ نیز یہ کہ یہ چیز بلاشرکتِ غیرے اُسی کا عطیہ تھی! لیکن ساری تاریخی شہادت اس سے عین برعکس نتیجے کا استنباط کراتی ہے!

اُس وقت مالکانِ آراضی کی تعداد اپنے موجودہ شمار کے مقابلے میں نصف اور دوثلث کے درمیان تھی۔ اچھا اب یہ چھوٹے چھوٹے "کاشتکار زمیندار" اپنے قطعاتِ زمین کی کاشت کے کاروبار میں گوناگوں چھیڑ خانیوں اور نیش زنیوں کا تختۂ مشق تھے! انھیں کثیر التعداد محاصل و "ابواب" ادا کرنے پڑتے تھے، لیکن چونکہ وہ اپنی محبوبۂ زمین سے دست بردار نہ ہونا چاہتے تھے، اس لئے لامحالہ اِن تعزیری قسم کے مطالبات کو برداشت کیا کرتے تھے، تاہم قدرتاً بُری طرح جز بز تھے!

تاریخِ فرانس کی زبان میں جس چیز کا نام "دورِ پیشیں" ہے وہ اگرچہ زمانۂ ہم سے ابھی بہت ہی قریب ہے، لیکن پھر بھی کم لوگ اِس سوال کا پورا جچا تلا جواب دے سکیں گے کہ "انقلابِ ۱۷۸۹ء سے قبل فرانس کے زرعی اقطاع کا نظم ونسق کس قسم کا واقع ہوا تھا؟"

اٹھارویں صدی میں کلیسا کے تمام معاملات کا اہتمام چند کلیسائی عمال کو تفویض تھا۔ یہ بات اب اک قصۂ ماضی ہو چکی تھی کہ یہ لوگ اُمرا کی جاگیروں کے بس کارندے ہوں! اب اُن کا انتخاب و تقرر بھی اِن خداوندانِ ارضی کی بارگاہ سے ہوا کرتا تھا! اِن میں سے بعض لوگوں کی نامزدگی حاکمِ صوبہ کی طرف سے عمل میں آیا کرتی تھی۔ اور باقی دوسروں کے انتخاب کنندگان خود کاشتکار ہوتے تھے عمالِ سرکاری کا فرض یہ تھا کہ وہ تشخیصِ محاصل کریں، گرجاؤں کی مرمت کرائیں، مدارس تعمیر کرائیں، اور حلقۂ کلیسا کے ارکان کی مجالس کا انعقاد اور اُن کی صدارت فرمائیں! وہ گرجا کی جائداد کی بھی نگرانی کرتے تھے، مصارفِ اوقاف کا تعین کرتے تھے۔ وہ کلیسا کی جائداد کے اُمنا کی طرح دوسروں پر ضروری دعوے کرتے تھے، اور دوسروں کی عدالتی چارہ جوئی کے مدعا علیہم بھی اِسی حیثیت سے وہی ہوا کرتے تھے!

نہ صرف یہ کہ جاگیر کا خداوندِ زمین اب چھوٹے چھوٹے مقامی اُمور کا انتظام نہ کرتا تھا، بلکہ اِن کاروبار پر اُس کی نگرانی واحتساب بھی ختم ہو گیا تھا! تمام کلیسائی حکام کا طبقہ، حکومت یا مرکزی اقتدارِ ریاست کے تحت آ گیا تھا، جیسا کہ آئندہ سطور میں اس پر روشنی ڈالی جائے گی، واقعہ یہ ہے کہ حقیقت نفس الامری کچھ اس نوبت سے بھی متجاوز ہو گئی تھی! یعنی کلیسا کی قلمرو میں امیرِ جاگیر کے، ترجمانِ تاج والے، منصب کا سازِ موت بج چکا تھا! شاہ ورعایا کے درمیان اُس کی حاجب و برزخ کی شان بھی اب اک تقویمِ پارینہ تھی!

اب اگر ہم کلیسا کے حدود و حرم کا تخلیہ کر دیں، اور ملک کے وسیع تر زرعی خطوں کا جائزہ لیں، تو یہاں بھی ہم اسی صورتِ حالات سے دوچار ہوں گے! اب مملکت کا کوئی گوشہ یا شعبہ ایسا نہ تھا جس میں انصرامِ اُمور کی عنان امرا کے ہاتھوں میں رہ گئی ہو! جماعتی یا انفرادی ہر حیثیت سے اب وہ اک "حلقۂ بیرونِ در" ہو گئے تھے!

یہ نقشہ فرانس کا مخصوص مرقع تھا!

فرانسیسی امارت کے تمام غیر معمولی اقتدارات و مراعات کی طویل فہرست اعزاز سے سیاسی عنصر اب مفقود ہو چکا تھا! البتہ مالی حلقہ اچھوتا رہ گیا تھا! بعض صورتوں میں اس حلقے کے حدود میں مزید وسعت بھی پیدا ہو گئی تھی!

(۳)

عمومیت کا اک سایہ!

اٹھارویں صدی کے اک فرانسیسی کاشتکار کو اپنی چشمِ تصور کے سامنے لایئے! تاریخی دستاویزات جس طرح اُس کی آئینہ داری کرتی ہیں۔ اُسی ہیئت میں اُسے لیجئے! وہ اپنے قطعۂ آراضی سے والہانہ وابستگی رکھتا ہے! وہ اپنے

کشتہا چوں بشتہا" کا ایسا دلدادہ ہے کہ وہ اپنی پس انداز کی ایک ایک کوڑی کو اُسے "کنار گیر" کرنے کے لئے صرف کر دے گا! اور پھر بالا سے "بالا نرخ" کو بھی وہ "ارزانی ہنوز" سمجھتا ہے! پھر دیکھئے کہ دستاویز بیع و شریٰ کے تکمیلے کے سلسلے میں اُسے کون کون سے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں! "قدم اول" یہ ہے کہ اُسے اک محصول ادا کرنا چاہئے! ——— لیکن سرکار کو نہیں، بلکہ قرب و نواح کے دوسرے خداوندانِ زمین کے خزانۂ عامرہ کو! اگرچہ یہ آخر الذکر بزرگ ملکی معاملات سے اسی طرح کوئی واسطہ نہیں رکھتے تھے جس طرح کہ وہ خود! پھر اُنکا اثر و اقتدار بمشکل اُس سے زیادہ واقع ہوا تھا! بہر حال وہ کسی نہ کسی طرح اک قطعۂ اراضی کا دامنگیر ہو جاتا ہے! اور اس شانِ وصل و غلول کے ساتھ کہ جب اپنے کھیت میں بیج ڈالتا ہے تو اپنی اک "قاشِ دل" بھی اُسی کے ساتھ سپردِ زمین کر دیتا ہے! یہ تنگ ترین گوشۂ زمین جو تمامی کائنات میں اُس کی تنہا متاع ہے، اُسے شہنشاہِ ہفت اقلیم کا فخر و غرور بخشتا ہے! وہ اُس کی آزادی و استقلالِ ذاتی کی تخت گاہ ہے!! ———

"اک حقیر چیز، لیکن میری اپنی"!

باایں ہمہ بھی اُس کے ہمچشم ہمسائے اُسے اُس کے کشت زار سے جب چاہتے ہیں کھینچ بلاتے ہیں، اور جس وقت وہ کھیتی باڑی پر کام کر رہا ہے، وہ مجبور کیا جاتا ہے کہ "بیگار" بھر کے اپنے "خونِ گرم" سے دوسروں کی خاک کی شیر خوارانی کرے! وہ اپنی نورس کاشت و فصل ان مُفت خوروں کی تخریبوں سے بچانا چاہتا ہے، لیکن اپنے "چراغِ تہِ داماں" سے بُری طرح گرفتارِ کشمکش ہے! دیہات و مواضع کے اندر چھوٹی چھوٹی نقل و حرکت کے دوران میں جب وہ کسی ندی پر سے گزرتا ہے، خدائی فوجدار محصولِ عبور عاید کر کے ندی کے پُل کو پُل صراط کی دشوار گزار بنا دیتے ہیں! پھر وہ ان موذیوں سے بازار میں دوچار ہوتا ہے، جہاں قبل اس کے کہ وہ کوئی داد و ستد کرے اپنی ہی جنس کی فروخت کا حق اُن سے خریدنے پر مکلف ہوتا ہے۔ اور جب وہ اس خرابی بسیار کے بعد اپنے گھر واپس آتا ہے، اور اپنے گیہوں کا بچا کھچا تبرک اپنے قوتِ لایموت کی طرح استعمال کرنا چاہتا ہے تو وہ اپنے ہی اناج کو ———

اُس اناج کو جس کی تخم ریزی اُسی کے ہاتھوں نے کی، اور جس کا ایک ایک ریشہ اُسی کی پدرانہ آنکھوں کی نگرانی کی آغوشِ گرم میں بڑھا اور پلا! ——— ہاتھ نہیں لگا سکتا، تا آنکہ وہ اُسے اپنی ٹھیکیداروں کی پن چکیوں میں پسوا نہ لے، اور انہی کے "نان پزاؤں" میں پکوا نہ لے! اسی طرح اُسے اپنی حقیر سی پونجی کی "جمع" بوٹی بوٹی کر کے ان "غارتگروں" کی نذر کر دینی پڑتی ہے! پھر ان مطالبات کا نہ ارتفاع ہے، نہ اُنکا جانستان تقاضا کبھی ختم ہوتا ہے۔

اُمرا جس طرح اپنے گزشتہ اقتدارات سے محروم ہو گئے تھے، اپنی گزشتہ ذمہ داریوں سے بھی بری ہو گئے تھے! کم از کم طبقۂ امارت، اس انقلاب حال کے سود و زیاں کو اسی رنگ میں دیکھتا تھا! اُمرا نے اس منصبِ امانت کو خالی کر دیا تھا، اور اُن کے بعد اُن کی اس نشست کو کسی نے پُر نہیں کیا تھا، عام اس سے کہ وہ کوئی مقامی حاکم ہو، یا کاونسل ہو، یا کوئی صوبجاتی یا کلیسائی مجلس! قانون کی بارگاہ سے اب کوئی واحد وجود اس امر کا مکلف نہ تھا کہ زرعی اضلاع کے غربا کا پُرسانِ حال ہو! صرف مرکزی حکومت نے یہ بارِ گراں اپنے دوش پر اُٹھا رکھا تھا۔ اگرچہ اس عزیمت میں اُس کا تمام و کمال اعتماد اپنے ذاتی وسائل ہی پر تھا! ع

لے لیا اپنے جگر پر میں نے اپنا تیرِ غم!

ہر سال سلطانی مجلس ہر صوبۂ مملکت سے مخصوص رقوم منسوب کیا کرتی تھی، جو محاصلِ ملک کی عام آمدنی سے حاصل ہوتی تھیں۔ ان محاصل کا تعین متعلقہ صیغے کا ناظر کیا کرتا تھا، اُنھیں مختلف حصصِ زمین پر حصۂ رسدی تقسیم کر دیا کرتا تھا۔

بعض اوقات ایسے نظائر بھی دیکھے گئے کہ مجلسِ سلطانی نے افرادِ ملک کو بالاصرار اس بات پر مجبور کیا کہ وہ بعض مُرفہ حالی کے کاروبار کی طرف توجہ کریں۔ ایسی سلسلہ جنبانیاں ہوئیں ضرور، لیکن یہ دوسری بات تھی کہ لوگ اُن پر صدائے لبیک بلند کر سکے یا نہیں! بے شمار ایسے فرمانِ واجب الاذعان صادر ہوئے، جن میں اہلِ حرفہ کو اس بات کا پابند کیا جاتا تھا کہ وہ بعض خاص قسم کے مصنوعات تیار کریں، یا اُن کی ساخت و پیدائش میں خاص طُرقِ صناعت کو کام میں لائیں! لیکن چونکہ سرکاری نگراں کاروں کے پاس ان گوناگوں ضوابط و شرائط کے نفاذ کی ضمانت حاصل کرنے کے لئے وقت نہ تھا۔ اس لئے اب اس کا تدارک یوں کیا گیا کہ سررشتۂ صنعت و حرفت کے انسپکٹر جنرل مامور ہوئے کہ وہ صوبجات میں دَورے کریں اور احکامِ متعلقہ کی بجا آوری پر اصرار کریں!

الغرض اس طرح حکومت کے نظام میں اک ایسا قلبِ ماہیت ظہور میں آ گیا تھا کہ وہ بجائے والیِ ملک کے متولیٔ اہلِ ملک ہو گئی تھی!

فرانس میں شہری و بلدیاتی آزادی، نظامِ جاگیرداری کا سازِ موت بجنے کے بعد بھی باقی رہی! خداوندانِ زمین کے زرعی قطعات کے فرماں فرما نہ رہنے

کے بعد بھی عرصۂ دراز تک شہر و قصبات کو حکومت خود اختیاری کا حق حاصل رہا۔
بیشتر صورتوں میں شہروں کا ایوانِ حکومت دو مجالس پر مشتمل ہوتا تھا۔ بڑے بڑے بلاد کا نظم و نسق ایسا ہی واقع ہوا تھا، لیکن بعض چھوٹے قصبے بھی اِس نظامِ کار سے متمتع تھے۔ اِن مجالس میں سے پہلی مجلس بلدیاتی عُمّال سے مرکب ہوتی تھی جو متعلقہ مقام کی آبادی کی کثرت یا قلت کے اعتبار سے کم و زائد ہوا کرتے تھے۔ میونسپلٹیوں کے اِن حکام کو اپنی خدمات کے لئے کبھی کوئی مُعاوضہ نہ ملتا تھا، تاہم اُن کے ساتھ "حسابِ دوستاں در دل" یوں رہا کرتا تھا کہ وہ عام محاصل سے مستثنیٰ رکھے جاتے تھے، نیز اُن کو بعض اور خاص مراعات حاصل تھیں:
دوسری مجلس، جو مجلسِ عمومی کہلاتی تھی، وہ ارکانِ کارپوریشن کا انتخاب کیا کرتی تھی، اور یہ اُن مقامات پر، جہاں وہ ہنوز اصولِ انتخاب کے تحت واقع ہوئی تھی۔ یہ مجلسِ ثانوی، شہر کے نظم و انتظام کے مہماتِ اُمور کی سربراہی میں شریک ہوا کرتی تھی!
اگر ہم شہر سے اپنی توجہ ہٹا کر اُسے دیہات کی طرف منعطف کر دیں تو یہاں ہم کو مختلف قسم کے طریقہائے نظم و نسق اور متعلقہ عمال کے مختلف نوع کے اختیارات سے سابقہ پڑے گا۔
اٹھارویں صدی میں کلیسائی آئمہ کی تعداد اور اُن کے مناصب کے نام مختلف صوبجات میں مختلف پائے جاتے تھے۔ بیشتر کلیساؤں میں یہ عُمال گھٹ کر صرف دو منصبوں کے اندر محدود ہو گئے تھے —— ایک کا نام "کلکٹر" (محصل محاصل) تھا، اور دوسرے کا "سنڈک"، عام طور پر یہ کلیسائی عمال منتخب کئے جاتے تھے، یا منتخب شدہ سمجھے جاتے تھے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ ہر جگہ عوام کے وکلاء کے بجائے حکومت کے آلۂ کار بن گئے تھے! کلکٹر، سرکاری نگراں کے براہِ راست احکام کے تحت عام محاصل عائد کیا کرتا تھا۔ سنڈک جو نگرانِ کار افسر کے ماتحت فرستادے کی روزمرہ نگرانی میں رکھا جاتا تھا، اُن جملہ اُمور میں اِس عامل کا ترجمان ہوا کرتا تھا جو امنِ عامہ اور کاروبارِ حکومت سے متعلق ہوا کرتے تھے، وہ فوجی خدمت، کارہائے رفاہِ عام اور مملکت کے عام قوانین کے نفاذ کے معاملے میں حکومت کا وکیلِ مطلق بن گیا تھا!
انقلاب کی عین ساعت تک فرانس کے کلیسائی حلقہائے نظم و نسق کو اپنی حکومت میں عمومیت کی روح کا وہ عنصر نصیب رہا جو اُنھوں نے قرونِ متوسطہ میں حاصل کیا تھا، کلیسا کی مجلسِ شوریٰ اپنی خواہشات کا اعلان کر سکتی تھی، لیکن اپنی مرضی کے نافذ کرنے کے اختیارات اُسے اِس سے زیادہ حاصل نہ تھے، جتنے کہ شہروں کے اندر مجالس جمہور کو ہوا کرتے ہیں! مثلاً وہ اُسی وقت لب کشائی کر سکتی تھی جب کہ اُس کا قفلِ دہن توڑ دیا جاتا تھا! —— ہمارا روئے سخن اِس حقیقت کی طرف ہے کہ مجلسِ مذکور کا اِنعقاد قانوناً اُسی وقت ہو سکتا تھا کہ سرکاری افسر نگرانِ کار کی اجازت حاصل کر لی جائے!

(۳)

قصرِ امارت کا انہدام

اگر انقلاب سے پہلے کی فرانسیسی ہیئتِ اجتماعیہ کی حالت کا ہم بنظرِ غائر مطالعہ کریں تو ہم کو یہ حقیقت نظر آئے گی کہ ہر حصۂ ملک میں، مختلف طبقاتِ جماعت کے لوگ، کم از کم وہ لوگ جو عوام کالانعام کی سطح سے بلند تر واقع ہوئے تھے، مناصب و مدارج کے سارے اختلافات کے علی الرغم، روز بروز ایک دوسرے سے ہمرنگ ہوتے جا رہے تھے!
وقت، جس نے اُن مراعات کو قیام و دوام بخشا تھا، نیز بہت سی صورتوں میں سنگین تر بنایا تھا، جو ان دو مدارجِ جماعت کی حدِ فاصل بناتے تھے، "اُسی وقت" نے تمام دوسرے اعتبارات سے، اُنھیں یکرنگی بہم پہنچانے میں بھی بڑے قوی اثرات پیدا کئے تھے!
مسلسل کئی صدیوں سے فرانس کا طبقۂ امارت برابر اک زوالِ دولت کی گردش میں گرفتار تھا۔ ایک فرانسیسی امیر نے ۱۷۵۵ء میں اک غمناک آہنگ میں یہ الفاظ سپردِ قلم کئے:
"امارت، اپنے سارے اقتدارات و مراعات کے علی الرغم، اک فلاکت و ہلاکت میں مبتلا ہے! متوسط طبقے کے لوگ معیشتِ قومی کے بڑے حصے پر قابض ہوتے جاتے ہیں!"
تاہم جن قوانین کے تحت اُمرا کی جاگیرات کی حفاظت و صیانت کی جاتی تھی وہ بدستور باقی رہے۔ چنانچہ طبقۂ امارت کی معاشی حالت میں کوئی تبدیلی نظر نہ آتی تھی! لیکن جس قدر اُن کی سیاسی طاقت میں کمی آتی گئی اُسی قدر اُن کی اقتصادی منزلت میں پستی پیدا ہوتی گئی۔ سیاست و معیشت میں اک باہمی رشتۂ تاثیر و تاثر ثابت ہوا!

اُمرا، جہاں جہاں جائداد و املاک سے بیدخل ہو رہے تھے وہاں اُن کے وارث، حلقۂ امارے سے باہر کے لوگ ہو رہے تھے! امارت کا ہیولی تحلیل ہو رہا تھا، اور غیر امیر افراد اِس خوانِ یغما پر اپنی فربہی بڑھا رہے تھے! بااینہمہ کوئی قوانین ایسے موجود نہ تھے جو متوسط طبقے کو خود تخریبی سے روکیں، یا کسبِ دولت میں اُن کے معاون ہوں! تاہم اُن کی دولت اندوزی کا تاریخی طور پر اک عمل جاری تھا۔ وہ مسلسل و متواتر مرفہ حال ہو رہے تھے، اور بہت سی صورتوں میں وہ امرا کی طرح، اور کہیں کہیں اُمرا سے بھی بڑھکر صاحبِ ثروت ہوگئے تھے! سچ تو یہ ہے کہ اُن کی دولت کی ساری نوعیت یکساں واقع ہوئی تھی، اِس لئے کہ اگرچہ وہ شہروں میں سکونت پذیر ہوگئے تھے، وہ اکثر اوقات دیہاتی زمیندار تھے۔ بعض اوقات وہ ذی اقتدار امارتی جاگیروں کے بھی مُشتری بنتے تھے۔

آئیے، اب تصویر کے دوسرے رُخسار کا مطالعہ کریں!

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ یہی فرانسیسی، جو اپنے مابین اتنے زیادہ وُجُوہ مشابہت رکھتے تھے، آپس میں اتنے متفرق و بیگانہ بھی واقع ہوئے تھے کہ اتنی مغائرت کسی دو مستقل ملکوں کے لوگوں کے درمیان بھی نہ ہوگی! فرانس کے تمامی ماضی کے کسی دَورِ گزشتہ میں فرانسیسی ہئیتِ اجتماعیہ کا یہ نقشہ نہ رہا تھا!

حقیقت یہ ہے کہ جیسے جیسے درجہ بدرجہ مختلف شعبہائے زندگی میں ملک کی عام آزادیاں سَلب ہوتی گئیں، اور اُنہی کی لپیٹ میں مقامی مراکزِ حریت بھی آتے گئے، ویسے ویسے اُمرا اور خواص کا باہمی ربط بھی مُلک کی حیاتِ عمومی سے معدوم ہوتا گیا۔

اِس پر طرہ یہ ہوا کہ نئے امرا کی ساخت و تخلیق کے کاروبار مزید وُسعت کے ساتھ جاری رہے! اِس حرکتِ مذبوحی نے امارت اور عامۂ خلائق کے درمیان نفرت کی خلیج کو فراخ تر کردیا! اگرچہ ضرورت اِس امر کی تھی کہ "بندۂ کوچہ گرد" اور "خواجۂ بلند بام" کے زمین و آسمان کے بُعد کو کچھ کم کیا جاتا! ان جدید امرا اور اُن کے قدیم ہمچشموں کے درمیان بجائے خود اک نہایت مسموم قسم کی رقابت پیدا ہوگئی! نتیجہ یہ تھا کہ یہ اول الذکر زمرۂ امارت، عوام کی عداوت و عناد کا خاص طور پر ہدف بنا، جسے وہ قدیم خاندانی طبقۂ اُمرا کے مقابلے میں زیادہ مبغوض رکھتے تھے!

اٹھارویں صدی میں جاکر اب یہ نوبت پہنچ گئی کہ فرانس کا طبقۂ مزارعین اپنے اِن سبک سر اور کم ظرف خداوندانِ زمین کا صیدِ زبوں بننے کے لئے تیار نہ تھا! حکومت کی طرف سے وہ شاذ و نادر ہی جبر و قہر کا نشانہ بنائے جاتے تھے، وہ مدنی آزادی سے شادکام تھے۔ اور زمین کے ایک حصّے کی ملکیت سے بھی بہرہ ور تھے! لیکن تمام دوسرے طبقاتِ جماعت اِس طبقے سے دامن کشاں تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ تختۂ زمین کے کسی گوشے میں فرزندانِ زمین ایسی کسمپرسی کی زندگی نہ بسر کرتے تھے!

اس نادر و عدیم النظیر قسم کی ناانصافی و حق تلفی کے اثرات کا مطالعہ غائت درجہ غائر توجہ کا مستحق ہے!

یہ صورتِ حالات، اپنے اِسی درجۂ کیفیت و شدت میں، براعظم یورپ کے کسی دوسرے مہذب ملک میں نہ پائی جاتی تھی، خود فرانس کے اندر اِس کا ظہور نسبتہً ماضئ قریب کی اک نشو و نما تھی۔ اس کے مقابلے میں چودھویں صدی کی یوروپی جماعتِ کاشتکاران زیادہ مظلوم بھی تھی۔ اور زیادہ متمتع بھی!

بلاشبہ وہ امارت کا تختۂ مشقِ ظلم و ستم تھے، تاہم امارت نے اپنے ساتھ اُن کی "نسبتِ بزرگ" کو ہمیشہ ملحوظ رکھا، اور وہ کبھی اپنے اِن گرفتارانِ بلا کو بھولی نہیں! لیکن اب اس ماقبلِ انقلاب دَور میں وہ اپنی جزوی آزادی کے ساتھ ساتھ اِسی گردش میں تھے! ؎

کھیل سمجھا ہے، کہیں چھوڑ نہ دے، بھول نہ جائے
کاش یوں ہی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

اٹھارویں صدی کے اک فرانسیسی گاؤں کا یہ مرقع تھا کہ اُس کی انسانی آبادی کے سارے ارکان مفلس، جاہل، اور کُندۂ ناتراش لوگ واقع ہوئے تھے۔ اُس کے قاضی بھی ماشاء اللہ ایسے ہی "ابوجہل" تھے جیسے کہ عوام کالانعام! اُس کے "سِنڈک" پڑھنے کے فن سے نابلد تھے، اور اُس کے محصلینِ محصول اپنی قلمی تحریر میں اپنی تحصیل وصول درج کرنے کی اہلیت سے ناآشنا تھے! ——— اگرچہ حسابات کی یہ قلمبندی کافی اہم کارروائی تھی، کہ اِسی پر اس محصل کے ہمسائے کی اور خود اُس کی آمدنی کے تعین کا انحصار تھا!

نہ صرف یہ کہ جاگیر کا سابق خداوند اپنی اِس چھوٹی سی مخلوق پر فرمانروائی کے حقوق کھو چکا تھا، بلکہ ایسی تسلیم نقدِ ہوش بھی کرچکا تھا کہ اِن کاروبارِ حکومت کی گرد سے اپنے دامن کو آلودہ کرنا بھی اپنی شان سے فروتر اک مشغلہ سمجھتا تھا!

ان معاملات کی خبر لینے والی اگر کوئی جماعت تھی تو وہ صرف مرکزی حکومت تھی، لیکن یہ جماعت اہلِ دیہات سے چونکہ اک دور دراز فاصلے پر مکین تھی، نیز ابھی اُسے آخرالذکر کی ذات سے کوئی خطرہ بھی پیش نہ آیا تھا، اِس لئے اُس کی تنہا خبرگیری بھی اُن کے معاملے میں اِس سے زیادہ نہ تھی کہ اُن کی رگہائے خشک سے مالگذاری کے قطراتِ خون ہی نچوڑا کرتی تھی! ؎

بگذر زسعادت ونحوست کہ مرا
ناہید بغمزہ کشت ومریخ بقہر!

اب کاشتکار کے "شترِ صابر" کی پشت پر اک اور "تنکے" کا اضافہ ہوا، سڑکوں کی مرمت کا یہ سرشتہ جاری کیا گیا کہ یہ کام تمام وکمال "بیگار" سے ہی انجام پایا کرے گا! اِس کے معنی فصیح تر زبان میں یہ تھے کہ بے معاوضہ عرق ریزی کی یہ ساری سعادت مظلوم ومحروم کسان ہی کے حصے میں آئے گی: "آسمانِ ایوانِ حکومت" سے نازل ہونے والی یہ "بلا" زمینِ دیہات پر پہنچنے سے پہلے پہلے یہی پوچھنے لگی کہ ؏

خانۂ انوری کجا باشد!

ملک کی سڑکوں کو پتھر اور پانی کے بجائے سوختہ بخت کاشتکار کے گوشت وخون کے آب وگِل سے تعمیر کرنے کی یہ تجویز اتنی جدت نواز اور فاتح کار سمجھی گئی کہ ۱۷۳۷ء میں فرانس کے کنٹرولر جنرل آلی نے یہ فرمانِ نما گشتی شائع کر دی کہ یہ جدیدالانکشاف دستور، ملک کے سارے طول وعرض میں جاری کیا جاتا ہے! کیوں نہو؟! ؎

شنیدہ ام کہ سگاں را قلادہ می بندی
چرا بگردنِ حافظ نمی نہی رسنے؟

اِس مرحلۂ حالات پر ملک کی زرعی آبادی کی جو اندوہناک حالت ہو گئی تھی اُس کا بیان کسی زبان کے لئے آسان نہیں! ہیئتِ اجتماعیہ کے "سیاسی رتھ" کی یہ کتنی ستم ظریفانہ چال ہے کہ اِس کے پہیوں کی گردش جتنی جتنی دوسرے طبقوں کا معاشی وعمرانی دَور دَورہ لایا کرتی ہے، اُتنی ہی اُتنی کسان کو روندا کرتی ہے! آہ کہ جس دُخترِ تہذیب کو وہ اپنا خونِ جگر پلا کر پالتا ہے، وہی اُس کی سوتیلی ماں بن جاتی ہے!

بیگار کی یہ بدعتِ بدیع اک حقِ شاہانہ بن گئی! چنانچہ رفتہ رفتہ اِس سعادت سے سارے فرانس کو نوازا گیا! اور رفاہِ عام کے تمام صیغوں کے کارہائے تعمیر اِسی ذریعے سے انجام پانے لگے! ۱۷۹۱ء کے سالِ مسعود نے تو یہ منظر دکھایا کہ فوجی بارکوں کا معمار بھی "بیگار" ہی ہے! شاہی فرمان واجب الاذعان کے الفاظ یہ تھے کہ "منابرِ کلیسا کے متعلقہ حلقوں کو اپنے بہترین کاریگر بھیجنا چاہئے تمام دیگر فرائض وامور راستہ خالی چھوڑ دیں گے، اور ان مجوزہ تعمیرات کا جلوس، راہ سے بے غل وغش گزرے گا!"

اِسی بیگار میں پکڑے ہوئے آدمیوں سے یہ کام بھی لیا گیا کہ وہ اپنے بدرقوں کی زیرِ نگرانی مجرمین کو جیل خانوں کے دارالمحن تک پہنچائیں، اور دریوزہ گروں کو کارگاہوں تک! جب کبھی فوجیں اپنی چھاؤنیاں بدلتی تھیں تو اُنکا خیمہ وخرگاہ بھی گاڑیوں میں لاد لاد کر یہی بیگاری مطلوبہ مقامات پر منتقل کیا کرتے تھے! یہ اک دیدنی زحمت تھی! اُن ایام میں فوجوں کے "پس خیمے" شیطان کی آنت ہوا کرتے تھے! ان کارہائے حمل ونقل کی لپیٹ میں کثیرالتعداد گاڑیاں اور بیل اور "عوام کالانعام" کسان اور مزدور آیا کرتے تھے! ؎

تا "عزّمن قنع" شدہ نقشِ نگیں ترا
دارند اہلِ فقر زدستِ تو صد جزع!

(۴)

اصلاح کی تعمیر وتخریب لازم وملزوم!

صورتِ حالات کے مُرکّب کا ایک اور عنصر —— جو اہم ترین عنصر ہے —— اب منتظرِ بیان باقی ہے! یہ وہ ہمہ گیر بے اعتمادی ہے جس کی زدؔ میں اٹھارویں صدی کے اواخر میں، اعتقادِ دینی کا ہر مظہر آگیا تھا! انقلاب میں جس چیز کی سب سے زیادہ کارفرمائی نظر آتی ہے وہ بلاشبہ یہی چیز ہے! لاریب کہ "انقلابِ فرانس" کی پیشانی پر جو تحریر بخطِ جلی لکھی ہوئی نظر آتی ہے وہ اِسی حقیقت کا طُغریٰ ہے!

لامذہبی نے عوام الناس کے انبوہ میں اک بے پناہ فتنہ پیدا کر دیا تھا! جس وقت مدنی قوانین کا استیصال ہوا اُسی کے ساتھ ساتھ احکامِ شریعت بھی چونکہ منسوخ ہو گئے، اِس لئے لوگوں کے دل ودماغ یکسر درہم برہم ہو گئے اب وہ اک "لنگر گسستہ کشتی" تھے جسے نہ اپنی بندرگاہ معلوم تھی نہ اپنا ساحلِ مُراد! اِس سلسلے میں انقلاب کاروں کی اک ایسی نوع معرضِ ظہور میں آئی جو کبھی

گنبد!

ابرار حسن خاں آثر ملیح آبادی

ممالکِ متوسط کے کسی گاؤں میں ایک بوسیدہ عمارت تھی۔ عمارت کو دیکھنے سے یہ پتہ چلتا تھا کہ اس پر کئی صدیاں گزر چکی ہیں۔

عمارت کے کل حصے منہدم ہو چکے تھے صرف ایک گنبد باقی رہ گیا تھا، جس میں ایک قدِ آدم طاق بنا ہوا تھا، یہ عمارت ایک بلند پہاڑی پر بنی ہوئی تھی۔ گنبد تک پہنچنے کے لئے سیڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ سیڑھیوں کے پتھر نئے تھے اور اُن پر چونا پھرا ہوا تھا۔ گنبد اور گنبد کا طاق بھی چُونے سے پُتا ہوا تھا۔ طاق کے اندر تیل کے چراغوں کی سیاہی تھی۔ گنبد جس پہاڑی پر واقع تھا اس کے چاروں طرف بڑے بڑے سیاہ پتھر پڑے ہوئے تھے۔ ان بڑے اور بھاری پتھروں پر ہزاروں نام کندہ تھے، یہ نام اُن لوگوں کے تھے جو اس گنبد کے دیکھنے کے لئے آئے تھے۔ اس گنبد میں کوئی تصویر یا بُت نہ تھا، بلکہ طاق کے بالائی حصے پر دو کیلیں گڑی ہوئی تھیں۔ جن پر لوگ ہار لٹکا دیا کرتے تھے، اس کے متصل منہدم شدہ حصوں پر ایک خاص قسم کی بیل دوڑی ہوئی تھی، جس کے پھولوں کی خوشبو سے پوری پہاڑی معطر رہتی تھی، اس کے علاوہ کچھ جنگلی جھاڑیاں بھی اس گنبد کے چاروں طرف تھیں جو ہمیشہ شاداب رہتی تھیں ان کے پھولوں میں اس قدر خوشبو ہوتی تھی کہ اگر کسی کے ہاتھ سے مس ہو جائیں تو کم سے کم ہاتھوں میں دو تین ہفتے تک خوشبو رہتی تھی، اس پہاڑی کے چاروں طرف دس بارہ موضعے تھے جن میں ہندو مسلمان۔ عیسائی اور جینی مذہب کے پیرو رہتے تھے۔ اس مندر کے متعلق ان دیہاتیوں میں عجیب و غریب روائتیں مشہور تھیں، اور یہ روائتیں نسلاً بعد نسلاً یوں چلی آرہی تھیں کہ اس بوسیدہ عمارت میں کئی سو برس گزرے کہ ایک بہت بڑا رشی رہا کرتا تھا وہ بڑا عبادت گزار تھا متقی و پرہیزگار تھا، ہر شخص کی آرزو برلاتا تھا، اور ہر بیمار کو اچھا کر دیتا تھا۔ اس کے قیام کی برکت سے قرب و جوار کے تمام مواضعات سرسبز و شاداب نظر آتے تھے۔ ہر شخص خوشحال رہتا تھا، دنیا کی کوئی فکر اُن لوگوں کو پریشان نہیں کر سکتی تھی۔ جب اِس رشی کی موت کا وقت آیا تو اُس نے اپنے تمام کمالات ایک عیسائی پادری کو بخش دیتے جو تلاشِ حق میں پاپیادہ سفر کرتا پھرتا تھا، آخر کار اس رشی کے کمالات اور سچائی کا اعتراف کر کے تقریباً پچیس سال سے اس کا چیلا بن چکا تھا۔ اس عیسائی پادری کے عہد میں بھی وہی خوشحالیاں رہیں۔ فصلوں کی شادابی میں کوئی فرق نہ آیا۔ تمام وبائی امراض سے یہ مخصوص مواضعات ہمیشہ پاک رہے، جب عیسائی پادری کا آخری وقت آیا تو اُس نے اپنے ایک مسلمان چیلے کو اپنی گدی پر بٹھا دیا جو ایک زمانے سے اس کی خدمت میں جان کھپا رہا تھا۔ اُس کے زمانے میں بھی حالت بدستور رہی، جب اس مسلمان کی موت کا وقت آیا تو اُس نے ایک جینی مذہب والے کو اپنی گدی پر بٹھا دیا جو اُس مسلمان کے ساتھ تمام عمر تلاشِ حق میں سرگرداں رہا تھا۔ اس جینی بزرگ کے زمانے میں بھی خوشحالی اور شادابی میں کوئی تغیر نہ ہوا۔ بلکہ پہلے کی طرح مواضعات کا ہر شخص اس بزرگ سے مستفید ہوتا اور اپنے دل کا مقصد حاصل کرتا تھا۔

اس جینی بزرگ نے ایک خاص دن یعنی جمعہ اس نے مقرر کر دیا تھا کہ قرب و جوار کے لوگ جمع ہوا کریں اور جس کی حاجت ہو اُس کو برلائے اس کے

علاوہ پند و نصائح بھی کرتا تھا۔ رشی، پادری اور مسلمان ان تینوں بزرگوں کی قبریں بھی اسی عمارت میں تھیں، انھیں قبروں سے یہ بیلیں بھی نکلی تھیں، اور انھیں قبروں کے قریب وہ جنگلی جھاڑیاں بھی تھیں جس وقت سے یہ بیلیں اور جھاڑیاں پیدا ہوئی تھیں اب تک اسی طرح شاداب اور عطر بیز تھیں۔ مگر عمارت کے منہدم ہو جانے سے ان قبروں کا کوئی نشان باقی نہ تھا۔

چینی بزرگ کا فیض زمانے تک جاری رہا۔ آخر کار اُس کی بھی موت کا وقت آگیا، دیہاتی لوگ اس کے گرد و پیش جمع ہو گئے۔ شور و شیون بلند کیا اور سب نے یک زبان ہو کر التجا کی کہ آپ کے بعد ہماری رہبری کون کرے گا، آپ کا تو کوئی چیلا بھی نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ مرنے کے وقت وہ چینی بزرگ گنبد کے طاق میں لیٹا ہوا تھا، لوگوں کے شور و شیون پر اُٹھ بیٹھا اور کہنے لگا کہ اے خدا اور پرماتما کے بندو، یہ سچ ہے کہ میرا کوئی چیلا نہیں جو میرے بعد تمہاری رہبری کرے۔ یہ تمہاری نہیں میری بدقسمتی ہے۔ مگر اے اللہ اور پرماتما کے بندو میں تمھیں کچھ نصیحتیں کرتا ہوں۔ (۱) کسی جیو کو تکلیف نہ دینا (۲) اگر کوئی جھوٹ بولے یا تمہیں دغا دے تو اُس کو اس گنبد کے پاس لانا، ان بیلوں اور جھاڑیوں کے درمیان اُسے بٹھانا اور اُس سے کلام کرنا، اگر اُس کے دوران کلام میں، ان بیلوں اور جھاڑیوں کے پھولوں سے خوشبو آتی رہے تو اُسے سچا اور معصوم خیال کرنا، اور اگر یہ خوشبو جاتی رہے تو اُسے جھوٹا اور دغاباز خیال کرنا۔ (۳) اپنے آپ سچے رہنا، ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھنا، اور جس طرح بھی ہو ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ اگر تمہارے قریب کوئی آکر آباد ہو جائے اُس کی ہر طرح دل دہی کرنا۔ مذہب پر کبھی نہ لڑنا ایک دوسرے کے مذہب کی عزت کرنا، ہر جمعہ کو عورتیں مرد بچے، اور بوڑھے اس گنبد کے چاروں طرف جمع ہوں اور اپنے پیدا کرنے والے کی تعریف کیا کریں، یہ کہہ کر اُس چینی بزرگ نے ایک آہ سرد کھینچی اور انتقال کر گیا۔

اس کے مرتے ہی بیلوں اور جھاڑیوں سے خوشبو کی تیز لپٹ آنے لگی، ہر طرف ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں، گاؤں والے بلک بلک کر رونے لگے، چینی بزرگ کی لاش دو تین روز تک محفوظ رکھی گئی، جب ہر گاؤں والا بوڑھا اور جوان زیارت کر چکا، اس کے بعد اس بزرگ کو بھی گنبد کے قریب دفن کر دیا۔

اب گاؤں والوں کا یہ دستور ہو گیا تھا کہ وہ ہر جمعہ کو صبح سے اس گنبد کے قریب جمع ہوتے تھے، دن بھر کھانے پکاتے تھے، دیہاتی گیت اور بھجن گاتے تھے۔ مٹھائی، پھول اور پیسے گنبد کے طاق پر چڑھاتے تھے، ہار بنا کر لٹکاتے تھے۔ چلتے وقت سب لوگ گنبد کو آنکھوں سے لگاتے تھے جس کو جو دعا مانگنا ہوتی تھی وہ گنبد کے قریب جا کر مانگتا تھا۔ سب لوگ رات کو انتہائی مطمئن گھروں کو واپس آتے۔ لوگ پہلے کی طرح خوشحال تھے، کھیتیاں اُسی طرح لہلہاتی تھیں۔ آپس میں وہی اگلی سی محبت تھی۔ ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھتا تھا۔ گاؤں میں جو بہو آتی تھی وہ سب کی بہو ہوتی تھی۔ اور جو داماد آتا تھا وہ سب کا داماد ہوتا تھا۔ خواہ کسی مذہب کے لوگ ہوں اُن میں محبت کی رشتے داری تھی۔ بڑے چھوٹے ایک دوسرے کو اُسی طرح پکارتے تھے جیسے اپنے کنبے والوں کو پکارا کرتے تھے۔

اجنبی کو اس امتیاز میں سخت دقت ہوتی تھی کہ مسلمان کون ہے اور ہندو کون ہے۔ یہ عیسائی ہے یا چینی، جب تک اُس کو بتایا نہیں جاتا تھا۔ بہت سی مذہبی رسمیں بھی اس گنبد سے وابستہ تھیں۔ جب کوئی نئی دلہن ان مواضعات میں آتی تو گھر میں داخل ہونے کے پہلے کل گاؤں والے جمع ہوتے اور اُس کو پہلے گنبد کی زیارت کرائی جاتی۔ جب کوئی دولہا ان مواضعات میں دولہن رخصت کرانے آتا تو گاؤں میں داخل ہوتے ہی اُسکو تمام گاؤں والوں کے ساتھ گنبد کی زیارت کرنا پڑتی تھی۔ جب تک یہ رسمیں نہ ادا ہو جاتیں اُس وقت تک کسی کی شادی مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی، خواہ وہ کسی مذہب کا انسان ہو۔

رفتہ رفتہ ان گاؤں والوں کے عقائد اس درجہ بڑھ گئے کہ اُس گنبد کو بغیر تخصیص مذہب سب نے اپنا معابد گاہ تسلیم کر لیا اور اپنے مذاہب کے ارکان سے بالکل ناواقف ہو گئے۔

اب ان گاؤں والوں کا صرف اتنا مذہب رہ گیا تھا کہ ہر جمعہ کو گنبد کے چاروں طرف جمع ہونا، دعائیں مانگنا، ہار اور پیسے چڑھانا، بھجن گانا اور گھر واپس چلے آنا۔ ان لوگوں کو اپنے اپنے مذاہب کی عبادتوں میں کسی قسم کا سکون یا لذت تک محسوس نہیں ہوتی تھی، گنبد کی کرامت کا شہرہ دور دور تک پہنچا۔ زائرین کا مجمع ہونے لگا۔ گنبد پر طلائی چادر چڑھائی گئی بادشاہِ وقت کو انتظام کے پولیس چوکی قائم کرنا پڑی۔ پہاڑی کے نیچے بہت سی

گنبد!

ابرار حسن خاں اثر ملیح آبادی

ممالک متوسط کے کسی گاؤں میں ایک بوسیدہ عمارت تھی۔ عمارت کو دیکھنے سے یہ پتہ چلتا تھا کہ اس پر کئی صدیاں گزر چکی ہیں۔

عمارت کے کل حصے منہدم ہو چکے تھے صرف ایک گنبد باقی رہ گیا تھا، جس میں ایک قدِ آدم طاق بنا ہوا تھا۔ یہ عمارت ایک بلند پہاڑی پر بنی ہوئی تھی۔ گنبد تک پہنچنے کے لئے سیڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ سیڑھیوں کے پتھر نئے تھے اور ان پر چونا پھرا ہوا تھا۔ گنبد اور گنبد کا طاق بھی چونے سے پُتا ہوا تھا۔ طاق کے اندر تیل کے چراغوں کی سیاہی تھی۔ گنبد جس پہاڑی پر واقع تھا اس کے چاروں طرف بڑے بڑے سیاہ پتھر پڑے ہوئے تھے۔ ان بڑے اور بھاری پتھروں پر ہزاروں نام کندہ تھے، یہ نام اُن لوگوں کے تھے جو اس گنبد کے دیکھنے کے لئے آئے تھے۔ اس گنبد میں کوئی تصویر یا بُت نہ تھا، بلکہ طاق کے بالائی حصے پر دو کیلیں گڑی ہوئی تھیں۔ جن پر لوگ ہار لٹکا دیا کرتے تھے، اس کے متصل منہدم شدہ حصوں پر ایک خاص قسم کی بیل دوڑی ہوئی تھی۔ جس کے پھولوں کی خوشبو سے پوری پہاڑی معطر رہتی تھی، اس کے علاوہ کچھ جنگلی جھاڑیاں بھی اس گنبد کے چاروں طرف تھیں جو ہمیشہ شاداب رہتی تھیں ان کے پھولوں میں اس قدر خوشبو ہوتی تھی کہ اگر کسی کے ہاتھ سے مس ہو جائیں تو کم سے کم ہاتھوں میں دو تین ہفتے تک خوشبو رہتی تھی، اس پہاڑی کے چاروں طرف دس بارہ موضع تھے جن میں ہندو مسلمان۔ عیسائی اور جینی مذہب کے پیرو رہتے تھے۔ اس مندر کے متعلق ان دیہاتیوں میں عجیب وغریب روائتیں مشہور تھیں، اور یہ روائتیں نسلاً بعد نسلاً یوں چلی آ رہی تھیں کہ اس بوسیدہ عمارت میں کئی سو برس گزرے کہ ایک بہت بڑا رشی رہا کرتا تھا وہ بڑا عبادت گزار تھا، متقی و پرہیزگار تھا، ہر شخص کی آرزو بر لاتا تھا۔ اور ہر بیمار کو اچھا کر دیتا تھا۔ اس کے قیام کی برکت سے قرب وجوار کے تمام مواضعات سرسبز و شاداب نظر آتے تھے۔ ہر شخص خوشحال رہتا تھا، دنیا کی کوئی فکر اُن لوگوں کو پریشان نہیں کر سکتی تھی۔ جب اِس رشی کی موت کا وقت آیا تو اُس نے اپنے تمام کمالات ایک عیسائی پادری کو بخش دیتے جو تلاشِ حق میں پا پیادہ سفر کرتا پھرتا تھا۔ آخر کار اس رشی کے کمالات اور سچائی کا اعتراف کرکے تقریباً پچیس سال سے اس کا چیلا بن چکا تھا۔ اس عیسائی پادری کے عہد میں بھی وہی خوشحالیاں رہیں۔ فصلوں کی شادابی میں کوئی فرق نہ آیا۔ تمام وبائی امراض سے یہ مخصوص مواضعات ہمیشہ پاک رہے، جب عیسائی پادری کا آخری وقت آیا تو اُس نے اپنے ایک مسلمان چیلے کو اپنی گدی پر بٹھا دیا جو ایک زمانے سے اس کی خدمت میں جان کھپا رہا تھا۔ اُس کے زمانے میں بھی حالت بدستور رہی، جب اس مسلمان کی موت کا وقت آیا تو اُس نے ایک جینی مذہب والے کو اپنی گدی پر بٹھا دیا جو اُس مسلمان کے ساتھ تمام عمر تلاشِ حق میں سرگرداں رہا تھا۔ اس جینی بزرگ کے زمانے میں بھی خوشحالی اور شادابی میں کوئی تغیر نہ ہوا۔ بلکہ پہلے کی طرح مواضعات کا ہر شخص اس بزرگ سے مستفید ہوتا اور اپنے دل کا مقصد حاصل کرتا تھا۔

اس جینی بزرگ نے ایک خاص دن یعنی جمعہ اس نے مقرر کر دیا تھا کہ قرب وجوار کے لوگ جمع ہوا کریں اور جس کی حاجت ہو اُس کو بر لائے اس کے

علاوہ پند ونصائح بھی کرتا تھا۔ رشی، پادری اور مسلمان ان تینوں بزرگوں کی قبریں
بھی اسی عمارت میں تھیں، انھیں قبروں سے یہ بیلیں بھی نکلی تھیں، اور انھیں قبروں
کے قریب وہ جنگلی جھاڑیاں بھی تھیں جس وقت سے یہ بیلیں اور جھاڑیاں پیدا
ہوئی تھیں اب تک اسی طرح شاداب اور عطر بیز تھیں۔ مگر عمارت کے منہدم
ہوجانے سے ان قبروں کا کوئی نشان باقی نہ تھا۔

چینی بزرگ کا فیض زمانے تک جاری رہا۔ آخر کار اُس کی بھی موت
کا وقت آگیا، دیہاتی لوگ اس کے گرد وپیش جمع ہوگئے، شور وشیون بلند
کیا اور سب نے یک زبان ہوکر التجا کی کہ آپ کے بعد ہماری رہبری کون
کرے گا، آپ کا تو کوئی چیلا بھی نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ مرنے کے وقت وہ چینی بزرگ گنبد کے طاق میں
لیٹا ہوا تھا، لوگوں کے شور وشیون پر اُٹھ بیٹھا اور کہنے لگا کہ اے خدا اور
پرماتما کے بندو، یہ سچ ہے کہ میرا کوئی چیلا نہیں جو میرے بعد تمہاری رہبری
کرے، یہ تمہاری نہیں میری بدقسمتی ہے۔ مگر اے اللہ اور پرماتما کے بندو
میں تمھیں کچھ نصیحتیں کرتا ہوں۔ (۱) کسی جیو کو تکلیف نہ دینا (۲) اگر کوئی جھگڑا
ہوئے یا تمہیں دغا دے تو اُس کو اس گنبد کے پاس لانا، ان بیلوں اور
جھاڑیوں کے درمیان اُسے بٹھانا اور اُس سے کلام کرنا، اگر اُس کے دوران
کلام میں ان بیلوں اور جھاڑیوں کے پھولوں سے خوشبو آتی رہے تو اُسے
سچا اور معصوم خیال کرنا، اور اگر یہ خوشبو جاتی رہے تو اُسے جھوٹا اور دغاباز
خیال کرنا۔ (۳) اپنے آپ سچے رہنا، ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھنا،
اور جس طرح بھی ہو ایک دوسرے کی مدد کرنا، اگر تمہارے قریب کوئی آکر
آباد ہوجائے اُس کی ہر طرح دلدہی کرنا۔ مذہب پر کبھی نہ لڑنا ایک دوسرے
کے مذہب کی عزت کرنا، ہر جمعہ کو عورتیں مرد بچے، اور بوڑھے اس گنبد
کے چاروں طرف جمع ہوں اور اپنے پیدا کرنے والے کی تعریف کیا کریں،
یہ کہہ کر اُس چینی بزرگ نے ایک آہ سرد کھینچی اور انتقال کرگیا۔

اس کے مرتے ہی بیلوں اور جھاڑیوں سے خوشبو کی تیز لپٹ آنے
لگی، ہر طرف ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں، گاؤں والے بلک بلک کر
رونے لگے، چینی بزرگ کی لاش دو تین روز تک محفوظ رکھی گئی، جب ہر
گاؤں والا بوڑھا اور جوان زیارت کرچکا، اس کے بعد اس بزرگ کو بھی
گنبد کے قریب دفن کردیا۔

اب گاؤں والوں کا یہ دستور ہوگیا تھا کہ وہ ہر جمعہ کو صبح سے اس گنبد
کے قریب جمع ہوتے تھے، دن بھر کھانے پکاتے تھے، دیہاتی گیت اور بھجن
گاتے تھے۔ مٹھائی، پھول اور پیسے گنبد کے طاق پر چڑھاتے تھے، ہار بنا کر
لٹکاتے تھے۔ چلتے وقت سب لوگ گنبد کو آنکھوں سے لگاتے تھے جس کو
جو دعا مانگنا ہوتی تھی وہ گنبد کے قریب جاکر مانگتا تھا۔ سب لوگ رات کو انتہائی
مطمئن گھروں کو واپس آتے۔ لوگ پہلے کی طرح خوشحال تھے، کھیتیاں اُسی طرح
لہلہاتی تھیں۔ آپس میں وہی اگلی سی محبت تھی۔ ایک دوسرے کو اپنا بھائی
سمجھتا تھا۔ گاؤں میں جو بہو آتی تھی وہ سب کی بہو ہوتی تھی۔ اور جو داماد
آتا تھا وہ سب کا داماد ہوتا تھا۔ خواہ کسی مذہب کے لوگ ہوں اُن میں محبت
کی رشتے داری تھی۔ بڑے چھوٹے ایک دوسرے کو اُسی طرح پکارتے تھے
جیسے اپنے کنبے والوں کو پکارا کرتے تھے۔

اجنبی کو اس امتیاز میں سخت دقت ہوتی تھی کہ مسلمان کون ہے
اور ہندو کون ہے۔ یہ عیسائی ہے یا چینی، جب تک اُس کو بتایا نہیں جاتا
تھا۔ بہت سی مذہبی رسمیں بھی اس گنبد سے وابستہ تھیں۔ جب کوئی نئی
دلہن ان مواضعات میں آتی تو گھر میں داخل ہونے کے پہلے کل گاؤں والے
جمع ہوتے اور اُس کو پہلے گنبد کی زیارت کرائی جاتی۔ جب کوئی دولہا ان
مواضعات میں دولہن رخصت کرانے آتا تو گاؤں میں داخل ہوتے ہی اُسکو
تمام گاؤں والوں کے ساتھ گنبد کی زیارت کرنا پڑتی تھی۔ جب تک یہ رسمیں
نہ ادا ہوجاتیں اُس وقت تک کسی کی شادی مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی، خواہ
وہ کسی مذہب کا انسان ہو۔

رفتہ رفتہ ان گاؤں والوں کے عقائد اس درجہ بڑھ گئے کہ اس
گنبد کو بغیر تخصیص مذہب سب نے اپنا معابد گاہ تسلیم کرلیا اور اپنے مذاہب
کے ارکان سے بالکل ناواقف ہوگئے۔

اب ان گاؤں والوں کا صرف اتنا مذہب رہ گیا تھا کہ ہر جمعہ کو
گنبد کے چاروں طرف جمع ہونا، دعائیں مانگنا، ہار اور پیسے چڑھانا، بھجن
گانا اور گھر واپس چلے آنا۔ ان لوگوں کو اپنے اپنے مذاہب کی عبادتوں
میں کسی قسم کا سکون یا لذت تک محسوس نہیں ہوتی تھی، گنبد کی کرامت کا شہرہ
دور دور تک پہنچا۔ زائرین کا مجمع ہونے لگا۔ گنبد پر طلائی چادر چڑھائی گئی
بادشاہِ وقت کو انتظام کے پولیس چوکی قائم کرنا پڑی۔ پہاڑی کے نیچے بہت

کرتی جاتی۔ آخرش وہ غمگین و اُداس سر جھکا کر بیٹھ گیا، اُس کے بعد سے کوئی سواری ہی نہیں آئی۔ وہاں سے مایوس ہو کر وہ سنیما گھر کے پاس آیا تھا۔

کھیل ختم ہوا۔ فلم نے آخری قومی گیت گایا، اندھیرے ہال میں روشنی ہوئی تماشائی اپنی کرسیوں کو چھوڑ کر باہر نکلے، بڑے بڑے امیر و دولت مند گاڑیوں اور موٹروں پر اپنے گھروں کو چل دئے۔ بعض پیدل ہی اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔ رکشہ والا ہر ایک کو دیکھ رہا تھا کہ شاید کوئی اُسے پکارے۔ مگر سنیما گھر بالکل خالی ہو گیا۔ اُس کے پھاٹک بند کر دئے گئے، سڑک بالکل سنسان ہوگئی۔ اور وہ بیچارہ وہاں کھڑا کا کھڑا ہی رہ گیا۔ اُس کی اُمید دل کی دل ہی میں رہ گئی، اُس نے ٹھنڈے سانس بھرے مایوسانہ انداز سے رکشہ اُٹھائے اور اپنے گھر کا رُخ کیا، صبح سے اس وقت تک ایک پیسہ بھی اس کے مُنہ میں نہیں گئی، اب رات کو بھی فاقہ سے سامنا کرنا تھا۔ وہ قسمت کے خلاف کر ہی کیا سکتا تھا۔ جو تقدیر میں لکھا تھا وہ بھگت رہا تھا، وہ سڑک پر اپنی پھوٹی قسمت پر دل ہی دل میں روتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

او رکشا، رکشا، کسی نے آواز دی۔

وہ مایوسیوں اور ناکامیوں میں اتنا گھرا ہوا تھا کہ آواز سنائی نہ دی، وہ آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا، جب پکارنے والے نے دوبارہ آواز دی تو اُس نے گھوم کر دیکھا، تھوڑے فاصلے پر کوئی شخص اُسے پکار رہا تھا اُس کی من مانی مراد بر آئی۔ اُس نے اپنا رُخ اُدھر پھیرا، بھوک کی وجہ سے اُس کا بدن جو نیم مردہ ہو رہا تھا اُس میں چستی و چالاکی کی لہر دوڑ گئی، وہ آن واحد میں پکارنے والے کے پاس پہونچ گیا۔

پکارنے والا ایک ہندوستانی انگریز تھا، وہ نشہ میں سرشار تھا، اُس کے مُنہ سے شراب کے بھبکے نکل رہے تھے۔ قدم لڑکھڑا رہے تھے، زبان بَرائی ہوئی تھی۔ "پا، پا، پارک سرکس" صاحب نے رکشہ کی گدی پر دھڑام سے گرتے ہوئے کہا۔

رکشہ والے نے چابکدستی سے رکشہ اٹھایا، مزدوری ملنے کی خوشی سے اُس کا دل بڑھ گیا تھا، اب وہ پیٹ بھر سکے گا، وہ جلدی جلدی دوڑنے لگا، وہ لڑ وار دکھا۔ پوچھتا، کھینچتا، جھگڑتا بڑی دقتوں کے بعد وہ پارک سرکس پہونچ گیا۔

"اُدھر روک لو" ایک گلی کی طرف اشارہ کرکے صاحب نے نشہ کے خمار سے چونک کر کہا۔

اُس نے رکشہ رکھدیا، وہ پسینے سے شرابور زور زور سے ہانپ رہا تھا، لیکن اُس کا دل خوش تھا، کیونکہ اب اُسے پیسے ملنے والے تھے، وہ صاحب کی طرف منہ کرکے کھڑا ہو گیا۔ صاحب اُترے، اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور جھومتے لڑکھڑاتے ہوئے بغیر مزدوری دئے چلے۔

"میری مزدوری تو دیتے جائیے صاحب" رکشہ والے نے کہا لیکن صاحب واہی تباہی بکتا چلا ہی جا رہا تھا، رکشہ والا ہاتھ پھیلائے اُس کے پیچھے گیا اور مزدوری طلب کرنے لگا۔

"ہم تمرا پیسہ دیدیا ہے، سور کا بچہ، بدمعاش" صاحب نے کہا۔

بھوک کی تیزی، محنت کی تھکن، مزدوری ملنے کی مایوسی، اس پر صاحب کی گالی، رکشہ والا غصّے سے بھر گیا۔ اُس نے صاحب کا ہاتھ تھام لیا، اور سختی سے مزدوری طلب کرنے لگا، صاحب اپنی انگریزیت اور اپنے سوٹ بوٹ پر نازاں تھا، ہندوستانی اُس کے غلام تو ہیں ہی، اُس نے رکشہ والے کے ایک سخت ٹھوکر رسید کی، ٹھوکر اُس کی پسلی پر لگی، وہ گر پڑا اور ضرب کی شدت سے کراہنے لگا۔ صاحب نے اپنا راستہ لیا، نیم شب میں جو تین چار آدمی جمع ہو گئے تھے، وہ بھی بغیر کچھ خیال کئے ہوئے اپنی راہ لگ گئے، رکشہ والا ایک طرف پڑا تھا۔ عالم خواب میں محو تھا، آسمان پر جگمگاتے ہوئے ستارے انسانوں کا حیوانی سلوک دیکھ رہے تھے۔

انسان! اے درندے انسان!

ہندوستان، اے بدبخت ہندوستان!

انساں کو زنِ فتنہ حیواں کر دے

زر سر کو عصائے رہبرِ ایماں کر دے

دولت کو فرشتوں سے بھی بالا تو بجا ہے

جب جائے اگر سمجھ تو شیطاں کر دے

(جوش)

نظیر اکبرآبادی

(یہ نظم ۱۰ر اگست ۱۹۴۳ء کو "آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن" دہلی سے براڈکاسٹ ہو چکی ہے)

بزمِ ہستی کر رہی ہے یاد وہ دورِ کہن ! نور سے محروم تھا جب مطلعِ شعر و سخن !

جب حقیقت تک نگاہِ شاعری پہونچی نہ تھی برقِ شعریت عیاں ہو کر کہیں چمکی نہ تھی

ذہنِ شاعر کی طرح نغمے رسا ہوتے نہ تھے قلب تاثیرِ سخن سے آشنا ہوتے نہ تھے

ہر نوا اگر بادۂ بے روح سے سرشار تھا یوں تو سب کچھ تھا مگر ناواقفِ اسرار تھا

حُسن کے ناظر تو اکثر تھے، کوئی ناقد نہ تھا کارواں تھے سینکڑوں لیکن کوئی قائد نہ تھا

کیف و کم ناآشنا تھے زندگی کے جام سے پھول چن سکتے نہ تھے گل خانۂ الہام سے

ناگہاں اک شاعرِ شیریں نوا پیدا ہوا

یعنی اک نقاشِ فطرت انجمن آرا ہوا

اے سخن کی مملکت کے تاجدارِ اوّلین اے نظیر، اے شاعرِ اعظم ادیبِ بہترین

سب سے پہلا میکشِ میخانۂ فطرت ہے تو عہدِ پیشیں کی نوائے روحِ شعریت ہے تو

بدمذاقی نے زمانے کی بھلایا تھا تجھے اور کچھ اہلِ وطن نے بھی مٹایا تھا تجھے

طلعتِ خود رنگ بن کر ہو گیا تو جلوہ گر ترجمانی کر رہے ہیں اب تری شمس و قمر

خود ترے الہام پاروں نے جگایا ہے تجھے مسندِ علم و ادب پر لا بٹھایا ہے تجھے

تیرے قدموں پر ہے سجدہ ریز لیلائے ادب حشر تک احساں ترے مانے گی دنیائے ادب

ہیں ترے اشعارِ سادہ ہر زباں پر آج بھی
چھا رہا ہے تُو زمین و آسماں پر آج بھی

اے نظیر اے سر زمینِ تاج کے ماہِ تمام
ثبت دامانِ ادب پر ہے ابھی تک تیرا نام

تیرے نغموں کی جہاں میں گونج باقی ہے ابھی
کائنات افروز تیری خوش مذاقی ہے ابھی

زندگی کے ہر بلند و پست کا ناظر ہے تُو
شاعرِ فطرت ہے نبضِ دہر کا ماہر ہے تُو

گلشنِ اُردو کا ہے تو باغبانِ اوّلین
تُو زبانِ سادہ کا ہے ترجمانِ اوّلین

دی جلا تُو نے مذاقِ شعریت کو عمر بھر
بارہا پہونچی حقیقت تک تری عالی نظر

زور حاصل تھا تجھے عکاسیٔ جذبات پر
سینکڑوں گلکاریاں فرمائیں حسیات پر

گوہرِ انوار سے ہستی کا دامن بھر دیا
چیر کر ذرّوں کا دل ہر راز ظاہر کر دیا

تھا نگاہوں میں تری ہر منظرِ شعر و ادب
مانتے ہیں سب تجھے پیغمبرِ شعر و ادب

اپنی فطری شاعری کا موجد و بانی ہے تُو
اعترافِ دہر فانی ہے کہ لافانی ہے تُو

ہر مذاقِ زندگی کو تُو نے روشن کر دیا
ڈھال کر اشعار میں ذرّوں کو ایمن کر دیا

دنگ ہے دُنیا تری جادو بیانی دیکھکر
عقل حیراں ہے تری گوہر فشانی دیکھکر

اے نظیرِ نامور پیدا نہیں ہمسر ترا
تا ابد چرچا رہے گا دہر میں گھر گھر ترا

تُو نے وہ موتی چنے ہیں دامنِ الہام سے
شاعری زندہ رہے گی صرف تیرے نام سے

آج بھی جمنا کی موجیں گیت گاتی ہیں ترے
"تاج" کی رعنائیاں نغمے سناتی ہیں ترے

منظر صدیقی اکبرآبادی

مراق و مالیخولیا کی فلسفیانہ تشریح

مُدیر

میں جب مندرجۂ ذیل مضمون کا ترجمہ کرنے بیٹھا تھا، اُس وقت یہ بات میرے حاشیۂ ذہن تک میں نہ تھی کہ اثنائے ترجمہ میں اس موضوع کے متعلق میں بھی اپنی طرف سے کچھ لکھوں گا۔ لیکن تھوڑا سا ترجمہ کرتے ہی میرا دماغ کھُل گیا، اور مراق و مالیخولیا کے متعلق میرے ذہن میں خیالات کا ایسا ہجوم ہوگیا کہ میں اس بات پر مجبور ہوگیا کہ یا تو اسی موضوع پر علیحدہ ایک مضمون طیار کرلوں، یا پھر اس ترجمے کے اندر ہی اپنے خیالات کو کھپا دوں۔

چونکہ ترجمے کے ذریعے سے میرے خیالات میں حرکت پیدا ہوئی تھی، اس لئے ادبی دیانت نے اس کی اجازت نہیں دی کہ میں علیحدہ مضمون لکھوں۔ بلکہ یہی مناسب معلوم ہوا کہ اِس ترجمے کے اندر اپنے خیالات کا اضافہ کردوں۔ چنانچہ جہاں جہاں مناسب معلوم ہوا میں نے صرف سطریں کی سطریں ہی نہیں، صفحے کے صفحے اس میں شامل کردئے۔ اس طرح کہ قارئین کو یہ پتا نہ چل سکے کہ اصل مضمون کس قدر ہے، اور مترجم کے اضافے کی مقدار کیا ہے۔

میں نے یہ تمہیدی چند سطریں اس لئے لکھدی ہیں کہ اگر کبھی کوئی میرے اِس ترجمے کو اصل مضمون سے ملائے تو اس کشمکش میں مبتلا نہ ہوسکے۔ ترجمے سے زیادہ جو جو عبارتیں اور تصرفات ہیں وہ کہاں سے اور کیوں کر آئے ہیں۔

(مُدیر)

رابرٹ برٹن

(۱)

شائستہ قارئین! میں اپنا اصلی نام نہیں بتانا چاہتا، اور میرا خیال ہے کہ آپ میں سے ہر فرد یہ جاننے کے لئے بےچین ہوگا کہ یہ گستاخی سے دوسری شخصیت کے نام کے ساتھ آنے والا کون حیلہ ساز بازی گر، یا ایکٹر ہے، جو اس بیباکی سے عالم کے فکر و نظر کے مشترک و آفاقی تھیٹر میں داخل ہوگیا ہے، یہ دراصل کہاں کا باشندہ ہے، اُس نے اپنے کو پس پردہ کیوں رکھا ہے، اور یہ کہنا کیا چاہتا ہے؟

لیکن اُس شئے کی تلاش نہ کیجئے جو مخفی ہے — کتاب کے مضامین اگر آپ کو پسند آئیں تو فرض کرلیجئے کہ اُس کا مصنف زمین پر نہیں، آغوشِ قمر میں ہے۔ آپ خواہ کچھ ہی کیوں نہ کریں، میں اپنے کو ظاہر نہیں ہونے دوں گا۔

میں نے اپنے کو ڈیماکریٹس صغیر کے نام سے پکاروں گا، تاکہ زیادہ آزادی کے ساتھ گفتگو کرسکوں۔

ڈیماکریٹس کی کتاب کا موضوع تھا "مراق و مالیخولیا" — جس کے چاروں طرف ہزاروں بہایم کی لاشیں پڑی رہتی تھیں جنھیں وہ چیرا پھاڑا کرتا تھا۔ — اِس چیر پھاڑ سے اُس کا یہ مقصد نہ تھا کہ وہ قدرت کی تحقیر کرے، بلکہ وہ یہ چاہتا تھا کہ حیوانات

کے جسم میں اُس عظیم کبیدگی کا محلِ وقوع معلوم کرے، جسے مراق اور مالیخولیا کہتے
ہیں، اور اس ذریعے سے یہ بات دریافت کرے کہ یہ موذی مرض نوعِ
انسانی کے اندر کیوں کر پیدا ہو کر نشو حاصل کرتا ہے، تاکہ وہ سب سے
پہلے تو اپنا علاج کرسکے، اور پھر اپنی ذات پر تجربہ کرنے کے بعد تحریر
کے ذریعے سے دوسروں کو بھی بتا سکے کہ وہ کیونکر اِس بلا سے محفوظ رہ
سکتے ہیں۔ —— اور یہی وہ نیک نیتی ہے جس کی رُو سے اِس کتاب
کا مصنف (جو اپنے کو ڈیماکرٹیس صغیر کے نام
سے پُکارنا چاہتا ہے) اِس بات پر کمرِ ہمت باندھ رہا ہے کہ وہ ڈیماکرٹیس کبیر کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اُس کی
ناتمام تصنیف کو تمام کرکے ایک نئی شکل میں پیش کردے۔

میں داد نہیں چاہتا، بلکہ بھلے آدمیوں کی لعنت و ملامت سے
خوفزدہ ہوں —— پھر بھی اللہ کے نیک بندوں کی کریانہ پسندیدگی
پر نگاہ رکھتے ہوئے اپنی مشقت کا نچوڑ پیش کر رہا ہوں۔ لیکن اُن تمام
بد زبانوں، لاعنوں، بہتان تراشوں اور یاوہ گویوں کو ٹھکرا دینا چاہتا
ہوں جو ہر نئی کتاب پر بے تکان بھونکنے لگتے ہیں۔ ابھی جو کچھ کہ میں نے
کہا ہے اگر اس کی ضرورت، یا اہمیت پر کسی کو اعتراض یا شک ہے، تو
میں اُسے یہ مشورہ دوں گا کہ وہ اِس عالمِ کون و فساد کا تھوڑا سا جائزہ
لے، اور جیسا کہ "سائیپرس" نے "ڈونیٹ" کو مشورہ دیا تھا، اگر وہ
یہ فرض کرے کہ وہ کسی نہایت ہی اونچے منارے پر پہونچا دیا گیا ہے جہاں
سے وہ اِس لرزہ براندام دنیا کا شور و غوغا سُن رہا اور اِس بوکھلائی
ہوئی زمین کے حوادث دیکھ رہا ہے —— تو مجھے یقین ہے کہ وہ یا تو
نوعِ انسانی پر قہقہے مارے گا، پھر اُس پر ترس کھا کر آنسو بہانے لگے گا،
اِن دو باتوں کے علاوہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔

وہ شخص جو دلِ آگاہ، اور چشمِ بینا رکھتا ہے، اُس کی نگاہ سے یہ حقیقت
پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ تبلیغیں کے درمیان، خوشامدوں، فریب کاریوں،
اداسیوں، مراقوں، شقاوتوں اور جنون انگیزیوں کا ایک ہنگامہ برپا
ہے۔ اور یہ دنیا کچھ نہیں، مگر ایک وسیع پیمانے پر تعمیر کیا ہوا پاگل خانہ جس
کے لنکا میں ہر پاگل باون گز سے کم کا ہوتا ہی نہیں —— اور اس کی شدید
ضرورت ہے کہ اس پاگل مخلوق کی اصلاح، اور اس پاگل خانے کی از سرِ نو
تعمیر کی جائے ——

سلطنتیں، اور حکومتیں پاگل ہیں —— شہر اور قصبے پاگل ہیں۔
جرگے کے جرگے، اور خاندان کے خاندان پاگل ہیں —— ہر صاحبِ عز
مخلوق اور ہر ذی حس و معقول ہستی پاگل ہے۔ تمام انواع، تمام طبقے اور
تمام نسلیں، بلکہ تمام سنین و شہور اور تمام صدیاں پاگل رہی ہیں، اور آج
بھی پاگل ہیں۔ حواس باختہ ہیں، بے شعری ہیں، اور مخبوط۔ اور یہ پاگل پن
اِس قدر مزمن و محکم ہے کہ عرش کے کنگروں سے لے کر فرش کے کنگروں تک،
سب کو، بلا استثنا سب کو دوا اور معالج کی شدید احتیاج ہے۔

اس کرۂ پر دماغی مریض کون نہیں ہے؟ اے اُلٹی کھوپڑی کے
عہد، اے مخبوط انسانو، اور اے مجنون اعمال! میں تمہیں کیا کہہ کر پکاروں؟
اور میں تمہیں راہِ راست پر کیوں کر لاؤں؟ اگر آج ڈیماکرٹیس زندہ ہوتا
اور ہمارے عہد کے اوہام، ہمارے مذہبی جنون، ہمارے مدعیانِ مذہب
کی بے دینی، ہمارے جیتار زریں اقوال، ہمارے برائے نام نیک اعمال،
ہمارے واعظوں کا اس قدر ہجوم، اور ہمارے افعال کی اتنی پستی کا
تماشا دیکھتا تو خدا جانے اُس نیک دل شخص کا کیا حال ہوتا۔

اگر وہ یہ دیکھتا کہ نوعِ انسانی صرف اس قدر خون بہا رہی ہے
کہ اُس سے پن چکیاں چل سکتی ہیں، اور آدمی ایک دوسرے سے یوں
گتھے پڑے ہیں گویا کسی بادشاہ کو مینڈھوں کی لڑائی کا تماشا دکھا رہے
ہیں، اور یہ تمام ہنگامہ کسی مقصدِ عظیم یا کسی امرِ خیر کے واسطے نہیں بلکہ اوہام
اور مذہبی جنون کے سوا اِن کی اور کوئی بنیاد ہی نہیں تو وہ غیظ و غم کی
شدت سے دیوانہ ہو جاتا۔

یہ ہمارے شائستہ اور تربیت یافتہ انسان جو احتیاط کے ساتھ
پروان چڑھائے گئے ہیں، جن کے جسم توانا، اور دماغ قوی ہیں، مذہبی
وسوسے اور روایتی اوہام انھیں شائستہ انسانوں کو قتل و غارت کی طرف
للکارتے ہیں۔ اور وہ رحم و انسانیت کے تمام جذبات سے عاری ہو کر
ایک دوسرے کا گلا کاٹنے لگتے ہیں، اور شیطان کو غذا بہم پہنچانے کی خاطر
آنِ واحد میں لاکھوں گردنیں کاٹ کر رکھ دیتے ہیں۔

اگر صرف ایک مرتبہ آنِ واحد میں لاکھوں گردنیں کاٹ کر ان
ظالم مراقیوں کی آنکھیں کھل جاتیں تو بھی غنیمت تھا، مگر یہ رسم و رواج،

اور وہم و خرافات پر مبنی "مقدس" جنگیں سالہا سال تک جاری رہتی ہیں۔ کوئی عہد اور کوئی دَور ان سے بچا نہیں رہتا، صدیوں اور قرنوں تک یہ کاٹ چھانٹ یہ شقاوت و قصاوت یہ شکست و ریخت اور یہ توڑ پھوڑ جاری، اور برابر جاری رہتی ہے۔

یہ کون ہے جس نے اس "امن پسند" "حلیم" "صاحب مہر و محبت" اور "پیدائشی رحمدل" انسان کو اس بات پر مامور کر رکھا ہے کہ وہ ہمیشہ بہائم کی طرح خون بہاتا، اور خود اپنی ہی تباہی کے سامان مہیا کرتا رہے؟

ہمارے حلقے میں کتنے قانون ساز اور کتنے قانون داں ہیں۔ مگر کس حقیر مقدار میں معدلت گستری کی جاتی ہے۔

ہمارے دائرے میں کس قدر خواتین ہیں، مگر کتنی بد نظمی پھیلی ہوئی ہے

ہماری سوسائٹی میں کتنی مخصوص عدالتیں ہیں، مگر وہ عدالتیں کتنی بے شمار بھول بھلیاں تعمیر کرتی رہتی ہیں۔

ہمارے دادرسی کے ایوانوں میں گوسفند پر فردِ جرم لگائی جاتی ہے، اور گرگ سزا کا حکم سناتا ہے۔

یہ ہے ہمارا مشہورِ عالم انصاف! ہمارے بازار کیا ہیں؟ صرف ایسے مقامات جہاں ایک دوسرے پر دام ڈالا جاتا ہے۔ اور جہاں ہر قدم پر چوہے دان کی طرح "انسان دان" لگے ہوئے ہیں۔

بازاروں کا کیا ذکر، خود ہماری یہ دنیا کیا ہے؟ ایک وسیع شور و غوغا کا مقام۔ ایک مسلسل و متصل برہمی و ابتری کا محل، ایک ہولناک دغا بازی کا عظیم تھیٹر، ایک لفنگے پن کا کارخانہ، ایک غرّاتا اور بھونکتا ہوا باڑا، اور ایک شر و فساد کا غضبناک ادارہ!

یہ دُنیا ایک میدانِ جنگ ہے، جہاں یا تو یہ لازمی ہے کہ تم کسی کو ہلاک کر ڈالو، یا کوئی تمہیں ہلاک کر ڈالے۔

یہ کرۂ ارض خود کامیوں کا ایک ایسا میدان ہے جہاں ہر شخص صرف اپنے لئے جیتا اور صرف اپنے ہی لئے مرتا ہے —— اس کرے کے بسنے والوں میں رحم، ہمدردی، دوستی، یگانگی، اُنس، اتحاد، اور محبت کا نام تک نہیں پایا جاتا۔

ہماری معبود تو صرف زر دیوی ہے، اور کوئی نہیں —— اور اُسی کی قربانگاہ پر ہم اپنے بھائیوں کے سروں کو بھینٹ چڑھاتے رہتے ہیں۔ یہ دنیا لیاقت، نیکی، دانش، جوہر، شجاعت، علم اور تدیّن کی بنا پر کسی کی عزت کرنے پر کبھی آمادہ نہیں ہوتی —— البتہ اس کے روبرو اگر زر، زمین، زور اور حکومت اور اقتدار پیش کر دو تو وہ دیکھتے ہی سجدے میں گر پڑے گی۔

تمام دنیا پاگل ہے، اس کا ہر رکن پاگل ہے، اس کا بچہ بھی پاگل ہے، اس کا جوان بھی پاگل ہے، اور اس کا بوڑھا بھی پاگل ہے۔

اگر میں کچھ چاہتا ہوں تو صرف اس قدر کہ اپنے اور دیگر ابنائے زمانہ کے معالج کی خاطر کسی حاذق طبیب کو تلاش کر کے نفسِ انسانی کو مراق کی بیماری سے نجات دلا دوں۔

مراق کے اسباب

(۳)

نوعِ انسانی کی مصیبتوں اور بربادیوں کا بنیادی اور تحریکی سبب غالبًا آدم و حوّا کا گناہِ اوّلین تھا۔

لیکن آدم و حوّا کو گناہ پر کس نے اُکسایا تھا۔ اس کا جواب کیا ہے؟ شیطان نے؟ تو پھر شیطان کو گناہ پر اُکسانے کی اجازت کس بارگاہ سے ملی تھی؟

اس کے علاوہ ہمارے ماں باپ یعنی آدم و حوّا میں گناہ پر اُکسانے والے کی بات مان لینے کا میلان کس قوت کا بخشا ہوا تھا؟

بہرحال ہماری بربادیوں اور مصیبتوں کا بنیادی سبب جیسا کہ کہا جاتا ہے، آدم و حوّا کا اوّلین گناہ، یا اُن کی پہلی مراق زدہ سرتابی و سرکشی تھی۔

آدم و حوّا کی اس مراق زدہ سرتابی و سرکشی کو شیطان کے اندر نہیں بلکہ خود آدم و حوّا کی فطرت کے اندر تسلیم کرنا چاہئیے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ آدم و حوّا نے یہ مراق اور یہ مالیخولیا اپنے بچوں کو وراثت میں دیا ہے، اور ان بچوں نے، دنیا کی تمام دوسری چیزوں کی طرح اُسے نشو و نما دے کر کیا سے کیا بنا دیا ہے۔ اس کے علاوہ ہم میں ایک فرد بھی ایسا نہیں جو کسی جسمانی یا نفسی نقص میں مبتلا نہ ہو۔

اس دنیا میں بے شمار بیماریاں ہیں، حادۂ و مُزمِن، خفیف و شدید، صحت پذیر و مہلک، غلط کار و آوارہ، پیچیدہ و سادہ، مخلوط اور مطلق اور ان تمام بیماریوں میں مالیخولیا سب سے زیادہ شدید ترین کھلنگا

کیونکہ یہ دیوانگی اور سگ گزیدگی وغیرہ سے بھی زیادہ قوی مرض ہے۔

مالیخولیا کا مریض اکثر و بیشتر افسردہ مضمحل، اور اُداس ہی رہا کرتا ہے، یہاں تک کہ اُس کے رقص و غنا میں بھی ایک پنہاں افسردگی کام کرتی رہتی ہے،

مالیخولیا یا تو مزاجی ہی ہوتا ہے یا عادات میں۔

مزاجی مالیخولیا وہ دقتی و آنی مالیخولیا ہوتا ہے جو کرب و غم کے ہر مختصر سے لمحے میں آتا جاتا رہتا ہے۔

ہم اُس شخص کو صید مالیخو کہتے ہیں جو سُست، غمگین، خلوت پسند، بوجھل اور بدمزا ہوتا ہے، اور یہ وہ طبیعت انسانی کی اُفتاد ہے جس سے کوئی آدمی مستثنٰی نہیں۔ کوئی خواہ کتنا ہی عقلمند، صابر، خوش مزاج، وسیع القلب، یا دیوتا نما ہو، اِس نوع کے مالیخولیا کے آنی حملوں سے اپنے کو کبھی محفوظ نہیں رکھ سکتا۔

مالیخولیا، یا مراق آمیز افسردگی، ایک سرد و خشک اور غلیظ و سیاہ قسم کی ترشی رطوبت ہے، جو طحال سے خارج ہوتی ہے، اور دو گرم رطوبتوں، یعنی خون اور صفرے کو روک کر انھیں ہڈیوں کی خوراک پر لگا دیتی ہے،

وہ افراد جو ضرورت سے زیادہ گرم یا سرد آب و ہوا میں رہتے ہیں یا وہ جو طبعًا خلوت گزیں ہوتے ہیں یا وہ زبردست طالب علم جو ہمیشہ مطالعہ و تفکر میں مصروف رہتے ہیں، یا وہ جو بے عمل زندگی بسر کرتے ہیں سب کے سب مالیخولیا سے وابستہ رہتے ہیں۔

اطبا کے حلقے میں مالیخولیا کے اسباب خصوصی کے متعلق چھ چیزوں کا بہت چرچا رہتا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ اگر کوئی مالیخولیا یا مراق، یا بالفاظ دیگر افسردگی وغیرہ میں گرفتار ہے، تو اُس نے مندرجۂ ذیل چھ چیزوں میں سے کسی ایک کو ضرور مجروح کیا ہوگا۔

(۱) خوراک (۲) ہوا (۳) ورزش (۴) خواب (۵) بیداری (۶) دماغ۔

کاہلی جو شرفا کا طرۂ امتیاز ہے، اور عدم ورزش جو جسم و دماغ کی نحوست، روگ کی دایا، شرارتوں کی موجد، تمام شرعی عیوب کی ماں، بیماریوں اور روگوں کا گھر، اور شیطان کا پاش و بستر ہے، یہ دونوں چیزیں مالیخولیا کو سب سے پہلے دعوت دینے والی ہوتی ہیں۔

اور وہ تمام افراد بھی کوئی کام نہیں کرتے، ضرورت کے وقت بھی محنت سے جی چراتے ہیں۔ ایک آدھ خط لکھنے کے علاوہ ہر کام سے بھاگتے اور آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ کسی حالت میں بھی مراق و مالیخولیا کے حملے سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اِس مرض کی زد پر سب سے زیادہ وہ امرا رہتے ہیں جن کی پوشاکیں نرم اور ڈھیلی ہوتی ہیں۔ جو سہریوں پر سوتے اور تیز سواریوں پر سوار ہوتے ہیں۔ جن کے سامنے سوچنے، سمجھنے اور غور کرنے کا کوئی موضوع نہیں ہوتا۔ جن کے لمحے کاہلی میں بسر ہوتے ہیں۔ ہر اُس نعمت کو پا لیتے ہیں جو اُنھیں مرغوب ہوتی ہے، اُن کی قسمت یہ ہوتی ہے کہ وہ کبھی خوش نہیں رہتے، نہ اُن کا جسم ہی درست ہوتا ہے، نہ دماغ۔ وہ جماہیاں لیتے، کراہتے، آہیں بھرتے، بدگمانیوں میں گرفتار رہتے، ہُشٌ کرتے، اور اُونگھتے رہتے ہیں۔ اُن کی طبیعت ہر وقت بدمزا رہتی ہے اور اپنی جان کے خوف میں گھلا کرتے ہیں۔ اور آخر کار مراق میں مبتلا ہو کر دنیا سے اُٹھ جاتے ہیں۔

نیز وہ افراد جو حسد، بغض، نفرت، انتقام، خوف، آزردگی اور شرم میں مبتلا رہتے ہیں۔ آخر کار مراق کی بدولت اپنے جسم اور دماغ کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے ہیں، اپنے کو پاش پاش کر دیتے ہیں، اور خود اپنی روحوں کا خون بہا دیتے ہیں۔

یہ مراق، جرگوں، گروہوں، اور خاندانوں کے درمیان بھی پایا جاتا ہے۔ فیل نشینوں سے لے کر گاڑی بانوں تک میں حسد و بغض کے جراثیم پرورش پاتے رہتے ہیں۔ جہاں تین آدمی موجود ہوتے ہیں۔ وہاں کی چوتھی چیز یہی معاندانہ جذبات ہوا کرتے ہیں۔ اور دلوں میں آگ لگی رہتی ہے۔

یہی نہیں، ہر زمانے کے بڑے بڑے وہ زبردست اہلِ قلم بھی اگر کچھا ہو جاتے ہیں تو اُن کے دلوں کو رشک و حسد کی آگ جلانے لگتی ہے۔

اور جب ہمارا یہ عالم ہے کہ تُو بارے سے لے کر اُمرا تک، اور جاہلوں سے لے کر علما تک سب کے سب بد مزاج، چڑچڑے، گمراہ، گستاخ، بدزبان، شریر، مغرور، وہم پرست، سازشی، حاسد اور خونی ہیں۔ اور ہم ایک دوسرے کو چیرتے، پھاڑتے، اور بھنبوڑتے رہتے ہیں۔ اور اپنے کو غیظ و غضب، کرب و الم، پریشانی و درماندگی کے ابدی جہنم میں جلاتے رہتے ہیں ـــــــ تو ان مراقی حالات میں ہم تہذیب و تمدن اور شائستگی و ثقافت کا کس منہ سے نام لے سکتے ہیں!

---

(۳) مراق و مالیخولیا کا علاج

معلوم نہیں کہ اس مرض موذی سے نجات حاصل کرنے کے لئے شیطان سے مدد طلب کی جائے یا خدا سے، بھوتوں سے رحم کی درخواست کی جائے کہ روح پاک سے۔

صحیح علاج کی طرف رہنمائی کرنا بہت مشکل معلوم ہوتا ہے، تاہم اگر بہتر غذا، صاف پانی، پاکیزہ ہوا، اُجلے کپڑے، ہوادار مکان اور باقاعدہ ورزش کے ساتھ ساتھ کسی طبیب حاذق سے، جو طب کے ساتھ ساتھ نفسیات کا بھی عالم ہو، رجوع کیا جائے ——— اور مناظر قدرت سے لطف اندوز ہونے، اور گاہ گاہ کسی اچھے رفیق کی معیّت میں دلچسپ سفر کرنے کا بھی اہتمام کیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ ایک طرف تو دوا اور غذا اور ورزش وغیرہ کے اثر سے، اور دوسری جانب تفریحی مشاغل، اور کثرت مطالعہ کے باعث آہستہ آہستہ اس مرض سے نجات حاصل ہو جائے۔

کیا کسی کو اس حقیقت سے انکار ہے کہ خوش جمالوں کے چہروں کا آب و رنگ بہتے ہوئے دریا کا خرام، لچکتے ہوئے پودوں کا رقص، اُبھرتے ہوئے سورج کی زرافشانی اور چمکتے ہوئے چاند کی سیم باری مراق کو بہ آسانی دُور کر سکتی ہے؟

اسی طرح اعلیٰ درجے کی کتابیں، نفیس بُت سازوں کے مجسّمے، رنگین نقاشوں کے نظر فریب نقوش، جوان مطربوں کے نغمے، اور بلند خیال شعراء کے شاہکار بھی ایسے تیر بہدف معالج ہیں جن کے سامنے مراق کا رنگ اُڑ کر رہ جاتا ہے۔

اگر تم سے بُرا سلوک کیا جا رہا ہے تو تم اُس بُرے سلوک کو خاموشی سے برداشت کر لینے کی عادت ڈالو، اور بُرا سلوک کرنے والے کے نفسیات پر غور کرنا شروع کر دو ——— اگر تم نے ایسا کیا تو تم بہت جلد اس نتیجے پر پہونچ جاؤ گے، کہ بُرا سلوک کرنے والا دماغی مریض ہے، اور اس دماغی مرض سے مجبور ہو کر وہ تم سے بُرا سلوک کر رہا ہے، اور جب یہ بات سمجھ میں آجائیگی تو تم پر اُس کے بُرے سلوک کا کوئی بُرا اثر نہ پڑ سکے گا، اور تم اُس شخص سے نفرت کرنے کے عوض اُس پر ترس کھانے لگو گے۔

اگر کوئی تم پر مستقل اعتراضات کر کے تمہیں تکلیف پہونچانا چاہتا ہے، اُس کے باب میں وہی نفسیات پر غور کرنے والا عمل کرو، اگر تم ایسا کرو گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کم سے کم اُس کا مذاق یا اُس کی افتادِ مزاج تم سے مختلف واقع ہوئی ہے، اور جب یہ بات تمہاری سمجھ میں آجائے گی تو اِس خیال سے کہ ہر شخص کو اپنی رائے کے اظہار کا حق حاصل ہے، تمہیں اُس کے اعتراضات سے ذرہ برابر بھی صدمہ نہ پہونچ سکیگا۔

لیکن یہ خیال نہ کرو کہ میں مجرم، بدنام، رُسوا، بے عزت، شکستہ دل، بدقسمت، محروم اور مبغوض و مغضوب ہوں ——— یہ صرف مجنونانہ وسوسے، احمقانہ خطرے، اور مراقیانہ اوہام ہیں، اور کچھ نہیں ———

اگر تم مجرم و روسیاہ ہو، تو تمام دنیا مجرم و رُوسیاہ ہے، اور اگر تم بدقسمت و محروم ہو تو تمام عالم بدقسمت و محروم ہے۔

جب حمام میں سب ننگے ہیں تو پھر شرمانے اور آنسو بہانے سے فائدہ کیا؟

لیکن تم روسیاہ یا بدقسمت کیونکر ہو سکتے ہو؟ روسیاہ اور بدقسمت تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ ہاں صرف وہ روسیاہ اور بدقسمت ہے جسے یہ وہم ہو گیا ہے، کہ میں روسیاہ و بدقسمت ہوں۔

میں پوچھتا ہوں یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اس وہم میں مبتلا ہو؟ کیا تمہارا معدہ خراب ہے، تم کاہل و بیکار آدمی ہو؟ تو پھر حساب یہ ہے کہ اپنا معدہ درست کرلو۔ کاہلی چھوڑ دو، اور کتاب و حیات کے ذریعے سے اپنی چشم تنگ کو فراوانی مطالعہ و کثرتِ نظارہ سے وا کر کے دیکھو، اُس وقت تمہیں پتا چلے گا کہ تم کس قدر خوش نصیب ہو، اور قدرت نے تمہیں کیا کیا خوبیاں عطا فرمائی ہیں۔

حسد سے دل، اگر افسردہ ہے، گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

مراقِ محبت

میں جانتا ہوں محبت کو میں نے "مراق" کہا ہے، اور اس سے اکثر حضرات کے ماتھوں پر شکنیں پڑ جائیں گی، اور وہ کہیں گے کہ میں نے ایک شئے کو اس کے مرتبے سے گرا دیا، اور ایک آسمانی چیز کو زمین پر پٹک کر

محبت کے کھلونوں سے ہمارے بڑے بڑے آدمی کھیلا کرتے ہیں ـــــ ہمارے بڑے بڑے فلسفی اِس کے ساحل پر سیپیاں تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔ ہرچند جلوت میں وہ اُس کے مخالف کی صورت سے سامنے آتے ہیں۔ لیکن خلوت میں اِس کے زانو پر سر رکھ کر سوتے ہیں۔

اِس ظالم مراقِ محبت، اور اس کے ظلم و جور پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے میرا خوف سے کانپنے لگتا ہے۔ یہ خطرناک اور مہیب مراق کتنے نظر فریب چہروں کو مکروہ، کتنے بھرے گھروں کو ویران، اور کتنے سلجھے ہوئے دماغوں کو ماؤف کر چکا ہے۔ اِس کے مظالم کی انتہا نہیں۔ اگر تم اس مراقِ محبت کے کوچے میں قدم رکھوگے تو تمہارے قدم کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی خدا کی بنائی ہوئی زمین پر نہیں پڑے گا، کیونکہ اِسی راہ میں شہیدانِ محبت کی لاشوں کے مختلف اجزا اس کثرت سے ایک دوسرے کے اوپر پڑے ہوئے ہیں کہ زمین کا ایک ذرہ بھی نظر نہیں آتا۔

اِس دائرۂ مراق میں ایک بات ایسی عجیب نظر آتی ہے جو اور کہیں مل ہی نہیں سکتی، اور اُس کے عجیب ہونے میں اس بات سے اور بھی حیرتناک اضافہ ہو جاتا ہے کہ اُس کی علت بہ آسانی سمجھ میں نہیں آسکتی۔

وہ عجیب اور نادر بات یہ ہے کہ شہزادۂ محبت میں پچاسی فیصدی سے زیادہ آپ کو وہ لوگ ملیں گے جن کا ذہن ہزاروں سے بہتر، اور جن کا دل لاکھوں سے وسیع تر ہوتا ہے۔

آخر یہ مراق اِس قدر نفاست پسند اور عالی خیال کیوں واقع ہوا ہے کہ ہمیشہ بلند و برتر ہی قسم کے آدمیوں کا شکار کرتا رہتا ہے، چونکہ اِس مرض کے بےشمار اسباب ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کا علاج بھی بےشمار طریقوں ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

اِس کے علاج کے مختلف طریقوں میں سے ایک علاج یہ بھی ہے کہ مریضِ محبت کو کسی ایسے حکیمانہ مزاج رکھنے والے کی مستقل نگرانی میں دے دیا جائے جو خالص حکمت کی رُو سے اسے ہمیشہ سمجھاتا بجھاتا رہے، اور اس قدر مشفقانہ شفقت اور مدبرانہ بصیرت کے ساتھ سمجھائے کہ مریض کو وحشت و ضد نہ پیدا ہونے پائے۔

[illegible] یہ خیال رہے کہ مریضِ محبت اوّل اوّل نصیحت سُنکر بڑی شدت سے [illegible] چیخیں مارے گا۔ اور وہ ناصحِ مشفق کی صورت سے بیزار ہو کر کسی قریب کے جنگل کی طرف بھاگ جانے پر تُل جائے گا۔ لیکن اگر انتہائی مندی سے نصیحت کا عمل جاری رہے، اور اس طرح کہ مریض کو نصیحت کا احساس بھی نہ ہو سکے۔ کبھی کبھی اُس کے جذبات سے ہم آہنگی بھی کی جائے۔ گاہ گاہ اُس کے ولولوں کا ساتھ بھی دیا جائے۔ اور اُسی اثنا میں ایک آدھ کلمہ ایسا بھی کہہ دیا جائے جو مریض کو اِس مراق کے خلاف تھوڑا بہت سوچنے پر بھی مجبور کر سکے تو ممکن ہے کہ مریض کے اندر آثارِ صحت پیدا ہونے لگیں۔

اگر اِس سے کام نہ چل سکے تو پھر ایسی مدبرانہ چالیں چلی جائیں کہ مریض کو اپنے معشوق کی سیرت پر اعتماد باقی نہ رہے ـــــ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ مریض کو اپنے معشوق کی سیرت سے اگر نفرت نہیں تو خوف تو ضرور ہی پیدا ہو جائے۔

اگر اِس سے بھی کام چلتا نظر نہ آئے تو پھر یہ چاہیئے کہ قُربِ محبوب اور ازدواج کے تمام عیوب کھول کھول کر بیان کئے جائیں ـــــ یہ حقیقتِ کبریٰ مریض کے ذہن نشین کی جائے کہ محبوب کا قُرب محبت کو ذبح کر ڈالتا ہے، اور صرف محبت ہی کو ذبح نہیں کر ڈالتا، خود محبوب کو بھی قتل کر دیتا ہے۔

مریض سے کسی ایسے اچھے موقع پر جس وقت کہ اُس پر دورے کی شدت نہ ہو نرمی کے ساتھ یہ سوال کیا جائے کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ یہ "دولتِ عشق" جو مہربان قدرت نے تمہیں ودیعت فرمائی ہے، یکسر تم سے چھین لی جائے اور تم صرف ایک معمولی انسان بن کر رہ جاؤ ـــ اور کیا تمہاری یہ خواہش ہے کہ یہ قلبِ رقیق، اور یہ چشمِ گریاں جس کی شیریں تلخیاں تمہیں اس دُنیا کے جہنم میں جنت کے باغ عطا کئے ہوئے ہیں۔ تم سے واپس لے لی جائے؟ اور کیا تم اِس بے پایاں سعادت، اور ایسی لامحدود خودکامی کو پسند کرو گے کہ محبوب کی قربت حاصل کر کے صرف تم ہی نہیں، بلکہ اپنے محبوب کو بھی ہر حیثیت سے ہلاک کر دو ـــــ اگر یہ باتیں، جن کی طرف میں نے ہلکا سا اشارہ کیا ہے، پوری منطقیانہ اور فلسفیانہ تشریح و توضیح سے بیان کر دی جائیں تو بہت ممکن ہے کہ مریض شفایاب ہو جائے۔

اس سلسلے میں معالج کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ ازدواج کی تمام ہولناکیاں بھی مریض سے بیان کر دے ـــــ اور اُس پر ثابت کر دے کہ ازدواج نام ہے ایک دائمی غلامی، اور ایک ابدی لعنت کا ـــــ یہ انسانی ولولوں اور اُمنگوں کے حق میں زہر کا حکم رکھتی ہے۔

وہ جو گھر کے اندر ایک عدد بیوی رکھتا ہے، گھر کے باہر نکل نہیں سکتا۔ یہ وہ چٹان ہے جس پر چڑھکر لاکھوں آدمی ہمیشہ کے لئے گم ہو چکے ہیں، اس طرح کہ آج تک اُن کا کوئی سُراغ نہیں مل سکا۔

ایک ذہین، طبّاع، اور آزاد منش انسان کے واسطے یہ زیبا نہیں کہ وہ اِس زنجیر کو اپنے پاؤں میں ڈال لے، کیونکہ یہ زنجیر صرف اُس وقت کٹ سکتی ہے، جب سانس کا ڈورا منقطع ہوتا ہے۔

اُسے یہ بات بھی سمجھائی جائے کہ اگر بیوی تُند خُو ہے تو گھر کی چار دیواری کے اندر ہمیشہ چلّانے اور غرّانے کی آوازیں گونجتی رہتی ہیں۔ اگر پڑھی لکھی اور سند یافتہ ہے تو اُس کا غرور اور فیشن گھر کو تباہ کر ڈالتا ہے، اگر جاہل ہے تو اُس کی گندگیاں اور بدسلیقگیاں گھر کو ناقابل سکونت بنا دیتی ہیں۔ اگر غریب گھرانے کی ہے تو بچوں کی ذہنیت اور گھر کے در و دیوار کو پست و زبوں حالت میں لے آتی ہے۔

اگر امیر گھرانے کی ہے تو دوستوں اور عزیزوں کی مہمانداریوں اور دیگر فضول خرچیوں کے باعث شوہر کا دیوالہ نکال دیتی ہے۔ اگر عمر میں بڑی ہے تو چند ہی مہینوں میں ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے، اور اگر شوہر سے عُمر میں بہت کم ہے تو پدرانہ فرائض ادا کرنا پڑتے ہیں، اور ساتھ ہی ساتھ رقیبوں کا ڈر بھی لگا رہتا ہے، اور ننانوے فیصدی رقیب ہی غالب آکر رہتے ہیں۔

اِس کے علاوہ اُسے یہ بھی سمجھا دینا چاہیئے کہ جس طرح اُس کرۂ ارض پر انسانوں کی صورت، چال ڈھال، وضع قطع، اور لب و لہجہ ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہوا کرتا ہے، اُسی طرح اُن کے مزاج، سیرت، اور سرشت میں بھی شدید اختلافات ہوتے ہیں۔ جب یہ حالت ہے تو ہم اپنی زوجہ سے یہ توقع کیونکر کرسکتے ہیں کہ زندگی کی ہر راہ، اور تدبیرِ منزل کے ہر دائرے میں وہ ہمارا ساتھ دے سکے گی؟ اختلافات رُونما ہوں گے، اور یقیناً رُونما ہوں گے، اور نتیجہ یہ ہوگا کہ آگے چل کر ہماری زندگی برباد اور ہماری عافیت تباہ ہو کر رہ جائے گی۔

اِسی کے ساتھ ساتھ مریض کو یہ بھی بتا دینا چاہیئے کہ محبت کا ازدواج ہمیشہ ناکام ہوا ہے۔ اور اس کی تاریخی ناکامی کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ شوہر کے عشق کی گرمی، اور زوجہ کے حُسن کی لطافت، کثرتِ قُرب اور ہجومِ مشاغل و تدبیرِ منزل کے باعث زیادہ مُدّت تک قائم نہیں رہا کرتی ــــ اور جب حُسن و عشق کے جذبات فنا ہو جاتے ہیں، اُس وقت شوہر یہ دیکھکر دنگ رہ جاتا ہے کہ پھُول تو کُمھلا چکا ہے، لیکن اُس کے کانٹے کی چبھن تا دمِ مرگ محسوس ہونے کے لئے باقی رہ گئی ہے۔

اگر یہ تدبیر بھی کام نہ دے تو چاہیئے کہ مریض کے واسطے کسی وقتی حسینہ کا بندوبست کر دیا جائے، جو اُس کے جذبات و جسم کو کمزور بنانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ دے۔

اگر یہ تیر بھی خطا کر جائے تو پھر سب سے زیادہ مناسب صورت یہ ہے کہ اُسے کسی بہانے سے طویل سیاحت میں مبتلا کر دیا جائے اور اِس قدر پے بہ پے سفر کئے جائیں، اور اِس بے دردی سے وقت ضائع کیا جائے کہ سیر و سیاحت میں کم سے کم دو ایک برس تو ضرور ہی گزر جائیں۔

چونکہ وقت ہر زخم کا مرہم، اور ہر چاک کا رفوگر ہے۔ اس لئے اس تدبیر سے بہت قوی اُمید ہے کہ مریض کو کامل شفا ہو جائے گی۔

تجھے جراحتِ دل کی ہے فکر کیوں اتنی
کہ خود ہے وقت کی فطرت میں ذوقِ بخیہ گری

اور اِس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سُن لیجئے۔ ؏

طُولِ فرقت سے بہت بیتابیاں کم ہوگئیں

اور اگر مریض اِن تمام تدابیر کے بعد بھی لا علاج ثابت ہو، کسی طرح معشوقہ کو فراموش نہ کرے، اور آزادی کی فردوس سے نکلکر پابندی و غلامی کی دوزخ ہی میں جانے پر مصر ہو تو اللہ کا نام لے کر معشوقہ سے اُس کی شادی کر دو۔ اور نتیجے کو بھی اللہ ہی کے سپرد کر دو۔ ؎

کشتی خدا پر چھوڑ دو، لنگر کو توڑ دو

برہمن سے خطاب

اے برہمن! یاد ہوگا وہ تجھے ماضی کا حال　　اپنے بھارت کے لئے تھا تو کبھی وجہِ جمال

قوم نے سمجھا تھا تو اس دیس کا اوتار ہے　　جو تری سیوا کرے بس اس کا بیڑا پار ہے

گرم ہو جاتا تھا خوں رگ رگ میں تیری دید سے　　شانتی ہوتی تھی ہر دل کو تری تقلید سے

تیری کٹیا ایک عالم کے لئے تھی درس گاہ　　وید لوبی سے تجھے فرصت نہ تھی شام وپگاہ

فی الحقیقت ہند میں تھی معتبر ہستی تری　　کیا ہوا اب کونسی اُفتاد تجھ پر آ پڑی

دیکھتے ہیں جہل کی جانب ہی مائل تر تجھے　　جب پرکھتے ہیں صداقت کی کسوٹی پر تجھے

عربدہ سازی کا تیری علم سب کو ہو گیا　　قدر تیری کم ہوئی تو، قوم کا دشمن بنا

چھوڑ کر مذہب کو تو نے جب سیاست کو لیا　　قوم کو رسوا کیا اور دیس کا اننیا کیا

اے برہمن! کوچ کر اب وقت تیرا ہو چکا　　راز مکاری کا تیری آشکارا ہو چکا

راجپوتوں کو ترے ہی مکر نے رسوا کیا　　پرتھوی کا راج تو نے ہی تہ و بالا کیا

تیری غداری ہی سے جے چند نے کھائی دغا　　ورنہ مٹنا اس کا اور اس طرح، ناممکن سا تھا

عہدِ عالمگیر میں تو حاملِ اعزاز تھا　　برہمی سلطنت کا بس یہی اک راز تھا

رام راجا کو اُبھارا قوم مسلم کے خلاف　　خوب مذہب کا چڑھایا اُس کی طینت پر غلاف

آہ سلطان کی ہوئی کیا گت میسور میں　　سازشوں سے کس کی کھوئی سلطنت میسور میں

جعلسازی کا نہیں یہ وقت ہے ایثار کا　　امن کا دے کر سبق ان سارے جھگڑوں کو مٹا

ہوش میں آ، پیکرِ ہندوستاں کی جان بن

اے برہمن! [illegible]

عبد الواسع عسقری، چپنگلوری (علیگ)

نظیر اکبر آبادی پر ایک سرسری نظر

نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی

جس طرح اردو غزل کا باوا آدم ولی دکنی ہے۔ اردو نظم کی اولیت کا سہرا نظیر کے سر ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ولی سے پہلے اردو میں غزل اور نظیر سے پیشتر نظم کا وجود نہ تھا۔ صرف یہ مقصود ہے کہ یہ چیزیں تکمیل کے اس درجے تک نہیں پہونچی تھیں، جہاں سے ایک مستقل شاہراہ نکلتی ہے۔ نظیر سے قبل بھی اردو میں بیانیہ شاعری کے نمونے ملتے ہیں، مگر ان کی حیثیت منتشر یا ضمنی تھی۔ نظیر نے اس قسم کی شاعری کو خاص موضوع بنا کر دادِ سخن دی۔ سودا کی طرح نظیر نے بھی جب قلم اٹھایا ہے تو متانت اور تہذیب کو بالائے طاق رکھدیا ہے، مگر سودا کا مقصود ہجا تھا اور نظیر نے محض واقعہ نگاری کی ہے، اور اس طرح نہ صرف اخلاقی محاسبے سے بری الذمہ ہو گیا ہے، بلکہ ہم حق بجانب ہوں گے، اگر یہ دعویٰ کریں کہ وہ امیل زولا، موپاسان اور دیگر یورپین حقیقت نگار اسکول کے علمبرداروں کا سرخیل ہے، جن کا نقطۂ نظر ہے کہ قبیح اور شرمناک اخلاقی کمزوریوں اور خامیوں کو اس قدر واضح کرو کہ ان کی عریانی دیکھکر طبیعت خود بخود متنفر ہو جائے۔ آرٹ سے نکل کر آج کل معاشرت میں بھی یہی آزادانہ اصول کارفرما ہے۔ مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ نظیر پہلا شخص ہے جس نے ان تحریکات کا بیج بویا۔ اس امر کی چھان بین دلچسپ ہوگی کہ آیا یورپین مفکرین کے دماغ میں یہ خیال نظیر سے علیحدہ پیدا ہوا یا اسی کی صدائے بازگشت ہے۔ حقیقت جو کچھ ہو افضلیت کا سہرا تاج نظیر ہی کے سر پر رکھا جائے گا، کیونکہ یورپ نے دوبارہ وہی دریافت کیا جو نظیر پیشتر پا چکا تھا۔

سودا کے علاوہ اردو کا دوسرا شاعر انشا ہے، جس میں اور نظیر میں مماثلت ہے۔ یہاں ہم یہ بحث چھیڑنا نہیں چاہتے کہ دونوں میں کس کو تقدم حاصل ہے۔ مگر سوسائٹی کا فرق مراتب یہاں بھی نمایاں ہے، گو آرٹ کے نقطۂ نظر سے نظیر منفرد ہے۔ کیونکہ سودا یا انشا نے جو کچھ لکھا تفنن طبع، تضحیک یا محض مسخرے پن کی بنا پر لکھا، لہٰذا مبالغے سے کام لیا۔ ان کے علی الرغم نظیر کی بیشتر نظمیں ایسی ہیں جن میں معمولی اور روزمرہ پیش آنے والے واقعات کو شاعر کی فن کاری نے صنعت کا بہترین مرقع بنا دیا ہے۔ جس عنوان پر قلم اٹھایا ہے۔ اس خوبی اور تفصیل سے بیان کیا ہے کہ تصویر پیشِ نظر ہو جاتی ہے۔ اور جس طرح عمدہ شاہکار مصوری یا بت تراشی دیکھکر خواہ وہ عریاں ہی کیوں نہ ہو۔ نفسانی خواہشات میں ہیجان اور ردِ عمل کے طور پر نفرت نہیں پیدا ہوتی۔ کیونکہ نقوش کی رعنائی، خطوں کا تناسب، رنگوں کی متنوع ہم آہنگی اور دوسری خوبیاں جاذب توجہ ہو کر دیکھنے والے کو ایسا مسحور کر دیتی ہیں کہ وہ خود پیکرِ حیرت و انبساط بن کر رہ جاتا ہے اسی طرح نظیر کی عریاں نظموں میں بھی کشش ہے۔ فرق اس قدر ہے کہ تصویر یا مورت میں اعضا کے صرف نقش ہوتے ہیں نام نہیں آتے، مگر شاعری میں نطق ناگزیر ہے اور تہذیب ان الفاظ کو زبان پر جاری کرتے ہوئے ابا کرتی ہے، یہ شاعری کا عیب نہ ہوا کیونکہ اگر آپ کسی برہنہ تصویر یا مجسمے کے اعضا کی تشریح کرنا چاہیں تو یہی صورتِ حال رونما ہوگی اور یہی مشکل پیش آئے گی۔ اس صورتِ حال سے قطع نظر ایسی نظموں میں جہاں تک آرٹ اور حقیقت نگاری

کا تعلق ہے اپنی آپ مثال ہیں۔ علاوہ بریں یہ مسئلہ ہمیشہ مابہ النزاع رہا ہے اور شاید رہے گا کہ آرٹ کو اخلاق کا پابند یا اس کے مطالبات سے بالکل آزاد و بے نیاز ہونا چاہیئے۔ البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ حقیقی آرٹ کتنا ہی عریاں کیوں نہ ہو، مخرب اخلاق نہیں ہو سکتا، یہ بات اور ہے کہ کوئی پہلے ہی سے بدکار و بد اطوار ہے یا بدکاری کی طرف مائل ہے، اور آرٹ کی اشاراتی اداکاریاں اُسے جامے سے باہر کر دیتی ہیں۔ اس کی ذمہ داری خود اُس کی طبیعت پر ہے، آرٹ کو الزام نہیں دیا جا سکتا۔ وہ آرٹ کی شوخ نگاریوں کے بغیر بھی گمراہ تھا یا گمراہ ہوتا۔ "ادنگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ"! میں تو یہاں تک عرض کروں گا کہ جو نام نہاد آرٹ دراصل اخلاق پر بُرا اثر ڈالے وہ آرٹ ہی نہیں، اُس میں کہیں نقص یا خامی ہے۔ ایک بات اور یاد رکھنے کی ہے، آرٹ سے بُرا اثر وہی لے گا جو آرٹ کا اداشناس نہیں ہے۔

کچھ لوگ ایسے ہیں جو آرٹ سے درستیٔ اخلاق کی توقع رکھتے اور آرٹ کی شوخیوں پر چشم نمائی کرتے ہیں۔ اُن کو چاہیئے کہ آرٹ کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں اور دخل در معقولات نہ دیں۔ آخر مُلّا، خطیب، واعظ کس لئے ہیں، اُن سے کسب فیض کریں اور آرٹ کو بخشیں۔

ہاں! تو فحشیات کو نظر انداز کر دینے کے بعد نظیر کا باقی کلام من حیث المجموع رنگین اور پاکیزہ خیالوں کا لہلہاتا ہوا باغ ہے، جہاں ایک سچے اور حقیقت آشنا شاعر کے جذبات و محسوسات خود بخود بلا تکلف و تصنع منظوم نغموں میں ڈھلتے نکلتے اور فضائے رنگ و بُو پر چھا جاتے ہیں۔ اور سننے والے کو بھی اپنی نشاط میں غرق کر دیتے ہیں۔

نظیر نے غزلیں بھی کہی ہیں، مگر ان میں کوئی امتیازی شان پیدا نہیں کر سکا۔ البتہ سادگی اور صفائی نے کہیں کہیں جاذبیت اور طبیعت کی شوخی نے تازگی و شگفتگی بہم پہونچا دی ہے۔

میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ نظیر پر کوئی سیر حاصل مقالہ سپرد قلم کروں، اُس کے کمال فن کے صرف دو نمونے پیش کر کے اس مضمون کو جس کی تشنگی و بے مائیگی کا اعتراف ہے ختم کر دوں گا۔

ایک شاعر کا عظیم ترین کارنامہ یہ ہے کہ اُس کی تخلیقی قوت مافوق الفطرت واقعات وضع کرنے کے بعد اُس کے مناسب ماحول قائم کرے اور پھر ان واقعات کو اس خوش اسلوبی سے ضبط تحریر میں لائے کہ اُن قائم کردہ اصول کے تابع ہو کر قیاس اور حقیقت سے مطابق ہو جائیں۔ فردوسی، انیس، ہومر، ڈانٹے، شیکسپیئر، ملٹن وغیرہ کی افضلیت کا راز اسی اختراعی قدرت کے کمال میں مضمر ہے، مثال کے طور پر ڈانٹے کو لیجئے، سیر دوزخ میں دور سے کچھ عالی شان گنبد نظر آتے ہیں۔ ورجل سے پوچھتا ہے کہ یہ کون خطہ ہے۔ ورجل جواب دیتا ہے کہ فاصلے نے تجھے دھوکا دیا۔ یہ گنبد نہیں بلکہ دیو پیکر انسان ہیں۔ جن کا صرف کمر سے اوپر کا حصۂ جسم نمودار ہے، باقی زمین میں دفن ہے۔ تاہم اتنی دور سے بھی اونچے اونچے گنبد معلوم ہوتے ہیں۔

غور فرمائیے کہ اس اسلوب ادا نے ان لوگوں کی جسامت کس قدر بڑھا دی، خصوصاً نصف جسم کو ڈھکنے کی ترکیب سے۔

ان میں سے ڈانٹے نمرود کا حلیہ بیان کرتا ہے، قد و قامت اور گھیر میں اُس صنوبر کے درخت سے مشابہ جو روم اتہ الکبریٰ میں سینٹ پیٹر کے گرجے پر چھایا ہوا ہے!

اسی قبیل کی مثالیں ہومر وغیرہ میں بھی ملتی ہیں۔

ڈانٹے کی ٹکر کا بلکہ اُس سے بدرجہا بہتر نظیر کا مندرجۂ ذیل بند ہے، اس تقابل سے امید ہے کہ ناظرین کو نظیر کی شاعرانہ عظمت کا صحیح اندازہ ہو، مہادیوجی پاربتی کو بیاہنے چلے ہیں۔ دیوتا کے ساتھ براتی بھی بلوان چاہیئے۔ ذرا اُن کی شان ملاحظہ فرمائیے:-

پھر ساتھ ہزاروں اور چلے جو بھوت، پریت اور راکھس تھے\
ڈیل اونچے اُن کے، برج نشن، اور سیس بھی اُن کے گُنٹ سے\
ہر بگڑ اُن کا سوسن کا، اور موٹے رسّوں کے پٹکے\
اور بگڑوں پر طُرّوں کی طرح تھے، ساکھو، بر کے بر، رکھے\
کوئی ننگے سر اور بال اُس کے، جوں بالش کھڑے، دس دس گز کے\
کوئی منڈ کوئی رنڈ اور کوئی بن پاؤں ناچے اور کودے\
کوئی ہاتھی رکھے کاندھے پر کوئی اونٹ بغل بیچ دبکائے\
کوئی ارنا بھینسا گود لئے، کوئی گینڈا سر پر بٹھلائے\
کوئی سانپ گلے میں لپٹائے، بیَن اُن کے دم پر دم چُھٹے\
کچھ لمبے سونٹے لوہے کے، کچھ ہاتھ لئے بھاری لکڑے\
کوئی گا دے پھاڑ گلا اپنا، کوئی نِرت کرے، چاک پھیری لے\
[illegible]

کوئی ہاتھ نچا دے رہ رہ کر، کوئی نین خوشی سے مٹکا دے
کوئی لمبے لمبے ڈگ رکھے، کوئی دس دس گز کی جست کرے

کچھ رنگ عجیب، کچھ ڈھنگ نئے، سب ہنس ہنس دھج دکھلاتے تھے
تھے دھوم مچاتے رستے میں، ہر آن اُچھلتے جاتے تھے

ایک تو بھوت، پریت اور راچھس یوں ہی ڈراؤنے نام ہیں، پھر ایسے لمبے سبے ڈول کہ جسم پر ہشت پہل بُرج کا دھوکا ہو۔ ہشت پہل کہنے سے جسم کا کاواک، بھدلسیلا اور گومڑے دار ہونا کس خوبی سے واضح ہوا ہے۔ سروں کو گنبد یا اُس کی بگڑی ہوئی شکل گمز نہیں کہا بلکہ ایک ثقیل مرادف گمٹ لایا، (گمٹی اسی کی تفسیر ہے) جس نے سروں کو بجائے کھوکھلا ہونے کے ٹھوس بنا دیا، کہ اُس وزن کے بلا تکلف متحمل ہی نہ ہوسکیں بلکہ پرکاہ سمجھیں جس کا تذکرہ بعد کو ہے۔ ان سروں پر سو سو من کے پگڑ بندھے ہوئے ہیں۔ کمر پٹکے موٹے موٹے رسّوں کے ہیں اور زینت کے لئے پورے پورے ساکھو کے درخت طرۂ دستار ہیں۔

"ساکھو، بڑ کے بر، ارکھے" اس ٹکڑے کی ترکیب اور نشست الفاظ ایسی ہے کہ ہر لفظ پر سامع کی حیرت و استعجاب میں پے در پے اضافہ ہوتا ہے، ساکھو! بڑ کے بر!! ارکھے!!!

اس کے بعد خیال اُن کی طاقت کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ جس طرح ہم آپ پھول توڑ توڑ کر پگڑی میں لگا لیتے ہیں یا لگا لیتے تھے یہ لوگ اُسی سہولت سے ساکھو کے پیڑ جڑ سے اُکھیڑ کر اپنے پگڑوں میں گھُرس، یا نظیر کی زبان میں اُڑس لیتے ہیں۔

متخیلہ کو پھر دھچکا لگتا ہے کہ شاعر نے ساکھو نے تناور درختوں کو کس آسانی سے پھولوں کے طروں میں منتقل کر دیا۔ خیال جھرجھری لے کے اُن قدوں کی طوالت کا اندازہ کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے جن کے سروں کے مقابل ساکھو کے لمبے لمبے درخت طرۂ دستار کے برابر ہوں۔ کیا یہ ادعا مبالغہ ہوگا کہ نظیر کی تخئیل سے ڈانٹے کی تخئیل لگا نہیں کھاتی؟

تصویر یوں ہی کیا کم رُعب آفریں تھی مگر نظیر کا آرٹ قناعت نہیں کرتا، اور کچھ "سر جھاڑ، منھ پہاڑ" لوگوں کو شامل کرتا ہے، جن کے بال بانس کی طرح اور وہ بھی دس دس گز کے لمبے بانسوں کی طرح کھڑے اور موٹے اور اُلجھے ہوئے ہیں۔ جن کے بال اتنے لمبے تھے، اُن کے قد کتنے ہوں گے؟ مساحت کا انحصار آپ کے خیال کی جولانی پر ہے۔ اس پر بھی ترقی کرتا اور ایسے لوگ لاتا ہے جن میں بعض ننگ دھڑنگ تھے اور بعض کے چار ابرو کا صفایا تھا: کوئی بن پاؤں ناچے اور کو دے " یہ ٹکڑا بداعت اسلوب کا ایسا شاہکار ہے جس کی تعریف ناممکن ہے۔ در اصل یہی وہ مقام ہے جہاں نظیر کی تخئیل ڈانٹے پر سبقت لے گئی ہے کیونکہ اُس نے مردوں سے چلنے پھرنے کی صلاحیت یہ کہہ کر سلب کرلی کہ کمر تک مٹی میں تپا ہوا تھا، نظیر نے اس دشواری پر بھی عبور حاصل کیا اور ایسے مشنڈوں کو بھی ناچتا کودتا دکھا دیا، لیکن "بن پاؤں" کہہ کر مافوق الفطرت عنصر کو شاندار اور معرکہ آرا طریقے سے قائم رکھا، گویا اُونچے اُونچے پہاڑ اُچھل رہے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ منظر کی ہیبت کو اس "بن پاؤں" کے ناچ نے دوبالا کر دیا۔ نظیر کی تخئیل اب بھی نہیں تھکتی، اجزائے تنوع بڑھاتی اور ان لوگوں کی طاقت اور جسامت کو یہ کہہ کر پہلے سے بھی زیادہ نمایاں کرتی ہے، کہ کوئی کاندھے پر ہاتھی بٹھائے تھا، کوئی بغل میں اونٹ دبائے تھا، کوئی ارنا بھینسا گود میں لئے تھا، کوئی گینڈے کو سر پہ چڑھائے تھا، کسی کے گلے میں سانپ لپٹے ہوئے تھے، اور متصل اُن کے پھن چومتا تھا، فن کا کمال دیکھئے کہ جس جانور کو جس حصۂ جسم سے متعلق کر دیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اُسی کے لئے خلق ہوا تھا۔ بعدہ ازاں ان لوگوں کی شوقین مزاجی دکھانے کو کسی کے ہاتھ میں لوہے کا لمبا سونٹا اور کسی کے ہاتھ میں بھاری لکڑا دیدیا ہے، براتی ہیں لہٰذا خوشی کا اظہار ضروری ہے۔ اور یہ "زندہ جنگل" گلا پھاڑ پھاڑ کے گاتا، ناچتا اور چکر گھنّی کھاتا ہے، یہاں کمال فن نے پھر معجز نمائی کی۔ گلا پھاڑ کے گانے کا اثر نہیں دکھایا، نہ اُس کی تشبیہ کسی چیز سے دی، کیونکہ ممکن ہی نہ تھی۔ مگر تخئیل اعتراف عجز کے بجائے اس طرح مظفر و منصور نکلتی ہے کہ چیخ کا ایک نیچا درجہ یعنی خوش فعلی کی قلقاری لے لی۔ یہ ایسی تھی جیسے ہاتھی کی چنگھاڑ۔ اسی پر گلا پھاڑ کر گانے کے بھیانک پن کو قیاس کر لیجیے۔ ہاتھوں کی جنبش، آنکھوں کی گردش اور اونچی اونچی پھلانگوں نے اس دل دہلانے والے منظر کی منظم بے ترتیبی اور عفریتیت پر ڈراپ سین کا کام دیا، بلکہ یوں کہئے کہ متحرک فلم کے پردے پر ایکٹر قریب آتے رہے اور بڑے ہوتے ہوتے یکایک غائب ہوگئے!

دیگر نظموں کے علاوہ کوئی تہوار، کوئی میلا، کوئی موسمی کیفیت ایسی نہیں۔

جس کی نظیر کے نادرہ کار قلم نے مصوری نہ کی ہو اور بلا تفریق مذاہب۔

ہولی ملاحظہ ہو ؎

حبب آئی ہولی رنگ بھری سو ناز و ادا سے مٹک مٹک
اور گھونگھٹ کے پٹ کھول دئیے وہ روپ دکھایا چمک چمک
کچھ مکھڑا کرتا دمک دمک، کچھ ابرن کرتا جھلک جھلک
جب پاؤں رکھا خوش وقتی سے تب پائل باجی جھنک جھنک
کچھ اُبھریں سینئیں ناز بھری، کچھ کُودیں آہیں تھرک تھرک

اس بند بلکہ پوری نظم میں نظیر نے اچھا دسے کام لیا ہے، جتنے الفاظ کاف پر ختم ہوتے ہیں اور مکرر آئے ہیں اُن میں لفظ ما قبل کا کاف ساکن کے بجائے متحرک کر دیا ہے۔ مثلاً پہلا مٹک بروزن نظر (یا فعل) نہیں بلکہ بروزن کیف (یا فاع) ہے، یوں نہ پڑھیے گا تو مصرعے موزوں نہ ہوں گے۔ اس تصرف نے نہ صرف ہولیاروں کا لہجہ پیدا کر دیا بلکہ منظر میں حرکت کے ساتھ کھٹکار، تھاپ اور موسیقی بھر دی۔ نیز یہ نادر اضافہ کیا کہ الفاظ کی اصوات سے معلوم ہونے لگا، جیسے ہڑک بج رہی ہے، جھرے برا رہے ہیں۔ ناچ گانا ہو رہا ہے، گردن کا ڈورا ہل رہا ہے۔ آنکھیں مٹک رہی ہیں، بھویں پھڑک رہی ہیں اور بیچ بیچ میں "ہولی ہے" اور "ارارا کبیرہ" کے نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ دوسرا شاعرانہ نکتہ یہ ہے کہ ہولی ہی کو ایک شوخ چنچل معشوقہ بنا کے پیش کر دیا ہے۔ اس طرح ایک غلغلہ، ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور یہی ہڑبونگ ہولی کا طرۂ امتیاز ہے۔

بقیہ نظم سنئے مگر پہلے بند اول کو پھر ایک مرتبہ مزے لے لے کے اور پہلی مٹک تھرک وغیرہ کو پنجابی لہجے میں بسکون اوسط ادا کیجیے، ورنہ موزونیت رخصت ہو جائے گی۔

(۲)

یہ رُوپ دکھا کر ہولی نے جب نین رسیلے ٹک مٹکے
منگوائے تھال گلالوں کے، بھر ڈالے رنگوں سے مٹکے
پھر سانگ بہت تیار ہوئے، اور ٹھاٹھ خوشی کے جھرمٹ کے
غل شور ہوئے خوش حالی کے اور ناچنے گانے کے کھٹکے
مردنگیں باجیں، تال بجے، کچھ کھنک کھنک، کچھ دھنک دھنک

(۳)

پوشاک چھڑکواں سے ہر جا تیاری رنگیں پوشوں کی
اور بھیگی جاگہ رنگوں سے ہر کنج، گلی اور گوشوں کی
ہر جانب زرد لباسوں سے ہوئی زینت سب آغوشوں کی
سو عیش و طرب کی دُھومیں ہیں، اور محفل میں مینوشوں کی
مے نکلی جام و گلابی سے، کچھ لہک لہک، کچھ چھلک چھلک

(چونکہ شراب کا ذکر ہے، لہک اور چھلک میں جو نرمی ہے اُس کا موازنہ مٹک وغیرہ کی کرختگی سے کیجیے اور نظیر کو صوتی الفاظ کے سلیقۂ انتخاب کی داد دیجیے)

(۴)

ہر چار طرف خوش وقتی سے دف باجے راگ اور رنگ ہوئے
کچھ دُھومیں فرحت عشرت کی، کچھ عیش خوشی کے رنگ ہوئے
دل شاد ہوئے خوش حالی سے، اور عشرت کے سو ڈھنگ ہوئے
یہ جھمکی رنگت ہولی کی، سب دیکھنے والے دنگ ہوئے
محبوب پری رو بھی نکلے، کچھ جھمک جھمک، کچھ ٹھمک ٹھمک

(۵)

جب خوباں آئے رنگ بھرے، پھر کیا کیا ہولی جھمک اٹھی
کچھ حسن کی جھمکیں ناز بھری، کچھ شوخی ناز و اداؤں کی
سب چاہنے والے گرد کھڑے نظارہ کرتے ہنسی خوشی
محبوب نشے کی خوبی میں، پھر عاشق اُپر گھڑی گھڑی (اُپر بسکون اول)
ہیں رنگ چھڑکتے سُرخی کے، کچھ لپک لپک، کچھ جھپک جھپک

(۶)

ہے دھوم خوشی کی ہر جانب اور کثرت ہے خوش وقتی کی
ہیں چرچے ہوتے عشرت کے اور فرحت کی بھی دھوم مچی
خوباں کے رنگیں چہروں پر ہر آن نگاہیں ہیں پڑتی
محبوب بھگوئیں عاشق کو اور عاشق ہنس کر اُن کو بھی
خوش ہو کر اُن کو بھگو دیں ہیں، کچھ اٹک اٹک، کچھ ہمک ہمک

(۷)

وہ شوخ رنگیلا یاں آیا جب ہولی کی کر تیاری
پوشاک سنہری زیب بدن اور ہاتھ چمکتی پچکاری

کی رنگ چھڑکنے میں کیا کیا اُس شوخ نے ہر دم عیاری
ہم نے بھی نظیرؔ اُس چنچل کو پھر خوب بھگویا ہر باری
پھر کیا کیا رنگ بہے اُس دم، کچھ ڈھلاک ڈھلاک، کچھ چھپک چھپک

ہولی پر ایک اور بہت دلکش نظم ہے۔ اس تہوار میں گالیاں بکنا جائز ہے۔ نظیرؔ نے مکمل تصویر کھینچی ہے، مگر اس قدر عریاں کہ بس توبہ ہے۔ فحش بند خارج کر دیئے گئے۔ جو صاحب چاہیں اصل کتاب میں پڑھ لیں۔

(۱)

جب پھاگن رنگ جھمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
اور دف کے شور کھڑکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
پریوں کے رنگ دمکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی
خم شیشے، جام چھلکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی
محبوب نشے میں چھکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

(۲)

ہو ناچ رنگیلی پریوں کا، بیٹھے ہوں گلرو رنگ بھرے
کچھ بھیگی تانیں ہولی کی، کچھ ناز و ادا کے ڈھنگ بھرے
دل پھولے دیکھ بہاروں کو اور کانوں میں آہنگ بھرے
کچھ طبلے کھڑکیں رنگ بھرے، کچھ عیش کے دم منہ چنگ بھرے
کچھ گھنگھرو تال چھنکتے ہوں تب دیکھ بہاریں ہولی کی

(۳)

سامان جہاں تک ہوتا ہے اس عشرت کے مطلوبوں کا
وہ سب سامان مہیا ہو اور باغ کھلا ہو خوبوں کا
ہر آن شرابیں ڈھلتی ہوں اور ٹھٹھ ہو رنگ کے ڈوبوں کا
اس عیش مزے کے عالم میں اک غول کھڑا محبوبوں کا
کپڑوں پر رنگ چھڑکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی

(۴)

گلزار کھلے ہوں پریوں کے اور مجلس کی تیاری ہو
کپڑوں پر رنگ کے چھینٹوں سے خوش رنگ عجب گلکاری ہو
منہ لال، گلابی آنکھیں ہوں اور ہاتھوں میں پچکاری ہو
اور وہ رنگ بھری پچکاری انگیا پر تک کر ماری ہو
سینوں سے رنگ ڈھلکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی

(۵)

اُس رنگ رنگیلی مجلس میں وہ رنڈی ناچنے والی ہو
منہ جس کا چاند کا ٹکڑا ہو اور آنکھ بھی مے کی پیالی ہو
بدمست بڑی متوالی ہو، ہر آن بجاتی تالی ہو
مے نوشی ہو، بے ہوشی ہو "بھڑوے" کی منہ میں گالی ہو
بھڑوے بھی "بھڑوا" بکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی

(۶)

اور ایک طرف دل لینے کو محبوب بھویّوں کے لڑکے
ہر آن گھڑی گت بھرتے ہوں، کچھ گھٹ گھٹ کے، کچھ بڑھ بڑھ کے
کچھ ناز جتاویں لڑ لڑ کے، کچھ ہولی گاویں اڑ اڑ کے
کچھ لچکے شوخ کمر پتلی، کچھ ہاتھ چلے، کچھ تن پھڑکے
کچھ کافر نین مٹکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی

(۷)

یہ دھوم مچی ہو ہولی کی اور عیش مزے کا جھکڑ ہو
اس کھینچا کھینچ گھسیٹ اوپر بھڑوے رنڈی کا پھکڑ ہو
معجون، شرابیں، ناچ، مزا، ٹکیا، سلفا، ککڑ ہو
لڑ بھڑ کے نظیرؔ بھی نکلا ہو، کیچڑ میں لتھڑ پتھڑ ہو
جب ایسے عیش مہکتے ہوں، تب دیکھ بہاریں ہولی کی

ازالۂ غلط فہمی

عطاء اللہ ۔ پالوی

یہ مضمون جس وقت آیا، اتفاقاً "کشاف" صاحب بھی آگئے، اور انھوں
نے اِسے پڑھکر ایک نوٹ لکھدیا جو اس مضمون کے آخر میں درج
کیا گیا ہے ۔ فیصلہ قارئین پر چھوڑا جاتا ہے۔ (مُدیر)

گذشتہ ماہ کلیم کے مئی نمبر میں "غزل گوئی" پر ایک انتقامی مضمون شائع ہوا ہے جس میں مضمون نگار نے حضرت آزاد انصاری پر بارش عنایات کی ہے، صاحب مضمون کون ہیں؟ یہ بتانا مشکل ہے، کیونکہ جب خود مضمون نگار کی عصمت مآبی نے اُنھیں اپنا نام ظاہر کرنے کی اجازت نہ دی اور وہ "نقاد" کا نقاب ڈال کر تشریف لائے ہیں تو اب کس کو غرض پڑی ہے جو اس کی تفتیش میں سرگرداں ہو؟ مضمون کیسا ہے اور کس جوش وخروش کے ساتھ لکھا گیا ہے یہ صرف دیکھنے ہی سے تعلق ہے۔ مناسب تو یہ تھا کہ اُس کے جواب میں "خاموشی" اختیار کی جاتی، لیکن حضرتِ فراق کی منچلی طبیعت نہ مانی، اور اُنھوں نے "خاموشی" پر "دنداں شکن جواب" کو فوقیت دیا، چنانچہ ان کا یہ مضمون "نگار" جولائی نمبر میں شائع ہوا ہے اور گو یہ مضمون بھی گرمی سے خالی نہیں مگر جو چیز قابلِ التفات ہے وہ فراق کی قوتِ تنقید ہے، رابرٹسن نے "تنقید" کی تعریف یہ کی ہے کہ "تنقید انسانی معلومات کے تمام شعبوں کے متعلق مقابلہ کرنے یا خیالات کے ٹکرانے کے عمل کو کہتے ہیں" بلاشبہ یہ تعریف فراق کے تنقیدی مضمون پر صادق آتی ہے۔ مگر اس سلسلے میں مجھے بھی کچھ عرض کرنا ہے۔

حضرتِ فراق کا (اُن کے مضمون میں) خیال یہ ہے کہ "نقاد" اور جوش کے مضمون (سلسلۂ غزل گوئی) میں غیر معمولی مشابہت ہے، نیز اُن کے الفاظ "حضرتِ جوش نے اپنے نام سے غزل گوئی کے خلاف ایک مضمون سپردِ قلم کیا تھا" سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُنھیں "نقاد" کے پردہ میں خود جوش کا چہرہ نظر آتا ہے۔ ممکن ہے کہ اُن ہی کا خیال صحیح ہو، اس لئے جب تک ہمیں اصل حقیقت کی خبر نہ ہو حضرتِ فراق کے اس قول کی تکذیب کرنی حماقت ہے۔ لیکن جہاں تک ہم نے دونوں کا موازنہ کیا ہمیں کوئی قوی دلیل نہ مل سکی۔ نیز جہاں تک جوش کی طبیعت کا انداز مجھے ملا ہے، یا یہ کہ جوش جس قدر بیباک اور آزاد خیال واقع ہوئے ہیں اُسے دیکھتے ہوئے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم دونوں کو دو الگ ہستی سمجھیں۔ اور اگر واقعی یہ حقیقت ہے کہ "جوش" اور "نقاد" ایک ہی ہیں تو میرے خیال میں حضرتِ جوش کو یہ عروسانہ حجاب زیب نہیں دیتا۔ ع

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

والی ترکیب ایک شاعرِ انقلاب کے لئے اگر حد درجہ نامناسب نہیں تو مہمل ضرور ہے۔ بہرکیف کلیم جون وجولائی کے مشترک نمبر میں بھی ایک "انتقادی" مضمون شائع ہوا ہے جس کی سُرخی ہے "اقبال وپیام اقبال" اس مرتبہ آزاد کی بجائے اقبال نشانۂ ملامت بنائے گئے ہیں۔ اور شرمیلے مضمون نگار "کشاف" کا لقب اختیار کرکے "تنقید" کے اکھاڑے میں بدانست خود اس طرح کودے ہیں کہ

کوداکوئی یوں گھر میں ترے دھم سے نہ ہوگا

اور سپر اقبال کی بزعم خود وہ یوں کھولی ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ مگر ستم ظریفی دیکھیے کہ اقبال کی پول وہ شخص کھولنے کی کوشش کر رہا ہے جو اپنا نام تک کھولنے سے شرماتا ہے؛ بہرحال مضمون کی نوعیت کہہ رہی ہے کہ صاحبِ

مضمون صرف ذہن ہی نہیں بلکہ اُن کے سینے میں جوشِ تنقید اس طرح موج مار رہا ہے کہ گویا دورِ حاضرہ کے تمام مشاہیر شعراء پر (بلحاظ حروفِ تہجی) ایسی تنقید کریں گے جو کسی طرح یہ نہ معلوم ہو کہ تنقید نگار پر "رعب" طاری ہے۔ ایسی صورت میں اگر غیر مناسب نہ ہو تو ہم نہ صرف حضرتِ کشاف بلکہ حضرتِ جوش کی خدمت میں بھی مودبانہ کچھ عرض کریں۔

~~~~~~~~~~

حضرتِ جوش مدیر کلیم نے "کلیم" کے اجراء کے جو مقاصد گنائے ہیں اور اس کی توسیع اشاعت کی کوشش کو جن وجوہ سے بمنزلہ فرض کے ضروری قرار دیا ہے اُن میں درجۂ اولیت صرف اس مقصد کو ہے کہ

"اِس کے ذریعے سے جن خیالات کی اشاعت کی جاتی ہے وہ زیادہ سے زیادہ افراد تک پہونچ سکیں"

اگر واقعی حضرتِ جوش اپنے اس قول پر ثابت قدم ہیں تو اُن کی خدمت میں التماس ہے کہ اگر کلیم کے خیالات کی اشاعت حضرتِ "کشاف" کی اس زبان میں ہوئی جو اُن کے مضمون میں جلوہ دکھا رہی ہے تو زیادہ سے زیادہ پانچ فیصدی اردو داں اِسے سمجھ سکیں گے ورنہ کس کو غرض پڑی ہے کہ کلیم کی خریداری کے ساتھ ساتھ ایک ایسے شخص کی تلاش میں بھی زحمت اُٹھائے جو اُسے پڑھکر سمجھائے؟ یا کسی کا سر پھرا ہے جو اس وقت جب کہ پیٹ بھر کر کھانا بھی نہیں ملتا۔ کلیم کی خریداری کے ساتھ ساتھ ایک اچھی لغت بھی خریدے؟ کیونکہ حضرتِ کشاف کے مضمون کی شاید ہی کوئی سطر ایسی ہو جس میں بڑے بڑے الفاظ و تراکیب کے استعمال سے آزاد و دنیا ز کو بدالنست خود شکست فاش نہ دی گئی ہو۔ حد تو یہ ہے کہ حضرتِ کشاف نے ایک جگہ "حجابِ غلیظ" لکھکر "غلیظ" کے عربی لفظ کو اُسی معنی میں استعمال کیا ہے جس معنی میں عربی میں مستعمل ہے، یعنی "موٹا" کے، کیا ایسی صورت میں جب کہ اردو زبان کو آسان سے آسان تر بنانے کی کوششیں جاری ہیں۔ کلیم کا یہ طرزِ عمل خود اُس کے حق میں مفید ہو سکتا ہے؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے دَور میں جب کہ ہماری قوم میں تعلیم ہی کی کمی ہے ایسے "ادق" مضامین کی اشاعت لوگوں کے دلوں میں کلیم کی خریداری کا جذبہ پیدا کر سکے گی؟ بہر حال! جوش کے بعد جنابِ کشاف سے یہ عرض ہے کہ کیا انھیں فرانس کے مشہور تنقید نگار "سینٹ بیو" کے اِس قول کی کہ "پڑھنا، سمجھنا، محبت کرنا اور دوسروں کو بھی اس پر مجبور کرنا تنقید کہلاتا ہے" تردید کرنی منظور ہے؟ یا وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ اُن کی عربی اور فارسی دانی کا سکّہ لوگوں پر بیٹھ جائے؟ تنقید کا یہ طریقہ ایک دم غلط ہے، کہ اُسے ایک ایسا گورکھ دھندا بنا دیا جائے جو تنقید نگار اور پبلشر کے سوا اور کوئی سمجھ ہی نہ سکے، مخصوص ایسے مشاہیر پر، جن کی شہرت کا آفتاب نصف النہار تک پہونچ چکا ہے۔ تنقید کرنے میں وہ زبان ہرگز نہ استعمال کرنی چاہیئے جو ایک خاص حلقہ تک محدود ہو۔ کیونکہ جو چیز وہ دکھانا یا پیش کرنا چاہتا ہے وہ اُس وقت تک قابل قبول نہیں ہو سکتی جب تک کہ عام فہم نہ ہو، بہر حال یہ ایک مشورہ تھا جو مخلصانہ عرض کیا گیا اب ؎ مرضی تری پسند کر یا نہ پسند کر

~~~~~~~~~~

حضرتِ کشاف تمہیدِ مضمون میں فرماتے ہیں ——

"آج ہم اقبال پر مرعوبیت اور نیز تعصب سے خالی ہو کر خالص تنقید کی غرض و غائت سے ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں"

اِس تمہید کے بعد اقبال پر جو اعتراض ہے وہ یہ ہے کہ ——

"اقبال ہندوستانی وطنیت کے نقیب کی حیثیت سے ملک کی محفل ادبی میں داخل ہوئے، اور اس بلند آہنگی سے کہ

یونان و مصر و رُومہ سب مٹ گئے جہاں سے
باقی ہے لیکن اب تک ہندوستاں ہمارا

لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اقبال کے ساز کے اس پردہ کا سازِ موت بج گیا۔ اور وہ ایک گوشۂ تخصیص میں آکر بڑے واضح و قاطع اسلامی شاعر بن گئے"

مکمل آٹھ صفحے کا مضمون اسی اجمال کی تفصیل ہے، اور گویا یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اقبال کی وطنیت سے علیحدگی ایک ایسا گناہ ہے جو کبھی شرمندۂ معافی نہیں ہو سکتا۔ اب قبل اس کے کہ ہم اقبال کی وطنیت کے متعلق کچھ عرض کریں ضرورت اس کی ہے کہ اس تمہیدی اقتباس پر بھی روشنی ڈالی جائے۔

"تنقید" کا لفظ استعمال کرنے کے بعد حضرت کشاف نے اقبال کی وطنیت پر جو اعتراض کیا ہے اور فصاحت و بلاغت کے جو دریا بہائے ہیں، اُس نے

عوام میں یہ غلط فہمی پیدا ہونے کا ڈر ہے کہ تنقید کے معنی اعتراض کرنے کے ہیں لہٰذا التماس یہ ہے کہ جو صاحب ایسا سمجھتے ہیں وہ "بازاک" کے اس قول کی تصدیق کرتے ہیں کہ

"تنقید نگار وہی لوگ ہیں جو ادب اور فنونِ لطیفہ میں
کوئی درجۂ کمال حاصل نہیں کر سکتے۔"

حالانکہ دراصل بقول حضرتِ زؔور

"تنقید اُس فن کو کہتے ہیں جس میں دوسروں کی حرکات و
اقوال پر انصاف کے ساتھ فیصلے صادر کئے جاتے ہیں
یا یہ کہ صحیح اور غلط، اچھے اور بُرے اور حق و باطل کے
درمیان فرق کرنا دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ
کر دکھانا تنقید ہے۔"

اب اگر یہ صحیح ہے تو اِس قول کے مطابق حضرتِ کشّاف کی حیثیت تنقید نگارہ کی نہیں بلکہ تنقیص نگار کی ہوئی جاتی ہے۔ اب آیئے اصل موضوع کی طرف حضرتِ کشّاف کا سارا کشف "اقبال کی وطنیت سے بیزاری" پر اظہارِ خفگی میں ظاہر ہوا ہے۔ یہ ایک ایسا پامال مضمون ہے جس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے حضرتِ کشّاف کو نہ معلوم ہو تو یہ دوسری بات ہے، ورنہ اور لوگ جانتے ہیں کہ اور تو اور خود حضرتِ اقبال سیالکوٹی کے ہم وطن حضرت اثر سیالکوٹی نے "اقبال کی وطنیت سے بیزاری" پر اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے کہ

تجھے فلسطین و قرطبہ سے بڑی محبت ہے مانتا ہوں
مگر ہے گنگا کی سرزمین سے سلوک تیرا مخاصمانہ

اور پھر آگے چل کر یہاں تک کہہ دیا ہے کہ

تو فخرِ ہندوستاں نہیں ہے تو شاعرِ ایشیا نہیں ہے
تو فرقہ پرور ہے فتنہ زا ہے برنگِ اعجازِ شاعرانہ

اور پھر اُس پر مدینہ نے جو حاشیہ آرائیاں کی ہیں وہ تو دیکھنے ہی کی چیز ہے، غرض اسی طرح اکثر و بیشتر اس عنوان پر لکھا جا چکا ہے اور اس موضوع پر اتنی بحثیں ہو چکی ہیں اور سوال و جواب میں اس قدر مقالے لکھے جا چکے ہیں کہ اب اس عنوان پر کچھ لکھنا اُگلے ہوئے نوالے کو دوبارہ چبانا ہے جس میں کوئی لطافت و نفاست نہیں۔ رہا یہ کہ حضرتِ کشّاف نے اقبال کی شخصیت سے مرعوب نہ ہو کر جی کھول کے اعتراض کیا ہے تو بلاشبہ یہ بہت لائقِ قدر و قابلِ ستائش ہے، ابھی ہم میں ایسے لوگوں کی بغایت کمی ہے۔ جو ذاتی شخصیت سے مرعوب ہوئے بغیر ایمانداری و دیانتداری سے کسی باوقعت شخصیت کی کمزوریوں پر بھی روشنی ڈال سکیں۔ اور اسی لحاظ سے حضرتِ کشّاف کا اقدام قابلِ تقلید ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی گذارش ہے کہ جہاں حضرتِ کشّاف کا یہ قول حقیقتاً اپنی جگہ اٹل ہے کہ

"اقبال کے متعلق معلومہ حرف غلط کی غیر معمولی شہرت ہے
جس نے لوگوں کی قوّت نقد و نظر پر ایک حجابِ غلیظ
پیدا کر دیا ہے، خواص تک اُس کی لپیٹ میں ہیں۔"

وہاں کسی کا یہ کہنا بھی صریحاً غلط نہیں کہ۔

"آج کل ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر اقبال پر
اعتراض کرنا فیشن سا ہو گیا ہے، ہر وہ شخص اعتراض کرنے
پر اُدھار کھائے بیٹھا ہے جس نے تھوڑی بہت ہی کتابیں
دیکھ لی ہیں، اس سے اور کچھ نہیں تو اتنا فائدہ ضرور
ہو جاتا ہے کہ معترض زینۂ شہرت کی دو چار سیڑھیاں
ضرور طے کر لیتا ہے۔"

میں مانتا ہوں کہ "حضرتِ کشّاف" پر یہ اعتراض کسی طرح عاید نہیں ہو سکتا کہ وہ شہرت کے خواہاں نہیں، کیونکہ اگر انھیں نام و نمود کی خواہش ہوتی تو وہ میدانِ صحافت میں حجابِ عروسی کو خیرباد کہہ کر تشریف لاتے، پھر بھی اس قدر ضرور ہے کہ جنبشِ قلم کا سبب فیشن کے سوا اور کچھ نہیں۔

بہرحال، اقبال پر اعتراض کیوں کیا گیا! میرے منہ میں اتنے دانت نہیں کہ ہم ایسا کہیں، اور نہ اس کی ضرورت ہے کہ ہم اقبال کی حمایتِ بیجا میں ان کی غلطی کو بھی بزعمِ خود صحیح ہی سمجھیں، مگر چونکہ اس جگہ حقیقت سے زیادہ غلط فہمی کارفرما نظر آ رہی ہے۔ اس لئے غیر مناسب نہ ہوگا اگر اس سلسلے میں ہم بھی کچھ عرض کر دیں۔

سب سے پہلی غلط فہمی یہ ہے کہ اقبال محفلِ ادب میں وطنیت کے نقیب کی حیثیت سے داخل ہوئے کیونکہ اقبال ملک کی محفلِ ادب میں کبھی بھی ہندوستانی وطنیت کے نقیب کی حیثیت سے داخل بھی نہیں ہوئے بلکہ جس طرح عام شعراء مشرقی غزلگو کی حیثیت سے محفلِ ادب میں داخل ہوئے

اُسی طرح اقبال بھی پہلے پہل آئے، اب یہ خدا کی قدرت ہے جو مشاعرہ میں ۲۲ سال کے اقبال کی سب سے پہلی غزل کا ایک شعر ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

سُن کر لوگ پکار اُٹھے کہ "اقبال غالبؔ کے بعد اُردو کا سب سے بڑا شاعر ہے" اور آخر میں یہ پیشین گوئی صحیح بھی ثابت ہوئی۔ اسی لئے یہ کہنا کہ وہ محفلِ ادب میں ہندوستانی وطنیت کے نقیب کی حیثیت سے داخل ہوئے ہرگز صحیح نہیں، ہاں بلاشبہ کچھ دن بعد جب ان کی طبیعت نے جولانی دکھائی تو "ترانۂ ہندی" میں وہ یہ کہہ اُٹھے کہ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جب تک ان کی تعلیم یہ رہی اُنھیں شاعرِ اسلام کسی نے نہ کہا، تاآنکہ وہ اسلامی تعلیم کے مجددِ اعظم ہو کر یہ نہ پکار اُٹھے کہ :-

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

بیشک "وطن" ایک ایسی چیز ہے جو ہر انسان کو عزیز ہے۔ اقبال تو اقبال بقول خود حضرتِ کشاف پیغمبر صلعم کو بھی بحیثیت انسان اپنا وطن پیارا تھا۔ مگر یہ بھی تو دیکھئے کہ جب وہ بحیثیت پیغمبر مبعوث ہوئے تو اسلام کی اس تعلیم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کہ اسلام میں وطن کوئی چیز نہیں، اُنھیں اپنے وطن کو خیرباد کہنا ہی پڑا، اس کے بعد قرآن مجید کو لیجیے، جس پر اسلام کا دارمدار ہے، اس کی کوئی آیت اور کوئی سورت ایسی چیز ہوتی جو "اسلام، اسلامی کتاب، اسلامی ہادی و رہبر اور اسلامی شاعر کے لئے ضروری تھی تو قرآن مجید اُس سے کبھی بھی خالی نہیں ہو سکتا تھا ؎

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار

مگر ایسی صورت میں جبکہ قرآن حمید اس سے خالی نظر آتا ہے مسلمان اُسے اسلامی چیز نہیں سمجھتے۔ اور جب وہ اسلامی چیز نہیں ہے تو "شاعرِ اسلام" سے یہ مطالبہ کہ وہ "وطنیت" سے بیزار کیوں ہے۔ محض غلط ہے۔ تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر بحث کا موقع نہیں۔ اس لئے صرف اس جگہ اُس نظم کو نقل کئے دیتا ہوں جو حضرت سیر نور بخش ناز سیالکوٹی کی نظم کے جواب میں حضرت نازکرہ نے کہی تھی، وہو ہذا

اسلام کا جہاں میں کوئی وطن نہیں ہے — یہ شمع پائے بندِ یک انجمن نہیں ہے
سیلِ ہوا نہیں ہے ابنِ فضائے صحرا — موجِ بہار، اسیرِ صحنِ چمن نہیں ہے
ذرّوں کی ہمتوں کی پستی، وطن پرستی — سورج کی روشنی کا کوئی وطن نہیں ہے
ر نکہت کا آشیانہ شاخِ سمن ہے لیکن — نکہت کبھی اسیرِ شاخِ سمن نہیں ہے
ر اسلام لامکاں ہے، کیوں ہو مکاں کا خوگر! — طوفاں رہینِ سطحِ گنگ و جمن نہیں ہے
روحی وطن ہے اسلام، اسلامیہ نکالیفی — غیروں کی طرح ان کا خاکی وطن نہیں ہے
محدود کیوں ہو وسعت اسلام کی فضا کی؟ — شاہیں، ہم نگاہِ زاغ و زغن نہیں ہے
اسلام کی نظر میں یکساں ہیں ہند و ایراں — ہر ملک ہے وطن اور، کوئی وطن نہیں ہے
قوم و وطن کے بت ہیں دنیا میں دراز قد — افسوس ہے کہ کوئی اب بت شکن نہیں ہے
جو دل کہ آسمانِ اسلام کے مکیں ہیں — ان کو دماغِ فکرِ خاکِ وطن نہیں ہے
ر اسلام کا وطن کیا؟ کہہ دیں گے ہم یہاں تک — کوئی زبان نہیں ہے، کچھ پیرہن نہیں ہے
قومیں ہیں طفلِ ناداں، ان کے وطن کھلونے — پر طارقانِ دیں کا ایسا چلن نہیں ہے
- ناؔز سے کوئی کہہ دے اقبال کی طرف سے — اک بحر کی پرستش حُسنِ سخن نہیں ہے

"چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

رہا یہ دیکھنا کہ اقبال کو شاعرِ اسلام کی حیثیت سے نہ سہی ایک انسان کی حیثیت سے "وطن" واقعی عزیز ہے یا نہیں تو حضرت کشاف کی خدمت میں گذارش ہے کہ اقبال کو اس سے ہرگز علیحدہ نہیں کہا جا سکتا۔ بالِ جبریل اور ضربِ کلیم جس کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ

"دورِ حاضرہ کے خلاف تبرّی[2] بازی کرکے اور اس کے سامان سے مقدس صحائف بالِ جبریل و ضربِ کلیم کے انبار[3] تعمیر کرنے سے کہیں بہتر تھا، کہ ہم اُس کی کیمیا ساز آگ میں خوب تپتے اور قائم النار ہو جاتے"

تمامتر نتیجہ ہے اُس وطن کی محبت، کا جو اقبال کے سینے میں موجزن ہے،

---

[1] رسالہ "زمانہ" لاہور جولائی ۱۹۳۵ء

[2] "تبرا" میں "ی" کی ضرورت نہیں

[3] "انبار تعمیر کرنا" دہلی میں معلوم نہیں بولا جاتا ہے یا نہیں۔

عطاء اللہ

کشاف صاحب جو چاہیں کہیں اُنھیں اختیار حاصل ہے، لیکن ہمیں بھی اعتراف ہے کہ بال جبریل اور ضرب کلیم بقولِ نیاز و شہاب ہیروں میں تولنے کے قابل اور ایک ایسی غیر فانی تصنیف ہے جو کبھی فراموش نہیں کی جاسکتی۔ بال جبریل و ضربِ کلیم دونوں میں مسلمانوں کی غلامی پر طنز ہے، اور یہ طنز یا بالفاظ دیگر یہ تعلیم کہ "مسلمان غلامی کا جوا اپنے کاندھوں سے اتار کر جلد از جلد پھینکیں" وطن کی محبت کے تحت نہیں تو اور کس جذبہ کی تحت ہے؟ کیا وطنیت کے اظہار کے لئے ایک ہی صورت ہے کہ وہ بار بار یہی چیخا کریں کہ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

ضرب کلیم میں اُن کی خدا سے یہ شکایت کہ ؎

لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

اور اُن کی یہ دعا کہ ؎

خدا نصیب کرے ہند کے اماموں کو
وہ سجدہ جس میں ہے ملت کی زندگی کا پیام

وطن کی محبت میں نہیں تو اور کس جذبہ کے تحت ہے؛ اُن کی یہ تعلیم کہ

اُٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں
سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر

کیا صرف اس لئے نہیں ہے کہ سرزمین وطن غلامی سے آزاد ہو؟ برادرانِ وطن بندگی و بیچارگی سے مخلصی حاصل کریں؟ اور ہندوستان غلامی کا طوق اپنی گردن سے نکال ڈالے؟

اقبال پر یہ اعتراض کہ اب اُسے اپنے وطن سے محبت نہیں، محض سطحی ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ اب اُن کی تعلیم اس قدر بلند ہے کہ مجھ جیسے کی سمجھ سے بہت دُور ہے۔ اور چونکہ ہماری محدود العلمی اقبال کی تعلیمات سمجھنے سے قاصر ہے، لہٰذا ہمیں اختیار حاصل ہے، کہ ہم جو چاہیں کہیں ورنہ اقبال نہ پہلے وطن سے برگشتہ تھے، نہ اب ہیں اور نہ شاید آئندہ ہوں گے اور اس لئے اس وقت بھی جبکہ اقبال ترقی کے تمام تکمیلی مدارج طے کر چکے ہیں اُن سے یہ بھی استدعا کہ "اقبال پھر سُنا دے ہندوستاں ہمارا" ایک طفلانہ ہٹ سے زیادہ وقیع نہیں۔

رہی ان کی شہرت تو صرف ان ہی پر کیا موقوف ہے، جوش، سیماب حسرت، شاعر، نوح، جگر، ساغر وغیرہ جتنے مشہور شاعر ہیں، بلا وجہ تو مشہور شاعر ہیں بلا وجہ تو مشہور نہیں، زمانے سے بڑھکر کون "نقاد" ہوسکتا ہے، پھر آخر کچھ تو ہے جسے دیکھ کر زمانے نے اقبال کو یہ درجہ دیا ہے؟ مگر ظرف دیکھیئے کہ اس رتبہ کے باوجود بھی اقبال نے خود کبھی کوئی فخر نہیں کیا، اور وہ برابر یہی کہتے رہے کہ

خوش آگئی ہو جہاں کو قلندری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے
(بال جبریل)

پھر بھی لوگ یہ کہہ ہی اُٹھے کہ: ؎

ڈال دی تیری نوائے آرزو نے زندگی
ملتِ مسلم رہے گی حشر تک ممنوں تری

جناب عطار اللہ صاحب پالوی نے اپنا یہ مقالہ، کلیم کے مشترکہ نمبر بابتہ جون و جولائی کے مطبوعہ تنقیدی مضمون —— اقبال اور پیامِ اقبال —— کے جواب میں بھیجا ہے! اگر ناگوار خاطر نہو —— اگرچہ ہمیں معلوم ہے کہ ناگوار خاطر ہوگا! —— تو ہم اتنا عرض کریں کہ ایسی مضطرب و نیم بار دُ وکالت اقبال کی، خود اقبال کے لئے موجب توہین ہے! چنانچہ ہم اس مضمون کی اشاعت در کلیم کو اقبال کی اتنی خدمت نہیں سمجھتے جس قدر کہ حضرت پالوی کی! اگر علامۂ اقبال کی ذاتِ گرامی کے احترام سے اس نقد النقد کو مسترد کردیا جاتا تو بلا شبہ یہ اُن کے حفظِ مراتب کا اک متقضا ہوتا، لیکن جنابِ پالوی صاحب یقیناً اسے اقبال کی حمایت و شفاعت کی وستاد نہ کے "زریں ترین ورق کی سیہ گشتگی" سے تعبیر کرتے! الغرض علامۂ اقبال کو جناب عطار اللہ صاحب کی یہ "ناخواندہ خدمتِ معکوس" برداشت کرنی ہی پڑے گی! اگرچہ یہ اک کھُلا ہوا راز ہے کہ اگر قبل از اشاعت یہ مسودہ حضرتِ اقبال کو دکھانے کے مواقع میسر ہوتے تو حضرت موصوف اُسے دفتر کلیم میں واپس فرمانے کے بجائے اغلباً جناب عطار اللہ صاحب ہی کے نام مع رہی "ڈائرکیٹ" کردیتے!

—— اس لذت کے ساتھ کہ "عطائے" تو بہ لقائے تو! ؎

صائب! دو چیز می شکند قدر شعر را
تحسینِ ناشناس و سکوتِ سخن شناس!

ہماری آرزو تھی کہ اس بارے میں کسی "سخن شناس" کی مہرِ سکوت

زُودِ تُتق! پھر چاہے ہم پر بھی اکثر "دنداں شکن جواب" کی ضرب پڑتی! ہم قوت ہم نبرد سے پنجہ کشی میں جو لطف ہے اُسے اہلِ ذوق ہی جان سکتے ہیں! ؎

اے خدا! یک زندہ مردِ حق پرست
لذتے باید کہ یابم در شکست!

اقبال کی جلالتِ قدر تو اقبال ہی کی ہے، سچ یہ ہے کہ خود میں (کشاف) پالوی صاحب کے اس نیم جان، اختلاجِ قلب زدہ جواب کو اپنے مضمون کے شایانِ شان نہیں سمجھتا! اک متین و سنگین انتقاد پر یہ طفلانہ زبان کج مج بیان!! ؎

ذوقؔ: بازیگۂ طفلاں ہے سراسر یہ زمیں
ساتھ "بچوں" کے پڑا کھیلنا گویا ہم کو!!

ناظرینِ کلیم تو عطار اللہ صاحب کے اس مضمون کی مسرت رنگیوں اور قلابازیوں سے لطف اُٹھائیں ہی گے، تاہم آیئے ہم ان حرکاتِ مذبوحی کا تماشا دیکھنے کے لئے بعض رَوز نوں اور رَخنوں کی سرسری نشاندہی کردیں۔

(۱) عطار اللہ صاحب پالوی کے جذبۂ "باصرہ نوازی" کی آسودگی میں "کشاف" کا "حجابِ عروسانہ" بُری طرح سنگِ راہ ہے! وہ اِس ناکام نقاب افگنی میں ایسے ناشکیبا ہیں کہ گویا چیخ رہے ہیں کہ ؏

پردہ چھوڑا ہے وہ اُس نے کہ اُٹھائے نہ بنے!

لیکن ہم پالوی صاحب کو اُن کے خطرناک ذوق پر متنبہ کرنا پسند کریں گے! وہ کسی "حجابِ عروسی" کے فریبِ نظر میں مُبتلا نہ ہوں! ہمیں خوف ہے کہ اپنی "شبِ زفاف" کی کامیڈی میں اُنھیں کہیں اس "ٹریجیڈی آف ایرر" سے دوچار نہ ہونا پڑے کہ ؏

شبِ اول عروس نر گردد!

پھر پوچھنے کی بات یہ ہے کہ آپ حریفانہ تنقید و استدراک کی وادیٔ مَتعَب میں اُتر رہے ہیں یا کسی حجلۂ عروسی کے دروازے پر نوشہانہ دستک دے رہے ہیں؟! اپنے مضمون میں آپ کا جو انجام ہوا ہے، غالباً وہ اسی آرزو پسندی کا خمیازہ ہے! ؏

عاشقی شیوۂ رندانِ بلاکش باشد!

آپ کو اس سے کیا کہ "کشاف" کے زیرِ حجاب کون ہے؟ تنقید کا کلمۂ اول تو یہ ہے کہ "اُنظُر اِلٰی مَا قَالَ، وَلَا تَنظُر اِلٰی مَن قَالَ!"

اسی سے "ذاتیات کا زنبورخانہ" بھی مُتعفن رہتا ہے، جو ہمارے علمی مناظروں کی بدنام خصوصیت ہے! لیکن ممکن ہے آپ اسی چیز کے جویا ہوں! اِس اشتیاق کی ستم ظریفیاں دیکھئے کہ "کشاف" کے حجاب کے نیچے کبھی آپ کو کوئی "عروسانہ رُخِ جمیل" نظر آتا ہے، اور کبھی خان صاحب جوش کا "چہرۂ جلیل"! ؏

معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے!

ہاں اِس "تاریکی" میں بہت سے مسلم الثبوت نقادوں اور سخن شناسوں کی "سخن فہمی عالَمِ بالا" بھی تو "معلوم" ہوتی ہے! ہمیں خوف ہے کہ آپ اور پروفیسر فراقؔ شاید اپنے اعزہ و اقربا کی آوازیں بھی پسِ دیوار سے نہ پہچانتے ہوں گے، جبکہ آپ کو "کشاف" اور جوشؔ کے بُعد المشرقین رکھنے والے اسلوبہائے بیان میں ایسا مغالطہ ہوا! ایسے لوگ اقبال کے مرتبہ داں بننے چلے ہیں! ؎

اے بندہ بدست و پائے در گِل ہشدار
اے دوختہ چشم و قفل بر دل ہشدار!

(۲) جناب نے اپنے مسودے کے چار پانچ طویل صفحے اِس شیون اور بین کے نذر کئے ہیں کہ "کشاف" کا مضمون اپنے لسانی اغلاق اور معنوی تعقید کی وجہ سے یکسر ناقابلِ فہم ہوگیا ہے، جس کے سمجھنے کے لئے آپ کو اک عربی فارسی لُغت کی ضرورت ہے، جس کی خریداری کے لئے آپ کی گرہ میں دام نہیں! کاش ہم آپ کو ایسا "مُفلس علم و درم" سمجھنے پر مجبور نہ ہوتے! تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ چند ساعت ہی کے بعد آپ کے جمود ذہنی کی گرہیں کُھلنے لگتی ہیں! آپ اِس مضمون کو "مُغلق" کے بجائے صرف "اَدَق" (باریک) کہنے لگتے ہیں! اور پھر تھوڑے بعد دیگرے اپنے کشفِ حجابات ہوتے ہیں کہ یہی سنگلاخ مقالہ "فصاحت و بلاغت کا بہتا دریا" بن جاتا ہے جو عام فہم کیا معنی "عوام فہم" تک ہو جاتا ہے! ؏

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی!

غالباً "بلاغت و فصاحت" اور "عام فہم و عوام فہم" اِن الفاظ کے معنی آپ کسی "لُغت" کی خریداری اور قرینے کی زیر باری کے اندیشہائے دور و دراز کے بغیر سمجھتے ہوں گے، اور اُن کے اور "مغلق و ادق" کے درمیان کے "تفاوتِ راہ" کی پیمائش بھی کرسکیں گے!

(۳) "تنقید التنقید" یا علی الاطلاق تنقیدِ ادب کے متعلق آپ خود

کچھ کہنے کی جرأت نہیں کرتے، اور باوصف اپنی "بنیقاب مُردمی" کے کبھی بلزاک کے پسِ پشت کھڑے ہوتے ہیں، اور کبھی پروفیسر "زوریہ" کے بل بوتے پر کچھ چند سطری لب کشائی کرتے ہیں! لیکن اس سارے "بچکانہ لہو ولعب" میں اس سنگین حقیقت کو صاف بھول جاتے ہیں کہ آپ پر اک سخت "بیا رزت" کے ادعا کو پایۂ استناد تک پہنچانے کا بارِ ثبوت تھا، جو شاید آپ کے خواب وخیال میں خود ہی اُتر گیا! ع

کیا خوبیاں ہیں میرے تغافل شعار میں!

"کشاف" کو آپ پہلے ذوقِ رُسوائی کا خوگر اک مریض کہتے ہیں، جس کی خوردہ گیریٔ اقبال، اک افسوسناک ناشناسی اور اقبال کی فلسفیانہ مشکل پسندی کا حریف نہ ہونے کی معذوری کا مظہر ہے! لیکن چند ہی صفحوں کے فصل نے جو ضُعفِ حافظہ عارضِ حال کیا اُس کا کرشمہ یہ ہے کہ (بالفاظِ بالوی صاحب) "حضرتِ کشاف کا یہ قول حقیقتہً اپنی جگہ اٹل ہے کہ (ملخصاً) اقبال کی مقبولیت اک مشہور حرفِ غلط ہے، جس کے اثر سے خواص تک کا علم ونظر اک حجابِ اکبر بن گیا ہے!" ——— قارئین کلیم کو معلوم ہے، اور ہمارے بالوی صاحب کا اعتراف ہے، کہ کشاف کا بقیہ مضمون اسی تمہیدی اجمال کی تفصیل ہے! اب اِسی کو علاء اللہ صاحب تسلیم کئے لے رہے ہیں! یہ صَدفی صَد انکار کے بعد صَد فی صَد اقرار کی کیسی طرفہ مثال ہے! ع

کافر نتوانی شدہ ناچار مسلمان شو!

اِسی طرح کشاف پر قبل ازیں اک "نمائیانہ جذبۂ نمائش" طاری تھا، لیکن اب وہ "اس شُبہ کے اطلاق سے بالاتر" ہو جاتا ہے، اور (از روئے منطقِ بالوی صاحب) اِسی نقاب پوشی کی "بے نیازیٔ نام ونمود" کی بنا پر! پہلے اقبال پر حرف گیری آفتاب پر خاک اُڑانا تھا، اس لئے کہ اقبال اک "آفتابِ نصف النہار" ہے! لیکن جلد ہی اس مہرِ نیم روز کو گہن لگ جاتا ہے، اُن میں "غلطیاں" نظر آنے لگتی ہیں جن کی "بیجا حمایت" اک "زعمِ باطل" بن جاتی ہے! ساتھ ہی "زمانہ مزاج کشاف" کی "غیر مرعوب" "نکتہ چینیٔ اقبال" "بلاشبہ اک لائقِ قدر و قابلِ ستائش، اور بغایت کمیاب ہمت و دیانت ہو جاتی ہے اور اک قابلِ تقلید اقدام"!!! ——— پھر بقول بلزاک اگر "تنقید نگار اُصولاً وحتماً بے ہنر ومحرومِ کمال لوگ ہوا کرتے ہیں" تو دوسری طرف "بفرمودۂ حضرتِ زوریہ" "ناقد، ادبیات کے حسن وقبح کا جوہری، اور اس کے حق و باطل کا فاروقِ اعظم ہوتا ہے"! ——— ہاں قرآن، وطنیت کے ذکر سے خاموش، اور اسلام قومیت کے تصور سے بیگانہ بھی ہے، اور اس بنا پر اقبال ایسے اسلامی شاعر سے اِن عقائد ومقاصد کی ترجمانی و ہمنوائی کی اُمید قطعاً بے محل ہے!" لیکن پھر چند ہی سطروں کے بعد اقبال اپنے شرعی منصب کو بھول بھی جاتا ہے، اور قرآنی نظریئے کو مسترد کر دیتا ہے اور ساری ناممکن توقعات کو بڑے سیر حاصل تصریحات میں پورا کرنے لگتا ہے، جبکہ بالوی صاحب، اُن کے وطن پرور، قومیت نواز، مشرق دوست، حریت تاب اشعار نقل کرنا شروع کر دیتے ہیں!

یہ ساری بدحواسیاں اور خود فراموشیاں اُس وقت ہیں کہ بالوی صاحب کو اک زیرِ نقاب عروسِ شرمگیں "ہی سے سابقہ پڑا ہے! اگر سچ مچ کبھی کسی "مرد" سے مقابل ہوئے تو اک "مرگِ مفاجات" ہی سے ہمکنار ہو جائیں گے! ؎

ایں زماں ہمتِ مرداں ہمیں محدود واست

زنے از پردہ بروں آید و کارے بکند!

(۴) "مارِ سیالکوٹی" کی معترضانہ نظم متعلق اقبال کی نظیر کو تازہ کرنے کے بعد بالوی صاحب نے جن "حضرتِ فکری" کی معترفانہ نظم درباره وسیع المشربیٔ اقبال کی طرف دعوتِ نظر دی ہے، وہ اگر ابلہ فریبی نہیں ہے تو خود فریبی ہے! اقبال کی فراخیٔ مسلک کا کون شاکی ہے؟ مگر یہ کون سی "شاعرانہ جہانگیریت" ہے جس کا قلعہ، کاشانۂ وطن کے ملبے پر تعمیر ہوا ہے؟!

اس قدر دشمنِ اخوانِ وطن ہو جانا؟!

"ترکِ وطن" اگر اِسی بنا پر "سنتِ محبوب الٰہی" ہے کہ آنحضرتؐ کو بادلِ ناخواستہ مکۂ معظمہ کے وطنِ مالوف کو خیرباد کہنا پڑا تو آپؐ کو خانۂ کعبہ کا بھی اسی طرح اور اِسی کے ساتھ ساتھ تخلیہ کرنا پڑا تھا! پس کیا "ترکِ بیت اللہ" بھی "محبوب الٰہی" کی اک "محبوب سنت" ہو گی، جس پر عمل پیرا کرا کر ہندی مسلمان کو یہ دعوتِ حقہ دی جائے گی کہ ہاں؛ دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی!

(۵) کشاف کے مضمون متعلق اقبال کے صرف ایک جزو ——— وطنیت کا اختیار و ترک ——— ہی سے بالوی صاحب نے بحث کی ہے، اور اِسی کے اُلٹے سیدھے جواب پر "انکار" "ازالۂ غلط فہمی" "تکمیل

کو پہنچ جاتا ہے: اگر دوسروں کی غلط فہمی کو دور کرکے وہ خود اک غلط فہمی میں گرفتار نہیں ہو گئے ہیں تو ہمیں، اُن کے ساتھ ساری ہمدردی کے باوجود، یہ تسلیم ہی کرنا پڑے گا کہ بقیہ حصۂ اکثریت، مضمون کا جس پر اُنھوں نے کوئی جرح و قدح نہیں کی ہے، اُنھیں "غیر متنازعہ فیہ" نظر آیا ہے۔ اور اُن کے نزدیک مُسَلّم و منظور ہے! —— کیا فرماتے ہیں جناب پالوی صاحب بیچ اس مسئلے کے؟!

(۶) اقبال کا اک وطن پرست شاعر کی حیثیت سے ہندوستان کی محفلِ ادبی میں داخلہ جناب پالوی صاحب کو تسلیم نہیں! وہ اُن کے شاعرانہ مرتبے کے اولین اعتراف کو اک غزل سرا قافیہ بند کی حیثیت سے منوانے پر مُصِر ہیں: پالوی کو صرف دو مغالطے عارضِ حال ہیں جنھوں نے اس بارے میں اُنھیں کشاف کے نقطۂ نظر سے اختلاف کرنے پر مجبور کیا۔ پہلی بات یہ ہے کہ اقبال کے "پیام" سے بحث تھی، اُن کا "کلام" مرکزِ نظر نہ تھا! اور ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ "غزل" کون سے سیاسی یا تمدنی یا معاشی "پیام" کا آرگن ہوتی ہے؟! —— دوسرا نکتہ یہ ہے کہ کشاف کے نزدیک "جدید ہندوستان کی محفلِ ادبی" اور "قدیم ہندوستان کے مشاعروں کی بھانڈوں کی محفل" میں تھوڑا فرق ہے! ع

سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجاست!

(۷) پالوی صاحب دغیرہم کے یہ واہمہ در پئے آزار معلوم ہوتا ہے کہ "آج کل لوگ اقبال پر فیشن کے طور پر تنقید کیا کرتے ہیں اور مقصود اک آسان شہرت ہوتی ہے!" —— بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کی خال خال، تقریباً الشاذ کالمعدوم قسم کی مخالفت، فیشن کی اکثریت و عمومیت سے ہنوز بمراحل بعید واقع ہوئی ہے، اور بجز بیباک، مجتہدانہ نقد کے کسی اور چیز سے تعبیر نہیں کی جا سکتی! البتہ ہمارے عہد کا ہر تعلیم یافتہ، نیم تعلیم یافتہ شخص اس وبائے عام کا شکار ضرور ہے، کہ اقبال کی آشنایانہ یا ناآشنایانہ "تحسین" کیا کرے! ؎

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں؟
پابستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے!

(کشاف)

کرب کی آواز

ابنِ آدم کی شادکامی کا — مسئلہ ہے عجیب زہرہ گداز
آدمی کھل کے ہنس نہیں سکتا — غم نہ بخشے اگر پرِ پرواز
ایک کلفت کا عارضی انجام — ایک وقتی طرب کا ہے آغاز
سبزۂ نرم و بسترِ سنجاب — خار و خس کا ہے فرشِ پا انداز
جس میں پنہاں نہو خراشِ الم — کونسا ہے طرب کا وہ انداز
ایک پژمردگیٔ نامحسوس — دہر کی ہر شگفتگی کا ہے راز
ایک مبہم سا نوحۂ ابدی — چھیڑتا ہے مسرتوں کا ساز
قہقہے تک میں جوشِ غلطاں ہے — ایک دھیمی سی کرب کی آواز

جوش

پولیس کا ببلا

(سب انسپکٹر)

ایک مسافر

۱۹۳۳ء کی بات ہے، ایک وار دغرجی ہایوں کہئے حکومت کے ایک چھوٹے ہوئے سانڈ صاحب، اپنے دُو دُو پیسے کے کانسٹبلوں، اور ہیڈ کانسٹبلوں کے حلقے میں کانپور کے اسٹیشن پر فرعونی طمطنے سے ٹہل اور ہامانی جبروت سے "احکام" نافذ فرما رہے تھے۔ مندرجۂ ذیل مضمون اُسی مطالعے کا نیتجہ ہے۔

آؤ میاں ببلے، آؤ، میرے درجے میں چلے آؤ، تم اکڑ کر چل رہے ہو، زمین شق ہو جائے گی۔ تم گرج کر کلام کر رہے ہو۔ فضا کا پتا پھٹ جائے گا — آؤ، آؤ، سانس لیتے ہوئے میاں ببلے! تم سر اُٹھا رہے ہو۔ آسمان میں سُوراخ ہو جائے گا۔

اللہ، اللہ، میاں ببلے، تمہاری حکومت، اور شوکت کی کوئی تھاہ نہیں۔ کیا مجال، مچھر تمہارے کان پر بھنبھنا سکیں۔ پتنگے تمہارے قریب آسکیں، اور خس و خاشاک تمہارے بالوں میں اُلجھ سکیں۔

میاں ببلے تم بہت مغرور واقع ہوئے ہو، اور کیوں نہو، تمہارے غرور کی جڑیں پاتال تک پہونچی ہوئی ہیں۔ اس لئے کہ تم تاج کے غلام ہو، اور تاج نے تمہیں بے مہار شُتر کی طرح چھوڑ رکھا ہے۔ ہر چند تاج کے غلاموں میں تمہارا مرتبہ سب سے گھٹیا ہے، جسے سوچ کر میرے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ مگر،

گرچہ خوردیم، نسبتیست بزرگ

کے لحاظ سے تم بھی ایک بڑی چیز ہو۔ اور ہاں اے میاں ببلے، تمہارے فرائض کی نوعیت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ تم بڑے اطمینان سے بے دست و پا مخلوق کو ستا سکتے، اور معصوموں سے مار دھاڑ کے ذریعے ارتکابِ قتل کا اقرار کراکے اُنھیں بہ آسانی تمام سُولی کے تختے پر لٹکوا کر حکّامِ بالا کی خوشنودی حاصل کر سکتے ہو۔ اس لئے تمہیں حق پہونچتا ہے کہ تم غرور کے مارے زمین پر پاؤں نہ رکھو!

میاں ببلے! تمہاری ٹوپی کا سِرا تمہارے داہنے کان کو چھو رہا ہے، اتنا شدید بانکپن کتنا مہیب، اور مہیب ہونے کے ساتھ ساتھ کتنا سفیہانہ ہے — میاں ببلے! "سفیہانہ" کے معنی تم نہ سمجھے ہوگے، اس لئے کہ تمہاری تعلیم و تربیت آنسو بہانے کی حد تک محدود ہے — "سفاہت" کہتے ہیں "چھچھورے پن" کو۔ اب سمجھے؟

اے میاں ببلے، خدا لگتی بات کا بُرا نہ ماننا، میں نے تمہیں چھچھورا کہا ہے۔ اس میں تمہاری کوئی خطا نہیں۔ اس لئے کہ تمہارا "ببلا گھر" یعنی تمہارا خاندان، اور پھر تمہاری کیچر یعنی تمہارا ماحول، اس قدر پست ہے کہ تم چھچھورے پن پر مامور ہو کر رہ گئے ہو۔

ہاں تو اے میاں ببلے! تمہاری ٹوپی کا سِرا، تمہارے داہنے کان کو چھو رہا ہے، شاید قدرت اس پردے میں یہ اشارہ کر رہی ہے کہ

مُصلحِ انسانیت کی خشکی کو اسی طرف آنا چاہیئے۔ اور تمہارے سر کے بائیں طرف والے کھچڑی بال، اے میاں بُلبلے، ٹوپی سے باہر نکلے ہوئے ہیں جن کی نوکیں آسمان کی طرف اُٹھی ہوئی ہیں۔ شاید تمہارا ہر بُن مُو آسمان کی طرف مُنھ کر کے اس کی فریاد کر رہا ہے کہ ہمیں اِس خیرہ سر کی کھوپڑی پر کیوں جمایا گیا ہے؟

میاں بُلبلے، دھوکا نہ کھاؤ، تم خوبصورت نہیں، بلکہ مہیب ہو۔ تمہاری آنکھوں کے اندر ایک گھٹیا قسم کا درندہ یعنی ریچھ ناچ رہا ہے۔

کمر سے، طوقِ غلامی کی سُتر پہن، یعنی کارتوس کی پیٹی لگائے ہوئے میاں بُلبلے! اکڑو، اکڑو، خوب اکڑو، کیونکہ یہ جو ہوں اور خرگوشوں ہی کے اکڑنے کا موسم، اور بزدلوں ہی کے فخر کرنے کی سہاگ ہے، لیکن اے بدہئیت میاں بُلبلے! بُلبلوں کی یہ ایک خوفناک خاصیت ہے کہ وہ اکڑتے ہی پھول جاتے ہیں۔ اور تمہیں معلوم ہے؟ پھولنا بُلبلوں کے حق میں موت کا پیغام ثابت ہوتا ہے، اِس لئے کہ وہ پھولتے ہی پھوٹ جاتے ہیں۔

دیکھو، سالس کی موہوم و ناقابلِ اعتبار موجوں پر تھرکنے اور اترانے والے میاں بُلبلے! دیکھو، اِس قدر دُھوم نہ مچاؤ، ہوا کی ٹکر، پہاڑوں کی ٹکر ہوا کرتی ہے، جس سے بُلبلے ایک نفس کے اندر ایسے معدوم ہو جاتے ہیں کہ خوردبین سے بھی دریافت نہیں کئے جاسکتے۔

کمر سے کارتوس کی پیٹی لگائے، اور جسم پر وردی کا جامہ کسے ہوئے غلام قسم کے آقا نُما غدّار بُلبلے! اِس سے پیشتر کروڑوں بُلبلے پھوٹ چکے ہیں۔ تم سے دس حصے بڑے بُلبلے۔ بڑی بڑی آنکھوں والے بُلبلے۔

تمہارے دادا بُلبلوں میں سے اے میاں پوتے بُلبلے، اکثر تم سے جسامت میں بہت بڑے تھے۔ وہ بھاری بھر کم بُلبلے تھے۔ پیٹ خوب نکلے ہوئے۔ خوب اونچے اونچے، چاروں طرف سے گول گول، قبوں کی شکل کے ہمشین شمایل بُلبلے، جن کے بُغبُغے لٹکے رہتے تھے، اور سینے طباقوں کے سے چوڑے تھے۔ وہ جب بات کرتے تھے تو بدلگام گھوڑوں کی ہنہناہٹ کی آوازیں آنے لگتی تھیں۔ مگر سُنا اے میاں بُلبلے! کہہ چکا ہوں ہوا کی ٹکر پہاڑ کی ٹکر ہوا کرتی ہے، چنانچہ ہوا اُن سے ٹکرائی اور وہ دفعتہً پھوٹ کر رہ گئے ــــ میاں بُلبلے ہاتھ اُٹھاؤ اُن کی فاتحہ خوانی کی خاطر، اور مٹھائی منگاؤ اُن کی نیاز کے واسطے۔

شاندار لیکن شرارت آمیز وردی پہنے ہوئے میاں بُلبلے! تم بھی ماشاءاللہ کافی پُر رعب بُلبلے ہو، گھوڑوں کی سی نہ سہی۔ مگر تمہاری آواز بھی گیدڑوں سے کچھ کم خوفناک نہیں ہے۔ تمہارے ہونٹ غرور سے کھنچے ہوئے ہیں، تمہارے پپوٹے بھی خاصے ورم آلود ہیں، تمہاری آنکھیں بھی آنکھوں خاک نہایت لال پیلی ہیں، تمہاری آدھی ترشی ہوئی دُمدار مونچھیں بھی صوفیائے کبار کی زُلفوں کی قسم نہایت ہی کرخت معلوم ہو رہی ہیں، اور تمہاری ناک بھی خدا کے فضل سے کافی سُرخ ہے، اِس کے علاوہ تمہاری ناک کے بال، نتھنوں سے سر نکالے ایک خاص رُعب آفریں انداز سے جھانک رہے ہیں، اِسی کے ساتھ تم جو پان چبا رہے ہو، وہ بھی نہایت سُرخ ہے، اور تمہاری پان چبانے کی ادا میں ایک ایسا طنطنہ پایا جاتا ہے گویا تمہارا چبانے کا انداز زبانِ حال سے یہ کہہ رہا ہے کہ اے اہلِ دُنیا! اگر موقعے سے گھڑ گئے تو کچا ہی چبا ڈالوں گا۔ لیکن اے پُھکنا سے میاں بُلبلے! تم سے کہیں زیادہ بڑے پُھکنے اِس حیات کے سمندر میں ٹوٹ چکے ہیں۔

میاں بُلبلے! تم خاکی "نیکر" اور چھوٹا سا کوٹ پہنے ہوئے جامے میں نہیں سماتے، تمہارا جیب سے جھانکتا ہوا فاونٹین پن کتنا جاکمانہ طور سے شاندار ہے۔ یہ وہی شاندار قلم ہے جو رُوئے زمین پر سب سے زیادہ جھوٹ اُگلا کرتا ہے،

لیکن اے میاں بُلبلے، دروغ برگردنِ راوی، سنتا ہوں بُلبلوں کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے، جب ہوا اُن سے ٹکرانے کا ارادہ کر لیتی ہے تو اُن کی نیکریں اور اُن کے فاونٹین پن یا اُن کا چھوٹا سا خاکی کوٹ، کوئی چیز بھی اُنھیں ہلاکت سے نہیں بچا سکتی۔

اے میاں حلقہ بگوش ادھمے پُھکنے بُلبلے! اِس سمندر میں بڑے بڑے بُلبلے، جو سورج سے آنکھیں لڑاتے تھے آنِ واحد میں ٹوٹ کر فنا ہو چکے ہیں۔

خواہ سر پر تمہاری ٹوپی کتنی ہی ٹیڑھی کیوں نہ رکھی ہو، اور خواہ اُس کا پھندنا، لال لال ٹوپی کا کالا کالا پھندنا، تمہارے کان کی لَو کو کتنی ہی شان سے کیوں نہ چھو رہا ہو، مگر اے میاں نیم رنگین، اور نیم خونخوار بُلبلے! ہوا کی ایک ذرا سی گوشمالی سے بڑے سے بڑا بُلبلا ٹوٹ کر رہ جاتا ہے۔

پولیس کے شیخی خورے بُلبلے! یہ بھی معلوم ہے کہ ہر بُلبلا ٹوٹنے ہی کیلئے

اُبھرتا اور ہر غرور کا آخر کار سر نیچا ہی ہو کر رہتا ہے؟

سمندر کے پُرانے تجربہ کار مگرمچھ، اور بڑی بُوڑھی مچھلیاں، رات کا کھانا کھانے کے بعد جب اپنے تجربے بیان کرتی ہیں، تو اُس موقع پر اکثر یہ کہتی ہیں کہ یہ عجیب بات ہے کہ زیادہ گڑبڑ مچانے والے ہیبت بُلبلے بہت جلد ٹوٹ جایا کرتے ہیں۔

اِس لئے اے میاں بُلبلے! ٹھنڈے پانی پر ٹھنڈے ٹھنڈے تیرو، زیادہ گڑبڑ نہ مچاؤ۔ اِتنی دُون کی نہ لو۔ کیونکہ زیادہ ہلنے ڈولنے، اور زیادہ گڑبڑ مچانے سے، سمندر کا بیان ہے کہ بلبلے بہت جلد ٹوٹ جاتے ہیں۔

اچھا! کیا میاں بُلبلے! تم مجھ پر آنکھیں نکال رہے ہو؟ کیا واقعی تم مجھ پر آنکھیں نکال رہے ہو؟ مجھے یہ دیکھکر کتنا افسوس ہو رہا ہے! کیونکہ بُلبلا جب ٹُوٹنے کے قریب آتا ہے، تو آنکھیں ضرور نکالنے لگتا ہے، اچھا میاں پولیس کے بُلبلے! خدا حافظ، کل جب تم ٹُوٹ چکے ہوگے، تو میں سمندر کے کنارے آؤں گا، اور بڑی بوڑھی مچھلیوں کے اس قول کی تائید میں قہقہے مارونگا کہ زیادہ گڑبڑ کرنے والے بُلبلے بہت جلد ٹُوٹ جایا کرتے ہیں!!

سلام، اے میاں بُلبلے، سلام!

جو ہم اہل ہمّت کی اولاد ہوں گے

جو ہم اہلِ ہمت کی اولاد ہوں گے　　　تو ہمت کریں گے اور آزاد ہوں گے

اُٹھو ہِل کے بندِ ستم توڑ ڈالیں　　　کہ ہوں گے تو کوشش سے آزاد ہوں گے

اُٹھو مُلک و مِلّت کی عزّت بچالیں　　　کہ ہِل جُل کے دلِوارِ فولاد ہوں گے

جو سب فتحیابی کے گُر جان لیں گے　　　تو سب فتحیابی سے دِلشاد ہوں گے

جو سب باہم امداد کی ٹھان لیں گے　　　تو سب بے نیازِ ہر امداد ہوں گے

وہ دَورِ عجیب و غریب آرہا ہے　　　کہ سفّاک ہوں گے نہ جلاد ہوں گے

وہ عہدِ ہمایوں قریب آرہا ہے　　　کہ فرعون ہوں گے نہ شداد ہوں گے

ہم اُس سرزمیں کی طرف جارہے ہیں　　　جہاں صید ہوں گے نہ صیّاد ہوں گے

ہم اُس بادشاہی میں در آرہے ہیں　　　جہاں کید ہوں گے نہ کیاد ہوں گے

نہ روکو اب آزاد ہم کو نہ روکو!

ہم آزاد ہوں گے ہم آزاد ہوں گے!

حکیم آزاد انصاری

غزل گوئی اور پروفیسر فراق!

"نقّاد"

بیدل! آں گوہر نایاب سراغ — مجھلے ست کہ پرسیدن نیست
عکس افتادہ در آئینہ ہوش — گل تواں گفت، ولے چیدن نیست!
نسخہا در تعقل و فہم محال! — جلوہا در نظر و دیدن نیست!

"دورِ حاضر اور اردو غزل گوئی" کے عنوان سے پروفیسر فراق نے اک مبسوط مقالہ، ماہ مئی کی اشاعتِ کلیم کے شائع شدہ مضمون —— غزل گوئی —— کے استدراک (Comment) میں نگار کے جولائی نمبر میں تحریر فرمایا ہے۔ اس مقالے پر نگار کے باب تعارف (ملاحظات) میں مدیر نگار کا اک نوٹ بھی ہے۔ ہر چند کہ ایڈیٹر کی طرف سے اس قسم کے سفارشی نوٹوں کا لکھا جانا، ادبیات و تنقیدات کی عدالت میں توہینِ عدالت سے کم نہیں، اس لئے کہ اس ہمچل اور قبل از وقت دخل در معقولات سے ان قضایا میں اصلی قاضی —— تعلیم یافتہ پبلک —— کی آزاد رائے کو متاثر کرنے کا اک ارتکاب متصور ہو سکتا ہے! تاہم اس بیضابطگی کی ہم چنداں پروا نہیں کرتے! یہ صرف منصبِ ادارت کی اک مصلحت ہے۔ ہماری کوئی غرض نہیں! یہ غیر معمولی طریقے انہی بزرگوں کے مقدمے کی کمزوری کی غمازی کرتے ہیں! ہمارا کوئی نقصان نہیں کرتے! ہمیں تو بہر حال اپنے اوپر ہونے والے اعتراضات کا جواب دینا ہے۔—— یہ اعتراضات ایک منہ سے نکلیں یا ایک سے زیادہ سے! پھر یہ آوازیں الگ الگ آئیں، یا ایک دوسرے کی ہمنوا بن کر! تاہم "منفردانہ مبارزت" (Single Duel) کی کھلاڑی پن کی اسپرٹ کے یہ بات منافی ضرور ہے! مزید براں پروفیسر فراق ایم اے، گورکھپوری کی پشت پر حضرت نیاز فتحپوری کچھ اچھی پشت پناہی بھی نہیں! ضعف الطالب و المطلوب!

حضرت نیاز چونکہ پروفیسر فراق اور ہمارے بیچ میں کود پڑے ہیں، اس لئے پہلے ہمیں انہی کو دفتر نگار کا راستہ بتانا ہے! تاکہ فریقین جنگ کے درمیان کوئی تیسرا فریق حائل نہ رہے! اس طرح گویا ہمارا "سیمی فائنل" (Semi-final) حضرت "نگار" سے ہوگا، اور فائنل "شریت رگھوپت سہائے جی" سے! پروفیسر صاحب بالقابہ کو اپنے "دوہرے دوہرے خطوطِ مدافعت" (Double Line of Defence) مبارک ہوں اور ہمیں اپنے تنہا دست و بازو! ع

آں نہ من باشم کہ روزِ جنگ بینی پشتِ من!

اک مردِ عارف نے ایک دفعہ کہا تھا کہ "مرید کو مرشد اپنے ظرف کے مطابق ملا کرتا ہے!" —— ہم دیکھتے ہیں کہ پروفیسر فراق کو اک "وکیل" تک کی دستیابی میں اس سخت گیر معیار سے سابقہ پڑا ہے! انکا "قلبِ لشکر" جتنا کمزور ہے "عقب" کچھ اس سے زیادہ مستحکم نہیں! نیاز کے سرٹیفکٹ نے فراق کو اتنا فائدہ نہیں پہنچایا ہے جتنا کہ نقصان! ع

مرا بخیر تو امید نیست شر مرساں!

حضرت نیاز، کلیم کے "نقاد" کی ناگزیر گرم نوائی پر فرماتے ہیں:-

"نہ صرف آزاد، بلکہ تمام غزل گو شعراء کا ذکر "لبِ لعل شکر خا" سے کیا گیا ہے!"

شایدؔ لبِ لعلِ شکرخا" کو تنہا استحقاقِ استعمال" خدا و رسول، جملہ انبیار اور تمامی بزرگانِ دین" ہی کے خلاف ہے، جو حضرت مجتہد العصر" نیازؔ کے سالہا سال تک "نخچیرِ شہد باری و شکرخائی" رہ چکے ہیں ؟! شعرار متغزلین سے یہ انتقام گیری تو اُس وقت سے واجب الوصول ہوگئی ہے کہ مولٰینا اسمٰعیل میرٹھی مرحوم نے "مُروجہ و متداول" غزل گوئی کے" آداب بے ادبی" پر مُدّت ہوئی کہا تھا:۔

غزب شیخ پہ ہر دم وہ لتیاں جھاڑیں   کریں مساجد و کعبہ سے دُم دبا کے فرار!
جمالِ یوسفی یا نطقِ عیسوی جو ہو   ہیں اُن کی گندہ دہانی کے سامنے سرِ خوار!
نہ کچھ خدا کا لحاظ اور نہ انبیار کا ادب   یہ اُن کی نوز بھری شاعری خدا کی مار!

نگار کے پیدا کئے ہوئے دفاترِ ادب پر عبور رکھنے والے جانتے ہیں کہ اِس بارۂ خاص میں شعُرار کی" نوز بھری شاعری" سے حضرتِ نیازؔ کے" اشعار منثور" کچھ کم" پُر نوز" نہیں رہے ہیں! آج اُن کے اندر اُن کا جذبۂ شیریں کلامی الیسا" ریشۂ خطمی" پیدا کر رہا ہے ؟! کیا اُن پر کچھ بلوغ کے آثار رونما ہو رہے ہیں ؟! کیا وہ اپنے" ذہنی بچپنے" کی ساری گالیاں بھُول گئے ؟! کیا" جنّ" سورۂ جنّ کی تلاوت کے لئے لبُ کُشا ہونا چاہتا ہے ؟! ع

آنچہ می بینم، یہ بیداری ست یارب یا بخواب؟!

کلیم کے مرکزِ بحث مضمون ——" غزل گوئی" —— کے متعلق جناب نیازؔ فرماتے ہیں :۔

" آخر کار فراقؔ اِس کے لئے طیار ہو گئے کہ وہ اِس کا جواب لکھیں "

" آخر کار" کا لفظ کتنا معنی خیز اور غماز واقع ہوا ہے! گویا بڑے بڑے عزم اور فسخِ عزم، ہمت اور شکستِ ہمت، پیشقدمی و پسپائی، تذبذب و تردُد کے مراحل پیش آئے! اور پھر بمصداقِ" نامردی و مردی قدمے فاصلہ دارد" وہ آخر کار اِس کے لئے طیار ہو گئے!" ع

پسینا پونچھیے اپنی جبیں سے!

آگے سُنئے :۔

" پھر اگر یہ جواب صرف اُسی طرح کی" دُشنام طرازی" پر مُشتمل ہوتا جو نقاد کے مقالے کی اصلی" بیک گراؤنڈ" ہے تو شاید میں اُسے شائع نہ کرتا "

اِس جُملے میں" شاید" کی معنویت کو دیکھئے! گویا یہ امر" مُشتبہ" ہوتا کہ آیا اک" دُشنام نامہ"" صفحاتِ نگار کی" زینت" بن سکتا ہے یا نہیں ؟! یعنی اگر اُس کا" قبول" یقینی نہ تھا تو" رَد" بھی قطعی نہ تھا! بالفاظِ دیگر" گالی نامے" بھی نگار میں امکاناً شائع کئے جا سکتے ہیں! فیصلہ کُن عنصر یہاں زیرِ بحث مسودے کا" دُشنام" یا" شریفانہ کلام" نہیں ہوا کرتا، بلکہ کسی" ہمارے عزیز دوست" کی خدمت یا کسی" مبغوض دشمنِ دیرینہ" کی عداوت! —— نازم بریں جوہر شناسی" انتقاداتِ عالیہ"!! ؎

تا عزمِ من فسخ شدہ نقشِ نگیں ترا
دارند اہلِ فقر ز دستِ تو صد جزع!

بالآخر جنابِ نیازؔ عزم بالجزم کر لیتے ہیں کہ :۔

" میں اُسے شائع کرتا ہوں، اور تمام اُنہی جذباتِ تشکر و امتنان کے ساتھ جو بصورتِ" خراج" مجھے جنابِ فراقؔ کی خدمت میں پیش کرنا چاہیئے!"

گویا یہ اک" حسابِ دوستان در دل" کا معاملہ تھا! —— یعنی میں اپنا رسالے کا" اسٹیج" تم کو اُدھار دیتا ہوں، تم اپنا زالہ ادب میرے سامنے نہ کرد! —— یعنی" تو مرا" رئیس التحریر" بگو، و من ہفواتِ ترا" انتقاداتِ عالیہ" می گویم!"

اب اک بات ضمناً، لیکن حقیقتہً جانِ سُخن، نیازؔ صاحب فرماتے ہیں۔

" فراقؔ کی غزل گوئی پر میں جون کے رسالے میں اک سرسری نگاہ ڈال چکا ہوں جس سے قارئینِ نگار کو اندازہ ہوا ہو گا کہ ذوق کے لحاظ سے اُن کی شاعری میں کتنی پاکیزگیاں پائی جاتی ہیں!"

" اک سرسری نگاہ" اور قارئین کو پورا" اندازہ" ہو جانے کا" شرح صدر"! —— گویا آنجناب کی" نیم نگاہی" کے" مسِ پارس" کا وہ اعجازِ انقلاب ہے جس کی التجا بھُوسے فراقؔ کی نیازمندی یوں کیا کرتی ہے کہ ؎

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند؟!

حضرتِ نیازؔ اب حُدودِ ارض کو بالکل چھوڑ کر طبقاتِ سماوی کے عازم ہوتے ہیں! اُن کی پیغمبرانہ پرواز دیکھئے :۔

" اک بلند معیار کے نقد و تبصرہ کے لئے ذہن جس توازن و تعادل (Equilibrium) کو چاہتا ہے اُس کے عطا کرنے میں فطرت

بہت بخیل واقع ہوئی ہے!"

بےشک جس طرح آپ فلسفہ طرازی اور رُعب اندازی کی زبان کے کلمات کے انبار لگانے میں آنجناب بہت مُسرف واقع ہوئے ہیں! ——— اللہ اللہ آج حضرتِ نیاز کے قلمِ "حکمت رقم" کی ایک جنبش سے "اقتضا دِ فطرت" کا ناموسِ اعظم ("Economy of Nature") کتنی آسانی سے مُتزلزل بلکہ باطل ہوگیا! ——— آہ، فطرت کے مُنبدءِ فیاض کی مُمسکی، اور اعلیحضرت "نیاز بے نیاز" کی دریا دلی جس سے کسبِ فیض کر کے اُلوہیت کا معیار اپنی تکمیل نہیں کرتا!! ——— ع

رب العزت کے لئے بھی کوئی سہنے دو خطاب!

تم خداوند ہی کہلاؤ، خدا اور سہی!

خدا جانے یہ جوہرِ "توازن و تعادل" جناب نیاز کے کاسۂ سر کو بخشنے میں بھی فطرت نے کسی سیر چشمی کا ثبوت دیا یا نہیں؟ اُن کا دماغ مُبالغۂ غلو کی جس رستخیز کی جولانگاہ نظر آتا ہے اُس سے تو یہی گمان ہوتا ہے کہ فطرت یہاں "بخیل ترین" ثابت ہوئی ہے!

ہاں اسی ترنگ میں اور سُنئے:-

"معلوم نہیں کتنے ہزار ذہین دماغ پیدا کرنے کے بعد انتہائی پس و پیش کے ساتھ، وہ کسی ایک کا انتخاب اس ودیعت کے لئے کیا کرتی ہے!"

لیجئے "یک نشد دو شُد"! ابھی تک تو فطرت بخیل ہی تھی، اب اُسے ضعفِ ارادہ اور تلون مزاجی کا مرض بھی عارضِ حال ہوگیا! غالبًا یہاں بھی عالی جناب نیاز کو اپنے ضرب المثل تاریخی آہنی استقلال اور کوہ تمکینی سے کارفرمائے کائنات کی دستگیری کرنی پڑے گی"! ——— واللہ یہ بھی عالَم کی کتنی بڑی خوش قسمتی ہے کہ اُس کے (نعوذ باللہ منہا) ناقص خالق اور مذبذب رب کی تکمیل و تکملہ کے لئے اک نیاز کیش، بلکہ مجسم "نیاز" بندہ موجود ہے، اور بوقتِ ضرورت کام آسکتا ہے! ع

مارا ازیں گیاہِ ضعیف ایں گماں نبود!

اور ٹیپ کا بند:-

"مجھے یہ ظاہر کرنے میں قطعًا تامل نکرنا چاہیئے کہ اِس وقت فراق بھی منجملہ اُن چند نفوس کے ہیں جو قدرت کے اس عطیئے پر عرفی کی زبان میں بجا طور سے کہہ سکتے ہیں:-

در آں دیار بہ سودا روند وکم کہ دہند
جوے ملال بعمرِ ابد بہ بسیاری!"

حضرت نیاز کے یہ مُشاہدات و مکاشفات شاید اُس وقتِ خاص سے تعلق رکھتے ہیں، جس کی شانِ نزول یہ ہے کہ "لی مع اللہ وقت لا یسعنی فیہ ملک مقرب ولا نبی مرسل"! ——— ہاں اک ایسے ہی وقت و ساعت میں جنابِ "فراق" کو بھی "وصالِ" الٰہی نصیب تھا، اور جناب نیاز تو "فی مقعد صدق عند ملیک مقتدر" ہی کے "مقامِ محمود" پر فائز تھے! ہاں اللہ میاں بدستور کچھ راضی کچھ نیم راضی تھے! تاہم انتہائی پس و پیش کے بعد پروفیسر فراق کا انتخاب اِس ودیعت (توازن و تعادلِ ذہن) کے لئے آخر کار ہوگیا! ——— اور اگرچہ یہ از اوّل تا آخر "حدیثِ معراج" ہی ہے، جس کے شاہد بلاشرکتِ غیرے حضرت نیاز ہی ہیں؛ لیکن وہ ازراہِ ذرہ نوازی، اہلِ عالَم کی مخلوقِ سفلی کو "اپنے اعتماد میں لیتے ہیں"! اور بلا کسی تامل کے قطعًا اُس حقیقتِ حقہ کا اعلان فرماتے ہیں کہ جناب فراق کے فرقِ مُبارک پر "تعادلانہ و توازن و تعادل" کا تاجِ زرین رکھ دیا گیا! اور ع

حوریاں رقص کناں ساغرِ شکرانہ زدند!!

بہرحال اب عرفی کا (منقولۂ بالا) شعر پڑھنے کے لئے جناب فراق صاحب، سالکِ باخبر حضرتِ نیاز کی طرف سے "صاحبِ اجازت" بنائے جاتے ہیں! ——— اگرچہ بدبخت عرفی اپنی قبر میں پیچ و تاب کھا رہا ہوگا کہ اُس کے شعر کی یوں مٹی پلید کی جا رہی ہے! ——— آہ، شعرِ مرا بہ مدرسہ کہ برد؟! ع

تحریر و مُدیرانِ مسئول و اربابِ انتقاداتِ عالیہ، کہ بُرد؟! ع

مدارِ روزگار بسفلہ پرور را تماشا کن!

فضیلت مآب جناب نیاز کے چند اور حیرت بار انکشافات ملاحظہ فرمائیے:-

"آپ یہ سُن کر غالبًا حیرت کریں گے کہ انتقادی ذوق، شعر گوئی سے بالکل علیحدہ چیز ہے!"

جی ہاں، آنجناب کے تو سارے ملفوظات ماشاء اللہ چشمِ بد دُور، ایسے ہی حقائقِ نادرہ و نکاتِ عجیبہ ہوا کرتے ہیں، جنھیں سنکر آپ کے مخاطبین و سامعین "غالبًا حیرت" کریں! دوسروں کو حیرت ہو یا نہ ہو آپ کو اپنے "فوق العادۃ کمالات" پر حیرت ہونا لازمی ہے! اللہ اللہ اُس کمال کا بھی

کچھ ٹھکانا ہے جو خود "حاملِ کمال" کو حیرت زدہ کر دے!! ــــــ خیر عالیجاہا! ہم آپ کے معجزاتِ لیاقت اور آنجناب کے خرقِ عادات انکشافات پر غالباً حیرت زدہ ہوں "یا" غالباً غیر حیرت زدہ" ہم مانے لیتے ہیں کہ ہم آپ کے اِس مہیب مظاہرۂ دانش فروشی پر ضرور بالضرور مبہوت ہوگئے! ع

گر تو خوش باش کہ ماگوش بہ احمق نہ ہیم!

مناسب یہ ہوگا کہ نگار صاحب جب کچھ "نگارش" فرمایا کریں تو "حیرت زدہ ہونے" یا حیرت زدہ نہ ہونے کا معاملہ قارئین ہی پر چھوڑ دیا کریں! یہ کچھ اچھے آدابِ مجلس نہیں کہ راستے میں کسی شریف ہمچشم سے دوچار ہونے پر، بجائے السلام علیکم کے آپ "وعلیکم السلام" کہہ اٹھیں! اور اس طرح سلسلۂ سخن جاری فرما دیں کہ "اجی بندہ کس لائق ہے! یہ سب آنجناب کی جوہر شناسی اور قدر دانی ہے!" وغیرہ وغیرہ، ــــــ اپنی عزت آپ کرو" والے اخلاقی اصول کا یہ بُرا استعمال ہے! ع

خود ستائی عیب ہے لے خودستا!

اور ہاں وہ "مظہر العجائب" حقیقت کیا ہے؟ نیاز صاحب سے سُنئے! "ایک بہترین شاعر بھی اِس کا مدّعی نہیں ہو سکتا کہ وہ اچھا "نقاد" ہے"! اور غالباً اِس وجہ سے کہ اِس وصف کا "داخل خارج اور رجسٹری" قبل ازیں اک "بہترین نثار" کے نام ہوگئی ہے!

بلاشبہ یہ بیان اک مجسم بوالعجبی چیز ہے کہ "ایک بہترین شاعر بھی .... نقاد ہے!" ــــــ نامور ویبے بدل نقاد، آسکر وائلڈ، نے عین اِسی مسئلے کو بار بار چھیڑا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "اک اچھا آرٹسٹ اور اک اچھا نقاد لازم و ملزوم، ہم معنی، بلکہ ایک ہی واحد شے کے دو نام ہیں! ناممکن ہے کہ ایک ہو اور دوسرا نہ ہو، یا بالعکس! حقیقتِ نفس الامری یہ ہے کہ اک صناع، عین اپنے عملِ صنعت کے دوران میں، اپنے ذہن کے اندر اک داخلی عمل نقد انجام دیتا جاتا ہے! اچھا آرٹ خود نقد ہی کا مولودِ صُلبی ہے! فن اور انتقاد شانہ بشانہ چلتے ہیں! .... نقاد اپنی صدی کی "بہترین تصنیف" ہوتا ہے!!"

"انتقاداتِ عالیہ" کے لئے خدائے بخشندہ کی "بخشیدہ" کمیاب ترین "ودیعت" سے بہرہ یاب ارباب کی "ازراہِ کرم" نظر سے خوش گزرے!

آسکر وائلڈ کا تو خیر یہ محبوب موضوع ہے، لیکن یہ حقیقت اتنی عام تھی کہ تعجب ہوتا ہے "فن کاری" سے عملی شغل رکھنے والے اِس سے ناآشنا ہوں! ہمارے اُردو ہندوستان کے "کرم خوردہ" دورِ غزل گوئی ہی کا اک "اُستاد" اِس نکتے سے محرم ہونے کا ثبوت دیتا ہے جب کہ وہ کہتا ہے کہ ؎

بنا کے "آئینہ" دیکھے ہے پہلے آئینہ گر"!
ہنر ور اپنے بھی عیب و "ہنر" کو دیکھتے ہیں!

فارسی ادب میں اس "نقد آشنائی" کی زیادہ معنی خیز مثالیں ملینگی۔ یہاں آپ دیکھیں گے کہ بدترین حریفانہ کاوش کرنے والے رقیبوں کے "برخود غلط اعتراف و تسلیم" کے بعد بھی اک حقیقی "ناقدِ خویش" سخنور اپنے کو مطمئن نہیں پاتا! وہ گویا "ادبی احتسابِ نفس" کے "درّۂ ضمیر" سے پیچ و تاب کھا رہا ہے! ؎

رَستم زِ مُدعی "بقبولِ غلط"، ولے
می تابم از "شکنجۂ طبعِ سلیم خویش!"

"مُدعی" کے مقابلے میں "دوستدار (Favourable Critic)" کی طرف سے "قبول غلط" کے قدرۃً زیادہ موقعے ہُوا کرتے ہیں! ــــــ خاصکر ایسے "پیشہ ور ناقدینِ عظام" کے سلسلے میں جن کے ہاں علمی دوستی یا علمی دشمنی کا "مُغزائے جلی" ہے "انتقاداتِ عالیہ کا سلیقہ"! ع

تفو! بر تو اے چرخِ گرداں، تفو!!

ہمیں فراق صاحب سے اُمید نہیں کہ وہ اِس شعر کے پڑھنے کی اخلاقی جُرأت بہم پہنچا سکیں گے کہ ؎

رَستم زِ "دوستے" "بقبولِ غلط"، ولے
می تابم از شکنجۂ طبعِ سلیم خویش!

لیکن پھر ہم اُنھیں چیلنج کریں گے کہ ؎

بنمائے بصاحب نظرے گوہرِ خود را
عیسیٰ نتواں گشت بتصدیقِ خرے چند!

کاش ہم پروفیسر فراق کو سمجھا سکتے کہ اک ایسے دوست کی تعریف، جو اپنے پر "واجب الاداء خراج" (نگار، جولائی، ص۴۳، سطر ۲!) کے معاوضے میں اپنے "نقد" و انتقاد کو "گِرو" کر چکا ہو، حقیقتاً کتنی "مذمت" کے ہم معنی ہے! ؎

صائب! دو چیز می‌شکند قدرِ شعر را
تحسینِ ناشناس، و سکوتِ سخن شناس!

اچھا، نیاز صاحب کو اپنا "رہوارِ قلم" پھر چھوڑنے دیجئے! وہ فرماتے ہیں:-
"میر کو دنیا خدائے سخن مانتی ہے، لیکن جب یہ خدائے سخن خود اپنے کلام کا انتخاب کرتا ہے تو وہ پیغمبری کے درجے سے بھی گرا ہوا نظر آتا ہے! اور خود اُسے مطلق خبر نہیں ہوتی کہ اُس کے بہترین اشعار کون سے ہیں!"

سب سے پہلے تو "نیاز بے نیاز" کو یہ سمجھ لینا چاہئے تھا کہ جس شاعر کو "دنیا خدائے سخن مانتی ہے" اُس کی خدائی سخن پر اُن کے لئے ایمان لانا ممکن بھی ہے؟! "نیاز ناز آفرین" "دنیا کے اور کون سے خدا" کے قائل ہوئے ہیں کہ "دنیا کے خدائے سخن" کے سامنے سرِ عبودیت جھکائیں گے؟! اُن کا نعرہ، پروفیسر فراق وغیرہم ایسے "مومنین اولین" کی صفِ نماز کے سامنے، تو یہی ہوا کرتا ہے کہ:-

"اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی"!

جب حال یہ ہے کہ "بالائے کبریائی اُلوہیت" ذاتِ نیاز "ساری دنیا کے خالق و مالک خدا" ہی کو کبھی خاطر میں نہ لائی تو بھلا اک ایسا "تھرڈ کلاس عَبْدِ ذلیل" اُن کی آنکھ میں کیا جچ سکتا ہے جو پیغمبری کے درجے سے بھی گرا نظر آتا ہو!———یارو! کچھ حد ہے اِس پستی و پسماندگی کہ کہ انسان "پیغمبری سے بھی بالا" نہ ہو!

ہمارا خیال ہے کہ یہ بات چنداں عجیب نہیں کہ "خدائے سخن میر کو اپنے بہترین اشعار معلوم نہیں" جبکہ ماورائے اُلوہیت نیاز کو خبر نہیں کہ اُن کی نخوت و رعونت کے "سیاہکارترین شاہکار" کون سے ہیں؟! ؎

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ دامن کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بندِ قبا دیکھ!

اسرار کی مزید و مسلسل بارش کا اک اور قطرۂ نیساں (دُرِ مکنونِ صدفِ حقیقت) ملاحظہ فرمائیے! حضرت نیاز فرماتے ہیں:-
"یہ راز میرے سوا شاید کم لوگوں کو معلوم تھا کہ اُن (فراق) کا ذوقِ تغزل ثانوی چیز ہے، اور یہی چیز جو قدرت نے اُن کو عطا کی ہے، وہ غیر معمولی "سلیقۂ انتقاد" ہے!"

ہمارا خیال ہے کہ راز بھی ہمیشہ ایسے "رازہائے سربستہ" نہیں ہوا کرتے، اور دوسرے لوگوں کو بھی کم و بیش معلوم ہوتے ہیں۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ "از دو سازند محفلہا"! چنانچہ خود جناب نیاز کا یہ جزوی اعتراف یہاں موجود ہے کہ کم از کم "چند لوگ" اِس راز سے واقف تھے! تاہم ایسے "اسرار" پر وقوف پانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں جو بجائے "اسرار" کے "توہمات" واقع ہوئے ہوں! یہاں "محرم رازی" کے بجائے "خود فریبی" کی ضرورت ہوگی! اگر حضرت نیاز کے علاوہ کم لوگ اِس "خود ساختہ واہمے" کا شکار ہوئے تو ہمارے وطن کی تعلیمیافتہ پبلک کی عقلی زندگی کے لئے یہ اک فالِ نیک ہے! اگر یہ متعدی مرض قطعاً نیاز تک محدود رہتا تو ہمارے "شہرِ علم و فہم" کے اندر بہتر صفائی و پاکیزگی (Sanitation) کی علامت ہوتی! کسی پر کیا مصیبت پڑی ہے کہ عریاں رسوائیوں کی جگہ "مقدس اسرارِ سربستہ" کے "شیخ چلی" کے سے خواب دیکھے، اور پھر خود ہی "صاحب الاسرار" بنجائے؟! "جنتِ ابلہاں" کی تعمیر بھی بعض اوقات کیسی "خوش طرح" ہوا کرتی ہے!! حضرت نیاز و جناب فراق کے باہمی "رازِ دو نیاز" "من ترا ناقد بگویم تو مرا فاضل بگو" پر ہم اِن بزرگانِ "گرفتار یکدگر" کو کس طرح متنبہ کریں کہ علم و انتقادِ صحیح و صالح کے مستقبلِ قریب کی صبحِ سعادت میں اُن کے "حجاب اکبر" کیسے چاک ہوں گے! ؎

بوقتِ صبح شود ہمچو روز معلومت
کہ با کہ باختہ عشق در شبِ دیجور؟!

علامہ نیاز کے علم کا پٹارا پھر کھلتا ہے۔ فرماتے ہیں (اور اپنی ازلی شانِ ہمہ دانی و "علام الغیوبی" کے ساتھ!)
"مجھے فراق کی اِس خصوصیت کا علم آج نہیں، بہت عرصے سے تھا، اُسی وقت سے جب اول اول میں اُن سے یہاں لکھنؤ میں ملا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اُن کے اِس ذوق کا کسی نہ کسی دن نکھرتہ ہو کر ظاہر ہو جانا لازم ہے، اور آخر کار "آبگینے" کو "تندیٔ صہبا" سے پگھل جانا پڑا"!

کیوں نہ ہو! ؎

دُور بینانِ ازل، کوریٔ چشمِ بدبیں!
ہم در اینجا نگرند آنچہ در آنجا بینید!

تاہم یہ مسئلہ تحقیق طلب ہے کہ "سیلانِ صہبا" نتیجہ ہوا "تندیٔ صہبا" کا یا "آبگینیتِ مینا" کا؟!———یعنی یہ "طلاقتِ لسانی" تھی یا "دریدہ دہنی"؟!

"زلیخا" کو اپنے ذاتی "عشق" کی تحریک، بازارِ مصر میں لے آئی۔ یا "چاہِ کنعان" کے کسی "یوسف کے حُسنِ روز افزوں" کی مسلسل تازیانہ زنی اُس کے "پردۂ عصمت" کی "دریدگی" کی علتِ اصلی بنی؟!

ہمارا خیال ہے کہ اگر "تندیٔ صہبا" کافی "تند" نہ بھی ہوتی تب بھی "آبگینے" کو "گداختہ" ہو جانا پڑتا محض اِس وجہ مُوجہ سے کہ جناب نیاز کی "مخبریٔ صادق" ایسا ہی چاہتی تھی! ہمیں ایک بزرگ اِس وقت بُری طرح یاد آرہے ہیں، جو مرحوم حکیم اجمل خاں صاحب کے "دربارِ مطب" میں بیٹھا کرتے تھے، اور "مسیح الملکؒ" کے "خواہ مخواہ طبی مُشیر" بنے رہتے تھے! مریضوں کے امراض کی تشخیص وہ ماشاء اللہ حکیم صاحب سے بھی دو قدم پہلے فرما دیا کرتے تھے! لیکن اُن کی تحقیقِ طبی کا خاص گوشہ مریض کے گزشتہ اعمالنامے کی "پیغمبرانہ قرأت" ہوتی تھی! ایک دن کا ذکر ہے کہ اک شریف صورت و ثقہ سیرت مریض، حکیم صاحب سے دوچار ہوئے۔ حکیم صاحب کے اِلٰہی "نفسِ ناطقہ" نے حسبِ معمول اِس غریب کے بھی بے تحاشا بخئے اُدھیڑنے شروع کردئے، چنانچہ اب ایک "رازِ فاش" یہ بھی تھا کہ "آپ کو آتشک بھی ہوئی ہے!"۔۔۔ غریب حواس باختہ مریض نے کانوں پر ہاتھ رکھے کہ "حضرت! میں آتشک کو جانتا تک نہیں! یہ بیماری مجھے نہ کبھی ہوئی ہے نہ اِس وقت ہے!"۔۔۔ مجسمۂ اعتماد علی النفس "مشیرِ طبی" نے چھوٹتے ہی کہا:- "اچھا اب ہو جائیگی!!" ؎

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بگردشِ رطلِ گراں بگردانیم!

اب کچھ "السنۂ مشرقیہ" کے متعلق "اجتہاداتِ عالیہ و تصرفاتِ غالیہ" سے شادکام ہو جئے! نیاز صاحب گلفشاں ہوتے ہیں:-

"اِس سے انکار ممکن نہیں کہ اِس فرض (ہمہ جہت تنقید و تنقیح غزل گوئی!) سے عُہدہ برآ ہونے میں اُنھوں (فراق) نے "وسعت و گہرائی" (واوین ہمارے ہیں!۔ نقاد) کی کسی حد کو مَس کئے بغیر نہ چھوڑا!"

ہم کہتے ہیں کہ "اِس سے بھی انکار ممکن نہیں" کہ علّامہ نیاز نے اِن منقولہ بالا سطور کے اک خاص موقعے پر زبان و ادب کی لمبائی چوڑائی اور گہرائی کی کسی حد کو مس کئے بغیر نہ چھوڑا!"۔۔۔ دو قطعاً مختلف اللسان الفاظ ۔۔۔ "وسعت، گہرائی"۔۔۔ کو اِس طرح اک واحد ترکیب ("وسعت و گہرائی") میں عربی و فارسی حرفِ عطفِ تفسیری۔۔۔ "و"۔۔۔ سے ہم رشتہ کرنا، اور ایسا کرکے زبان و قواعدِ زبان کے مُبادیات کے متعلق طفل مکتبی" کا ثبوت دینا، کیا یہ اُسی خدائیگانہ زبان دانی و شعر فہمی و سُخن سنجی کی "آیۂ قاہرہ" ہے جس کے سامنے "خدائے سخن" تیر پیغمبری کے درجے سے بھی گرا ہوا نظر آتا ہے؟!" ؎

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی!!

پروفیسر فراق اور جناب نیاز کی بعض دوسری ترکیبیں ۔۔۔ مثلاً "معرکتہ الآرا" وغیرہ!۔۔۔ بھی بہت معرکہ آرا واقع ہوئی ہیں!

(۳)

فراق کے مقالہ "انتقاداتِ عالیہ" کے جلوسِ میمنت مانوس کے سامنے اِس قدر نقیبانہ شور و شورش کے بعد اب جناب نیاز اصل مبحث کے میدان میں اُترتے ہیں، اور غالباً صحیح سمت مطالعہ اختیار کرکے متعارف "نظم" اردو کی حقیقی نوعیت متعین کرنے کے لئے اُس کے تاریخی ظہور و بُروز کا جائزہ لیتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ "نظم کی ابتدا کا زمانہ اردو شاعری میں اُس وقت سے ہوتا ہے کہ جب مُلک انتہائی ذلت و نکبت کے دَور سے گزر رہا تھا! ------- گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھنا چاہیئے کہ نظم نگاری کی بُنیاد کا سبب احساس کی وہ ضرب کاری تھی جس نے دفعتہً اربابِ وطن کو ایک جگہ ٹھہر کر سوچنے، اور زندگی کے ہر شعبے میں عمل کی نئی راہیں ڈھونڈنے پر مجبور کر دیا! اِنہی سوچنے والوں میں ایک جماعت شعرا کی بھی تھی! ------- بجائے غزلوں کے قومی نظموں کی طرف عام توجہ پیدا ہوگئی! اِسی سلسلے میں آہستہ آہستہ محاکاتی، جذباتی، اور غنائی نظمیں بھی لکھی جانے لگیں!"

یہ حرف بحرف صحیح "تاریخی تبصرہ" "نظم" کی پیدائش، حالاتِ پیدائش، محرکاتِ پیدائش، اور اِس ادبی مولود کے عناصرِ مزاجی کا ہے! تاہم حضرتِ نیاز سے ہمیں اک سنگین فردگذاشت کی شکایت ہے! وہ صرف "نیم صداقت" ("half - truth") پر قانع رہے! اِسی کے ساتھ ضمناً وہ "غزل" (خاصکر متداول غزل!) کے کشت و زمین، آب و ہوا، موسم و فصل، تخم و بیخ، گُل و ثمر وغیرہ کا بھی مشاہدہ کرسکتے تھے، اور اِتنی ہی آسانی سے کہ اگر ع

تابِ اندیشہ نداری، بنگاہے دریاب!

"نظم" اگر "غزل" کا رَدِّ فعل تھی، اور اُس انقلابِ تمدنی کا ثمرِ شیریں تھی، جس نے اہلِ وطن کے دماغ و نفس کی سرزمین میں احساسِ ذلت و نکبت، بیداریٔ تفکر و تدبر، اک ضربِ کاری کے نتیجے میں پیدا ہونے والی روحِ قلب کی "رستاخیز" کا تخمِ حیات بو یا تھا!، تو کیا اِسی کا نتیجۂ صریح یہ حقیقت بھی نہ تھی کہ ہماری قدیم، نیز عموماً و اصولاً موجودہ و مروجہ "غزل" اُس "شجرۂ خبیثہ" کا "ثمرِ زقومی" تھی، جو زوالِ اختلاط، سلبِ حکومت و حریت، نشو و نمائے جہل و ظلمت، پرورشِ جمود و ہلاکت، طوفانِ غلط کاری و زشت عملی، دونِ ہمتی و پستِ فطرتی، بحرانِ یاس و حرمان، تمام و کمال غلبۂ حسرت، یکسر احاطۂ قنوطیت، فقدانِ احساس و غیابِ غیرت وغیرہ وغیرہ کے رگ و ریشہ سے اپنا ملعون تنہ و بیخ بنا چکا تھا؟!——سبحان اللہ، آفتابِ نظم کی صبحِ سعادت!

دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند   واندراں ظلمتِ شب آبِ حیاتم دادند!
چہ مبارک سحرے بود و چہ فرخندہ شبے   آں شبِ قدر کہ ایں تازہ براتم دادند!
من اگر کام روا گشتم و خوشدل، چہ عجب   مستحق بودم و اینہا بہ زکاتم دادند!
بعد ازیں روئے من و آئینۂ حسنِ نگار   کہ دراں جا خبر از جلوۂ ذاتم دادند!
شکرِ شکر بشکرانہ بیفشاں اے دل!   کہ نگارِ خوش و شیریں حرکاتم دادند!
ایں ہمہ قند و شکر کز سخنم میریزد   اجرِ صبریست کزاں شاخِ نباتم دادند!
بحیاتِ ابد آں روز رسانید مرا   خطِ آزادگی از حسن بساتم دادند!

ہمتِ حافظ و انفاسِ سحرخیزاں بود
کہ ز بندِ غمِ ایام نجاتم دادند!

بلاشبہ یہ نوزائیدہ اُردو نظم کا شادیانۂ ولادت بنایا جاسکتا ہے!

"غزلِ مرحوم" کے انفاسِ آخریں میں کہے ہوئے کلماتِ مشوم اگر آپ سننا چاہتے ہیں تو قدیم تاریخ کے "امام باڑے" اور "عاشور خانے" کے در و دیوار آج بھی اُس کے ریکارڈوں سے گونجتے ہیں! مثلاً:۔

ساقیا برخیز و درد دہ جام را   خاک برسر کن غمِ ایام را!
پدرم روضۂ رضواں بہ دو گندم بفروخت   ناخلف باشم اگر من بہ جوے نفروشم!
آسماں بارِ امانت نتوانست کشید   قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند!
خوشحال آنکہ ہدیہ ترا دُ سپر دجاں   آگہ نگشت ہجر کدام است و وصل چیست؟

گرچہ بدنامی ست نزدِ عاقلاں   مانمی خواہیم ننگ و نام را!
صلاحِ کار کجا و منِ خراب کجا!   ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا!
رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند   گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش!
ہزار قصر تو بنیاد محکمی دارد   ولے چہ سود؟ کہ بنیادِ عمر محکم نیست!
تو شبانہ می نمائی، بہ برِ کہ بودی امشب   کہ ہنوز چشمِ مستت اثرِ خمار دارد!
تو بخوابِ ناز بودی و من از رقیب پنہاں   کفِ پات بوسہ دادم، ز حنا شنیدہ باشی!

یہ مثالیں فارسی غزل کی ہیں، اور اُس کے متعدد ابیات حافظ سے بھی ماخوذ ہیں، لیکن حافظ کی زبان سے اک روح پرور زمزمہ سننے کے بعد مناسب معلوم ہوا کہ کمیں اُنہی کے دل و دماغ پر حبِ "بوم غزل" بسیرا لیتے لگتا ہے تو اُنہی کے ساز سے کیسا آہنگِ مرگ نکلنے لگتا ہے! اُردو میں اِن منقولات کے بالمقابل بےشمار حوالجات مل سکتے ہیں! اگر ضرورت ہو تو مُشتے نمونہ از خروارے "سُن لیجئے!

ہم اک جَو پہ سارا جہاں بیچتے ہیں!
جو بارِ آسماں و زمیں سے نہ اُٹھ سکا!   تو نے بُرا کیا دلِ ناداں اُٹھا لیا!
کسی پر مرٹ کے رہجانا ہے حسرت!   ہمیں کیا کام عمرِ جاوداں سے؟!
کہاں صبر و تحمل، آہ ننگ و نام کیا شے ہے!   میاں رو پیٹ کر ان سب کو ہم اک بار بیٹھے ہیں!
پھر دل طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے   پندار کا صنمکدہ ویراں کئے ہوئے!
ہم فقیر اپنی فقیری میں شب و روز ہیں مست   تجھ کو اے شاہ مبارک رہے شاہی تیری!
چھپر کھٹ کے عوض لازم جنازے کا بنانا ہے!
صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو   دینے لگا ہے بوسے بغیر التجا کئے!
لے شبِ وصلِ غیر بھی کاٹی   تو مجھے آزمائیگا کب تک؟!

آخری شعر کے بارے میں پروفیسر فراق کو یہ شکایت ہے کہ حضرت جوش اُسے بےغیرتی کی مثال بتاتے ہیں!—— بلاشبہ جوش صاحب کی یہ بڑی زیادتی ہے: ابھی اِس شعر کا موضوعِ محبوب تو عشق کی وہ حُرمت و حمیت ہے جس کا بیان اب بھی تشنہ رہ گیا ہے! اور جس کی پوری معراجِ ارتقا اُس وقت حاصل ہوتی کہ مومن خاں مومن اس شعر میں تصرف کرکے یوں لکھتا کہ ؎

لے شبِ وصلِ غیر بھی کاٹی
اور "شبِ قدر" اُسے بھی مانی!!

" ذوقِ فراق" کے اربابِ حال ہی "رقیبِ روسیہ" کی بخشی ہوئی اِن "سرخرویوں" کی لذت آشنا ہیں! ع

نُکتہ مغزانِ "غزل" را کے "حیا" زنجیرِ پاست!!

یہ نہ سمجھئے گا کہ مومنؔ کے عہد کی یہ "غیرتمندیاں" اب "قبرِ ماضی" میں دفن ہو چکی ہیں! نہیں یہ عفریت آج بھی اپنے "سینگ" دکھایا کرتا ہے! حسرتؔ، جو پروفیسر فراقؔ کے "انتقاداتِ عالیہ" کی رو سے دَورِ حاضرہ کے کامل و اکمل شاعر بے بدل ہیں، اور جن کا "اسٹائل" اساتذۂ اردو کے صدیوں اور قرنوں کے اسالیبِ بیان کو کوٹ کر بنایا گیا ہے (ملاحظہ فرمائیے مقالۂ پروفیسر صاحب موصوف، ص۳۵، نگار، جولائی!) آج بھی "طفیلِ غزل" کولہو کے بیل کے چکر کے اُسی نقطے پر ہیں، جس کی نشاندہی مومنؔ کا مذکورۂ بالا شعر کرتا ہے! چنانچہ فرماتے ہیں:-

دن کو ہم اُن سے بگڑتے ہیں، وہ شب کو ہم سے
رسم پابندیٔ اوقات چلی جاتی ہے!

حیرتِ حُسن نے مجبور کیا ہے حسرتؔ
وصلِ جاناں کی یونہی رات چلی جاتی ہے!

غالباً:-

رسمِ اسلاف نے مجبور کیا ہے ایسا   وہ "ہزل" آج بھی دن رات چلی جاتی ہے!

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ راسخ الاعتقاد غزل کا قدیم ڈھانچا ہی کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ اُسمیں بے اختیار دنائت و خودشکنی حلول کر جاتی ہے! مولانا محمد علی جوہر ایسے شیرِ غژاں کو دیکھئے کہ "غزل" کی "بانسری" میں اُنکا صورِ رجز کیسا پست آہنگ ہو جاتا ہے! ع

جو صحبتِ اغیار میں اس درجہ ہو بیباک   اُس شوخ کی سب حُرمت و حیا میرے لئے ہے!

اِس شعر کو اِسی غزل کے دوسرے اِس شعر سے کیا مناسبت ہے؟

یہ حورِ بہشتی کی طرف سے ہے بُلاوا   لبیک کہ مقتل کا صلہ میرے لئے ہے!!

دوسرا شعر "نظم" والے نشاۃِ ثانیہ کے "دَور" کی نوائے حیات ہے، اور پہلا "غزل کے عہدِ پارینہ" کا سخت جان ورثہ!

جنابِ نیاز بجا ہیں تو "عہدِ جدید" کے اُس "ذخیرۂ غزلیات" کی حقیقت معلوم کر لے سکتے ہیں جو عہدِ نَو کے دفترِ منظومات سے مقدار میں "بدرجہا زیادہ" واقع ہوا ہے! —— مقدار کی اِس زیادتی سے کسی کو انکار نہیں، لیکن عہدِ نَو کے اندر کسی چیز کے بجز وجود ہونے سے وہ عہدِ نَو کی مولود نہیں ہو سکتی! کتنے بکثرت خس و خاشاک بے موسم پرورش پاتے ہیں، لیکن وہ نئی فصل کی روئیدگی نہیں ہوا کرتے! آپ نے دیکھا ہوگا کہ نیشکر کے کٹ جانے کے بعد اُس کی جڑوں سے کچھ مُردار تم کے کلّے نکلتے ہیں، جنھیں کسان "پیڑی" کہا کرتے ہیں۔ مگر نہ یہ باضابطہ "فصلِ نیشکر" کہلاتی ہے نہ عموماً قندِ سیاہ کے بنانے کے کام آتی ہے! بجائے انسانوں کے استعمال کے وہ مویشی کے چارے کے مصرف میں آتی ہے، یا کبھی یونہی اُکھاڑ کر پھینک دی جاتی ہے!

—— كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ، مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ! —— غزل کا جو گیاہستان "ادبِ اردو کی نشاۃِ ثانیہ" کے بعد اب بھی خودرو پیدا ہو رہا ہے، وہ ہماری "نوبہارِ شعر و انشا" کا کاشت کردہ چمنستان "نہیں! —— بس وہی مُردہ ماضی کی سخت میراث! —— تاہم "اک خاص نفسیاتی نکتہ" ہر نشو و نمائے ادبی کے متعلق ارزانی فرمانے والے فضلا و حکما اِن باتوں کو نہیں جانتے! ع

رازِ درونِ پردہ ز رندانِ مست پُرس!
کیں حال نیست صوفیٔ عالیمقام را!!

اور یہی ناقابلِ رشک حقیقت اُن "حیرت انگیز انقلابات" کی ہے جو پروفیسر فراقؔ کو اپنی مورخانہ عینک سے نظر آتے ہیں، اور جو مملکتِ اردو کی ساری قلمرو میں برپا ہو چکے ہیں! مولانا حالیؔ نے سلفِ غزل کے تازہ ترین خلف ہی کی "جدت" نیز "گندگی" کے متعلق یہ فرمایا تھا۔

خلف اُن کے جو یاں کہ جادو بیاں ہیں   بلاغت میں مقبولِ پیر و جواں ہیں،
فصاحت میں "مشہورِ ہندوستاں" ہیں   وہ کچھ ہیں تو لے دے کے اس گوں یہاں ہیں

کہ جب شعر میں عمر ساری کھپائیں
تو "بھانڈ" اُن کی غزلیں مجالس میں گائیں!

پھر جس طرح سال خوردہ "پیرزالِ غزل" کا اعادۂ شباب ہونا اب ناممکن ہے، اسی طرح "نوعروسِ نظم" اب تخیل کی ساری پہنائیوں، نیز تغزل کی بھی ساری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ آرا ہو گئی ہے! خود جنابِ نیاز کا اعتراف ہے کہ "قومی نظموں" کے عام فروغ کے ساتھ "آہستہ آہستہ محاکاتی، جذباتی، اور رعنائی نظمیں بھی لکھی جانے لگیں"! —— پس چاہیئے کہ جدید العہد نظم کے اِس "گلِ صد برگ" کو ہاتھوں ہاتھ لیں، اور "غزلِ آنجہانی" کی بے گور

وکفن لاش کو اک با احترام تدفین بخشیں!

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا آسماں! ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک؟!
توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام دورئ جنت میں روتی چشمِ آدم کب تلک؟!

پروفیسر فراق اُردو غزل کے اندر جن "حیرت انگیز انقلابات" کا ذکر کرتے ہیں اُن کی جلوہ گاہ اُن کے رات کے خوابوں کے اُفق کے سوا کہیں نہیں! غزل میں خفیف ترین اصلاحی تبدیلی کا قدمِ اوّل یہ ہونا چاہیئے کہ وہ مسلسل و مربوط ہو جائے! بغیر اِس ربط و ضبط کے تو اک "سرِ راہ کھڑے ہوئے آدمی" ("the man in the street") کے ساتھ ہمارا چلتا ہوا اختطاب بھی بامعنی نہیں ہوسکتا! کجا "پردہ نشینوں کے ساتھ حرف و حکایاتِ محبت"؟! ——— "حیوانِ ناطق و عاقل" ——— انسان ——— کی گفتگو کی یہ شرطِ اولین ہنوز ناپید ہے! پھر پروفیسر فراق کی بشارت دادہ "انقلابِ غزل" ہم کہاں ڈھونڈیں؟! ؎

میں بے پتا کروں تو کروں جستجو کہاں؟
اِتنا مجھے بتا دے کہ ملتا ہے تو کہاں؟!

کیا شب و روز کی کسی صحبت میں ہماری گفتگو ایسی ہی "رجماً بالغیب" ہوا کرتی ہے جو ہماری متعارف بیربط و خبط غزل کا معلوم لب و لہجہ ہے؟! کیا کیا ہم حسینوں کے رعبِ حُسن سے ایسے حواس باختہ ہو جاتے ہیں کہ "آئیں بائیں شائیں" الاپنے لگتے ہیں؟! اور اُسے "آہنگِ غزل" کہتے ہیں؟!

یوں کہتے تھے یہ کہتے وہ کہتے جو وہ آتا
سب کہنے کی باتیں تھیں کچھ بھی نہ کہا جاتا!

"نشاۃِ ثانیہ" کے پورے باپرو بال غزل گو، حسرت، شاید اِس سوال کا جواب اثبات میں دیتے ہیں، جبکہ وہ فرماتے ہیں کہ:-

"بیزبانی" ترجمانِ شوقِ بیحد ہو تو ہو
ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں!

ہاں پھر کیا ہم اپنے جانِ جانِ معشوق کو خط بھی یونہی "زبانِ گنگو" "لسانِ ماقل و دل" میں لکھا کرتے ہیں؟ ہم پر "اعجازِ ایجاز" کا فن" ہی غالب رہتا ہے؟! اور ہم "لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم" کے "بحرانِ شوق" سے کبھی اس "غرضِ فن" کو غرق نہیں کر دیتے؟! آخر "خدائے سخن" "میر" اپنی "نثر" کی زبانِ فطری میں اپنے مخاطبِ الفت کو کس طرح خط لکھا کرتا تھا؟! ؎

خط لکھتے لکھتے میر نے دفتر کئے رواں!
افراطِ اشتیاق نے آخر بڑھائی بات!

ہمیں "غزل کے ظرفِ تنگنائے" کی مزعومہ "لامحدود وُسعتوں" (مقالۂ فراق، صفحہ ۱۳۱، سطر اوّل) کے بارے میں بھی کچھ عرض کرنا ہے! مان لیجئے کہ لسان الغیب غالب اپنے اِس "مجوزہ مسلکِ ادبی" (Poetic Creed) میں قابلِ اعتماد نہیں تھا کہ ؎

"بقدرِ شوق" نہیں "ظرفِ تنگنائے غزل"
"کچھ اور" چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے!

آپ اپنے اِسی دعوے پر اصرار کئے جائیے کہ غزل کا ایک ایک مصرع ہزار داستاں در آغوش ہوتا ہے! اور شاعر کا دیوان و کلیات "کائنات بر دوش"! اس لئے کہ، جیسی کہ آپ دعوتِ نظر دیتے ہیں، غزل اک ہمہ گیر صنفِ شعر و فکر ہے جو تمامی تخیلات و جذبات، علوم و معارف، ارشاد و ہدایت وغیرہ پر حاوی واقع ہوئی ہے! ——— ہمارا جواب یہ ہے کہ اول تو غزل کی "ہزار داستانی"، اُس کی بیربط بیانی کی تلافی و نعم البدل نہیں! ہم ایک "وصف" کو ایک "عیب" کی قیمت میں نہیں خرید سکتے! قطعِ نظر اس سے، سوال یہ ہے کہ آیا غزل کی ہمہ دانی و ہمہ بیانی سرے سے کوئی خوبی بھی ہے؟! غزل اوّلاً و آخراً، ازلاً و ابداً اک "داستانِ حسن و عشق" تھی! فلسفہ طرازی، اخلاق آموزی، تصوف گوئی، الہٰیات فروشی، معارف باری، سائنس ترجمانی، سیاسیات تراشی، نفسیات نوائی وغیرہ وغیرہ، "بزمِ حُسن" اور "کوئے یار" کو "مسندِ حکمت، مدرسۂ اخلاقیات، تکیۂ درویشاں، منبرِ مسجد، کُرسئ پروفیسر، دار التجربۂ طبعیات، معملِ کیمیائیات، میز ایڈیٹر، اور تجربہ گاہِ تحلیلِ نفسی" تو بنا نہیں سکتی! ——— اس لئے کہ یہ اُس کے بس کی بات نہیں ——— البتہ حریمِ جمال اور کوچۂ جاناں کی فضائے لطیف و رنگین کو مکدر و مسخ ضرور کر سکتی ہے!

چاندنی، قوسِ قزح، عورت، شگوفہ، لالہ زار علم کا اِن نرم شانوں پر کوئی رکھتا ہے بار؟!
"رُوشنائی" میں کہیں کھلتی ہے "موجِ ماہتاب"؟! کیا کوئی "اوراقِ گُل" پر طبع کرتا ہے "کتاب"؟!
سارے عالم میں نہیں اس بدمذاقی کا جواب "کاکلِ افسانہ" ہو "دوشِ حقیقت" پر سوار؟!
حُسن کا "آغوشِ رنگیں"، دلفریب و دلربا علم سے بجائے "اقلیدس کا محض اک دائرہ"!
"مصحفِ روئے کتابی" روکشِ نازِ گلاب اور بجائے "لُغت" یا "دفترِ علمِ حساب"!
"نغمۂ شیریں" کے دامن میں ہو "شورِ کائنات"! "بزم" کا "دش" میں جلے "شمعِ شبستانِ شباب"!

صُبح "عرق بحث" ہو غنچے کھلانے کے عوض
"درس دیں موجیں صبا کی گنگنانے" کے عوض!

لاریب کہ غزلِ مشرقی اور "غزالِ مشرقی" (ایشیا کی عورت) یکسر ہم سیرت واقع ہوئی ہیں!

"جہانگیریت" پسند، متعارف غزل گو "غزل" کو "انسائیکلو پیڈیا برٹینکا" بنا دینا چاہتے ہیں!

غزل کی "بزمِ خاص" کے "گوشۂ خلوت" میں "لامحدود وسعتیں" پیدا کرنے والے اربابِ تغزل شاید اک بُتِ خوشخط اور اک صنمِ خوش اندام پر "ٹیک تنی" کی وہ نوبت لانا چاہتے ہیں جس کے تحت اُس کے ناخن، ہلال نما اور اُس کے خوش سَواد سبزۂ خط کا یہ منظر ہو جائے گا: ؎

ناخن ہمہ بالیدہ شدہ سُم گشتہ!
ریشش زعقب برآمدہ دُم گشتہ!!

الغرض "حسن و عشق" کے حدود کو "پامال" کر کے اُن سے "متجاوز ہونا" غزل کی "بالیدگی" نہیں ہے۔ اُس کے اعتبار کے نمو کی بیراہہ روی ہے! تن درستی نہیں "تن نادرستی"!!

نظریۂ تغزل کی اس مضحکہ خیز بوالعجبی پر بھی مزید بوالعجبی یہ ہے کہ نیاز صاحب پروفیسر فراق کو "استفادات عالیہ" کا سرٹیفکٹ دے رہے ہیں! ——— درانحالیکہ ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے کہ اول الذکر بزرگ نے جناب اصغر گونڈوی کی غزلیات پر نقد کرتے ہوئے اُن کے مشہور میلانِ "تفلسف و تصوف" پر اُن کے خلاف بار بار سخت ایرادات کئے تھے، اور غزل کو "مثنوی مولانائے روم" بنانے کے خلاف شدید احتجاج کیا تھا! اب "استفادات عالیہ" کی یہ کیسی قلابازی ہے؟! مگر محاذ کی اس تبدیلی میں اصل کارفرما عنصر ممکن ہے کہیں "عزیز دوست" کی محبت ہو، نیز کسی مبغوض دشمن کی عداوت! ——— سچ ہے "اک بلند معیار کے نقد و تبصرہ کے لئے ذہن جس توازن و تعادل کو چاہتا ہے اُس کے عطا کرنے میں فطرت بہت بخیل واقع ہوئی ہے!" (نگار، جولائی، ص ۵، سطر ۹۔۱۰)

ہم اس پر اتنا ہی اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ "فطرت کے اس بخل" کے قفل کے کھولنے میں حضرت نیاز و جناب فراق کی آرزو مندیاں اور خود بینیاں بھی "کچھ کلید" نہ ثابت ہوئیں! ع

آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں؟!

غزل کو چاہیے کہ حسن و عشق کے کُنجِ گلپوش میں زاویہ گزیں ہو جائے، اور اُسے کونین کا نعم البدل جانے! ع

من ایں مقام بہ دُنیا و آخرت نہ دہم!

ستم ظریفی یہ ہے کہ اہلِ غزل نے اس گوشۂ حسین کو تو حقیقۃً مس نہیں کیا ——— وہ صدیوں سے اُس کا پروانہ وار طواف ہی کر رہے ہیں، شانِ باریابی اُنھیں نصیب نہیں ہوئی! ——— اور دوسری طرف اُنھوں نے اُن میدانوں میں بیہودہ دراندازیاں کیں جو دراصل رُباعی قطعہ، مثنوی، قصیدہ، بلکہ مرثیہ تک کے "مخصوص و محفوظ" حلقے تھے! ؎

تو کارِ خود ت را نکو ساختی؟
کہ با دیگراں نیز پرداختی؟!

انسانی منطق یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ ایک غزل کس بنیاد و اساس پر اک "واحد تسوید" کہلاتی ہے؟! اگر مختلف، متفاوت، متباین، متضاد، متصادم، باہم دست و گریباں شعر بھی ایک ہی غزل کے "اجزائے لاینفک" ہو سکتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ماشاءاللہ غزل "خنثیٰ سخن" کی ایسی غزال جمیل ہے جو مصر کی (Sphinx) ("ابوالہول") کا ہندوستانی مثنیٰ واقع ہوئی ہے! کیا صرف ایک ہی وزن و بحر اور ردیف و قافیہ اُس کی "انفرادیت" کے لئے کافی ہے؟ لیکن ہر چیز کی بیرونی صورت کے ساتھ اُس کی اک معنوی سیرت بھی لازماً ہوا کرتی ہے ——— اور غزل ایسی مزعومہ "داخلی" شاعری میں تو یہ شے عین "بیت الغزل" ہونی چاہیئے! ———
ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ "قالب" کے بعد اس "قلب" میں، ایک جُدا و علیحدہ غزل کا منفردانہ مابہ الامتیاز کیا ہے؟ یقیناً ایسی کوئی اندرونی وحدت و تشخص معرضِ وجود میں نہیں! اک بظاہر واحد و مستقل غزل حقیقۃً اک چوں چوں کے مربّے کا مرتبان ہے، یا اک بھان متی کا پٹارا، یا سارے جہان کا اک چڑیا خانہ!!

لیکن نہیں، ذرا ٹھہرئیے! ابھی ایک معیارِ تقسیم غزل کا باقی ہے! ہمارا مشہود و ذہنی یہ حقیقت ہے کہ ایک غزل کا طول یوں ناپا جا سکتا ہے کہ اُس میں "۵ یا ۷ یا ۱۱ شعر" ہوتے ہیں! ——— اس ضابطے میں یہ اصول "صوتیات" (Phonetics) مُضمر معلوم ہوتا ہے کہ وہاں پہنچ کر ایک غزل بن جاتی ہے جہاں قافیہ پیمائی کرتے کرتے "شاعر کی سانس ٹوٹ جائے"! ؎

وہی منزل ہے جہاں ٹھہرے حیاتِ گُزراں!
کہیئے راہِ فنا کوئی "نہ فرسنگ ہے نہ میل"!

کون ہے جو بصحتِ نفس و ثباتِ ہوش اس کا انکار کرسکتا ہے کہ غزل درِ اصل اک "غیر مجنس و ناہموار مُواد" ("heterogenous mass") خیالات و حسیات کا ہے، جس کے مختلف اشعار بجائے" ایک غزل کے ابیات" ہونے کے غزلگو مسودہ نویس کے "منتشر فردیات" ہیں، جنہیں اُس کے "افکارِ پریشان" ادا ہوئے ہیں! ع

من "قاش" فروش" دلِ صد پارہ" خویشم!

ہم دیکھتے ہیں کہ غزل آج تک اس ریزہ نگاری کی "سُنتِ سلف" کے قلادۂ غلامی سے گلو خلاص نہیں ہوئی! پھر ہم حیران ہیں کہ اُن "حیرت انگیز انقلابات کے محشر کو کس "چوہے کے بل" میں ڈھونڈیں جو لبقولِ پروفیسر فراق، غزل کی دنیا میں گزشتہ نصف صدی سے گرج رہا ہے؟!——

" وادیِ نمل" کے اندر ایک "مورِ ضعیف" آسمان سر پر اُٹھائے ہوئے ہے کہ يَا أَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوا مَسَاكِنَكُمْ، لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمَانُ وَجُنُودُهُ!! —— ہمارا خیال ہے کہ حضرتِ سلیمانؑ اس ننھی سی منادی پر سوائے اس کے کیا کرسکتے تھے کہ فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِنْ قَوْلِهَا!! ؎

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خون نہ نکلا!

ہم اِن بزرگوں کی مصیبت کو سمجھتے ہیں! اُن کا نعرۂ جنگ یہی تو ہے کہ إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَيْهِ! وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِمْ لَمُهْتَدُونَ!

افسوس ہے کہ ہم کو اِس کا جواب سوائے اس کے نہیں نظر آتا کہ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ؟! ع

ہر کس کہ شد صاحب نظر، "دینِ بزرگاں" خوش نکرد!

با اینہمہ، نیاز صاحب، اپنے اک" عزیز دوست" کے واجب الادا "اخراج" کی ادائی میں، اور اپنے اک" دیرینہ دشمن" کے بارے میں اپنے جگر سوز" عناد" کی آسودگی میں (!!)، غزل کا "قصیدۂ مدحیہ"، نظم کے" ہجو نامے" کے پہلو بہ پہلو، یوں تصنیف فرماتے ہیں:-

" آہنگِ نظم اک ملکیتِ عامہ کی شکل رکھتی ہے، اور آہنگ غزل بالکل خاصہ کی چیز ہے! (اس بیان میں بہترین "صنعتِ تضاد" موجود ہے!——

غزل، اِس کے قطعاً علی الرغم، اک" پنچایتی تعشق سرائی" کا نام ہے!—— نقاد) اُس کا مقصود دوسروں کے کانوں تک پہنچنا ہے! اس کا صرف" اپنے سامعہ" کو متاثر کرنا (جو" اپنا سامعۂ گم گشتہ" خود فراموش غزلگو کو" مشاعرے" کے حاضرین کے پچاس ہزار کانوں کے اندر جاکر ملتا ہے! ناظم برین خطاب" سامعۂ خویش"! ستم ظریفی دیکھیئے کہ شعرائے کرام اپنا" اپنا کان" اپنی کنپٹی پر" پکڑ کر" دیکھتے نہیں، اور اِس افواہ پر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں کہ" کوا آپ کا کان لے گیا!" —— شاید اب ہمارے" کان کھول دینے" سے اِن بزرگوں کے" کان ہو جائیں"! —— ن") اُس میں ہنگامے کی کیفیت ہے، اِس میں "سکون" کی (جو عبارت ہے مشاعرہ گاہ کے "شور نشور" !—— ن") وہ ایک رائے زنی ہے جو انتقاد و تبصرہ چاہتی ہے، اور یہ اس سے بے نیاز ہے (غالباً حضرتِ نیاز" بدیہیاً" کے اعتراف سے بھی" بے نیاز" واقع ہوئے ہیں، مشاعروں میں شمع مشاعرہ سامنے رکھنے والے غزل سرا شاعر کے یہ تکیہ ہائے کلام کہ " ملاحظہ فرمایئے، شعر عرض کیا ہے!" اور لعدہ" آمد طوفان داد"، "آداب، آداب!" کے کلمات اور غیر مختتم تسلسل سے" اُٹھنے" کے حرکات وغیرہ لاریب، کہ "بے نیازیِ انتقاد و تبصرہ" ہی کے" آیاتِ بینات" ہیں!!——— ن") اُس میں تحریک پیدا کرنے کے لئے دوسروں کے جذبات کی شرکت ضروری ہے، اور اِس میں کسی خارجی تحریک کی ضرورت نہیں (اس لئے کہ مشاعرے کا "مصرعِ طرح" کا اعلان، بتصریح" ردیف و قافیہ"، تو اعماقِ قلب کی اک" داخلی تحریک" ہے! جس پر ہمارے شعرائے استغنا شیوہ دور دراز مقامات میں منعقد ہونے والے" بازارہائے عکاظ" مشاعرہ میں بسواری ریل و موٹر و ٹانگہ و چھکڑا رواں، دواں، پراں چلے جاتے ہیں! سبحان اللہ بریں "بے نیازی تحریکِ خارجی"!—— ن") اُس کی تحلیل کے بعد اک صدائے بازگشت پیدا ہوتی ہے، اور اِس کے تجزیہ کے بعد صرف اک کراہ (جو اتنی دل دوز اور زیر لب ہوا کرتی ہے کہ" ہمہ تن گوش" ہو جانے اور چند" مائکروفون" استعمال کرنے پر" شعراء کے "دنگل" کے" سامعہ نواز شور و شغب" میں سُنائی دیتی ہے!—— ن")........

وہ بغیر خیالِ" آورد" کے از خود وجود میں نہیں آتی، اور یہ صرف" آمد" ہے جس میں بسا اوقات قصد و ارادہ کو بھی خبر نہیں ہوتی (گویا ع گفتہ گفتہ من شدم بسیار گو!—— لفظ" آمد" میں کتنی" آورد" ہے! کیوں نہو! مشاعروں کے مسلسل" مشتہرہ مصرعہائے طرح" "اشعار آمدہ" کے مرہون ہوتے"

ہیں: ع پڑھوں میں شعر سے یوں، راگ سے جیسے "باجا" اک ذرا چھیڑئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے! ــــ "ن") ..... فنی رکھ رکھاؤ کا دونوں میں لحاظ رکھنا ...... ضروری ہے، لیکن اُس پر فن غالب آجاتا ہے۔ اور یہ فن پر! (دریں چہ شک!) ــــ "کیا زبان ہے! کیا بیان ہے! واللہ کیا "محاورہ" باندھا ہے! سُبحان اللہ یہ لفظ کیسا نبا ہا ہے!" وغیرہ وغیرہ "غلبہ بر فن" ہی کے تو مظاہر مُدہشہ ہیں؟! ــــ "ن")"

قصہ مختصر:-

کشتی خدا پہ چھوڑ دوں، لنگر کو توڑ دوں!

"منطق شکن منطق" کی اِس "دراز نفسی" کے بعد نیاز صاحب استنباط فرماتے ہیں کہ "الغرض نظم اور غزل میں بہت فرق ہے!" ــــ مگر معاً بعد کے ہی جملے میں یہ "بُونِ بعید" ایسے تشابہ و یگانگی میں مُنقلب ہو جاتا ہے جیسے کہ "ایک آغوش میں پلنے والے دو (توأم) بچے!" ــــ اور پھر دوسری ہی سطر میں نظم و غزل کچھ ایسا من تو شدم تو من شدی کا تداخل حاصل کر لیتی ہیں کہ بالفاظِ نیاز صاحب "منظومات کے اکثر وہی اشعار نظر انداز ہوا کرتے ہیں، جن کو ہم نظم سے علیحدہ کر کے ہر وقت غزل میں شامل کر سکتے ہیں، اور غزل کے وہی ابیات مکمل سمجھے جاتے ہیں جو مجرد حسن و عشق کے حدود میں پہنچکر وہی وسعت اختیار کر لیں، جس پر منظومات کی کامیابی کا انحصار ہے!"

کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی!

آپ کو "نظم" کے متعلق نیاز صاحب کا لفظ "آورد" کا اطلاق یاد ہوگا، اب یہی نظم اُس "غزل" کے گلے میں باہیں ڈالے ایک ہی "گود" میں پڑی کھیل رہی ہے جو خالصتہً "آمد" واقع ہوئی ہے! کیا "آورد" کی پیدا دار بھی مادرِ شعر اور پدرِ سخن کی "نجیب الطرفین اولاد" ہو سکتی ہے؟!

پھر ایک صفحہ اُدھر (ص۷۹، سطر ۱۱-۱۲) حضرتِ نیاز فرما چکے ہیں کہ بعض بڑے غزل گو "بہتر نظم گو" تھے، لیکن وہ:

"جب واقعات و حالات پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اِس وقت ہندوستان میں وہ شعراء بہتر نظم لکھنے والے ہیں جو کسی وقت، اور شاید اب بھی، بہترین غزل کہہ سکتے ہیں! اس لئے نظم کی کامیابی تو بغیر تغزل کے لگاؤ کے ممکن نہیں، اور غزل گوئی اِس کی محتاج نہیں! یہ (غزل) اک "دبستانی چیز" ہے جو شاعر میں نظم لکھنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے، اور اِس منزل سے گزرے بغیر مقصود تک پہنچنا دُشوار ہے!"

یہ اعتراف اپنی تشریح خود کر رہا ہے! گویا "غزل" "تیاری کے دَور" کا اک ابتدائی مرحلہ ہے، اور "نظم" "شعر کی "منزلِ مقصود"! نظم میں غزل شامل ہے، غزل میں نظم نہیں! غزل طفلِ مکتب کی "دبستانی چیز" ہے، اور نظم "منتہی الکلام" کا مقام!!

مگر مسٹر نیاز کی "عربدہ جوئی" اور "برخود پیچیدگی" کی پیمائش آسان نہیں! چنانچہ ارشاد ہوتا ہے (اور کاسٹنگ ووٹ" کی شانِ "ڈکٹیٹری" سے!) کہ ــــ "اگر مجھے مجبور کیا جائے کہ میں اِن میں سے کسی ایک کو ترجیح دوں تو میرا فیصلہ یقیناً غزل کے حق میں ہوگا، کیونکہ صحیح معنی میں شاعری کی ابتدا دنیا میں غزل سے ہوئی ہے!"

گویا

"اگر مجھے اختیارِ انتخاب دیا جائے کہ میں علم و معرفت کا کونسا مقام پسند کرتا ہوں تو میرا فیصلہ یقیناً "انفینٹ کلاس" کے حق میں ہوگا، اس لئے کہ حقیقت نفس الامری میں "درس و تدریس" کی "بسم اللہ" دُنیا میں "انفینٹ کلاس" ہی سے ہوئی ہے!!

صَدَقتَ یا "مجتہد العصر" حضرتِ نیاز! ع

فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست!

(۳)

پروفیسر فراق کا مقالہ!

پروفیسر فراق نے چالیس صفحوں کا اک دریا دریا، صحرا صحرا مقالہ لکھا ہے! اور شش جہت میں دست افشانی و پاکوبی، پیش قدمی و پسپائی، پیچ و تاب خوری و تعل در آتشی کا اک بوقلمون تماشا (Panoramic Melodrama) دکھایا ہے! معانی و مطالب کے شتر بیہارِ انبار، اُس کی تکرار، اور اس پر اصرار، نیز حشو و زائد کے انبار کا یہ حال ہے کہ دلائل ساطعہ کی اس ہنگامہ آرائی اور براہین قاطعہ کی اس آتش افروزی کی اگر تعلیل کی جائے تو اک چشتابِ برق اور تبسم شرار سے زیادہ ثابت ہو! اس مقالۂ طول طویل کے "پیل گرانڈیل" کا اگر ذرا گرم نظر نقد

کی آنچ پر "مار الجحم" نکالا جائے تو معلوم ہو کہ وہ اک موشگاف "حقیر" تھا! ؎

بھرم کُھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا
اگر اس طرّۂ پُرپیچ و خم کا پیچ و خم نکلے!

چنانچہ ہم اپنی تیز نظری و گرم نگاہی سے اُسے گداختہ کئے ڈالتے ہیں، اور اس تقطیر سے جو "چند قطرہائے خون" نکلتے ہیں اُن کا "Blood examination" (معاینۂ خون) کرتے ہیں! آپ دیکھیں گے کہ کہنہ سال پیرزالِ غزل کے متعلق پروفیسر رگھوپت سہائے کا یہ سارا طومارِ ہزل اور پشتارۂ زٹل دو ایک ضربتوں میں گرد بن کر اُڑ جائے گا! ؎

ذرۂ عشقے جہانِ عقل را غارتگر است
پنبہ گر صد تودہ باشد، آتشِ یک لشکر است!

پروفیسر فراق نے اپنے مضمون کا آغاز خالص پروفیسرانہ خود فراموشی کی اک مغالطہ خوری سے کیا ہے! آزاد صاحب انصاری کے جواب میں "نقاد" کا یہ دانشگاف جملہ اُن کے لئے اک معمّا بن گیا ہے کہ:-

"بلاشبہ ہمیں (اُردو و فارسی کی متعارف غزلوں پر) اعتراض ہے، لیکن مطلقاً غزل پر، اپنے وسیع ترین تصور میں، نہیں! بلکہ متعارف و متداول غزل پر! بے ربط و بے آہنگ غزل پر! متضاد و باہم متصادم غزل پر! موئے کمر و کوہِ سُرین والی غزل پر! اپنے ہجر و دوام اور "رقیب روسیہ" کے غلبۂ مدام والی غزل پر! قاتل شیوہ و قصاب پیشہ محبوب والی غزل پر! ——— بلکہ اُس غزل پر جو ہے "افسانۂ آں شبے کہ بایار گزشت"! ؏

سخن شناس نئی دلبرا خطا اینجاست!" (کلیم، مئی ۳۷ء)

اس پر ملتِ غزلگوئی کے سخن ناشناس، پروفیسر فراق فرماتے ہیں:-

"موصوف آخر کہہ کیا رہے ہیں؟"

ہم:-

"ممدوح آخر سمجھ کیا رہے ہیں؟!"

لاریب کہ یہ خواہ مخواہ کا مجہول المعنی بنایا ہوا جملہ اپنی وضاحت و صراحت و حقانیت میں اِس کا مصداق تھا کہ ؏

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب!

تاہم فاضلِ اجل پروفیسر اُس کے سمجھنے سے لاعلاج حد تک قاصر ثابت ہوتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ "نقاد" کا یہ جملہ اجتماعِ ضدین کا ایک لاینحل گورکھ دھندا ہے! اُسے قابلِ فہم بنانے اور اُس کے اندر ممکن و متوقع مفہوم پیدا کرنے کے لئے وہ کہتے ہیں کہ "غالباً جملے کے ابتدائی حصّے میں "نہیں" کا لفظ تھا، یا ہونا چاہئے تھا! جسے "نقاد" نے فروگزاشت کردیا اور یہ اُن کی پہلی بے سروپا بیانی ہے!"

اِس اختراع کردہ فروگزاشت پر وہ سخت گلوگیر گرفت کرتے ہیں، اور اپنے طولانی "چہل ستونی" (۴۰ صفحاتی!) مقالے میں کوئی چالیس ہی بار اِس پروار کرتے ہیں، اور اپنے جذبۂ نقد و جرح کی آسودگی کرتے ہیں! ——— درآنحالیکہ یہ گمگشتہ "نہیں" کلیم میں بھی موجود تھا، حضرت فراق نے بھی اُسے پڑھا تھا، اپنے مسودۂ مضمون میں بھی اُسے نقل کیا تھا، اور وہاں سے وہ نگار میں بھی بجنسہٖ منتقل ہوا ہے! بااینہمہ دوسرے ہی پیراگراف تک پہنچتے پہنچتے اُس کی روشنائی اُڑ گئی! اور پروفیسر صاحب کی ساری "روشنیٔ طبع" اُن پر "بلا" ہوگئی! اب اُنھیں یہ "نہیں" نہیں ملتا پر نہیں ملتا! اُنکا "قیاس" لسانی اُسے فرض کرتا ہے، اُن کی "نحو" اُسے بہم پہنچاتی ہے! تاہم اُن کی آنکھ اُسے "پیش پا اُفتادہ" نہیں دیکھ سکتی! "چشم بند، گوش بند و لب بہ بند" کا "آسن" مہاشہ رگھوپت سہائے جی ترک کرنے کے لئے تیار نہیں! ؏

چہ کنم باکہ تواں گفت کہ او
درکنارِ من و من مہجورم!

کیا یہ حضرتِ "فراق" کے تخلص کے معنی کا تصرف ہے؟! جس نے اُنھیں مشاہدات و بدیہیات سے بھی اک "ہجر و بُعد و حجاب" میں مبتلا کردیا ہے؟! یہ "بغل میں بچہ، شہر میں ڈھنڈورا" کیسی طرفہ مصیبت ہے! ——— ہماری رائے ہے کہ تبدیلیٔ تخلص پروفیسر صاحب کے لئے اک قرینِ مصلحت بات ہوگی! ورنہ اُنکا ستارۂ قسمت ہمیشہ بُرجِ نحوست ہی میں رہے گا! "فراق" کو چھوڑ دیجئے!

مزن "فالِ بد" کا ورد حالِ بد!

اچھا اب جوں توں کرکے ہمارے مصیبت زدہ دوست اِس چکر سے نکلتے ہیں، اور غزل گوئی کا صحیح تصور حاصل کرنے کے لئے اُس کا تاریخی جائزہ لینا شروع کرتے ہیں۔ تاہم اُن کی ابتدائی گفتگو، متعدد صفحوں تک، حیران کُن ہے! غالباً اُن پر "عصبیت" (nervousness) غالب آگئی ہے! وہ "لکھنؤ اسکول" پر بے طرح تبری کرتے ہیں! نیاز۔ "نقاد" کے "لبِ لعل

Completion

شکر خاص تو بہت تیغ کام ہوئے ہیں، لیکن "چودھری رگھوپت سہائے" کے "قندِ سیاہ" کے اِس "کڑھاؤ کا اُبال" بھی دیکھنے کی چیز تھی!

تاہم، ہمارے نقطۂ نظر سے جناب فراق غیر معتدل نظر نہیں آتے! "جذباتی اسکول" دراصل "محرمی اسکول" ہے! اور لکھنؤ اسکول کا صحیح تسمیہ "کربلائی اسکول" ہے: ع

ہاں کہ شغلِ گریہ "نصب العین" بن سکتا نہیں!

پروفیسر فراق نے لکھنؤ اسکول کے "امام باڑے" پر جب ضربیں لگانی شروع کیں تو بار بار ہم نے اِس دُعائیہ مصرعے کی تکرار کی: ع

نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو!

بہرحال، پروفیسر صاحب کی یہ "با دوستاں خلاف و جنگ" اِس خود فراموشانہ بدحواسی ہی کی مصداق اک حقیقت ہے کہ "بھاگ کھڑا ہونے والا ہاتھی اپنی ہی (عقبی) فوج کو پامال کیا کرتا ہے"! اُن کے زیرِ قدم آکر جو "ہزارہا جانِ شعرا" کشتہ" ہوئی ہیں اُس کا اندازہ اُن کے اِس سخت زجر و توبیخ سے کیجئے:

"اِس ذلیل قسم کی رقت سے نفرت پیدا ہوتی ہے! یہ سوز و ساز نہیں ہے! یہ رونا نہیں ہے! یہ زنخوں کی سینہ کوبی ہے! یہ اظہارِ غم نہیں ہے، یہ پھبک مارنا ہے!" (نگار، جولائی، ص ۳۱-۳۲)۔

ہم انگشت بدنداں ہیں: ع

آنچہ می بینم بہ بیداری ست یارب یا بخواب؟!

خیر، وہ آگے بڑھتے ہیں، لیکن "لال بھبھوکا" (   )

اب بھی اُن کی وحشت کا سامان بنا ہوا ہے! چنانچہ اُردو غزل گوئی کے دوسرے مابعد دَورِ ارتقا کا تعارف کرتے ہوئے اُنہیں حسرت اور اقبال کے ایسے (بقولِ عام) "سید المتغزلین" اور "سرخیلِ عساکرِ شعر" کا کلامِ تغزل بھی نسبتۂ کم ناکامیاب اور کم "مُبتذل" نظر آتا ہے!

شریمت رگھوپت سہائے جی بالکل مہاراجہ دھراج بنے ہوئے "انتقاداتِ عالیہ" کی راج گدی پر پورے "سلیقے" سے براج رہے ہیں! اور ع

زمیں کنیز ہے اور آسمان حلقہ بگوش!

لیکن بعد میں پھر جلد اُن کے حواس دُرست ہو جاتے ہیں اور اُنہیں ہوش آجاتا ہے کہ ؎

ہنستیں چند اپنے ذمے دھر چلے!
کس لئے آئے تھے ہم، کیا کر چلے؟!

مگر اب پلٹنا بھی اُنکا قیامت ہے! غزل گوئی میں عیوب ابتذال و فرسودگی کو وہ مُسترد نہیں کرتے، لیکن فرماتے یہ ہیں کہ ماضیٔ قریب میں اُردو غزل نے "حیرت انگیز انقلابات" قبول کئے ہیں! تاہم بخیال اُن کے، اِس مظہر العجائب ارتقار کا عمل اتنا پیچیدہ، اتنا ژولیدہ، اتنا شتاب رو، اِتنا مبہم رفتار واقع ہوا ہے کہ اُس کے فہم و شعور سے عہدہ برآ ہونے کے لئے غزل کا "عملی ذوق" ہی درکار ہے! وہ فرماتے ہیں کہ "غزل بڑی دق کرنے والی چیز ہے"!

یہاں اِتنی فرد گزاشت شاید ہم بہم پہنچا دیں کہ "غزلگوئی بڑی "تدقوق" کرنے والی بد پرہیزی ہے!

ایسی زمینِ انکشاف طلب میں اُن کی رفتار قدرۃً ناہموار، غیر مستقل، اُفتاں و خیزاں اور کبھی رَواں، دواں، اور پرّاں ہے! اِن میدانہائے تحقیق میں پروفیسر صاحب کو "فالو" (follow) کرنا "غول بیابانی" کے "تعاقب" سے کم دُشوار نہیں! وہ شش جہت میں حرکت کرتے ہیں! ہر ممکن و ناممکن سمت میں دامنِ تقریر پھیلاتے ہیں! پیش و پس، راست و چپ، بالا و پست، فوق و تحت جَست و خیز کرتے ہیں! وہ فلکیات کے "خمسۂ متحیرہ" کی طرح اپنی غیر التعین کجرویوں کی کسی حد کو مس کئے بغیر نہیں چھوڑتے! ——

وہ ایک قدیم شعر کو لے کر رفتارِ ترقی کا جائزہ لینا شروع کرتے ہیں، لیکن صراطِ مستقیم پر ایسی استقامت کے ساتھ کہ ایک "پُشت" آگے جا کر "تین قرن" پیچھے بازگشت کر جاتے ہیں! ؎

یہ بات کیا دمِ رفتار ہوتی جاتی ہے؟
کہ اپنے سائے سے تکرار ہوتی جاتی ہے!

اور پھر اس طۓ منازل و قطع مراحل میں "تسلسلِ ادب" کے نظریئے کی یوں داد دیجاتی ہے کہ اگر اک اونٹ (کے نقشِ قدم) کے بعد کوئی لومڑی بھی ہاتھ پڑ گئی تو اُسی پر چیخ اُٹھے کہ: "ایں ہم بچۂ شتر است!"

تاہم جو بات وہ کہنا چاہتے ہیں اور اپنی "برخود پیچیدگی" کی کشاکش میں کہہ نہیں سکتے، وہ یہ ہو کہ مسلسل اصلاح و ترقی، نقوشِ ثانی پر نقوشِ ثانی، منازل پر منازل، مراحل پر مراحل، مراتب پر مراتب، اُردو غزل (راسخ الاعتقاد مسلک والی!) نے پیہم طے کئے ہیں تا آنکہ اُس کی "نشاۃِ ثانیہ (نشاۃ الثانیہ ثہنیا)

اب مین شباب پر پہنچ گئی ہے"!

تُف ہے مرغی کے بچے کی اِس دن دونی رات چوگنی بڑھوتری پر!

اور حیف ہے "طاؤسِ نظم" کے اُس سُست رو رقص پر!!

لیکن عجیب تر یہ ہے کہ اردو شاعری کی ترقیٔ معکوس کی اِس پیمائش میں جو اُفتاد پروفیسر فراق کے "قلم تاریخ رقم" سے اردو نظم پر پڑی ہے وہ یہ ہے کہ "اقبال کے" بالِ جبریل" اور "ضربِ کلیم" کے شبد ہائے تازہ" اب گُل پژمُردہ بن چکے ہیں!" ——— "بہ استثنائے اُن کی غزلوں کے"! ——— اس لئے کہ ماشاء اللہ "پیرزالِ غزل" تو وہ سدا بہار دوشیزہ ہے کہ "بوڑھی ہوگئی چِک مور دیسی"!

سچ ہے غزل بھلا کس طرح عمر سے اُتر سکتی ہے! ع

کہ ایں عجوزہ عروسِ ہزار داماد است!

اور ہاں جوش کے فن پر جو آفت اِس دَورِ خوش ذوقی و حیات پروری میں آئی ہے وہ یہ ہے کہ "کسان" اور "بغاوت" "جیسی" ترکنوں" کی گرم نوائیاں، "سیاسی شور و شغب (کے بھوت کی) سامعہ خراشی سے زیادہ نہیں!" (نگار جون)

تاہم وہ "جذباتی اسکول" کے "گو رِ غریباں" والے ذوق سے مُتاثر ہونے سے اِنکار کرتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ اقبال اور جوش کچھ نہ سہی، لیکن وہ "بالکل دفن کرنے کے قابل نہیں سمجھے جاسکتے"! (ص۳۶ والم)

پھر عزیب اقبال و جوش کے یہ شکوے کیا بیجا ہیں کہ:-

من نوائے شاعرِ فرداستم! (اقبال)

قدرت سے مِلا ہے مجھکو صد حیف یہ حکم
"بہروں" کو سُنائے جا فسانہ اپنا! (جوش)

یا،

اندھوں سے جب پڑا ہے زمانے میں سابقہ　　اے جوش آپ یوسفِ کنعاں ہُوئے تو کیا!

اللہ اللہ، جوش کی نشاۃِ ثانیہ والی رستاخیز کی پیامبر نظمیں، اور وہ صرف سامعہ خراش سیاسی غوغا؟!

بزدلی، بے غیرتی، کینہ وری، رُسوائیاں　　تجھ پہ اِتنی لعنتیں! افسوس اے ہندوستاں!
بَرچھیاں محزون، بِگُل خاموش، پرچم تارتار!　　خون ہمدردوں کے دل میں، اور سینے ہیں فگار!
کون ہندو سے کہے اے "لالہ دولت نواز!"　　اب بھی گرُدانِ جہانبھارت پہ کیا تجھکو ہے ناز؟
کون "مومن" سے کہے اے "مسلم بے اعتبار!"　　لافتیٰ الاعلی، لاسیف الا ذوالفقار!"

کشتیٔ ملت کو جوئے خوں میں کھینے کیلئے
کون بڑھتا ہے لہو تھوڑا سا دینے کیلئے؟ (جوش)

"غزل" کے جمال و کمال کے ذکر کی تر زبانی کے اِس موقعے پر ہمارے لالہ رگھوپت سہائے صاحب کا جلال دیدنی ہے! اُن کی ہیئت کذائی لطف لینے کے قابل ہے! اُن پر وہ عالمِ جذب طاری ہے کہ گویا ع

فرشتہ صید، پیمبر شکار، یزداں گیر!

وہ کہتے ہیں کہ "اجی کتنی دفعہ کہوں کہ غزل بہت وِق کرنے والی چیز ہے! اُس کے ایک ایک شعر نے لوگوں کا جینا حرام کر دیا ہے! بڑے بڑے نظم گو شعراء کے اُس نے دانت کھٹے کر دئے ہیں، اور اُن کے چھکے چھڑا دئے ہیں! اُس کے ایک معیاری شعر میں جتنا کچھ ہوتا ہے اُس کے پیدا کرنے میں ہومر، فردوسی، دانتے اور ورجل کے دانتوں پسینا آجاتا ہے! اُردو کے نظم گو کس شمار میں ہیں؟! صرف شیکسپیر کہیں کہیں اس باب میں کامیاب ہوتا ہے!" (نگار جولائی ص ۵۲ و ۵۸ و ۶۰)

العظمۃ للہ! ؎

"بنگے" زدیم و سرِ انا الحق شد آشکار!
مارا ازیں "گیاہ ضعیف" ایں گماں نبود!

حد یہ ہے کہ جب کسی طرح کام نہیں چلتا تو وہ I.C.S کے امتحان کے اک پرچے کی دور کی کوڑی لاتے ہیں جس میں مضامین غزل کے "حسن و عشق" کے مشہور و عام موضوع سے پرے نکل جانے کا اک کنایہ مُتبادر ہوتا ہے! گویا اب سرکارِ دولتمدار کے قانون کے ناموس اعظم کی شہادت، غزل کی جاں بخشی کے لئے لائی جائے گی! پروفیسر فراق اب سخن سنجی کی اُس مہیب رفعت کو پہنچے معلوم ہوتے ہیں جس کے ایک فائز کا رجزِ تغزل یہ ہے:- ؎

لوگ کہتے ہیں کہ فنِ شاعری منحوس ہے
شعر کہتے کہتے میں ڈپٹی کلکٹر ہو گیا!!

پروفیسر صاحب کا عام طریق بحث و استدلال یہ ہے کہ وہ حریف کے محاذ کے سامنے اپنا کوئی محاذ قائم کرلیتے ہیں، اِن خطوطِ جنگ کو متصادم نہیں کرتے! اُنکا اسلحہ خانہ، غیر جارحانہ، دفاعی، بلکہ بعض اوقات قطعاً غیر جنگی ہوتا ہے! وہ اک متقابل صفِ جنگ تعمیر کرتے ہیں میلوں تک، ملکوں تک، رقبۂ جنگ سے بھی متجاوز دور و دور تک! لیکن تصادم کا شاذ و نادر

ہی جیلنج کرتے ہیں! چنانچہ وہ بکثرت، بلکہ بیشمار اقوال و امثال نقل کرتے ہیں۔ مگر عموماً بےمحل و غیر حسبِ حال! وہ علمار، فضلا، مصنفین، ناقدین کا کوسوں لمبا جلوس نکالتے ہیں۔ جس کے نقیب خود بن کر تماشبینوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مونچھوں پر تاؤ دیتے ہیں! جس وقت وہ حوالوں، اقتباسوں، کتابوں، مصنفوں، ناموں کی فہرست سازی پر آتے ہیں تو ہمیں مُلّا دوپیازہ کی وہ مُہیبؔ اٹ البحر" اور اٹ الہدیٰ" کی جلدیں یاد آجاتی ہیں۔ جنھیں سینکڑوں گدھوں کی پلٹن کی فوجِ ظفر موج کی پیٹھوں پر لاد کر، مع اک "شملہ بمقدارِ علم" کے، اک ایرانی عالم کے مقابلے میں وہ اک معرکہ گاہ مناظرہ میں تشریف لے گئے تھے؛ اور جہاں بات بات پر اُن کے استشہادات اس بلند بانگی سے گونجا کرتے تھے کہ:-

"دیکھئے اَٹ البحر کا دفتر ۵۰، صفحہ ۳۰۶۰۷۷۰؛

"ملاحظہ فرمائیے اَٹ الہُدیٰ کی جلد ۷۰، صفحہ ۹۹۹۹۹۹؛

ہم علم و فن، فلسفہ و ما بعد الطبعیات کے کلمات و اصطلاحات میں بھی "مجذوب کی بڑ" ہانک سکتے ہیں!! ع

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے!

الغرض وہ اقتباسات و حوالجات کے اپنے ہی اُٹھائے ہوئے طوفانوں میں خود غوطے کھاتے ہیں! علم و معلومات کی کثرت اُن کی "روشنیِ طبع" کے لئے اک "بلا" ہوگئی ہے؛ دوسروں کے خیالات کا ہمارے لئے علم کافی نہیں، ہمیں ضرورت ہے اُن کے "فہم" کی!۔ اور فہم کے نام سے "فہم" ہی کی، نکہ "وہم" کی!! اِسی حقیقت کو نظر انداز کرنے سے علم "حجابِ اکبر" بن جاتا ہے! اِسی لئے کہا گیا ہے کہ "یک مَن علم را دہ من عقل باید!" جرمن حکیم نیٹشا کا جو قول ("رائے، خیال کی افیون ہے") اُنھوں نے نقل کیا ہے، ہمارے خیال میں اُس کا "مشار الیہ" بھی یہی نکتۂ لغز ہے! "رائے" سے یہاں، مراد وہی دوسروں کا (غیر مفہوم و غیر منہضم) قول ہے اور نہ اپنی رائے، اپنے اجتہادِ فکر کو نیٹشا افیون کہے؟! ——— وہ نیٹشا جو بیکوقت اجتہادِ خیال اور جہادِ عمل کا اک "شیرِ خدا و رستمِ داستاں" واقع ہوا تھا۔ اور جس نے مغرب کے نظامِ تمدنی سے لے کر مسیحی یورپ کے قصرِ دینی تک کو اپنی "شرابِ فکر و رائے" کی طوفانی بارشوں سے مسمار کر دیا تھا! اور اس فاسحانہ شانِ تخریب کے ساتھ کہ بقولِ اقبال ع

"دیوانہ بکارگہِ شیشہ گر رسید!"

یہی حال "امرد پرستی" کی بحث کے سلسلے میں شیخ سعدیؒ کے اُس حوالے کا ہے جو پروفیسر فراق نے دیا ہے اور جس کی روشنی میں شیخ مُصلح الدین" کو "پکا .... باز" بتایا ہے! حضرت فراق کو اپنی "شعر العجم" خوانی پر بڑا ناز ہے! لیکن سعدیؔ کے متعلق شعر العجم کے محدود و معدود صفحات کے علاوہ ہم نے مولانا حالی کی مفصل و مکمل جلد ——— "حیاتِ سعدی" ——— بھی پڑھی ہے! جس میں "شیخ" اِس "مزعومہ ذوقِ پاکبازی" پر یہ پردہ در نقد و احتساب کرتا ہے:

گروہے نشینند با خوش پسر | کہ "ما پاک بازیم و اہلِ نظر"!
زمن پُرس فرسودۂ روزگار | کہ بر سفرہ حسرت خورد روزہ دار!
چرا طفلِ یکروزہ ہوشش نبرد؟ | کہ در صُنع دیدن چہ بالغ چہ خورد!

یہ ہے "مشتے نمونہ از خروارے" اُس طریقِ تعبیر و استفادہ کا جو پروفیسر ممدوح، ارباب و اقطابِ علم و فکر کے معاملے میں کام میں لایا کرتے ہیں! ہمیں کتابوں کو اپنے دماغ کے اوزار بنانا چاہیئے، اپنی پشت کے بار نہیں! پروفیسر فراق کے چہل صفحاتی مقالے کا "قصرِ چہل سُتون" کچھ اس ناقابلِ رشک حقیقت کا مصداق ہے کہ "More voluminous than luminous" (کلاں سر، نکہ روشن دماغ!)

"نقاد" کے مضمون ——— "غزل گوئی" ——— کو اُنھوں نے علامس تک نہیں کیا! وہ اس "حصنِ حصین" کے گرداگرد چکر ہی کاٹتے ہیں، اُس کے پاس پھٹکتے ہوئے اُن کے پَر جلتے ہیں! ؎

لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخن گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پہ انگشت!

اُنھوں نے کہنے کے لئے چند نقاط کو چھیڑا ہے۔ مثلاً غزل کی بے ربطی، ردیف و قافیہ کی پابستگی، مصرعِ طرح کی بدنام "صلائے عام" تغزل کی تشنہ بیانی و رمز نگاری، "رقیبِ روسیہ" کی مستقل صدر نشینیِ بزمِ حُسن! اور استمراری اجارہ داریِ خلوتِ محبوب! وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اُنھوں نے نازک دماغی سے ان میں سے نہ کسی ایک کو سمجھا، نہ امانت داری کے ساتھ اُنھیں پیش کیا، اور نہ دِقتِ نظر کے ساتھ کسی کا جواب دیا! ——— اُنھوں نے نقاد کے ہر خیال کے خط و خال کو مسخ کر ڈالا! ہر اعتراض کی نوک پلک کو مجروح کر دیا! اور پھر اس بدہئیت چہرے کو وہ ہدفِ تعریض بناتے ہیں! وہ اپنے ہی توہمات و اختراعات و تصرفات سے لڑتے ہیں، ہم سے نہیں! ؎

کب بہ مقابل آئینہ تھا؟
تم نے اپنی طرف نظر کی!

جو چیزیں لطافتِ نظر کی "خوردبین" سے دیکھنے کی تھیں، اُنھیں اُنھوں نے "غیر سلیم آنکھ" سے دیکھا ہے، اور جو باریک بال کمانی "واچ میکر" کی "نازک چمٹی" سے اُٹھانے کی تھی اُسے اُنھوں نے موٹی انگلیوں سے پکڑنا چاہا ہے! سہ

آہستہ خرام، بلکہ مخرام   زیرِ قدمت ہزار جان است!

ہمیں عموماً پہلے سے معلوم تھا کہ جواب دینا آسان نہیں! تاہم پروفیسر فراق سے ایسی آسان پسندی کی توقع نہ تھی! ــــــ گو حضرت نیاز کو اُن سے اسی چیز کی پوری توقع ہو!" (نگار۔ ص۵۵، سطر ۳) ڈکٹر ہیوگو نے اپنے اک ناول میں اک مردم بیزار پیرِ مرد "قلندر" کا ذکر کیا ہے، جس کا ایک رفیق و شفیق بھیڑیا تھا، یہ گرگ باراں دیدہ اس قدر ہوشیار و بیدار، واقفکار و تجربہ کار تھا کہ بقول اُس کے "انسانی ہمزاد" کے وہ اک "پروفیسر" کہلانے کا مستحق تھا! لیکن چونکہ پروفیسر کا ازلی طور پر "شئے لطیف" سے خالی ہونا ضروری ہے، اس لئے با دلِ ناخواستہ پھر اس خطاب کو واپس لے لیا گیا!"

نسخہا در بغل و فہم محال
جلوہ ہا در نظر و دیدن نیست!

ہم بھی ابھی چند نقاط پر اکتفا کریں گے۔ ہر حرکتِ مذبوحی پر اک صدائے غفلت شکن رسید کرنا فی الحال ملتوی کرتے ہیں، دُنیا دیں مُنہدم کر دینے کے بعد چند محرابیں اور کنگرے اس ناشاد "قصر ثریا رس" کے باقیات صالحات کے طور پر بحیثیت آثار قدیمہ باقی رہنے چاہئیں! ــــــ
برائے عبرت!

(۱) غزل کے "بحر و وزن، ردیف و قافیہ" کی بحث نسبتہً صاف تھی۔ لیکن تصویر کے "چشم و اَبرو" ہی کی رعایت اُن پر حرام ہے! چنانچہ مدہوشانہ وہ ہم سے باز پرس کر جاتے ہیں کہ "آخر جوش کی نظموں میں ان لوازمِ فن اور پردہائے سازِ شعر کا کیوں التزام کیا جاتا ہے؟"

در اصل گوشۂ نزاع یہ نہ تھا! یہ تھا کہ "قافئے کے ہاتھ میں رہتی ہے ان لوگوں کی باگ!" مزید وجہ اس تخصیص کی یہ تھی کہ آزاد صاحب نے ردیف و قافیہ ہی کو شعر کا سارا صورت گر بلکہ ڈکٹیٹر قرار دیا تھا! اُن کی گفتگو کا ماحصل یہ تھا کہ "ردیف و قوافی ہی غزل کو پیشگی ظروف مقررہ و مقدرہ ہوتے ہیں۔ پس اُنہی کے سانچے میں جو خیالات و جذبات ڈھل سکتے ہیں، ڈھال لئے جاتے ہیں! باقی کو "دورباش" کی صدا سُنا دی جاتی ہے!" ــ قدرتاً اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند پیش پا اُفتادہ قافیئے ہی اختیار کر لئے جاتے ہیں۔ اور اُنہی کے اندر اک اصلاً موہوم مفہوم کو اک مزید ابہام کے ساتھ بھر دیا جاتا ہے! ظاہر ہے کہ غزل گو کا کوئی خاص منطوق تو ہوتا نہیں! بیشمار بجائے خیالات اور بجائے حسیات ہیں ــــــ جو عبارت ہیں غزل کی آفاق گیر مملکتِ فکر و معنی و جذبہ سے! ــــــ جو بھی ان میں سے "غزل طرحی" میں سما جائیں، بس شاعر ہی کی خاص الخاص "تلاش مضمون" ہے! شش جہت اُس کی باد ہوائی تیر اندازی کے لئے باز ہے، جدھر بھی تیر نکل گیا "تیر بہدف" وہی ہے! ماشاء اللہ! ع نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو!

قیامت ہے کہ اتنی "لمبی رسی" ملنے پر بھی ہر غزل گو کو "قافیہ تنگ اور ناطقہ بند" ہونے ہی کی شکایت رہا کرتی ہے!

تاہم کمال یہ ہے کہ بالفاظ پروفیسر فراق، "قافیہ غزل کا طرۂ کمال ہے!"

(۲) "مصرعِ طرح" کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ "اس کے لغوی معنی پر غور کیجئے! طرح کے معنی ہی "نمونے" کے ہیں!" پھر وہ فرماتے ہیں کہ "ہر فنی عمل کا جم فنکار کے وجدان اور قوتِ مُمیزہ کی چیز ہے!" ــــــ ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا "ہر فنکار غزل گو" کا وجدانِ ذاتی اور اختیار تیزی، مہتمم مشاعرہ کی "گولک" میں "گرو" ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقام سے اک "سیٹی" بجاتا ہے اور "شعرائے شہر" بھانت بھانت کی بولیاں بولنے لگتے ہیں؟! ــــــ یعنی حسبِ تحقیقِ انیق" پروفیسر فراق: "غزل کی موجِ ترنم، متعینہ بحر میں دو برابر ہلکورے لیتی ہے! بحر کے "ساحل" یعنی ردیف پر پہلی موج کو پہنچتی ہوئی دوسری موج ٹوٹی مقطع بنا، اور غزل کا راگ مل گیا!" ــــــ اور (بقول حسبِ حال ہمارے) حاضرین با تمکین مشاعرہ نے اپنے طبلے اور مجیرے سنبھال لئے اور مشاعرے کی "ٹھُمکی" شروع ہو گئی!" ع

حیف گر در پس امروز بُود فردائے!

(۳) غزل کے لئے اک مسلسل ربطِ معنوی کو اصولاً پروفیسر صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن اس اعتراف کے ساتھ ہی توہمات کی اک کائنات کا بھی اعتراف کرنے لگتے ہیں! وہ یہ راز سینہ بسینہ ہمیں بتاتے ہیں کہ گویا غزل

کا غیر معمولی ربط و ضبط، ہم آہنگی و یکجہتی، توافق و تطابق، تسلسل و تواتر، اتنا باریک، لطیف، دقیق، عمیق، غامض، ہوائی، موہوم، مبہم ہوتا ہے کہ نظم کی بلند بانگ ہم نوائیاں جن لوگوں کے سامعے کو خراب کر چکی ہیں، وہ "آہنگ غزل کی (بالفاظ حضرت نیاز) خاصہ کی چیز" کے شعور اور لطف اندوزی کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے! ــــــ گویا ع

ذوقِ ایں مے نہ شناسی بخدا تا نہ چشی!

کیوں نہ ہو! ــــ

زاہد نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی!!

گویا غزل کا ناقابلِ دید ربط و تسلسل بھی غزل کے معشوق کے دہن و کمر ہی کی طرح اک تیسرا عجوبہ ہے! ــــ

ساری دنیا میں پتا ملتا نہیں
تو ہی بتلا ہے رگِ گردن کہاں!!

حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ خود یہ بزرگ غزل کے اندر کسی معنوی تسلسل سے مایوس ہو چکے ہیں؛ چنانچہ اک دوسری جگہ حضرت فراق کا یہ اظہار کتنا معنی خیز ہے کہ "مسلسل غزل" اک تناقضی اصطلاح ("A contradiction in terms") ہے"! ــــ "تناقضی اصطلاح" سے اُن کی مراد غالباً "اجتماعِ ضدین" ہے!

"غزل" کے اِس عیب کے اس "اقبال" پر، "نظم" کے وصفِ ربط و ضبط کے اِس معکوس اعتراف" کو بھی سُنیئے کہ "نظم ہنوز اک حسین طول عمل (یا طولِ امل؟) سے زیادہ نہیں"! (ص۵۷) ــــ

ہنر بچشمِ عداوت بزرگتر عیبے ست
گل است سعدی و در چشمِ دشمناں خار است!

غزل کے نادیدہ و نادیدنی، غیر مرئی تسلسل کو تسلیم کرانے کیلئے اُنھیں بڑے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں؛ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ "بتایئے آم کے قد و قامت رنگ و بو، اور ذائقہ و لذت میں کیا ہم آہنگی ہے؟" (گویا سیندر یا یا جوگیا آم کی قوسِ قزح نما رنگینی و بوقلمونی سے ظاہری آنکھ اُس کے "حنظل" ہونے کا قیاس قائم کرتی!) "نقاد" "آسمان کے نظام شمسی میں کونسا نظم ہے؟" (گویا پروفیسر صاحب کے بے پایاں علم کے "حجاب اکبر" کا یہ حال ہے کہ وہ نظم و تنظیم ثوابت و سیار، شمس و قمر، نجوم و کواکب کے مظہر العجائب و معجز نما بند و بست اور ربط و ضبط سے بالکل بیخبر ہیں! ــــــ "ن") "صحائف آسمانی کے بیانات میں بے ربطی کیوں ہے؟!" (یہ علماء و مفسرین سے پوچھیئے! لیکن اتنا ہم بتلائے دیتے ہیں کہ مثلاً قرآن کے "احسن القصص" یعنی "حدیثِ حسن و عشقِ یوسف و زلیخا" کی "غزل" میں کوئی بے ربطی نہیں! ــــــ "ن") "شیکسپیر کے ڈرامے کیوں ایک ناقد کے الفاظ میں شیکسپیری جہانِ نیستان لکھے گئے ہیں؟ (یہ ناقد غالباً کوئی ایسا بہرہ یا بے "سلیقہ" انتقاداتِ عالیہ" ہوگا جسے "فطرت کی اک نادر الوجود خوش فعلی" ("freak of nature") سمجھنا چاہیئے! ــــــ "ن")

اور "ہاں یہ ہندی دوہروں اور اُردو و فارسی رُباعیوں کے مضامین ایک دوسرے سے اتنے مختلف و متبائن کیوں ہوتے ہیں؟" (گویا کبیر داس کے دوہے اور عمر خیام کا مجموعۂ رُباعیات ایک ایک واحد، طویل نظم کے "بند" ہیں، منفرد و مستقل اجزائے کلام نہیں؟! ــــــ "ن")

ہائے ہائے! گویا زمین متزلزل ہو جائے! آسمان تہ و بالا ہو جائے! نظاماتِ شمس و کواکب درہم برہم ہو جائیں! تمامی قصرِ کائنات اڑا اڑا دھم ہو جائے! لیکن للہ ہماری کسی ممکن اینچا تانی، کسی ناممکن زور آزمائی، کسی جانگسل کاوش و کاہش سے غزل کی ہزل اور زٹل کے اندر نستعلیق، اُقلیدسی خط و خال کا تناسب و جمال تسلیم کر لیجئے! مان لیجئے! رحم کیجئے! ــــــ ہماری مدت العمر کی دماغ سوزیوں، اور ہمارے سلفِ صالح کی صدیوں کی مغز پاشیوں پر ترحم خسروانہ ہی کے صیغے میں ترس کھائے، اور کسی طرح ہماری لاج رکھ لیجئے! ــــ

قسم خدا کی میں کچھ آج لیکے اُٹھونگا   کہ میں غریب ہوں، خواجہ مرا غریب نواز

(۳) "مطلع و مقطع" پر بھی حضرتِ فراق شیخ چلیانہ تو ہم طرازیاں فرماتے ہیں! لیکن سوائے دیدہ بر دوختہ غزل بازوں کے، دنیا جانتی ہے کہ "مطلع" کسی معنی میں بھی "افتتاحِ غزل" نہیں ہوتا! وہ مطالبِ غزل کا پیامبر نہیں ہوتا! وہ اپنا ہی "نقیب" ہوتا ہے! اب رہا "مقطع" تو وہ "رُسوائی تخلص" کے لئے اک "حیلہ" "بیم پہچانے کے سوا اپنی کوئی "معذرت" نہیں رکھتا! لیکن محرم رازِ غزل پروفیسر فراق سے سُنیئے کہ "مقطع میں غزل کے پورے احساسِ تغزل کی آواز بازگشت پوری تھرتھراہٹ (یا رقصِ جانکنی کی آخری تھرکن! ــــــ "ن") کے ساتھ بھر دی جاتی ہے! یہاں زمزمۂ تغزل کی سرحدیں سکوتِ ابدی سے مل جاتی ہیں! (اللہ اللہ! سکوتِ ابدی کے بحر سرمدی میں غزلیت رحمت ہونے

کی سعادت؟! بہرحال غزل کا یہ خاتمہ بالخیر اچھا ہی ہوا! — شکر ہے آج عدد چل تو لبا، خیر وہ داخلِ جنت ہی سہی! —— ("ن")

(۴) "رقیبِ روسیہ" کی مذمت پر جنٹلمین پروفیسر بجز وہو جاتے ہیں! وہ زبانِ حال سے یہ کہتے معلوم ہوتے ہیں کہ: کیوں جناب! کیا وہ (رقیب) ہمارا "رفیقِ طریقِ عشق" (**Comrade-in-Love**) نہیں؟ جب وہ خلوتِ صحیحہ میں اُس نعمتِ غیر مترقبہ پر بلا شرکتِ غیرے فائز المرام ہوتا ہے کہ "چو خانہ خالی و معشوق مست و ناز بود"! تو ہم شریف آدمیوں کی طرح دروازے پر "اٹینشن" کھڑے پہرہ دیا کرتے ہیں! اور آنے والی صبحِ سعادت کی ساعتِ نور و ظہور میں یہ بانگِ مردانہ بلند کرتے ہیں کہ —

اے شبِ وصلِ غیر بھی کاٹی! تو مجھے آزمائے گا کب تک؟!

حاشا وکلا، کہ جوش صاحب کی طرح کوئی اِس شعر کو بے غیرتی کی مثال بتائے! غیرت و حمیت کے مزید ارتقا کی اِس میں ابھی بڑی گنجائش ہے! مثلاً شاید اِسکی "معراجِ ناموس" یہ ہوتی: —

اے "شبِ وصلِ غیر" بھی کاٹی! اور "شبِ قدر" اُس پہ بھی مانی!!

(۵) "امرد پرستی" کی حمایت حضرتِ فراق اِس جوش و خروش، اِس عزم و اِذعان، اِس اخلاص و "شرحِ صدر" کے ساتھ فرماتے ہیں کہ ہم تصویرِ حیرت بن کر رہ جاتے ہیں! واللہ ہم کو خوف ہونے لگتا ہے کہ اُن کے کالج کا پرنسپل اُن کی حرکات و سکنات کا مطالعہ نہ شروع کر دے! اُن کے شہر کی پولیس اُن کی نقل و حرکت پر "نگرانی" نہ قائم کر دے!! اور کانگریسی حکومت کا وزیرِ تعلیم، اپنے صیغے کی آئندہ اصلاحات میں اُن کی "تخفیفِ تنخواہ" کے بجائے اُن سے "تخفیفِ تصدیعہ" کی درخواست نہ کرے!!! —

گر ہمیں مکتب است و ایں مُلّا

کارِ طفلاں تمام خواہد شد!

وہ کامل دو صفحوں پر وسیع اک طویل و عریض فہرست اہلِ علم و فضل، اصحابِ ادب و دانش، اربابِ سائنس و فلسفہ، اور اقطابِ تہذیب و شائستگی کی دیتے ہیں! جن کی زندگی میں عملاً، اور جن کی قلمکاریوں میں بصورتِ آئینہ داری، "امرد پرستی اُن کی حساس ترین رگِ سیرت و سرشت نظر آتی ہے!" (صفحہ ۶۶، نیچے سے تیسری اور چوتھی سطر!)

پھر وہ غریب "نقاد" کو چیلنج کرتے ہیں: "غزل گو چودہ برس کے جیل والی بات سے اِس بحث (امرد پرستی) میں نہیں ڈرتا! حضرتِ نقاد: یہ بیسویں صدی ہے! تعزیراتِ ہند یا کسی ملک کے قانون میں جہالت کے جو "آثار" ابتک باقی ہیں وہ اُن سے مرعوب نہیں ہوتا! سُنئے "جنسیات" پر ہیولاک ایلس سے لیکر اِس وقت تک تمام ممالک میں جتنی علمی، سنجیدہ، اور محققانہ کتابیں لکھی گئی ہیں "سب امرد پرستی کے جواز" کو تسلیم کرتی ہیں! —— انا للہ! —

علم را بر جاں زنی "یارے" بود

علم را بر تن زنی "مارے" بود! (رومی!)

پروفیسر فراق کا آفاق گیر مطالعہ اور جہاں پیما معلومات مستحقِ اعتراف و داد ہیں، لیکن اِس مطالعے کی بے تنویری اور اِن معلومات کی خانۂ دماغ کے دفاتر میں بد ترتیب نشست نے اُن کے بڑے سے کاسۂ سر کو "عمرو عیار کی زنبیل" بنا رکھا ہے! اِس ظرفِ لبریز و تاریک میں سے جب کبھی وہ کچھ نکالتے ہیں چشمِ بد دُور ایسا ہی ہوتا ہے! چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ "نقاد صاحب! اگر آپ کسی سے کہیں نہیں تو اک رازِ سربستہ آپ کو بتاؤں کہ اردو شاعری کی ۳ صدیوں کے تمام مجموعی دفاتر میں جوش صاحب کی نظم —— "نامِ جوانی" —— امرد پرستی کے شوخ ترین رنگ سے شرابور ہے! —— ہم فراق صاحب کو اُن کی "سخن فہمیٔ اہلِ مدرسہ" اور اُن کی "محرمانہ" راز داری پر بے اختیار داد دیتے ہیں: نازم بریں پردہ پوشی و رو پوشانہ گوشہ گیری: —

بسر منارۂ اُشتر رود و فغاں برآرد کہ نہاں شدہ من اینجا مکنید آشکارم!

پھر وہ جوش صاحب ہی کی طرف روئے سخن کرتے ہیں کہ اُک نظم گو شاعر بھی "ساری دُنیا کا بہنوئی یا داماد" بنا کیوں پھرتا ہے؟ اور کیوں ہر غیر محرم عورت کو اپنی "منکوحہ" کی طرح خطاب کرتا ہے؟!

فاضل پروفیسر کیا شریعتِ ادب کے "بابِ رُخصت" کے علم سے سچ مچ ایسے معصوم ہیں؟! —

دو چیز مفت حلال است دہم بشرعِ دُرست

سرِ دو خانۂ ہمسایہ، حُسنِ رہگذرے!

مناسب ہو کہ وہ اپنے علم و فضل کی "ہمہ فروش دُکان" کے گودام (**Universal Seller's Shop**) کے اندر اک شیشے کا "شوکیس" (**Show Case**) بنا کر اُس میں یہ ابیات محفوظ کریں اور اپنے اِن مذکورۂ بالا توہمات کے دَورے کے وقت اِن

اشعار سے "تصفیۂ افکار" کر لیا کریں،

رعنائیٔ خیال کو ٹھہرا لیا گناہ ——— زاہد بھی کس قدر ہے مذاقِ سخن سے دُور!

اگر بدل نہ خلد آنچہ از نظر گزرد ——— خوشا زمانیٔ عمرے کہ در سفر گزرد!

ٹک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش کام ہوئے اور چل نکلے!

(۲) نظم اور غزل کے درمیان پروفیسر فراقؔ کا مفروضہ یہ فرق کہ "اول الذکر خارجی و مادی عالم کی کرخت و ثقیل نقاشی ہے، اور آخر الذکر دُنیائے دل کی عمیق، داخلی راز نوائی" اک خود ساختہ خیال ان کی غزل سرایانہ خود بینی کا اِلقا کیا ہوا ہے! یہ اک راز فاش ہے کہ "نظم عبارت ہے روحِ شعری کی اُس لب کشائی سے جو اک لمحۂ شاعرانہ کی تحریک پر عمل میں آئے! بخلاف اس کے متعارف غزل گویا اک گراموفون ہے جو مشاعرے کی دوکان خود فروشی پر رکھا ہوا ہے، اور مصرعِ طرح کی آہنی سوئی سے جب کوئی چاہے اُسے چیخنے پر مجبور کر سکتا ہے!" ——— "نظم" کی اس حقیقت کی روشنی میں وہ خارجی بھی ہو سکتی ہے اور داخلی بھی! عالمِ آب و گِل کی بھی نقاش ہوتی ہے، اور نہاں خانۂ روح و دل کی بھی ترجمان! رزمیہ بھی ہو سکتی ہے اور بزمیہ بھی! گرم بھی، اور نرم بھی، جلالی بھی، اور جمالی بھی! ——— جوشؔ کو ذرا یہاں اس مسئلے کی عقدہ کشائی کرنے دیجئے! ع

خود زبانِ شاعری سے شعر کی تفسیر سُن!

اپنے قرآن دیوان کی "فاتحۃ الکتاب" میں لکھتے ہیں۔

اے روحِ عصرِ حاضر و ہندوستانِ نو ——— لایا ہے اک صحیفۂ "سُخنداں" ترے لئے!

اِس مصحفِ عظیم کی اللہ ری وسعتیں ——— ہر "مد" ہے مشرقین بداماں ......!

لایا ہوں رزم و بزم کی "ارضِ تضاد" سے ——— یہ بلبلِ جنگ و سازِ شبستاں ......!

کتنی شبوں کے طاق میں رکھکر "چراغِ دل" ——— پرکھی ہے روحِ عالمِ امکاں ......!

اس کی خبر بھی ہے کہ بنایا گیا ہے لحن ——— کتنی شبوں کا گریۂ پنہاں ......!

گوندھی گئی ہے تارِ سخن میں خبر بھی ہے ——— کن مہوشوں کی زُلفِ پریشاں ......!

واقف بھی ہے کہ موجِ سخن میں ہوئی ہے صرف ——— کن انکھڑیوں کی جنبشِ مژگاں ......!

لایا ہوں وزن و شعر کی منزل میں کیا کہوں

کیونکر جراحتِ دلِ انساں ترے لئے! (جوشؔ)

بلاشبہ ہم اِس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ جوشؔ کے ہر آہنگ میں "نشاۃ جدیدہ" کی اک بے پناہ اُمنگ و ترنگ گونجتی ہے! اُن کے آرٹ میں اک ناگزیر "انداز ترکانہ" اپنی "کجکلاہی" کے ساتھ موجود ہے! اُنکا تخلص "جوشؔ" رسمی شعراء کی طرح محض برائے بیت نہیں!

لیکن جس طرح جوشؔ میں آفتاب نصف النہار کی شوکت ہے، مخمورؔ (اکبر آبادی) میں، جو خود بھی اصولاً و اصلاً اک زندہ نظم گو ہیں۔ سوز و ساز، درد و حسرت، یاس و حرماں کی دوسری نوائے دل زیادہ نمایاں مسموع ہوتی ہے! ہم اُن کی اک نظم یہاں (جزءً) نقل کرتے ہیں، اور پروفیسر فراقؔ کو چیلنج کرتے ہیں کہ اِس سے زیادہ وہ اپنی مشتہرہ و مطلوبہ "نشتریت اور بھیتریت" اپنی ہی کسی "پُرفسوں غزل" میں بتائیں! یہ عشقِ ناکام کا اک مرثیۂ جاں سوز ہے، اور آپ کے ہم مشرب غزل باز شعراء کے "واسوختوں" کی جلی کٹی زہرناکی سے کتنا پاک ہے! اس فرق کو بس یوں سمجھئے کہ :-

اے صیدِ ہوس! آگ غمِ ہستی کی ——— تجھ کو بھی جلا رہی ہے اور مجھکو بھی

میرے جلنے میں "عود" کی ہے خوشبو ——— بُو تجھ میں ہے جلتی ہوئی "ہڈی" کی سی!

ہاں تو مخمورؔ کا شکر پاش نالۂ رنگین سُنئے:-

نویدِ عشرتِ موہوم اب نہ چھیڑ مجھے ——— اُمیدِ لذتِ معدوم اب نہ چھیڑ مجھے!

خوشی کے نام سے دل کی مصیبتیں نہ بڑھا ——— دکھا کے جلوۂ راحت کسی کا جی نہ دُکھا!

گدازِ دل کی رفاقت بہت ہے میرے لئے ——— "نہیں وہ میری" یہ حسرت بہت ہے میرے لئے!

عزا گسار رہوں ناکام جستجوؤں کا ——— نہ ذکر کر مری "مرحوم" آرزوؤں کا!

غمِ فراق ہے، ارماں کو دفن رہنے دے ——— مجھے اب اُن کے تغافل کا رنج سہنے دے!

مرے شباب کی کاوش کا قصۂ دل دوز ——— سُنا کے اور فزوں کر مرے صبر کا سوز!

خدا کے واسطے دے اب تو درسِ بیخبری ——— کہ فاش ہو چکا عالم پہ رازِ چارہ گری!

یہ مدعا نہیں لیکن کہ دردِ ہجر مٹے ——— غمِ فراق کی لذت دل و جگر سے چھٹے!

یہ آرزو ہے کہ وہ دردِ دل کا راز بنے ——— مرے حریمِ محبت کی وجہ ناز بنے!

تپش کو اپنی رفیقِ شبِ محن سمجھوں ——— میں سوزِ دل کو فقط "شمعِ انجمن" سمجھوں!

نہ آہِ نیم شبی باعثِ رسائی ہو ——— نہ گریۂ سحری موجبِ رہائی ہو!

دعائے وقتِ سحر جب بلند ہونے لگے ——— اثر خرابیٔ قسمت پہ میری رونے لگے!

عیاں ہو جب کہ دوا و دعا کی بے اثری ——— تو اِتنا یاد رہے اے غرورِ بے خبری!

کبھی وہ حُسنِ مجسم جو سامنے آئے ——— اور اپنے جلووں سے خورشید و مہ کو شرمائے!

تو خوابِ یاس سے مجھکو ذرا جگا لینا،

حجابِ دید مری آنکھ سے اُٹھا دینا!

اِس نظم کی ساری "نشتریت" کا راز شاعر کا کسی "لمحۂ شاعرانہ کا حال" ہونے کے بعد اُس کا فطری تسلسل ہی ہے! وہ بیت بہ بیت مے دو آتشہ و سہ آتشہ ہوتی چلی گئی ہے، تا آنکہ اک "کشتۂ اکسیر" بن گئی ہے! متعارف غزل کے شش جہت میں اُڑنے والے تیر تُکّے اِس نشو و نما کو خارج از بحث بنا دیتے ہیں! وہاں نہ خیال کا "تقدم" (Progress) ہے، نہ احساس کا "عمل ضرب" (Multiplication)، نہ جذبے کی "اشتداد پذیری" (Intensification) نہ کیف کا "اِسراع" (Acceleration)، نہ عمل شعری کا مجموعی "ارتقا" (Evolution) نہ شاعرانہ ڈرامے کی "معراج" یعنی (Climax)! ع

رُکے نہ ہاتھ ابھی ہے رگِ گلو باقی!

غزل کا ہر شعر اک "تیرِ نیکش" ہے، جس کا سُننے والا اک "نیم بسمل"!

اُف رے بیدرد، ستم پیشہ و جاہل قاتل
نہ کیا ذبح، گیا چھوڑ کے "بسمل" قاتل!

دہنِ زخم پکارا کیا قاتل قاتل!

غزل چند منتشر "پَر" ہیں، نظم اک سالم "طاؤس"! غزل دو تین رنگوں کی تنک ظرف "پیالیاں" ہیں، نظم، آسمانِ شعر کی "ہفت رنگ قوسِ قزح"! پروفیسر فراق کو اپنی مقطوع الاعضا غزل کے قطرۂ بمایہ کے متعلق، اپنی اشک شوئی کے لئے یہ بمحل اطلاق رکھنے والا قول مبارک ہو کہ "جزو، کُل سے بڑا ہوتا ہے"!

مِل گئی جس کو "گانٹھ" ہلدی کی
اُس نے سمجھا کہ میں ہوں پنساری!

اہلِ یونان کے منقولۂ بالا قول کے بجائے نظم و غزل کے مشترک موضوع پر ہمیں اقبال کا یہ کلام زیادہ حسبِ حال معلوم ہوتا ہے۔

"برگِ گُل" شد چوں ز آئیں بستہ شد
گُل ز آئیں بستہ شد "گلدستہ" شد!
"نغمہ" از ضبطِ صدا پیدا استے
چوں "پریشاں" شد، صدا "غوغا" ستے!

یہی وجہ ہے کہ نسیم کی "گُلِ بکاؤلی" اک "گلزارِ نسیم" بن گئی! اور میر حسن کی مثنوی اک "سحر البیان"! ــــ آپ کو میر حسن کا مشکل سے کوئی غزل کا شعر یاد ہو گا! اور بیچارے پنڈت دیا شنکر کو تو شاعر کی حیثیت سے آج کوئی پہچاننے والا بھی نہ ہوتا، اگر اُن کی خوش ذوقی اور حسنِ انتخاب "شعرا الہند" کے عجائب خانے میں اپنا یہ نادرہ کار تحفہ نہ رکھ جاتا! لیکن اب تو وہ اپنی قبروں سے فاخرانہ یہ نعرے لگا سکتے ہیں کہ ع

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما!

اور ہاں یہ اک مسلسل "منظوم صحافت" ــــ مثنوی "شاہنامہ" ــــ ہی تھی، جس کے بل پر فردوسی "دل شکن" محمود غزنوی کے قہرمان گرزہ گراں کو چیلنج کرتا ہوا، کہتا ہے: ؎

بنا کردم از خامہ "کاخ بلند"
کہ از باد و باراں "نیابد گزند"!

باایں ہمہ، ہمیں پروفیسر فراق اور حضرت نیاز (جنھوں نے نظم کے مقابلے میں غزل کو اپنی "بارگاہِ ناز" تک پہنچا کر، اپنے خدا یگانہ پندار میں گویا "نظم کا اخراج جنتِ شعر سے" کر ڈالا ہے!) کے راہِ راست پر آنے کی اُمید نہیں! اور ہو تو کیونکر ہو؟! پروفیسر بالقابہ غزل کی زبان کے تشنہ و کوتاہ ابیات کو "کُن فیکون" کی شان کا "کائنات آفریں نُطقِ یزداں" کہتے ہیں! اور جناب نیاز اس "طبلِ بلند بانگ و در باطن ہیچ" کو "انتقادات عالیہ کا مقالہ" فرماتے ہیں! ع

دو دل یک شود بشکند کوہ را!

اول بہ آخر نسبتے دارد، اس تحریر کو پروفیسر فراق کے ایک لطیفے کے ذکر سے شروع ہو کر پروفیسر فراق ہی کے ایک دوسرے لطیفے پر ختم ہونا چاہئے۔ "بادشاہ غزل" آتش کا شاید رنگِ تغزل سے شرابور ایک شعر پیش کر کے وہ اک مبہوت کُن سوال ہم سے کرتے ہیں کہ "فرمایئے! یہ شعر قطعے میں کھپے گا، یا رُباعی میں، یا کسی نظم میں، یا کہاں؟!" ــــ شعر ہے:

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے!

ہمارا ناطقہ تو سچ یہ ہے کہ یہاں بند ہے! لیکن اپنی عقل پر بہت ... کر ہم اس کا شاید یہ جواب دیں گے کہ:

"ٹامس کک اینڈ کو کے "Travellers' Guide" (راہنمائے سیاحانِ عالم) کے صفحات میں!

پروفیسر فراق امید ہے ہمیں معاف فرمائیں گے! باہمی نغز نوائیوں کی اتنی بے پایاں گفت و شنید کے بعد جب آخر کار یہ قضیۂ نامرضیہ اب ختم ہونے کو آیا ہے تو کیوں نہ خوشوقتی کا تھوڑا سا اہتمام کریں! مزید مناسبت یہاں یہ ہے کہ آتش کا یہ شعر تاریخی طور پر نکاتی ادب کا موضوع رہا ہے! علی گڑھ کالج کے اک کھلنڈرے نے مدت ہوئی اس پر یہ تضمین کی تھی! انظرے

خوش گزرے!

سفر کو نکلے ولایت سے چند نصرانی　　خبر یہ تھی کہ زرِ بیشمار راہ میں ہے!
ارادہ جب ہوا ایسا تو ایک نے پوچھا　　"اجی کہو! کوئی ہوٹل بھی یار راہ میں ہے"

ڈاردن کا خلف الرشید اک سُرخ فام فرنگی "رفیق طریق" یوں جواب دیتا ہے:-

ہماری قوم کو ہے ہوٹلوں کی کیا حاجت؟　　ہزار کشتۂ مسور و جوار راہ میں ہے!
جو شب ہوئی تو اُچک کر "قیام کر لیں گے"!　　"ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے"

کھلتے ہی گلاب خار ہو جاتا ہے
ہنستے ہی لب اشکبار ہو جاتا ہے
اے موت بتا یہ قیمتِ انسان
پیدا ہوتے ہی شکار ہو جاتا ہے

(جوش)

وابستہ ہر ایک فرد آفات سے ہے
روزی سے یہ تنگ، وہ خیالات سے ہے
تو جس کی طرف چلا ہے حاجت لے کر
وہ سوختہ جاں بھی اہلِ حاجات سے ہے

(جوش)

اک ذرۂ ناچیز کو انجم سمجھا
اک موجِ خفیف کو تلاطم سمجھا
اس علمِ قلیل کو کہ ہے صرف اک بوند
افسوس کہ جاہلوں نے قلزم سمجھا

(جوش)

آتی ہیں گھٹائیں نغمہ خوانی کے لئے
سوزن لئے ہوئے جوانی کے لئے
دے بادہ کہ اب بڑھ کے موزوں ہیں پیر
پیاسے ہیں ابھی ترسے ہوئے پانی کے لئے

(جوش)

جھجک باقی ہے

ساقیا جام، کہ بیدادِ فلک باقی ہے
آبلے پھوٹ بہے پھر بھی ٹپک باقی ہے

ادھار دے آتشِ تر سے کہ نہ پھر چوٹ ابھرے
ابھی توبہ کی مرے دل میں کسک باقی ہے

آنکھوں ہی آنکھوں میں پھر کوئی اشارہ کر دے
تیرے قرباں ابھی تھوڑی سی جھجک باقی ہے

پھر اُسی ناز سے اک خندۂ گلریز طرب
دل کے شیشے میں ابھی جس کی کھنک باقی ہے

پھر چھڑک دے سرِ انگشت حنائی سے شراب
شیشہ بازی کی ستاروں کو لپک باقی ہے

ہاں چھلک جائے لبِ جام سے وہ لعلِ مذاب
جس میں خورشید کی کرنوں کی جھلک باقی ہے

حل کئے صبح نے انفاسِ معطر جس میں
روح بالیدہ ہوا اب تک وہ مہک باقی ہے

جس کو افشردہ کیا شام کی دوشیزہ نے
قطرے قطرے میں ستارے کی چمک باقی ہے

وہ زلال اُس کا ہی سب جس کو شفق کہتے ہیں
اُس کی تلچھٹ ہے فلک پر جو دھنک باقی ہے

عقدِ پرویں سے کوئی لمس کی لذت پوچھے
دانے دانے میں ٹپکنے کی للک باقی ہے

دیکھ لے پھر، میں تری نیم نگہ کے صدقے
نیند کی سی مری آنکھوں میں کھٹک باقی ہے

بات کرنے میں اُلجھ پڑتے ہو ایک اک سے اثرؔ
پیر ہو اور جوانوں کی سی جھک باقی ہے

تیری ٹانگوں میں کمر میں ابھی لچک باقی ہے

(اثرؔ لکھنوی)

بھارت کا مزدور

(گیت)

بھارت کا مزدور — میں ہوں بھارت کا مزدور
مجھ سا کوئی نہیں مجبور   مجھ سا کوئی نہیں معذور
دکھ سے آٹھ پہر رنجور   سکھ سمپت[1] سے کوسوں دور
فاقہ مستی ہے دستور
میں ہوں بھارت کا مزدور — یارو بھارت کا مزدور

بھارت کا مزدور — میں ہوں بھارت کا مزدور
مجھ سا کوئی نہیں کنگال   کھانے پینے کا ہے کال
بھوکوں تڑپیں میرے لال   بیوی فاقہ سے بے حال
دل کے زخم ہوئے ناسور
میں ہوں بھارت کا مزدور — یارو بھارت کا مزدور

~~~~~~~~~~~~

بھارت کا مزدور — میں ہوں بھارت کا مزدور
کیا بتلاؤں اپنا حال   ہر صورت سے ہوں پامال
روتے گزریں ماہ و سال   مجھ کو جینا ہے جنجال
بیشک مرنا ہے منظور!
میں ہوں بھارت کا مزدور — یارو بھارت کا مزدور

بھارت کا مزدور — میں ہوں بھارت کا مزدور
محنت کرتا ہوں دن رات   جاڑا گرمی اور برسات
پھر بھی اوچھی میری بات   پھر بھی نیچی میری ذات
دیکھو دنیا کا دستور
میں ہوں بھارت کا مزدور — یارو بھارت کا مزدور

~~~~~~~~~~~~

بھارت کا مزدور — میں ہوں بھارت کا مزدور
دن بھر کرتا ہوں میں کام   صد ہا سنتا ہوں دشنام
مجھ سا کوئی نہیں ناکام   گھر آتا ہوں تھک وقتِ شام
دن بھر کی محنت سے چور
میں ہوں بھارت کا مزدور — یارو بھارت کا مزدور

بھارت کا مزدور — میں ہوں بھارت کا مزدور
مجھ پر ہنستے ہیں زردار   میرا دشمن ہے سنسار
جگ میں کوئی نہیں غمخوار   میرا کوئی نہیں ہے یار
تم ہو باسط کیوں رنجور؟
میں ہوں بھارت کا مزدور — یارو بھارت کا مزدور

~~~~~~~~~~~~

باسط بسوانی

[1] دولت
~~~~~~~~~~~~

رفتارِ وقت

زُبان کا مسئلہ!

"زبان کا مسئلہ" (Question of Language) اِس نام سے پنڈت جواہر لال نہرو کانگریس پریزیڈنٹ، کا ایک پمفلٹ، اُردو ہندی کے قضیے پر، کانگریس ہیڈکوارٹرز، الہ آباد، کی طرف سے ابھی حال میں شائع ہوا ہے، جسے عموماً تمام ہندوستانی انگریزی اخبارات نے بالاقساط اپنے کالموں میں نقل و نشر کیا ہے، ہم اِس پمفلٹ کا خلاصہ، مع اک مختصر و سرسری اظہارِ خیال کے، صفحاتِ کلیم میں دینا چاہتے ہیں۔ قرار واقعی نقد و تبصرہ کو کلیم کی آئندہ اشاعت کے اک مستقل، سیر حاصل مقالے پر ملتوی کرتے ہیں۔ ممکن ہے یہ مقالہ، ادارۂ کلیم کو کلیم کے کوئی محترم ناظر ہی بہم پہنچائیں! بہرحال، زبان اُردو کے مصالح و منافع (interests) کے لحاظ سے اک ایسی چیز کی ضرورت ہوگی! موجودہ تعرض، پنڈت نہرو کے اِس مقالے سے، عموماً اُس کی تلخیص و ترجمانی ہی تک محدود رہے گا!

پہلی بات جسے پنڈت جواہر لال کی کسی تحریر یا تقریر کی قرأت یا سماعت کے وقت ملحوظ رکھنا چاہئے یہ ہے کہ وہ بالفاظ خویش "جلائے ذہن و صفائے فکر" (clean mind & clear thought) کے داعی ہیں! آپ کو اپنے توہمات اور تعصبات کی رعائت کی توقع اُن سے نہ رکھنی چاہئے! یہ رحم وہ اپنی ذات پر بھی نہیں کیا کرتے! اپنی

ادارہ

"خود نوشت سیرت" میں اُنھوں نے معلوم کتنی جگہ لکھ دیا ہے کہ "کس کو خبر ہے کہ میرا ابھی یہ خیال ہے یا میرا جذبہ؟! میرے دماغ کی پیداوار ہے، یا میرے دل کا مولود؟!" ——— الغرض یہ خطرہ ہر انسان کیساتھ، بتقاضائے بشریت، لگا ہوا ہے کہ ؎

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اُسے تنہا بھی چھوڑ دے!

تاہم ہمارے مُلک کے موجودہ و معلومہ معدودے چند خواص میں پنڈت نہرو ہی وہ دل و دماغ رکھتے ہیں جو حجاباتِ نفس اور خبثِ باطن کے خلاف مستقلاً معرکہ آرا رہا کرتا ہے! اور یہ خصوصیت، پنڈت جی کی اک خالص اخلاقی، بلکہ روحانی و صوفیانہ خدمت ہے! اعلانِ حق اور بیباکئ نقد میں وہ اک شمشیر برہنہ ہیں، اُن کی سوانحعمری کو دیکھئے کہ اُن کے احتساب سے نہ اُن کے پدرِ محترم ——— پنڈت موتی لال آنجہانی ——— محفوظ ہیں، نہ اُن کے مرشدِ طریقت، مہاتما گاندھی، مامون! وہ اِس "دُعائے مقبول" کا مُرشیرِ معلوم ہوتے ہیں کہ ؎

بے لوث محبت ہو، بیباک صداقت ہو!
سینوں میں اُجالا کر، دل صورتِ مینا دے!

قصہ مختصر اپنے اِن جواہر دل و دماغ کے ساتھ، وہ ہندوستان کی اک مطلوبہ "لسانِ عمومی" (Lingua Franca) کی بحث

میں آتے ہیں! صحتِ مطلقہ اور بیداغ قولِ فیصل تو کسی "بشر" کے ممکنات میں نہیں، لیکن شاید بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ اُردو ہندی - اور ہندوستان کی دوسری زبانوں، اور اک مجوزہ آل انڈیا قومی زبان کے مسائل و قضایا پر اس سے زیادہ صائب الرایانہ اور ثالث بالخیرانہ مُحاکمے کی کوئی نظیر ہمارے اس وقت تک کے مُتنازعہ فیہ ادبِ لسانی میں موجود نہیں! معلوم قضیئے میں یہ "آخری حرف" (Last Word) ہو، لیکن جب تک اس پر کوئی "نقشِ ثانی" پیش نکیا جائے، اُسے اِک "غیر منسوخ کلمہ" ہی تسلیم کرنا پڑے گا! —— خوشی کی بات یہ ہے کہ مہاتما گاندھی نے بھی، اِس پمفلٹ پر اپنے مختصر لیکن جامع "پیش لفظ" میں، اُس سے اُصولاً و عموماً اظہارِ اتفاق و خوشنودیٔ مزاج کیا ہے! حقیقتِ نفس الامری یہ ہے کہ گاندھی جی کبھی بھی اُن خیالات کے حامل اور اُن منصوبوں کے داعی نہیں رہے ہیں جو ماضیٔ قریب میں اُن سے منسوب کئے گئے ہیں! رسالۂ کلیم کے مشترک جون جولائی نمبر میں بھی، "رفتارِ وقت" کے باب کے تحت "مشترکہ قومی زبان" کے عنوان سے جو نوٹ نکل گیا وہ گاندھی جی کی شائع شدہ تصریحات کی ناقص فہم و تعبیر پر مبنی تھا۔ جنوبی افریقہ والی اپنی "فینکس کالونی" کے ہندوستانی مدرسے میں مسلمان بچّوں کے اُردو معلم اور نستعلیق کے اُستاد، اور ہندوستان کے اندر جیلخانے میں اِک مسلمان عالم سے اُردو سیکھنے والے، اور سیکھ کر الفاروق و سیرت النبی کا مطالعہ کرنے والے، اور پھر آج کل مولٰنا ابو الکلام کی تفسیر و ترجمان القرآن کی تلاوت کرنے والے "موہنداس کرم چند گاندھی" کے متعلق اُردو دُشمنی کی بدگمانی کرنا، گاندھی جی کی غیر متزلزل شہرت کو اس قدر نقصان نہیں پہنچا سکتا جس قدر کہ خود اُردو کے مقاصد و مصالح کو! —— خیر، یہ اک جملۂ معترضہ تھا، اگرچہ اس بات کو مدِنظر رکھتے ہوئے کہ موجودہ لسانی فتنۂ خوابیدہ کو جگانے کا بانی و مُبانی مہاتما جی کو کہا جاتا ہے، ہمارا مذکورۂ بالا ریمارک شاہراہِ مُذاکرہ سے کوئی انحراف بھی نہیں! —— بہرحال آمدیم برسرِ مطلب!

پنڈت نہرو کے مقالۂ (مسئلۂ زبان) کے مہماتِ مطالب اور اُس کا سلسلۂ استدلال و بیان (ملخصاً) حسبِ ذیل ہے:-

"ہندوستان میں اُردو ہندی کے قضیئے نے اپنی ساری روایاتی فتنہ سامانیوں کے ساتھ پھر سر اُٹھایا ہے! جو مسئلہ علماء و فضلاء، ماہرینِ فن و خصوصیّینِ زبان کے ذکر و فکر کا تھا "سند یافتہ جُہلا" نے اُسے کج بحثی و شورش انگیزی کے بازارِ قصابان میں گھسیٹ کر پہنچا دیا ہے! تاہم یہ صورتِ حالات ناقابلِ اعتنا نہیں! پھر اِس کی وجہ بھی یہ نہیں کہ بقولِ برخود علماء کے ہندوستان، اک "ہزار داستان" سرزمین ہے! بخلاف ازیں، عالمِ بشری کی آبادی کے پورے خمس کی اس ناپیدا کنار دُنیا میں حیرت انگیز حد تک، کم تعداد زبانیں پائی جاتی ہیں! مزید براں ہندوستان کو اک عمومی قومی زبان بھی نصیب ہے، جس کے "کلمہ گو" کروڑہا کی شمار پر حاوی ہیں!

"تاہم اک کافی پیچیدہ مسئلہ ضرور پیدا ہو گیا ہے! اِس کا موادِ فساد ہماری فرقہ پرستی اور سیاسیاتی ژولیدگی سے بہم پہنچا ہے!

"زبان کا مسئلہ اک قوم یا جماعت یا ریاست یا سلطنت کی موت و حیات کا سوال ہُوا کرتا ہے! زبان اک قوم کی آواز ہے، اُس کا دماغ و دل ہے، اُس کی روح و جان ہے، اُس کی تہذیب و ثقافت ہے، اُس کے ماضی و حال و مستقبل کی حال و صورت گرد آئینہ دار ہے، اور اُس کی ساری زندگی اور تمامی ہستی کی جلوہ گاہ! جو قوم ایک زبان بولتی ہے وہ ایک ہی دماغ سے سوچتی ہے، ایک ہی دل سے ارادہ کرتی ہے، ایک ہی ہاتھ سے کام کرتی ہے، ایک ہی قدم سے چلتی ہے، اور ایک ہی منزلِ مقصود پر گُریزا گُریز پہونچ جاتی ہے! —— تاہم زبان اک زندہ، نامی شے ہے، وہ ساری قوم کی ترجمان ہے، نکہ اُس کے چند افراد کی اُنگلیوں میں اک موم کی ناک! وہ کانفرنسوں کے پنڈالوں میں ریزولیوشنوں کے تیشوں سے نہیں ڈھالی جاتی! وہ ساری قوم کے کاروانِ بزرگ کے نقوشِ قدم ہوتی ہے!

"کراچی کانگریس نے اپنے منشورِ حقوقِ اساسی میں وطنِ عزیز کی ساری ملتوں اور جماعتوں کی مادری و ثقافتی زبانوں کی بھی کافی و وافی ضمانت کی ہے! اُس نے "ہندوستانی" کو اپنی ہر دو صورتوں اور رسم الخطوں میں، قومی زبان بھی تسلیم کیا ہے! صوبجاتی زبانیں کانگریس کے آئندہ دورِ حکومت میں وہاں کے مقامی و اسلہائے تعلیمی ہوں گی! کانگریسی "ریاستہائے متحدۂ ہند" کے جدید الحدود صوبے دراصل ملک کے مختلف "لسانی رقبہ جات" کے ہم معنی ہوں گے! اِس وقت بھی اپنے سر رشتۂ نظم و نسق و نشر و اشاعت میں کانگریس اِن وطنی زبانوں سے کام لے رہی ہے! واقعہ یہ ہے کہ ہم

وسائل ہیں جو کانگریس کے پیام کو ملک کے ایک ایک قریہ کی جھونپڑی تک پہنچانے والے سفیر بنے ہیں!

"یہ ہندوستانی" زبان کیا ہے؟ ہندی اور اُردو اسی ماں کی دو "سانولی" اور "گوری" بیٹیاں ہیں! —— اپنے دیوناگری اور فارسی خط کی "ساڑھی" اور "قبا" میں! بنگالی، گجراتی، اور مرہٹی وغیرہ ہندی کی "خالہ زاد چھوٹی بہنیں" کہی جاسکتی ہیں، جن کی تحریری پوشش بھی دیوناگری کی تھوڑی مختلف تراش وخراش ہے، جن میں بآسانی اک عام رسم الخط کی یکسانی خط و خال پیدا کی جاسکتی ہے! اِسی طرح سندھی کو ہم اُردو سے وابستۂ دامن کرسکتے ہیں! جنوبی ہند کی تامل، تلنگی، کنڑی اور ملیالی بلاشبہ اک قطعی اجنبیت ومغائرت کی دُوری پر واقع ہیں، اور یہ امر محل نظر کہ وہ کہاں تک لسانی، لغاتی، یا کم ازکم رسم الخطی اعتبار سے ہندی کے قریب لائی جاسکتی ہیں! اب مشرق میں آسامی و اُڑیا اور مغرب میں پنجابی و پشتو رہ جاتی ہیں —— یہ تقریباً ایک درجن زبانیں ہیں جو برِاعظم ہند کی ساری ناپیدا کنار محفلِ انسانی کی ترجمان ہیں! "ہندوستانی" اِن میں علانیہ اک میرِ مجلس کا موقف ومنصب رکھتی ہے!

"ہندوستانی کے بالمقابل بعض لوگ انگریزی زبان کو یہ وظیفہ بخشنا چاہتے ہیں۔ لیکن انگریزی علانیہ ہندوستان کے تعلیم یافتہ، دولتمند طبقے کی اک "خورد بینی اقلیت" کی زبان کچھ بیان سے زیادہ نہیں! مزید براں وہ ہماری تمامی تہذیبی روح کی ہمنفسی سے قاصر ہے! بلاشبہ ہمیں بیرونی تمدنی وعلمی دُنیا سے اپنے روابط قائم رکھنے کے لئے انگریزی، اور شاید بعض اوقات انگریزی سے بھی زیادہ فرانسیسی، جرمن، روسی، اطالوی، جاپانی وغیرہ زبانوں کی ضرورت ہوگی! تاہم اُن کے اغراض وخدمات بہت مخصوص ومحدود ہوں گے، لیکن وہ ہندوستان کے طول وعرض میں "زبانِ خلق" کا "نقارۂ خدا" کہاں بن سکتی ہیں؟

"اِس کے بالمقابل ہماری "ہندوستانی" بالفعل ۱۲ کرور اہلِ ہند کی تو مروجہ ومستعملہ زبان ہو ہی! چند اذر کرور اُسے بادنیٰ تکلف سمجھ سکتے ہیں۔ اور بقیہ آبادیٔ ملک بھی اُسے اک بالکل بیرونی زبان کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ آسانی سے حاصل کرسکتی ہے! سہولت کے بعض مزید وعمیق اسباب یہاں ساری ہندوستانی زبانوں کی اَساسی لسانی ہم جنسی اور اک عام تہذیب وتمدن کی باہمی یکسانی ہے!

"اچھا ترکیب کے اعتبار سے "ہندوستانی" کی ماہیت کیا ہے؟ یوں سمجھئے کہ فارسی نما اُردو اور سنسکرت نُما ہندی کے درمیان وہ اک "خیر الامور اوسطہا" کی سعادت کی مایہ دار ہی! —— بلاشبہ ملک میں اور بہت سی "بولیاں" بھی ہیں، لیکن دراصل یہ بے زبان عوام کالانعام کی زبانیں ہیں! عامۃ الناس کی تعلیم کی اشاعت کے ساتھ ان میں بعض اپنے مادرانہ سرچشموں میں مُدغم ہو جائیں گی، اور کچھ آپس میں ضم ہوکر یک رنگی کی وحدت اختیار کرلیں گی!

"اب رسم الخط کے معاملے کو لیجئے! اُردو اور دیوناگری خط بہت متباین اور لاعلاج وناگزیر حد تک ایک دوسرے سے بیگانہ ہیں! ابھی باہمی اجنبیت رسم الخط کے نتیجے میں دونوں زبانوں "بعید یا قریب مستقبل" انہیں اک "مجمع البحرین" بنا دے، لیکن اِس وقت تو یہ حصار ناقابلِ انہدام ہے! پس محفلِ قومی میں ہم نے بادلِ ناخواستہ دونوں کو مساوی طور پر باریاب کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے!

"لاطینی رسم الخط کی سفارش اور حمایت واختیار ربھی ممالکِ مشرق میں ایک قومی تحریک بن رہی ہے، "ٹائپ رائیٹر، ڈپلیکیٹر، اور دوسری طباعتی واشاعتی ایجاداتِ عہدِ حاضر سے فائدہ اُٹھانے کے لئے یہ تجویز بلاشبہ اپنے اندر اک زبردست اپیل رکھتی ہے! تاہم واضح رہے کہ رسم الخط ایک زبان کا "لباس وشعار" ہی نہیں ہے، وہ اُس کی "جلدِ بدن" ہے! نیز ماضی کے ساتھ واسطۂ تعلق کے اعتبار سے وہ زبان کی شہرگ ہے! مزید براں ہندوستان میں لاطینی خط ہمارے بیہر اجنبی حکمرانوں کی حکومت واستبدادیت سے ہمرشتہ واقع ہوا ہے، اور بدیں وجہ مبغوض سمجھا جاتا ہے!

"الغرض ہندوستانی کے دو مسلمہ رسم الخط —— اُردو دیوناگری —— تو ناگزیر ہیں، لیکن ملک کی بقیہ زبانوں کی تحریریں کم وبیش کوشش وکاوش سے انہی دونوں کے اندر جذب ہوسکتی ہیں! خاص بے اطمینانی جنوبی ہند کی زبانوں کے متعلق نظر آتی ہے۔ ممکن ہے ماہرین اِس بارے میں ہماری تنویرِ افکار اور حلِ مشکل کی کوئی سبیل نکالیں!

"ہندی اور اُردو کے درمیان صرف ونحو، بیشتر ذخیرۂ الفاظ، اور عام اَساسِ لسانی کی بہت سی اہم مشابہتیں ہیں! اُردو کو خارجی مسلمانوں نے

بلاشرکتِ غیرے والبستہ سمجھنا سخت مہمل خیال ہوگا! اُردو میں سوائے اُس کے رسم الخط کو بیرونِ ہند کی کوئی بات بھی نہیں ہے! وہ شمالی ہندوستان کے دَورِ سابق کے مغل پایہ تختوں، درباروں، دفتروں اور شہری حلقوں کے گرد و نواح میں رواج پا جانے والی "فارسی آمیز ہندی" ہی کا دوسرا نام ہے! شمال کے کثیر التعداد ہندو گھرانوں کی وہ بے تکلف زبان ہے! یہ زبان اصطلاحاً "ریختہ" بھی کہلائی! "ہندوستانی" بلکہ عین "ہندی" کا عام اطلاق مُدتوں متعارف اُردو پر کیا جاتا رہا، اگرچہ وہ فارسی رسم الخط میں روزِ اول سے لکھی گئی!

"البتہ اُنیسویں صدی کا نیمۂ آخر اک دَورِ انقلاب کے افتتاح کا زمانہ ہے! اُردو اور ہندی کی متداول صورتوں کے درمیان "ہذا فراق بینی و بینک" کا دو طرفہ پیام اسی وقت گوش زد ہوا! مغرب کی ضربِ شدید ہندو اور مسلمان دونوں پر پڑی! دونوں میں جُدا جُدا ایک نیم سیاسی، نیم مذہبی قوم پرستی کے جذبے کی پیدائش عمل میں آئی۔ ہندوؤں کو قدرۃً یہاں بھی سبقت حاصل تھی۔ اپنی زبان —— دیوناگری ہندی —— کی سربلندی کی حریفانہ کاوشں شروع ہوئی، اور عدالتیں، دفاتر، اور مدارس مدتوں تک باہمی مسابقت کی جولانگاہیں بنے رہے! یہ بلاشبہ بیداری اور تعمیر کی سرگرمیاں تھیں، تاہم تنگ نظری، تنگ دلی، اور فرقہ پرستی بخطِ جلی اُن کی پیشانی پر منقوش تھی! تاہم وسیع تر، ہندوستان گیر، کلّی وطن پرستی اِس کے تعاقب ہی میں تھی! بلاشبہ اجنبیت و مغایرت بڑھی لیکن قومیت و وطنیت کا دھارا بھی اسی کے متوازی بہنے لگا! پہلی چیز نے اگر متعارف ہندی اور اردو کے مغائر و متصادم اَڈّے قائم کئے تو دوسری قوت نے مشترک و مخلوط "ہندوستانی" کا کیمپ جمایا! آج اِس ستیاادُ لسانیت کی ہمرشتگی کو دیکھ لینا بالکل آسان ہے! "متحدہ ہندوستان" کا علمبردار سیاسی مجاہد، لسانیات میں "ہندوستانی" کا ادیب ہوگا! اوُ دوسری طرف ہندی اُردو کی نزاع کے ایک حریف کا بیرونی روغن ذرا کُھرچ کر دیکھئے، فوراً نیچے سے اک فرقہ پرست، نیز اک سیاسی رجعت پسند ننگا ہو کر نکل آئے گا!

"مجمل طور پر اک دوسرا فرق اُردو اور ہندی میں یہ بھی ہے کہ اول الذکر عموماً شہری زبان ہے، اور آخر الذکر دیہاتی! پس اُردو اور ہندی کے درمیان لسانی و ادبی قربت، شہر اور گاؤں کے باہمی معاشی و مجلسی تقارُب ہی کے نتیجے میں پیدا ہو سکتی ہے!

"تاہم آج کل کی ترقی یافتہ" اُردوئے معلیٰ" اور تشدہ ہندی" کے درمیان بظاہر اک وسیع و مہیب ناقابلِ پُل بندی خلیج حائل ہو گئی ہے، اور ایسا نظر آتا ہے کہ اِن دونوں زبانوں کے لئے ہمیشہ کے واسطے ایک دوسرے سے منقطع ہو جانا مقدر ہو چکا ہے! تاہم غائر مطالعہ اور عمیق تشخیص کچھ اور بتاتی ہے! ہندو مسلمانوں کی سابقہ علیحدگی، اک نہایت محدود بالائی طبقے کی تعلیم یافتگی، سیاسی رجعت پسندی، شہر و دیہات کی دوری، ادب و زندگی کی بے تعلقی وغیرہ عموماً یہ اسباب اِس لسانی صورتِ حال کے ناگزیر موجبات رہے ہیں! جدید حال اور مستقبل انہی اسباب و آثار کا قاتل ثابت ہونے والا ہے! نتیجۃً دونوں زبانوں میں نزدیکی تعلیم عام کی فراوانی، حریت پسندی، اک پرولتاری تہذیب و ثقافت کی بسم اللہ خوانی، ادبیات و حیات کی باہم آمیزی، زبان کی بے تکلفی و آسانی و جانداری، اور بالآخر اک حقیقی لسانِ عمومی کے "آفتاب ہندوستان تاب" کا طلوع، یہ سب ناگزیر حوادث ہوں گے! عالمگیر بین الاقوامی روابط، ہمہ گیر انقلابی قوتیں، خود ہندوستان کے اندر وسائل و اعمال آمد و رفت کا المضاعف ہونا یہ مزید طوفانی عناصر ہمیں اپنی اپنی لسانی خلوتوں کی کھوجوں میں کہاں ٹھہرنے دیں گے! —— ایک آفاق گیر دھارا ہوگا، اور ہم سب اُس کی امواج میں بغلگیر!!

"اُردو ہندی کی موجودہ اجنبیت نیز رقابت نہ صرف ناگزیر ہے، بلکہ مفید و مستحسن بھی ہے! دونوں زبانیں کم از کم بیدار ہو گئی ہیں، مغربی زندہ زبانوں کے تراجم سے اپنے پر اک "عملِ تقلیم" انجام دے رہی ہیں، اور اپنا "اعادۂ شباب" کر رہی ہیں، ہر قسم کے اذکار و مباحث اور ہر صنفِ ادب کے موضوعات سے اپنے اپنے اجسام کی بالیدگی کر رہی ہیں! اب صرف اُنھیں شہر سے نکل کر دیہات میں پہنچنا ہے، اور خلوتِ مصنوعیت کو ترک کر کے جلوتِ حیات و جہاد میں آنا ہے! وہ اب زیادہ مُدت گزرے بغیر یہ کرنے والی ہیں، اور اِس منزل کو پہنچنے سے پہلے ہی نیمۂ راہ میں وہ کہیں مُلاقی ہو جائیں گی!!

"حقیقت یہ ہے کہ جس قدر مواقع اِس وقت اُردو ہندی کی وسعت

اور لسانی سہولت اور اُن کی باہمی قربت کے پیدا ہوگئے ہیں، بدقسمتی سے اُن سے بھی پورا کام نہیں لیا جا رہا ہے: عام مصنفین اک نہایت محدود بزمِ خاص کے ساتھ راز و نیاز میں معروف نظر آتے ہیں! اخبارات تک کا پیام اک تصلائے عام" نہیں پایا جاتا! اگر ہم عامۂ خلائق کو اپنا مخاطب بنائیں تو وہ اُردو اور ہندی کے درمیان قدرِ مشترک ثابت ہوسکتے ہیں! اگر ہم اُن کی زندگی کے حالات و واردات کو اپنا موضوعِ ذکر و فکر بنائیں تو وہ اُردو ہندی کا معانقہ کرا دے سکتے ہیں!

"بنگالی زبان نے اِس شاہراہِ حیات پر گامزنی کی ہے۔ صرف اک وجودِ واحد یعنی رابندرا ناتھ ٹیگور نے بنگالی کی قلب ماہیت اور نشاۃِ ثانیہ انجام دے ڈالی! اُس نے فکر و شعر کے عرش تک پرواز کی اور پھر بنگال کے قریوں کی معصوم بولی میں اپنی حُورِ شاعری کو گویا کر دیا! ٹیگور، دیہاتی کشت و باغ کی اک "کویل" ہے! ——— کہا جاتا ہے کہ گجراتی میں بڑی حد تک ایسا ہی خوشگوار انقلاب گاندھی جی کی پاکیزہ اور زندہ قلمکاریوں نے برپا کر دیا ہے! ——— کیا ہمیں اِن "سالکانِ باخبر" کی تقلید کی توفیق ہوگی؟!

"ہندوستانی" جن حدود کو حرام جانے گی وہ دو ہیں ——— اُردو اور ہندی دونوں رسم الخط، اور مُلک کے مختلف "لسانی حلقوں" کی مقامی زبانوں کی انفرادیت! "ہندوستانی" گویا اِن تمام ثانوی وطنی زبانوں کے "دفترِ خارجہ" (Foreign Office) کی زبان ہوگی!

متعارف "ہندوستانی" کے حلقۂ اشاعت کو وسیع کرنے کے لئے ہم "اساسی انگریزی" (Basic English) کے کامیاب تجربے سے بھی اہم رہنمائی حاصل کرسکتے ہیں! "اساسی انگریزی کا سارا تخیل اور طریقِ تعامل (Esperanto) سے مختلف واقع ہوا ہے! کوئی ۹۰۰ الفاظ کی کُل کائنات رکھنے والی یہ زبان ہے! فنی و اصطلاحی فہرست اُس سے قطعاً خارج رکھی گئی ہے، صرف عام تمدنی بین الاقوامی افہام و تفہیم کا اک مختصر، لیکن پورا کارآمد ترجمان اک واسطہ ہے، صرف و نحو برائے نام ہی اس میں پائی جاتی ہے! تاہم قواعدِ زبان کو خواہ مخواہ پامال بھی نہیں کیا گیا ہے! عام انگریزی زبان سے اِس کی معرفت اتنی آشنائی ہوجاتی ہے کہ اُس کے آئندہ مطالعے اور ادبیاتِ عالیہ کی سخن فہمی کے لئے گویا اک دروازہ کھل جاتا ہے! "ہندوستانی" کے لغات کا اک باسلیقہ، ماہرانہ، ہنرِ لفظی انتخاب، مع مُصرحۂ بالا شرائط و آداب کے ہمارے لئے اک "اساسی ہندوستانی" بنا دے سکتا ہے! حسبِ موقع یہ "اساسی ہندوستانی" عام ہندوستانی اور بشرطِ امکان بعد میں اعلیٰ اردو اور اُتم ہندی کے مراحل طے کرا سکتی ہے:

اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را!

"تمام مباحث اور جملہ افکار کا خلاصہ، براہِ راست عملی تجاویز کی صورت میں مستقبلِ قریب کے آزاد کانگریسی ہندوستان کی سیاسی، انتظامی، اور تمدنی زندگی کے لئے) حسب ذیل ہوگا:

(۱) ہر صوبے (لسانی حلقے) کی سرکاری، دفتری، اور تعلیمی زبان وہاں کی مخلوق کی غالب جماعتی زبان ہوگی! اِن اغراض کے لئے جو زبانیں مسلمۂ دستور ہوں گی وہ وہی قبل ازیں مذکورہ بالا بارہ زبانیں ہیں! اور اُردو و دیوناگری دو رسم الخط (برائے "ہندوستانی")

(۲) "ہندوستانی" کے علاقے والے صوبجات میں ہندوستانی مع اپنے دوگونہ رسم الخطوں کے نافذ ہوگی۔ سرکاری اطلاعنامے ہر دو رسم الخط میں جاری ہوں گے۔ مگر ہر اہلِ معاملہ کو اختیار ہوگا کہ کسی اک واحد رسم الخط میں عدالت سے خطاب کرے، دوسرے رسم الخط والی نقل کے اِدخال کا وہ مکلف نہ ہوگا!

(۳) مدارسِ سرکاری (واقع حلقۂ "ہندوستانی") میں ہر طالب علم کوئی ایک رسم الخط حسبِ مرضی اختیار کرے گا۔ البتہ دوسرے رسم الخط کی تحصیل کی صرف "ہمت افزائی" کی جائے گی۔ اور وہ بھی "ثانوی منزل اسکول" میں!

(۴) "ہندوستانی" چونکہ تمام ہندوستان کی عام سرکاری دفتری زبان بھی ہوگی، لہٰذا ہر حصۂ ملک میں وہاں کی صوبجاتی زبان کے علاوہ "ہندوستانی" میں بھی ہر شہری عدالت سے خطاب کرنے کا مجاز ہوگا!

(۵) بنگالی، گجراتی، اور مرہٹی رسم الخطوں کو دیوناگری خط میں بطریقِ مناسب ضم کرنے کی کوشش کی جائے گی، تاکہ اِس مرکب رسم الخط سے ٹائپ اور چھاپے وغیرہ میں کام لیا جائے۔

(۶) اِسی طریق پر سندھی خط کو اُردو میں انہی اغراض کے لئے مدغم

کیا جائے گا !

(۷) جنوبی ہند کی کسی قدر اجنبی زبانوں کے رسم الخطوں کو دیوناگری تحریر میں جذب کرسکنے کے امکانات کی ماہرین کے ذریعے تفتیش اک نہایت مستحسن و مفید قسمت آزمائی ہوگی !

(۸) لاطینی کا رواج، بحیثیت اک آل انڈیا قومی رسم الخط کے، بظاہر خارج از بحث نظر آتا ہے !

(۹) جدید العہد "اُردوئے معلّٰی" اور "شدہ ہندی" کی موجودہ ترقی و ارتقا پر کوئی پابندی عائد نہ کی جائے، نہ اِسے مضر یا خوفناک یا غیر مستحسن یا غیر متوقع یا غیر فطری سمجھا جائے ! یہ دونوں باہم حلیف ہوں، نہ کہ حریف ! البتہ عالمگیر یکرنگی پیدا کرنے والی قوتیں اور خود اندرونِ ہند میں عامۃ الناس کی تعلیم از خود اک معیاری ہمواری پیدا کر دے گی !

(۱۰) آئندہ ہندوستانی مصنفین کو اپنی تحریرات میں روئے سخن عام خلق اللہ کی طرف رکھنا چاہئیے ! اِس طرح اُن کے اُسلوبِ بیان سے قدیم درباری لب و لہجہ اور مرصع کلمات و ترکیبات از خود رُخصت ہو جائیں گے ! اردو ہندی بھی قریب تر آنے لگیں گی !

(۱۱) اک "اساسی ہندوستانی" کی ترتیب عمل میں آنی چاہئیے۔ یہ "عام ہندوستانی" سے اولین اور کمترین روشناسی ہوگی، تاکہ بعد کے مراحلِ تحصیل آسان اور مرغوب ہو جائیں !

(۱۲) خارجی زبانوں سے علمی و فنی اصطلاحات، انسب یہ ہے کہ عموماً بلا ترجمہ، بجنسہٖ اختیار کر لئے جائیں ! ہندوستانی زبانوں سے بھی ضروری مصطلحات حسبِ موقع اخذ کی جاسکتی ہیں، لیکن رفعِ ابہام کے لئے اشد ضرورت ہے کہ ماہرین اُن کی اک مسلّمہ و مصدقہ و مستند فہرست شائع و تشہیر کر دیں۔

(۱۳) ہر لسانی صوبے میں اصولاً و عموماً وہاں کی مقامی زبان ہی میں تعلیم دی جائے گی، تاہم اگر اک کافی تعداد اک مختلف زبان کے طلبہ کی چاہے تو اک قابلِ رسائی مرکز کے میسر آنے کی صورت میں صرف ابتدائی تعلیم ان بچوں کو اپنی مادری زبان میں دی جائے گی ! تعدادِ طلبہ کے معتدبہ ہونے پر ثانوی تعلیم کا بھی یہ اہتمام کیا جاسکے گا ! تاہم صوبے کی مسلّمہ زبان کی تحصیل لازمی ہوگی !

(۱۴) غیر ہندوستانی "صوبجات میں" اساسی ہندوستانی "کی تعلیم کا آغاز منزلِ ثانوی سے کیا جائے !

(۱۵) یونیورسٹی کے مراحلِ تعلیمی میں مقامی زبان، ہندوستانی، اور ایک بیرونی زبان جبری مضامین میں داخل ہوں گی ! ثانی الذکر زبان، وطن کی عام تمدنی و مجلسی اشتراک کے لئے، اور آخر الذکر اعلیٰ فنی تعلیم کی غرض سے تجویز کی جاتی ہے !

(۱۶) اُردوئے معلّٰی، اُتم ہندی، اور دوسری ہندوستانی زبانوں کی اعلیٰ قسمیں ثانوی منزلِ اسکول میں اختیاری، لیکن یونیورسٹی کے مرحلے میں لازمی ہوں گی ! اِنہی کے ساتھ کم از کم ایک خارجی زبان بھی شامل ہوگی ! ——— بغرض اعلیٰ مطالعۂ علم و فن !

(۱۷) ہمیں تراجم کی بھی ایک بڑی مُہم شروع کرنی چاہئیے ! ہماری وطنی زبانوں کو اِن سے ارتقا نصیب ہوگا۔ لسانی و ادبی و علمی قوت و حیات کے چشمے اُن کی رگ و پے میں بہیں گے، اور مہذب دنیا کے ترقی کُن علوم و فنون، اور رواں دواں تمدنِ عالم سے ہمارا رابطہ جاری رہے گا !

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~
~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

نقد و نظر!

ادارہ

نغمات } قامت، چھوٹی کتابی، ضخامت ۱۰۶ صفحات، کاغذ و کتابت و طباعت عمدہ، مجلد، معہ مخصوص جامعی "گرد پوش" مطبوعہ رفاہ عام پریس آگرہ۔ ملنے کا پتہ: مکتبۂ جامعہ ملیہ، قرول باغ، نئی دہلی قیمت صرف ایک روپیہ آٹھ آنے۔

"نغمات"، ل احمد صاحب اکبرآبادی کے چند مختصر افسانوں (طبعزاد یا مترجمہ یا مختار!) اور ادبی شہ پاروں کا اک خوش سلیقہ گلدستہ ہے! لطیف صاحب اُردو "انشائے لطیف" کے غالباً اوّلین "احسن الخالقین" ہیں! اُنکی دوشیزہ جنبش قلم ———— افسانۂ "لالہ رُخ" (اُردو پیکر) ———— نے اُنھیں اُردو ادبِ لطیف کے "ارژنگِ چین" کا مانی بنا دیا! "نغمات" اُن کی مینا کارانہ ریزہ نگاری کا اک جواہر خانہ ہے! عام موضوع کے اعتبار سے وہ حسن و عشق ہی کی داستانِ رنگین کے نقاش ہیں، لیکن یہاں "نغمات" کی "عمومیت" اس قدر قابلِ ذکر نہیں جس قدر کہ اُن کی "خصوصیت"! وہ "حریم حسن" کے بعض نادیدہ گوشوں پر سے زرکار پردے اُٹھاتے ہیں۔ اور "نہاں خانۂ عشق" کے بکثرت تہخانوں کے اسرار کو سطح پر لاتے ہیں! ؎

بہ نازِ حُسن کہ بندد نقاب در خلوت

بہ رازِ عشق کہ آید برہنہ در بازار!

لسانی مآخذ کے اعتبار سے بھی نغمات بہت مُتنوع اور بوقلموں واقع ہوئے ہیں۔ انگریزی، فرانسیسی، جاپانی وغیرہ وغیرہ بکثرت لسانی و ادبی سرچشموں کی یہ اک "گنگا جمنی، جوئے آب" ہے، یا بَینَ الاقوامی ادب و انشا کی اک "قوسِ قزح" ———— جس پر کسی مزید رنگ و آہنگ کا اضافہ ناممکن نظر آتا ہے!

اکثر چیزیں وارداتِ عشق و جمال کی "نقاشانہ مُعاملہ بندیاں" یا Snap-shots ("فوری فوٹو") واقع ہوئی ہیں! چند جلوؤں پر نظر سے خوش گزرے:

(۱) میں اور وہ باغ میں رنگ و نگہت کی موجوں میں تیر رہے تھے! وہ اِس طرح جھکی جس طرح شبّو کی نازک شاخ لچک جاتی ہے اور گلاب کا ایک پھول توڑ لیا!.... میں نے دیکھا کہ پھول اُس کی سانسوں سے اور رنگین ہو گیا!

(۲) وہ گاؤں کے باہر اُس کی منتظر کھڑی تھی...... مُضطرب جسم انجم کی اک ارضی صورت! وہ آیا، یہ کچھ کھنچی! وہ بڑھا۔ یہ کچھ کھنچی، لیکن پھر دونوں ایک تھے، اک عالمِ خود فراموشی میں: سیاح نقاش آیا، اور اِس تصویرِ جلب و سلب کو دیکھا...... لیکن اُس کے پاس کوئی رنگ ایسا نہ تھا، جس سے وہ اِس "روحِ معاشقہ" کو نُمایاں کرسکتا! ع

بشکن اے نقاش اینجا خامۂ تصویر را!"

(۳) چینی و جاپانی شاعری کا "اعجازِ ایجاز" ضرب المثل ہے! اک نو وفات جاپانی بچے کا پورا مرثیہ اک "واحد نوائے حسرت" میں مرکوز دیکھئے!

"معلوم نہیں، چمکیلے بھونرے کے تعاقب میں آج وہ کتنی دور نکل گیا!!"

"نغمات" کے آہنگِ سوز و ساز ایسے واقع ہوئے ہیں! (ا۔ا۔خ)

اَنمول جواہرات } مرتبہ ہرچرن لال، مُبلّغ رادھا سوامی مت، دیال باغ، آگرہ، ضخامت ۵۴ صفحات، سائز چوڑا رسالجاتی، کاغذ دبیز سفید، کتابت عمدہ قدرے جلی، طباعت صاف قیمت ۸/

"رادھا سوامی مت" کے روحانی پیام سے متعلق چند مقالات و مضامین کا یہ اک خوش سلیقہ مجموعہ ہے، جو کتابی صورت میں شائع ہوا ہے، دو ایک مضمون خارجی سرچشموں سے بھی ماخوذ ہیں۔ لیکن عموماً "سوامی مت" ہی کی دعوت کی ترجمانی "مت" کے مُنادیوں ہی کے قلم سے کی گئی ہے: "دیال باغ" کی نو آبادی رادھا سوامی مت کا اک ایسا تعمیری کارنامہ ہے جو اپنی نظیر آپ ہے! خیال تھا کہ اُس کی پشت پر روحانی و اخلاقی تعلیم بھی اِسی پایہ کی ہوگی۔ "انمول جواہرات" میں جو مواعظِ حسنہ نظر آتے ہیں، حاشا و کلا کہ ہم اُنھیں قطعاً کوئی ادنیٰ درجے کی چیز نہیں سمجھتے! تاہم بادب اتنا عرض کریں گے کہ ہمیں اِن پاکیزہ تحریرات میں "روحانی خود بینی" کی اک مخصوص، گو خفیف، جھلک کو دیکھکر اک گونہ صدمہ گزرا! ہمارے نزدیک مذہب، روحانی رفعت اور انسانی شرافت کا دوسرا نام

ہے! ہم ان دونوں چیزوں کی بیش از بیش تبلیغ و تلقین کرسکتے ہیں۔ لیکن انھیں کسی طرح اپنی "خانہ ساز ملکیت" نہیں بناسکتے! آفتاب عالمتاب حقیقت کے، ممکن ہے کسی دَور میں ہم ہی تنہا شاہد ہوں، تاہم آفتاب، دنیا کی اک عالمگیر متاعِ مشترک ہی رہے گا! مذہبی تبلیغ اور "روحانی اشتہار بازی" کے درمیان ہمیں فرق کرنا چاہیئے! بااینہمہ ہمیں اعتراف ہے کہ "رادھا سوامی مت" والی اِس عام لَوث سے نسبتہً بہت زیادہ پاک ہیں۔ کہنے کا مطلب صرف یہ تھا کہ ہمیں اُن سے اس سے زیادہ بلند و بے نیاز معیار کی توقع تھی! زیرِ تنقید کتابچے کے مضامین بہرحال اعلیٰ، پاکیزہ، کافی متنوع، خاصے فیاضانہ، اور عموماً اک روحانی کیف، بشری الفت، اور اک اخلاقی و اصلاحی اپیل کی اسپرٹ سے متحرک و جولاں ہیں! ہم ناظرین سے اُن کے پڑھنے کی تہ دل سے سفارش کرتے ہیں! (ملنے کا پتہ: سرن داس، پریم نگر، دیال باغ، آگرہ

(ا-ا-خ)

ماہنامۂ "عالمتاب" (لاہور)

عام رسالجاتی سائز، ضخامت ۴۸ صفحات۔ کتابت و طباعت و کاغذ بدرجۂ اوسط۔

مُدیر۔ بسمل دہلوی،　　　چندہ ۲ سالانہ

عالمتاب کی پہلی جلد کا یہ پہلا ہی نمبر ہے! ساری ہیئت و صورت عموماً "بے نوایانہ" ہی نظر آتی ہے، تاہم مضامین کی جدت، اور حضرتِ مُدیر کی طبعی حرارت و حدت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم اُس کے مستقبل کے متعلق شاید کہہ سکتے ہیں کہ ممکن ہے ؎

رے اُڑے بُلبل بے پرکہ مذاقِ پرواز!

تاہم ابھی بڑی بہتری اور بالیدگی کی گنجائش ہے! ہمارا خیال ہے کہ حضرتِ بسمل کا مفرط سوز رسالے کے تعمیری ساز میں شاید حائل ہوجائیگا! خدا نہ کرے کہ ایسا ہو! ہم تہِ دل سے دعا کرتے ہیں کہ اس قابلِ داد روحِ تپش رکھنے والے آرگن کو کافی مادی ساز و برگ حاصل ہوجائے، تاکہ ؎

ہم کو بھی وہ دکھائے کہ مجنوں نے کیا کیا!

اور کہیں ایسا نہ ہوجائے کہ ؎

ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے "خونِ گرم" دہقاں کا!

عالمتاب جدید اُردو ہندوستان کی ہمت افزائی اور دستگیری کا مستحق ہے! (ا-ا-خ)

کہکشاں، دہلی

عام سائز، ضخامت ۸۰ صفحات، کاغذ و کتابت و طباعت خاصی اچھی، لوح مصور و رنگین طباعت آرٹ پیپر کی، سالانہ چندہ ایک روپیہ

اک اوسط درجے کا عام ادبی و تمدنی رسالہ ہے: "شذرات" میں "پین اسلازم" کی روحِ رواں دواں نظر آتی ہے، اور "رشبدِ گل" اور "گل دریچاں" کی "دلعزیبی" عنوان" کے تحت، علی الترتیب دہلی اور اسلامی ہندوستان کی سیاسیات و شخصیات و ذاتیات سے متعلق "تکلیف دہ" "کلوخ اندازی و سنگ باری"! "شبان المسلمین قاہرہ" پر اتنا سیر حاصل مقالہ ہے کہ قیاس ہوتا ہے کہکشاں اک "مصر کا مجلہ" ہے! اور ہندوستان کی اسلامی سیاست و معیشت سے اُس کے صفحات اِتنے معصوم ہیں کہ معلوم ہوتا ہے اُس نے یہ کام کانگریس ہی کے نام تمام و کمال "ہبہ" کردیا ہے اور اُس نے صرف "اسلامی ثقافت" اور "اردوئے معلیٰ" کی بقا کے تحفظ کا مطالبہ کرکے بقیہ سب کچھ اُسی کے سپرد کردیا ہے! ؎

از صحنِ خانہ تا بلبِ بام ازانِ تو
وز سقفِ خانہ تا بہ ثریا ازانِ من!　　　(ا-ا-خ)

گُل فروش، دہلی

اک ہفتہ وار مصور اخبار، چھوٹا اخباری سائز، ضخامت ۲۰ صفحات، کاغذ و کتابت و طباعت معمولی، لوح مصور آرٹ پیپر کی، مع ایک دلچسپ تاریخی منظر کے نقش کے! چندہ سالانہ ۳ قیمت فی پرچہ ار — اک معمولی "ہفتہ وار" ہے۔ پالیسی بیکوقت "اشتراکی" و "خلافِ کانگریس" ہے! ہدفِ تعریض و ملامت بیکدم خواجہ حسن نظامی و مہاتما گاندھی ہیں! صف آرائی، بہ یک نفس، خواجہ صاحب کی "ننگِ وجود مجوزہ جدید کانگریس" اور "انڈین نیشنل کانگریس" کے خلاف نظر آتی ہے! ؎ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی!

اِتنی اندرونی دماغی کشمکش، اتنا "گیر و دار و مریز" اِتنا "دمبدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من" ہے کہ جب ہم سیاسیات کی بساط پر آئیں گے تو جو کچھ "طوفانِ بے تمیزی" برپا ہوگا بآسانی قیاس کیا جاسکتا ہے: بوالعجبی یہ ہے کہ خواجہ صاحب مجسم "قدِ آدم پوسٹر" بھی ہیں، اور بااینہمہ کانگریس پر جب وہ اپنی "محفوظ کمین گاہ" سے تیر بازی کرتے ہیں تو "حیرت انگیز صاف گوئی و جراُت پیشگی" کے مجسمۂ صدق و حق ہوجاتے ہیں؟! —— بہرحال بے اصول و بد مذاق مسلمانوں کے پڑھنے کے لئے اچھا اخبار ہے!　　　(ا-ا-خ)

انشائے لطیف

ادیب العصر حضرت لطیف الدین احمد اکبر آبادی کے افسانے

اُردو ادب میں صاحب "لالہ رُخ" کا نام محتاجِ تعارف نہیں، اور افسانہ نویسی کا جو معیار ل احمد نے پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ تنہا ایک مثال ہے، اُن کا افسانہ علم و حکمت، جذبات، واردات اور نفسیاتِ حسن و عشق کے نازک ترین اشارات کا حامل ہوتا ہے، اُن کا طرزِ انشا شعریت اور تفلسف اردو ادب میں مستقل اضافات ہیں —— ل احمد صاحب کے افسانے بلا شائبہ تغلیط ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں رکھے جا سکتے ہیں —

انشائے لطیف ل احمد صاحب کے پندرہ شہ پاروں کا مجموعہ ہے، جو اکثر نگار اور دیگر مجلاتِ علمیہ و ادبیہ میں طبع ہو کر مقبولیت دوام حاصل کر چکے ہیں، اس لئے اگر آپ کو سلاست و نفاستِ زبان کے ساتھ نفسیاتِ شباب اور جذباتِ حسن و عشق کی صحیح نقاشی سے کوئی خاص لگاؤ ہے، اگر آپ ادب و شعریت کا ذوقِ سلیم رکھتے ہیں تو اس مجموعہ میں آپ کو اپنی طلب و تشنگی کے لئے مکمل سامان سیرابی نظر آئے گا، طباعت و کتابت روشن، و بہترین ہونے کے ساتھ کراؤن سائز پر تقریباً ڈھائی سو صفحات کی ضخامت، نفیس جلد اور

قیمت صرف دو روپے علاوہ محصولڈاک

نغمات

نثر کی شاعری

ادبِ اردو میں جناب ل احمد کی تنہا وہ ہستی ہے جس نے حُسن و عشق کی واردات اور نفسیات کو انتہائی مطالعۂ فکر کے ساتھ اپنے ذاتی تاثرات و تکیفات کے ماتحت شعریت، موسیقی یا موسیقیت، شعر کی صورت میں صفحاتِ سادہ کو فردوسِ خیال بنا دیا ہے، اس مجموعہ میں جناب لطیف کے ساتھ مختصر ترین افسانے اور ادب پارے شامل ہیں جنھیں نثر کی شاعری کے شہ پاروں کا ایک وجہ آفرین کارنامہ کہا جا سکتا ہے، یہ کتاب بھی مکمل ترتیب و تہذیب کے بعد تیار ہو چکی ہے، اگر آپ اپنی زبان کی نزاکت و لطافت کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ضرور منگائیے، قیمت صرف ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

ملنے کا پتہ: مینیجر کلیم بک ڈپو، جنتی نواس نمبر ۴ دریا گنج، دہلی

ساغر نظامی کا کلیات نظم و غزل

بادۂ مشرق

وہ تاریخی کتاب جس کے دیباچے مشرقی و مغربی علوم کے ماہرین و سر برآوردہ انشا پردازوں نے تحریر فرمائے ہیں، حجم ۴۰۰ صفحات، کاغذ دبیز، چکنا، ۳۸ پونڈ، سائز پیام مشرق، کتاب ۱۲ ابواب میں منقسم ہے، ہر باب کا سرورق رنگین و مصور ہے، غیر مجلد ٹائیٹل اُبھری ہوئی ڈائیوں سے مرصع ہے، اور مجلد ٹائیٹل سنہری ڈائی سے مزین، جلد کا کور سہ رنگا۔

ساری کتاب ہندوستانی شاعری کے جدید پاکیزہ تخیل کی حقیقی تصویر ہے، زندگی اور جوانی، حب وطن اور آزادی کے وہ آتشین نغمات اس کتاب میں پائے جاتے ہیں، جنھوں نے قوم میں نئی زندگی پیدا کر دی ہے، اس کے باوجود اس کی قیمت کتاب کے حسن و جمال اور ضخامت کے لحاظ سے بالکل حقیر ہے، یعنی

صرف پانچ روپے علاوہ محصول

۱۰۰ سو شعر کا سٹ

جوش، جگر، اصغر، حسرت، میر، درد، غالب، مومن، داغ

(کے)

ایک ایک سو بہترین اشعار

ہر شخص کو ہر شاعر کا سب کلام پڑھنے اور اُس کی شاعری کے متعلق رائے قائم کرنے کا موقع نہیں ملتا ہے، اسی خیال سے یہ سلسلہ جاری کیا گیا ہے، ہر کتاب میں دورِ جدید یا دورِ قدیم کے ایک ممتاز شاعر کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام سے منتخب کرکے بہترین سو شعر دئے گئے ہیں، ساتھ ہی سوانح حالات اور کلام پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے، باوجود اختلافِ مذاق کے نصف سے زیادہ اشعار آپ کو اپنی پسند کے ملیں گے، **جیبی سائز، کاغذ، کتابت، طباعت دیدہ زیب، سرورق خوشنما،** جس پر ہر شاعر کی تصویر بھی ہے۔

قیمت فی کتاب چار آنے (۴ر)

ملنے کا پتہ: مینیجر کلیم بک ڈپو، جنتی نواس ۴ دریا گنج، دہلی

معارفِ جمیل

حضرت حکیم آزاد انصاری کا پہلا مجموعہ کلام

جو غزلوں، مسلسل غزلوں، نظموں، قطعوں، اور رُباعیوں پر مشتمل ہے!

وہ حضرات جو اُردو شاعری کے ہر دَور اور ہر دَور کے طرز بیان کا گہرا مطالعہ کر چکے ہیں اس حقیقت پر متفق ہیں کہ حکیم آزاد اردو میں جس طرز بیان کے موجد و خاتم ہیں، اُس کی نظیر ولی سے لے کر اس وقت تک کی اُردو شاعری میں کہیں نہیں مل سکتی۔

اگر آپ بالکل انوکھے طرز بیان کا مطالعہ فرمانا چاہتے ہیں، تو آج ہی آرڈر دیجیے، اس مجموعہ میں آپ کو تغزل، تفلسف، حسن و عشق، رندی و سرمستی، اور رنگینی و رعنائی ہر شعر کے اندر جھلکتی ملے گی، اور ہر رنگ اتنا گہرا ہو گا کہ آپ کے دل و دماغ پر ایک سرور سا چھا جائے گا۔

کاغذ چکنا، طباعت و کتابت روشن، سائز کراؤن صفحات ۲۵۶۔

قیمت مجلد ع۲، غیر مجلد عہ

ملنے کا پتہ: منیجر کلیم بک ڈپو، جینتی نواس نمبر ۴ دریا گنج دہلی

اطلاع

جن صاحبان کے پاس پرچہ نہ پہونچے تو وہ دس تاریخ تک پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع کر دیں ورنہ بعد میں پرچہ نہیں بھیجا جائے گا۔　　منیجر کلیم دہلی

مشرقی عظمت کا علمبردار

جاپان

مُصنّفہ: چمن لال سیاح جاپان

مُترجمہ: محمود علی خاں (جامعی)

آج سے صرف اسّی برس پہلے جاپان جس سے اب ایشیا کا نام روشن ہو وہ بالکل گمنامی میں پڑا تھا، لیکن اس مختصر مدت میں اُس نے وہ حیرت انگیز ترقی کی کہ اس کا شمار دُنیا کی زبردست طاقتوں میں ہونے لگا۔ اس انقلاب کی داستان اس تصنیف میں ملاحظہ فرمائیے، جس کے متعلق ڈاکٹر سنڈرلینڈ (امریکہ) فرماتے ہیں کہ یہ کتاب جدید جاپان کے متعلق سب سے زیادہ پُرازمعلومات کتاب ہے، صفحات ۴۵۰ بلاک کی ۲۰ تصاویر، مجلد عار غیر مجلد ۱۱ تصاویر عہ

کائنات

مصنفہ: محمود علی خاں جامعی

اس کتاب میں علم ہیئت کے راز آسان سے آسان زبان اور سادہ سے سادہ اسلوب بیان میں بچوں کو ایسی مثالوں اور دلچسپ دلیلوں سے سمجھائے گئے ہیں کہ فوراً ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔ ہمارا کرۂ ارض کیا ہے، سورج و چاند ستارے کیا ہیں۔ ان کا ایک دوسرے سے کیا تعلق ہے، اور ایک دوسرے پر کیونکر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان سوالات کے نہایت کافی جوابات۔ متعدد نقشوں سے مزین صفحات ۸۰۔ قیمت چار آنے علاوہ محصول۔

ملنے کا پتہ: منیجر کلیم بکڈپو، جینتی نواس نمبر ۴ دریا گنج دہلی

گرمیں لیجے اور رنا دُسے زنانی
نظر آتے ہیں نوجوان کیسے کیسے
بنام قوت وحیات
کلیم
آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجھکو صد حیف یہ حکم
آگے کئی صدیوں ہے فسانہ اپنا
بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا
سالانہ چندہ چھ روپے
منظور شدہ گورنمنٹ میسور و پٹیالہ
ششماہی چندہ تین روپے آٹھ آنے
قیمت فی پرچہ نو آنے

اشارات

مسلم لیگ

نہ ہم سمجھے ، نہ تم آئے کہیں سے
پسینہ پونچھیئے اپنی جبیں سے

نہ تو میں سیاست کا ماہر ہوں ، نہ قوم کا لیڈر ، لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں ، اور اس جانتے کا ببانگ دہل اعلان بھی کردینا چاہتا ہوں کہ ہندوستانی سیاسیات میں جس عیش پسند جماعت کو "مسلم لیگ" کے خطاب سے یاد کیا جاتا ہے اور جو چند جاہ پسند خطاب یافتہ اور خطاب خواہ بیرسٹروں ، ایڈوکیٹوں ، زمینداروں ، خان بہادروں اور ٹائیوں ، سگرٹوں ، سگاروں ، نیکر ، نائیٹوں ، موٹروں ، اور سنہریوں والی حریر و پرنیاں میں لپٹی ہوئی ، ایک کاہل ، سست اور کام چور جمعیت ہے ۔ اُسے ایک سخت ناکارہ جماعت کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا ۔

یہ میں کیونکر جانتا ہوں ؟ اس لئے اور صرف اس لئے کہ میری آنکھوں میں روشنی ہے اور سر میں مغز ۔

مسلم لیگ ان چیزوں میں سے نہیں ہے جن کے جاننے کے واسطے کسی خاص غور و فکر اور کسی خاص فنی معلومات یا بعض مخصوص سائنٹیفک آلات کی ضرورت ہوتی ہے ۔

"مسلم لیگ" تو ہر صاحب نظر کے سامنے ،
صورت بہیں حالت مپرس

مُدیر

کے نعرے لگاتی ہوئی آتی ہے ـــــ یہ آج کوئی نئی بات نہیں ہے ، بلکہ قدیم زمانے میں بھی جب کبھی یہ عجوزہ سامنے آئی ہے ، اُنھیں برہنگیوں کے ساتھ آئی ہے ۔

مسلم لیگ کی یہ بڑی بدبختی ہے کہ اب وہ قدیم زمانہ نہیں رہا ہے ، جب ملک کے افراد سیاسی بصیرت سے محروم تھے ـــــ اب ہندوستان کی بصیرت کم سے کم اس قدر تو ضرور ہی ترقی کرچکی ہے کہ اِدھر کوئی فرضی جماعت سامنے آئی ، اور اُدھر اُس نے اُس کی حقیقت کو پہچان لیا ۔

ایک حدیث ہے ، عجیب و غریب حدیث ، میں تو جب اس حدیث پر غور کرتا ہوں ، پیغمبرِ اسلام کی فلسفیانہ عظمت کے سامنے سجدہ کرنے پر مائل ہوجاتا ہوں ، یعنی "مومن کے سامنے آنے سے خوف کھاؤ" اس لئے کہ اُس کی بصیرت انسان کے پنہاں ترین عیوب کو بیک نگاہ معلوم کرلیتی ہے ـــــ کتنی زبردست حقیقت بیان کی گئی ہے ـــــ اگر کوئی مجھ سے کہے کہ اس حدیث کی صداقت پر دلیل پیش کرو ، تو میں اُس سے یہ کہوں گا کہ اتنا تو غالباً ہر شخص کو معلوم ہے کہ ہر انسان کے دو رُخ ہوتے ہیں ۔ ایک داخلی دوسرا خارجی ۔

داخلی پہلو کے تحت انسانی سیرت ، جبلّت ، سرشت ، اور موروثی اثرات ہوتے ہیں ـــــ اور یہ رُخ اِس قدر پیچیدہ و پُرفریب ہوتا ہے کہ سالہا سال کے باریک ترین مُطالعے کے بعد بھی اس کے متعلق کوئی یقینی رائے قائم نہیں کی جاسکتی ۔

اِس کے مقابلے میں دوسرا رُخ ہے، جسے خارجی کہتے ہیں، اور یہ رُخ رفتار و گفتار، نشست و برخواست، عادات و اطوار، لب و لہجہ، مشاغل و مبلاقات، اور چشم و ابرو پر مشتمل ہوتا ہے — اور اپنے اندر انسان کے داخلی پہلو کے متعلق اس قدر روشن اور واضح علامتیں رکھتا ہے کہ اربابِ بصیرت اُسے دیکھتے ہی بیک نگاہ معلوم کر لیتے ہیں کہ فلاں شخص کیسا ہے اور کیسا نہیں۔

کون کہہ سکتا ہے کہ چہرہ، کتابِ دل کی فہرستِ مضامین نہیں ہوتا۔ اور کون ایسا اندھا ہے جو فہرستِ مضامین پڑھکر کتاب کی ماہیّت نہ معلوم کرلے۔

اگر قدرت انسان کے خارجی رُخ کو کافی اُبھار نہ دیتی، اور اُس کے آئینے میں اُس کے داخلی رُخ کو جھلکاتی نہ رہتی۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ ایسے بالغ نظر افراد نہ پیدا کر دیتی جو خارجی رُخ کے مطالعے سے اُس کا رُخ کا احاطہ کر لیتے ہیں، تو انسانی سیرت، سرشت، نیّت اور جبلّت کے معاملے میں دُنیا ہمیشہ اندھی رہتی، اور کھوٹے کھرے میں قیامت تک امتیاز نہ ہو سکتا۔

یہ صورتِ حال فرد ہی تک محدود نہیں، جماعتیں بھی اسی حلقے میں داخل ہیں۔ جماعتوں کے بھی فرد ہی کی طرح دو رُخ ہوتے ہیں، اور وہ بھی اپنے خارجی رُخ سے پہچان لی جاتی ہیں۔

ایک یہودی کا واقعہ بہت مشہور ہے کہ جیسے ہی اُس نے پیغمبرِ اسلام کا رُوئے مبارک دیکھا، یکایک چیخ اُٹھا کہ واللہ یہ شخص سچا پیغمبر ہے کیونکہ اس صورت شکل کا آدمی کبھی جھوٹا نہیں ہوسکتا۔

کیا یہودی نے پیغمبرِ اسلام کی سیرت کا مطالعہ کیا تھا۔ یا آپ کی صحبت میں اُٹھا بیٹھا تھا؟ نہیں — بلکہ پیغمبرؐ کے خارجی رُخ، یعنی چہرے میں اُس کی بصیرت نے اُن کا داخلی رُخ جھلکتا ہوا دیکھ لیا تھا، اور اسی بناء پر بے ساختہ چیخ اُٹھا تھا کہ اِس صورت کا آدمی جھوٹا ہو ہی نہیں سکتا۔

اسی طرح ہرقل کا ایک واقعہ بھی بہت مشہور ہے، یعنی جب اُس کے شکست خوردہ افسر اُس کے سامنے اپنی فتح مندی کی ڈینگ مارنے لگے، تو اُس کا چہرہ سُرخ ہوگیا، اور وہ یکایک چلّا اُٹھا کہ تم جھوٹے ہو۔ اِس لئے کہ فاتحوں کے چہرے ایسے نہیں ہوا کرتے۔

بالکل اسی طرح جب مسلم لیگ میرے سامنے آتی ہے، اسلام کا پرچم اُڑاتی، آزادیٔ وطن کا راگ گاتی، اور اللہ اکبر کے نعرے لگاتی ہوئی تو اُسی وقت میرے دل سے بیساختہ یہ آواز آنے لگتی ہے کہ تم ہے دلوں کے پوشیدہ بھید جاننے والے کی کہ یہ جماعت نہ تو ہندوستان کو آزاد کرا سکتی ہے اور نہ مسلمانوں ہی کو نجات دلا سکتی ہے۔ کیونکہ کسی ملک یا ملّت کے ناجیوں کے چہرے ایسے نہیں ہوا کرتے۔

ہندوستان کے زندۂ جاوید شاعر کبیر نے شاید مسلم لیگ ہی کے لئے یہ دوہا کہا تھا۔

(اصل)	(ترجمہ)
تورے دِیا دھرم نہیں تن مال	تیرے دل میں نیکی اور سچائی نہیں
کھوٹا کیا دیکھے درپن مال	تو آئینے میں صورت کیا دیکھتا ہے
اینٹھی گینٹھی پگھیا باندھے	ٹیڑھی ترچھی پگڑی باندھے ہوئے ہے
تیل چوئے چکّھن مال	اور زلفوں سے تیل ٹپک رہا ہے
کہیں کبیر سُن بھائی سادھو	اے بھائی سادھو سُنو، کبیر کہتے ہیں کہ یہ
یُو کیا لڑیں رَن مال	(نازنین) رَن میں کیونکر لڑیں گے؟

غُلاموں کی نماز

ہر رنگ میں ابلیس سزا دیتا ہے
انساں کو بہر نوع دغا دیتا ہے
کر سکتے نہیں گنہ جو احمق اُن کو
بے رُوح نمازوں میں لگا دیتا ہے

میں نے اپنے متعلق صاحبِ صلاح و صلوٰۃ ہونے کا کب دعویٰ کیا ہے کہ مندرجۂ ذیل واقعے کے بیان کرنے سے شرماؤں۔

وہ شخص جس کی زندگی، پبلک لائبریری ہو وہ یہ کیوں نہ بیان کرے کہ میں کئی روز ہوئے کہ اپنے ایک نہایت ہی مخلص، مگر افسوسناک حد تک مذہب گزیدہ دوست کے یہاں بیٹھا ہوا تھا کہ میرے معمولاتِ شبینہ، اور اُن کی نمازِ مغرب کا وقت آگیا۔

میرے دوست حضرتِ ساغر نے (جو بالغ ہوجانے کے بعد بھی بیسویں صدی میں اِس پر مصر نظر آتے ہیں کہ اُنھیں اب بھی ساغر نظامی لکھا جائے) شاید اسی موقعے کے لئے یہ شعر کہا تھا کہ:۔

مجھے شرع سے کوئی ضد نہیں، پر اس اتفاق کو کیا کروں؛

کہ جو وقت بادہ کشی کا ہو، وہی عین وقتِ نماز ہو

غرضکہ نماز کا وقت آتے ہی جس وقت کہ یہ رُباعی پڑھی جاسکتی ہے کہ:-

ہم دونوں ہیں لے نقیہہ، دیوانے سے
مطلب ہے فقط دل کے بہل جانے سے
ہر شام و سحر کرتے ہیں عیاشی ہم
تو ظرفِ وضو سے، اور میں پیمانے سے

میرے دوست نے ظرفِ وضو اُٹھایا اور وضو کرنا شروع کر دیا، اور اُن کے وضو شروع کرتے ہی، تمام حاضرینِ بزم میں آمادگیٔ صلوٰۃ کی ایک لہر دوڑ گئی ـــــــ لوگ دھڑا دھڑ کُرسیاں خالی کر کرکے نل کی طرف بھاگنے لگے، اور چشم زدن میں حضرتِ آزاد انصاری، اور میرے سوا کُرسیوں پر ایک شخص بھی باقی نہیں رہا۔ گویا ع

ساری بستی میں یہ دو گھر تھے مسلمانوں کے

ہر چند حاضرینِ محفل میں سے اکثر کے چہرے نماز کے تصوّر سے گھبرائے گھبرائے سے نظر آرہے تھے۔ مگر میزبان کی خاطر، اُن کے اعضاء و جوارح وضو کی خاطر جلد جلد حرکت کر رہے تھے۔ کہ اتنے میں میزبان کی نگاہ ہم دو باغیوں، یعنی حضرتِ آزاد اور مجھ پر پڑی، ـــــ جب اُنھوں نے یہ دیکھا کہ ہم لوگ اپنی اپنی کُرسیوں پر نہایت سکون کے ساتھ، اور قطعیٔ طور پر غیر متحرک بیٹھے ہوئے ہیں، تو وہ میری طرف بڑھے، اور بے پایاں خلوص کے ساتھ مجھ سے خواہش کی کہ میں بھی نماز پڑھوں ـــ جس کے جواب میں میں نے کہا کہ اگر یہ پیرِ دانا، اور یہ مردِ حکیم آزاد انصاری نماز پڑھنے پر آمادہ ہو جائیں تو میں بھی پڑھ لوں گا۔ چنانچہ آزاد صاحب کو دعوتِ صلوٰۃ دی گئی، اور یہ دیکھکر میں دنگ رہ گیا کہ وہ دعوت کی پہلی ہی ضرب میں سپر انداختہ ہو گئے اور وضو کرنے لگے، اثنائے وضو میں اُنھوں نے مجھ سے ہنسکر کہا آپ مجھے حیرت سے کیوں دیکھ رہے ہیں، میں ابھی وطن سے آرہا ہوں، جہاں مُلّاؤں اور شاہ صاحبوں کے سوا میرے گرد و پیش کوئی بھی نہ تھا، اور اُن کے خوف سے وہاں ڈیڑھ ماہ تک برابر نماز پڑھتا رہا ہوں، جب ڈیڑھ ماہ تک اِن مولویوں کی خاطر نماز پڑھی ہے تو ایک بار اگر اس وقت بھی پڑھ لوں تو کیا حرج ہے۔

جب معاملہ اس منزل پر پہونچا، اور میرے دوست نے اصرار میں اس قدر غلو فرمایا کہ خود لوٹا لے کر مجھے وضو کرانے کھڑے ہو گئے تو مرتا کیا نہ کرتا، چار و ناچار اُلٹا سیدھا وضو کرکے، حکیم آزاد کو غضب آلود نگاہوں سے دیکھتا ہوا سب کے ساتھ مُصلّے پر جاکر کھڑا ہو گیا۔ وہ شخص اور مُصلّے پر کھڑا ہو جائے جو "گل گشتِ مُصلّے" سے پیمانِ وفا باندھ چکا ہو ـــــ مُصلّے پر پہونچتے ہی میں نے آسمان کی طرف مُنھ اُٹھا کر کہا کہ اے "اللہ" تو جانتا ہے کہ مجھے تیری عبادت سے کوئی گُریز نہیں، لیکن تقلیدی عبادت، رسمی بندگی، اور بے رُوح نمازیں، اے نیتوں کے جاننے والے مجھ سے برداشت نہیں ہوتیں ـــــ "بارِ الٰہا"! تجھے معلوم ہے کہ یہ نمازیں نہیں، نمازوں کی مضحکہ انگیز نقالیاں ہیں، اور یہ عبادتیں درحقیقت

"بازی، بازی، باریش بابا ہم بازی"

کے مصداق ہیں ـــــ اے "رب العزّت" میں رندِ آزاد مشرب ہوں، مجھ سے نہ تو رسمی عبادت ہی ہو سکتی ہے، نہ میں تیری جناب میں گستاخی ہی کی جرأت کر سکتا ہوں ـــ تو دیکھ رہا ہے کہ مجھ پر جبر کیا جا رہا ہے، میری اِس میں کوئی خطا نہیں، تو گواہ رہنا۔

میرے اِس دردناک احتجاج پر نماز سے شغل کرنے والوں نے ایک قہقہہ مارا، اور ایک تھوڑی سی ڈاڑھی اذان دینے لگی، ـــــ اذان کے بعد صفیں مرتب کی گئیں اور نیتیں باندھ لی گئیں۔

لوگوں کے نیّت باندھتے ہی میرے دل پر وہ کیفیت طاری ہو گئی، جس کے متعلق بہت کچھ لکھنے کے بعد بھی میں اُس کی شرح کرنے کے حق سے کسی طرح بھی عہدہ برآ نہ ہو سکوں گا ـــ یکایک دیکھتا کیا ہوں کہ میرے ذہنی اُفق پر اسلامی نبوّت کا آفتاب طالع ہو گیا ہے، اور خود رسالتمآب جن پر میرے ماں باپ قربان ہوں، ہماری طرف دیکھ کر ارشاد فرما رہے ہیں کہ لے ہندی مُدّعیانِ اسلام اے موت کے نام سے جی چرانے والے بزدلو! تم نے میری شریعت کو پارہ پارہ کر ڈالا ہے۔ تم نے میرے برق و آتش سے کھیلنے والے اسلام کی عمارت کو مسمار کرکے رکھ دیا ہے، اور خود میرے کلمے کو بھی، میرے سب سے بلند کلمے کو بھی تم نے پست اور نہایت پست کر دیا ہے۔

خدا کی قسم کھا کر بتاؤ، کیا تم تک میرے یہ کلمات کسی نے اب تک

پہونچاتے ہی نہیں ہیں کہ وہ غلام جو آزادی کی سعی سے دست بردار ہو کر غلامی پر قانع ہو جاتا ہے، اُس کی عبادت درگاہِ رب العزت میں مقبول نہیں ہوتی؟ تم کہ غلامی پر قانع ہو، اور باطل سے مصالحت کر چکے ہو، تمہیں نماز پڑھنے کا حق کہاں سے پہونچتا ہے۔ اور تم کس مُنھ سے نماز پڑھتے ہو؟

اے مُدعیانِ اسلام، احکم الحاکمین نے تو قرآن میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اگر تم مسلمان رہو گے تو ہم تم کو کسی کا محکوم نہیں بنائیں گے۔ تم اِس کے معنی سمجھے؟ اِس کے صاف صاف معنی یہ ہیں کہ مسلمان کسی کا محکوم نہیں ہو سکتا، بلکہ وہ اِس لئے خلق کیا گیا ہے کہ کرۂ ارض ہی پر نہیں، شمس و قمر تک پر حکومت کرے،

لیکن اِس کے برعکس تم محکوم و مغلوب ہو، جس کے صرف دو ہی معنی ہو سکتے ہیں، یعنی یا تو نعوذ باللہ خدائے بزرگ و برتر نے تم سے جھوٹا وعدہ کیا تھا، یا یہ کہ تم سرے سے مسلمان ہی نہیں ہو۔

اِن دونوں میں ایک بات ضرور صحیح ہوگی، یعنی یا تو تم مسلمان ہو اور نقل کفر، کفر نباشد، خدا جھوٹا ہے، یا تم مسلمان نہیں ہو، اور خدا سچا ہے۔

بولو، تم اِن دونوں باتوں میں سے کسے پسند کرتے ہو، کسے صحیح سمجھتے ہو؟

ہاں تم اِس بات کے کہنے پر مجبور ہو کہ خدا سچا ہے، اور جب خدا سچا ہے تو تم ادعائے اسلام میں جھوٹے ہو ــــ اور جب تم از رُوئے قرآن و ایمان تم مُسلم ہی نہیں ہو تو پھر یہ تمہارے حج، یہ تمہارے روزے، اور یہ تمہاری نمازیں خدائے قہار سے مسخرا پن نہیں تو اور کیا ہیں،

یاد رکھو جس وقت تم اسلام کا دعویٰ کرتے ہو، اُسی وقت غیر ملفوظ طور سے یہ شکایت اور اعلان بھی کرتے ہو کہ خدا نے تو ہم سے وعدہ کیا تھا کہ ہم تمھیں کسی کا محکوم نہیں کریں گے۔ لیکن ہم مسلمان بھی ہیں اور محکوم بھی، اور ہم سے خدا نے جو وعدہ کیا تھا وہ جھوٹا تھا۔ آہ تمہیں کیا معلوم کہ تمہارا دعویٰ اسلام ایک ایسا کلمۂ کُفر ہے جسے معاف نہیں کیا جاسکتا۔

اِس کے علاوہ قرآن کریم میں یہ بھی دعویٰ کیا گیا ہے کہ نماز فواحش کو ترک کرا دیتی ہے، لیکن تم نماز بھی پڑھتے ہو، اور فواحش میں بھی مبتلا رہتے ہو، جس کے یہ معنی ہیں کہ تم یہ بات عملاً ثابت کر رہے ہو کہ نماز فواحش کو ترک نہیں کرا سکتی، اور قرآنِ مجید میں اُس کے متعلق جو دعویٰ کیا گیا ہے وہ صریحی اور بدیہی طور سے غلط اور کس قدر غلط ہے۔

اے اپنے کو مسلمان کہہ کر اپنے خدا و رسول کو رُسوا کرنے والے غُلامو! میں تم سے پھر ایک بار پُوچھتا ہوں کہ تم کس مُنھ سے نماز پڑھتے ہو، اور کس مُنھ سے مسلمان ہونے کے دعوے کرتے ہو؟

اگر میں کسی کے حق میں بد دعا کر سکتا تو سب سے زیادہ تم اُس کے مستحق ہو، اور اگر میں کسی پر لعنت بھیج سکتا تو سب سے زیادہ تم اُس اُس کے سزاوار ہو ـــــــ کہ تم نے میرے کلیجے میں سوراخ کر دئے ہیں۔ سوراخ! اور تم نے میرے دل میں داغ ڈال دئے ہیں، انگاروں کی طرح سرخ داغ،

یہ کہتے کہتے رسالت پناہ کا رُوئے مبارک سُرخ ہو گیا۔

زمین و آسمان گھومنے لگے، فضا میں کپکپی سی پیدا ہو گئی، در و دیوار ہلنے لگے، اور میرے ہر رونگٹے سے لَو نکلنے لگی۔ میں نے گھبرا کر نیت توڑ دی اور دیوانہ وار اُس مکان سے نکل کر سڑک پر آگیا، اور نیز تیز قدم رکھتا ہوا وہاں پہونچ گیا، جہاں:-

اے بیخبر ز لذتِ شُربِ مدام ما

کی لے پر آلامِ حیات کو "آبِ طربناک" میں غرق کر دیا جاتا ہے۔

سخن کوتہ، مرا ہم دل بہ تقویٰ مائل است اما
زننگِ زاہد اُفتادم بہ کافر ماجرائے ما

اِطلاع

معارف

(جوش)

اوہام سے دل ڈرے ہوئے ہیں اب تک
سیں طرح جبیں پہ سجدے ہیں اب تک
افسوس کہ اسلاف کے آبائی اقوال
کانوں میں بیاں بھرے ہوئے ہیں اب تک

کیا پایۂ تیرگیٔ گذشتہ نشیں ہے اب تک
کیا آپ ہی کا مرتبہ زمیں پہ ہوا اب تک
انساں کہاں ہوا ابھی پہنچا ہی کہاں
اور دین جہاں کل تھا وہیں ہوا اب تک

یارب یہ نئی لوح کا مضمون ہے کیا؟
صدیوں کیلئے ایک ہی معجون یہ کیا؟
ہر آن بدلنے والے انساں کے لئے
جوہر نہ بدلنے والا قانون یہ کیا؟

ہاں تصور ہے تو برسات کے بعد
موقع ہے طلوع صبح کا رات کے بعد
نادیدہ خدا کی یاد کرنے والو
ہے یاد کی منزل ملاقات کے بعد

ہاں نوعِ بشر انتشار میں ہے اب تک
انساں رہِ راست پر نہیں ہے اب تک
اللہ کو ہو مژدہ کہ سرِ شیخ میں بندہ
تھا روزِ ازل جہاں، وہیں ہے اب تک

اک قاعدہ استوار ہے، اور کچھ بھی نہیں
تخئیل کا سلسلہ ہے، اور کچھ بھی نہیں
کہتا ہے جسے فخرِ انساں الیقیں
اک وہم کا ارتقا ہے اور کچھ بھی نہیں

قدسی ازل ان سے کہہ چکے ہیں گویا
اسرار کی آنچ، سہہ چکے ہیں گویا
اسما و صفات سے گزرنے والے
صحبت میں خدا کی رہ چکے ہیں گویا

ہاں فخرِ عمل سیاہ کرتا ہوں میں
ہر سانس میں اب تو گناہ کرتا ہوں میں
اس پر بھی ہوں قدسیوں سے بڑھ کر معصوم
فطرت! تجھ کو گواہ کرتا ہوں میں

جوش ملیح آبادی

حسنِ مجروح

یوسف کے کلیجے کو مسلتی تھی کبھی
ہاں مصر میں یہ نسیم چلتی تھی کبھی
وہ لہر گذر رہی ہے بیزار سے رُخ
جو روئے زلیخا پہ مچلتی تھی کبھی

الفاظ میں غلطیدہ ہے جادو گویا
آواز بدل رہی ہے پہلو گویا
لہجے کا اثر ہے درد و رعب واللہ
لفظوں سے ٹپک رہے ہیں آنسو گویا

دل سینۂ نازک میں مچل جاتا ہے
چتون تری آنکھوں کا بدل جاتا ہے
اللہ رے سوزِ غم کہ میرے آگے
پھولوں کا اثر سے رنگ بدل جاتا ہے

نغمے ترے فریاد ہوئے جاتے ہیں
دل کشتۂ بیداد ہوئے جاتے ہیں
راتیں یہ جوانی کی ہیں اور دل ویران
افسوس کہ برباد ہوئے جاتے ہیں

آواز میں غلطاں ہیں نگاہیں گویا
گردن میں پڑی ہے تری بانہیں گویا
ہیں کرب سے اٹھ رہی ہیں پیہم ہچکیاں
آنکھوں سے نکل رہی ہیں آہیں گویا

کیا عشق کا بھی اثر ہے اللہ اللہ
اک شے وہ عجیب تر ہے اللہ اللہ
سر جس کے زانو پہ ہے ارماں جس کا
پہلو میں پڑا ہے وہ سر اللہ اللہ

جوش ملیح آبادی

جاپان اور لازمی تعلیم

جاپان اسکولوں کا مجموعہ ہے۔ سارا جاپان خود ایک اسکول ہے یعنی علم وفن کے لحاظ سے وہ انگلستان ثانی ہے۔ جاپانی قدیم یونانیوں کی طرح فطرۃً نہایت مستعد اور چست وچالاک ہوتے ہیں، اُن کی ذہنیت میں بڑی گنجائش ہوتی ہے وہ ہر چیز کو قبول کرنے کو تیار رہتے ہیں اور ہر نئی اور عجیب چیز کو سیکھنے کے شائق، یہ لوگ علم کی تلاش میں ایسے رہتے ہیں جیسے بطخ پانی کی تلاش میں۔

(ڈاکٹر نیٹوبے)

از چمن لال سیاح

مترجمہ محمود علی خاں (جامعی)

میں کوئی ماہر تعلیم نہیں ہوں اور نہ مجھے دعویٰ ہے کہ تعلیم کے سے اہم مسئلے پر رائے زنی کرسکوں گا، اس لئے میں ناظرین کے سامنے جاپان کی تعلیمی حالت کے متعلق چند ضروری اعداد وشمار اور خاص خاص واقعات پیش کردوں گا تاکہ وہ خود یہ طے کرسکیں کہ صحیح تعلیم کیسی نعمت عظمیٰ ہے اور اس کی بدولت کس طرح جاپان ستر سال کے اندر اندر اس قابل ہوگیا کہ برطانیہ اور امریکہ جیسی عظیم الشان سلطنتیں بھی اُس پر رشک کرتی ہیں، بخلاف اس کے ایک سو اسّی سال کی برطانوی سرپرستی کے باوجود ہندوستان کی دنیا میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔

اس کی وجہ کچھ زیادہ بعید از قیاس نہیں ہے، جاپان کی لازمی تعلیم میں اس کا راز مضمر ہے جو بنگال میں کلایو کی فتح کے تقریباً ایک سو سال بعد وہاں جاری ہوئی تھی، لیکن ملاحظہ کیجئے کہ کیسے شاندار نتائج برآمد ہوئے، آج وہاں ننانوے فی صدی آبادی تعلیم یافتہ ہے، جب کہ ہندوستان میں تعلیم کا اوسط صرف ۹/۱ فیصدی ہے۔

۱۹۳۱ء میں جاپان میں ۴۵۸۹۸ مدارس تھے، اس میں ابتدائی مدارس سے لے کر یونیورسٹیوں تک ہر قسم کے اسکول شامل ہیں، جن میں ۱۲۸۴۷۷۳۰ طلبا تعلیم پاتے ہیں یہ اسکول ملک کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں اور اُن کا اوسط دس میل میں تین اسکولوں کا پڑتا ہے، طالب علموں کا اوسط آبادی کا بیسواں حصہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جاپان میں ایک گاؤں یا ایک قریہ بھی ایسا نہ ہوگا، جہاں لوگ پڑھتے ہوئے نہ ملیں اور غریب سے غریب طبقے میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو لکھ نہ سکتے ہوں، لازمی فوجی بھرتی کے سلسلے میں ہر سال جو امتحانات ہوتے ہیں اُن سے یہ چیز اور زیادہ واضح ہوجاتی ہے، اس موقعہ پر پتہ چلتا ہے کہ ملک کے نوجوانوں میں بہت کم ایسے ہیں جو پڑھنے لکھنے سے نابلد ہوں۔

سرسری طور پر دیکھنے والے متعجب ہوتے ہیں کہ جاپان کو امریکہ اور یورپ سے تعلقات پیدا کئے، ابھی صرف پچاس سال ہی گزرے ہیں، لیکن اس نے تعلیم میں اتنی سرعت کے ساتھ کیسے ترقی کرلی، بہرحال یہ چیز نظر انداز نہیں کی جاسکتی، کہ جاپان ایک قدیم ملک ہے اور جس وقت مغربی تہذیب شروع ہوئی اُسے قبول کرنے اور اس سے استفادہ کرنے کی جاپان میں پوری اہلیت موجود تھی۔

شاہ میجی سے قبل جاپان کے تعلیمی نظریئے بودھ اور دیگر اثرات کے ماتحت بدلتے رہتے تھے، اس لئے لوگ بیرونی تعلیمات کو قبول کرنے کے اہل تھے

چنانچہ انھوں نے اپنے قومی آئین اور مخصوص جذبات کی امداد سے اپنی ایک خاص تہذیب کی بنیاد ڈال لی، میجی دور کے ابتدا میں جاپانی لوگ مغربی تہذیب کے اتنے شائق تھے کہ انھوں نے ہر مغربی چیز کو اختیار کر لیا تھا، اور طرح طرح کے اصولوں اور نظریوں کی پیروی شروع کر دی تھی، اس پر اکتوبر ۱۸۹۰ء میں تعلیم کے مسئلہ پر ایک شاہی فرمان جاری ہوا۔ جس میں ملک کی تعلیمی پالیسی کو بالکل واضح کر دیا گیا، اس کے بعد تمام اسکولوں نے ان اصولوں پر عمل شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ایسا تعلیمی نظام قائم ہو گیا جو ہر طرح قومی ضروریات کے مطابق تھا۔

آج جاپان کا تعلیمی نظام مغربی ممالک کے نظام سے کسی حالت میں کم نہیں ہے اور اسے یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے مشرقی اور مغربی تہذیبوں میں ایک امتزاج پیدا کر دیا ہے جس کی بنیاد ان کا قومی آئین ہے۔

مذکورۂ بالا شاہی فرمان کا ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

اے ہماری وفادار رعایا تجھے معلوم ہو کہ:۔ ہمارے بزرگوں نے ہماری سلطنت کی بنیاد وسیع اور دائمی اصول پر ڈالی تھی، اور نیکی کا بیج بہت گہرا اور ہوشیاری سے بویا تھا، ہماری رعایا جو ہمیشہ وفادار اور سعادت مند رہی ہے، نسلاً بعد نسلاً اس کے حسن کو نمایاں کرتی رہی ہے یہی ہماری سلطنت کی شاندار خصوصیت ہے اور اسی میں ہماری تعلیم کا راز پوشیدہ ہے۔

تم۔ اے ہماری رعایا!! اپنے والدین کے سعادتمند رہو، اپنے بھائی اور بہنوں سے شفقت سے پیش آؤ اپنی ازدواجی زندگی ہم آہنگی سے اور ایک دوسرے کے سچے رفیق کی حیثیت سے گزارو، حیا اور اعتدال کا لحاظ رکھو، ہر ایک سے فیاضی سے پیش آؤ۔ علم حاصل کرو اور فنون کو رائج کرو۔ اس طرح اپنی ذہنی استعداد اور اخلاقی قوتوں کو بڑھاؤ، علاوہ ازیں عام بہبود اور قومی مفاد کا خیال رکھو، ہمیشہ اپنے آئین کا احترام کرو اور قوانین کی پابندی کرو۔ اس طرح اپنے شاہی تخت کی عظمت کو برقرار رکھو اور اس کی حفاظت کرو جو تمہاری دنیا اور عقبیٰ کی ایک درمیانی کڑی ہے، تم محض ہماری نیک اور وفادار رعایا ہی نہ رہو بلکہ اپنے بزرگوں کی روایات کے علمبردار بھی بنو، یہ وہ شاہراہ ہے جو بلا شک و شبہ ہمارے شاہی بزرگوں نے بتلائی ہے جو ہر زمانے اور ہر موقع پر یکساں کارآمد ہے اور جس پر چلنا ان کی اولاد اور ان کی رعایا کے لئے یکساں لازم ہے، ہماری عین خواہش ہے کہ تم اور تمہارے ساتھ ہم بھی اسے نہایت احترام کے ساتھ اپنے دل نشین کر لیں تاکہ ہم دونوں ایک سے محاسن پیدا کر سکیں اور ایک ساتھ منزلِ مقصود پر پہنچیں۔

۳۰ ر ماہ دہم ۲۳ سنہ میجی (شاہی دستخط و مہر)

جدید تعلیمی نظام ۱۸۷۲ء میں فرانس اور امریکہ کے اصولوں پر قائم ہوا تھا لیکن قدیم جاپانی نظام کی خوبیاں برقرار رکھی گئی تھیں، نئے دور کے چار سال بعد اور جاگیرداری کی تنسیخ کے ایک سال بعد ہی اس پر عمل شروع ہو گیا یعنی اس سال سے جب کہ لازمی فوجی تعلیم کا حکم نافذ ہوا۔

فی الحال جاپان کا سارا انتظام تعلیم حکومت کے ماتحت اور سرکاری محکمۂ تعلیمات کے زیر نگرانی ہے۔ لیکن اس کا کچھ حصہ مقامی بورڈوں کے بھی سپرد کر دیا گیا ہے، تاکہ مخصوص مقامی ضروریات کا لحاظ رکھا جا سکے۔ مختلف افراد کو بھی یہ اجازت ہے کہ وہ چند شرائط کے ماتحت نجی اسکول اور تعلیمی ادارے قائم کریں۔ اس طرح جاپان میں مختلف نوعیت اور مختلف مدارج کے تقریباً ۵۴ ہزار اسکول ہیں۔ جن میں کوئی ایک کروڑ بیس لاکھ طلبا زیر تعلیم ہیں۔

ابتدائی تعلیم

جاپان میں لوئر اور اپر پرائمری اسکولوں کی تعداد ۲۵۶۰۰ ہے جن میں ۹۰ لاکھ ۶۰ ہزار بچے تعلیم پاتے ہیں، لوئر پرائمری کی مدت تعلیم چھ سال ہے اور اپر پرائمری کی دو سال یا بعض حالات میں تین سال ۱۹۰۷ء کے قانون کے مطابق ہر لڑکے اور لڑکی پر چار سال کے سلئے یعنی چھ سال سے دس سال کی عمر تک مدرسے میں تعلیم پانا لازمی قرار دیا گیا۔ اس کے بعد اس مدت میں دو سال کا اور اضافہ ہوا۔ اور یقین ہے کہ عنقریب دو سال اور بڑھا دئے جائیں گے، ابتدائی مدارس میں مادری زبان میں تعلیم دی جاتی ہے؛ اور شہر

چند مدارس کے سوا کہیں کوئی غیر زبان نہیں سکھائی جاتی۔ چھ سال سے بارہ سال کی عمر کے بچوں میں سے ۹۹،۴۸ فی صدی مدرسوں میں جاتے ہیں۔ یہ اوسط اتنا کافی ہے کہ دنیا کے ہر ملک سے اس کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ ابتدائی تعلیم کی اس حیرت انگیز اشاعت سے لوگوں کی ذہنی اور اخلاقی حالت میں غیر معمولی ترقی ہو گئی ہے، اس کا ثبوت لازمی فوجی بھرتی کے موقع پر ملتا ہے، سنہ ۱۹۲۶ء میں ان امتحان دینے والوں میں بے پڑھوں کا اوسط ۰،۸۲۱۱ فی صدی تھا لیکن سنہ ۱۹۳۰ء میں ۰،۴۸۲ رہ گیا۔

ہر شہر قصبہ یا گاؤں کا یہ فرض ہے کہ ایک دو اسکول ضرور قائم کرے اور چونکہ اس کے اخراجات گاؤں والے برداشت نہیں کر سکتے، اس لئے حکومت معقول امداد دیتی ہے۔ شہروں میں تمام اخراجات کا آٹھواں حصہ تعلیم پر خرچ ہوتا ہے، لیکن قصبات اور دیہات میں یہ خرچ نصف تک پہنچ جاتا ہے۔ حکومت نے طریقۂ تعلیم اُستادوں کی قابلیت، حفظانِ صحت اور نصاب وغیرہ کا ایک خاص معیار مقرر کر دیا ہے، اگرچہ اُستادوں کو بہت کم تنخواہ ملتی ہے۔ یعنی اوسطاً ۵۰ ین سالانہ لیکن عام سول ملازموں کے مقابلہ میں اُنھیں پنشن بہت فیاضی سے دی جاتی ہے، غرضکہ جاپان کی ابتدائی تعلیم کا نظام اتنا اعلیٰ ہے کہ وہ اس پر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

لازمی تعلیم کی برکات

لازمی تعلیم کے خوشگوار نتائج پیش کرنے کے لئے میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر نیٹوبے مرحوم کی کتاب "جاپان" کے چند اقتباسات پیش کر دوں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف ایک عالم متبحر اور مشہور و معروف اہل قلم تھے، وہ تحریر فرماتے ہیں کہ

"ہمارے نظام تعلیم میں ضرورت سے زیادہ تنظیم کے خواہ کتنے ہی نقائص موجود ہوں اور حکومت کا خواہ اُس پر کتنا ہی اثر کیوں نہ ہو لیکن اس کے باوجود اس میں ذرا شک نہیں ہے کہ اس سے حیرت انگیز نتائج مرتب ہوئے ہیں، مختلف صوبوں کی بولیوں میں جو زبردست اختلاف تھا اور ڈیمیو لوگ اپنے اپنے علاقے میں مقامی تنگ نظری کے پیش نظر جس کی تلقین کیا کرتے تھے اب وہ بالکل مٹ گیا ہے، زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ شمال کا ایک شخص جنوب کے اپنے ہم وطن کی بات سمجھ بھی نہ سکتا تھا، وہ دونوں ایک ہی زبان ایک ہی لغت اور ایک ہی قواعد استعمال کرتے تھے۔ لیکن لہجہ میں آسمان و زمین کا فرق تھا۔

جس چیز پر لازمی تعلیم بجا طور پر فخر و ناز کر سکتی ہے وہ رسالوں اور اخباروں کی غیر معمولی تعداد اور اشاعت ہے، ان میں سے دو اخبار تو روزانہ ۱۵ لاکھ شائع ہوتے ہیں، جاپانیوں کی عام تعلیم کا ایک دوسرا بیّن ثبوت یہ ہے کہ تمام روزانہ اخبارات اپنے پہلے صفحہ پر صرف کتابوں اور رسالوں کا اشتہار دیتے ہیں۔

لازمی تعلیم کا سب سے اہم کارنامہ عوام کا ذہنی اور سماجی ارتقا ہے، ایک انگریز مصنف نے اس چیز پر پیہم زور دیا ہے کہ جاپانی اسکولوں میں طالب علموں کے درمیان کوئی ادنیٰ و اعلیٰ کا امتیاز نہیں کیا جاتا۔ یعنی دولت اور نسل کی بناء پر کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا۔ اسکول جمہوریت کی تعلیم دینے کا سب سے معقول ذریعہ ہے۔ یہ خدمت وہ اس طرح انجام دیتا ہے کہ ایک طرف لوگوں کے ذہنی ارتقا کا انتظام کرتا ہے اور دوسری طرف تمام طالب علموں کے ساتھ یکساں سلوک کرتا ہے۔ نہ تو جاپان کے امراء کبھی اس قسم کی شکایت کرتے ہیں کہ ہمارے لاڈلے بچے اسکول میں حقیر سمجھے جاتے ہیں۔ اکثر عالی خاندان شرفا اپنے بچوں کو امراء کے اسکول میں بھیجتے ہیں جو خاص طور پر اُن کے لئے قائم کیا گیا ہے، لیکن اس میں متوسط طبقے کے لڑکے اور لڑکیاں بھی داخل کی جاتی ہیں۔"

اس قومی نظام تعلیم کا قوم پر ایک یہ بھی احسان ہے کہ اس نے مقامی تنگ نظری کو بالکل ختم کر دیا ہے۔

ثانوی تعلیم

۱۸ لاکھ لڑکیوں اور لڑکوں میں جو ہر سال ابتدائی تعلیم ختم کرتے ہیں تقریباً دس فیصدی لڑکے اور چھ فی صدی لڑکیاں ثانوی مدارس میں داخل ہوتی ہیں۔ لڑکوں کے ثانوی مدارس کی تعداد ۱۲۱۵ ہے جن میں ۲۵۸ مڈل اسکول اور ۹۵۷ فنی اسکول ہیں، مڈل اسکولوں میں پانچ سال کا نصاب ہے۔ جہاں علم الاخلاق، جاپانی زبان و ادب، چینی، انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبان میں سے کوئی ایک زبان، تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، علم الطبعیات، کیمیا، قانون، اقتصادیات، ڈرائنگ، موسیقی اور جمناسٹک کی تعلیم دی جاتی ہے۔ فنی اسکولوں میں ۱۱۹ صنعتی اسکول، ۳۳۹ زراعتی اسکول، ۲۹۶۷ تجارتی اسکول، ۱۲ جہاز رانی کے اسکول اور ۱۹۱ دیگر فنون اور پیشوں کے اسکول ہیں، ان

سب کی مدت تعلیم مختلف ہے۔ ان کے علاوہ تقریباً پندرہ ہزار فنی توسیعی اسکول ہیں جن میں لڑکوں اور لڑکیوں کو معمولی ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد دو تین سال فنی تعلیم دی جاتی ہے، زنانہ ہائی اسکول کی مدت تعلیم جن میں لڑکوں کے مڈل اسکول کے برابر تعلیم دی جاتی ہے چار یا پانچ سال ہوتی ہے۔ کل ۹۷۰ زنانہ ہائی اسکول ہیں جن میں طالبات کی تعداد لڑکوں کے مڈل اسکولوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کی ثانوی تعلیم پر زیادہ توجہ کی جاتی ہے، بلکہ اس کی یہ وجہ ہے کہ لڑکوں کے لئے اور بہت سی راہیں بھی کھلی ہوئی ہیں۔ اس لئے ثانوی مدارس میں اُن کی تعداد کم ہو جاتی ہے۔ زنانہ ہائی اسکول کے نصاب تعلیم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اُنھیں آداب معاشرت کی تعلیم بھی دی جاتی ہے جس میں چائے کی تقریب اور پھولوں کا سجانا بھی شامل ہے، اس مقصد کے لئے ہر مدرسہ نسواں میں جاپانی وضع کا ایک کمرہ ہوتا ہے، جسے "معلّم آداب" کہتے ہیں۔ اب لڑکیوں کی شادی زیادہ عمر میں ہونے لگی ہے یعنی عموماً بائیس تیئیس برس کی عمر۔ اس لئے تکمیل تعلیم اور شادی کا درمیانی وقفہ امور خانہ داری کی مشق میں یا خیاطی، موسیقی، چائے کی تقریب، پھولوں کی آرائش، خانگی ضروریات وغیرہ کی تعلیم اور تجربہ میں صرف کیا جاتا ہے۔ فی زمانہ بڑے بڑے شہروں میں لڑکیاں دفتروں میں ملازمت بھی کرنے لگی ہیں۔

اعلیٰ اور مخصوص تعلیم

وہ نوجوان جو یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں پہلے ہائی اسکول (کوٹوگاکو) میں داخل ہوتے ہیں، جہاں اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ یہاں دو قسم کے نصاب ہوتے ہیں، امتیازی اور معمولی۔ معمولی نصاب کی مدت تعلیم سات برس اور امتیازی کی اس کے بعد تین برس ہے، جاپان میں کل ۳۲ ہائی اسکول ہیں جن میں سے ۲۴ میں صرف امتیازی نصاب کی تعلیم دی جاتی ہے، معمولی نصاب کے داخلے کے لئے اسی قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے، جو مڈل اسکول کے داخلے کے لئے! لیکن امتیازی نصاب کے داخلے کے لئے یہ شرط ہے کہ یا تو مڈل اسکول کا چوتھا درجہ پاس ہو یا ہائی اسکول کا معمولی نصاب ختم کیا ہو، یا اسی کے برابر کی قابلیت رکھتا ہو۔ نجی یونیورسٹیاں بھی اسی قسم کی سہولتیں بہم پہنچاتی ہیں۔ یعنی اُن کے یہاں بھی یونیورسٹی کی تعلیم شروع کرنے سے پہلے دو تین سال کا ایک ابتدائی نصاب ہوتا ہے۔

جاپان میں چھ سرکاری یونیورسٹیاں ہیں۔ یعنی ٹوکیو، کیوٹو، سنڈائی فیوکیوکا (کیوشو) اور سپورو (ہوکائڈو) اُن میں سے ہر ایک میں مختلف شعبے ہوتے ہیں، کوریا کی سیول یونیورسٹی اور فارموسا کی تائی ہوکو یونیورسٹی وہاں کی حکومتوں کی زیر نگرانی ہیں۔ ان کے علاوہ تیرہ سرکاری، دو پبلک اور چھبیس نجی یونیورسٹیاں اور کالج بھی ہیں۔ جن میں سے کیو۔ واسیدا، چوؤ، میجی، نہین، رکیو اور ہوسنی تو ٹوکیو میں اور دوشیشہ کیوٹو میں زیادہ مشہور ہیں گویا کہ اعلیٰ تعلیم کی تمام درسگاہیں بڑے بڑے شہروں میں واقع ہیں۔

اعلیٰ نصاب کے فنی اسکولوں میں اٹھارہ صنعتی اسکول، گیارہ زرعی اسکول، گیارہ تجارتی اسکول اور بحری تجارت کے اسکول ہیں۔ جن میں ثانوی مدارس کے پاس شدگان کو اُن مضامین کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ ان میں عموماً تین سال کا نصاب ہوتا ہے، اور یونیورسٹیوں سے ان کا درجہ کم ہوتا ہے۔ اس قسم کی بہت سی نجی درسگاہیں بھی ہیں۔

معلمی کی تعلیم دینے کے لئے عورتوں اور مردوں کے ایک سو پانچ معمولی نارمل اسکول، تین اعلیٰ نارمل اسکول، ٹوکیو، ہیروشیما اور نارا میں، اور تربیت ٹیچرس ٹریننگ اسکول ہیں۔ علاوہ ازیں چودہ سو کنڈرگارٹن اسکول، تہتر اندھوں کے اسکول، ایک سو بائیس گونگے بہروں کے اسکول اور ۸۰۰ متفرق اسکول ہیں۔

جاپانی تعلیم کی خصوصیات

اب میں جاپان کی تعلیم کی چند خصوصیات بیان کروں گا، وہاں کنڈرگارٹن سے لے کر یونیورسٹیوں اور تحقیقاتی درسگاہوں تک مدارس کا ایک جال سا بچھا ہوا ہے۔ اُن کا نصاب تعلیم اتنا جامع اور وسیع ہے کہ ہر اُس موضوع کی تعلیم کا مکمل انتظام ہے جو انسان کے مفید مطلب اور مستقبل کے لئے کارآمد ہو سکتا ہے۔ سارے ملک میں ابتدائی تعلیم لازمی اور مفت ہے۔ رفتہ رفتہ اس کا معیار بھی اعلیٰ ہو گیا ہے۔ چھ برس کے عمر کے بچوں کی تعداد جن پر اسکول جانا لازمی ہے ۱۰،۰۵۶،۶۳۰ ہے جن میں سے ۵،۱۰۱،۴۰۹ لڑکے اور ۴،۹۵۵،۲۲۱ لڑکیاں ہیں، ان بچوں کی صحت، زندہ دلی اور شگفتگی دیکھنے کے قابل ہے۔ سڑکوں پر جب وہ وردی پہنے باضابطہ لمبی لمبی قطاروں میں مارچ کرتے ہوئے نکلتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی منظم فوج جاری ہو،

گویا ہر طالب علم ملک کا ایک سپاہی معلوم ہوتا ہے۔

ذریعۂ تعلیم

ہندوستان کے محبِّ وطن ماہرینِ تعلیم ایک عرصہ سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ ہندوستانی زبانوں کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔ لیکن یونیورسٹیوں پر حکومت کا قبضہ ہے اور وہ اُس طرف ذرا توجہ نہیں کرتی۔ بعض غلامانہ ذہنیت کے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ انگریزی زبان ہی کو ذریعۂ تعلیم رہنا چاہیئے۔ میں اُنھیں دعوت دیتا ہوں کہ وہ جاپان جا کر دیکھیں کہ وہاں ادنیٰ سے اعلیٰ درجہ تک ذریعۂ تعلیم جاپانی زبان ہے۔ یونیورسٹیوں کے تمام شعبوں کی نصابی کتابیں جاپانی میں ہیں۔ اور تمام تحقیقاتی مقالے اور سائنس کے رسالے جاپانی میں لکھے جاتے ہیں۔ خود ہندوستان میں عثمانیہ یونیورسٹی نے اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دے کر ایک اعلیٰ مثال پیش کی ہے۔ پھر دوسری یونیورسٹیاں اس کی پیروی کیوں نہیں کرسکتیں؟

تعلیم کے اخراجات

۱۹۳۱ء میں تعلیم پر ۳۱۴،۶۷۰،۹۶۶ ین خرچ ہوتا تھا جس میں سے حکومت ۲،۰۰۲،۰۰۳،۴۴۱ ین اور پبلک بورڈ وغیرہ ۹۲۴،۷۴۶،۶۲۳،۰۴ ین دیتے تھے۔ درسگاہوں کی مجموعی تعداد ۴۵،۸۹۸ تھی، جن میں ۱۲،۴۴۷،۷۷۷ طالب علم زیر تعلیم تھے۔ ہندوستان میں ۲۹-۱۹۳۰ء میں ۲،۵۰۸،۰۱۷ سرکاری اور غیر سرکاری درسگاہیں تھیں جن میں ۱۲،۵۱۵،۱۲۶ طالب علم تعلیم پاتے تھے کل خرچ ۲۷،۶۴۳،۸۴۲،۰۱۸ روپیہ تھا جس میں سے ۱۶،۵۰۱،۳۰۵،۴۴ روپیہ پبلک فنڈ سے دیا جاتا تھا۔ اس طرح ہمارے یہاں اوسط خرچ فی طالب علم ۲۳ روپیہ سالانہ پڑتا ہے۔ حالانکہ جاپان میں صرف ۷ ین سے ۸½ ین تک ہے ہندوستان میں زیادہ روپیہ اعلیٰ تعلیم پر صرف کیا جاتا ہے جس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ انگریز پرنسپلوں اور پروفیسروں کو بڑی بڑی تنخواہیں دی جاتی ہیں۔ لیکن جاپان میں تعلیم کا تین چوتھائی خرچ ابتدائی تعلیم پر کیا جاتا ہے۔

فرقہ وارانہ درسگاہوں کی لعنت

ہندوستان کی موجودہ فرقہ وارانہ کشمکش کا سبب دراصل وہ لوگ ہیں جنھوں نے مذہبی درسگاہوں میں تنگ نظری کے ماتحت تعلیم پائی ہے۔ پنجاب اس قسم کی درسگاہوں کا مرکز ہے۔ اس لئے وہاں فرقہ وارانہ کشیدگی بھی زیادہ ہے۔

لیکن ہمیں جاپان سے سبق سیکھنا چاہیئے جہاں نصابِ تعلیم میں مذہب کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ عام مدارس میں کسی طرح کی مذہبی تعلیم نہیں دی جاتی۔ البتہ مذہبی انجمنوں کو اختیار ہے کہ وہ اپنے علیحدہ اسکول قائم کرلیں اور مروجہ نصابِ تعلیم میں اپنے مذہبی اصولوں کی تعلیم بھی شامل کرلیں۔ پھر بھی وہ مذہبی جنون کی اشاعت نہیں کرتیں۔ نہ دوسرے مذہب والوں کے خلاف عدم رواداری اور نفرت کی تلقین کرتی ہیں، جیسا ہمارے فرقہ وارانہ درسگاہوں کا عام مسلک ہے۔

میں سچ عرض کرتا ہوں کہ اگر مجھے صرف ایک دن کے لئے ہندوستان کا ڈکٹیٹر بنا دیا جائے تو سب سے پہلا کام میں یہی کروں کہ ان فرقہ وارانہ درسگاہوں کو بند کردوں تاکہ لاکھوں نوجوان ان کے زہریلے اثرات سے برباد ہونے سے بچ جائیں۔

مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ ان درسگاہوں نے تعلیم کی روشنی اور سیاسی بیداری پھیلانے میں کافی خدمت انجام دی ہے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ انھوں نے قوم کے نوجوانوں کے دلوں میں نفرت کا بیج بو کر اُس سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے اور اس طرح ہندوستان میں برطانیہ کی غلامی قائم رکھنے میں ہمیشہ امداد کی اور اب بھی کر رہی ہیں۔

کالج کی تتلیاں

ہمارے زنانہ اسکول اور کالج آج کل محض خوشنما تتلیاں تیار کیا کرتے ہیں جو عموماً دق کا شکار ہو جاتی ہیں، کیونکہ وہ گھر کا کام کاج یا محنت کرنا کسرِ شان سمجھتی ہیں۔ لیکن جاپان اپنی لڑکیوں کو صحیح قسم کی تعلیم دے کر نہایت تندرست، مضبوط، اور ذہین قوم پیدا کر رہا ہے۔ ملک کی قسمت کو بنانے میں ان لڑکیوں کا بہت حصہ ہے۔ یعنی نسوانی مدارس وطن پرست اور اہل مائیں تیار کرنے کے مرکز ہیں۔

لڑکیوں کو ہائی اسکولوں میں بہت سے کارآمد اور مفید کام سکھائے جاتے ہیں۔ مثلاً کھانا پکانا کپڑے دھونا سینا پرونا کشیدہ کاری وغیرہ، اس کے علاوہ فنونِ لطیفہ مثلاً موسیقی، رقص، ڈرائنگ اور پھولوں کی آرائش وغیرہ کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔

لڑکیوں کے اسکول مقامی حالات کے لحاظ سے لڑکوں کے اسکولوں سے بہت کچھ مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن اصل خصوصیت دونوں میں مشترک رہتی ہے۔

اُن کی مقبولیت طالبات کی کثیر تعداد سے ظاہر ہوتی ہے، جو اس وقت اسّی ہزار کے قریب ہوگی۔ یہ لڑکیاں چودہ سال کی عمر میں ابتدائی تعلیم ختم کرنے کے بعد ہی ہائی اسکول میں داخل ہوجاتی ہیں۔ اور چار یا پانچ سال تک تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ اعلیٰ طبقہ میں تو اسکول کی سند حاصل کرنا لازمی ہوگیا ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر معقول جگہ شادی نہیں ہوسکتی جس طرح چینیوں میں یہ رسم ہے کہ شرافت اور نجابت کے ثبوت کے طور پر دلہن کے جہیز میں کسی مشہور آرٹسٹ کا بنایا ہوا کیمونو یا اس کی صحیح نقل ضرور دی جاتی ہے۔ اسی طرح جاپانیوں میں کسی اچھے اسکول کی سند جہیز کا ایک خاص جزو بن گئی ہے۔

ہر شخص کو یہ تسلیم ہے کہ مستقبل قریب میں ذہنی اعتبار پر عورتیں کافی ترقی کریں گی۔ بلکہ یہاں تک کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے واقعی حیرت انگیز ترقی کی ہے حالانکہ نظامِ تعلیم کا یہ مقصد نہ تھا کہ اُن کا معیار بلند کیا جائے۔ صنفِ نازک کی یہ بیداری تو نظامِ تعلیم کا ایک غیر متوقع نتیجہ ہے۔ عام طور پر لوگوں کو اس پر حیرت ہوئی اور بعض کو ناگوار بھی ہوا۔ بہر حال اس سلسلہ میں ناانصافی ہوگی اگر عیسائی مشنریوں کی ان بیش بہا خدمات کا اعتراف نہ کیا جائے جو انھوں نے تعلیم نسواں کے سلسلے میں انجام دی ہیں۔

بہیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

سارے ہندوستان میں کل پندرہ یونیورسٹیاں ہیں۔ لیکن صرف ٹوکیو شہر میں سولہ اور سارے جاپان میں ۴۶ یونیورسٹیاں ہیں۔ ان میں سترہ سرکاری ہیں پانچ پبلک بورڈوں کے زیر انتظام ہیں باقی ۲۴ نجی ہیں ۱۹۳۱ء میں ان یونیورسٹیوں میں ۷۹۶۶۶ طلبا تعلیم پاتے تھے۔ حالانکہ ۱۹۲۹-۳۰ء میں ہندوستان میں طلبا کی تعداد ۹۴۸۰۳ تھی۔ اس سلسلہ میں یہ امر بھی قابلِ لحاظ ہے کہ ہندوستان کی آبادی جاپان سے پانچ گنی ہے۔

جاپان کی یونیورسٹیاں ایک طرف تو مکمل علمی معیار پر نشو ونما کا انتظام کرتی ہیں۔ تاکہ نوجوان تعلیمی کاموں کے اہل بن سکیں اور دوسری طرف ملک کے مختلف اقتصادی اور صنعتی شعبوں کے لئے ہوشیار کاریگر پیدا کرتی ہیں۔

جاپانی غیر معمولی طور پر عملی لوگ ہیں اور محض معمولی تعلیم سے مطمئن نہیں ہوتے۔ اُن کے تمام نظامِ تعلیم کی تہ میں یہ اصول کام کرتا ہے کہ ہمارے بیشتر نوجوان غریب ہیں اور تعلیم کے اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج طے نہیں کرسکتے۔ اگر انھیں اپنی روزی کمانے کے لئے صنعت و حرفت کی معقول تعلیم نہ دی جائے، چنانچہ صنعت کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے دو سال کا نصاب مقرر ہے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ بہت سے نوجوان کو قبل از وقت کشمکشِ حیات میں مبتلا ہو جانا پڑتا ہے، اس لئے جو شعبۂ زندگی وہ اختیار کرتے ہیں اس کے لئے انھیں مزید تعلیم و تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کے لئے بھی توسیعی صنعتی اسکول کھول دئے گئے ہیں۔

ابتدائی تعلیم کے اختتام پر ثانوی تعلیم کی ابتدا ہوتی ہے، یہاں سے پھر کئی قسم کے نصاب شروع ہوجاتے ہیں تاکہ ہر شخص اپنے حسبِ منشا اور مجوزہ مستقبل کے مطابق کارآمد مضامین کا انتخاب کرسکے۔

جاپانی بڑے کفایت شعار ہوتے ہیں، وہ قانون فطرت کے اس اصول پر عقیدہ رکھتے ہیں کہ مادّہ کبھی فنا نہیں ہوتا، اور ہر چیز کی اصلیت ہمیشہ برقرار رہتی ہے، چاہے ظاہری طور پر وہ ناقص اور بے کار ہوجائے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ اس کا لحاظ رکھتے ہیں کہ ردّی چیزوں کو جو بیکار سمجھکر پھینک دی جاتی ہیں کسی طرح کارآمد بنالیں۔ کالج کی تجربہ گاہوں میں آپ ردّی کاغذ کے ڈھیر دیکھیں گے، جو کوڑا گھروں سے جمع کرلئے جاتے ہیں۔ سائنس داں ان پر تجربات کرکے یہ معلوم کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں کہ ان سے پھر نیا کاغذ کیسے بن سکتا ہے۔ صنعتی اسکول جاپان کی صنعتی دنیا کو ماہر کاریگر مہیا کرتے ہیں ۱۹۳۱ء میں ایسے اسکولوں کی تعداد ۹۷۵ اور طالب علموں کی تعداد ۲۸۰۰۶۸۱ تھی۔

ہماری تعلیم کے نقائص

اب میں ہندوستان کے نظامِ تعلیم کے چند خاص خاص نقائص پیش کروں گا جو ایک مشہور ہندوستانی محبِ وطن نے ظاہر فرمائے ہیں۔

(۱) ہماری تعلیم کی ہندوستان کے باہر کوئی قدر و قیمت نہیں ہے خود ہندوستان میں یہ ہمیں حکومت کا دست نگر بنا دیتی ہے، یا ایسے پیشوں کا محتاج کر دیتی ہے جن کا تعلق نظامِ حکومت سے ہے۔ اور جو نیم سرکاری سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً وکالت، مدرّسی یا دفتر کی کلرکی وغیرہ، اس قسم کی تعلیم کی اچھائی برائی اس وقت تک نہیں معلوم ہوتی جب تک ہندوستان کے باہر کسی جگہ روزی کمانے کا اتفاق نہ ہو مثلاً اگر ایک ہندوستانی میٹرک ایف اے یا بی اے پاس امریکہ میں ہو اور اس کا ماہانہ خرچ گھر سے آنے میں دیر ہوجائے یا رک جائے

تو پھر روپیہ پیدا کرنے کی اس کے پاس کوئی صورت نہیں ہوتی۔ بجز اس کے کہ وہ کسی ہوٹل میں برتن صاف کرے۔ بہرے کی خدمت انجام دے، گھروں میں اسی قسم کے ادنیٰ کام کرے یا کھیتوں اور سڑکوں پر معمولی مزدور کی حیثیت سے محنت مشقت کرے۔ یہاں بھی یہ ناقص تعلیم سدّ راہ ہوتی ہے، کیونکہ اُسے دست و بازو سے محنت مشقت کرنا سکھایا ہی نہیں گیا۔ ہندوستانی اسکولوں اور کالجوں میں دس پندرہ سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ اس قابل بھی نہیں رہتا کہ اپنے ہاتھ سے برتن صاف کر سکے، جھاڑو دے سکے۔ یا کھیتوں اور سڑک پر مزدوری کر سکے،

(۲) کھانا پکانے، کپڑے سینے اور مریضوں کی تیمار داری کرنے کے معاملہ میں اُنھیں بہت کم معلومات ہوتی ہے۔ تیرنا اور کشتی کھینا بھی نہیں جانتے، اپنی مدافعت کے فن سے بھی ناواقف ہوتے ہیں۔ کیونکہ تعلیم کے اس اہم جزو کی طرف یہاں کوئی توجہ ہی نہیں کرتا۔ البتہ ایک چیز وہ جانتے ہیں یعنی اپنا کام نکالنے کے لائق انگریزی بول سکتے ہیں۔ اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ جن ممالک میں انگریزی بولی جاتی ہے وہاں وہ بیچ منجدھار میں ڈوبنے سے بچ جاتے ہیں۔

(۳) اب ذرا اس تعلیم کے معاشرتی رُخ کو ملاحظہ کیجیے، جس کا اُنھیں کوئی احساس ہی نہیں ہوتا۔ موسیقی سے لطف اُٹھانے کے لیے نہ اُن کے کان ہوتے ہیں اور نہ کسی تصویر کے محاسن سمجھنے کے لیے اُن کے پاس آنکھیں، پنجاب اور یوپی والوں کے مقابلہ میں بنگالی اور مرہٹے اپنی خاندانی روایات کی وجہ سے اس معاملہ میں کچھ بہتر ثابت ہوتے ہیں۔ ذرا شمالی ہند والے سے کہیے کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے حاضرین کو محظوظ کرے، پھر دیکھیے وہ کیسے کیسے عذر کرتا ہے۔ اُسے گانا نہیں آتا، باجا بجانا نہیں جانتا۔ نظم یا اشعار بھی نہیں پڑھ سکتا۔ حتیٰ کہ قصے کہانی بھی نہیں کہہ سکتا۔ اُسے کسی محفلِ رقص و سرود میں یا فنونِ لطیفہ کی نمائش میں لے جایئے وہاں وہ ایسا محسوس کرے گا جیسے کسی پرند کو قفس میں بند کر دیا۔ نہ کسی چیز کی خوبی کو سمجھ سکتا ہے اور نہ اُس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ تنہائی میں وہ بدنصیب اپنا وقت کچھ گنگنا کر بھی نہیں گزار سکتا۔ بس وہ اتنا جانتا ہے کہ ہندوستان کی قدیم عظمت کے راگ گائے، حالانکہ اسے یہ علم بھی نہیں ہوتا کہ عظمت کا اصل راز کیا تھا۔ یا بعض نوجوان ہندوستان کی پرانی تہذیب کا مضحکہ اُڑاتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اس سے اتنا ہی ناواقف ہوتے ہیں جتنے اس تہذیب کے مداح۔ اگر کسی جگہ کچھ لڑکے اور لڑکیاں تفریح کے لیے جمع ہوں تو اُن کے درمیان میں ایک پنجابی نوجوان کی حالت بڑی مضحکہ خیز ہوتی ہے۔ وہ اُن کی دلچسپیوں میں شریک نہیں ہو سکتا بس وہ تو ٹھنڈی سانسیں بھرنا جانتا ہے۔ اگر اُس سے کچھ اشعار پڑھنے کو کہا جائے تو ممکن ہے کہ لجاتے ہوئے وہ ٹینسن اور شیکسپیر کے کچھ بند پڑھ دے۔ لیکن پنجابی اردو، ہندی یا سنسکرت شاعری کا اُسے ایک مصرع بھی نہیں آتا۔ کیونکہ اُن پر تضیع اوقات کرنا وہ حماقت سمجھتا ہے۔ اپنے ملک کے گیت بھی اُسے نہیں آتے۔ اکثر ایسے غیر ملکیوں سے اُسے سابقہ پڑ جاتا ہے جو اُس کے یہاں کے گیتوں اور افسانوں سے اس سے زیادہ واقف ہوتے ہیں۔ اس وقت اس کی ذلت اور شرم کی انتہا نہیں رہتی، اور اس کی حالت قابلِ رحم ہو جاتی ہے۔

لالہ لاجپت رائے کے خیالات

اس باب کے اختتام پر میں تعلیم کے مسئلہ میں لالہ لاجپت رائے کے زرّین خیالات پیش کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ یہ اُن محبِ وطن ہندوستانیوں کے خیالات کا آئینہ ہیں جو جاپان، یورپ اور امریکہ ہو آئے ہیں

"جاپانی تعلیم میں ذہنی اور جسمانی تربیت کا نظام بالکل مکمل ہے، وہ اس پر زور دیتے ہیں کہ ہر نوجوان کو اپنی مدافعت کا فن اچھی طرح سیکھنا چاہیے۔ اس لیے وہ پٹہ بازی، گھونسہ بازی، تیر اندازی، تیراکی، گولی چلانے اور دوڑنے وغیرہ کی بھی تعلیم دیتے ہیں۔ ہر طرح کے اسکول چاہے وہ مذہبی ہوں یا قومی، علمی ادبی ہوں یا صنعتی، عام ہوں یا خاص جسمانی تعلیم کے معاملہ میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ٹینس، فٹ بال اور بیس بال کا بھی کافی انتظام ہوتا ہے، کیونکہ اُن کا عقیدہ ہے کہ کھیلوں سے انسان مدافعت اور حملہ دونوں کے قابل بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر لڑکا گانا بجانا اور ڈرائنگ بھی جانتا ہے۔ جاپان والے حسنِ فطرت کے تو فطرتاً قدر دان ہیں۔ لیکن تعلیم اس ذوق کی تکمیل کر دیتی ہے۔ جاپانی تعلیم کا یہ ضروری جزو ہے کہ ہر چیز کے متعلق طالب علم کو کچھ معلومات ہو جانا چاہیے۔ یعنی تھوڑا سا پکانا، تھوڑا کپڑے سینا وغیرہ ضرور آنا چاہیے۔ آج کل جاپان والے دنیا کے ہر حصے میں پائے جاتے ہیں۔ قطبِ شمالی سے لے کر قطبِ جنوبی تک اور جاپان سے کیلی فورنیا تک، انھیں (اور چینیوں کو بھی) ہر جگہ خانگی ملازمت مل جاتی ہے۔ لیکن ہندوستانی اتنے بے ڈھنگے ہیں کہ اپنا پیٹ پالنے کے لیے معمولی سے معمولی نوکری بھی ملنا مشکل ہوتی ہے۔ آخر کیوں؟ اس لیے

کہ انھیں اس قسم کی تربیت ہی نہیں ملتی۔ جو انسان کو کم سے کم کارآمد تو بنا دیتی ہے، چاہے وہ کسی شعبۂ زندگی میں کمال رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔

بے شک آج ہمیں سنسکرت اور انگریزی کے عالموں، سائنس دانوں، فلسفیوں، ڈاکٹروں، قانون دانوں، مورخوں اور ماہرینِ اقتصادیات کی غرض کہ ہر شعبۂ علم کے فاضلوں کی ضرورت ہے۔ لیکن اس سے زیادہ ہمیں ایسے ہوشیار لوگوں کی ضرورت ہے جو ہر موقع اور ہر صورت میں اپنی ضروریات خود پوری کرسکیں، اور جو چیز بھی موقع پر اُن کے ہاتھ لگے اُسی سے چند پیسے پیدا کرلیں، اسی قسم کی تربیت پر اعلیٰ تعلیم کی عمارت تعمیر ہونا چاہیئے۔ علاوہ ازیں اعلیٰ مقاصد کے لئے ملک کو اچھے مشین سازوں ہوشیار بڑھئیوں، بجلی کے کاریگروں، اور سمجھ دار دواسازوں کی ضرورت ہے۔ یعنی ملک ایسے لوگ چاہتا ہے جو دوسرے ممالک کے ساتھ صنعت و حرفت میں مقابلہ کرسکیں۔ ہمارے یہاں قواعد داں، لغت داں، زبان داں اور مقرر تو کافی ہیں، اور ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے جو فلسفۂ مذہب اور روحانیات کے متعلق بہت کچھ باتیں بنا سکتے ہیں لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ بھوکے پیٹ والوں کے اعلیٰ خیالات کیسے ہوسکتے ہیں ایک قوم جو مفلس اور غلام ہو جس میں معمولی سمجھ بوجھ اور ذوقِ سلیم کا فقدان ہو اور جو اپنی ضروریاتِ زندگی کے لئے دوسروں کی محتاج ہو مذہب کا نام تو رٹ سکتی ہے مگر اس پر عمل نہیں کرسکتی۔ فلسفۂ مذہب کا تذکرہ اب حد سے گزر چکا ہے اور اب یہ ہمارے مرض کا علاج نہیں رہا ہے۔ اب تو ہمیں زندہ مذہب کی ضرورت ہے جو موجودہ دَورِ حیات میں اعلیٰ نصب العین اور شاندار کارناموں کے لئے ہمیں تیار کرے نہ کہ اس تخئیلی زندگی کے لئے جس کا علم صرف غیب دانوں کو ہوگا۔ ہمیں عقلی پرواز کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ کاروباری زندگی کی ضرورت ہے۔ روح سے ہمیں انکار نہیں لیکن فی الحال تو جسم و جان کو یکجا رکھنے کا سوال درپیش ہے، خدا کے لئے گاڑی کو گھوڑے کے آگے مت رکھو۔ جو چیز مقدم ہونا چاہیئے اُسے مقدم سمجھو اور جو مؤخر ہونا چاہیئے اُسے مؤخر۔

دنیا نے ہمارے فلسفے، ہمارے تصوف اور ہماری روحانیت کی جس کی ہمارے بزرگوں نے نشوونما کی تھی کافی قدر کی۔ لیکن اس کے باوجود ہمیں حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، کیوں کہ ہم میں خودداری، خود اعتمادی، خود اختیاری، اور آزادی کی کمی ہے۔ ہم اپنی قومی زندگی کے بڑے نازک دَور سے گزر رہے ہیں۔ اور ہمیں اپنی قوم کی حالت سدھارنے کے لئے مناسب صورتیں پیدا کرنے کا خاص لحاظ رکھنا چاہیئے آج ہم دنیا کے پردے پر سب سے ذلیل اور حقیر سمجھے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں کی بھی ذرا عزت نہیں ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم صحیح تعلیم سے محروم ہیں۔

آہ! یہ ناکارہ موجودہ تعلیم!! کاش اگر یہ نہ ہوتی تو ہم اس کشمکشِ حیات میں اس سے کہیں بہتر رہتے، کیوں کہ اس نے تو ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔

اب سے بیس سال پہلے لالہ جی نے اس حقیقت کا انکشاف کیا تھا لیکن ہم اب تک اپنے نظام تعلیم میں ان نقائص کی اصلاح نہیں کرسکے ہیں۔ مانا کہ حکومت اس معاملہ میں ہماری مدد نہیں کرتی۔ لیکن آخر خود ہم نے عوام کو لکھنا پڑھنا سکھانے کے سلسلے میں کیا کیا ہے۔ ہر ہندوستانی کا یہی فرض ہے۔ اور اگر وہ اس فرض کو انجام دینے پر دل و جان سے لگ جائے تو دس سال کے اندر اندر سارا ملک تعلیم یافتہ ہوسکتا ہے۔ لیکن گاندھی کے سوا کون ہزاروں نوجوانوں کو اس خدمت پر آمادہ کرسکتا ہے کہ وہ دیہات میں جابسیں اور تعلیم، حفظانِ صحت اور صنعت و حرفت کی اشاعت کو اپنا نصب العین بنالیں۔ تعلیم ہر چیز سے زیادہ ضروری ہے۔ اور اگر ہماری قوم تعلیم حاصل کرے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی ہے۔

سماجی تعلیم

باوجودیکہ جاپان کا نظام تعلیم بالکل مکمل ہے۔ لیکن پھر بھی عوام کی علم کی پیاس بجھانے کے لئے کافی نہیں ہے۔ چنانچہ جو لوگ اسکول کی تعلیم ختم کرلیتے ہیں وہ اپنا مطالعہ جاری رکھنے کے ذرائع کی تلاش میں رہتے ہیں اور دنیا کی عام رفتار اور اپنے خاص شعبۂ زندگی میں جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اُن سے باخبر رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ضرورت بڑی حد تک سماجی تعلیم سے پوری ہوتی ہے جس کی حکومت ہر طرح ہمت افزائی کرتی ہے۔ اخبار و رسائل کا سماجی تعلیم میں خاص حصہ ہے۔ جاپان کے ناظرین کو تصنیف و تالیف اور ترجموں وغیرہ کی صورت میں مطالعہ کا کافی سامان ملتا ہے وہاں بائیس ہزار مطبوعاتِ جدیدہ اور دس ہزار طبع ثانی کا سالانہ اوسط ہے۔ علاوہ ازیں کوئی پچاس ہزار رسائل نکلتے ہیں۔

کتب خانوں کا بھی سماجی تعلیم سے خاص تعلق ہے۔ اُن کی تعداد ساڑھے چار ہزار کے قریب ہوگی۔ ان میں سے بعض نجی ہیں اور بعض تعلیمی اداروں اور

مقامی بورڈوں وغیرہ کے زیر اہتمام ہیں۔ مختلف انجمنوں کی طرف سے مسائل حاضرہ پر اور سائنس پر لیکچروں کا انتظام بھی کیا جاتا ہے اور بڑے بڑے اخباروں کے یہاں سینما کے ذریعہ تعلیم کی اشاعت کے لئے محکمے قائم ہیں۔

سماجی تعلیم کی سب سے اہم جماعتیں نوجوان مردوں اور نوجوان عورتوں کی انجمنیں ہیں۔ جن کا مقصد اچھے شہری پیدا کرنا ہے۔ وہی لوگ اُن کے رکن ہو سکتے ہیں جو ابتدائی تعلیم ختم کر کے کسی روزگار میں لگ گئے ہیں۔ یہ انجمنیں ہر گاؤں اور ہر قصبے میں موجود ہیں۔ نوجوان مردوں کی انجمنوں کی تعداد ۱۵۰۰۰ ہے جن میں ۲۵۳۰۰۰۰ اراکین ہیں اور عورتوں کی انجمنوں کی تعداد ۱۳۰۰۰ ہے جن میں ۱۵۰۰۰۰۰ اراکین ہیں، یہ انجمنیں مختلف قسم کے جلسے کرتی ہیں، مدارس شبینہ کھولتی ہیں اور طرح طرح کی سماجی تحریکوں میں حصّہ لیتی ہیں۔ اُن کے علاوہ بوائے اسکاؤٹ کی تحریک بھی ۱۹۲۱ء میں انگریزی اصولوں پر جاری کی گئی ہے۔ یہ اسکاؤٹس بھی قابلِ قدر خدمات انجام دیتے ہیں۔ اس وقت جاپان میں ان کی ۳۷۰۰ جماعتیں ہیں جن میں ۲۰۹۰۱۷ اراکین ہیں۔

جاپان میں سو سے زیادہ عجائب خانے ہیں، اور ہر علاقہ میں وہاں کی پیداوار کی ایک مستقل نمائش گاہ ہے، اس کے علاوہ متعدد چڑیا گھر اور ایسے باغات ہیں جن میں ہر قسم کے درخت پودے۔ پھول اور بیلیں موجود رہتی ہیں۔ محکمہ تعلیم پبلک کے استفادہ کے لئے وقتاً فوقتاً منتخب کتابوں، اچھے سے اچھے فلموں اور بہترین ریکارڈوں کی فہرست شائع کیا کرتا ہے۔ ریڈیو بے انتہا مقبول ہے اور ریڈیو سننے والوں کی تعداد اس وقت دس لاکھ سے زیادہ ہے۔ یعنی ہزار افراد میں سے ۱۰۶ شخص ریڈیو سنتے ہیں۔ اس کے روزانہ پروگرام میں بھی بہت سی ایسی چیزیں ہوتی ہیں۔ جن میں سماجی تعلیم کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے۔

غرضکہ جاپان نے ہمارے سامنے اس کی ایک زندہ مثال پیش کر دی ہے کہ ایک قوم تعلیم پانے کے بعد کیا کچھ کر سکتی ہے، کاش ناظرین اس سادی سی بات کو سمجھ سکیں کہ جاہل لوگ اگر تعداد میں لاکھوں بھی ہوں پھر بھی وہ کسی مرض کی دوا نہیں ہوتے۔ بلکہ اپنی جہالت کے باعث اکثر نازک مواقع پر خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن جب علم کا ہتھیار اُن کے ہاتھ میں دے دیا جائے تو ایک منظم فوج کی طرح قوم پر جانیں قربان کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اگر ہم جنگِ آزادی میں عوام کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں تو ہر گھر میں تعلیم" "ہر خاندان میں تعلیم" یہی ہمارا مسلک اور یہی ہمارا نعرۂ حرّیت ہونا چاہئے۔

تخیّلِ مزدور

میرے انوارِ تبسم سے جہاں تابندہ تر — میری محنت خالقِ سیم و طلا لعل و گہر
میرے احساسِ نمو سے آبروئے بحر و بر — میری خوں افشانیوں سے تابشِ لعل و گہر
میری ہستی سے ہے قائم گردشِ لیل و نہار — میری زحمت سے وقارِ رحمتِ پروردگار
دامنِ غم سے مرے وابستہ ہے ذوقِ نشاط — میرے آنسو میں جھلکتی ہے ضیاءِ انبساط
بندگی سے ہے مری اربابِ زر کا اعتبار — میری پستی سے ہے قائم رفعتِ سرمایہ دار
لیکن اب میری شبِ خوابِ گراں کٹنے کو ہے — تیرگی کافور ہونے کو ہے لَو پھٹنے کو ہے
میری شامِ زندگی ہے جلوہ دارِ صبحِ نو — اک جہانِ تازہ و تابندہ تر ہے در جلو
ہر رگ و پے میں رواں میرے ہے خونِ زندگی — رہ نہیں سکتا میں اب صیدِ زبونِ زندگی

امتیازِ بندہ و خواجہ مٹانے کے لئے
آسماں بیتاب ہے بجلی گرانے کے لئے

عبداللطیف شمیم بجنوری

سورت کا قہوہ خانہ

از ٹالسٹائی　　مترجمہ عباس جعفری

"اے بدنصیب غلام! کیا تیرے ناقص ذہن میں خدا کا وجود ہے؟"

یہ تھے وہ الفاظ جو ایک ایرانی ماہر الٰہیات نے اپنے غلام سے کہے۔ اس نے اپنی زندگی فطرتِ الٰہی کے مطالعے میں صرف کر کے اس موضوع پر کئی کتابیں پڑھیں اور تصنیف کیں تھیں۔

اس نے خدا کی ہستی کے متعلق اس قدر سوچا کہ اس کے حواس پریشان ہو گئے، یہاں تک غور کیا کہ خدا کے وجود کا منکر ہو گیا۔ اور یہ سمجھنے کے عوض کہ اُس نے اس نے اپنی عقل و فہم کھو دی ہے یہ خیال کرنے لگا کہ کارخانۂ عالم کا چلانے والا کوئی نہیں ہے۔ جب ملک میں یہ خبر عام ہوئی کہ وہ خدا سے منحرف ہو گیا ہے تو شاہِ ایران نے اُسے جلاوطن کر دیا۔ ایران سے نکل کر اُس نے متعدد ممالک کی سیر کی اور اب ہندوستان کے مختلف مقامات کی سیاحت کرتے ہوئے سورت کے ایک قہوہ خانے میں داخل ہوا۔ یہاں ملک ملک کے مسافر اور سیّاح جمع ہوتے اور تبادلۂ خیال کیا کرتے تھے۔ اُس نے قہوہ خانے کے ایک ملازم سے افیون طلب کی اور جب افیون نے اس کے دماغ کو متاثر کیا تو اُس نے اپنے حبشی غلام کو جو دروازے کے باہر ٹھہرا ہوا تھا آواز دی اور کہا "بدنصیب غلام! کیا تیرے ناقص ذہن میں خدا کا وجود ہے؟"

"جی ہاں! خدا موجود ہے۔" غلام نے جواب دیا اور کمر بند میں سے ایک چوبی مورتی نکالتے ہوئے کہا: "دیکھئے! خدا یہ ہے۔ اس نے ہی پیدائش سے لے کر اب تک میری حفاظت کی ہے ہمارے ملک میں ہر شخص اس درخت کی پرستش کرتا ہے جس کی لکڑی سے یہ خدا بنایا گیا ہے۔"

آقا اور غلام کی گفتگو قہوہ خانے کے تمام مہمانوں نے نہایت حیرت و استعجاب سے سُنی۔ وہ لوگ آقا کے سوال سے متعجب تھے ہی مگر غلام کا جواب بھی کچھ کم حیرت انگیز نہ تھا۔ ان میں سے ایک برہمن، غلام کے الفاظ سنکر اُس کی طرف مخاطب ہوا۔ "بیوقوف!" اس نے کہا "کیا تیرے خیال میں یہ ممکن ہے کہ خدا ایک کمر بند میں رکھا جائے؟ دنیا میں صرف ایک ہی بھگوان ہے، برہما۔ اور وہ تمام دنیا سے بڑا ہے کیونکہ وہی خلاقِ عالم ہے۔ برہما ہی خدائے قادر ہے۔ اسی کی تعظیم میں گنگا کے سارے مندر بنائے گئے ہیں۔ اور یہاں اُس کے سچے پجاری —— برہمن —— اس کی عبادت کرتے ہیں حقیقی بھگوان سے صرف یہی لوگ آشنا ہیں اور دوسرا کوئی نہیں جانتا۔ ہزاروں سال گزر گئے سینکڑوں انقلابات ظہور میں آئے۔ مگر کوئی اپنی جگہ سے نہ ہٹا سکا۔ یہ کیوں؟ صرف اس لئے کہ وہ ویدِ مقدّس پر کاربند رہے اور اسی ایک پرماتما نے اُن کی حفاظت کی۔"

برہمن کا یہ خیال تھا کہ تمام حاضرین اُس کی حمایت کریں گے۔ مگر ایک یہودی دلّال نے جو اُس وقت موجود تھا، جواب دیا: "نہیں!" اس نے کہا "حقیقی خدا برہمنوں کا نہیں بلکہ ابراہیمؑ۔ یعقوبؑ اور اسحٰقؑ کا خدا ہے۔ وہ بجز اپنی برگزیدہ قوم —— بنی اسرائیل —— کے اور کسی کی حفاظت نہیں کرتا۔ ابتدائے عالم سے اس نے ہماری اور صرف ہماری ہی قوم کو پسند کیا ہے۔ اگر اب ہم منتشر اور پراگندہ ہو گئے ہیں تو اس سے تحقیر مقصود نہیں، یہ صرف امتحاناً ہم پر مصیبت نازل کی گئی ہے۔ کیونکہ اس معبودِ حقیقی نے وعدہ کیا ہے کہ ایک دن

میں اپنی قوم کو بیت المقدس میں جمع کرکے اسرائیل کو نوعِ انسانی کا بادشاہ بنا کر روانہ کروں گا۔

یہودی نے صرف اسی قدر کہہ پایا تھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔ مگر اطالیہ کے ایک پادری نے جو تبلیغ کے لئے بھیجا گیا تھا اُسے روک دیا: "تم جو کچھ کہہ رہے ہو غلط ہے" اس نے کہا: "تم خدائے عادل کو نا انصاف بتلاتے ہو۔ وہ دوسروں سے بڑھ کر تمہاری قوم کو نہیں پسند کر سکتا۔ ممکن ہے کہ ازمنۂ گزشتہ میں اُس نے بنی اسرائیل کا ساتھ دیا ہو۔ لیکن آج انیس سو سال گزر گئے کہ اس نے انکی قوم کو مقہور کرکے دنیا میں ایسا پریشان کر دیا کہ نہ اُنکا مذہب پھیلایا جاتا ہے اور نہ اس کی تبلیغ کی جاتی ہے۔ خدا کسی ایک مذہب کو دوسرے مذہب پر فضیلت نہیں دیتا، بلکہ ان تمام لوگوں کو جو رحمت اور مغفرت کے خواہاں ہیں۔ کیتھولک کلیسا کی راہ بتلاتا ہے، کیونکہ صرف یہی ایک مذہب ذریعۂ نجات ہے۔"

جب اطالوی کی تقریر ختم ہوئی تو ایک پروٹسٹنٹ پیشوا نے اس کو نہایت عتاب آمیز نگاہ سے دیکھا: "تم یہ کس بنا پر کہتے ہو؟" وہ کہنے لگا۔ "کہ تمہارے ہی مذہب والے بخشے جائیں گے؟ شفاعت کا تو صرف وہی شخص حقدار ہے جس نے انجیل اور مسیح کے احکام کے مطابق عمل کیا ہو اور خدا کی عبادت خشوع اور خضوع کے ساتھ کی ہو"

یہ سنکر ایک ترکی نے جو سورت کے ایک محصول خانے میں ملازم تھا، دونوں عیسائیوں پر حقارت کی ایک نگاہ ڈالی اور اس طرح مخاطب ہوا "تم لوگ عیسائی مذہب کو وسیلۂ نجات خیال کرتے ہو، یہ عبث اور لاحاصل ہے۔ تیرہ سو برس ہوئے جب اس "وحدہٗ لاشریک لہٗ" نے دینِ عیسیٰؑ کو منسوخ کرکے دینِ محمدیؐ کو رائج کیا۔ اصلی انجیل کا دنیا میں اب کہیں بھی وجود نہیں ہے۔ کلام مجید کے سوا کوئی دوسری کتاب دنیا و آخرت کا دستور العمل نہیں ہو سکتی، تم خود دیکھتے ہو کہ اسلام یورپ اور امریکہ میں کس سرعت کے ساتھ پھیلتا جاتا ہے اور تمہیں نے اس کو تسلیم کیا ہے کہ خدا نے یہودیوں پر عذاب نازل کیا ہے اور اس کے ثبوت میں تم نے یہ حقیقت بیان کی کہ یہودی ذلیل کئے گئے اور اب ان کے مذہب کی اشاعت نہیں ہوتی۔ پھر اسلام کی اصلیت اور صداقت کا اقرار کرنے میں کونسا امر مانع ہے۔ کیونکہ یہی وہ مذہب ہے جس کو بجا طور پر عالمگیر کہا جا سکتا ہے اور اس کے پیرو اور مبلغ مشرق و مغرب شمال و جنوب ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ حشر کے دن شافعِ قیامت پیغمبرِ اسلام اپنی امت کی شفاعت کے لئے دعا فرمائیں گے۔ مسلمانوں کے سوا اور کسی کی مغفرت نہ کرے گا، اور ان میں بھی صرف عمرؓ کے پیرو ہی بخشے جائیں گے نہ کہ حضرت علیؓ کے حجفوں نے سچے مذہب سے مونھ موڑ کر شاہراہِ صداقت کو ترک کر دیا ہے۔"

اس پر ایرانی ماہرِ الٰہیات جو حضرت علیؓ کے پیرووں میں سے تھا غضبناک ہو کر آگے بڑھا اور کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اس وقت تک مختلف اہلِ مذاہب میں جو وہاں موجود تھے کچھ ایسی قیل و قال شروع ہوئی کہ اسکو بات کرنے کی بھی مہلت نہ ملی۔ وہ سب خدا کی قدرت اور اُس کی عبادت کے مختلف طریقوں پر بحث کر رہے تھے۔ ان میں سے ہر شخص دلائل و براہین سے یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ صرف اسی ملک میں خدا کو جانا اور سمجھا جاتا ہے۔ اور وہیں اُس کی صحیح طور پر عبادت اور پرستش کی جاتی ہے۔

حاضرین نہایت جوش اور سرگرمی کے ساتھ اس مناظرے میں حصہ لے رہے تھے۔ مگر ایک چینی جو "کنفیوسیش" کی تعلیمات کا متبع تھا، قہوہ خانے کے ایک گوشے میں خاموش بیٹھا چاء پی رہا اور دوسروں کی گفتگو کو بڑے غور و انہماک سے سُن رہا تھا۔ ترک نے اس کو علیحدہ بیٹھا ہوا دیکھ کر اس سے درخواست کی: "میرے عزیز چینی! جو کچھ میں کہہ رہا ہوں تم اس کی تصدیق کر سکتے ہو۔ بظاہر تم خاموش معلوم ہوتے ہو۔ لیکن مجھے کامل یقین ہے کہ جب تم بات کرنے پر آمادہ ہو گے تو میرے خیال کی پُر زور تائید کرو گے۔ تمہارے وطن کے اکثر تاجروں سے میری ملاقات ہے اور انھوں نے بارہا کہا ہے کہ اگرچہ چین میں متعدد مذاہب کی تبلیغ کی جاتی ہے مگر اہلِ چین اسلام کو سب پر ترجیح دیتے ہیں اور ہزاروں مسلمان ہوتے جا رہے ہیں۔ پھر تم سے بڑھ کر میرے الفاظ کی تصدیق کون کر سکتا ہے؟ اب تم اپنی رائے کا اظہار کرو کہ خدا اور اس کا سچا پیغمبر کون ہے؟"

دوسروں نے بھی اس سے اتفاق کرتے ہوئے چینی کو اپنی رائے ظاہر کرنے پر مجبور کیا "تمہارا فیصلہ آخری اور قطعی ہوگا،" اُنھوں نے کہا "اور ہم اسکو تسلیم کریں گے" چینی کچھ دیر تک آنکھیں بند کئے سوچتا رہا۔ پھر اُس نے استقلال کے ساتھ نرم اور مطمئن لہجے میں یوں تقریر شروع کی۔

"عزیزو! مجھے ہمیشہ سے ان باتوں سے دلچسپی رہی ہے اور بہت غور کرنے کے بعد میں آخر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ صرف غرور و نخوت کی وجہ سے

انسان مذہب کے بارے میں ایک دوسرے سے جھگڑتا ہے۔ اگر آپ لوگ میری تقریر سننے کی تکلیف گوارا فرمائیں تو میں ایک واقعہ بیان کروں جس کے ذریعے سے موجودہ مباحثے کے تمام اختلافات بہ آسانی رفع کئے جاسکتے ہیں۔

چین سے میں ایک برطانوی جہاز پر سیاحت کے واسطے سوار ہوا۔ راستے میں تازہ پانی کے لئے ہمیں جزیرہ "سماٹرا" کے شمالی ساحل پر اترنا پڑا۔ آفتاب نصف النہار پر تھا اور ہم میں سے بعض لوگ سستانے کے لئے سمندر کے قریب ہی ایک ناریل کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے اور ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔

ہم کو آئے ہوئے تھوڑا ہی زمانہ گزرا تھا کہ ایک اندھا وہاں آیا۔ اس کے متعلق بعد میں ہم کو اس قدر معلوم ہوا کہ اس بات کا پتا چلانے کے لئے کہ آفتاب کیا ہے اور اُس کی روشنی پر کس طرح تصرف حاصل کیا جاسکتا ہے۔ وہ مدت دراز تک مسلسل سورج کو گھورتا رہا۔ یہاں تک کہ اُس کی بصارت کمزور ہونے لگی۔ آخر اس نے یہ فیصلہ کیا "آفتاب کی روشنی سیال نہیں ہے، کیونکہ اگر وہ سیال ہوتی تو اُس کو ایک برتن سے دوسرے برتن میں ڈالنے کا امکان ہوتا اور ہوا کی موجوں سے اس میں بھی پانی کی طرح جنبش پیدا ہوتی۔ نہ وہ آگ ہے کیونکہ اگر وہ آگ ہوتی تو پانی نے اُس کو یقیناً سرد کر دیا ہوتا۔ نہ وہ روح ہے کیونکہ آنکھیں اُس کو دیکھ سکتی ہیں۔ نہ وہ مادہ ہے کیونکہ وہ غیر متحرک ہے۔ پس جب سورج کی روشنی نہ تو سیال ہے نہ آگ، نہ روح ہے، نہ مادہ، تو گویا کچھ بھی نہیں ہے" وہ ایسی ہی باتیں کر کے اپنے دل کو تسلی دیا کرتا۔ آفتاب کو مسلسل دیکھتے رہنے اور اس کے متعلق سوچتے رہنے سے اس کی بینائی اور عقل دونوں رخصت ہوگئے۔ اور اُسے کامل یقین ہوگیا کہ سورج کا وجود ہی نہیں ہے۔

اس اندھے کے ہمراہ اس کا ایک غلام بھی تھا جس نے اپنے آقا کو سائے میں بٹھا کر زمین پر سے ایک ناریل اُٹھا لیا اور رات کے لئے چراغ بنانے میں مصروف ہوگیا۔ ناریل کے ریشے سے اُس نے ایک بتی بنائی۔ کھوپرے سے تیل نکالا اور بتی کو اس میں بھگو کر چراغ تیار کر لیا۔

ادھر غلام نے اپنے کام سے فراغت پائی اُدھر اندھے نے ایک آہ کھینچی اور یوں گویا ہوا "اے غلام! کیا میں نے غلط کہا تھا کہ دنیا میں سورج نہیں ہے! کیا تو نہیں دیکھتا کتنی تاریکی چھائی ہوئی ہے! پھر بھی لوگ کہتے ہیں کہ سورج موجود ہے۔ اگر حقیقت میں سورج کا وجود ہے تو وہ کیا ہے اور اس کی کس چیز سے تعمیر کی گئی ہے"۔

"مجھے اس کا علم نہیں کہ سورج کیا ہے" غلام نے جواب دیا۔ "ہاں اتنا میں یقینی طور پر جانتا ہوں کہ روشنی کیا ہے۔ میں نے یہ چراغ بنایا ہے جس کی مدد سے میں آپ کی خدمت کرسکتا ہوں اور رات کے وقت اندھیرے میں ہر چیز کو بہ آسانی دیکھ سکتا ہوں" پھر اُس نے ناریل کو زمین سے اٹھالیا اور کہا "یہ ہے میرا آفتاب"۔

ایک لنگڑے نے یہ گفتگو سنی اور ہنس کر کہا "ظاہر ہے تم تمام عمر نابینا ہی رہے ہو کیونکہ تمہیں اس کا بھی علم نہیں ہے کہ سورج کیا ہے۔ سنو۔ میں بتاتا ہوں۔ وہ آگ کا ایک گولا ہے جو ہر صبح دریا سے نکل کر شام کو جزیرے کے پہاڑوں کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔ ہم سبھوں نے اس کو دیکھا ہے کہ اگر تم میں بھی بینائی ہوتی تو تم بھی اُس کو دیکھ سکتے"۔

تھوڑے فاصلے پر ایک ماہی گیر کھڑا یہ باتیں سن رہا تھا۔ جب لنگڑا خاموش ہوگیا تو وہ قریب آکر بولا "اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تم نے کبھی اس جزیرے کے باہر قدم نہیں رکھا۔ اگر تم لنگڑے نہ ہوتے اور میری طرح دریا کی سیر کو کشتی میں باہر نکلتے تو تمہیں معلوم ہوتا کہ سورج پہاڑوں کے پیچھے نہیں چھپ جاتا بلکہ جس طرح ہر صبح سمندر سے نمودار ہوتا ہے اسی طرح ہر شام اسی میں ڈوب جاتا ہے جو کچھ میں کہتا ہوں بالکل سچ ہے کیونکہ ہر روز اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں اور......"

ہمارے حلقے کے ایک ہندوستانی نے جب یہ باتیں سنیں تو ماہی گیر کی بات کاٹتے ہوئے کہا "مجھے سخت حیرت ہے کہ تم ایک ذی عقل انسان ہوتے ہوئے کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آگ کا گولا پانی میں چلا جائے اور پانی اس کو نہ بجھا دے۔ سورج آگ کا گولا نہیں بلکہ "دیوا" نامی ایک دیوتا ہے جو ہمیشہ سواری میں بیٹھ کر "میرو" نامی سنہری پہاڑ کا دورہ کرتا ہے اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ "راگو" اور "کیتو" جو دو بڑے زہریلے ناگ ہیں وہ اس پر حملہ کر کے اُسے نگل جاتے ہیں اور تمام دنیا تیرہ و تار ہو جاتی ہے۔ لیکن جب ہمارے پجاری بھگوان سے دعا اور التجا کرتے ہیں تو وہ رہا کر دیا جاتا ہے۔ صرف تمہارے جیسے جاہل لوگ

جنھوں نے اپنے جزیرے کے باہر قدم بھی نہیں رکھا۔ تصور کرتے ہیں کہ آفتاب صرف اُنھیں کے ملک پر چمکتا ہے ؛

ابھی برہمن نے اپنی بات پوری بھی نہ کی تھی کہ ایک مصری جہاز کا مالک بول اُٹھا۔ نہیں! تم بھی غلطی پر ہو۔ سورج کوئی دیوتا نہیں ہے اور نہ صرف ہندوستان اور اس کے سنہری پہاڑوں کے اطراف گشت لگاتا ہے۔ میں نے بحرِ ظلمات، بحرِ عرب۔ جزیرۂ فلپائن۔ مداغاسکر اور دیگر ممالک کا سفر کیا ہے : سورج صرف ہندوستان ہی کو نہیں۔ بلکہ تمام دنیا کو روشن کرتا ہے، وہ فقط ایک پہاڑ کے گرد نہیں گھومتا، بلکہ دور مشرق میں جاپان سے طلوع ہوکر مغرب میں انگلستان کے اس طرف غروب ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اہلِ جاپان اپنے ملک کو "نپن" یعنی "مولدِ آفتاب" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ میرے دادا نے بھی جنھوں نے تمام دنیا کی سیاحت کی تھی۔ مجھ سے یہی بیان کیا تھا۔

اس نے اپنی گفتگو کو تمام بھی نہ کیا تھا کہ ہمارے جہاز کے ایک انگریزی مسافر نے اس کی باتوں کو رد کرتے ہوئے کہا" یہ فخر صرف انگلستان ہی کو حاصل ہے کہ وہاں سورج کی ہر نقل و حرکت کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ وہاں کا معمولی آدمی بھی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے کہ سورج نہ کہیں سے طلوع ہوتا ہے نہ غروب۔ بلکہ دنیا کے گرد چکر لگاتا ہے۔ اسکا قوی ثبوت یہ ہے کہ ہم نے ابھی ابھی دنیا کا دورہ کیا ہے۔ مگر کہیں بھی ہمارا سورج سے تصادم نہیں ہوا۔ ہم جہاں کہیں گئے تو دیکھا کہ وہ صبح کو نکل کر شام کو غائب ہو گیا۔ اور ہر مقام سے بالکل اسی طرح دکھائی دیا جیسا کہ اب نظر آتا ہے"۔

یہ کہتے ہوئے اس نے زمین پر ایک نقشہ کھینچا اور یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ سورج آسمان پر گردش کرتا ہے اور زمین کے اطراف گھومتا ہے۔ لیکن جب اچھی طرح سمجھانے میں ناکام رہا تو جہاز کے ناخدا کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ صاحب مجھ سے زیادہ واقف ہیں اور خوب سمجھا سکیں گے :

ناخدا نہایت قابل اور ذہین آدمی تھا۔ اس نے خاموشی سے تمام باتیں سنیں اور جب اس کو گفتگو کرنے کا موقع ملا تو یوں گویا ہوا ——

" تم لوگ خود بھی غلط فہمی میں مبتلا ہو اور دوسروں کو بھی مغالطے میں ڈال رہے ہو۔ سورج زمین کے اطراف نہیں پھرتا، بلکہ زمین سورج کے اطراف پھرتی ہے، اور خود بھی گردش کرتی ہے۔ اور ہر چوبیس گھنٹوں کے دوران میں نہ صرف جاپان، فلپائن اور سماٹرا کو بلکہ افریقہ، یورپ، امریکہ اور دیگر ممالک کو بھی سورج کی جانب پلٹا دیتی ہے۔ سورج صرف کسی ایک پہاڑ، کسی ایک جزیرے کسی ایک سمندر، اور کسی ایک زمین کو منور نہیں کرتا۔ بلکہ دوسرے سیاروں کو بھی ہماری دنیا کے ساتھ روشنی پہونچاتا ہے۔ اگر تم بجائے زمین دیکھنے کے آسمان پر نگاہ ڈالو تو ممکن ہے کہ یہ حقیقت آشکار ہو جائے۔ اور پھر یہ خیال نہ کرو کہ آفتاب صرف تم پر یا تمہارے ہی ملک پر ضیا پاشی کرتا ہے "۔

" اس حکایت سے ظاہر ہے" چینی نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا —— کہ" انسان صرف غرور اور تعصب کے باعث ایک دوسرے سے اختلاف کرتا ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ فتنہ و فساد پیدا ہو کر انسانیت کی دیواریں لرز جاتی ہیں۔ جس طرح سورج کے بارے میں ہر ایک نے یہی سمجھا کہ میں حق پر ہوں۔ اسی طرح خدا کے متعلق بھی ہر شخص یہی خیال کرتا ہے کہ صرف میرا ہی مذہب صراطِ مستقیم اور شاہراہِ صداقت ہے اور اسی بنا پر وہ یہ چاہتا ہے کہ اپنے لئے یا کم سے کم اپنے وطن کے لئے ایک علیحدہ دیوتا رکھے اور آفتوں میں اس سے دستگیری چاہے۔ وہ ایک لامحدود ہستی کو جس کے لئے تمام پہنائے کائنات ناکافی ہے ایک ذرا سے مندر میں محصور اور محدود کر کے دوسروں کو اس کے فیض عام سے محروم کر دینا چاہتا ہے۔

کیا کوئی مندر ایک ایسے مندر کا مقابلہ کر سکتا ہے جس کو خود ذاتِ خداوندی نے بہ نفسِ نفیس نوعِ انسانی کو ایک رشتے میں مربوط و وابستہ کرنے کے لئے تعمیر کیا ہے۔

تمام منادرِ انسانی اسی ایک مندر کے نمونے پر —— جس کو دنیا کہتے ہیں —— بنائے گئے ہیں۔ ہر مندر میں اس کے حوض، گنبد، چراغ، تصاویر، مجسمے، مورتیں، قوانین کی کتابیں، کتبے، قربانگاہیں اور پجاری ہوتے ہیں۔ لیکن وہ کونسا مندر ہے جس میں سمندر کا سا حوض۔ آسمان کا سا گنبد۔ سورج، چاند اور تاروں کے سے چراغ ہیں؟ یا ایسے مجسمے اور مورتیں ہیں، جن کا مقابلہ ذی روح، رحمدل اور ہمدرد انسانوں سے کیا جا سکتا ہو؟ کیا اوصاف خداوندی کی کوئی ایسی یادگار بھی ہے جو اُن تمام نعمتوں سے جو اُس نے نوعِ بشر کی خوشحالی کے لئے مرحمت فرمائی ہیں۔ زیادہ آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے؟ کیا کسی قانون کی کتاب میں ضمیرِ انسانی سے بڑھکر توضیح کی گئی ہے۔ کونسی قربانی ایسی نفس کشی کی برابری کر سکتی ہے جس سے محبت کرنے والی انسانی ہستیاں

ایک دوسرے پرنثار ہو جاتی ہیں؟ اور کس قربانگاہ کا تقابل ایک نیک انسان کے دل سے ہوسکتا ہے جس کی قربانی کو خداوندِ عالم خود قبول فرماتا ہے؟ ؎

غافل انداز جلوۂ یزداں فریش یک قسلم
سادہ لوحانیکہ تعبیرش بہ انساں کردہ اند

انسانی تخیل جس قدر بلند ہوتا جائے گا اسی قدر ذاتِ باری تعالیٰ کے متعلق علم و عرفان بڑھتا جائے گا۔ اور جتنا اس کا علم بڑھیگا اتنا ہی انسان اس کے صفات سے قریب تر ہوکر دردِ دل، پاسِ وفا اور جذبۂ ایمان کی دولت سے مالا مال ہوتا جائے گا۔

پس اس شخص کو ــــ جو یہ حقیقت جانتا ہے کہ آفتاب کی روشنی تمام دنیا کو منور کرتی ہے ــــ چاہیئے کہ اُس باطل پرست آدمی پر جسے صرف اپنی ہی مورتی میں تجلی دکھائی دیتی ہے اعتراض کرنے اور اُس کو حقیر سمجھنے سے احتراز کرے۔ اور اس اندھے اور بے دین کو بھی جس کی آنکھیں آفتاب کو نہیں دیکھ سکتیں، دوسروں کا مضحکہ اڑانا اور ان کی تذلیل کرنا نہ چاہیئے۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ انسانیت پرستی کو اپنا شعار بنائے، اپنے دل سے تعصب اور تنگ نظری کی جڑوں کو جس کی تخم ریزی نام نہاد مذہب کی آڑ میں کی گئی ہے اُکھاڑ کر پھینک دے اور نوعِ بشر سے محبت کرنا ماحصلِ حیات سمجھے۔ ؎

ہماں عشق است برخود ساخت چندیں داستاں رنہ
کسے بر لفظ یک معنی چنیں دفتر نمی سازد!

چینی کی اس تقریر نے تمام حاضرین کو اتنا متاثر کیا کہ ایک سناٹا سا طاری ہوگیا اور سب نے تہیہ کر لیا کہ پھر کبھی اس موضوع پر ردو قدح نہ کریں گے۔

یادگار رات

تھا مرا سجدہ اک جنتِ نظر کل رات کو
میں رہا سارے جہاں سے بے خبر کل رات کو

لے رہا تھا اس طرح انگڑائیاں مستِ شباب
موجِ مے بل کھا رہی تھی سر بسر کل رات کو

مست نظروں کی جنوں انگیزیوں کا ذکر کیا!
تھی سراپا، ہر ادا، صہبا اثر کل رات کو

اُس کے آگے مہوشانِ بزم سب خاموش تھے
ایک گُل، بھاری تھا سارے باغ پر کل رات کو

لال ڈورے تھے سیہ آنکھوں میں کیا حشر آفریں
دل کی دنیا ہوگئی زیر و زبر کل رات کو

کس قیامت کی کشش اس چہرۂ گلگوں میں تھی!
جس سے اک پل ہٹ نہ سکتی تھی نظر کل رات کو

بڑھ گیا تھا عشق سے بھی خود فراموشی میں حُسن
میں تو میں، اس کو نہ تھی اپنی خبر کل رات کو

میرے غمخانے میں شاہ مہر طلعت کے طفیل
لُٹ رہی تھی دولتِ نورِ سحر کل رات کو

ہر پہر پر ہو رہا تھا، وجد لمحے کا گمان
وقت سمٹا جا رہا تھا اس قدر کل رات کو

(سید سکندر علی وجد بی اے (عثمانیہ)

جامعۂ ملیۂ اسلامیہ دہلی!

اسرائیل احمد خاں

وائے بر عشقے کہ نارِ او فسرد!
در حرم زائید و در بتخانہ مُرد!

جامعۂ ملیۂ اسلامیہ بھی مسلمانانِ ہند کی نشاۃ ثانیہ کے دَور کا اب اک "جواں مرگ" ادارہ ہے! ع

خوش درخشید ولے دولتِ مستعجل بود!

ناواقف پبلک کے سامعے کے لئے یہ کتنی "سنسنی خیز" خبر ہوگی! لیکن تاریخ انسانی کے کتنے مُسلمہ واقعات ہیں جن کا ابتدائی ظہور اک "خبرِ وحشت اثر" ہی کی حیثیت سے ہوا، اور بعد میں دُنیا کو اعتراف کرنا پڑا کہ لوگوں کو اس ناگہانی حادثے کے وقوع پر اس قدر متعجب ہونے کا حق نہ تھا جس قدر کہ اِن "نام نہاد" ناگہانی حوادث کو پبلک کی معصوم بےخبری اور شدید گراں گوشی سے شکوہ سنج ہونے کی وجہ حاصل تھی! عدمِ علم، علمِ عدم کا مُستلزم نہیں! جس طرح کہ ایک طرف یہ صحیح ہوا کرتا ہے کہ ع

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ!

اُسی طرح دوسری طرف اِسی ماجرے کا مُثنیٰ کبھی کبھی یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ کسی مامون و مصون کینگاہ میں ایک ناپسندیدہ نشو و نما عرصہ دراز تک پرورش پاتی رہتی ہے اور خوش گمان عوام نیز خواص کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی! انقلابی تحریکات بھی اِس قسم کی اُفتاد بد سے بالاتر نہیں ہوا کرتیں! اگر کوئی اس خوش فہمی میں مبتلا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ عالم کے بکثرت جلی العنوان وقائع اُس کی نظر سے مستور رہیں! "انقلابِ فرانس" جریدۂ بشریت کا پہلا اہتمام بالشان واقعہ ہے جو عظیم ترین انسانی عزیمت، استقامت، احتساب، ایثار، عُقاب نظری ضمیر پروری، اصول پرستی، حق پژوہانہ فدویت و شیدائیت کی مشترک کارفرمائی کا "ثمرِ بہشت تھا"! تاہم آپ کو کچھ معلوم ہے کہ مابعد انقلاب کے ردِ فعل کی تخریبیں کتنی عبرت انگیز تھیں؟! ایسی تھیں کہ سات آٹھ چیدہ ترین علم بردارانِ انقلاب فرانس میں سے دو تین نے "مُلوکیت" کا نعرہ از سرِ نو بلند کیا، دو تین جدید القیام دربارِ شاہی کے "ارکانِ رکین" بنے، اور دو تین نے اس بازگشتہ دَورِ سعادت میں خطاباتِ امارت کے طُرّے اپنی کُلاہ افتخار میں لگا کر جاگیرداریت کی "سنتِ پارینہ" کو تازہ کیا! ——— یہ ہے روشناسِ عالم انقلابِ فرانس کی شِکَست انجامی، جس کی تلخیص نامور مؤرخ میرآبونے کی ہے! ؎

مایۂ طینتِ آدم ز خمیرِ دگر است
تو توقع ز گِلِ کوزہ گراں میداری؟!

انقلابِ فرانس سے صدیوں پہلے کا "انقلابِ اسلام" بھی اِس ازلی انسانی زبوں تابی سے محفوظ نہ رہ سکا! چنانچہ جب حضرت عائشہؓ نے "ھوالذی ارسل رسولہٗ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہٗ علی الدین کلہٖ" کی یہ تعبیر سمجھی کہ "سعادتِ ظہورِ اسلام اک دائم و قائم نعمت ہے جو ابد تاقیامت

سلامت باامانت رہے گی" تو سرورِ عالمؐ کی اِس بیدارکُن رفعِ غلط فہمی سے آپ کتنی تلخ کام ہوئی ہیں کہ نہیں عائشہ! یہ حسینۂ انسانیت صرف تیس فصلہائے بہار کی مقدرہ عمر رکھتی ہے!———ہیہات! ؎

کہا میں نے کتنا ہے گُل کا ثبات
کلی نے یہ سنکر "تبسم" کیا!

الغرض ؎

ہنگامہ گرم ہستیٔ ناپائیدار کا
چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

بھلا اس طوفان عالم آشوب میں ہمارے بعض "نابالغ لیڈر" اپنے کو اک لنگر گُستہ کشتی میں امواج پر تھپیڑے کھاتے ہوئے پانے لگیں تو ایسا مستبعد حادثہ نہیں! ؎

گیا سالم نہ کوئی اس بھنور سے
یہی دیکھا کیا ہوں عمر بھر سے!

تاریخ انسانی کی رصدگاہ پر سے اِتنے نظارے اور مطالعے کے بعد ہمارے لئے "جامعۂ ملیہ" کے محولۂ بالا ارتداد کے امکان کو تسلیم کرنا ایسا دشوار نہ ہوگا! ہم اس احتمال کے دروازے کو باز دکھا کر اُس کے خالی خاکے میں اثبات کا رنگ بھر کر بتائیں گے! اور اسلامی ہندوستان کو اک پیام احتساب دیں گے! ع

پس بہر دستے نباید داد دست!

سیاسی تنبّہ کا کتنا چشم کشا کلمۂ جلیل ہے کہ:

"The price of liberty is eternal vigilance."

(حریت کی قیمت اربابِ اختیار کی دائمی نگرانی ہے!)

ہم اہلِ مشرق اِس تشکیک مزاج پہرہ داری کے خوگر نہیں! "ظن المومنین خیرا" کی ہم نے بمحل تفسیر کی ہے! ہم زیادہ سے زیادہ اِس کے منتظر رہتے ہیں کہ کسی سے پہلے اک آدھ دفعہ لغزش سرزد ہو، اور پھر ہم اس مسنون احتیاط پر عمل پیرا ہوں کہ "مومن ایک سوراخ سے دو دفعہ ڈنک نہیں کھاتا!"——— ہم ان پیر دو ارشادات نبوت کو غلط سمجھتے ہیں۔ جماعتی اور اداراتی احتساب کے حدود اِس سے کہیں وسیع تر ہیں! حضرت عمرؓ کا جاسوسانہ شبانہ گشت مدینے کی گلیوں اور شہر کے بیرونی نواحی سے اور اہلِ بیت کی جماعت کے افراد پر مناصب و خدمات بیرون دار الخلافت کا عملاً ممنوع قرار دینا وغیرہ اک پیشگی——— گویا "بلا اشتعال"!——— سوئے ظن نہ تھا تو کیا تھا؟! حقیقت یہ ہے کہ معشرِ انسانی کی زندگی کی بعض صورتیں ہی ایسی ہوتی ہیں کہ اک اُصولی وازلی بدگمانی کی قدرتی محمل ہوتی ہیں: قومی ادارات کا اہتمام وانصرام اور حکومتی سررشتے کا نظم ونسق ایسے ہی دو مشہور و معروف گوشے ہیں۔ اِن میں اک طبعی میلانِ بدعت وفساد پایا جاتا ہے! پس اِن حلقوں کے متعلق یہ راہ دیکھنا کہ وہ کسی علانیہ غلط کاری کا ارتکاب کریں تو ہم گرفت کریں اور پھر اپنی نگرانی کا آغاز کریں، بالکل ایسا ہی ہے کہ پہلے "نیشِ عقرب" کو متحرک ہونے دیجئے اور اُس کے بعد ہم اُس کی سرکوبی میں حق بجانب ہوں گے! "ہم" مقتضائے طبیعتش" کے "علی الاطلاق" عُذر کے تصور سے اپنے ذہن کو "سادہ لوح" پاتے ہیں! رقبۂ سکونتی کے گرد اک دیوار وحصار کھڑا کرنا، صندوق میں قفل لگانا، دفاتر ومحاکم سرکاری کا معائنہ کیا جانا، مُلازمین کا مناسب وقفہائے وقت سے تبادلہ و منتقلی، پولیس وفوج کا مستقل قیام، سی، آئی، ڈی وپرچہ نویسی کی ماموری کیا ہیں، اگر معاملات وجماعات وافراد کی "بالقوۃ فطری فساد پذیری" کے "ایمان بالغیب" کے تحت اُس کا قبل از وقت سدّباب نہیں ہے؟! پس "الحزم" کو "سوء الظن" سے مُنفصل نہیں کیا جاسکتا! جہاں ہم اِس خوش گمانی سے کام لیتے ہیں معاً اس خوش فہمی کی سزا ملتی ہے! سچ تو یہ ہے کہ بکثرت صورتوں میں ہمارا حُسنِ ظن——— خصوصاً مُمتد ومسلسل حُسنِ ظن——— فریقِ ثانی کی غلط کاری کا تخم ریز بنتا ہے! بغیر قفل کے صندوق کا نظارہ ہی اک خوابیدہ داعیۂ سرقہ کے لئے محرک ثابت ہوتا ہے! ؎

زمن پُرس فرسودۂ روزگار
کہ بر سفرہ حسرت خورد روزہ دار!

پھر روزِ اوّل سے اعتماد بھی روزِ آخر بداعتمادی کی حرکات کا داعی بنا کرتا ہے! مفاسد وبدعات اس خیال کی پناہ میں بے غل وغش پرورش پایا کرتے ہیں کہ دیکھنے والا کون ہے؟ جو ہیں وہ سب مُبتلائے خوش اندیشی ہیں! ایسے اوقات میں موقع شناسوں کا مقولہ یہ ہوا کرتا ہے: ؎

چو خانۂ خالی ومعشوق مستِ ناز بود
تواں گریست بہ آں کس کہ پارسا نہ بود!

قصہ مختصر!

تصوفی "کوکسی نے آزمایا ہی نہیں ! نیکی میں شک اُس کی کوئی لایا ہی نہیں
ہوسکۂ رائج میں بھی شاید کچھ کھوٹ پر اُس کو کسی نے یاں تپایا ہی نہیں؛

(۱)

پہلی چیز جو جامعہ کے موجودہ چہرے کی پیشانی کا داغ ہے وہ اُس کا وہ "زوالِ روح" ہے جس کے مظاہر اُس کا گزشتہ پانچ چھ سال کا نامۂ اعمال ہیں! کسی تحریک کی اسپرٹ کا اضمحلال اُس کا معنوی اختلاجِ قلب ہی! اِس ضعف کی گرفت میں جب کوئی قوت آجائے تو وہ داغدار ہی نہیں ہوجاتی، اُس کی شہرگ کٹ جاتی ہے: ؎

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مرجائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے!

جامعہ اپنے عنصرِ رئیس کی اسی جانِ جاں کو کھو چکا ہے! اُس کی تعلیمگاہ، اقامت گاہ، دارالخطابت، دارالمناظرہ، دارالمطالعہ، سب یکسر اک افسردگی و پژمردگی کا منظر ہیں! جہاں کبھی "الوزپاشا کیمپ" کی رُستاخیز باعرہ نوازتھی، وہاں آج "اتحادی دوکان" اور "مکتبہ جامعہ" کی "لقالا نہ زق زق و بق بق" سامعہ خراش ہے! جامعہ کی جماعت کے اندر بعض تاجرانہ عناصر روزِ اول سے یہ ناشدنی ودن ہمتیاں رکھتے تھے! اُنھوں نے اِس مُخرب جوہر کا نام "حسرتِ تعمیر" رکھا تھا! اس پست فطرت گلے کے تصور کی بدخوابی پر مولانا محمد علیؒ نے ایک موقعے پر اِن "حسرت نصیب معمارانِ تخریب" کو قرار واقعی پھٹکار سُنائی تھی؛ مولانائے مرحوم کی (غالباً قیدِ فرنگ سے) اک مراجعت جامعہ کے لمحۂ روح پرور پر جامعی "سپاسنامے" کے مصنفین نے جب یہ مرگ نوا مصرع اُن کے سامنے پڑھا کہ ع

"وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے"!

تو وہ مادرزاد فاتحِ اسلام اِس دنارتِ نفسی پر تڑپ اُٹھا! اُس نے اپنے اِن خود فراموش سامعین کو للکارا کہ جو "تعمیر" تمہارے سینوں کے اندر اک "حسرت" کی تخم کاری کرے، وہ ہزار تخریب سے زیادہ مُخرب ہے! ؎

گر خدا داری، زغم آزاد شو!
از خیالِ "بیش وکم" آزاد شو!

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اک عرصے کی گردشِ نشیب و فراز کے بعد جامعہ کی عنانِ اختیار ایسے ہی اربابِ کار کے ہاتھ میں آئی جنھوں نے اپنی "حسرتِ تعمیر" جی بھر کے نکالی! اُنھوں نے "اتحادی دوکان" کھولی! "اتحادی بنک" کا افتتاح کیا، اوکھلے میں "جامعہ نگر" کا سنگِ بنیاد رکھا، اور اب ڈاکٹر انصاری مرحوم کے "جامعے کے ولی" کی حیثیت سے "مزار پُرانوار" کی نقشہ بندی اِن بزرگوں کی لاعلاج، جوع البقر نما "حسرتِ تعمیر" کا آئندہ خواب ہے! شاید اوکھلے میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے "رین بسیرے" کے نقشِ قدم پر مستقبل قریب میں اک "عرسِ مبارک" کا بشارت نوا اعلان سُنایا جائے گا! ؎

جاں بخش تھے للکارتے جن رہگذروں میں
دن رات بلند اُن میں فقیروں کی صدا ہے!

خشت وگِل کی یہ تعمیر جاری ہے، اور اُسی کے پہلو بہ پہلو روح و دل کی اک تخریب! ؎

خواجہ در بند زیبِ ایوان است
خانہ از پائے خویش ویران است!

"معاشیات" کے "پیشہ ور معلمین" —— "Professors" —— کو یہ بتانا مشکل ہے کہ آب و گِل کے "بیجان تودوں" کا اجتماع "تعمیرات" نہیں ہیں، "مقبرے" ہیں! ؎

من از فریبِ عمارت گدا شُدم، ورنہ
ہزار گنج بہ ویرانۂ دلِ افتادہ است!

خود جامعہ کے موجودہ اربابِ تعلیم و درس میں سے ایک بزرگ نے ابھی حال میں ایک مختصر لیکن پبلک صحبت میں بیان کیا کہ "بلاشبہ اہلِ جامعہ پر اک دیدنی افسردگی پیدا ہے، اور جس جماعت کو افسردگی عارض ہوجائے تو اُس کے نتیجے میں پھر رہ کیا جاتا ہے؟!"

اِس پر اک شریکِ مکالمت دل جلے نے واشگاف کہا کہ "واللہ اب تو جامعہ کے نام سے کافور و کفن کی بُو آتی ہے!"

یہ فضائے قبرستان جامعہ پر طاری ہے، اور اُس کے سائے میں ماشاء اللہ نئی عمارتوں کے مقابر کی تعمیر جاری ہے!

معلوم ہوتا ہے جامعہ، زندہ و پُر ولولہ اجسامِ انسانی کے عہد سے گزر کر بے روح و فنا پذیر در و دیوار کے دَور میں داخل ہوچکا ہے! مِنْ جملہ

معمورۂ قلوب ہا خراب! ——— مبارک ہو حسرتِ تعمیر کے دردمندوں کو!

(۳)

جامعہ جتنا جتنا اپنے پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کے کاروبار میں پاگل ہوتا گیا! اُتنا ہی وہ ملتِ ہند کے کارزارِ جہاد حریت و حیات سے خارج البلد ہوتا گیا! اور ابتو سالہا سال سے ماشاء اللہ یہ حال ہو کہ اگر جامعہ کے اساتذہ یا طلبہ میں سے کسی طالبعلم کو اپنے مادرِ علمی کے عہدِ اوّل کی روایاتِ عمل و اقدام کی لاج سے، تحریکِ قومی کی کسی علم کشائی کے وقت، میدان میں کود پڑنے کی توفیق ہوئی تو جامعہ خیر سے بدحواس ہو گیا ہے! اُس نے علی الاعلان اپنے سرکاری آرگن ——— رسالۂ جامعہ ——— کے باب شذرات کے صیغۂ گزٹ میں، اِن گویا منحرف متعلقینِ جامعہ سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کیا ہے! اپنے اِن حقیقی "فرزندانِ رشید" سے تبری کرتے ہوئے اُس نے جو "عاق نامے" شائع کئے ہیں وہ مولانا محمود حسنؒ، بانیٔ جامعہ، کی غازیانہ روحِ پُرفتوح کے لئے ناقابلِ رشک فاتحہ و درود کے تحفے ثابت ہوئے ہوں گے: کیا مولانا محمد علی مرحوم جامعہ کی مسندِ درس سے وقتاً فوقتاً جب معرکہائے جہادِ قومی کے عین مُحاذ پر منتقل ہوا کرتے تھے، اور وہاں سے زندانِ حکومت میں، تو کیا اُن کی دوبارہ تشریف آوری جامعہ پر اہلِ جامعہ جس طرح اپنی "حسرتِ تعمیر" کو اُن کے سامنے پیش کیا کرتے تھے، اپنی یہ آرزو بھی عرض کیا کرتے تھے کہ "کاش آپ کے گریز از جامعہ و داخلۂ میدانِ جنگِ حُریت پر ہم آپ کو جامعہ کے اربابِ حل و عقد سے خارج کر سکتے، اور آپکی گمرہی اور جامعہ سے فسخِ تعلق کا اعلان اخبارات و جرائد ملک میں کرتے؟ ——— اُس وقت ہم دیکھتے کہ آیا بیچارے دوسرے غریب دلدادگانِ آزادی کی طرح مولانا محمد علیؒ کو یہ خداوندانِ "حسرتِ تعمیر" کس طرح "خوارج" میں داخل کرتے ہیں؟! ع

تفو، بر تو اے چرخِ گرداں، تفو!

اور ہاں کیا ڈاکٹر انصاری مرحوم، کانگریس پریزیڈنٹ و مستقل رکنِ ورکنگ کمیٹی کانگریس و یکے از ارواح و روانہائے تحریکِ قومیت و حریت، حسبِ معلوم مواقع و مراحل پر جہادِ وطنیت کے جھنڈے کے نیچے جا کھڑے ہوتے تھے، یا اپنے مطب سے نقلِ مکان کر کے محبسِ فرنگ میں جا داخل ہوتے تھے تو کیا "جامعۂ ملیۂ اسلامیہ" کے جریدہ اعلامیہ ——— رسالۂ جامعہ ——— کے "خرق العادت گزٹ" (Gazette "Extra-ordinary") میں اُس وقت بھی اس بات کا اعلان کیا جاتا تھا کہ "بجرم شرکتِ کاروبارِ حریت و سیاست اُنکا نام امارتِ جامعہ کے منصب سے خارج ہو گیا ہے! فلہٰذا "عالمِ بالا" کو غلط فہمی نہ ہو! ہم ماشاء اللہ بجز "اک تعلیمی جماعت" کے کچھ نہیں ہیں! اور ؎

اسپِ گزرے نہ گماں ریو و ریا کار زنہار
غالبِ خاک نشیں اہلِ خرابات سے ہے!

مگر نہیں، ایسا نہیں کیا گیا! ڈاکٹر انصاری مرحوم کے ساتھ اہلِ جامعہ کی وابستگی تادمِ آخر جاری رہی! لیکن اک ناگزیر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ دوعملی و دورنگی آخر کیا معنی رکھتی ہے؟! کیا جامعہ کے اربابِ حل و عقد کے پاس بجز اس کے کوئی اور جواب ہے کہ "ڈاکٹر صاحب ماشاء اللہ "ڈاکٹر صاحب" تھے! دولتمند آدمی تھے! فیاض و زر پاش تھے! پھر اُن کے درِ دولت کی رسائی کا جامعہ نے عملاً بلا شرکتِ غیرے اجارہ (Monopoly) لے رکھا تھا جب جامعہ والوں پر "اپنی سوکھی روٹی میٹھی سے کھانے" کی اُفتاد پڑا کرتی تھی تو کسی نکسی پیرائے میں وہ اپنے اس صومِ زُہد کی خبر ڈاکٹر صاحب کے گوش گزار کر ہی دیا کرتے تھے، اور پھر "حُسنِ طلب" کے اس "فنِ شریف" کی فاتحکار "کشائشِ رزق" کے طفیل میں زیادہ سے زیادہ شام تک "زُہادِ جامعہ" کا یہ روزہ اک "مجربِ عید" سے افطار ہو ہی جاتا تھا، جس کے خوانہائے ضیافت ڈاکٹر انصاری مرحوم کے امیرانہ مطبخ کے الوانِ نعمت سے بہم پہنچ جایا کرتے تھے! واللہ یرزق من یشاء بغیر حساب! ؎

یہ کہنے سننے کی باتیں نہیں ہیں برخوردار
وگرنہ "علمِ معیشت" وسیع ہے واللہ!

پس ڈاکٹر انصاری ایسی "سونے کی چڑیا" چھوڑنے کی چیز نہ تھے! چنانچہ اُس بھولے بالے "انصاری مردِ میزبان" کا قرار واقعی "تعاقب" کیا گیا! اُن کی وفات حسرت آیات پر ارکانِ جامعہ نے اگر اپنے قرول باغ کے خانگی عزا خانوں میں نہیں، تو سب کی طرف سے "شیخ الجامعہ" نے دہلی کے ریڈیو اسٹیشن کے سرکاری "منبرِ ذاکر" سے اطراف و اکنافِ ہند کے بے شمار گھروں کو اپنا بَین سُنا دیا! ——— اور قصہ کوتاہ کر دیا! ؎

اس طرف نعش کسی کشتۂ غم کی اُٹھی ——— اُس طرف سوگ نشیں سوگ بڑھا کے اُٹھے!

ہاں لاریب کہ ڈاکٹر انصاری ایسی موٹی آسامی چھوڑنے کی چیز نہ تھے!
مشہور ہے کہ ہندوستانی ملاقاتی قبر تک پیچھا نہیں چھوڑتے! لیکن موقع شناس
و مطلب آشنا حریفانِ جامعہ نے اِن مشرقی روایات کا بھی ریکارڈ توڑ دیا!
اور ڈاکٹر انصاری کی دامنگیری کو منزلِ قبر سے بھی متجاوز لے گئے! زندگی میں
اُن کی دولت اور اُن کے خوانِ نعمت کے بعد پسِ مرگ اُن کی نعش کو بھی اُن کے
خاندانی پسماندگان سے جھپٹ لیا! اور اوکھلے کے جدید البنا "جامعہ نگر" میں اُن
کے اک مجوزہ روضۂ مبارک کی تعمیر کے ذریعے اُسے اپنے لئے اک "صدقۂ
جاریہ" کا کرشمہ بنانا چاہتے ہیں! ——— عہدِ حاضر کے اِن "انقلاب بدوشوں"
کی یہ جدید العہد سائنٹیفک "استخواں فروشی" کیا پُرانی دلّی کے مزاراتِ
کہنہ کی فرسودہ گور پرستی کا اک قابلِ داد نقش ثانی نہیں ہے؟! ؎

ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو تو وہ بھی نہ سہی!

ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ ایک طرف ڈاکٹر انصاری مرحوم کے ساتھ یہ
دائمی و ناشکستنی، عینِ حیاتی و مابعد الطبیعیاتی وابستگی، اور دوسری طرف بعض
غریب و غیر معروف اعضائے جامعہ کی، اُن کی شرکتِ تحریکِ قومی کی پاداش
میں، دو راندۂ درگاہی، آخر اِن دو متبائن طرز ہائے عمل میں کونسی راہِ تطبیق
ہے؟! مگر ع

زر می طلبی سخن درین است!

ڈاکٹر انصاری کی "حیات بعد الممات کی برکات" میں اُن کے "ارتقا
پذیر مزار" واقع جامعہ نگر کے علاوہ اُن کی متنازعہ فیہ تصنیف ———
"Regeneration in Man" ——— بھی تھی!
"جامعہ ملیہ" کا مکتبہ خیر سے ہر قومی پارۂ ادب کے ترجمہ و اشاعت و تجارت و طلبِ منفعت کا
خدائی ٹھیکیدار ہے! ——— اُسے تو صرف جہادِ حریت کے "سوز" سے انکار و فرار ہے! قومی ادبیات
کے "ساز" سے نفع اندوز ہونیکے میدان میں ماشاءاللہ وہ مکتبہ السابقون الاولون ثابت ہوا کرتا ہے!
— ہاں تو ڈاکٹر مرحوم کی موسومہ بالا انگریزی کتاب بھی بصورتِ اردو پیراہن، مکتبہ جامعہ کی صیادانہ نظر کی
ہدف بن رہی تھی، لیکن آخر کار یہ ترشکار عین اُس کے جبڑوں میں سے نکال لیا
گیا! ہم کو جامعہ ملیہ سے عموماً، اور مکتبۂ جامعہ کے "میر شکارؔ" سے خصوصاً، اِس تلخ
کامی پر ہمدردی ہے! ؎
"قسمت تو دیکھیے کہ کہاں ٹوٹی ہے کمند؟ دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا!

تعلیمی اداروں کی سیاسیات سے علیحدگی اک مستقل، مخلوط تعلیمی و سیاسی
مسئلہ ہے۔ ہمیں خوف ہے کہ جامعہ کے اربابِ بست و کشاد اُس کی کما حقہ
"تحلیلی فہم" سے قاصر ہیں! بلاشبہ اِس معنی میں تعلیم و سیاست الگ الگ کئے
گئے ہیں کہ اول الذکر کی پیشگی تکمیل خود آخر الذکر کا حق ادا کرنے کے لئے ضروری
ہے۔ اس لئے طبعی حالات میں اُصولاً سیاست کو تعلیم کے مرحلے کے اختتام تک
معلق رکھنا چاہیئے ——— اس معنی میں نہیں کہ تعلیم و سیاست میں
کوئی نظری اُصولی نقیض ہے! خود اک واحد معاملے کے ایک جزکی تعمیل میں
اگر ہم مشغول ہوں تو اُسی معاملے کے بقیہ، آئندہ مراتب کو ہم چھیڑنا پسند
نہیں کیا کرتے! کیا اس طرح ایک حصۂ کار کا اِشتغال اور دوسرے کا التوا
یہ تعبیر رکھتا ہے کہ ایک ہی چیز کی "وحدت" اک "اجتماعِ ضدین" ہے؟! نہیں،
یہ صرف عملی طریق کار کی اک حکمتِ عملی سی ہوتی ہے! میدانِ جنگ کے اک معینہ و
مفوضہ مورچے پر اگر ہم تعینات ہیں تو دوسری رزمگاہِ کارزار میں بظاہر ہماری
ضرورت ہونے کی صورت میں بھی ہم، باصطلاحِ لغتِ جنگ، "اپنی ہی توپوں
سے وابستہ" رہا کرتے ہیں! کیا اس کے امکاناً یہ معنی ہوسکتے ہیں کہ دوسرے
طالبِ کمک گوشۂ عرصۂ حرب میں ہماری دستگیری فی نفسہٖ اک "کورٹ مارشل"
کی مستوجب ہوتی! "کاش میں یہ کام کر سکتا" اور "واللہ میں اس کام کو مبغوض
جانتا ہوں" میں جو فرق ہے وہ اِتنا باریک تو نہیں جسے جامعہ کے فلاسفہ و
منطقین سمجھ نہ سکیں! تاہم جامعی اربابِ حل و عقد نے جس زبان و بیان اور
جس لب و لہجہ میں جامعہ کے وابستگان کے تعاونِ تحریکاتِ حریت سے برأت
کی ہے، اُس میں دوسری ہی روح کارفرما نظر آتی ہے! یہ کام کی ترتیب اور
مُہم کے مختلف مراحل کی تقدیم و تاخیر کا معاملہ دکھائی نہیں دیتا، ہمارے عظیم
فریضۂ زندگی ——— علمِ حقیقت اور عملِ حق (اجتہاد و جہاد!) ———
کا "جزو" اختیار ہے اور "جزو" ترک! بہ پیرایۂ نؤمن ببعض و نکفر ببعضٍ و
نتخذ بین ذٰلک سبیلاً!
ایک چیز ہے فوجی چھاؤنی میں سپاہیانہ تربیت حاصل کرنے کے قبل
ہی میدانِ جنگ میں داخل ہوجانے کے خام طریقۂ کار کی تنقیص، اور دوسری
چیز ہے عرصۂ کارزار کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے "رقبۂ ممنوعہ" (Forbidden
Area) اور "منطقۂ خطرہ" (Danger Zone)
قرار دیدیا جانا! دونوں چیزیں یکساں نہیں! ایک صحیح طریقِ کار ہے، دوسرا

مُطلق ارتداد!

جامعۂ ملیّہ کی طرف سے، اپنے خال خال سعید الفطرت طالب علموں اور معلّموں کے دخل در عملی سیاسیات پر جو "ماشا و کلّا" وقتاً فوقتاً رسالۂ جامعہ کے صفحاتِ شذرات سے گوش زد ہوئی ہے، وہ زیرِ بحث موقف کے دوسرے پہلو کی غمازی کرتی ہے! کم از کم جامعہ کے اگر بعض فارغ التحصیل طلبہ نہیں تو پختہ مغز و پختہ کار اساتذہ ایسے "رنگروٹِ سیاست" نہ تھے کہ محاذِ جنگ پر جن کی "سرگرم خدمت" ("Active Service") اک "قبل از وقت تجاوز عن الحدود" ("Trespass") قرار پاتی! لیکن ہم نے دیکھا کہ جامعہ کے اسٹاف کے "پیرانِ مُغان" نے بھی جب کبھی "مئے سیاست" میں اپنا ہی "سجادۂ تعلیم" "رنگین" کیا ہے تو وہ خود اپنے لئے بھی "سالکِ باخبر" تسلیم نہیں کئے گئے ہیں! "قیشنل آزادیٔ ضمیر" ایک طرف، "روحانی حریتِ اتقنتِ قلبک" تک انھیں نہیں دی گئی ہے! اُن کی یہ "بےراہ روی" جامعہ کے "سرکاری مسلک" ("Official Creed") کے بہر حال منافی ہی سمجھی گئی ہے! کیا جامعہ ملیّہ کے اساتذہ و شیوخ تک ہمیشہ "پیرانِ نابالغ" ہی رہتے ہیں؟! انھیں نہ کبھی بلوغِ سِن حاصل ہوتا ہے، نہ رسائیٔ فکر، نہ بصیرتِ قلب، نہ استقلالِ عمل؟! جامعہ کیسی "مادرِ علمی" ہے جس کی پیداوار بطن پر پختگی و رسیدگی حرام ہے؟! جب کبھی متعلقینِ جامعہ میں سے کسی نے اس کے خلاف دعویٰ کیا ہے، جامعہ نے اپنے "تبرّی ناموں" میں انھیں جتایا ہے کہ گویا "میری کنارِ خام میں رہتے ہوئے تو وہ اس کی آرزو نہ رکھیں! یہ خام بُدم، پختہ شدم سوختم" کے "مدارج خودی و بیخودی" تو انھیں میرے قلادۂ غلامی کی شکست سے پہلے نصیب نہیں ہو سکتے! یہ چیزیں وہ دوسری جگہ ڈھونڈیں اور اس راہِ تلاش کا پہلا قدم یہ ہے کہ جامعہ سے "محجوب الارث" ہونے کا سرٹیفکٹ حاصل کریں!

——— ہیہات! ؎

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
ہوگئے خاک انتہا یہ ہے!

لیکن یہ بھی یاد رہے کہ ؎

چو پردہ دار بشمشیر می زند ہمہ را
کسے مقیم "حریم حرم" نخواہد ماند!

ہمیں خوف ہے کہ "جامعہ ملیۂ اسلامیہ" بھی خیر سے "آل انڈیا مسلم لیگ" کے نقشِ قدم پر چل رہی ہے۔ اور اُسی غارِ ہلاکت کی سمت میں، جو امروز فردا میں مسٹر جناح کا "مقبرۂ عالیہ" بننے والا ہے!

ہاں، غالباً یہ لوگ جامعہ کے "ناخلف فرزند" ہیں جو اُس کی مصلحت پسندی و سلامت روی کے "بچکانہ صحن خانہ" سے رینگ کر "کربلائے سیاست و حریت" میں داخل ہونا چاہتے ہیں! ہاں اِن "شوریدہ سروں" کو واضح ہو کہ نعوذ باللہ منہا، "ہم بجز اک تعلیمی جماعت ہونے کے اور کچھ نہیں ہیں"!

گویا ہم یکسر "زنانِ قول و ارشاد" کا اک "زنانخانہ" ہیں! نکہ "مردانِ کارزارِ جہاد" کا اک "اکھاڑا"! ——— یہاں تک کہ اگر سوءِ اتفاق سے ہم میں سے کوئی مجاہدِ حق پیدا بھی ہو جائے تو ہمیں چاہیئے کہ بعجلت تمام اس حقیقت کا اعلان کریں کہ "ایسے لوگ چمنستانِ جامعہ کی ایسی "غیر طبعی روئیدگی" ہیں جس کی شاخ و بیخ کا اک رگ و ریشہ بھی اس سرزمین کے آب و گل میں نہیں!" ———

آہ! کیا مولیٰنا محمد علی مرحوم کی روحِ مجروح کا یہ شیون ہمارا سامعۂ تخیل اس وقت نہیں سُن رہا ہے کہ ؎

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد!
آئے ہے بیکسیٔ عشق پہ رونا غالب کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد!

سیاسیات، اور خاصکر جدید العہد ہندوستانی سیاسیات، خاندانِ آدم کے پورے پانچویں حصّے کی مظلوم و محروم، مقہور و رنجور خلق اللہ کے ساتھ غمگساری اور ممکن چارہ سازی کا دوسرا نام ہے! کیا یہ ایسا ناشُدنی کام ہے کہ اُس سے آلودۂ دامن ہوتے ہی اک "جامعی" اپنی "مادرِ جامعہ" کی آغوشِ تعلق کے لئے "اچھوت" ہو جاتا ہے؟ اگر سیاسیات کی وسیع انسانی ہمدردی و خدمت گزاری ایسا ہی کارِ شنیع ہے تو ہمیں خوف ہے کہ اگر کسی موقعے پر کبھی کسی جامعہ والے طالب علم یا اُستاد نے کسی بڑھیا کی آتش زدہ جھونپڑی کی آگ بجھائی، یا کوئیں میں گر جانے والے کسی بچّے کو کوئیں میں سے نکالا، تو ہمیں رسالۂ جامعہ کے "شذراتی گزٹ" میں یہ "کمیونکے" پڑھنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے کہ "بڑھیا اور بچّے کی اس بیان کردہ خدمت کے ارتکاب سے قبل ہی اس "جامعی" کا تعلق جامعہ سے باضابطہ طور پر منقطع ہو گیا تھا! پس کسی کو غلط فہمی نہو! یہ کام شخصِ متعلقہ نے اپنی پرائیویٹ حیثیت سے کیا ہے، جس کی تمام ذمہ داری سے جامعہ کا دامنِ عصمت پاک ہے"! ع

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند!

"ڈوڈی" علمائے اسلام کو اگر اپنے اس مشہور "مذہب" کی تائید میں کہ "اسلام سیاسیات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا" اگر کسی مجموعۂ "دلائلِ ساطعہ و براہینِ قاطعہ" کی ضرورت ہو تو "جامعہ ملیہ اسلامیہ" کی "اکادمی" کی یہ "ریسرچ" (تحقیق انیق) اور بعض "شیوخِ جامعہ" کی سیاست بیزاری کی یہ "سنتِ مؤکدہ" اُن کی بہت کچھ دستگیر ثابت ہو سکتی ہے! ؎

من و تو ہر دو خواجہ تاشانیم
بندۂ بارگاہِ سلطانیم!

کیا اک شریف باپ کے لئے یہ بات موجبِ ننگ ہو سکتی ہے کہ اُس کا بیٹا کسی مظلوم و معصوم انسان کے کام آیا، یا کسی خرمغز حاکم سرکار سے کامیاب طور پر متصادم ہوا؟! ایسے سپوت کو باپ سینے سے لگائے گا، یا اُسے ننگِ خاندان کہہ کر عاق کر دے گا؟! سر وزیر حسن صاحب ہی کو دیکھئے کہ اُنھوں نے باوجود اپنی سابق چیف کورٹ کی چیف ججی اور موجودہ "نائٹی" کے "مقامِ محمود" کے اپنے نوجوان فرزند ارجمند سید سجاد ظہیر کے دادِ حریت دینے والے "قال و حال" پر یہی نہیں کہ اُنھیں مردود قرار نہیں دے دیا۔ بلکہ بزرگ سن باپ نے نوخیز بیٹے کو عملاً اپنا "پیرِ طریقت" بنا لیا! اور آج وہی "سر وزیر حسن" ہیں جو اپنی پُر زور و بیم آزاد مقالی کی بنا پر "کانگریس نائٹ" کا خطاب پا چکے ہیں! ؎

رشکِ وفا نگر کہ بدعوئ گر رضا | ہرکس چگونہ در پئے معشوق میرود!
فرزند زیرِ تیغ پدر می نہد گلو | گر خود پدر در آتشِ نمرود میرود!

جامعۂ ملیہ والے اپنے تعلیمی مرکز نمبر ا و نمبر ۲ اور اپنے ننگِ وجود "پیامِ تعلیم" کو کہاں کا "حرمین شریفین" سمجھتے ہیں کہ جس سے اپنی "بیعتِ رضوان" کو محفوظ رکھنے کے لئے انسانیت و غیرت و ضمیریت کے ہر رشتے کو منقطع رکھنا ضروری ہے! ؎

ورتد رسہ کس را نرسد دعوئ توحید
منزل گہِ مردانِ موحد سرِ دار است!

اور پھر تکمیلِ تعلیم کے بعد میدانِ عمل و اصلاح میں داخل ہو کر اپنی تعلیم کی کامل العیاری کا ثبوت ہی نہیں دینا ہے، بلحوائے ؎

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا وہ پھر لہو کیا ہے!

بلکہ خاص حالات میں تعلیم کے "ہفتخوان" کے طے کرنے سے پیشتر ہی ہم کارفرمائی اور زور آزمائی کی منزل سے کبھی دوچار ہو جایا کرتے ہیں! یہ ہماری کوئی خامکاری اور جلد بازی نہیں ہوا کرتی! اصولِ عمل سے بظاہر یہ "انحراف" بجائے خود ایک اصول کی "بجا آوری" ہوا کرتی ہے! ہم بلاشبہ ایسے موقعوں پر اک اصول سے بھاگتے ہیں۔ لیکن لاریب کہ اک اصول ہی کی طرف! یہاں منسوخ اک اصول ہوتا ہے، لیکن جو چیز ناسخ ہوتی ہے وہ بھی اک اصول ہی ہوتی ہے، ہم بڑی چیز کے لئے چھوٹی چیز قربان کر دیا کرتے ہیں! اس طرح ہم متعلقہ مقاصدِ عالیہ کی دعوت کو کبھی محرومِ لبیک نہیں کرتے، اور معقولیت کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیتے! یہاں ہم "دیوانگی و فرزانگی" کے عملاً جامع بنجاتے ہیں۔ اور اُس مقام پر فائز ہو جاتے ہیں، جہاں سے اُفق پر ہمیں یہ آتشیں و نورانی تحریر نقش نظر آتی ہے کہ "زندگی منطق سے فائق تر واقع ہوئی ہے!" ("Life is larger than logic") ایسے اوقات میں ہمارا "جوش" ہمارے "ہوش" کو یوں جواب دیا کرتا ہے:۔

عشق سے مست ہوں مجھے ساغرِ ہوش سے غرض؟
تُرکِ سیاہ چشم کو سُرمہ فروش سے غرض؟
آپ کو حسِّ خیر و شر! آپ کو حُبِّ مال و زر!
آپ جُنوں سے بے خبر! آپ کو جوش سے غرض؟

"جُنون سے بے خبر" اِن لوگوں کے مقابلے میں "جنون سے باخبر" لوگ ہی عقل و دانش سے بھی حقیقتاً زیادہ آشنا ہوا کرتے ہیں! لیکن اُن کی حکمتِ لغز کے سمجھنے کے لئے "مغز" چاہئیے! ؎

ہم سے وفا پرست اگر کارِ جنوں کو چھوڑ دیں
اہلِ خرد کے درمیاں جوش بڑا "فساد" ہو!

ہاں تو یہ "مشارٌ الیہ" "خاص حالات" جو فتوائے عمل کو ایسا متغیر کر دیا کرتے ہیں وہ "اوقات" رکھتے ہیں جو اقبال کی لُغتِ حیات کی اصطلاح میں "محشر کی گھڑی" کہلاتی ہے! اور یہ اوقات وہ "مقامات" رکھتے ہیں جو اسی زبانِ رمز میں "عرصۂ محشر" کہلاتا ہے! ؎

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے!
پیش کر غافل، عمل کوئی اگر دفتر میں ہے!!

یہ ساعتِ محشر اور عرصۂ محشر کہاں ہے؟ شاعر اس استفسار پر محوِ استعجاب ہو جاتا ہے! ؎

سخن ز "نامہ و میزاں" دراز تر گفتی
بحیرتم کہ نہ بینی "قیامت موجود"!

اس طرح ہم اِس حقیقتِ نادرہ کے محرمِ راز بنائے جاتے ہیں کہ ہمارا عہدِ حاضر بھی بمنزلۂ اُن "ایام اللہ" کے ہے جو "مالک یوم الدین" والے "یوم الدین" ــــــــ دَورِ جزا و سزا ــــــــ کی وسیع تر تعریف میں آتا ہے!

"اللہ اور اولو العلم" "شاہد" ہیں کہ اس وقت اک "یوم دین" اپنے پورے آثار و لوازم کے ساتھ ہمارے سامنے آگیا ہے! لاریب کہ اک "لمن الملک الیوم؟ للہ الواحد القہار!" کی نوائیں تک سننے میں آرہی ہیں! ع

گوش نزدیک لبم آر کہ "آوازے" ہست!

گو ہم "کتاب در بغل" اور "لیکچر بر زبان" بزرگوں کو اس بزمِ راز میں بار نہ کرا سکیں! ؎

نسخہا در بغل و فہم محال جلوہ ہا در نظر و دیدن نیست!

آیئے، نزدیک تر آکے، اور اپنے کو قریب الفہم بنا کے ہم آپ کو اس وقت و ساعت و حالت سے اس طرح روشناس کریں کہ آپ کو بتائیں کہ یہ وہی مخصوص زمان و مکان و شان ہے، جسے جواہر لال اک "ملک و قوم کی زندگی کے غیر طبعی حالات" کہہ کر پکارتا ہے! جواہر لال کا بھی عموماً یہی قول ہے کہ اگر زمانہ مہلت دے تو تعلیم کی مشق از بس تکمیل کر لینی چاہیئے۔ لیکن پھر جلد ہی وہ کہتا ہے کہ ساری دنیا کی یہ "عمومیت" ہم ہندوستانیوں کے لئے اک "خصوصیت" سے منسوخ ہو گئی ہے! ہندوستان کا طالب علم اک "غیر طبعی دور" سے گزر رہا ہے! وہ کسی طبعی حالت سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا! اپنے اسکولوں اور کالجوں کی ذہنی چھاؤنیوں کے اندر وہ اِس طرح مقیم ہے کہ اردگرد کی زمینیں "رقبۂ جنگ" بنی ہوئی ہیں! اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کس لمحے "قوم کا یہ رنگروٹ" تیار یا نیم تیار حالتِ تربیت میں میدانِ جنگ میں بلا لیا جائے گا! ایسے لمحہ و ساعت پر اُس کا یہ کہنا تو خیر اک گولی کھانے کا سزاوار ہوگا کہ "میں لیفٹیننٹ کا اک ازلی ساکن ہوں"! لیکن اگر وہ عرصۂ کارزار کے طرم کی بھی آواز پر اُفتاں و خیزاں اُٹھ کھڑا ہونے میں بھی اک منٹ کی دیر کرے گا تو اک کم دبیش "مفرور" کی طرح "بیوفا سپاہی" سمجھا جائے گا۔ انفروا خفافاً و ثقالاً و جاہدوا

فی سبیل اللہ!

ہاں، ہمارے گرد و پیش اِس وقت یہی فضا ہے! "جامعہ ملیۂ اسلامیہ" کے "تعمیری حسرت زدگان" کو اگر اس کی خبر نہیں تو غالباً "جامعہ اتحادی دوکان"، "جامعہ بنک"، "جامعہ مکتبہ" ہی کے کاروبارِ داد و ستد اس گرانگوشی کے ذمہ دار ہوں گے! ؎

دیر سے توپوں کے مُنہ کھولے ہوئے ہے روزگار
سینۂ گیتی میں ہے جن کی دھمک سے خلفشار!
حسرتِ تعمیر سے فرصت تمہیں ملتی نہیں
کیا تمہارے پاؤں کے نیچے زمیں ہلتی نہیں؟!

"اسلامیت و ملیت" کی اِس ہنگامہ اور "جامعہ نگر" کے درمیان جو چیز اک "حجابِ مستور" بن کر کھڑی ہو گئی ہے وہ "شیوخِ جامعہ" کی زبان میں اُن کا "ٹھوس کام" ہے! نیز "جامعہ تعلیمی مرکز نمبر ۱" کا "تعلیمی تجربہ"! ؎

بنگے زدیم و مے انا الحق شد آشکار!
مارا ازیں گیاہِ ضعیف ایں گماں نبود!

آہ، اِس "ٹھوس کام" سے بڑھ کر "ٹھس کام" کیا ہو سکتا ہے! اِس "تعلیمی تجربہ" سے زبوں تر "آزمودہ را آزمودن" کا کیا "جہل" ہو سکتا ہے!! ؎

من آں علم و قلم را با پر کاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد طفل غازی را!

ہم بزرگانِ جامعہ کے گوشِ حق نیوش تک کیونکر اس شکایتِ رنگین کو پہنچائیں کہ "حضرت! یہ ننگ تو سرکاری تعلیمگاہوں کے "غلام خانوں" کا تھا، کہ اُن کے اسیرانِ تعلیم و تدریس ایسے وقت شیکسپیئر و ملٹن کی معیت میں "فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے" کی غلو تہائے خرابات کے اندر صرفِ بیہشی و سرمستی پائے جاتے تھے! لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اب جامعہ ملیہ کے زیرِ سایۂ علمِ علم جو حال گوئٹے اور ہرڈر کے مُبتلاؤں کا ہو رہا ہے، شیکسپیئر و ملٹن کے قتیلوں سے کچھ کم بدتر نہیں"! ؎

بگذر ز سعادت و نحوست کہ مرا ناہید بغمزہ کُشت و مریخ بقہر!

کیا بقول برنارڈ شا کے "ہم احرار کا ہر بُت شکن تیشہ" سومنات شکنی کے بعد خود اک "لات و ہبل" میں منتقل نہیں ہو جایا کرتا!؟ ؎

ہرچند سُبکدست ہوئے بُت شکنی میں ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور!

"ہم اک غیر طبعی دَورِ حیاتِ قومی سے گزر رہے ہیں، اور اس روشنی میں اپنے شغلۂ تعلیم وتعلم کو کسی بھی لمحے خیر باد کہہ کر کارزارِ حریت میں چلے آنے کے فرمان کے لئے گوش برآواز رہنے پر مکلف ہیں!" ـــــ پنڈت جواہر لال نہرو کے اس مسلکِ عمل وجہاد پر لبیک کہنے کے لئے کتنے اساتذہ وطلبۂ جامعۂ ملیۂ اسلامیہ تیار رہا کرتے ہیں؟! عام اس سے کہ جامعہ کا مکتبہ "جواہر لال کی سوانح عمری ـــ میری کہانی" ـــ کے ترجمہ وطباعت واشاعت ومنعت کا پی رائٹ کے حُبِّ منفعت سے کتنا داخلِ حسنات ہوتا ہے؟!! ؎

لا تقربوا الصلوٰة "زِ نہیم" بخاطر است! وز امر یاد ماندہ "کلوا واشربوا" مرا!

افسوس ہے کہ جامعہ ملیۂ اسلامیہ کو نہ اپنے "پولیٹیکل مجاہدے" والی فرض کا پاس ہے، نہ اپنے "اسلامی منصب" کے شرف کا لحاظ، اور نہ مُلک کے ہمعصر غیر اسلامی، اصلاحی وانقلابی اداراتِ کی شاندار نظیروں پر غیر تنداند رشک وجذبۂ مسابقت!

پری نہفتہ رُخ و دیو در کرشمہ و ناز بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست؟

"سابرمتی آشرم" کی زندہ تعلیمگاہ وتربیت گاہ کے ۸۰ جانباز گاندھی جی کے "ڈانڈی مارچ" میں "السابقون الاولون" بنتے ہیں، اور ایامِ امن میں، نیز بعد فراغِ تعلیم، آشرم کے نواح میں سینکڑوں میل تک گجرات کے دیہات وقصبات کو بیروزگاری، بیکاری، مقدمہ بازی، قرضداری، اور نشہ بازی کی لعنتوں سے پاک کر دیتے ہیں! ٹیگور کے "بول پور اسکول" کے طلبہ واساتذہ کا دیہاتی کام اور آراضیات کی متعلقہ ریسرچ حکومتِ بنگال کے محکمۂ زراعت کے لئے لاثانی تنویرِ افکار کا سامان بنی ہے۔ ڈاکٹر پی سی رائے ہر سال، بنگال کے موسمِ بارش وسیلاب کی اُفتاد کے وقت، اپنا بین الاقوامی شہرت رکھنے والا "ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" منتقل کر دیتے ہیں اور مع اپنے شاگردوں اور مستفیدوں کی پوری جماعت کے طوفانِ نوح کا منظرِ محشر رکھنے والے بنگالی دیہات میں منتقل ہو جاتے ہیں، اور شہر کا "دارالتحقیق" گاؤں (بیشتر مسلمان!) کے "مراکزِ ریلیف" سے بدل جاتا ہے!! ؎

چیست انسانی؟ تپیدن از تبِ ہمسائگاں!

از سمومِ تپید در باغِ عدن پژمان شدن!

بنارس کے "ودیاپیٹھ" کی سیاسی بیداری، مجلسی خدمتِ عوام اور سارے صوبے میں اُن کی شہرتِ عام کا یہ کرشمہ ہے کہ گذشتہ انتخاباتِ مجالسِ قانون کے موقعے پر یو پی کی کانگریس کاؤنسل پارٹی کی اکثریت اُنہی کے اسٹاف اور اولڈ بوائز نے بہم پہنچائی! ـــ یہ دن اس کے کہ ودیا پیٹھ نے اپنے ان جگر گوشوں کو "عاق" کیا ہو! یا ان فرزندانِ تعلیم نے اپنی "مادرِ علمی" کو "طلاق" دی ہو! ـــ جیسی وارداتِ حیرت نے جامعہ ملیۂ اسلامیہ کی ماضیِ قریب کی مقدس روایات ہیں!

اس سب کو شاید متوازن کر دینے کے لئے جامعہ کا سب سے جلیل الشان کارنامۂ قومیت

حریت صرف یہ بیان کیا جاسکتا ہے کہ سابقہ انتخاب دہلی میونسپلٹی کے وقت حضرت شیخ ا بعض ارکانِ دربار کی طرف سے ٹھنیاں لگانے پر قرول باغ کی مسلم نشست کے لئے کھڑ تو مفا بٹھا دئے گئے! بدقسمتی سے اس حادثۂ فاجعہ کی وجہ یہ ہوئی کہ معزز امیدوار کے نام وہ موقعوں پر باہم مختلف پا یا گیا، جس کے طفیل میں ایک نام بھی باقی نہ رہا، اور شیخ الجامعہ جہد کی "دوشیزہ" "قسمت آزمائی" کا پھول "حالتِ غنچگی" ہی میں افسردہ ہو کر رہ گیا۔ شیخ کے " کا بھی اک دلچسپ معاملہ ہے! وہ "پٹھان" ہونے کے باوجود اپنے نام کے ساتھ افغانی لا "خان" ـــ نہیں لگایا کرتے۔ "قرول باغ کا گاندھی" اس ترکِ خطابِ عالی" پر علی گڈھ میں خیر سمجھا جاتا تھا۔ صدارتِ جامعہ کے دَور میں ماشاء اللہ "سید" فرض کیا جانے لگا۔ اور اب "الیکشن" کی گزشتہ معرکہ آرائی کے موقعہ پر اسی، بیام نے سرے سے اُن کی شخصیت ہی کو مٹ اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی!

سیاسی میدان کی ان معرکہ آرائیوں کے بعد اگر سابرمتی آشرم، وسوا بھارتی بنگ ودیاپیٹھ بنارس کی سی نوعیت کا جامعی نمونے والا "سوشل ورک" دیکھنا ہو تو وہ چشم بد دور "زہادِ جامعہ" اک "یومِ خاکروبی" منایا کرتے ہیں، جب کہ قرول باغ کے باخانوں اور پا خانو بھی پاکیزہ تر قرول باغ کی گلیوں کی جاروب کشی وسیلی کاری کا سارا "مجاہدۂ نفس" دہ سال ر سر کر لیا کرتے ہیں! ؎

تو وُ طوبیٰ وُ ما وُ قامتِ دوست فکرِ ہرکس بقدرِ ہمتِ اوس

ہاں، تحقیق کہ اس کے آگے "لا تعدوا"! کے مطلقاً حرام حدود واقع ہیں! ـــ ـــ حرام اور خطرناک! ومن یتعد حدود الجامعة فقد ظلم نفسہ

گاندھی جی کی بس اتنی ہی تقلیدِ "ہریجنوں" تک کا لیڈر بنجانے کے لئے کافی کچھ مزید اقتدار کی گنجائش ہے تو وہ اُن کی ذات سے یہ مالی استفادہ ہے کہ اُن کی سوا ـــ "تلاشِ حق" ـــ بھی ترجمہ وفروخت کے لئے حاصل کر لی جائے! جہاتما جی کے لئے یہ ا ہوگی، لیکن جامعہ کے مکتبے کے "رندِ ہزار شیوہ" منامینجر کے لئے اک مزید فتح "تلاشِ معاش

ہر کسے از ظنِ خود شد یارِ من وز درونِ من نجُست اسرا

جامعہ کے روشناس ہندوستان "تعلیمی تجربے" کے بعض شعبے یہاں قابل "احمد آباد آشرم" کے تربیت یافتگان اگر گجرات کے دیہات کی خاک چھانتے ہیں، اور پی کے شاگرد بنگال کی طوفانی بارشوں میں گاؤں کے اندر پانگل ہوا کرتے ہیں، تو اہلِ جامعہ میدان میں اُن سے کچھ پیچھے نہیں ہیں! ـــ وہ تاج محل کو دیکھنے کے لئے آگرہ کی تر مطالعہ کیا کرتے ہیں! اور مناظرِ قدرت کا "صوفیانہ مکاشفہ" کرنے کے لئے کشمیر جنتِ نظیر زا ہا! تا چند در خلوتِ تفکر گاو خر؟ ہاں بیا! صورتِ مشاطۂ قدرت

"واقعہ کہ ہم ٹھوس کام کرنے والی اک خالص واخلص تعلیمی جامعہ

سیاسیات سے ہمارا دامن قطعاً پاک ہے!" ــــــ غالباً یہ کانگریسی ہندوؤں کا خالص پولیٹیکل کام ہے!"، چاہے مولٰنا ابوالکلام آزاد اپنے "ذوقِ الحاد" کے تقاضے سے کتنا ہی کہا کریں کہ "ہندوؤں کے لئے کانگریس کا کام اک "سیاسی خدمت" ہے، لیکن مسلمانانِ ہند کے لئے وہ اک مہتم بالشان فریضۂ "جہاد فی سبیل اللہ" ہے!" ــــــ قریب ہے کہ جامعہ ملیۂ اسلامیہ کے نصاب دینیات کی اک انقلابی تطہیر عمل میں آئے گی، اور سرسید علیہ الرحمۃ کا وہ دَورِ سعادت تازہ ہو جائے گا جب کہ "محمڈن اینگلو اورینٹل کالج" کے "تھیالوجی کورس" سے "باب الجہاد" خارج کرنے کا اجتہاد "اُنیسویں صدی مسیحی کا مجددِ اعظم" کر ڈالنا چاہتا تھا! ؎

من و دل گر فنا شدیم، چہ باک؟
غرض اندر میاں سلامتِ اوست!

مولٰنا شبلی مرحوم فطرۃً اک اعتدال مشرب سیاسی مفکر تھے۔ لیکن چونکہ فکرِ رسا اور جگر سوز دردِ اسلامی رکھتے تھے، اس لئے باوجود قربتِ پیری کے سیاستۃً وقلباً اُن پر اک "آمدِ شبابِ حریت" ہی کے مظاہر دیکھے گئے! اُن کے آخری دَور کی سیاسی نظمیں کتنی شوخ و بیباک واقع ہوئی ہیں! اِن ایام کی اُن کی ایک قلم کاری کے اندر تو سچ مچ عَلَمِ بغاوت بلند ہوتے نظر آتے ہیں! ابتدائی مخاطب تو اِس نظم کا غالباً علی گڈھ تھا۔ لیکن آج "بیدار ہو جانے والے علی گڈھ" کے بجائے "سو جانے والے جامعہ نگر" کے وہ کہیں زیادہ حسبِ حال ہے! یا للعجب! ع

میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا!

ہم سمجھتے ہیں مولٰنا شبلیؒ کی محبوب یاد اور اُن کے محبوب تر پیامِ "ملیۂ اسلامیہ" کو تازہ کرنے کے لئے اُن کی محولۂ بالا نظم یہاں نقل کرنا اک ضیافتِ دماغ و دل ہو گی! وہو ہٰذا!

مذہب یا سیاست!

تم کسی قوم کی تاریخ اُٹھا کر دیکھو
وہی باتیں ہیں کہ جن پر ہے ترقی کا مدار

یا کوئی جذبۂ دینی تھا کہ جس نے دم میں
کر دیا ذرۂ افسردہ کو ہمرنگِ شرار

ہے یہ وہ قوتِ پُر زور کہ جس کی تکرار
سنگِ خارا کو بنا دیتی ہے اک مشتِ غبار

اِس کی زَد کھا کے لرز جاتی ہے بنیادِ زمین
اِس سے ٹکرا کے بکھر جاتے ہیں اوراقِ دیارَ

یہ اسی کا تھا کرشمہ کہ عرب کے بچے
کھیلنے جاتے تھے ایوانِ کسریٰ میں شکار

وہ اُلٹ دیتے تھے دنیا کا مرقع دم میں
جن کے ہاتھوں میں رہا کرتی تھی اُونٹوں کی مہار

اِس کی برکت تھی کہ صحرائے حجازی کی سموم
بنگئی دہر میں جا کر چمن آرائے بہار

یہ اسی کا تھا کرشمہ کہ عرب کے رہزن
فاش کرنے لگے جبریلِ امیں کے اسرار

یا کوئی جاذبۂ ملک و وطن تھا جس نے
کر دئے دم میں قوائے عملی سب بیدار

ہے اسی مَے سے یہ سرمستیٔ احرارِ وطن
ہے اسی نشے سے یہ گرمیٔ ہنگامۂ کار

آپ دونوں سے کئے دیتے ہیں ہم کو محروم
نہ سیاست ہی رہا نہ ناموسِ شریعت کا وقار

(۳)

اک قوم کی زندگی میں "غیر طبعی حالات" والا موسم اجتماعیات کا اک مستقل مبحث ہے! تاریخِ اقوام کے ہر مصلح اور داعیٔ انقلاب نے اُس کے مقتضیات کو ملحوظ رکھا ہے! "طالب علموں کو دورانِ تعلیم میں سیاسیاتِ عملی میں حصہ نہ لینا چاہئے" بلا شبہ۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر کم سِن لڑکوں اور نازک بدن عورتوں کو میدانِ جدال و قتال کے شدائد و صعوبات اختیار نکرنا چاہیئے! لیکن پھر آپ کو معلوم ہے کہ "غیر طبعی دَورِ قومی" میں یہ بے اعتدالیاں آزادانہ عمل میں آئی ہیں، اور اربابِ حل و عقد نے نہ اُنھیں روکا ہے، نہ اُنھیں مُضر یا مذموم سمجھا ہے۔ خود اسلام کے "خیر القرون" کی مثالی تاریخ کے آثار اِس کے شاہدِ عادل ہیں، اگر ایک طرف اک موقعے پر رسول اللہؐ حضرت علی شیرِ خدا کو مدینے کی "مدنی آبادی" ("civil population") کا محافظ بنا کے چھوڑ جاتے ہیں (جس پر جنابِ امیر کو اپنے تئیں "رضوا بان یکونوا مع الخوالف" کے زُمرے میں شامل ہو جانے کا تکلیف دہ واہمہ تک گزر جاتا ہے!) تو دوسری طرف اِنہی "غیر طبعی حالات" کے زمان پر آپ خورد سال بچوں اور نوجوان عورتوں ــــــ گھر وندوں اور مامون خلوتوں کی مخلوق! ــــــ تک کو صفوفِ جنگ میں داخل کر لینے میں متامل نہیں ہوتے! اور پھر معلوم ہے اِن بچوں نے عساکرِ اسلامی کی صفِ مدافعت کی "بنیانِ مرصوص" (سیسہ پگھلائی اور پلائی ہوئی دیوار) میں کوئی کمزور رخنہ نہ بہم پہنچایا! اور نہ اُن زنانِ اسلام نے کسی موقعے پر اپنی اک بہت بعد میں آنے والی بہن ــــــ نور جہاں بیگم ــــــ کے اِس "پارٹ" سے اپنے شاندار تعامل کو کچھ کم رکھا کہ ؎

نور جہاں گرچہ بظاہر "زن" است

در صفِ مرداں زنِ "شیرافگن" است!

ہماری حیرانی کی انتہا نہیں رہتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ "جامعۂ ملیۂ اسلامیہ" اپنے فارغ التحصیل طلبہ کو اتنا "خام" اور اپنے اساتذۂ بزرگ کو ایسا "پیرِ نابالغ" سمجھتی ہے کہ گویا وہ معرکۂ زندگی میں اُترنے کے کبھی اہل ہی نہ ہونگے! اور اگر "خدا نخواستہ" اپنی "مادرِ علمی" کی ساری معکوس "روح پروری" (Ins- spiration) کے علی الرغم، ایسی "جرأتِ بیجا" کا ارتکاب کریں گے، جس سے جامعہ کی نیکنامی اور نیک ملنی اور حصول چندہ کی آسانی میں خلل واقع ہو، تو وہ اک "عضوِ مسموم" کی طرح کاٹ کر پھینک دئے جائیں گے! ع

اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا؟!

مگر ہر دل عزیزی حاصل کرنے کی یہ کاوشیں کہیں جامعہ ملیہ کو سوائے اغیار کے ہر اپنے کے لئے بے وقار نہ کر دیں؟! ؎

بقولِ دشمنے پیمانِ دوست بشکستی

ببیں کہ از کہ بُریدی و باکہ پیوستی؟!

ہمارے دوستوں کو یاد رہے کہ ہر دل عزیزی سے بڑھکر کوئی فتنہ نہیں!

ہر بزم میں "آفریں" کے لائق ہونا   شیریں سخنی میں شہد فائق ہونا

ممکن نہیں! جبتک کہ ہو دل میں نفاق!   آسان نہیں مقبولِ خلائق ہونا! (حالی)

یہی وجہ ہے کہ لسانِ اسلام میں اہل حق کا طغرائے امتیاز یہ قرار پایا کہ "لایخافون لومۃ لائم"! ؎

شرک چھوڑا تو سب نے چھوڑ دیا

میری کوئی "سوسائٹی" ہی نہیں!

حنیفاً وما انا من المشرکین!

ہم مولنٰیا محمد علی مرحوم اور حضرت شیخ الہندؒ والی جامعۂ ملیۂ اسلامیہ کی روحِ آوارہ کا یہ شیون سُن رہے ہیں: ؎

ایں ہمرہانِ سُست عناصر دلم گرفت!

شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزو ست!

اربابِ جامعہ کم از کم اپنے گرد و پیش کے دوسرے معاصر، غیر مُسلم، ادارات تعلیم قومی ہی کو دیکھیں، اور اُن کے مقابلے میں اِتنی المناک پسماندگی کا ثبوت نہ دیں! "جامعہ ملیہ" پر افسردگی، پژمردگی، اور نامردی کا جو دَوْر اک مدت سے گزر رہا ہے... وہ اک مستقل مرثئے کی قرأت کا طالب ہے!

اے دل! جنونِ عشق کے ساماں کو کیا ہوا؟   ہوتا نہیں ہے چاک، گریباں کو کیا ہوا؟

رسمِ وفا کی کاہشِ پیہم کدھر گئی؟   ذوقِ نظر کی کاوشِ پنہاں کو کیا ہوا؟

ہے خاکِ تجد برف میں گویا گھلی ہوئی   اے قیسِ عامری! دلِ سوزاں کو کیا ہوا؟

وہ جوہری رہے نہ وہ گوہر نظر فریب   بازارِ مصر و یوسفِ کنعاں کو کیا ہوا؟

ہر اک صدف ہے آنکھ میں آنسو بھرے ہوئے   یارب! نزولِ قطرۂ نیساں کو کیا ہوا؟

آنکھیں ہیں بند، دید کی حسرت یہ کیا بنی؟   دل ہے خجل، تصورِ جاناں کو کیا ہوا؟

کعبے میں بار پاگئے اصنامِ آذری   کاشانۂ خلیل کے درباں کو کیا ہوا؟

اب آستانِ کفر پہ ہیں سجدہ ریزیاں   پروردگار! مردِ مسلماں کو کیا ہوا؟

قبضوں پہ ہاتھ ہیں نہ جبینیں ہیں خاک پر   ذوقِ جہاد و جذبۂ عرفاں کو کیا ہوا؟

شانِ وغائے حمزہؓ و حیدرؓ کدھر گئی؟   روحِ دعائے بوذرؓ و سلماںؓ کو کیا ہوا؟

عزمِ حسینؓ ہے نہ ثباتِ ابوترابؓ   صبرِ جمیل و ضبطِ فراواں کو کیا ہوا؟

پھر ابر سامری سے برستے ہیں اژدہے   یارو! عصائے موسیٰ عمراں کو کیا ہوا؟

سینے میں اس گروہ کے کیوں اُڑ رہی ہے خاک؟

گنجِ حدیث و دولتِ قرآں کو کیا ہوا؟! (جوش)

ہم کسی گوشۂ عالم پر نظر ڈالیں، جامعہ ملیہ کی روش کی تاویل کے لئے کوئی راہِ گریز نہ ملے گی! ہندوستان کے اُس مایۂ نازش خطۂ شریف میں جس کا نام بنگال ہے لڑکیاں تک، اپنے نازک دست و بازو قومی جھنڈے کے بلند کرنے کے لئے وقف کر رہی ہیں، اور اس شانِ مردانگی و بلند آہنگی سے کہ اُن میں سے بعض "نظربند کیمپوں" کے قفسِ تاریک کی عنادل محبوس بن چکی ہیں! کہاں بنگالے کے شاعرانہ گلعذاروں کی بے غل و غش خلوتیں، اور کہاں زندانوں اور بندی خانوں کی پُر وحشت حراستیں!

فضائے ناز میں تھا پرفشاں اک طائرِ رنگیں   نہ تھا برقِ حوادث کا خطر جس کے نشیمن کو

مگر صیاد کو خود کھینچ لایا نغمۂ شیریں   سُریلے چہچہوں کی گود میں پالا ہے دشمن کو!

سچ تو یہ ہے کہ بعض مَردوں کی مردمی خیز سے اتنی تحتِ زنانیت واقع ہوتی ہے کہ جوش کی زبان کا یہ رنگین طعن بھی شاید اُنھیں نہیں شرما سکتا کہ:

یا حجلۂ رنگیں میں دکھا عشوۂ پُرفن   یا رَن میں کچھ اس شان سے آ گونج اٹھے رَن!

یا گوندھ کے چوٹی کو پہن پھول سی کنگن   یا سر سے کفن باندھ کے مرنے پہ ہو طیار!

الغرض بنگال کا ہر طالب علم، طالبِ طبل و علم ہو رہا ہے! درآنحالیکہ ہم

خود علم کی نظری حیثیت سے بھی اتنے بیگانہ ولفور نظر آتے ہیں کہ بجائے طالبِ علم کے سچا طور پر "تائبِ علم" کہلانے کے مستحق ہیں!

تبدید! المعہد اسلامی متقریں بھی طلبہ ہی تھے ——— مردانہ بھی اور زنانہ بھی ——— جنھوں نے اپنی شورش سے مسولینی کی دُور سے دکھائی جانے والی مُسَطّحوں کو برطانوی اقتدار کے لئے ایسی زلزلہ فگن ضربتوں میں تبدیل کردیا کہ "وادیٔ نیل" سے برطانوی "شیرِ ببر" کو بیک بینی و دوگوش رخصت ہونا پڑا! سے

نواپیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنّم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا!

اور آج انگلستان کی طالب علموں کی دنیا پر اک نگاہِ عبرت ڈالئے! ابھی چند ہی مہینے ہوئے ہیں کہ کیمبرج کے "انڈر گریجوائٹس یونین" نے اپنے یہاں یہ تجویز پیش اور پاس کی کہ:

"ہم آئندہ کی کسی جنگ میں خدا، بادشاہ اور ملک کے لئے نہ لڑیں گے!"

آپ بے خبر نہ ہوں گے کہ یونیورسٹی کے اربابِ حل و عقد نے اس آتش لڑائی و بغاوت سرائی پر اِن طالب علموں کا "رسٹی کیشن" نہیں کر دیا، نہ اس ریزولیوشن کو پیشگا سے قبل اُسے مسترد کر دیا! نہیں، بلکہ اس کے بالکل برعکس، پروفیسروں نے ہمّت آموزانہ اس سنگین مناظرے میں شرکت کی، اور اُسے براصل سنگین تر بنا دیا! نامور سوشیلسٹ پروفیسر سی. ایم. جُود نے طالب علموں کی "شراب" کو اس طرح "دوآتشہ" کر دیا! اُن کے الفاظ یہ تھے۔

"مجھے آپ سے سخت شکایت ہے! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جو "جائے اُستاد خالی ست" والی مثل ہے شاید اک ازلی حقیقت ہے! افسوس یہ ہے کہ آپ لوگ ابھی تک الفاظ کا صحیح استعمال تک نہیں جانتے! آپ کی قرأت شدہ قرار داد کے الفاظ کی ترتیب سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ گویا آئندہ جنگ اپنے مقاصد کے اعتبار سے خدا پرستی اور ملک پروری کا اک مقدس "جہاد" ہوگی، ابھی آپ یہ کیوں نہیں کہتے کہ مستقبل میں بین الاقوامی پیمانے پر انسانیت کا جو قتل عام ہوگا اُس میں ہم نوجوان اپنے شریف انسانی ہاتھ رنگین نہ کریں گے!!"

بالآخر کیمبرج کے طلبہ کی یہ تجویز، اساتذۂ کبیر السن کی اس رشکِ عہدِ شباب ترمیم کے ساتھ پاس ہوئی. او ۲۷۵ ا۔ ڈاؤننگ اسٹریٹ" کے ایوان میں زلزلہ ڈال دیا! ع

کشیم نالہ، خدا آسماں نگہدارد!

"فرنگیت مآب" کیمبرج اور گہوارۂ "اسلامیت وملیت" جامعہ کے مسلک و مشرب کے درمیان اگر "تفاوتِ رہ" کو دیکھنا ہو تو آخر الذکر کا یہ "آرڈی نینس" ملاحظہ فرمائیے۔

"ہماری سال تعلیمی کی ابتدا سے بلکہ اُس سے بھی پہلے سے، دہلی میں سیاسی تحریک کا بازار گرم ہے[1]، اور اُس کے اثر سے تمام تعلیم گاہوں کے کام میں کم و بیش حرج ہو رہا ہے[2]! مگر جامعۂ ملیہ میں تقریباً کامل سکون کی حالت رہی[3]! اور تعلیم کا کام پوری سرگرمی سے جاری رہا! جامعہ کے معلمین سے دو چار حضرات نے سیاسی جوش سے متاثر ہو کر استعفا دیدیا[4]۔ اور کانگرس کا کام کرنے کی وجہ سے جیل چلے گئے[5]۔ مگر طالب علموں کی تعلیمی حالت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑنے پایا[6]۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جامعہ کے کارکن عموماً یہ طے کر چکے ہیں کہ اپنی عمر ملک وملت

---

[1] گویا یہ اک شہر آشوب ہے! ——— اک بازاری شور و شر، نہ کہ معرکۂ جہاد و حریت! صاحب چیف کمشنر بہادر دہلی اور شیوخِ جامعہ کی رایوں میں کیا آپ کے لئے امتیاز کرنا ممکن ہے؟ ع پروردگارا، مردِ مسلماں کو کیا ہوا؟! [2] علم جہاد کے کھلجانے اور نفیرِ عام کے بلند ہو جانے کے بعد یہ کرنا اُن وظیفہ ہے جس کی تلاوت میں حرج واقع ہو رہا ہے؟! جامعہ کی تعلیم شاید "صلوٰۃ الٰہی" سے بھی اولیٰ و افضل ہے جو قتال فی سبیل اللہ کی ساعات تک بالکل موقوف و معلق تک ہو جا سکتی ہے!! [3] بالفاظ صحیح تر "جامعہ نگر" اس تمام ہنگامۂ جہد و جہاد میں اک شہر خموشاں بنا رہا! ہیہات! "رضوا بان یکونوا مع الخوالف وطبع علیٰ قلوبھم"! [4] اور تقاضائے علم اور مطالبۂ عمل کا فریضۂ عظیم پوری سرد مہری و مردہ دلی سے معطل رہا! وزین لھم الشیطان اعمالھم؛ فصدّھم عن سبیل وھم لا یؤمنون!" [5] اور جامعہ کی

(بقیہ دوسری طرف پڑھئے)

کی تعلیمی خدمت میں گزار دیں گے[۵]! ہندوستان کی ساری
فضا پر سیاست کے بادل چھا جانے کے باوجود یہ ایک
گوشۂ آفتابِ علم کے نور سے منور رہے گا[۱۱]! سیاست دلوں
کو لاکھ لبھائے[۱۲] (!) مگر تعلیم کے سچے خادم اُس کا دامن کسی
طرح نہیں چھوڑیں گے[۱۳]!

(رسالۂ جامعہ، بابتہ ماہ دسمبر ۳۰ء
ص ۴۸۴ - بہرۂ شذرات)

کیا مناسب ہوگا کہ اب علی گڈھ یونیورسٹی، "جامعہ ملیہ اسلامیہ" کو اپنی
اک نجیب الطرفین "دخترِ نیک اختر" کی طرح گود لے لے!، اور بعد مدت وہ
مبارک واقعہ باعرہ نواز نے کہ ع

آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک!

نظر ایسا آتا ہے کہ عالمِ بالا کے معتدد و باخبر حلقوں میں اس تجویزِ سعید
پر سنجیدگی کے ساتھ غور شروع ہو گیا ہے۔ اور شاید مستقبلِ قریب میں سارے
انیگلو انڈین اخبارات اور برطانوی کنزرویٹو پریس اِس تحریک کو متفق اللفظ
ہو کر پوری بلند آہنگی سے اُٹھانے والا ہے! کم از کم "اسٹیٹسمین کلکتہ"
ہندوستانیت، ہندوستانی قومیت، اور ہندوستانی دعوتِ حریت کا
وہ بدنام دشمنِ سیاہ! ——— نے اِس مبارک منصوبے کی بسم اللہ کر دی ہے!
اپنی ۱۴ رجون ۳۶ء کی اشاعت میں وہ اپنی "منظورِ نظر" جامعۂ ملیہ کی معلومہ
"ادا ہائے دلبری" پر یوں شکر ریز ہوتا ہے:

"یہ ادارہ ہندوستانی مسلمانوں کی اِس تمنا کا
بہترین مظاہرہ ہے کہ اُن کے نوجوانوں کی تعلیم ان بلند
نظریوں اور اعلیٰ اصولوں پر مبنی ہو جو اُن کی ادبی اور
تمدنی روایات کے حامل ہیں، اُن کی تربیت میں غیر ملکی
اور اجنبی اثرات بہت کم ہوں۔ غیر ملکی تمدن و تہذیب
سے وہی اخذ کیا جائے جو کارآمد اور مفید ہو"

قارئینِ کرام اول تو شاید اِس رپورٹ کو باور نہ کریں، یا اگر کریں
تو اِس کو اسٹیٹسمین کا کوئی "اپریل فول" نما مغالطہ قرار دیں! لیکن سُنیئے کہ
اولاً روایت کے استناد کی تو یہ شان ہے کہ اُس کے راوی خود اربابِ
جامعہ ہیں! اور وہی اسٹیٹسمین کے اِس اعلان پر "صداقت یا صحیفۂ
انگلیسیہ" کے لب و لہجہ میں یوں اُس کے خراجِ تحسین کو از راہِ خاکساری
وکم بینی "قبول فرماتے ہیں:

"۱۴ رجون کے اسٹیٹسمین میں ایڈیٹر کے قلم سے ایک مضمون
جامعۂ ملیہ دہلی پر شائع ہوا ہے، جس میں جامعہ کے پچھلے
۱۵ سالوں کی تعلیمی تاریخ اور کارگزاریوں پر مفصل نظر
ڈالی گئی ہے۔ فاضل مدیر اِس مضمون کے دوران میں کہتے
ہیں (اقتباس بالا!) فاضل مدیر نے جامعہ کے نصاب اور

بد آموزی سے "غیر مانوف" رہ کر اُس سے پا بزنجیر نہ رہے! ——— افسوس جامعہ سے استغنیٰ؟!
اور صفوفِ حریت میں شرکت؟! ؎ بقول دشمنے پیمانِ دوست بشکستی ؛ ببیں کہ از کہ بریدی و با کہ پیوستی؟
[۶] اور جامعہ میں اک بے روح تعلیم پاتے ہوئے اُس کے "گوشۂ عافیت" کو غنیمت نہ جانا!
"یا ایہا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ! ولا تتبعوا خطوات
الشیطان"! [۷] سبحان اللہ! وقالوا قلوبنا غلف! [۸] اور اپنی عمرِ عزیز کی
اس "عصمت فروشی" ("prostitution") کو پورے شرحِ صدر سے انگیز
کریں گے! ——— خیر اپنی مدت العمر کی خدمتِ ملک و ملت کو نظرِ بد سے بچانے
کے لئے اپنے دو چار "ناخلف فرزندانِ تعلیم یا خیرہ سر ارکانِ اسٹاف کو ملک و ملت کی نقصان
رسانی" ("dis-service") کا بھی اِرتکاب کر لینے دیجیے! خاندانِ
آذر میں دو ایک "ابراہیموں" کے پیدا ہو جانے سے اُس کی نیکنامی میں کچھ فرق نہ آئے گا!
[۹] "سیاست کے بادل"؟! ——— اور ترکِ سیاست کا "مطلع صاف"! کصیبٍ
من السماءِ فیہِ ظلماتٌ وَّ رعدٌ وَّ برقٌ! یجعلون اصابعھم فی اٰذانھم
من الصواعقِ حذرَ الموت! ؎ ہم سے وفا پرست اگر کار جنوں کو چھوڑ دیں
اہلِ خرد کے درمیاں جوش بڑا فسانہ ہو! [۱۰] ع "اندھیرا چھا جائے گا جہاں میں اگر یہی روشنی رہے گی!"
——— یہ "آفتابِ علم" آفتابِ قیامت سے کم نہیں! اللہ اکبر، یہ "حجابِ اکبر"!! ؎ صد کتاب و
صد ورق در نار کن ؛ جان و دل را جانبِ دلدار کن! [۱۱] "سیاست دلوں کو لاکھ لبھائے"! امیر
جامعہ، ڈاکٹر انصاری تک کو اک فریبِ طفلانہ میں گرفتار کر لے! تاہم "شیوخِ جامعہ" اس دلالۂ
سیاست کے دام میں آنے والے نہیں! ؎ وہ نہیں ہم کہ چلے جائیں حرم کو اے شیخ ؛ ساتھ حجاج
کے اکثر کئی منزل آئے!! [۱۲] کیوں نہو! ؎ اسپِ تازی میاں بکار آید ؛ روزِ میداں، نہ گاوِ پرواری
افسوس، ہم ان "سچے خادمانِ علم"، اور کچے مفروران میدانِ عمل کو کس طرح بتائیں کہ:

زہیچ عشق بجز نکو دانکشند لاغر صفتان و زشت خو را نکشند!
تو عاشقِ صادقی، ز کشتن مگریز مُردار بود ہر آنکہ او را نکشند!!

طریق تعلیم پر اظہار استحسان کیا ہے! اور کارکنانِ جامعہ کی بے غرض اور سچی قربانی کی تعریف کی ہے!

(رسالۂ جامعہ، بابتہ جولائی ۳۷ء)

حیف گر درسِ امروز بود فردائے!

ہمارا یقین ہے کہ کلکتے میں "ہمدردانِ جامعہ" کا جو حلقہ ہوگا اُس کا معلّیٰ اعظم، نیز اُس کا سرپرست اعلیٰ یا دش بخیر اسٹیٹسمین کا "مدیر شہیر" ہی ہوگا اور حلقے کا دفتر بھی اخبار موصوف کے آفس کے اک پُرخلوت گوشے میں واقع ہوگا! ؎

اور ہمدرد کہاں؟ ہو نہ ہو لے حضرتِ دل
درد اب تم کو ہمارا ہو، تمہارا ہم کو!

اہلِ جامعہ کے "ضمیر کا امین" (Keeper of conscience) مجلۂ شریفہ اسٹیٹسمین ہندوستانی سیاسیات کی تاریخ میں قابلِ رشک روایات رکھتا ہے! پنڈت جواہر لال نہرو اپنے وارداتِ زنداں کے متعلق ایک جگہ فرماتے ہیں کہ "جیلخانہ اک حصار سخت ہوتا ہے، جس کے اندر پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ لیکن وقتاً فوقتاً اُس کی سنگین دیوار حصار کے اندر اک کھڑکی کھول دی جاتی ہے، جس پر اک گہرے رنگ کا شیشہ لگا ہوتا ہے جس کے اندر سے بیرونی دنیا کی اک نہایت رنگ آمیز تصویر دکھائی جاتی ہے! ——— یہ رنگین کھڑکی عبارت ہے، یا دش بخیر جریدۂ اسٹیٹسمین سے!"

کیا اربابِ جامعہ اسی "شاہی محل کے جھروکے" کے سامنے کھڑے ہوکر اپنے خدمات کے ڈرامے کا اک نہایت رنگین "متکلم ومترنم فلم" ("all talking & singing film") ملک کی پبلک کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں؟! یہ بھی بادب استفسار ہے کہ اسٹیٹسمین نے وقتاً فوقتاً جواہر لال، گاندھی جی، اور جدید ہندوستان کے بکثرت مردانِ کار کی مزعومہ کج نظری، شوریدہ سری، تخریب وفساد پروری ——— نیز برطانوی حکومتِ ہند کی رعایا پروری کی نسبت جو دفتر کے دفتر سیاہ کئے ہیں کیا وہ سب تحریریں بھی ایسی ہی "لسانِ صدق" کی تراوشیں ہیں، جیسا کہ اسٹیٹسمین کا وہ "پروانۂ خوشنودیٔ مزاج" جو جامعہ کے "جدید منظورانِ نظر" کو عطا ہوا ہے؟!

ہمیں امید رکھنی چاہیئے کہ عنقریب دہلی کے صاحب چیف کمشنر بہادر بالقابہ "جامعہ نگر" میں نزول اجلال فرمائیں گے۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم کے مزار پر اک فرمائشی فاتحہ کے لئے دستِ دعا اُٹھائیں گے! جامعہ کی غیر مکمل عمارات اور مجوزہ "مسجد" کی تکمیل کے لئے جیبِ خاص سے اک گرانقدر عطیہ منظور فرمائینگے! اور آئندہ نوروز کے یوم سعید پر حضرت "شیخ الجامعہ" کو "خان بہادر" کا خطاب ملنے کی سفارش روانۂ گورنمنٹ ہند کریں گے! ؎

وہ بھی دن ہو کہ اُس ستمگر سے
ناز کھینچوں، بجائے حسرتِ ناز!

یہ کہنا تحصیلِ حاصل ہے کہ جامعہ واہلِ جامعہ کو حضرت مفتیٔ ہند مولانا اسٹیٹسمین کے اس پروانۂ خوشنودیٔ مزاج کے بعد اب راہِ صداقت دامانت وہدایت کے کسی "مزید سلوک" کی ضرورت نہیں ہے! باقی اگر کوئی لذت ناچشیدۂ التفات والطاف یہ کہہ گزرے تو بکتا ہے کہ: ؎

رقیب سرٹیفکٹ دیں، تو عشق ہو تسلیم!
یہی ہے عشق، تو اب ترک عاشقی اولیٰ!

ہاں! ؎

بازآمدم کہ سجدۂ آں خاکِ پا کنم
گر طاعتے قضا شدہ باشد ادا کنم!

(۴)

"شیخ الجامعہ" بڑے لائق وفائق، خلیق ومسکین، صاحب ایثار وقربانی بزرگ ہیں۔ لیکن اک انقلابی تعلیم وتربیت کے مرکز کے صدر کے لئے جس گرم دلی اور مخمور المزاجی کی ضرورت ہے وہ دُور دُور اُن میں پائی نہیں جاتی! تنہا ذہانت، انقلابیت سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتی! ؎

"عقل ہم خوب است واز ذوقِ جنوں بیگانہ نیست
لیکن این بیچارہ" را آں "جرأتِ رندانہ" نیست!

اُن کی اسی "شکستہ رگی" پر جامعۂ ملیہ کی تحریک کی ولادت کے دردِ زہ کے ساعاتِ صعب میں ایک موقعے پر مولانا حسرت موہانی نے اُن سے برملا کہہ دیا تھا کہ "ارے میاں! بڑے بودے آدمی ہو! پٹھان اور جوان ہوکر ڈرتے ہو؟"

اِس گفتگو کی تقریب وہ وقت تھا کہ نوزائیدہ جامعہ، علی گڈھ کالج

کے احاطے کے اندر قیام یا ترکِ قیام کی گرم تنقیح چھڑی ہوئی تھی ——— اور اُس وقت کے "شاب" اور اِس وقت کے "شیخ" نے "فی الفور تخلیہ" کی رائے دیدی تھی!

خیر یہ ہوئی کہ اپنی ملّت کی متاع کی اِس "رضا کارانہ دستبرداری" پر اُس "جبریہ اخراج" کو ترجیح دی گئی جو "جامعۂ ملیۂ اسلامیہ" کے لئے اک "سعادت ہجرت" بن کر اُس کے صدرِ اوّل کی تاریخ کے اک صحیفۂ زرین پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہوگئی! نیز شکست خوردگی و ترکِ میدان داری کی وہ اولین بڑی مثال نہ پیدا ہونے پائی جو زندگی کے "پہلے قدم و اقدام" ہی کو اک "فرار" میں تبدیل کردینے والی ہوجاتی! — سید الاحرار حسرت موہانی کا یہ جواب، خداوندانِ علی گڈھ کالج کے "الٹیمیٹم" پر، استقامت و ظرافت کا کیسا مفرحِ قلب نسخہ تھا کہ "We simply ignore this notice" گویا ؎

اُس فتنہ خو کے دَر سے اب اُٹھتے نہیں اسدؔ
اِس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو!

یہ نہ سمجھئے کہ "شیخ" کے ہَول وِل کا محل اُن کا دل ہی ہے! — ماشاء اللہ اُن کے "دماغ" میں بھی کوئی ریشۂ بغاوت نہیں؛ وہ یکسر اک غیر انقلابی ذہن رکھتے ہیں! وہ مشکل سے کسی قدیم و کہنہ چیز پر معترض ہوسکتے ہیں۔ بعض دقیانوسی چیزوں کے وہ اس درجہ دلدادہ واقع ہوئے ہیں کہ اُن کے بعض آزاد دماغ رُفقائے کار "شیخ" کے اِس میلان پر ہجو ملیح سے لبریز تلمیح کرتے رہتے ہیں! وہ ڈاکٹر انصاری مرحوم کو "ڈاکٹر" نہیں، "طبیب" کہا کرتے تھے! لیکن پھر ڈاکٹر انصاری کی تشخیص پر حکیم نابینا کے "فی طغیانهم یعمهون" کو ترجیح دیا کرتے تھے! اُن کے دل و دماغ کا ایک لطیفہ یہاں ضیافتِ طبع کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ برلن یونیورسٹی کے فلسفے کا یہ ڈاکٹر کہا کرتا ہے کہ "کاش خدا مجھے اتنی فرصت دیتا کہ میں طبیہ کالج میں داخل ہوکر طبِ یونانی کی تحصیل و تکمیل کرسکتا!" ——— انا للّٰہ!

پانی کی ایک بوند سے مرعوب ہو شرر! حیراں شکوہِ قطرۂ شبنم سے ہو گہر!
"چیالے" کے طمطراق سے لرزاں ہو نیشتر! "ذرے" پہ "آفتاب" جو کائی ہوئی ہو نظر

یہ اُس طبیہ کالج کی عقیدت ہے جس کی مخلوط "طبی و ڈاکٹری و ویدک" تعلیم، بیک وقت تین تین نظریہائے طب و معالجہ کے "اخلاط" کا خلط مبحث مختلف عناصر مؤتلفہ کی "لاعلاج" غیر ہم آہنگی، ویدک و طب کی جامد دقیانوسیت کے ساتھ یوروپین میڈیسن کے برق رفتار ارتقائے صبح و شام کی باہمی دست و گریبانی، اور جس کے نظام و پروگرام کے سارے "معجونِ مرکب" کی "طرفگی" وغیرہ وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن کو خود طبیہ کالج کے نہ معلوم کتنے طالب علم پڑھ کر مضحکہ بناتے رہتے ہیں!! ——— "آیورویدک اینڈ طبی کالج" دراصل اک ایسا "میڈیکل فیڈریشن" ہے جو ہندوستان کے مجوزہ "سیاسی وفاق" سے بھی زیادہ بیربط و خبط واقع ہوا ہے! ——— کیا "شیخ" کے دماغ کی یہ "شیخوخت" و کہولت، ڈاکٹر انصاری مرحوم کے "اعادۂ شباب" (کے بھی بس) کی بات ہے؟! ؎

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا!
آسماں! ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک!

لاریب کہ "شیخ الجامعہ" پرانی دلی کے کسی مقبرۂ کہنہ کے مجاور بننے کے لئے مخلوق ہوئے تھے ——— "جامعہ ملیہ" ایسی انقلابی تربیت گاہ کی سرکردگی کے لئے اک یکسر دوسرے ہی روح و جگر کی ضرورت تھی! ہمیں "شیخ" نہیں چاہئیں، "جوان" چاہئیں "جوان"! ——— اور کیسے جوان؟ ؎

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہوں کمند!

بلاشبہ اُن کی مالی قربانی ناقابلِ انکار ہے، لیکن مالی قربانی لازماً وہ قلب و روح نہیں خرید سکتی جس کی طالب جامعہ ملیہ کی مسند نشینی تھی! ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

ہمیں مختلف اوصافِ اخلاقی کے درمیان فرق کرنا چاہیئے، اور ایک کا منصب دوسرے کو نہ تفویض کرنا چاہیئے! حضرت عمرؓ نے جب عمرو معدی کرب کو قادسیہ کے معرکے میں عربی صفوف کی کمک کے لئے روانہ کیا تو اُنہی کے ہاتھ یہ پروانہ بھی امیر لشکر کے نام دیا کہ: "میں تمہاری مدد کو دو ہزار سوار بھیجتا ہوں! لیکن للّٰہ انھیں سردار نہ آدمیوں پر بھی مقرر نہ کرنا!" ؏

ہر کسے را بہر کارے ساختند!

ہمارا خیال ہے کہ "شیخ الجامعہ" کچھ اِسی قسم کی تاریخی حقیقت کی تازہ

نظیر ہیں: اپنے ذاتی مالی ایثار کے علی الرغم وہ اپنے جیب و دامن میں وہ متاعِ نغز نہیں رکھتے جو اک انقلابی ادارے کی روح پروری (inspiration) کے لئے ناگزیر ہے! ع

شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست!

الغرض اک بھاری جیب خالی کرکے آپ اک لبریز قوتِ قلبِ زندہ کے مدعی نہیں بن سکتے! "انفاقِ مال" اور "جہاد بالنفس" میں فرقِ مراتب کی ضرورت ہے! ؎

"نقدِ جاں" نذر کرو، سوچتے کیا ہو جوہر!
کام کرنے کا "یہی" ہے، ہمتیں کرنا ہے یہی!

یہ نعرۂ جنگ ہے "جامعۂ ملیۂ اسلامیہ" کے اولین کارواں سالاروں اور سرعسکروں میں سے ایک —— مولانا محمد علیؒ —— کا! لیکن اب جامعہ کا "تکیۂ کلام" اور "سبعاً من المثانی" کیا ہے؟ "ہم تو صرف اک تعلیمی جماعت ہیں!" —— ہیہات! ؎

قم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے
خانقاہوں میں موذن رہ گئے یا گورکن!

ہاں یاد رہے کہ "جامعہ نگر" میں اک عارضی مسجد کے چبوترے پر "اذانیں" دینے، اور ڈاکٹر انصاری مرحوم کی "قبر" کو پکا کرنے کے اعمالِ صالحہ کچھ بہت زیادہ قابلِ رشک نہیں ہیں۔

بیا کہ سجدہ بمحرابگاہِ نو رہنیم | بنائے کعبۂ دیگر زسنگِ طور نہیم!
حطیمِ کعبہ شکست و حصارِ قبلہ بریخت | بتازہ طرح یکے قصرِ بے قصور نہیم!

پھر یہ کوئی معمولی نقصان و فقدانِ روح نہیں! جو چیز شیخ الجامعہ کو شب و روز کے ہر بیدار لمحے میں جامعہ کے طلبہ اور اپنے رفقائے کار کو دینی چاہیئے اُسی سے وہ قطعاً مفلس واقع ہوئے ہیں! ع

سینہ آتش فارغ ز قلبِ زندہ!

برادرانِ وطن میں بھی ایسے صاحبِ ایثار و زرپاش لوگ ہیں لیکن پھر اُن کے خدمات کا اعتراف صحیح میدان میں کیا جاتا ہے! سیٹھ جمنا لال بجاج کو ہندو لوگ "بھاگوان" کہتے ہیں، لیکن اُنھیں گجرات ودیا پیٹھ "بھرودھان" تو کسی نے نہیں بنایا! ع

دولتِ دُنیا کجا و ہمت و جرأت کجا!

پھر دولت و ثروت کی طرح یہاں علمی فضیلت و مشیخت بھی سود مند نہیں! ہمیں معلومات کی کھتونی کی ضرورت نہیں ہے۔ مجاہدات کے میگزین کی! ع

بزورِ بازوِ حیدر بدہ ادراکِ رازی را!

جامعہ کے موجودہ اربابِ حل و عقد شاید بھولے ہوں گے کہ جس دورِ سعادت اور جس فضائے حرارت میں جامعۂ ملیہ کا قیام عمل میں آیا تھا، ہماری قوم کی وضعِ نفسی کا نعرہ (بزبان مولانا شوکت علی) یہ تھا کہ ؎

مفتیٔ شہر ہو یا "شیخ" حرم کوئی ہو
جو ہو سست نکالو اُسے میخانے سے!

جناب ذاکر حسین خاں صاحب (یا بخیالِ خود اُن کے صرف "ڈاکٹر ذاکر حسین، پی، ایچ، ڈی"!) اک ازلی طور پر سرد آب و گل کی مخلوق واقع ہوئے ہیں! وہ طبعاً بس ہندوستان کی معتدل سیاست کے حریف ہو سکتے تھے! وطنی سیاسیات میں اُن کی شیر گرم روش "ماڈریٹ پالیٹکس" سے اوپر نہ جا سکتی تھی! اُن کی بلند ترین معراج اس سے زیادہ نہ تھی کہ اک دوسرے "سر تیج بہادر سپرو" بن جائیں! اب یہ سیرت و خصلت جامعۂ ملیہ کی کارواں سالاری و کمانداری سے وابستہ ہوئی! فطرت کی اس ستم ظریفی میں نہ معلوم ظرافت زیادہ تھی یا ستم گری؟! ع

قرعۂ فال بنامِ منِ "فرزانہ" زدند!

ڈاکٹر ذاکر حسین، پی ایچ، ڈی، نہایت باقاعدگی و التزام کے ساتھ سرد مہر طریقوں اور شکست پذیر اطوارِ سیاست کے علمبردار رہے ہیں! آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب ماضیٔ قریب میں حکومت کی پُرپیچ ڈپلومیسی نے ڈاکٹر ضیاء الدین پی ایچ ڈی کو علی گڈھ کی تعلیمی و سیاسی فرماں فرمائی پر دوبارہ مسلط کیا، تو اندر اور باہر اک عام غم و غصہ کا اظہار کیا گیا، لیکن نرم یا گرم فریق کے تمامی وابستگان میں سے پہلی اور آخری آواز جو ڈاکٹر ضیاء الدین کے تقرر یا تسلط کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے، نیز اُن کے دورِ حکومت کے ساتھ بہرحال اشتراکِ عمل کرنے کے لئے اُٹھی وہ اک دوسرے "پی، ایچ، ڈی" —— ڈاکٹر ذاکر حسین —— کی تھی!! ؎

اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
تو مشقِ ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر!

بلاشبہ جناب ذاکر حسین خاں صاحب نے جامعہ کے لئے بڑی قربانی

کی ہے! کم و بیش مبلغ ایک ہزار روپیہ کا ممکن مشاہرہ ——— جس کی پیشکش شروع میں عرصے تک اُن کو علی گڈھ کے اربابِ زر کی طرف سے کی جاتی رہی! ——— یقیناً اک گرانقدر رقم ہے۔ لیکن تصویر کا دوسرا رُخ بھی شاید پورے طور پر روشنی میں نہیں آیا ہے! جامعہ کو یہ بخشش بڑی مہنگی پڑی ہے! ذرا اس داد و ستد کا موازنہ کیجئے! ایک طرف قوم کو ایک ہزار کی منفعت ہے، اور دوسری طرف اس سے براحل بیش بہا، بلکہ بے بہا، چیز ——— نصب العین جامعہ ملیۂ اسلامیہ ——— ہے، جس کی ساری روح اور تمامی حرارت، ساری عملیت اور تمامی جانبازی، اِن ایک ہزار کی نذر ہو چکی ہے! ہمارا خیال ہے کہ "ملیّت و اسلامیت" کے "بازار ایکسچینج" میں مبلغ ایک ہزار ماہوار کی دوامی قسط کی مالیت بھی اِتنی جانستان حد تک گرانبار "شرحِ مبادلہ" سے متعین نہ کی جائے گی! ؎

مرا فروخت محبت، و لے ندانستم
کہ مشتری چہ کس است و بہائے من چند است؟

پھر، اس میں شک نہیں کہ یہ گرانقدر رقم اُنھوں نے عملاً ماہ بماہ جامعہ کو دی ہے، لیکن ہماری التجا یہ ہے کہ از راہِ کرم اس "نیم صداقت" ("half - truth") کو مکمل کیجئے! ——— یعنی جامعہ نے بھی اپنی کل کائناتِ متاع و روح اُن کے نذر کر دی ہے! پس یہ معاملہ یک طرفہ نوازش کا نہیں ہے، دو طرفہ "تقابُضِ بَدَلین" کا ہے! ہم قیمتِ خرید کو "عطیہ" نہیں کہا کرتے، نہ شے خرید کردہ کو "امانت" اور نہ اس "تاجرانہ داد و ستد" کو "تاجدارانہ داد و دہش"! ——— "گھی کہاں گیا؟ اپنی ہی کھچڑی میں!" ——— یہ ہے اس ماجرائے شگفت کا اصلی عنوان!! ———

اب وہ ہیں، جزو کل کے مالک، اور سیاہ و سفید کے مختار! اب وہ عوام کالانعام کی طرح "تھرڈ کلاس" میں سفر نہیں کیا کرتے! وہ گاندھی جی اور جواہر لال نہرو سے بہت پرے نکل گئے ہیں! البتہ جواہر لال کی اِتنی ریس سے اُنھیں بھی خاص ذوق ہے کہ اپنی بیٹی کو بیرونی سیاحتوں اور پبلک تقریبوں میں ماشاء اللہ ہم رکاب رکھا کرتے ہیں! ——— ہاں جامعہ کے اربابِ حل و عقد کو یہ لٹکا خوب رواں ہے کہ وہ ہر مشہور شخصیت اور ہر مقبول تحریک سے اُس کا اِفادی پھل اور نمائشی پھول توڑ لیا کرتے ہیں، اور بیخ و خار کی خشکیاں اور زحمتیں "احمق قربانی بازوں" کے لئے چھوڑ دیتے ہیں!

من زقرآں مغز را برداشتم!

آج بھی وہ اگرچہ اپنے کو اک سچے اور پکّے کانگریسی کی حیثیت سے مشتہر کیا کرتے ہیں ——— بلاشبہ متعلقہ حلقوں میں! ——— تاہم اپنی پرائیویٹ صحبتوں میں مسٹر جناح کی مسلم لیگ اور "حکیم اسلام" ڈاکٹر سر اقبال کی دعوتِ "پاکستان" سے پوری وابستگی اور احترام پیشگی کا شرح صدر کے ساتھ ثبوت دیا کرتے ہیں! ع

رندِ ہزار شیوہ را طاعتِ حق گراں نبود

اُنھیں اس سے مطلق خوف نہیں کہ ع

لیک صنم بسجدہ در ناصیہ مشترک نخواست!

اس لئے کہ گو وہ "صنم شکن" نہوں، لیکن صنم کو دم دینے والے ضرور ہیں! ؎

دیر و حرم میں آپ کو دیکھا ہے پیش پیش
فرمائیے کہ "شیخ" ہیں یا "برہمن" ہیں آپ؟

بایں ہمہ، علی گڈھ کی طرف شیخ کا اضطراری میلان اُنکا مستقبل مسلک بنتا جاتا ہے! اُن کے وجود کا کم از کم تین رُبع حصّہ جسماً و روحاً علی گڈھ میں رہا کرتا ہے! وہ اگر ادکھلے کے "جامعہ نگر" میں ایک دفعہ جاتے ہیں تو دس دفعہ علی گڈھ کے اکابر کی بزمِ خاص میں باریاب ہوتے ہیں۔ مکان۔ دفتر اوکھلہ، علی گڈھ ——— اِن اماکنِ اربعۂ مقدسہ میں سے اُنکا زیادہ مستقل مستقر، خصوصاً ایامِ تعطیل و اوقاتِ فرصت میں، علی گڈھ ہی ہوا کرتا ہے! ع

رُخ سُوئے "میخانہ" دارد "شیخ" ما!

شاید قارئینِ کرام کو سب سے زیادہ مستبعد میرا جو قول مسموع ہوا ہوگا وہ یہ ہے کہ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین، پی ایچ ڈی، اجتہادِ فکر اور حریتِ رائے کی متاع کے بھی کچھ ایسے مایہ دار نہیں! ——— لیکن آئیے، "اہلِ خرد" کی "پابستگیٔ رسم و رہِ عام" کی نظیر میں اک تازہ واقعہ سُنائیں!

"معاشیات: مقصد و منہاج" نام ہے اُس معرکہ آرا مقالے کا جو "ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد" کے فضلاء کے "مجمعِ عالی" کے سامنے ڈاکٹر صاحب نے سنہ ۳۲ء میں پڑھا تھا۔ سر دست اِس تصنیف یا تالیف کے "تہدیہ" سے ہمیں تعرض کرنا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ یہاں بھی وہی نقادگی

و سرافگندگی بینقاب ہوتی ہے جو عبارت ہے اُن کی ساری مغلوب و مرعوب نفسیت و سیرت سے! فرماتے ہیں:

"اِن مقالوں میں اگر کچھ توجہ کے قابل ہو تو وہ ہے جو میں
نے اپنے محترم اور شفیق استاد، پروفیسر ورنر زومبارٹ
استادِ جامعہ برلن کے حلقۂ درس میں بیٹھکر اور اُن کی
تصانیف کو پڑھکر سیکھا، اس لئے اپنی اس طالب علمانہ
کوشش کو اُن کے نام نامی سے منسوب کرتا ہوں۔ ذاکرحسین"

ہمیں یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ "تہدیہ" دارِ بند کے اک فارغ التحصیل چالیکامی طالب العلم "کا ہے یا" برلن یونیورسٹی "کے اک" ڈگری یافتہ پی ایچ، ڈی "کا؟ تعلیم مغربی کے اک نوجوان فرزندارجمند کی زبان سے تو اِس قسم کی گفتگو کا خواب بھی نہ دیکھا جاسکتا تھا، لیکن شاید ہمارے ندوے کا اک منتہی بھی اپنے کسی ایسے خطبے کے انتساب کی تقریب پر عمر خیام کی اِس مردانہ لڑائی کو نہ بھولتا کہ:

صیاد نہ، حدیثِ تحجیر مکن	چیزے کہ نخواندہ، تو تفسیر مکن
چوں مردِ حقیقتہ از تو معنی طلبد	از دیدہ بگن، روایت از پیر مکن!

(۵)

آزاد قومی تعلیمی ادارات کے لئے حکومت کی مالی امداد ناجائز سمجھی گئی ہے۔ تحریکِ ترکِ موالات کا نعرۂ جنگ یہی تھا؛ بلاشبہ یہ اک صحیح اصول تھا "جس کا کھاتے ہیں اُس کا گاتے ہیں،" نہ صرف یہ کہ اک مقولہ ہے، بلکہ اک ناگزیر لازمہ ہے! جامعہ ملیہ کی معاشی زندگی کا آغاز بھی اسی کلمۂ بے نیازی سے ہوا کہ "ہم نہ حکومت کا نمک کھائیں گے نہ اُس کا حقِ نمک ادا کرنے کے مکلف ہوں گے"! ہم کو وہ موقع یاد ہے کہ جب جامعہ کے قیام و اجرا کے بعد اولین موقعِ سکون آنے پر اُن لوگوں کے ناموں کی اک فہرست تیار ہونی شروع ہوئی جو اس جدید البنا درسگاہِ "ملیت و اسلامیت" کے متوقع و ممکن و مستحسن مالی پشت پناہ ہوسکتے تھے تو مولانا محمد علی مرحوم کی طرف سے اُن کے چند دولت مند دوستوں کے اسمائے گرامی کے ادخال پر فی الفور مولانا ابوالکلام آزاد نے گرفت کی تھی، اور مولانا محمد علی کے اس عذر کو کافی نہ سمجھا گیا تھا کہ "یہ لوگ ذاتی طور پر تحریکِ قومی کے ہمدرد ہیں، اگرچہ جماعتہً و سیاستہً و عموماً صفِ مخالفین سے رشتہ رکھتے ہیں!" ——— اس لئے کہ، جیسا کہ مولانا ابوالکلام صاحب کا قول تھا، اِس رخصت کی بنیاد پر ہر رکنِ مجلسِ شوریٰ اپنے دو دو چار چار دوست ایسے پیش کرسکے گا جو اس قسم کی خصوصیت کے حامل ہوں گے، جس کا نتیجہ پھر یہی ہوگا کہ ہمارے اصول کی بیلاگی اور بےلوثی کالعدم ہوجائے گی! بالآخر مولانا محمد علیؒ کو مولانا ابوالکلام صاحب کا اختیار کیا ہوا موقف تسلیم کرلینا پڑا۔ اور اس طرح جامعہ کے اولین معاونین کی فہرست اِس آتشین عنوان کے تحت ترتیب پائی کہ ؎

والیٔ ملک ہو، یا صاحبِ زر، کوئی ہو
جو ہنو مست، نکالو اُسے میخانے سے!

جامعۂ ملیۂ اسلامیہ کی معاشی بسر اوقات کی روایات اِس "صدقِ مقال اور اکلِ حلال" سے شروع ہوئی تھیں! لیکن اس درخشاں آغاز کا دا ژگوں انجام یہ ہے کہ آج ہر "خداوندِ دولت" کے سامنے جامعہ کے لئے دستِ سوال دراز کیا جاتا ہے اور ساتھ ہی ان کلماتِ توبہ و انابت کے ساتھ سرِ تسلیم خم کیا جاتا ہے کہ "ہم محض اک تعلیمی جماعت ہیں! سیاسیات سے ہمارا کوئی تعلق نہیں!" ——— گویا ؎

بالآخر کہہ دیا میں نے کہ گو مسلم تو ہے بندہ
ولیکن "مولوی" ہرگز نہیں ہو خانساماں ہے!

چندے کے معاملے میں حضرت "مسیح الملک" کی حکیمانہ احتیاط یہاں قابلِ ذکر ہے! حکیم صاحب مرحوم کے زمانے تک جامعہ کے اندر چندے کے فتنے کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ وہ عموماً اپنی جیبِ خاص ہی سے جامعہ کے "مولود و طفل" کی شیرخوارانی کیا کرتے تھے! اُنھیں کسی طرح یہ بات گوارا نہ تھی کہ اِس شیرخوار کے "شیرِ مادر" میں ایک "جرعۂ" بھی "مالِ حرام" کا دخیل ہوجائے؛ چنانچہ انتہائی ذاتی عسرت کے زمانوں میں بھی جب کبھی احیاناً انھوں نے کسی صاحبِ استطاعت ہندوستانی سے جامعہ کی مالی اعانت کے لئے کوئی اپیل کی بھی تو اپنے "حسنِ طلب" کو اِس سے زیادہ متجاوز نہ کرسکے کہ "جامعۂ ملیۂ اسلامیہ، مسلمانانِ ہند کی صراطِ اسلامیت و سیاست کی خضرِ راہ ہے، اور میں اُس کا امین و ترجمان ہوں"! ——— ظاہر ہے کہ ہمارے ہندوستان کے گرانگوش اربابِ ثروت کے سامنے اِس نوع کی لطیف و پُرکنایہ اثر آفرینی اک صدا بصحرا ہے! چنانچہ یہی ہوا کرتا تھا کہ ع

بات بھی کھوئی التجا کرکے!

اور پھر جو کچھ ہوتا تھا وہ یہ کہ حکیم صاحب کی نظر اپنے ہی دستِ ہمت پر پڑا

کرتی تھی، اور وہ کچھ اپنی جیب خاص سے اور کچھ اپنے ہم خیال ارکانِ خاندان کو داخل حسنات کرکے جامعہ کے ماہوار مطالبات جاریہ جوں توں بہم پہنچایا کرتے تھے! غور کیجئے، اُن کے لئے یہ کس قدر آسان تھا کہ کسی والئ ریاست یا رئیس وقت سے اپنی گو دلی ہوئی دُخترِ ملی کی ضروریات کو بیان کردیتے، اور پھر اس کے اک "انبارِ زر" جامعہ کے لئے حاصل کرلیتے! لیکن نہیں، اُنکا مسلکِ شرافت یہاں وہی تھا کہ ؎

زنہار ز دستِ ناکساں آبِ زُلال

برلبِ مچکاں اگر در آتش باشی!

الغرض اُن اوقات میں بھی کہ وہ عارضی طور پر جامعہ کے لئے قوتِ لایموت فراہم نہ کرسکتے تھے، وہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ذلتِ زبوں گوارا نہ کرتے تھے اور جامعہ کے ساتھ شریکِ رنج و راحت رہنے کو ترجیح دیتے تھے! ؎

قوتِ "دادن" اگر نیست مرا، باکے چیست؟

قوتِ ناستدن ہست و للہ الحمد!

وہ اُس روحِ غیرت و حمیت کے پیکر تھے جس کا فلسفۂ "معاشیات" یہ ہوا کرتا ہے کہ ؎

دستِ سوال سیکڑوں عیبوں کا عیب ہے

جس دست میں یہ عیب ہو "دستِ غیب" ہے!

اُن کا ایمان تھا کہ دستِ سوال اس قدر پاتا نہیں جس قدر کہ کھوتا ہے! وہ "شکم سیر" ہوکر "سبک سر" ہوجاتا ہے! وہ پیٹ کو اُبھارتا ہے، اور سر کو "داژدسلہ" کرتا ہے! ؎

از سوال افلاس گردد خوار تر!

از گدائی گریہ گر نادار تر!

"عطایا و ہدایا" کے خوانِ چشیدہ اپنے "زرقِ مقسوم" کو اسی سرچشمۂ پاک سے وابستہ سمجھتے ہیں، اور "استقامت کی کرامت" اور توکل علی اللہ کی فاتحکاریوں کے تصور کے اہل نہیں ہوا کرتے! اُن کے "نابینا ایمان" کو اس حقیقتِ نغز کا مشاہدہ کرانا ناممکن ہوتا ہے کہ ؎

خود بخود گردد در میخانہ باز

بر تہی پیمانگانِ بے نیاز!

وہ نہیں جانتے کہ زیادہ کھانے والے تو مند نہیں ہوا کرتے، بلکہ بقول شاعرے "بسیار خوار است بسیار خوار!"

مولینا ابو الکلام آزاد کا مشرب آزادانہ "خوش خوراک" اربابِ جامعہ کے پیشِ نظر رہنا چاہیئے تھا! مولینا کا "الہلال" جب پہلی دفعہ کلکتے کے اُفقِ مشرق سے طلوع ہوا تو اک مشہور والئ ریاست نے چھوٹتے ہی تین ہزار کا ایک چیک بھیجا اور اتنی رقم کے ماہ بماہ پہنچتے رہنے کی بشارت سنائی، اور بشرطِ ضرورت اس سے زیادہ مقدار کی نذر کا پیام خوش دیا! ـــــ سحر السحر الحلال فی مجلدات الہلال" کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ "گفتگوئے خرید و فروختِ ایمان" کے اس "ہیجانے" پر مولینا کا جواب کیا تھا! یہ تھا:

"ہم ایسے فقرائے خاک نشین کے لئے سہ ہزار اک ضرورت سے زیادہ رقم گرانمایہ ہے! ہم ایسے ہیچ نہ تو کوڑی کے بھی تین تین آ سکتے ہیں! تاہم یہ معاملہ سراسر ہماری ذات بمقدار کا ہے! اگر خدانخواستہ آپ حضرات ہمارے ایمان و ضمیر کے خریدار بن کر بازار میں آئے ہیں تو تین ہزار تو تین ہزار ہیں، دولتِ کونین پر بھی اپنے کو فروخت نہ کریں گے!" ؎

عیاں ہیں جن پہ تہیدستیاں سلاطیں کی

لباسِ فقر میں وہ شہریار ہیں ہم لوگ!

الہلال کی تمامی زندگی لاگ اور لپٹ سے مبری و منزہ اک مستقل تاریخ غیرت و استغنا ہے! سارے اسلامی ہندوستان میں عموماً اور بنگال میں خصوصاً اُن کے ہزاروں، لاکھوں مداح، روحانی مریدوں اور عاشقانہ فدائیوں کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن مولینا آزاد نے اُن کا ایک پیسہ اپنے اوپر حرام رکھا! الہلال پر بڑے بڑے حوادثِ عسرت و غربت آئے، اور لوگوں نے کوئی ممکن طریقہ اُس کی امداد کا اُٹھا نہ رکھا، لیکن ان تمام پیشکشوں اور اثر آفرینیوں پر مولینا کی مستانہ نوائے بے نیازی یہی رہی کہ ؎

برو، ایں دام بر مرغِ دگر نہ

کہ عنقا را بلند است آشیانہ!

مولینا شبلی مرحوم نے اُنہی ایام میں اپنے حیدرآباد دکن کے اک وقتی قیام کے دوران میں، مولینا ابو الکلام کو لکھا کہ حیدرآباد کے لوگ آپ کے بعد مشتاق ہیں! کیا آپ کا اس نواح میں ایک دورہ مناسب ہوگا؟ ـــــ مردِ آزاد کی زبان پر بس اُنہی کلمات کی تکرار رہی کہ ؎

مژدہ بشارتِ طوبیٰ کہ مرغِ ہمتِ ما
براں درخت نشیند کہ بے ثمر باشد!

ہندوستانی ریاستوں سے دامن کشی کے معاملے میں اُن کی ادائے
پرہیز و گریز دیدنی ہے! وہ شاید اپنی تمامی زندگی میں کسی رجواڑے کی زمین کو
اپنے قدم سے مَس کرنے سے ناآشنا رہے ہیں! ریاست بھوپال میں اگرچہ
مولانا کی خود ہمشیرہ صاحبہ اک ممتاز منصب پر مکین تھیں، لیکن مولانا نے بھوپال
کے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں بھی کبھی قیام نہ فرمایا! ؎

غلام ہمت آنم کہ زیرِ چرخ کبود
ز ہر چہ رنگِ تعلق پذیرد آزاد است!

الہلال کی ضمانتیں ضبط ہوئیں، ضمانتیں طلب کی گئیں، لوگوں نے اعانتی
رقمیں بھیجیں اور مولانا کی طرف سے واپس ہوئیں! "حریف ظریفوں" نے گمنام
منی آرڈر بھیجے، اور مولانا نے بلطائف الحیل فرستندوں کے نام اور پتے
پوچھ پوچھ کر پھر اس سارے "علائے تو" کو "بہ لقائے تو" کیا! کلکتے کے مشہور
سیٹھ جمال نے یکمشت دس ہزار کی رقم پیشکش کی، تاکہ الہلال کی مطلوبہ ضمانت
داخل کی جائے، اور "دعوتِ قرآن کے اس منادی" (الہلال) کو خاموش ہونے
دیا جائے! ــــ لیکن سب واپس! ــــ بمبئی کے ایک نوجوان و وارستہ
مزاج مسلمان انجینئر نے اسی موقع نازک پر لکھا کہ "الہلال کی تحریرات نے میرے
پیکر رندانہ کے اندر دوبارہ روحِ اسلامی نفوذ کی ہے! آج میرا سارا قلب
و روح الہلال کا عطیہ ہے! تاہم میں "ھل جزاء الاحسان الی الاحسان"
کے اقتضا کو آج تک پورا نہ کر سکا! میں آج بھی غیر مستطیع حالت میں ہوں - البتہ
میرا اک نوتعمیر بنگلہ پورے دس ہزار کی لاگت کا ہے - میں اُسی کو آپ کے نام ہبہ
کرتا ہوں! آپ فی الفور اُسے بیچ کر الہلال کی اسی کی ہم مقدار ضمانت ادا کر دیجئے!
اور للہ میرے اس ہدیے کو رَدّ نہ فرمائیے!" ــــ اس پر مولانا کا جواب ملاحظہ
فرمائیے:

"عزیز من! میں اس گراں قدر پیشکش کو شکریے کے ساتھ واپس کرنے کی
اجازت چاہتا ہوں! مبلغ دس ہزار روپیہ بلاشبہ اک رقم خطیر ہے، لیکن اس سے
بمراحل زیادہ گراں مایہ آپ کی وہ عقیدت و محبت ہے جو آپ کو الہلال کی تحریک
اور میری ذات سے ہے! میں دس ہزار کے بدل میں اس نقد نغز کو دینا نہیں
چاہتا! اگر آپ سے روپیہ قبول کر لینے کی صورت میں اس نادر نعمت سے دستبرداری

اس معاملے کا ناگزیر نتیجہ ہوگا!"

اللہ اللہ! سچے انسان کی بلند نظری و پاکبازی! سچ ہے کہ ؎

جس انساں کو سگِ دُنیا نہ پایا
فرشتہ اُس کا ہم پایہ نہ پایا!

الغرض ع

بے نیازی نازہا دارد ردیسے!

اور یہی راز ہے کہ سارے انبیا و مرسلین کا نعرۂ بے نیازی و پاکبازی
یہ ہوا کیا ہے کہ "یا قوم لا اسئلکم علیہ مالا" و "یا قوم لا اسئلکم علیہ
اجرا"!

تاہم، آپ کو معلوم ہے کہ جامعۂ ملیۂ اسلامیہ کا مستقر، قرول باغ، اور
اس کا زیر تعمیر "مسکنِ جدید"، اوکھلا، نوابان و اُمرا، اہل دولت و ارباب ثروت کی
مستقل جائے نزول ہے! پھر ان اکابر کے شایانِ شان استقبال ہوتے ہیں۔
مُرغن ضیافتیں ہوتی ہیں اور پُرتکلف ٹی پارٹیاں! اور پھر ظاہر ہے کہ "زہاد
جامعہ" اگرچہ قوم کا ایک پیسہ بھی اپنے تکلفات و تعیشات پر اُٹھانے کا خیال
خواب میں بھی نہیں لاتے، لیکن جب اعیانِ ریاست اور عمائد ملت کے لئے
غریب جامعہ اک "مائدۂ لذتِ درد" ترتیب دے تو ہم پیالگی و ہم نوالگی، یا کم
از کم "پس خوردگی" کی سعادت تو نصیب میں از خود آ جاتی ہے! ارکانِ عملۂ مطبخ،
اگر الوانِ نعمت کی دیگیں اُتارتے ہوئے، نمک چکھ لیں تو یہ چیز "مفت خوری"
کی تعریف میں نہیں آ جاتی!

پھر "مقدسین جامعہ" اِس محفل "کلوا واشربوا"، اور اس مجلس ضیافتِ
معدۂ واحشا" کا انعقاد پورے شرح صدر کے ساتھ کیا کرتے ہیں! اللہ کی
نعمتیں ــــ محض "تحدیثِ نعمت" کے لئے! ــــ کھاتے ہیں! اور اپنی اس نفس کشانہ
دعوتیانہ زندگی کے مُرقعے (بصورتِ فوٹو) "پیام تعلیم" میں شائع کیا کرتے ہیں!!
ــــ نازم بریں "پیامِ تعلیم" و "صلائے عامِ ناو نوش"!! ؎

تا عزمِ من قنع شدہ نقشِ نگیں تُرا
دارند اہلِ فقر زِ دستِ تو صد جزع!

اور پھر یہی نہیں، دیسی ریاستوں کے اندر ہفتوں اور مہینوں خداوندانِ
دولت کی آستاں بوسی اور اربابِ رسوخ کی دُنبالہ روی کی جاتی ہے!
ــــ یہ فریضۂ مقدسہ خود حضرت شیخ الجامعہ انجام دیا کرتے ہیں! ؎

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی
میں کیا بتاؤں رات مجھے کس کے گھر ملے!

معاملات کی زبونی کی یہ آخری نوبت نہیں ہے! "شیخ" پایۂ تخت دہلی کے جناب صاحب چیف کمشنر بہادر کے دربار میں بھی باریاب ہوا کرتے ہیں! تاکہ جامعہ کو چند صد روپیہ ماہوار کی میونسپل گرانٹ کی جو مجوزہ منظوری تھی اُس پر جامعہ کا استحقاق اِس طرح جتایا جائے کہ "حاشا و کلا! ہم کوئی آزاد، باغیانہ تعلیمگاہ نہیں ہیں! ہماری روزی میں کھنڈت نہ ڈالی جائے اور ہمارا پیٹ نہ کاٹا جائے!"
—— ہیہات! ؎

تیرے فقیر، اور دیں کوچۂ کُفر میں صدا؟!
تیرے غلام، اور کریں اہلِ جفا کی جا کری!

شاید ہماری کج نظری جس چیز کو جامعہ کے اربابِ حل و عقد کی "رندہزار شیوگی" سمجھتی ہے۔ وہ جامعہ کی "وسیع المشربی" ہو! وہ اپنے مہمان خانے میں باوقاتِ مختلف جواہرلال کو بھی "خوش آمدی" کہتا ہے، اور راجہ صاحب محمود آباد کو بھی "آمد آں یارے کہ مامی خواستیم!"، مہاتما گاندھی کی بھی قدمبوسی کرتا ہے اور نواب مستطاب عالیجناب مہدی یار جنگ بہادر کے حضور میں بھی جبہ سائی!۔ واللہ کہ شخصیتوں کے اس زمین آسمان کے تباین میں مطلقاً کوئی دورنگی نہیں! جامعہ کو اِن سارے ادانی و اعالی، باغی و فدائی بزرگوں سے جلبِ منفعت کرنے سے غرض ہے، کسی اور شے سے واسطہ نہیں! چونکہ جواہرلال کی خودنوشت سوانح عمری — "میری کہانی" — اور مہاتما جی کی "تلاشِ حق"، "معاشیاتِ معیاری" کے نقطۂ نظر سے ایسی ہی قیمتی چیزیں ہیں، جیسے کہ والیانِ ریاست اور عمائدِ حکومت کے گرانقدر عطیے، اِس لئے دونوں کی خدمتوں میں نیاز حاصل کرنا دراصل ایک ہی شے — حضرت "مُبلغ" علیہ السلام — کی آستاں بوسی ہی ہے! ؎

"مقصودِ ما" ز دیر و حرم جُز حبیب نیست
ہر جا کُنیم سجدہ" بر آں آستاں" رسد!

"چہرۂ شاہی" رکھنے والا "سکّہ" ایسی چیز نہیں کہ اُس کا نقش کسی جگہ نظر آئے، اور اُس کو سجدہ کرنے کی ناگزیری سے گُریز کیا جا سکے، پھر چاہے ہمیں اپنی شاہراہِ مسلک سے کتنا ہی انحراف کیوں نہ کرنا پڑے۔

"اُس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل!
میں کوچۂ رقیب" میں بھی سر کے بَل گیا!

"گورنمنٹ گرانٹ" کے معاملے میں بھی جامعہ کی پالیسی ناقابلِ فہم ہے۔ برطانوی حکومتِ ہند سے بے نیازی اور والیانِ ریاست کی آستان بوسی، کچھ اچھا "سلوکِ طریقت" نہیں! آخر الذکر طائفۂ شریفہ آخر کون بزرگ ہیں؟! شاید اس کا جواب ناگفتہ بہ ہے! گاندھی جی نے ہندوستانی رجواڑوں کے متعلق جو پھبتی کہی ہے، جامعۂ ملیۂ اسلامیہ کے سیاسیین و معاشیین اُس سے بے خبر نہوں گے! برطانوی ہند کے اک سیاسی مُجاہد کے لئے اک دیسی ریاست کوئی "دار الہجرۃ" یا "دار الامن" نہیں! وہ "کڑھائی سے کود کر چولھے میں" جا پڑنے کا اک طریقِ پناہ جوئی ہے! "بہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیداست!" ریاستوں کی "زمین" کہیں زیادہ "سخت" ہے، اور آسمان کہیں زیادہ "دور"! ریاستیں بقول مہاتما گاندھی کے "دوگونہ غلامی" کے معابد و مَنادِر ہیں! مہاتما جی کی آپ بیتی — "تلاشِ حق" — اور مہاتما جی کے آوازہائے اعلانِ حق — "قوم کی آواز" — شائع کرنے والی جامعہ شاید اِس سے ناواقف نہو گی! پھر یادش بخیر مکتبۂ جامعہ نے پنڈت جواہرلال نہرو کی خودنوشت سوانح عمری — "میری کہانی" — "ہم خُرما" و "ہم ثواب" حاصل کرنے کے لئے ابھی حال ہی میں چھاپنے کا جو "خیر دارین" حاصل کیا ہے، اس آتشیں کتاب کے وہ فقرے شاید بزرگانِ جامعہ "منسوخ التلاوت" سمجھتے ہوں گے، جو ماشاءاللہ اِس "ہندوستانی ہندوستان" کے متعلق اُس میں پائے جاتے ہیں!— وہی "ہندوستانی ہندوستان" جو خیر سے "سولھویں سترھویں صدی کا اک تمدنی تبرک" ہے، جو بیسویں صدی کی "بجلی کی روشنی" کا اک "اندھیر" ہے! جہاں کے کرۂ ہوا میں سانس لینے سے "دم گھٹتا ہے"! جہاں کے ریلوے پُلوں پر سے گزرنے والی ٹرینوں میں بیٹھے ہوئے مسافروں کو اُن "ندیوں کے آبِ رواں منجمد ہوتے محسوس ہوتے ہیں"! جہاں کا "راج محل اور قصرِ شاہی" وسیع دیہات و قریات کے "ملبہائے تخریب و ویرانی" کے وحشت زار کے "درمیان" تنہا نظر نواز تعمیر پائی جاتی ہے!

یہ ہندوستانی ریاستیں ہیں جو اب "مقدسینِ جامعہ" کی قبلۂ مقصود و کعبۂ اُمید ہیں! "جیسی روح ویسے فرشتے"۔ کیا یہ اُس ماجرے کی اک نظیر ہے؟! جامعہ کے لئے گورنمنٹِ ہند کا "عطیۂ اعانتِ تعلیمی" حرام ہے، لیکن چشمِ بد دُور ریاستہائے ہند کے "خوانہائے یغما" اُس کے ذہنِ معصومیت کے لئے "شیرِ مادر" ہیں! "گُڑ کھاؤں، گلگلوں سے پرہیز" والا اصولِ حکمت کیا "حضرت شیخ الجامعہ" نے جامعہ کے ہموار

"عبیہ کالج" کی آب وہوا میں سیکھا ہے؟! کیا برٹش گورنمنٹ کی گرانٹ کا قلادۂ غلامی کافی نہ تھا کہ اُسے "دوچند گلوگیر" کرنے کے لئے دیسی ریاستوں کے خزانوں کی طرف "تحویلِ قبلہ" عمل میں آیا ہے؟! جامعۂ ملیۂ اسلامیہ کے "مفتی وشیخ" کو سرکاری گرانٹ پر سے حُرمت کی قدغن اُٹھاکر اک رخصتِ اباحت حاصل ہی کرنی تھی تو" برطانوی حکومتِ ہند" ہی کی خیرات وصدقات کے متعلق "کراہت کا فتویٰ" کیا معنی؟! یہ فقہ اسلامی میں اک نئے باب کا اضافہ ہوگا! ممکن ہے یہ "معاشیاتِ ابہامی" کا کوئی قانون ہو! اور والیانِ ریاست کے خزانوں اور توشہ خانوں کی سمت میں رُخ "معاشیاتِ معیاری" کا کوئی عنوان ہو! ہم تو معاشیات کے "مبادی" سے بھی واقف نہیں۔

وگرنہ علم معیشت وسیع ہے واللہ!

حقیقت تو یہ ہے کہ برٹش گورنمنٹ کی گرانٹ اگرچہ عملاً قابلِ پرہیز ہے، لیکن اصولاً جائز ہے! وہ بہرحال ہماری ہی حکومت ہے، گو غیر ذمہ دارانہ سہی، تاہم ہماری: اُس کا خزانہ خود اُس کے لئے اتنا جائز نہیں جتنا کہ ہمارے لئے! ہم اک استعارے کے پیرایہ میں اُس کے عیاش اربابِ حل وعقد کو اِس "خزانۂ عامرہ" کے متعلق یوں متنبہ کرسکتے ہیں کہ ؎

بہ بادہ دست میالاے کاں ہمہ خونِ است
کہ قطرہ قطرہ "چکیدست از" دلِ انگورا!

پس اگر گورنمنٹ ہند کے ہاتھ سے تعلیمی امداد کی مد میں ہم کو کچھ وصول ہوجائے تو اگرچہ اس "ثقیل غذا" کو ہضم کرکے اپنے جسم کے اندر "خونِ صالح" پیدا کرنا ہر بودے قومی یا تعلیمی ادارے کے بس کی بات نہیں، تاہم، اُصولاً واصلاً یہ رقوم سرکاری ایسی ہیں کہ اُنھیں ہم اپنی "متاعِ بُردہ" کی بازیافت کی اک ایسی قسط سمجھ سکتے ہیں، جس کو "رہزن" نے کم وبیش اپنے اوپر اک "قرض" تسلیم کرلیا ہے!

لیکن دوسری طرف، ہندوستانی ریاستوں سے ہمارا کوئی "آئینی" رشتہ نہیں! پھر اک عام ہندوستانی قومیت کا رابطۂ اخوت بھی وہ ہم سے جس قدر محسوس کرتی ہیں اُس کا اندازہ آپ اِس سے کیجئے کہ اُن کے قلمروئے حکومت وحلقۂ عبودیت سے باہر بسنے والا ہر ہندو یا مسلمان اُن کی سرکاری زبان میں "غیر ملکی" کا مکروہ نام رکھتا ہے! ع

ہر کو نہ "خر" است "کافرش" میخوانند!

ایسی دُنیائے قلعۃ الموت" نشین سے" برطانوی ہند" کا اک ادارہ کیا پا سکتا ہے؟! اور اگر پاسکتا ہے تو انہی "ناگفتہ بہ شرائط داد وستد" کی مفاہمت پر کہ وہ اُس کے عُریاں استبداد ومطلق العنانی کے بارے میں اک "مُہرِ طلائی" اپنے لب ودہن پر لگائیگا! اِسی عہدِ وفا کا ناگزیر مشتنیٰ یہ ہوگا کہ وہ موقع وبیموقع، ریاست اور سیاسیاتِ ریاست کی حمایت کرے گا! چنانچہ جامعۂ ملیۂ اسلامیہ نے بھی ماشاء اللہ پوری "اسلامی" عہد پروری اور "ملی" وفاکیشی سے اِن نئے اختیار کئے ہوئے پیمانہائے محبت وارادت و "دعایت" ("Propaganda") کو نبھایا ہے! اُس سے شائع ہونے والے رسائل اِن ریاستوں اور اُن کے پایۂ تختوں کے حالات سے "زرّیں" ہوا کرتے ہیں، اور اُن کے اکابرِ دولت واعیانِ حکومت کی عنایتوں کے فوٹوؤں سے مُرصع! ؎

غالب وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دُعا!
وہ دن گئے "(۱)، کہ کہتے تھے "نوکر نہیں ہوں میں"!

ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ تحریرات ومُرقعجات، "جامعہ ملیہ" کے زیرِ تربیت ومخاطبت معصوم بچوں کے رسالے "پیامِ تعلیم" ——— میں شائع کئے جاتے ہیں! "ٹھوس کام" کرنے والی جامعہ اِس سے زیادہ اور کیا "تعلیمی پیام" "شاہانہ سیاست" کے ساتھ محبت وعقیدت کا، آزاد پیدا ہونے والے معصوم بچگانِ ملک کو دے سکتی ہے؟! ——— یہ گویا "فطرۃِ اسلام" پر پیدا ہونے والی ارواحِ ملک ووطن کے کانوں میں لمحۂ پیدائش ہی پر "اذان واقامت" کے کلماتِ طیبات کی تلقین ہے! ؎

مدہوش کردے ساقی ساغر پلا پلا کے
دیں گے دُعا شرابی پھر ہاتھ اُٹھا اُٹھا کے!

جامعہ ملیہ اگر اپنی پاک بازی اور بے نیازی کی نمبود ونمائش کا "خرقۂ سالوس" اُتار پھینکتی اور دیسی ریاستوں کی "بخششوں" کی ایمان طلبیوں پر برطانوی حکومتِ ہند کی نسبتہً بہت زیادہ صاف اور مقابلتہً بہت ہی کم بے لوث گرانٹ کو مُرجّح قرار دیتی تو، دوسری بیشمار علتوں اور قباحتوں سے بچ جانے کے علاوہ اس گرانٹ کی مالی مقدار بھی زیادہ ہوتی! مثل مشہور ہے کہ ع

خاک از تودۂ کلاں بردار!

مگر شاید اِس کا راز یہ ہو کہ "جامعہ" اپنے کو اک ایسا گدائے خاک نشین سمجھتی ہے کہ دہلی وشملہ کے بابِ عالی کے سنگِ آستاں تک اپنی پیشانیٔ پست کو بلند نہیں کرسکتی، اور بدرجۂ مجبوری دیسی رجواڑوں کی "دُکھشنا" پر قانع

ہوگئی ہے:ؔ

تو وطوبیٰ و ما و قامتِ دوست!
فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست!

تاہم جامعہ کے "ماہرینِ علمِ معیشت" نے اِس نارسائی و بے بہرگی کی کافی و وافی تلافی کرلی ہے! گورنمنٹ ہند کی سرپرستی کے سایۂ عاطفت سے محرومی سے فائدہ اُٹھاکر اُنھوں نے "جامعہ" کو اک "آل انڈیا یتیم" کی حیثیت سے مشتہر کرنا شروع کردیا! اور اب یہ مہم پوری معاشی بارآوری کو پہنچ گئی ہے! چنانچہ اس وقت وہ والیانِ ریاست سے بھی فیضیاب ہیں، اور ہندوستانی رؤسائے حریت پرور (مثل جمنالال بجاج) سے بھی! فقرائے ملک (مثل مہاتما گاندھی وغیرہم) کے دستِ کرم سے بھی مستفید ہیں اور جانبازانِ "تمارِ مردانہ" (مثل جواہر لال) کے بازوئے ہمت سے بھی! وہ شیخ سعدی شیرازی کی زبان میں بغداد کی نصیبہ سکندری رکھنے والی "زبیدہ خاتون" ہیں، جو روزِ ولادت سے اک خلیفہ (مہدی) کی لاڈلی بیٹی تھی، اور بعد میں اک دوسرے خلیفہ (ہارون الرشید) کی چہیتی بیوی بنی، اور بعد ہی کی اک تیسرے خلیفہ (مامون الرشید) کی والدۂ محترمہ! ع

نہ مثلِ زبیدہ است ہر بیوہ! (سعدی)

تاہم موجودہ اربابِ حل و عقدِ جامعہ کو زیبا نہیں کہ جامعۂ ملیۂ اسلامیہ کی ولادت باسعادت، اُس کے محترم متولیانِ امانت، اُس کے سابقہ نامور جانبازانِ خدمت و استقامت، اُس کی گزشتہ مبارک روایاتِ امانت و دیانت و عسرت و عزیمت، اُس کے موقر نام اور مسلمۂ عام شہرت کے آبگینۂ نازک پر ذرا بھی ٹھیس لگنے دیں: ع

نامِ نیکِ رفتگاں ضائع مکن!

آزاد تعلیم کے معاملے میں سرکاری گرانٹ کا مسئلہ بیحد نازک واقع ہوا ہے۔ جنگِ عظیم میں انگلستان کی شہرۂ آفاق پرائیویٹ یونیورسٹیوں ــــ کیمبرج و آکسفورڈ ــــ کے نوخیز طالب علموں سے لیکر نازک دماغ پروفیسروں و آبگینہ طبع شعرا تک نے میدانِ جنگ کو اپنے خونِ گرم سے رنگین کرڈالا تھا! لیکن جنگ کے آفاق گیر معاشی خلفشار و مالی سقوط کے نتیجے میں یہ دونوں یونیورسٹیاں جب بُری طرح گرفتارِ مشکلات ہوئیں اور ملک کی قومی حکومت نے محض بتقاضائے "هل جزاء الاحسان الا الاحسان" اپنے خزانے سے اُن کی دستگیری کرنے کی پیشکش پیش کی تو اُن جامعاتِ علم و شرافت کے علماء و فضلاء، ارکانِ اہتمام و اربابِ حل و عقد کی ہنگامہ خیز "مجلسِ شوریٰ" میں جو مناظر پیش آئے اُنھوں نے تمدنِ اسلام کے اُس علمی و تعلیمی خیر القرون کی تاریخ دوہرادی جب کہ عروس البلاد بغداد کے اولین سرکاری مدرسۂ عالیہ ــــ "نظامیۂ بغداد" ــــ کا افتتاح اک دیدنی شاہانہ تزک و احتشام سے کیا گیا۔ اُس وقت علمائے وقت نے اک "مجلسِ عزا" منعقد کی، جس میں یہ نوحہ بلند کیا گیا کہ "ہیہات! دورِ علم و شرافتِ علم ختم ہوا! آج سے علم، معرفتِ حقیقت اور خدارسی کے لئے نہ پڑھا جائے گا بلکہ قربِ سلطان و امیر کے لئے!!" ؎

آئے ہے بیکسیٔ عشق پہ رونا غالب!
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد!

اگر ہم خدانخواستہ موجودہ مجاہدینِ جامعہ کا جائزہ، قدیم و جدید تاریخ علم و تعلیم کے اس بلند منارے پر کھڑے ہوکر لینے لگیں تو اُس کے یہ اطفال مکتب سوائے اِس کے کیا کہہ سکتے ہیں کہ "لا علم لنا الا ما علمتنا!" ؎

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مردافگنِ عشق؟"
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد!

جامعۂ ملیۂ اسلامیہ" کو معلوم ہونا چاہیئے کہ تعلیم کے معاملے میں اسلام کا تصورِ حزم و احتیاط اِس درجہ نازک واقع ہوا ہے کہ "عالم بالا" کے سرپرستوں کے گرانقدر عطیئے تو ایک طرف رہے، ہمارے معلمانہ قدموں میں زانوئے ادب تہ کرنے والے شاگردوں کی تعلیمی فیسیں تک شرعاً جائز نہیں رکھی گئی ہیں! پھر اِس فتوے کو آپ کسی "مفرطہ غیر پرستی" پر بھی محمول نکیجئے! محصلینِ زکوٰۃ کا نفسِ قطعی قرآنی سے معاوضہ مقرر کرنے والا اسلام بغیر کسی وجہ غامض کے تعلیم کے حق الخدمت کو ممنوع قرار دینے والا نہ تھا! ہم اگر چاہیں تو بآ ذنی تامل اِس راز کی تہ کو پہنچ سکتے ہیں! کیا آپ کو اپنے مخاطب طلبہ کی تھوڑی بہت رعایت ملحوظ نہیں ہوا کرتی!! رجسٹرہائے طلبہ کی فہرستیں خوب طویل ہوں! اُسی کے تناسب سے رقومِ فیس وصول ہوں! والدین کو خوشگوار قسم کی "تعلیمی رپورٹیں" بھیجی جائیں! ہمارے ہاں کے پاس ہونے والوں کا اک اچھا "فیصد" ("Percentage") ہو! کوئی ایسی چیز نہ پڑھائی جائے جو لڑکوں، اُن کے جذبات، اُن کے "سرپرستوں" کے تعصبات و توہمات کو ٹھیس لگائے! پھر "یومِ والدین" ("Parents' Day") وغیرہ کی قسم کی تقریبات منعقد کرکے بچوں کے گھر والوں تک پر ڈورے ڈالے جائیں! وعلیٰ ہذا القیاس اِسی نوع کی گوناگوں ترکیبوں اور ڈپلومیسیوں نے ہمارے بہت سے مشن اسکولوں اور پرائیوٹ،

نام نہاد قومی تعلیمگاہوں کو "اعلیٰ سیاسیات" کے "اکھاڑے" بنا رکھا ہے! سوائے فیس کی آمدنی اور اُس کے اضافے کے خیال کے کونسی چیز ہے جو تعلیم و تربیت کے حیلے سے یہ بیسیوں پاپڑ بیلنے پر مجبور کرتی ہے!! پس معاوضۂ تعلیمی کا فتنہ ناقابلِ انکار ہے! — تا بہ گرانٹ گورنمنٹ چہ رسد؟!

اسی شر کو آپ اک دوسرے شعبۂ زندگی میں دیکھئے! اخبار کے خریداروں سے اخبار کا چندہ لینا کتنا معصوم حق ہے! لیکن پھر آپ کو معلوم ہے کہ خریداروں کو اپنے اخبار یا رسالے سے وابستہ رکھنے کے لئے مقررہ تعدادِ صفحات و اوراق "ریڈنگ میٹر" کے علاوہ کیا کیا کچھ "ناقابلِ قرأت مواد متعفن" (Unread able rotten stuff) بھی دیا جاتا ہے؟ اسی چیز نے مغرب کے ممالک کے "چوتھے رُکنِ ریاست" (رسائل و جرائد) کو "Gutter Press" بنا رکھا ہے!

آپ اپنے حاصل کردہ "تعلیمی عطایا و ہدایا" کو کہاں کا "مائدۃً من السماء" سمجھتے ہیں؟! جس شے کو ہم اپنی "فتوح و خراج" سمجھے ہوئے ہیں وہ دراصل ہمارے ضمیر و ایمان کی "قیمتِ خرید" ہے! ؎

مرا فروخت محبت و لے نہ دانستم

کہ مشتری چہ کس است و بہائے من چند است!!

ان ساری خرابیوں اور علتوں، اس تمام لاگ اور لاسے، اس ساری لوٹ و غوض کی طویل کارفرمائی اور انقلاب انگیزی کا مجموعی نتیجہ آج یہ ہے کہ ہم اک عالم نفاق جامعہ پر طاری پاتے ہیں! شیخ الجامعہ کانگریسی بھی بنتے ہیں، اور مسلم لیگی بھی!، وہ جامعہ ملیہ کے سالارِ کارواں ہیں، اور علی گڈھ کے شب و روز کے زائر! وہ ٹیگور کے بھی معتقد ہیں اور اقبال کے بھی مُرید!، خالدہ ادیب خانم سے ترکی میں "مشرق و مغرب کی کشمکش" پر خطباتِ رَجَز بھی دلواتے ہیں اور پھر خود "عشقیانۂ علی گڈھ کے میلے" — مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ تعلیم ثانوی کی بزم میں "شبنم افشانی" بھی کر آتے ہیں!، رسالۂ جامعہ میں صیغۂ ادارت کی طرف سے اسلامی سیاستِ ہند کے مسائل متنازعہ فیہ پر نفیاً کچھ کہتے ہیں نہ اثباتاً، لیکن قلمی معاونین کی معرفت یہ بھی لکھوا لیتے ہیں، اور وہ بھی: تاکہ وقت پر چت بھی اپنی ہو اور پٹ بھی اپنی! نیز اگر ضرورت ہو تو ہر دو سے بَری الذمہ بھی! منیجر صاحب مکتبۂ جامعہ خیر سے جامعۂ ملیہ سے ملحق ہیں اور جامعۂ اسلامیہ سے بھی وابستہ، اور با ایں ہمہ بھرے جلسوں میں گھبرا کر یہ بھی بول اُٹھنے والے کہ "نا صاحب! ہم نہ "مسلم کانگریسین" ہیں نہ "نیشنلسٹ مسلم"! ہم تو صرف "کتب فروش" ہیں! شیخ الجامعہ، جواہر لال نہرو سے بھی جامعہ کے دروازے پر شیک ہینڈ کرتے ہیں، اور راجہ صاحب محمود آباد سے بھی معانقہ! وہ لہو لگا کے شہیدوں میں داخل ہونے کے لئے سال بھر میں ایک دفعہ "یوم خاکروبی" بھی منا لیتے ہیں، اور پھر نہا دھو کر باقی سارے برس علیگڈھ کا مسلسل گشت و بازگشت سیکنڈ کلاس ریلوے کمپارٹمنٹ میں فرماتے رہتے ہیں! وہ خود بیرونِ خانہ کھدر پوش نظر آتے ہیں، لیکن اُن کا زنانخانہ ہر کوالٹی کے بدیسی کپڑے کا مستقل سرپرست ہے!، تاہم "بچی" کی بسم اللہ خوانی کا جب "پبلک فنکشن" مروانے میں انجام پاتا ہے تو اسی عزیب بچی کو اُس کے سارے لال پیلے، ریشمی و قیمتی، جاپانی و انگریزی کپڑوں کے جوڑوں سے ننگ کر دیا جاتا ہے، اور بروقت اک خاص طور پر سلوایا ہوا "شدھ کھدر" کا بانا اُسے زیب تن کرا دیا جاتا ہے! ؎

حافظا! مے خور و رندی کن و خوش باش و لے

دام تزویر مکن چوں دگراں قرآں را!

(۶)

قومی خدمت کے کاموں میں گرانٹ اور چندے کا دخل و مُداخلت اک بڑی بے پناہ آفت ہے! برنارڈ شا نے اپنے ایک ڈرامے میں اک حق پرست اور جانباز لڑکی کے کردار کو پیش کیا ہے۔ یہ لڑکی اپنے دولت مند باپ کو اُس مشہور شعر کے دوسرے مصرعے کی نظیر پاتی ہے جو یہ ہے کہ: ؎

کریماں را بدست اندر درم نیست

خداوندانِ نعمت را کرم نیست!

اُس کا یہ دردانگیز مشاہدہ اُس کے اندر مسلسل تلخی اور بیزاری پیدا کرتا رہتا ہے! تا آنکہ دولت کی عیش کوشی اور عزت آزاری کے یہ مناظر اُس کی آنکھوں میں اُس کے باپ کے گھر کو اک ایسے خوفناک مقام میں تبدیل کر دیتے ہیں جس کی ملعونیت کسی بھی لمحے اُسے عذابِ الٰہی کے نزول کا ہدف بنا دے سکتی ہے! بالآخر لڑکی باپ کے دولت خانے کے مامون محل کی آتش فشاں سرزمین سے ہجرت کر جاتی ہے! اور "سیلویشن آرمی" (مُکتی فوج) کے اک مرکزِ خدمتِ خلق سے رشتۂ عقیدت جوڑتی ہے!

وہ عرصے تک اس جگہ پورے سکونِ دل اور شرحِ صدر کے ساتھ رہتی ہے۔ یہ پاکیزہ مامن اُس کی روحِ معصوم کے لئے ایسا تسکین بخش ہے کہ

وہ بعض پبلک تقریبات کے موقعوں پر بھی اپنی "اخوات طریقت" کے ساتھ اِس حرَمِ قدس سے باہر نہیں نکلتی، اور اِسی دار السلام کے حصار میں آسودۂ قیام و قرار رہتی ہے!

ایک دن کا ذکر ہے کہ وہ اِسی طرح، سب کے باہر چلے جانے کے بعد اِس آشیانۂ امن کی تنہا قمری بنی بیٹھی تھی۔ کچھ جی گھبرایا تو شغلِ بیکاری و وقت گزاری کے طور پر اُس نے سامنے میز پر رکھے ہوئے آرمی ہیڈ کوارٹرز کے رجسٹرِ دل کی ورق گردانی شروع کی۔ معاً اُس کی نظر اک عُنوانِ جلی پر پڑی ــــ "فہرست مُعطیانِ چندہ"! لڑکی بڑے اشتیاق سے اسمار کے اِس "سلسلۃ الذہب" (زنجیر زر) کے مطالعے میں مشغول ہو گئی! کیا دیکھتی ہے کہ عین سرِ فہرست کے اسمائے گرامی میں اُس کے "بابا جان" کا نام نامی بھی "زیبِ قرطاس" بنا ہوا ہے! اور اُن سارے القاب و خطابات کے ساتھ جو رِقومِ چندہ کی بخشش و بَذل کا نعم البدل ہوا کرتے ہیں!!ع

شکر نعتہائے تو چند آنکہ نعتہائے تو!

مبہوت کمسن لڑکی سر پکڑ کر رہ گئی! اللہ اللہ، میرا باپ! سارے جنود و شیاطینِ شر و ظلم کا سرخیل، اور "عساکرِ نجات" ("Salvation Army") کا اک "کیپ فالوئر"؟! ع

آنچہ می بینم، بہ بیداری ست یارب یا بخواب؟!

اُف! دولت کی یہ "ریاکاری"؟! اور ثروت کے دامِ سخت کی یہ "ہمہ گیری" "مکتی فوج" کو بھی اُس کی گرفت و دست درازی سے نجات نہ مل سکی؟! ہیہات! ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے "مُرغِ قبلہ نُما" آشیانے میں!

وامصیبتا! کہ دولت کی عالم آشوبی کے خلاف کوئی "دار الامن" نہیں! وااسفا! کہ اِس سمائے دُنیا کے نیچے انسانی خدمات و حسنات بھی اربابِ سرمایہ ہی کے دستِ کرم پر پل رہی ہیں! "یزداں" کی پرورش بھی "اہرمن" ہی کے خوان پر؟! ع

حیف گر درپیِ امروز بود فردائے!

اک ناقابلِ بیان و ناممکن التسکین کوفت و کلفت اور یاس و قنوط کی حالت میں لڑکی اُس "سیلویشن آرمی" کے معسکرِ مُجاہدین کا بھی اِسی طرح تخلیہ کر دیتی ہے جس طرح کہ قبل ازیں اُس نے اپنے باپ کے "محلِ قارونی" کو خیرباد کہا تھا ؎

حقا کہ با عقوبتِ دوزخ برابر است
رفتن بپائے مردیِ "سرمایہ" در بہشت!

خلق اللہ کی خدمت اور قومی تعمیر کے کاروبار میں دولت و سرمایہ کی اِس "تیر در کمانی و صیاد در کمینی" سے قدم قدم پر ہوشیار و خبردار رہنے کی ضرورت ہے! مولٰینا ابو الکلام آزاد پر "الہلال" کے پر و بال پر اُڑنے کی پہلی جُنبش پر مبلغ ۳ ہزار روپیہ کے چیک کے "دامِ زرین" کا فی الفور پڑنا، اور اِس عنقائے بلند آشیاں کا دہن اُس کے تار و پود کو بکھیر کر رکھ دینا اوپر کہیں مذکور ہو چکا ہے! ہم سب کو معلوم ہے کہ مولٰینا آزاد کا نعرۂ حریت یہی رہا ہے کہ ؎

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں!
جسے غرور ہو آکر کرے شکار مجھے!!

تاہم یہ مایۂ نازشِ انسانی مثالیں اُتنی ہی شاذ ہیں جتنی کہ شاندار! و "قلیل ما ہم"! خال خال "افراد فرید" سے قطع نظر کر کے عالمگیر مرقع اِس معاملۂ ناشدنی کا بالکل برعکس واقع ہوا ہے! انگلستان اور بیشتر ممالکِ مغرب کے اخبارات و جرائد کو اہلِ سرمایہ نے خفیہ وہاں کے کروڑپتیوں ہی کا کلمہ گو ہے! پیرس سے غربا و مساکین ملک اور مزدوران واشتراکیانِ بر اعظم کا اک زبردست آرگن نکلتا ہے، ــــ اور آپ کو معلوم ہے کہ کس کے سرمائے سے اور کس کی پسِ پردۂ زنگاری کا فرماجرائی سے؟! ــــ کنزِ سرمایہ پرستوں اور جبّاری قاردنانِ یورپ کی جنگِ زرگری سے!! جنگِ عظیم کے بعد کے خستہ و شکستہ و شکست خوردہ جرمنی کی "نشاۃِ ثانیہ" کی ہر تگ و دَو کو یہودی خداوندانِ سرمایہ نے بھیس بدل بدل کر شرکت کر کے خراب کر ڈالا! تا آنکہ ہٹلر اک نعرۂ فاقہ مستانہ مار کر اُٹھا، اور اپنے وطنِ عزیز کی اِن طلائی زنجیروں کو پارہ پارہ کر ڈالا! اِسی اژدرِ دولت کی سرکوبی کے بعد یہ ممکن ہو سکا کہ جرمنی کا "کرپ" کا کارخانۂ آہن و فولاد اِتنا برق دَم ہو گیا کہ اُس کے سامانِ بر آوردہ نے ایک غروب و طلوعِ آفتاب کی درمیانی شب میں ساری "ارضِ رہائن" پر اپنا پرچم اُڑا دیا!ــــــــ پھر سرمایہ ہی ہے جو جدید العہد امریکہ کی تمامی معاشی بحالی اور تمدنی ترقی و سربلندی کی راہ میں "سالخوردہ ججانِ سپریم کورٹ" کے پیکرِ قانون و آئین کی راہ میں سنگِ راہ ہے! اور پریزیڈنٹ روزویلٹ کے سارے جہادِ تطہیرِ ہئیتِ اجتماعیہ کا عَلَم بار بار سرنگوں کر کر دینا چاہتا ہے! ع

الاماں، اے جانستاں سرمایہ داری، الاماں!!

جب حال یہ ہے کہ ہر حق تحریک کی شاہراہ پر سرمایہ کا اژدہا دہانہ

پھاڑے اُسے نگل لینے کو پڑا ہوا ہے تو سالکانِ صراطِ مستقیم کو کتنا بیدار و نظر باز رہنے کی ضرورت ہے! وہ ہمارا شیر خوراں نہ نبیگا، ہمارا خون آشام ثابت ہوگا!

مباش غرّہ و غافل چو میش سر در پیش
کہ در طبیعتِ این گرگ گلّہ بانی نیست!

خاتمۂ سخن میں اب ہم اس بحث کو بالکل جامع و مانع بنا دینا چاہتے ہیں! واضح رہے کہ ہم چندے کو ازلاً و ابداً حرام و ممنوع کہنے پر آمادہ نہیں! اور یہ کیونکر ممکن ہو! چندہ دیوبند نے بھی لیا ہے، چندہ کانگریس بھی لیتی ہے! دوستوں سے نذرانہ مولانا محمد علی مرحوم نے بھی لیا، اور بعض خاص احباب کے پیشکشوں کے قبول کرنے والے مولانا ابوالکلام بھی بنے! بڑی بڑی بھینٹیں گاندھی جی نے بھی لیں اور خطیر رقومِ امداد کو ٹیگور نے بھی نوازا! اک مشہور تاریخی ہدیۂ گرانمایہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے آستانے کے دراجابت تک بھی پہنچا! اور یہ ہدایا و تحائف ہی تھے جن کے زرِ کثیر نے حضرت داعیٔ اسلام کے قدم مبارک چومے، اور جن عظیم میزانوں نے کبھی حضرت عمرؓ کو اپنے نصف اثاثِ متاع سے سبکدوش کر دیا، کبھی صدیق اکبرؓ کے گھر میں صرف اللہ اور اللہ کے رسول کا نام چھوڑ دیا! اور کبھی حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے سالم باغات، اور حضرت عثمان غنیؓ کے سارے تجارتی قافلے دائرِ نیلام کرائے!—— تاہم ذرا عقل و تمیز کو کام فرمائیے، اور تفاوتِ رہ کی پوری پیمائش کیجئے! یہ تنبیہ یہاں اشد ضروری نظر آتی ہے کہ ؎

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

عموماً و اصولاً اِن سب بزرگوں نے یہ پیشکش اس طرح قبول کئے کہ بیشتر شریف النفس بے لوث لوگوں نے بطیبِ خاطر اُنھیں اُن کی خدمتوں میں پیش کیا، اُن کو خریدنے کے لئے نہیں!، بلکہ خود اُن کے درِ قبول کو پہنچنے کے لئے! اُن کی اور اُن کے مخدوموں کے درمیان شرائطِ مفاہمت کا عنوان یہ تھا کہ ع

باچوں توئی معاملہ برخویش منت است!

دراصل اِن خدام کو متعلقہ تحریکوں یا شخصیتوں نے متاثر یا کم از کم مرعوب کیا! اُنھوں نے جو کچھ دیا وہ منتسبین و یا بندگان کے ایمان و ضمیر کی "قیمتِ خرید" نہ تھی، اُن کی دعوت کی قوت کا "زرِ خراج" تھا! اوپر جو فہرستِ خواص و اکابر گزر چکی ہے اُس سے سرِدست ازمنۂ قدیم کے بزرگانِ دین کو الگ کر دیجئے، اور عہدِ حاضر کے محولۂ بالا مردانِ کار و بانیانِ تحریکات و سربراہ کارانِ ادارات کو لیجئے! ہاں نذرانہ مولانا محمد علیؒ کی طرح لیجئے کہ جب جب کسی وقتِ سابق کے نذر گزار بزرگ، نازک سیاسی موقعوں پر اُن سے "حسابِ دوستان در دل" مجھکو اسلئے کا تقاضا کیا کرتے تھے تو گو اُنکا شخصی موقف تھوڑی دیر کے لئے کتنا ہی بدنما ہو جائے۔ لیکن وہ اپنی زبان یا اپنی موضوعِ خدمت تحریک کے کسی جز کو بھی مکفول یا معطل نہ کرتے تھے! ہاں ہدیہ مولانا ابوالکلام کی طرح قبول کیجئے جنھوں نے زراندوزی کے زرین ترین موقعوں کو اپنی اک ادنیٰ ادنیٰ ادائے بے نیازی کی نذر کر دیا ہے! چندہ گاندھی جی کی طرح وصول کیجئے، کہ وہ عین جس وقت ملک کے خداوندانِ دولت پر تبرّی کر رہے ہیں، اُن کے قدموں میں قارون و فرعون کمینٹوں کے ڈھیر لگا رہے ہیں! عطیہ ٹیگور کی طرح نوازیئے کہ اُس کے ایک اشارۂ چشم و ابرو پر سلطانِ مصر پورے کتب خانۂ عربی کے ساتھ، شاہِ ایران سارے ذخیرۂ ادبیاتِ ایرانی کے ساتھ، سلطنتِ چین اپنے گرانقدر تحفۂ اسفار و صحائفِ چینی کے ساتھ، جاپان، امریکہ، اور یورپ اپنی گوناگوں قدردانیوں اور نیازمندیوں کے ساتھ، اور "نوبل پرائز کمیٹی" اپنے سوا لاکھ کے انعام کے ساتھ، دست بستہ حاضر ہے!، درآنحالیکہ خود شاعر، مشرق و مغرب کی اِن ساری مقتدر ہستیوں، جماعتوں، قوموں، اور حکومتوں کے سامنے اپنی تمدنی نقادی اور اپنی روحانی آزاد مقالی کے ساتھ بالکل شمشیر برہنہ ہے!—— ہاں تحفہ لیجئے، مادام خالدہ ادیب خانم کی طرح، کہ اِدھر شریمتی جمنالال بجاج مبلغ ایک ہزار روپیہ انھیں اُن کے سفرِ آمد و رفتِ ہندوستان کے بہانے سے نذر کرتے ہیں، اور اُدھر خانم موصوف اس رقم کو جامعۂ ملیۂ اسلامیہ کی مقدم ترضرورت کے حیلے سے اہلِ جامعہ ہی کے حوالے فرما دیتی ہیں!—— اور ہاں چندہ نہ لیجئے "بعذرِ" سربراہ کارانِ جامعہ کی طرح، کہ وہ اک غریب الوطن، نیز جلا وطن، اور رشیدائے علم و فن دخترِ اسلام کا ذاتی ہدیہ بھی (جو بمشکل اُن کی طویل زحمت کشی اور دماغ سوزی کا بدل تھا!) بے تکلف ہتھیا لیتے ہیں! ع

ایں کار از شماست و مرداں چنیں کنند!

مردانِ حق بلاشبہ زمین پر حالتِ تہیدستی میں ظہور کرتے ہیں لیکن اپنے "دمِ نقد" سے خزانے اور کانیں، سلطنتیں اور تہذیبیں پیدا کر جاتے ہیں! تاہم یاد رکھئے کہ یہ اُنکا "عملِ دریوزہ" نہیں ہوا کرتا، اُنکا "جہانِ خلاقی" ہوتا ہے! وہ جس طرح نسلِ آدم سے جانباز و فدائی لیتے ہیں، اِسی طرح اُس سے زرپاش"

قیدیوں کا غول پیچھے چھوٹ گیا۔ زخمی سپاہیوں کی ڈولیاں پیچھے چھوٹیں، سواروں کا دستہ پیچھے رہا، سواروں کے آگے فرمانروائے ملتان کی بیگمات اور شہزادیوں کے تخفے سکھپال تھے قاسم اپنی رَو میں بڑھا چلا جاتا تھا، دفعتہً آگے ایک مکلف پالکی میں دو آنکھیں جھانکتی ہوئی نظر آئیں، قاسم ٹھٹک گیا، اسے معلوم ہوا کہ میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے، اُسے اپنے جگر میں ایک لرزش، دل میں ایک ضعف، حواس میں ایک وحشت سی محسوس ہوئی۔ وہ دونوں آنکھیں دو منور رقصاں ستاروں کی طرح جنہیں ساحرانہ کشش تھی اس کے گوشۂ دل میں آبیٹھیں۔

افسانے کا یہ آغاز آغاز عمل ہے۔ مگر فی الاصل اس آغاز میں آئندہ واقعات سے پیدا ہونے والی پیچیدگی جھلکا دی گئی ہے۔ ملتان کے فتح کے بعد جتنے لوگ قیدی بنے ہیں وہ سب بادشاہ کے قیدی ہیں، اور قاسم کا بحیثیت شاہی ملازم یہ فرض ہے کہ وہ بادشاہ کے تمام قیدیوں کو بادشاہ تک پہنچادے مگر وہ راہ میں ایک قیدی حسینہ کو دل دے بیٹھتا ہے۔ یہ سوال فوراً سامنے آجاتا ہے کہ اس کی اس ناعاقبت اندیشی کا کیا انجام ہوگا۔ گویا آغاز افسانہ ہی سے پیچیدگی صاف صاف نظر آرہی ہے۔

ایک گدائے قوم کی صدا

غمخواریٔ انڈیا کئے جا — چھُپ کر نہیں برملا کئے جا
کچھ خدمتِ ملک بھی بجالا — کچھ حقِ نمک ادا کئے جا
بنیادِ فلاحِ قوم رکھکر — کچھ خیر کی ابتدا کئے جا
للّٰہ مریض کی طرف سے — غفلت نہ برت، دوا کئے جا
بادل کی طرح برس برس کر — گلزار وطن ہرا کئے جا
قسمت بھی مساعدت کرے گی — کوشش کے حقوق ادا کئے جا
دانا ہے تو زورِ عقل سے چھین — ناداں ہے تو التجا کئے جا
آنکھیں ہیں تو آ جفا کی حد دیکھ — اندھا ہے تو جا وفا کئے جا
حق بات خطا سہی، مگر تو — دن رات یہی خطا کئے جا

آزاد، پھر اک صدا لگا چل
بابا کئے جا بھلا کئے جا

آزاد انصاری

رُوح کا معمّا

امام اکبر آبادی

بُت پرست یونانیوں اور رومیوں کا عقیدہ تھا کہ انسان کی روح اُس کے جسمانی صورت سے مشابہ ہے۔ اور جسم کے عروج و زوال کے ساتھ اُس کا تعلق ہے۔ یعنی جب جسم بڑھتا ہے تو یہ بھی اِسی مقدار سے بڑھتی ہے اور جب یہ گھٹتا ہے تو وہ بھی گھٹ جاتی ہے۔

قدیم عیسائیوں کے خیالات یہ تھے کہ آنے والی دنیا میں روحیں اپنے عزیز و اقارب اور دوست و احباب سے اسی طرح مل کر بات چیت کریں گی جس طرح انسان اس دنیا میں کرتا ہے۔ اس خیال سے اُن کے دلوں کو ایک گونہ تسکین ہوجایا کرتی تھی۔ اور یہ خیالات اسی تسکین کی بنا پر تھے کہ سینٹ پیٹر بہشت کا دربان ہے، اور اس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ جس روح کو چاہے بہشت میں داخل کرے اور جس کو چاہے نکال دے۔ اس میں ایک گروہ کا خیال تھا کہ موت کے بعد روح اپنی قبر پر منڈلایا کرتی ہے دوسرا گروہ کہتا تھا کہ وہ حالتِ سراسیمگی میں اِدھر اُدھر فضائے بسیط میں بھٹکتی پھرتی ہے۔

تمام یورپ میں نہ صرف جہلا بلکہ عقلا بھی یہ بات تسلیم کرتے چلے آئے ہیں کہ روحیں وقتاً فوقتاً آکر اپنے دیرینہ مساکن میں بود و باش اختیار کرتی ہیں اور کبھی ویران محلوں، تنگ و تاریک ویرانوں میں جا کر رہتی ہیں، یا چاندنی راتوں میں تنہا خاموش چہل قدمی کیا کرتی ہیں۔

ایشیا میں اس کے برعکس تصورات تھے، یعنی ماہیتِ ذاتِ باری کے تصورات سے مشرقی ایشیائیوں نے تجسیم کے خیال کو خارج کر کے یہ ظاہر کیا کہ روح کے باب میں انفصال و انجذاب لازمی ہے۔

ویدوں میں اس امر کا اعتراف کیا گیا ہے کہ روح تمام کائنات میں جاری و ساری ہے اور اسی سے انسانی روح کا انفصال و انجذاب ہوتا رہتا ہے۔ منو کی سمرتیوں میں بھی یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ روح شعلۂ عقل کی ایک چنگاری ہے جو اس سے جدا ہو گئی ہے، اور ایک مدّت مدید کے بعد پھر اسی میں مدغم ہو جائے گی۔

بُدھوں کا عقیدہ یہ تھا کہ قوت کا وجود اصلی و حقیقی مادّے کو اپنا مظہر بنا کر عالمِ شہود میں لاتا ہے۔ یعنی ایک جلتی ہوئی شمع ایک انسان کی مورت کے مانند ہے۔ جس میں مادہ مجسم ہو کر قوت کے عملِ ارتقا کو ظاہر کرتا ہے۔ اُن کے نزدیک شمع بذاتِ خود مادہ ہے، اور شعلہ مثلِ روح کے ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ جب شمع جلی نہ تھی تو شعلہ کہاں تھا؟ کیا اس وقت وہ معدوم تھا؟ اور اب فنا ہو گیا؟ نہیں بلکہ شعلے کا وجود پہلے بھی تھا، اور بجھنے کے بعد بھی ہے۔ جسے ہماری ظاہر بین نگاہیں نہیں دیکھ سکتیں۔

یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ ایک عقلِ مطلق اور ایک غیر محدود طاقت ہے جو کائنات کے رگ و ریشے میں جاری و ساری ہے۔ اسی سے روح انسانی کا تعلق ہے، جو ایک طرف تو اُس ازل سے وابستہ ہے جس کی کوئی ابتدا نہیں، اور دوسری طرف اُس ابد سے متعلق ہے جس کی کوئی انتہا نہیں۔

مسلمانوں کا عقیدہ تھا اور ہے کہ روح ایک حکم ربی ہے، اور اُس کے سوا کچھ نہیں۔ یعنی خدا کا ایک حکم ہے جو کائنات کی ہر ہر شے میں حیات بن کر رہتا ہے۔ یہی قرآن نے کہا ہے اور اسی پر تمام مسلمان فلاسفر متفق نظر آتے ہیں۔ مثلاً ابن رشد، ابن تیمیہ، ابن حزم، امام غزالی، ابن عربی، فخرالدین رازی، بوعلی سینا، فارابی، شاہ ولی اللہ اور سر سید احمد خاں، یہ

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے وقت کے امام گزرے ہیں، اور جو یورپ کے فلاسفروں سے آزاد خیالی میں دو قدم آگے ہیں، لیکن یہ تمام کے تمام کسی مسئلہ کی تشریح کے باب میں قرآن ہی کے محتاج نظر آتے ہیں۔

ابنِ رشد کے فلسفہ کا مفہوم یہ ہے کہ ہر شے زندہ ہے، اور اس کا تعلق کسی ایسی شے سے ہے جو پہلے سے زندہ تھی۔ عالم مرئی چونکہ دنیائے حیات ہے۔ اس لئے لازماً یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس کا انفصال کسی وجودِ اولین سے متعلق ہے، اور وہ وجود وہی ہے جسے ہم خدا کہتے ہیں۔ ابنِ رشد کے فلسفے کا اثر یورپ پر اس قدر پڑا کہ تمام اس کے عقیدت مند ہو گئے۔

اس کے بعد امام غزالی کے فلسفہ کا ظہور سنہ ۱۱۰۱ء میں ہوا۔ ان کا فلسفہ رُوح کے متعلق یہ ہے کہ

"خدا نے انسان کی رُوح کو اپنے نُور کے ایک قطرے سے پیدا کیا ہے اور اس قطرے کی خلقت کا منشا یہ ہے کہ جس سمندر سے یہ نکلا تھا اس میں جا کر ملجائے، اپنے نفس کو اس بے بنیاد خیال سے دھوکا نہ دو کہ جسم کے فنا ہوتے ہی روح بھی فنا ہو جاتی ہے۔ جب تم دنیا میں آئے تھے تو تمہاری شکل و صورت کچھ اور تھی، اور اب کچھ اور ہے۔ اس لئے ضروری نہیں کہ جسم کے ہلاک ہونے کی وجہ سے روح بھی ہلاک ہو جائے۔"

ابنِ رشد کے پیرووں کا عقیدہ تھا کہ جب ایک آدمی مرتا ہے تو اس کا جوہرِ عقلی، یعنی روح جداگانہ طور پر قائم نہیں رہتی۔ بلکہ اس عالمگیر روح یا عقلِ فعال، یا روحِ کائنات، یعنی خدا کی طرف رجوع کر کے اس میں جذب ہو جاتی ہے، جس سے ابتداءً اس کا صدور یا خروج یا انفصال ہوا تھا۔"

خلفائے اندلس اگر ایک طرف عیش و عشرت کے حیرت افزا لوازم مہیا کر رہے تھے، تو دوسری طرف علوم و فنون کے چرچے بھی تھے۔ عربوں کے فلسفیانہ خیالات اندلس سے نکل کر آہستہ آہستہ یورپ تک پہونچتے رہے، حتیٰ کہ دسویں صدی عیسوی میں خلیفہ حاکم ثانی نے اندلس کو فردوسِ عالم بنا دیا تھا۔ عیسائی، یہودی اور مسلمان بے روک ٹوک ملتے تھے، اور ان میں ایک عالمگیر برادری قائم ہو گئی تھی، اور مساوات کی انتہا نہ تھی۔

پیٹر جو کچھ دن کے بعد پاپائے اعظم بن گیا تھا اس کا بیان ہے کہ میں نے ایسے ایسے علماء کو دیکھا جو تحصیل علم کے لئے برطانیہ سے چل کر اندلس پہونچتے تھے، اندلس کے اربابِ علم و فضل کا یہ حال تھا کہ آنے والا عام اس سے کہ وہ کہیں کا باشندہ ہو، اس کا نہایت تپاک سے خیر مقدم کیا کرتے تھے، حکمت اور فلسفے کی درسگاہیں قایم تھیں۔ فرانس، جرمنی، اٹلی اور انگلستان میں ابنِ رشد کا فلسفہ مسلط تھا، ایسا کہ فرانسسکن فرقے کے پادریوں نے اس کے فلسفے کو نہایت وقعت کی نظر سے دیکھا، حتیٰ کہ پیرس کی یونیورسٹی اس کا مرکز بن گئی۔

یہودیوں میں بھی جو اس زمانے کے صدر نشینانِ بزمِ ادراک متصور ہوتے تھے، فلسفہ ابنِ رشد نہایت سرعت سے پھیل گیا۔ غرضکہ سائنس و فلسفہ کی حکومت ایشیا و یورپ کے ایک بڑے حصے پر قائم ہو گئی۔ اگر اس وقت مذہبی لوگ حائل نہ ہوتے تو آج خدا جانے زمین پر رہنے والا انسان ترقی کے کس درجہ پر ہوتا۔ لیکن جس طرح عروج کے بعد زوال اور زوال کے بعد عروج ہوتا رہا ہے، جس طرح تاریکی کے بعد روشنی اور روشنی کے بعد تاریکی ہوتی رہی ہے اسی طرح حکمت و جہالت کا بھی ہمیشہ ساتھ رہا ہے،

چنانچہ اسپین میں خلیفہ المنصور نے محض دُنیوی حصول وجاہت و سلطنت کی غرض سے مذہبی لوگوں کا ساتھ دے کر ضعیفی میں ابنِ رشد کو یہ کہہ کر ملک بدر کیا کہ اُس کے فلسفے سے اسلامی عقائد خراب ہوتے ہیں۔ یورپ میں فرقۂ ڈامنیکن نے جو فرقۂ فرانسسکن کا رقیب تھا، فلسفۂ ابنِ رشد کی مخالفت شروع کر دی، اور اعلان کر دیا کہ چونکہ ابنِ رشد کا فلسفہ ذات و شخصیت کے تصور کو مٹاتا ہے، جبریہ خیالات کی اشاعت کرتا ہے، اور عقولِ منفردہ کے اختلافاتِ مدارج و ترقی کی کوئی توجیہہ نہیں پیش کر سکتا۔ اُس کا یہ دعویٰ کہ کائنات میں صرف ایک عقل کا وجود ہے، محض غلط ہے، اس لئے کہ اس سے اولیاء کی کرامات و تصرفاتِ روحانی کی نفی ہوتی ہے، اور انسانوں کے مدارج میں کوئی فرق نہیں رہتا، کیا یہ سمجھ میں آنے کی بات ہے کہ پاپائے اعظم پیٹر کی مقدس روح اور یہودا کی ملعون روح میں کوئی فرق نہو، اور دونوں کا درجہ برابر ہو، پس ابنِ رشد کا یہ ملحدانہ مسلک پیدائش تائیدِ ایزدی، الہام، اقانیم ثلٰثہ، استجابِ دعا، ثواب، خیرات، اور قبولِ استغفار کا منکر ہے۔ اور حشرِ اجسام و بقائے روح کو باطل قرار دیتا ہے۔

اس انقلاب کا اثر یہودیوں پر بھی پڑا، اور یہاں بھی مذہبی لوگوں

نے مخالفت شروع کر دی۔ موسیٰ بن میمون اور اُس کے شاگردوں کا جو ابن رشد کے فلسفے کے پیرو تھے، اور جو دنیا کے ہر حصہ میں اس فلسفے کی اشاعت کر رہے تھے، مذہبی فرقہ دشمن ہو گیا۔ اور اس ہستی کو، اس علامہ کو جس کے متعلق یہودیوں کا قول تھا کہ وہ ایک زبردست عالم و فاضل ہے راس العلماء و فرزانۂ دوراں ہے، سرزمین مغرب و مشرق کا آفتاب ہے، یہی لوگ اس کے اس قدر مخالف ہوئے کہ ملحد، منکر، اور کافر وغیرہ کہنے لگے۔ یہاں تک کہ اس کی تمام تصانیف کو نذر آتش کر دیا

بہر نوع روح کے باب میں دنیا کے بڑے بڑے عقلا، بڑے بڑے حکیم و فلسفی، اور بڑے بڑے پیغمبر دہا تا سر پٹک کر چل دیئے، مگر کوئی نہیں بتا سکا کہ یہ کیا چیز ہے؟ کیسا سحر ہے؟ اور کیسا جادو و طلسم ہے؟ آیا بجلی کی ایک رَو ہے جو ہر ہر قطرے اور ہر ہر ذرّے میں دوڑ رہی ہے؟ جوہر برق ہے جو غیر مرئی اشیا تک میں جاری و ساری ہے؟ یا جوہر لطیف ہے جو جمادات میں سوتی ہے، نباتات میں کروٹیں بدلتی ہے۔ اور حیوانات میں آکر بیدار ہو جاتی ہے؟ پھر کون ہے جو بتا سکے، کہہ سکے، اور غور کر سکے بجز اس کے کہ

کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمہ را

راز و نیاز

خموش رہنے پہ طعنے، جو کچھ کہو تو عتاب
کرے تو کیا کرے انسان اور کیا نہ کرے

مزے مزے کا گلہ تھا، مزے مزے کا جواب
کہ اب سے نامِ محبت کوئی لیا نہ کرے

جو پوچھا عشق میں بھرتے ہیں پھر مزہ کیونکر
کہا کہ خون ہو دل کا اور اُف ذرا نہ کرے

جو پوچھا درد میں لذت کی اور کیا تدبیر
کہا کہ سامنے کی بات ہے، دوا نہ کرے

جو پوچھا کہتے ہیں کس کو شہیدِ طرزِ نگہ
کہا طلب جو سرِ حشر خوں بہا نہ کرے

جو پوچھا صبر کسے کہتے ہیں محبت میں
کہا کہ دم ہو لبوں پر مگر دعا نہ کرے

جو پوچھا عشق میں کیا کوئی شے ہے خودداری
کہا کہ لاکھ تمنا ہو، التجا نہ کرے

جو پوچھا عشق میں کیا آرزو کو دخل نہیں
کہا کہ بھول کے ایسی کبھی خطا نہ کرے

جو پوچھا شیوۂ محبوبِ دلربا کیا ہے
کہا کہ وعدہ تو کر لے، مگر وفا نہ کرے

جو پوچھا ہوشربا کون ہے ادا، تو کہا
سنائے پردے سے آواز، سامنا نہ کرے

جو پوچھا سچ ہے یہ کیا، جذب ہے محبت میں
کہا غلط ہے، اگر ترکِ مدعا نہ کرے

آثر لکھنوی

شاعرِ ہندوستان

اے حریفِ بخت خفتہ، شاعرِ ہندوستاں   تاکجا یہ رنگِ غفلت، تاکجے خوابِ گراں
ترک کر بُلبُل کا قصہ۔ چھوڑ گُل کی داستاں   نغمۂ حُسن و محبت تاکجا وردِ زباں
کیا زمیں بدلی نہیں، کیا آسماں بدلا نہیں!
ہاں مگر تیرا ابھی رنگِ بیاں بدلا نہیں

صاحبِ ثروت کی آخر مدح خوانی تاکجا   اہلِ زر کی شان میں رطب اللسانی تاکجا
سوزشِ پروانہ پر آتش بیانی تاکجا   شمع کی توصیف میں شعلہ زبانی تاکجا
فائدہ دنیا کو کیا پہنچا تری تحریر سے
اب بدل دے قوم کی قسمت کسی تدبیر سے

دیکھ حالت ملک کی غافل نگاہِ غور سے   سابقہ آکر پڑا ہے قوم کو کس دَور سے
خود ہے تُو ذی فہم، سمجھائیں تجھے کس طور سے   ننگ ہے تیرے لئے، پوچھے اگر تُو اور سے
ایک عالم میں مسلّم ہے تری فرزانگی
کس لئے پھر واقعاتِ حال سے بیگانگی؟

تُو اگر چاہے تو پیدا ہو جہاں میں انقلاب   تو اگر چاہے تو ذرّے کو بنا دے آفتاب
شاہدِ مقصود کا رُخ ہے حجاب اندر حجاب   اب خدا کے واسطے غافل اُلٹ بھی دے نقاب
جذبِ اُلفت سے بدل دے حُسن کا دستور تو
سب کو بے پردہ دکھا دے جلوۂ مستور تو

ہم نے مانا، وقت اپنا تو کبھی کھوتا نہیں!   رات کو فکرِ سخن میں بسترِ سوتا نہیں
پھر بھی ہونا چاہیئے جو کام وہ ہوتا نہیں   بھول کر بھی قوم کی حالت پہ تو روتا نہیں

وہ صدا نکلے ترے بیتاب دل کے ساز سے
جاگ اُٹھیں سونے والے آہ کی آواز سے

بھول کر دل میں نہ لا بغض و تعصب کا خیال چھوڑ دے، ہاں چھوڑ دے ہندو مسلماں کا سوال
مُلک کی حالت ہے ابتر۔ قوم کا ہے غیر حال اب نہ کر بہرِ خدا ہندوستاں کو پائمال
ہاتھ کانوں پر نہ رکھ ظالم اذاں کی یاد سے
شور و ہنگامہ نہ کر، ناقوس کی فریاد سے

ایک دُنیا ہے ازل سے ماننے والی تری ہوش میں اپنے نہیں آتی ہے متوالی تری
رو رہے ہیں دیکھکر ہم آج بدحالی تری کیا ہوئی ہاں کیا ہوئی وہ ہمتِ عالی تری
منھ چھپا کر بزم سے خلوت میں روپوشی تری
اے ستمگر کس لئے یہ مصلحت کوشی تری؟

رہنمائے قوم سب کہتے ہیں تیری ذات کو کیوں صداقت سے عیاں کرتا نہیں جذبات کو
کس طرح سمجھے کوئی افسوس تیری بات کو رات کو جب دن بتائے، دن کہے تو رات کو
ہے زباں پر اور کچھ، دل میں مگر کچھ اور ہے
راست گوئی، حق شعاری کا یہی کیا طور ہے؟

ننگِ دُنیائے ادب، فکرِ سخن ہی چھوڑ دے بارِ خاطر اب نہ بن، تو انجمن ہی چھوڑ دے
جب نہیں الفت چمن کی تو چمن ہی چھوڑ دے بیخبر ہے گر وطن سے تو وطن ہی چھوڑ دے
قدر جب دل میں نہیں، ہندوستاں سے کیا غرض
کافرِ نعمت کو اس جنت نشاں سے کیا غرض

کاش تجھکو افتراقِ ملک کا احساس ہو قوم کے مٹتے ہوئے ناموس کا کچھ پاس ہو
شوق بے پایاں ہو باسط، دُور دل سے یاس ہو دیکھ کر تیری اُمنگیں ہم کو بھی کچھ آس ہو
رنگِ ہمدردی دکھا، کچھ جذبِ دل سے کام لے
چھیڑ وہ نغمہ کہ اک دنیا کلیجہ تھام لے!

باسط بسوانی

رفتارِ وقت

صوبہ سرحد!

صوبہ سرحد میں کانگریسی انقلابِ وزارت ماہِ مختتمہ کا ایک مہتم بالشان سیاسی حادثہ ہے۔ ہندوستان کے چھ صوبوں میں کانگریسی دَورِ حکومت کے قیام کے بعد یہ اُمید کافی معقول سمجھی جاتی تھی کہ اس کے آغاز کردہ فیاضانہ و رعیت پرورانہ نظم و نسق کا پُر نور نظامِ شمسی بعض دوسرے صوبجات کے سیارات کو بھی اپنے قوی حلقۂ جذب (Orbit) میں کھینچیگا! یہ توقعات کچھ خود بینی کا نتیجہ نہ تھیں۔ خود بعض معتدد اینگلو انڈین اخبارات نے اسی مُبشّرانہ سیاسی پیغمبری کی شان سے اپنے کو پیش کیا تھا! تاہم یہ حوصلہ و داعیہ کم لوگوں کو تھا کہ حُریت و سعادت کی شعاع کا آئندہ مطلع پشاور بنے گا۔ اس کے یہ معنی بھی نہ سمجھئے کہ ہم سرحد کو کوئی ایسا بد توفیق خطۂ وطن سمجھتے تھے! حاشا و کلا! سچ تو یہ ہے کہ گزشتہ پانچ چھ سال کی وطنی سیاسیات کے کارزار میں صوبۂ مذکور صفِ اول کا موقع حاصل کر چکا ہے! لیکن جنگگاہ قومیت کے اس مخصوص گوشے کی کوئی فتح اس قدر محبوب آرزو تھی ــــ نیز بساطِ سیاست کے اس "مِل نشستہ" خانے کے گرداگرد "فرزین" قیصریت کی شاطرانہ قلعہ بندی کچھ اس درجہ بے پناہ واقع ہوئی تھی! ــــ کہ محض انہی وجوہ سے سارے سازگار آثار کے علی الرغم، ہم اس نعمتِ نادرہ کے نزول کے پیشگی اعلان میں اپنے کو گرفتارِ بیم و رجا پاتے تھے! اگرچہ اب ہم اپنی سابقہ اُمید و اثق اور اس کے بر آنے پر اپنی عمیق مسرت ہر دو کا بیک وقت یوں اظہار کرتے کہ ؎

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر میخواست
آخر آمد ز پسِ پردۂ تقدیر پدید!

سیاسی اُفق کے مظاہر کے علاوہ اگر کوئی لطیفۂ غیبی اس واقعۂ شگفت کے اندر کارفرما نظر آتا ہے۔ تو وُہ سرتاجِ سرحد" خاں عبدالغفار کی خدماتِ جلیلہ اور اُن کا "ایثارِ مردانہ" ہے جس کا شایانِ شان اجرِ سُنت الٰہی نے دیا ہے بہ مصداقِ "کذالک نجزی المحسنین"!

ادارۂ کلیم

لاریب کہ صیادِ سرحد کا یہ پہلا "بڑا شکار" ہے۔ جو اس نے جلیانہ کی "کچھار" سے نکلکر مارا ہے! آج ان کا پرچم اقبال اُتنا ہی سربلند ہے جتنی کہ خود اُن کی "قامت شاہانہ"! خان بلاشبہ آج "خانِ خاناں" ہے اور خان کے برادرِ معظم، "ڈاکٹر خان" آج صوبہ سرحد کی حکومت کے وزیرِ اعظم بن کر "خانِ اعظم" نظر آتے ہیں! اللہ اللہ ان دو خدائی خدمتگاروں کی شانِ مخدومی! ؏

آں کہ خدمت کرد او مخدوم شُد!

باخبر حلقوں کی دوسری بشارت یہ ہے کہ صوبۂ سرحدی کے بعد کانگریسی سلطنتِ "ہند" اب آسام کی آئینی تسخیر و الحاق کا عزم رکھتی ہے! گویا اس طرح ہمارے "ہمالہ والے سنتری" کے "دونوں بازو" کانگریس کے "کمان افسر" کے اشارۂ چشم و ابرو پر متحرک ہوا کریں گے! اللہم زد فزد!

کیا ہم اُمید کریں کہ سرحد اور آسام کے بعد بنگال اور پنجاب اس جلوسِ فتح میں شرکت کرکے ہواخواہانِ وطن کو شاد کام کریں گے؟ ؏

آ ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک

جزائر انڈمین کے یارانِ زنداں

کالے پانی کے "سیہ بخت" سیاسی قیدیوں اور جلاوطنوں کی طرف سے مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کی اپیل پر، اپنے "مقاطعہ جوعی" (hunger-strike) کا ترک، اور اپنے "شربِ ہیبت انگیزی" کو خیرباد گوئی، ہندوستان کی تحریکِ آزادی کی تاریخ کے ایک انقلابی مرحلے کا نشان

راہ سمجھی جانی چاہئے، بنگال میں یہ سیاسی حربہ وہاں کے "سلف صالح" کی اک مقبول سُنت کی حیثیت حاصل کرچکا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ معرکۂ حریت کے فتح مندانہ اختتام ہی پر وہ اس ہتھیار کو اپنی کمر سے کھولیں گے! ہیبت انگیزی کے دلدادگان کو اس آلہ کی قاتحکاری پر پورا ایمان تھا۔ بظاہران کے دماغوں میں فن انقلاب کے اس فلسفے — "اصلاح بذریعہ اسلحہ" — کی تشکیل پذیری ایک کافی متوقع نشو ونما تھی! ہم دُنیا کی سیاسی تاریخ جدید میں کم وبیش بلاناغہ اس عنصر کو کارفرما دیکھتے ہیں! خود "جدید بنگال" کی تعمیر میں اس کی تخریب کا کافی دخل پایا جاتا ہے! بایں ہمہ آج ہم ان ہی مُبارزانِ سرکف کی زبانوں سے ہیبت انگیزی کی معزولی کا اعلان سُنتے ہیں۔ اور اک خاصے سیاسی معمے سے دوچار نظر آتے ہیں!

کیا بات یہ ہے کہ بنگال کا نوجوان زبان حال سے یہ کہہ رہا ہے کہ:۔

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسد

جس دل پہ ناز تھا مجھے، وہ دل نہیں رہا

حاشا کہ نہیں!

پھر کیا وہ اس بدمست تصوف کی افیون کا لذت چشیدہ ہوگیا کہ ؎

میازار مورے کہ دانہ کش است

کہ جاں دارد و جانِ شیریں خوش است

یقینًا یہ بھی نہیں!

بات یہ ہے کہ ہم بعض طریقے یوں بھی اختیار کرلیتے ہیں کہ وہ "بہترین" نہیں ہوتے۔ لیکن ایک وقت خاص کے تمام دوسرے مروجہ طریقوں میں "بہترین ممکن" ہوتے ہیں! مادرِ بنگال کے نوخیز سپوتوں کا زاویۂ نگاہ اپنی مزعومہ ہیبت انگیزی کے متعلق یہی تھا! جب مہاتما گاندھی نے اپنے عدم تشدد ومقاومت مجہول وتنالعبت قوانین مدنی کو پیش کیا تو بنگالی علمبرداران انقلاب نے اپنی مخصوص مہم کو ہنگامی طور پر معطل کردیا تھا۔ اور گاندھی جی کے آلات کی قرار واقعی آزمائش کے لئے اک پُرسکون فضا بہم پہنچادی تھی! اس تحریک کے محاذ نے وقتًا فوقتًا اپنے بعض رخنے دکھائے۔ لیکن حقیقۃً جزوی ووقتی امید شکنیوں کے لئے "نان وائلنس" اتنی ذمہ دار نہ تھی جتنی کہ اس تنظیم جدید کی نارسیدگی! اب عدم تشدد ہی کے جھنڈے کے سائے میں ماضی قریب کی کانگریسی جدوجہد اک نظر افروز فتح ونصرت کے مناظر سے بارور ہوئی۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہاں بھی کامیابی کا سہرا اس قدر عدم تشدد کے سر نہیں جس قدر کہ عام نظم وتنظیم، تعلیم وتلقین، اشاعت ورعایت، توسیع نظام کانگریس وافتتاح مزید مراکز کار، آغاز ارتباطِ شہر ودیہات وقیام رابطۂ عوام وتالیف قلوب جمہور کے کارہائے کے سر تھا! انڈمین کے بلاکشان زنداں وشیفتگان "بزن وشکن" کو انہی توطہید اخرالذکر سرگرمیوں اور کارگزاریوں نے اپنا مُرید بنایا ہے اور وہ بے تکلف ان کارناموں پر اپنی نذرِ دل پیش کرچکے ہیں اور کیوں نہ کریں! ؎

ابن مریم ہوا کرے کوئی

میرے دُکھ کی دوا کرے کوئی!

پس جانبازانِ بنگال کا ترک واختیارِ مسلک ہردو نہایت مخصوص ومشروط چیزیں ہیں! یہ ہے ہماری تعبیر ان تازہ بتازہ نونہو مظاہر سیاسی کی!

بلاشبہ یہ نوجوان اپنے جدید رابطۂ کانگریس سے عدم تشدد کے التزام کو خارج نہیں کرتے، لیکن اس کی اہمیت ایک ثانوی درجہ رکھتی ہے یعنی ایک پُرامن ماحول کے بغیر خود تحریک مزدوران وکاشتکاران کی وہ پرورش وپرداخت نہیں ہوسکتی جو اب ایک "غیر خونریز خاموش انقلاب" کی بشارت سُنا رہی ہے! ہر انسان اور ہر ذی الحس نوجوان کی طرح فرزندان بنگال بھی امن وسکون کے خواہاں تھے۔ لیکن جب بقول مہاتما گاندھی کے، "امن وامان" "زنانخانہ کے سکون" کے ہم معنی ہوجائے تو ہر غیور وناشکیبا مرد وطن بادل ناخواستہ اس سے روگرداں ہو ہی جائے گا! ؎

سخن کوتہ، مرا ہم دل بتقویٰ مائل ہست اما

زننگِ زاہد افتادم بہ کافر ماجرائیہا! (۱۰۱خ)

زنجبار کا قضیہ!

زنجبار میں برطانوی استعمار اور انگریز مُلوک التجار کی دست بُرد سے جو صورت حال پیدا ہوگئی ہے اس کے عام اخباری تفصیلات سے قارئین واقف ہوچکے ہوں گے۔ آئیے اس ماجرے میں جو معنویت مُضمر ہے تھوڑا اس کا مطالعہ کریں!

زنجبار کوئی منقطع، انفرادی معاملہ نہیں ہے! حقیقۃً مغرب ومشرق

کی عام کشمکش کے کثیر التعداد اور مختلف المقام مظاہر ہیں سے ایک مظہر ہے! ہم قبل ازیں برما میں برمی اور ہندوستانی تجارت کی یورپین اغراض کی طرف سے اسی قسم کی گلوگیری کی نظیر دیکھ چکے ہیں! خود جنوبی افریقہ، ایشیائیوں اور خصوصاً ہندوستانیوں کے خلاف معاشی بندش و اخراج کے فتنے کا سرچشمہ بن چکا ہے! ہندوستان کے سواحل برطانوی تجارت بردار جہازی کمپنیوں کے "نباہکنوں" کے ہاتھوں نوخیز ہندوستانی جہازرانی کے بیڑے کی غرقابی خونچکاں منظر دیکھ چکے ہیں! اور اب جبکہ حال ہیں، بمصداق "ہر فرعونے راموسیٰ"، جاپانی تجارتی جہازات کے بحر ہند میں ہجوم نے خود برطانوی کمپنیوں پر سواحل ہند کی ساری وسعتوں کو تنگ کرنا شروع کیا تو اک جدید قانون کے ذریعے بچگان "ملکۂ بحر" (برطانیہ) کا تحفظ اسی سلسلے کی اک اور کڑی ہے! اور پھر ترجیح سلطنت اور "میثاقِ اوٹارا" تو ماشاء اللہ اس سرمایہ دارانہ "جنگ زرگری" کے ڈرامے کے معراج ہی ہیں!

یہ مظاہر کس پس پردہ حقیقت کی غمازی کرتے ہیں؟ آپ اس تشخیص کو بالکل چسپاں پائیں گے کہ یورپی معیشت عموماً اور برطانوی تجارت خصوصاً اب دنیا کے کھلے بازار کی بین الاقوامی رزمگاہ میں میدان داری کی سکت نہیں رکھتی! اس کی زندگی و سرسبزی کے لئے "تحفظ و ترجیح کے حسن پوش گملوں" کی ضرورت ہے! ساتھ ہی مشرقی تجارت و حرفت ایک حیات بعد ممات کے دور سے دوچار ہے جس کی نہضت کو دبانے کے لئے بھی مصنوعی شکنجوں کی حاجت ہے! لیکن سوال یہ ہے کہ اول الذکر "مغل شہزادی" "چمچے کے تغذیے" پر کب تک اپنی رعنائی کو قائم رکھ سکے گی؟ اور آخر الذکر نوزائیدہ "ترکن" کی بالیدگی نبرد وش میں اس کی حیثیت صدری کب تک حائل ہو سکیگی؟ نوخیز مشرقی تجارت و حرفت کی دھارے سے کہولت زدہ رہبانیت کوش مغربی معیشت اپنی خود ساختہ خلیجوں کی خلوتوں میں اب زیادہ دن تک مامون رہنے والی نہیں! ؂

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ

دنیا ہے تری منتظر روز مکافات!

سردست بھی ہم اہل ہند اپنے کو قابل مبارکباد ہی سمجھتے ہیں! ہم اگرچہ زنجبار میں بالفعل ہار گئے ہیں۔ لیکن شمّہ ہماری اک "فتح مبین" کا شاہد بنا ہے! زنجبار کی نوآبادیاتی حکومت اور "آل انڈیا مسلم لیگ" کا مین جانی "حی و قیوم"، صدر (مسٹر جناح) بیک وقت اس تماشائے سیاست میں برہنہ ہوتے ہیں! ؂

افشائے راز عشق میں گو ذلتیں ہوئیں

لیکن اُسے جتا تو دیا، مان تو گیا!

(ا-ا-خ)

چین و جاپان

چین اور جاپان کے درمیان جو شدید تازہ آویزش جاری ہوگئی ہے وہ بعض بالکل جدید خصوصیات سے ممتاز نظر آتی ہے۔ مثلاً چین ابکی دفعہ دبا نہیں۔ جاپان کے جانستاں مطالبات کا جواب اُس نے مانچوکو کے استرداد کے دعوے سے دیا! پھر جب جنگی کارروائی شروع ہونے کے بعد جاپان نے بزعم خویش "بزن و بگیر" والی اپنی رواں مشق کا آغاز کیا تو چین کے دست و بازو میں پہلی بار اُسے صلابت و غلظت کا احساس ہوا اگرچہ اپنے اس "افیونی ہمسائے" کے متعلق وہ اس غرور و غرے میں تھا کہ ؂

نہ خنجر اٹھے گا نہ تلوار تم سے

یہ بازو مرے آزمائے ہوئے ہیں!

لیکن ماضی کو مستقبل کا مستقل آئینہ دار سمجھنا اپنے غلبۂ اقتدار کو "خدائے لم یزل" کے ہمسر فرض کر لینے کے ہم معنی ہے! جاپان کا نشۂ پندار اب اسی "دیدہ بر دوختگی" کی منزل میں ہے! پسماندہ و افتادہ چین کی زبانِ حال کا یہ خاموش جواب جاپان کی متکبرانہ گران گوشی مشکل سے سن سکتی تھی کہ ؂

خاکساران جہاں را بہ حقارت منگر!

تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد!

اس میں شک نہیں کہ "گردِ چین" کے پیچھے "سرخ روس" کا "سوارِ اشہبِ دوراں" موجود ہے، لیکن یہ امر بھی اب ضرور مشتبہ ہے کہ "خاکسار جہاں"، چین بدستور سابق اک "خاکِ پامال" ہے! گزشتہ ایک عشرۂ سنین، بیک وقت چین کی کمزوری اور قوت آفرینی کا "دورِ عبوری" رہا ہے! بیس سال اُدھر جو چین اک پیر فرتوت تھا، دس برس گزرے کہ ایک "طفل نوخیز" سے بدل گیا، جو طفل نوخیز آج ایک "جوان بالغ" ہے!

جو نہ صرف یہ کہ سر خم کر کے جاپان کے جیت کھانے کے لئے تیار نہیں بلکہ گزشتہ چہل سالہ دورِ معنوی و مغربی کی ساری ضربات کا تقاضا وصول کرنے کا عزم رکھتا ہے! جو "افیون نوش"، چین آج اپنے فرزندوں کو افیون نوشی کی پاداش میں تختۂ دار پر کھینچ دیتا ہوا جس کے "زرد جسم" کے پورے نصف (مغربی) حصے میں کمیونسٹ "سرخ خون" رواں دواں ہوا! اور رگوں میں دوڑتے پھرنے کے بجائے "چشم کہ سے ٹپک پڑنے" کے لئے بیتاب ہو! جو چین ترک افیون کے بعد ایسا دلدادۂ "شراب احمر" ہو اُسکو "چنگیزان جاپان"، کا ایسا صید زبوں سمجھ لینا جیسا کہ مسٹر ہیروٹا، جاپانی وزیر جنگ نے سمجھا ہے، سوائے اس کے کیا معنی رکھتا ہے کہ یہ ہماری نہ صرف آرزو ہے، بلکہ آثار تک کی تقریباً غیر مشتبہ تشخیص، کہ چین و جاپان کا کا موجودہ تصادم مشرق بعید کی تاریخ میں ایک انقلاب کا افتتاح بننے والا ہے ے

با ضعیفاں گاہ نیروئے پلنگاں میدہند
شعلۂ شاید بروں آید ز فانوس حباب
انقلاب! انقلاب اے انقلاب (ا-ا-ر خ)

دریاؤں کی تربیت!

چودھری مختار سنگھ صاحب، جو ہندوستان کے دیہات اور کاشتکار کی معاشی زندگی سے متعلق نہایت عرق ریز اور قابل داد تحقیقات و تصنیفات شائع کر چکے ہیں" ملک کے دریاؤں کی تربیت"، کے ایک نادر عنوان و بحث سے وطن کے ارباب حل و عقد کو روشناس کرتے ہیں! وہ ہم کو بتاتے ہیں کہ انسانی معیشت میں ایک ایسی چیز بھی وجود رکھتی ہے جسے ہم "ندیوں کے سدھانے"، کی اصطلاحی ترکیب سے تعبیر کر سکتے ہیں! اس اجمال کی کچھ تفصیل ملاحظہ فرمائیے!

دریا اک ملک کی معاشی زندگی میں ایک نہایت حیات پرور عنصر کی حیثیت رکھتے ہیں! وہ صحن سرزمین کے پانی کی نکاسی کی نالیاں ہیں! چمنستان کشت زار کی آبجوئیں ہیں! حمل و نقل اسباب تجارت اور سیر و سفر مسافران کی کشتیوں کی سواریوں کی آبی سڑکیں ہیں! اُن کے سواحل بحری دریائی جہاز رانی و کشتی سازی کی حرفت گاہیں، شکار ماہی کی جولانگاہیں، عالم آب کی سیر کے رستے مقدس مقامات کے حرم، اور دریائی تجارت کے بنادر ہوتے ہیں!

لیکن ان عظیم خدمات کی انجام دہی سے قبل، دریاؤں کو ان فرائض کی بجا آوری کے لئے تیار کرنا ہوتا ہے! یا اگر وہ قدرتاً ہی "حدود الٰہی" کے اندر واقع ہوئے ہیں تو ان کے مزاج کے فطری اعتدال کا تحفظ رکھنا پڑتا ہے! اس لئے کہ بہت سے اسباب ہیں جو دریاؤں کے "توازنِ اخلاط" کو درہم برہم کر دیا کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں دریاؤں کی نگرانی سے قرار واقعی طور پر عہدہ برا ہونے کے لئے پورے "اتالیق"، بلکہ ایک پورے "مشیر طبی"، کے فن لطیف کی سی احتیاط مرعی رکھنی پڑتی ہے! چنانچہ جن طوفانی دریاؤں پر بند باندھ کر ان کی "عناں گیری" کر لی جاتی ہے، اس پابہ زنجیر حالت میں بھی اُن کی زنجیر شکنی کی تگ و دو کا بڑی نظر بازی سے مشاہدہ و مطالعہ کیا جاتا رہتا ہے! دریائی انجینئرنگ کے اس شعبے کا نگراں کار افسر "دریا کا نباض" (Pulse feeler) کہلاتا ہے! الغرض دریاؤں کا معاملہ بڑا نازک واقع ہوا ہے۔ قدیم غیر سائنٹفک زمانے میں دریاؤں کے معاملے میں ہمارا "مبدم باامن و ہر لحظہ گریزاں از من"، والا معاملہ اس سے زیادہ ارتقا یافتہ نہ تھا کہ ے

بدریا در منافع بے شمار است
اگر خواہی سلامت بر کنار است!

لیکن آج صحراؤں میں رینگنے اور پھنکارنے والے ان مہیب اژدہوں"، "کوکیل" دیا گیا ہے اور اب عموماً "فطرت کے یہ خادم، مطلق العنان آقا" نہیں بنا کرتے! تاہم دنیا کے متعدد غیر ترقی یافتہ ملک اس کلیے کے افسوسناک مستثنیات بنے ہوئے ہیں!۔۔۔ از انجملہ ایک ہندوستان ہے!

دریاؤں کی عظیم تعمیر نیز اُن کی قاہر تخریب، مادر ارض کے جغرافیہ و تاریخ کے روشناس عالم مناظر اور شہرہ آفاق حوادث ہیں! مصر یا وادی نیل، یکسر دریائے نیل کی قدرتاً منظم و منضبط سالانہ (باراں نما!) طغیانیوں کا ساختہ و پرداختہ ہے۔ چنانچہ وہ بجا طور پر "عطیۂ نیل" کہلاتا ہے! اور خود یہ مجازی پروردگار مصر "سقائے نیل"! سعدی شیرازی کا یہ شعر قابل نقل ہے ے

چنیں یاد دارم کہ "سقائے نیل" نکرد آب بر مصر سالے سبیل

"بہشتِ شداد" اور "نوشیروانی بغداد" دجلہ و فرات کے "بین النہرین" کی آغوش مادری و پدری کے نونہالان تمدن تھے! ہندوستان جنت نشان،، کا جغرافیائی نام ہی "وادیٔ گنگ کا عمران،، ہے! عظیم چین کی "بہشتی مملکت،، دریائے یانگزی کی "ارضی کشت،، ہے! وسطی یورپ کا ڈینیوب، قلب روس کا والگا، امریکہ کا مسیسپی، کناڈا و ریاستہائے متحدہ کا مشترکہ دریائے سینٹ لارنس وغیرہ، مشرق و مغرب کی نوآبادیوں، تجارتوں، حرفتوں، اور تمدنوں کے نامور مرکز و ظرف ہیں!

تاہم تصویر کا دوسرا (تاریک) رخ بھی موجود ہے! ہم صرف ایک مثال پر اکتفا کریں گے۔ شمالی چین کے دریائے ہوانگ ہو کو لیجئے۔ جس کی وارستگیٔ تباہ کاری کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے جوشِ جنون کے دوروں کے وقت پان پان سو میل اپنے دھارے اور راستے کو بدل دیا کرتا ہے! ایک بحیرے کو چھوڑ کر دوسری خلیج میں جاکر بحر اعظم سے ملاقی ہوتا ہے! اور اپنی ان عالم آشوب آوارگیوں کے نتیجے میں "چین کا عذاب،، کہلاتا ہے!

ہندوستان کی ندیوں، کی چال ڈھال بھی ایک عرصے سے بگڑی ہوئی ہے! یہ برٹش راج کی "سبز قدمی،، کے کچھ قدم بقدم رہی ہے! بنگال کے مانسونی سیلاب وہاں کا سالانہ باضابطہ نیچر کا پروگرام بن گئے ہیں! ہر برسات بنگالے کے اہل دیہات کے لئے اک "بارانِ زحمت،، لاتی ہے! یہ کیا ستم ظریفی ہے؟!

ماہرین کا بیان ہے کہ یہ آفتِ سماوی دراصل اک "آفتِ ارضی" ہے۔ بنگال اور دوسرے انقطاع ملک کے دریاؤں کے راستوں کے اُتار چڑھاؤ کو سرکاری سڑکیں، نہریں، ریلیں، پل، اور پشتے وغیرہ بنانے والے انجینیروں نے تہ و بالا کر دیا ہے اور یہی گندہ گرا بچا و بندہ" سرگرمیاں زرعی بنگال کی اک ہمہ گیر، لامتناہی مصیبتیں بن گئی ہیں! بعض خطوں میں جنگلوں کی بے اصول و لاابالی قطع و برید نے بھی طوفان کی رسی ڈھیلی کر دی ہے! یہ تباہیاں فصلوں کی خرابی، انسان و مواشی کی غرقابی، دیہات کی دریا بُردی وغیرہ ہی پر محدود نہیں ہیں، وہ بکثرت اوقات زمین کو زراعتی صلاحیتوں سے بھی مستقلاً عاری کر دیتی ہیں!

حسب تجویز چودہری مختار سنگھ صاحب، ضرورت ہے کہ، ترجیحاً کانگریسی وزارتوں کے دورِ مسعود ہی میں، اک مقتدر کمیٹی ماہرین کی مامور کی جائے کہ وہ عین موسم باراں میں ایک قرار واقعی فنی تحقیقات ہمارے شتر بے مہار دریاؤں پر انجام دے، انہیں تخریبی عناصر فطرت کے بجائے تعمیری سرچشمہائے معیشت میں تبدیل کروا دے۔ انہیں ندیوں کی مزید نگرانی و صفائی وغیرہ کے ذریعہ انہیں عہد حاضر کے "لانچوں،، کی گردش کے قابل بنائے، اور اس طرح ہمارے اک قدیم ذریعہ حمل و نقل اور وسیلۂ سفر و خبر کو از سر نو زندہ کرے، اور ہمارے دریاؤں کے سواحل پر آباد شہروں کو اُن کی سابقہ تجارتی و حرفتی سرسبزی پر بحال کرے، نیز ہندوستانی تمدن و مذہب کے ان مراکز کو اُن کی عظمت رفتہ واپس دلائے! س ع

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است
تو بدیں آرزو مرا برساں! (ا-ا-خ)

بحرالروم کا میدانِ حشر

بحرالروم، جو اپنے انگریزی جغرافیائی نام میں "میڈی ٹرینین سی،، ("بحر متوسط") کہلاتا ہے، اس وقت یوروپین سیاست کے مرکز ثقل بنجانے کی وجہ سے تاریخاً بھی بہم اصلی ہوگیا ہے! اطالیہ کی فوج کشی در فتح حبش، برطانیہ کے لئے جس علت خاص کی بنا پر اہم و موجب فکر تھی، اسمیں "شاہ نجاشی،، — ہیل سیلاسی ("دہول تثلیث") — کی دوستی و ہمدردی تو محض اک مفت کرم داشتن ہی تھی، لیکن "مطلب سعدی،، یہ تھا کہ بحرالروم، جو برطانوی "سلطنتِ ماورائے بحر،، کو انگلستان کے سرِ سلطنت سے پیوستہ کرنے والے خطوطِ مواصلات کی "شہرگ،، کی گردن واقع ہوا ہے، اس کے امن و تسلط پر بحیرۂ احمر کے تقویت یافتہ اطالوی مراکز بحری کی طرف سے شہ پڑتی تھی! بدقسمتی یہ ہے کہ یہ شہ اب "ملکہ بحر،، (برطانیہ عظمیٰ) کے لئے "شہ مات،، بنا چاہتی ہے! بحرالروم میں اٹلی نے اپنی جنگی طاقت کو آنا فانا المضاعف کر لیا ہے۔ آج مسولینی جو اپنے کو جولیس سیزر کا بیسویں صدی والا اوتار سمجھتا ہے، بحرالروم کو لفظاً و معناً "بحرالروم،، بنا لینے پر مُصر ہے! وہ کہتا ہے کہ انگلستان

کی بحری تجارت کو اس بین الاقوامی آبی شاہراہ سے گزرنے کا اخلاقی حق بلا شبہ حاصل ہے، لیکن سیاسی اقتدار اور حربی تسلط کے اعتبار سے بحر الروم نوظہور سلطنت "ردمتہ الکبریٰ" کے باب عالی کا "پیش دروازہ" ہی ہے! جدید "عظیم تر ایطالیہ" اپنے اس حوصلے کو عملی عزائم کی بہت سی منزلیں طے کرا چکا ہے! اس نے ہسپانوی مراکش کے نقطۂ سیوٹا پر اپنا پرچم اثر گاڑ دیا ہے، جو آبنائے جبل الطارق والے بالمقابل ہمنام بحری مستقر کے ہاتھ سے بحر متوسط کی کلید "چھین چکا ہے" اسپینی جزائر بلیارک اور ایطالوی "الجزائر" کے سواحل کے قریب کے اک اور نو قلعہ بند جزیرے کے قبضہ کے ذریعے "برطانوی مالٹا" سے اس کا سارا طلسم سلب کر چکا ہے! پھر مشرقی بحر الروم کے گوشے میں جزیرہ رھوڈز کی بحری تعمیر و استحکام کی معرفت قبرص و اسکندریہ وغیرہ کو چیلنج کر رہا ہے اور پھر بحر متوسط کی وسیع عربی دنیا میں "ناصر الاسلام" بنکر برطانیہ کے کبھی کے ابلہ فریب دعوے دربارۂ "عظیم ترین اسلامی دولت" کے سحر کا رد سحر کر چکا ہے! جس کے افسون کی تکرار نے ابھی تک مصر، شام، اور فلسطین کو کم از کم نصف آزاد کرا دیا ہے۔ اور اب الجزائر و مراکش و ٹیونس کے فرانسیسی و ہسپانوی "زندانوں" کے اندر نوخیز عرب تحریکات حریت کا "جنون" پیہم زنجیر در کھڑکا رہا ہے!

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ برہم زن "انقلاب یوروپ" ناگہاں کیسے برپا ہو گیا؟ شیر انگلستان کو کیا ہو گیا، جو "باورچی ایطالویوں" کی بیباک چٹکیوں سے اپنی مونچھیں اینٹھوا نے پر بقول اخبارات مسولینی، گرجنا ایک طرف، چھینکتا تک نہیں!" یورپ کی "تھرڈ کلاس" طاقت" (اٹلی) آج "عظیم روم" کی نہضت کا محیر العقول کرشمہ کیسے دکھا رہی ہے! بے پناہ جرمنی کا سر کچل دینے والا فرانس ہیجیرز ایطالیہ سے کیوں لرزہ براندام ہے!

در اصل یہ انقلابی حوادث اس قدر "انقلابی" نہیں جس قدر کہ نظر آتے ہیں! حیرت و ناگہانیت کے مظہر یہ واقعات نہیں، ہماری بیخبری دگراں گوشی ہے! "پس پردہ"، کتنی "بازیہائے پنہاں" ہوتی ہیں جو عرصے سے پرورش پاتی رہتی ہیں اور ہم ان کے بے نقاب بروز کو ان کا اولین ظہور کہنے کی لغزش زبان میں گرفتار ہو جاتے ہیں!

برطانیہ عظمیٰ پر مدت سے ایک دور کہولت اور سن شیخوخت طاری ہے۔ جرمنی و اٹلی گزشتہ نصف صدی سے نوجوانی کا لنگر لنگوٹ کس رہے ہیں! جاپان نہ معلوم کب سے مشرق کی فتح کا پرچم اڑا رہا ہے! امریکہ "ملکہ بحر" کی شہ نشین سے قبل ازیں انگلستان کو معزول کر چکا ہے! اور پھر شاید "سرخ روس" تو محفل عالم میں ایک "نو بنو تمدن بشری" کی دعوت لئے ہوئے، مسند نشین محلس بن چکا ہے! ترکی کی "نزکی تمام" ہو جانے کے بعد قسطنطنیہ کا مرد بیمار کبھی کا "انقرہ کا مرد قوی" بن چکا ہے! اور ہاں سرزمین ہند و چین پر جو مناظر مدہشہ دیکھنے میں آئے ہیں ان کا عنوان جلی یہ ہے کہ ؎

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے!
"ہمالہ کے چشمے" ابلنے لگے!

پس یہ ہم اہل ہند کا خواب خرگوش ہی ہے کہ ہم دنیا کو غدر ۱۸۵۷ء کے بعد سے ساکن سمجھ چکے ہیں! بقول مسولینی کے "تاریخ عالم چلتے چلتے رک نہیں گئی ہے!" اور "انگریز لوگ خدا نخواستہ خاتم الاقوام نہیں ہیں!"، ایسی خوش فہمیوں میں انسان اس سے پہلے بھی مبتلا رہا ہے! لیکن بالفاظ "خضر مشرق"، شیخ سعدی کے دریائے دجلہ بدستور ع

پس از خلیفہ بخواہد گزشت در بغداد!

لوح تقدیر کبھی کی بے نقاب ہو چکی ہے! اب یہ ایک راز فاش ہے کہ انگلستان و فرانس کے بعد براعظم یوروپ کی کارروان سالاری جرمنی و اٹلی کو حاصل ہونے والی ہے! سویٹ روس غالباً ایک نیم مغربی اور نیم مشرقی طاقت کی حیثیت سے اپنے ایک جداگانہ منصب پر قابض رہیگا، اور ہٹلر و مسولینی اپنے عارضی تخریبی دور عبوری کے خاتمے اور براعظم کے میدان کے تخلیئے کے بعد شاید روس کے "پرو لتاری عمران" کے جلوس رواں کے لئے سڑک صاف کرنے والے ثابت ہوں گے! جدید العہد جرمن اور اطالوی ہماری ہندوستان کی تاریخ سابق کے "مرہٹے اور سکھ" بنتے نظر آتے ہیں! درآنحالیکہ "برطانیہ عظمیٰ"، بادشاہ بخیر عالمگیر کے بعد کی "سلطنت

مغلیہ" کے تاریخی ڈرامے کے پارٹ کو کھیلنے والی ہے! جرمنی کا "نازی ازم" اور اٹلی کا "فاسیزم" اس وقت کے مہاراشٹر اور پنجاب کی "ترائوں جنگ" کا عین تاریخی مثنیٰ نظر آتا ہے! شاید موجودہ روس اس وقت کے انگلستان کی تاریخ کو دہرائے! اور ان دوسرے اور تیسرے درجے کے تمام تابناک عناصر" سے مطلع صاف کرا کے ایک بشری تہذیب کے "آفتاب جہاں تاب" کے مطلع الانوار کی جلوہ گاہ بنے!! ع

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ، دنیا کیا سے کیا ہوجائیگی!

(ا-ا-خ)

نقد و نظر

(ادارہ)

"نیساں" الہ آباد یونیورسٹی اُردو ایسوسی ایشن کا رسالہ قامت کتابی، ضخامت ۹۶ صفحات، ورق ٹائٹل، فیروزی، چرم نما کاغذ کا، قیمت فی پرچہ آٹھ آنہ،

نیساں ایک درجۂ اوّل کا علمی وادبی وتنقیدی مجلہ ہے - جو مغز سیرت کے ساتھ ساتھ نقاب صورت بھی دیدہ زیب رکھتا ہے! چنانچہ کاغذ وکتابت وطباعت اور مضامین ومقالات کی معنویت سب عموماً بلند پایہ واقع ہوئی ہیں! تاہم ہمیں یہ کوئی "بدعت حسنہ" نظر نہ آئی کہ رسالے میں اگرچہ "جلد" ہے "شمارہ" ہے، سنہ (۱۹۳۶ء) ہے، لیکن "مہینا" ہی نہیں ہے! کیا "تا تب مدیران" کی طویل فہرست، کا "سلسلة الذہب" اس پر کچھ روشنی ڈالے گا؟ ایک اور ستم ظریفی یہ دیکھی کہ فہرست مضامین کی نظم ــ "ہم کون ہیں؟" ـــ از پروفیسر فراق، اصل متن سے غائب ہے! وائے حسرت کہ "ہم کون ہیں" اس میں گم ہوکر رہ گیا کہ "ہم کہاں ہیں؟" "ادبی رسوم وقیود اور ذہنی انقلاب" اور "جدید اردو شاعری" اہم مقالات ہیں! نیساں اُردو "موقت ادبیات" میں ایک معزز نشست رکھتا ہے! (ا-ا-خ)

ماہنامہ "ہندوستانی" عام رسالجاتی سائز، ضخامت ۵۰ صفحات کاغذ وکتابت وطباعت درجہ دوم کی۔ مع ایک تصویر آرٹ پیپر پر، چندہ ؏ پتہ عزیز منزل مراد آباد

ایک اوسط درجے اور متعارف قسم کا "علمی، ادبی، ماہوار" رسالہ ہے، جو جناب رشید کمالی ایم-اے کی چیف اڈیٹری میں اور سر محمد یعقوب، ایم ایل اے کی "سرپرستی" میں نکلا ہے! ع

ہوئے تم دوست جسکے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو!

ہم بصد ادب جناب رشید کمالی صاحب کی خدمت میں عرض کرینگے کہ اخلاقی رشد وہدایت اور فنی تکمیل وکمال، نیز ادبی پاکیزگی دیسلوٹی سب کے متفقہ، ناقابل رجوع مطالبہ یہ ہے کہ ہم سروں کی سرپرستیوں "کے سایۂ ہما" سے بے نیاز ہوجائیں! ع

ترا ز کنگرۂ عرش میزنند صفیر   ندامت کہ دریں دامگہ چہ افتادست؟

رسالے کے دو مجوزہ شعبوں "باغ نسواں" "شاخ سبز" - سے ہم ومقدم ہندوستانی کو ایک بیخ حقیقت اور تنہ استقامت کی ضرورت ہے ہمارے نزدیک ادب انسان کی ارضی شریعت کا دوسرا نام ہے جس کا مہبط وحی خود اُس کا طور دل ہے! بہرحال رسالہ مستحق ہمت افزائی ہے! (ا-ا-خ

"اقدام" ایک نواشاعتی ہفتہ وار اخبار از کوہاٹ قامت درمیانہ ضخامت ۸ صفحات، مدیر خیر محمد جلالی، چندہ سالانہ للعہ قیمت فی پرچہ ار

مادی بے سروسامانی جو اعلان حق کی آواز کے ابتدائی مراحل کے شامل حال ہوا کرتی ہے، اس ہمعصر کی ساری صورت پر برستی ہے لیکن اس ابر غربت کے نیچے سے حق وحریت کی برق خاطف بے طرح تڑپتی ہے - چنانچہ اخبار کا خوش

عنوان سراسر یہ ہے ؎

کیجئے نہ اندوہ پہ بسر یونہی زندگی اُٹھئے، اور اُٹھ کے اب کوئی اقدام کیجئے!

سرحد کے علاقے کے عوام و کاشتکاران کے ایک مجوزہ جلسے کے اشتہار کا

کا عنوان جلی و جلالی، یوں ہے -

اُٹھو! مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو کاخ اُمراء کے در و دیوار ہلا دو!!!

جس کھیت سے دہقاں میسر نہیں دانہ اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو!

"مولویت اور اسلام"، ایک پمفلٹ نما کتابچہ، از حاجی نبی احمد صاحب بریلوی قیمت ۴ر، چودھویں صدی کی مولویت - بخلاف صدر اول کے اسلام محمدی کے! - پر جو "علیہ ما علیہ" کہا جا سکتا ہے - اس میں کہا گیا ہے! یہ موضوع مقدس تو ماشاء اللہ شیخ کی "ریش دراز" ہی کے ہم طوالت واقع ہوا ہے لیکن کتاب کی "قامت کہتر" کی تلافی اسکے لہجہ "تلخ تر" نے کردی ہے جسمیں مولوی کا ناگفتہ بہ اعمالنامہ اشگاف بیان کیا گیا ہے۔ کبھی کبھی ہمیں خیال ہوا کرتا ہے کہ مولوی پر یہ لعن و طعن شاید قرین مصلحت نہیں اس سے مقاصد تلقین و اصلاح فوت ہو جاتے ہیں! لیکن یہ واہمہ دوسرے ہی لمحے ہمارے دماغ سے رخصت ہو جایا کرتا ہے یہاں اس مولویت و مشیخت کے مرض مزمن کو قابل علاج سمجھنا ہی یکسر "غلط تشخیص" ہے!

پس جرعہ دوا کے "خوش ذائقہ" ہونیکا سوال ہی خارج از بحث ہے! "مریضہ مولویت" کو ہمیں نوشدارو کے گلاس کے بجائے جام زہر پلانا ہے - پس اسلام کے ان "احبار و رہبان" کے خلاف جہاد کرنے میں جتنی شدت برتی جائے اتنی ہی مقتضائے حال کے مطابق ہے! ہمارا معاملہ مریض کے "جسم" سے نہیں ہے، اسکے "جراثیم" سے ہے! زیر تنقید کتاب کی تالیف و ترتیب میں غالباً یہی "در پس منظر" ملحوظ رکھا گیا ہے! قرن اول کا اسلام مولوی کی زندگی میں جیسا مجروح و مسخ کیا گیا ہے اُسکو "آخر الزماں" کے "مفاسد و فتن" سے متعلق چند احادیث نبوی ہی کے آئینے میں منظر کر کے دکھایا گیا ہے! مثلاً:-

(۱) وَیْلٌ لِاُمَّتِیْ مِنْ عُلَمَاءِ سُوْءٍ افسوس میری اُمت کی دُرگت علماء سوء کے ہاتھوں!

(۲) یَکُوْنُ فِیْ آخِرِ الزَّمَانِ عِبَادٌ جُهَّالٌ وَعُلَمَاءُ فَسَقَة جاہل نمازی اور بدکار عالم امت کے دور آخر کی دو لعنتیں ہوں گی!

(۳) عُلَمَاءُهُمْ اَشَرُّ مِنْ تَحْتِ اَدِیْمِ السَّمَاءِ! ان کے عالم آسمان کی سقف نیلی فام کے نیچے سیاہ کار ترین مخلوق ہوں گے!

(۴) یُوْشِكُ اَنْ یَّاْتِیَ عَلَیْكُمْ زَمَانٌ لَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُهٗ وَلَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اِسْمُهٗ! مجھے خوف ہے کہ تم پر ایسا ہی اس زمانہ آنے والا ہے کہ پیام قرآن کے بجائے صرف ایک رسم تلاوت، اور حقیقت اسلام کے بدلے میں محض ایک اسم اسلام ہی کا تبرک باقی رہ جائے گا!!

حیف گر در پس امروز بود فردائے! (ا - ا - خ)

"انکشاف موسیقی"، حصہ اول چھوٹی کتابی قامت ۵۶ صفحہ ضخامت، کتابت طباعت و کاغذ بدرجہ اوسط قیمت ۱۲ آنہ مصنفہ جناب ایس آر چاند صاحب

انکشاف موسیقی میں (حدید العہد) موسیقی ہند کے ہر اصول پر عالمانہ بحث و تنقید کی گئی ہے اور اس کو غلط ثابت کیا گیا ہے!"- اس اعتبار سے یہ ٹریکٹ بظاہر اپنی نوعیت کی سب سے پہلی کتاب ہی معلوم ہوتی ہے! ہماری قوم میں بیباک تنقید اور آزاد اجتہاد ایک قصہ ماضی ہو چکے ہیں، اسلئے اگر کوئی دل یا دماغ اس جوہر نادر کا ثبوت دے محض اس مردانہ اقدام کی بنا پر وہ خیر مقدم کا مستحق ہے! ہماری یہ جرأت رندانہ اپنے اندر صحت خود پیدا کریگی بشرطیکہ ہم سائنٹفک مزاج کے اخلاص سے خالی نہوں ؎

مباش اے رہ نورد عشق غافل از تپیدنہا کہ در آخر بجائے میرسد از خود رسیدنہا!

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ ہم اس کتاب پر صرف اک عامی ہی کی حیثیت سے کچھ لب کشائی کر سکتے ہیں اس لئے ہمارے اظہار خیال کو مروجہ موسیقی ہند کی اس تنقید کی تنقید سمجھنا بالکل بے محل بات ہوگی! لیکن اگر ہماری فہم عام اور زیر نظر کتاب کا عام رواں بیان اور خوش منطق استدلال کسی حد تک بنیاد فیصلہ سمجھا جا سکتا ہے تو یہ کتاب ملک کے فنی حلقوں میں با احترام پذیرائی کی حقدار سمجھی جا سکتی ہے۔

تفصیلات میں جانا نہ ممکن ہے نہ مطلوب، صرف یہ جامع ماحصل کافی سمجھئے کہ اس کتابچے میں ہندوستان کی قدیم موسیقی اور رائج الوقت گانے بجانے کے درمیان ایک تقابل کیا ہے اور اہل نظر کو دعوت دی گئی ہے کہ ؏

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا؟!

جناب چاند صاحب مجتہدانہ جرأت اور انسانی اعتراف بشریت کے جامع معلوم ہوتے ہیں دل اور دماغ کا یہ بڑا مبارک امتزاج ہے چنانچہ وہ اپنے الفاظ میں بار بار اس دعوت کی تکرار کرتے ہیں کہ ؏

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کیلئے! (ا - ا - خ)

ہمایوں

۱- ہمایوں - اتنا پابند وقت ہے کہ جنوری ۱۹۲۲ء سے لیکر جب یہ جاری ہوا تھا) آجتک کبھی اس کی اشاعت میں ایک دن کی تاخیر بھی واقع نہیں ہوئی اُردو صحافت میں اس سے قبل ایسی باقاعدگی کی مثال نہیں مل سکتی۔

۲- ہمایوں - آنریبل جسٹس میاں محمد شاہدین صاحب ہمایوں مرحوم جج ہائیکورٹ پنجاب کی یادگار کے طور پر ایک مستقل سرمایہ سے جاری ہے۔ اس لئے اس کے ظاہری و معنوی حسن کو برقرار رکھنے کے لئے کسی قسم کی کاروباری مصلحت مدنظر نہیں رکھی جاتی۔

۳- ہمایوں کا اخلاقی معیار اس قدر بلند ہے کہ ملک کا کوئی ادبی رسالہ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ اس میں فحش اشتہارات، عریاں تصاویر، اور مخرب اخلاق مضامین اور نظموں کے لئے قطعاً گنجائش نہیں۔ یہ رسالہ بلا خطر طلبہ اور خواتین کے ہاتھوں میں دیا جاسکتا ہے۔

۴- ہمایوں - کی ادارت جناب میاں بشیر احمد صاحب بی اے (آکسن) بیرسٹرایٹ لا کے قابل ہاتھوں میں ہے۔ اسکی ترتیب میں مضامین کے محض بلند معیار ہی کا خیال نہیں رکھا جاتا، بلکہ "تنوع" کا بھی اتنا خیال رکھا جاتا ہے کہ "ہمایوں" کا ہر پرچہ مختلف قسم کے مذاق کے لوگوں کے لئے یکساں جاذب توجہ ہوتا ہے۔

۵- ہمایوں - کے مضامین محض پُر از معلومات ہی نہیں ہوتے بلکہ انتہا درجے کے دلچسپ بھی ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے ہمایوں آپ اپنی نظیر ہے۔

۶- ہمایوں صحتِ زبان کے لحاظ سے نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان بھر کے مستند ترین رسائل کی صف اول میں شمار ہوتا ہے۔

۷- ہمایوں میں علمی و ادبی، تاریخی و تمدنی مضامین، دلکش افسانے اور ڈرامے پاکیزہ نظمیں، مزاحیہ مقالے، مشرقی و مغربی رسائل کے دلچسپ اقتباسات اور ملک کی موجودہ ادبی تحریکات کے متعلق نہایت بیش قیمت اطلاعات شائع کی جاتی ہیں۔

۸- ہمایوں ملک کے محکمہ ہائے تعلیم کی طرف سے منظور شدہ ہے اور ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں بے انتہا مقبول ہے۔

۹- ہمایوں کے کاغذ۔ کتابت۔ طباعت اور تصاویر وغیرہ پر دل کھول کر روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔

۱۰- ہمایوں کے سالگرہ نمبر اور دیگر خاص نمبروں کے لئے کوئی زائد قیمت نہیں لی جاتی۔

چندہ سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے مع محصول ہے۔

خاکسار منیجر رسالہ ہمایوں لاہور

اُردو رسائل کی دُنیا میں ایک نئے دور کا آغاز

رسالہ سَارُبان لاہور

رسالہ"ساربان" اُردو میں ایک بلند پایہ ماہوار رسالہ ہے جسمیں ذہنی اصلاح و تہذیب کے مدنظر سبق آموز نظموں اور علمی مقالات کے علاوہ انسانی زندگی سے تعلق رکھنے والے مسائل پر زبردست مضامین لکھے جاتے ہیں ان وجوہات کی بنا پر ملکی جرائد اور مشاہیر قوم نے ساربان کو اردو رسائل کی دنیا میں ایک نئے دور کا آغاز قرار دیا ہے۔ رسالہ ساربان میں عشقیہ غزلیں یا ایکٹرسوں وغیرہ کی تصاویر قطعاً شائع نہیں کی جاتیں۔ سالانہ چندہ تین روپے نمونے کے لئے ۲؍ کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں۔

منیجر رسالہ "ساربان" لاہور

اخبار "ریاست" دہلی

نصف قیمت پر

"ریاست"، دہلی جس میں آرٹ پیپر پر ہر ہفتہ بارہ صفحہ کی تصاویر دی جاتی ہیں اور جس کی ضخامت چوالیس صفحہ کی ہوتی ہے اس سے پہلے چار آنہ فی پرچہ کے حساب سے ایجنٹوں اور ڈیلر کے بُک سٹالز پر فروخت ہوتا تھا۔ اب ایسی کوالٹی اور ضخامت کے ساتھ اس کی قیمت سب جگہ دو آنہ کردی گئی ہے۔

سالانہ قیمت آٹھ روپیہ ششماہی ساڑھے چار روپیہ

منیجر "ریاست" دہلی

۱۹۳۷ء کی بہترین تصنیف

ہفتہ وار اخبار گلفروش کا شاندار سالنامہ ہوگی۔ جو ۲۰ اکتوبر کو ضرور شائع ہو جائے گا اس کی ضخامت تقریباً ۲۰۰ صفحہ ہوگی۔ اس کے لئے نامور ادبا اور شاعروں کے شاہکار حاصل کرلئے گئے ہیں۔ متعدد رنگین وسادہ تصویریں بھی دی جائیں گی۔

سالنامہ کی قیمت عہ ہوگی۔ گل فروش کا سالانہ چندہ ۳ہے ہے۔ مگر جو صاحب ۱۵ اکتوبر تک خریداری قبول فرماکر زرچندہ بذریعہ منی آرڈر بھیجدیں گے ان سے صرف دو روپیہ بارہ آنہ مع سالنامہ لئے جاوینگے۔ طلباء اور لائبریریوں کے نام ۲ہے سالانہ میں مع سالنامہ جاری کردیا جاویگا۔ مگر ۱۵ ستمبر کے بعد کسی کو بھی یہ رعایت نہ دیجاویگی۔ نمونہ کا پرچہ ار کا ٹکٹ بھیجکر منگوائیے۔

منیجر ہفتہ وار اخبار گلفروش دہلی

چند دن کے استعمال سے سفید بال جڑ سے کالے ہو جائینگے

کھنگرہ ہیئر آئیل

سر اور ڈاڑھی کے بالوں کو سیاہ اور دراز کرنے گرنے سے روکنے چمک پیدا کرنے، جلد سے جلد نئے بال اُگانے اور بالوں کا انبوہ پیدا کرنے میں کامیاب تجربہ شدہ اور بےنظیر روغن ہے خواتین کیلئے بے بہا اور نئی چیز ہے، ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں یہ عرض کریں گے کہ آزمائش کے لئے اولاً صرف ایک ہفتہ استعمال کے لئے منگایا جائے اور استعمال سے قبل اپنے بالوں کی لمبائی ناپ لی جائے پھر چند روز کے بعد جانچ کی جائے، اس میں کافی ہے کہ ہمارا اشتہار غلط ثابت نہ ہوگا اور تحریر کے مطابق ہی خوبیاں پائی جائیں گی۔

بایں خیال کہ ہمارا روغن اپنا اشتہار خود بھی بنجائے فی الحال قیمت لاگت کے برابر رکھی ہے۔ قیمت فی ادھا ۱۲ ار تین ادھے ۲ عار نمونہ کی شیشی ۵ ر

انڈین اسٹور بریلی

رُوح

عہد حاضر کا ایک بہترین مذہبی، معاشی، سیاسی، معاشرتی اور اصلاحی افسانہ

جس میں ہندوستانی قوم کی حیات ملی کے لئے ایک بالکل نیا اور اچھوتا لائحہ عمل پیش کیا گیا ہے۔ جس پر عمل پیرا ہو کر "غلام فرقہ پرست ہندوستان" جلد سے جلد "آزاد متحد ہندوستان"، ہو جائیگا۔

رُوح کے بہترین دلچسپ اور ہندوستانی قوم کے لئے مفید اور قابل عمل ہونے کی اس سے زیادہ بہتر اور کیا ضمانت دی جاسکتی ہے کہ اس کا تعارف (Foreword) حضرت جوش ملیح آبادی ایڈیٹر کلیم نے فرمایا ہے۔

عنقریب شایع ہونیوالا ہے۔ انتظار فرمائیے

انشائے لطیف

ادیب العصر حضرت لطیف الدین احمد اکبرآبادی کے افسانے

اُردو ادب میں صاحب لالہ رخ کا نام محتاج تعارف نہیں اور افسانہ نویسی کا جو معیار ل۔ احمد نے پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ تنہا ایک مثال ہے ان کا افسانہ علم و حکمت، جذبات، واردات اور نفسیات حسن و عشق کے نازک ترین اشارات کا حامل ہوتا ہے، انکا طرز انشا، شعریت اور تعاسف اردو ادب میں مستقل اضافات ہیں ل۔ احمد صاحب کے افسانے بلا شائبہ تغلیط ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں رکھے جا سکتے ہیں انشائے لطیف ل۔ احمد صاحب کے پندرہ شہ پاروں کا مجموعہ ہے۔ جو اکثر نگار اور دیگر مجلات علمیہ و ادبیہ میں طبع ہو کر مقبولیت دوام حاصل کر چکے ہیں۔ اسلئے اگر آپکو سلاست و نفاست زبان کے ساتھ نفسیات شباب اور جذباتِ حسن و عشق کی صحیح نقاشی سے کوئی خاص لگاؤ ہے اگر آپ ذوق شعریت کا ذوق سلیم رکھتے ہیں تو اس مجموعہ میں آپ کو اپنی طلب و تشنگی کیلئے مکمل سامان سیرابی نظر آئے گا۔ طباعت و کتابت روشن و بہترین ہونے کے ساتھ کراؤن سائز پر تقریباً ڈہائی سو صفحات کی ضخامت نفیس جلد اور

قیمت صرف دو روپے علاوہ محصولڈاک

نغمات

نثر کی شاعری

ادب اردو میں جناب ل۔ احمد کی تنہا وہ ہستی ہے جس نے حسن و عشق کی واردات اور نفسیات کو انتہائی مطالعہ و فکر کے ساتھ اپنے ذاتی تاثرات و کیفیات کے ماتحت شعریت موسیقی یا موسیقیت شعر کی صورت میں صفحات سادہ کو فردوس خیال بنا دیا ہے اس مجموعہ میں جناب لطیف کے ساتھ مختصر ترین افسانے از ادب پارے شامل ہیں جنہیں نثر کی شاعری کے شہ پاروں کا ایک وجد آفریں کارنامہ کہا جا سکتا ہے یہ کتاب بھی مکمل ترتیب و تہذیب کے بعد تیار ہو چکی ہے اگر آپ اپنی زبان کی نزاکت و لطافت کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کتاب کو ضرور منگائیے قیمت صرف ایک روپیہ آٹھ آنہ علاوہ محصول

ملنے کا پتہ:- **منیجر کلیم بک ڈپو جنیتی نواس نمبر ۴ دریا گنج دہلی**

ساغر نظامی کا کلیات نظم و غزل

بادۂ مشرق

وہ تاریخی کتاب جس کے دیباچے مشرقی و مغربی علوم کے ماہرین و سر برآوردہ انشا پردازوں نے تحریر فرمائے ہیں حجم ۶۰۰ صفحات کاغذ دبیز چکنا ۳۰ پونڈ سائز پیام مشرق کتاب ۱۲ ابواب میں منقسم ہے۔ ہر باب کا سرورق رنگین و مصور ہے غیر مجلد ٹائٹل۔ ابھری ہوئی رنگین ڈائیوں سے مرصع ہے اور مجلد ٹائٹل سنہری ڈائی سے مزین جلد کا کور سہ رنگا ہے۔

ساری کتاب ہندوستانی شاعری کے جدید پاکیزہ تخیل کی حقیقی تصویر ہے زندگی اور جوانی، حب وطن اور آزادی کے وہ آتشیں نغمات اس کتاب میں پائے جاتے ہیں جنہوں نے قوم میں نئی زندگی پیدا کر دی ہے اسکے باوجود اسکی قیمت کتاب کے حسن و جمال اور ضخامت کے لحاظ سے بالکل حقیر ہے یعنی

صرف پانچ روپے علاوہ محصول

سو شعر کا سٹ

جوش۔ جگر۔ اصغر۔ حسرت۔ میر۔ درد۔ غالب۔ مومن۔ داغ

کے

ایک ایک سو بہترین اشعار

ہر شخص کو ہر شاعر کا سب کلام پڑھنے اور اس کی شاعری کے متعلق رائے قائم کرنیکا موقع نہیں ملتا ہے۔ اسی خیال سے یہ سلسلہ جاری کیا گیا ہے۔ ہر کتاب میں دور جدید یا دور قدیم کے ایک ممتاز شاعر کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام سے منتخب کرکے بہترین سو شعر دیے گئے ہیں ساتھ ہی سوانح حالات اور کلام پر مختصر تبصرہ کیا گیا ہے۔ باوجود اختلافِ مذاق کے نصف سے زیادہ اشعار آپ کو اپنی پسند کے ملیں گے جیبی سائز، کاغذ، کتابت، طباعت دیدہ زیب سرورق خوشنما جس پر ہر شاعر کی تصویر بھی ہے۔ قیمت کتاب چار آنے علاوہ محصول

ملنے کا پتہ:- **منیجر کلیم بک ڈپو۔ جینتی نواس نمبر ۴ دریا گنج دہلی**

معارفِ جمیل

حضرۃ حکیم آزاد انصاری کا پہلا مجموعہ کلام

جو غزلوں، مسلسل غزلوں، نظموں، قطعوں اور رباعیوں پر مشتمل ہے!

وہ حضرات جو اردو شاعری کے ہر دور اور ہر دور کے طرز بیان کا گہرا مطالعہ کر چکے ہیں - اس حقیقت پر متفق ہیں کہ حکیم آزاد اردو میں جس طرز بیان کے موجد و خاتم ہیں اس کی نظیر دلّی سے لے کر اس وقت تک کی اردو شاعری میں کہیں نہیں مل سکتی -

اگر آپ بالکل انوکھے طرز بیان کا مطالعہ فرمانا چاہتے ہیں تو آج ہی آرڈر دیجئے - اس مجموعے میں آپ کو تغزل، تفلسف، حسن و عشق، رندی و سرمستی، اور رنگینی و رعنائی، ہر شعر کے اندر جھلکتی ملے گی، اور ہر رنگ اتنا گہرا ہوگا کہ آپ کے دل و دماغ پر ایک سرور سا چھا جائے گا -

کاغذ چکنا، طباعت و کتابت روشن سائز کراؤن صفحات ۳۵۶

قیمت مجلد ۱۲؍ غیر مجلد عہ

ملنے کا پتہ

محمد تراب علی خاں باز عقب مسجد چوک حیدر آباد

بلاک برائے فروخت

دفتر کلیم میں وہ تمام بلاک جو اب تک ہر ماہ کلیم میں چھپ چکے ہیں برائے فروخت موجود ہیں اور اگر کوئی صاحب کسی بلاک کو کرایہ پر لینا چاہیں تو بھی مل سکتے ہیں

جملہ خط و کتابت بنام منیجر کلیم جنیتی نواس ۱۳ دریا گنج دہلی ہونی چاہئے

مشرقی عظمت کا علم بردار

جاپان

مصنفہ :- چمن لال سیاح جاپان

مترجمہ :- محمود علی خاں (جامعی)

آج سے صرف اسی برس پہلے جاپان جس سے اب ایشیا کا نام روشن ہے وہ بالکل گمنامی میں پڑا تھا لیکن اس مختصر مدت میں اس نے وہ حیرت انگیز ترقی کی کہ اس کا شمار دنیا کی زبردست طاقتوں میں ہونے لگا، اس انقلاب کی داستان اس تصنیف میں ملاحظہ کیجئے - جس کے متعلق ڈاکٹر سنڈرلینڈ (امریکہ) فرماتے ہیں کہ یہ کتاب جدید جاپان کے متعلق سب سے زیادہ پُر از معلومات کتاب ہے - صفحات ۲۵۰ بلاک کی ۳۰ تصاویر مجلد عا ر غیر مجلد ۱۱ تصاویر عہ

کائنات

مصنفہ - محمود علی خاں (جامعی)

اس کتاب میں علم ہیئت کے راز آسان سے آسان زبان اور سادہ سے سادہ اسلوب بیان میں بچوں کی ایسی مثالوں اور دلچسپ دلیلوں سے سمجھائے گئے ہیں کہ فوراً ذہن نشین ہو جاتے ہیں - ہمارا کرۂ ارض کیا ہے - سورج و چاند ستارے کیا ہیں ان کا ایک دوسرے سے کیا تعلق ہے قیمت ۸؍

منیجر کلیم بک ڈپو - جنیتی نواس نمبر ۱۳ دریا گنج دہلی

بنام قوت وحیات

کلیم

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
آگے کئی صدیوں ہے فسانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجھ کو صحیفہ یہ کلیم
بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا

دہلی

سالانہ چندہ چھ روپے
ششماہی چندہ تین روپے آٹھ آنے

منظور شدہ گورنمنٹ میسور و پٹیالہ
قیمت فی پرچہ نو آنے

جلد ۴ — فہرست مضامین بابتہ ماہ نومبر ۱۹۳۷ء — نمبر ۵

(جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر کلیم جبلی نواس نمبر ۵ دریا گنج دہلی سے شائع کیا)

اشارات

مُدیر

عبرتناک ذہنیت اور خطرناک انجام

ریاست ٹونک کے (یادگارِ خلیل) کلب میں ریڈیو، دہلی کا پروگرام سُن رہا تھا، کہ ایک سیاہ فام دیسی عیسائی صاحب، چار عدد لڑکیوں کے ساتھ، جن پر مغربی طرز کی دیدہ دلیر برنائی اور مشتبہ قسم کی انگریزی دوشیزگی برس رہی تھی، ہال میں تشریف لائے، اور ایک طرف بیٹھکر گانا سننے لگے، ——— لیکن اُن کی "صاحبیت" دیر تک ہندوستانی موسیقی کو برداشت نہ کرسکی، اور اُنھوں نے مغربی موسیقی کی طرف ریڈیو کا مُنھ پھیر دیا —— جس کا سامعہ خراش نتیجہ یہ ہوا کہ کلب کا ہال، ناتراشیدہ پتھروں کے انبار کے اندر گونجے ہوئے بے تکے شور وغل سے، جسے مغربی موسیقی کہا جاتا ہے۔ بُری طرح کراہنے اور کراہتے کراہتے بھونکنے لگا اور جس سے ہم لوگ تو سخت بے کیف ہوئے، لیکن اُن عیسائی صاحب کے ساتھ آئی ہوئی لڑکیاں کیف کا اظہار کرنے کی خاطر پاؤں ہلا ہلا کر تال دینے لگیں ———

جب میں نے ان صاحبزادیوں کا یہ عالم دیکھا تو تن بدن میں آگ لگ گئی، اور میرے دل نے مجھ سے کہا یہ کیسی چھچھوری لڑکیاں ہیں۔

اتنے میں میرے دوست ملک مجید صاحب نے مجھ سے باہر چل کر بیٹھنے کو کہا، اور میں فوراً اِس انداز سے اُٹھ کھڑا ہوا جس سے عیسائیوں پر یہ ثابت ہوگیا کہ میں اُن کی صحبت سے اُٹھ جانے کا کس قدر آرزومند تھا۔ اور چلتے چلاتے میں نے اُن لڑکیوں میں سے ایک کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جو نسبتہً ملاحت آمیز دلکشی رکھتی تھی، غیر ملفوظ طور سے یہ کہہ دیا کہ میں اُن کی مغربی وضع سے بے انتہا نافر ہوں۔

میں نے اظہارِ نفرت کے لئے اُن میں نسبتہً دلکش لڑکی ہی کو کیوں منتخب کیا، اس کا جواب میرے پاس کچھ نہیں، ممکن ہے کوئی نفسیاتِ شاعر کا ماہر اِس کی توجیہہ کرسکے۔

یہ واضح رہے کہ یہ عیسائی صاحب، اور اُن کے ساتھ کی لڑکیاں، ان میں کوئی اینگلو انڈین بھی نہ تھا، بلکہ سب کے سب ہندی، اور ٹھیٹ ہندی تھے۔ اور ہم میں اُن میں صرف اتنا ذرا سا فرق تھا کہ اُنھوں نے بدیسی مذہب اختیار کرلیا تھا، اور چالاک و سیاسی گندم نما جو فروش پادریوں کے "جیزس کرائیسٹ" پر ایمان لاچکے تھے ——— اِس کے علاوہ ہم میں اُن میں بال برابر بھی کوئی فرق نہ تھا۔ فرق ہو بھی کیونکر سکتا ہے، کیونکہ ہم سب ایک ہی مُلک کے باشندے، اور ایک ہی قوم کے افراد ہیں۔ لیکن چونکہ وہ "دیسی عیسائی" "صاحب لوگوں" کا مذہب اختیار کرکے اپنے نزدیک ہم سے نہایت ارفع و بلند ہوچکے تھے، اِس بنا پر وہ ہندوستانی موسیقی سے لُطف اندوز ہونے کے ننگ کو کیونکر گوارا فرما سکتے تھے۔

یہ بات آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ مذہب کے تبدیل ہوجانے سے قومیت کیونکر تبدیل ہوجاتی ہے۔

مذہب تو نام ہے تبدیلیٔ عقائد کا ——— تبدیلیٔ عقائد سے تبدیلیٔ نسل

و وطن کا امکان کیونکر پیدا ہو سکتا ہے۔

اگر آج میں چینی یا جاپانی مذہب اختیار کر لوں تو کیا میں اپنے نسلی مزاج اور وطنی خصوصیات سے قطعی مُعرّا ہو کر چینی یا جاپانی قوم کا فرد بنجاؤں گا۔ اور میری سرشت و فطرت، نیز شکل و صورت بھی وہی ہو جائے گی جو چینیوں یا جاپانیوں کی ہوتی ہے ؟

لیکن بات یہ نہیں ہے ۔۔۔ اس کے اندر ایک اور ہی تلخ راز ہے۔ اور وہ تلخ راز ہے ہماری ذلّت و خواری، ہماری غلامی و محکومی ۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب ہمارے بھائیوں میں سے کوئی "شاہی مذہب و معاشرت" اختیار کر لیتا ہے، تو ہر چند وہ اندر سے تو ہے وہی ٹھیٹ ہندوستانی، لیکن اپنی ہندوستانیت پر غیروں سے بھیک میں مانگا ہوا غلاف چڑھا لیتا ہے، تاکہ لوگ اُسے بھی "صاحب" سمجھکر، یا کم سے کم اُس پر "صاحب" کا دھوکا کھا کر، اُس کا احترام کرنے لگیں۔

آزاد و زندہ قوموں کے لوگ بھی مذہب تبدیل کرتے ہیں، مگر یہ تبدیلی، اُن کے قومی خصوصیات، اور نسلی مزاج کو محو و معدوم نہیں کر دیتی۔

مسٹر پکتھال کو، جو انگریز تھے، میں نے خود اپنی آنکھوں سے حیدرآباد میں دیکھا تھا۔ ہر چند وہ مسلمان ہو چکے تھے، مگر اُن کی وضع قطع، چال ڈھال، لباس اور معاشرت میں ذرّہ برابر بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا ۔۔۔ لیکن جس وقت کہ ہمارا کوئی بھائی عیسائی مذہب اختیار کر لیتا ہے تو اُسی وقت اپنی وضع قطع اور تمام معاشرت کو یکسر بدل کر رکھ دیتا ہے، اور انتہا یہ ہے کہ نام تک تبدیل کر دیا جاتا ہے۔

یہ ہے غلامی کی لعنت، جس کا ہم صبح و شام نظارہ کرتے رہتے ہیں۔ اور اس سے بھی بڑھ کر غلامی کی لعنت یہ ہے کہ ہم میں سے جو افراد اپنے دین و ایمان اور اپنے تمام و کمال خصوصیات قومی کو کلیتہً ترک کر کے فاتح قوم کی طرف

> اِدھر آؤ، لے لیں بلائیں تمہاری

کے نعرے مارتے ہوئے بڑھتے ہیں۔ اُنھیں دیکھتے ہی فاتح قوم کے افراد

> "دیکھو، دیکھو، ہمیں نہ چھو لینا"

کی ڈانٹ بتاتے ہیں، اور اُنھیں اس قدر ذلیل سمجھتے ہیں کہ اپنے معبدوں میں بھی گھسنے کی اجازت نہیں دیتے۔

اِن خانماں برباد و معلّق دیسی عیسائیوں، یعنی انگریزوں کی حقارت آمیز زبان میں ان نیٹو کرسچینس کو

کن آلات کے ذریعے سے یہ بات سنائی اور سمجھائی جائے کہ اے فریب خوردہ بھائیو! جیزس کرائیسٹ کی قسم کہ تم یوروپین نہیں ہو ۔۔۔ تم ہندوستانی، اور خالص ہندوستانی ہو ۔۔۔ تمہارے ماں باپ بھی لوقا اور سینٹ پال کی قسم یوروپین نہ تھے۔ بلکہ وہ بھی ہم سب کی طرح ہندوستانی، اور خالص ہندوستانی ہی تھے ۔۔۔ تم اس ہندوستان کی خاک پاک سے پیدا ہوئے ہو، اور ایک روز اسی خاک پاک میں دفن کر دئے جاؤ گے ۔۔۔ اور تمہارے آبا و اجداد بھی، جن کے نطفے سے تم عالم وجود میں آئے ہو، اسی خاک سے اُٹھے تھے، اسی خاک میں سو رہے ہیں، اور اسی خاک میں حشر تک سوتے رہیں گے ۔۔۔ تم نے مذہب تبدیل کر دیا، بہت اچھا کیا، بہ چشم ما روشن و دل ما شاد، لیکن "خدا" کے واسطے، "خداکے" اکلوتے بیٹے "کے واسطے اس تبدیلیٔ مذہب کی وجہ سے اپنے وطنِ عزیز کے حقوق اور اپنے آبا کے خصوصیات کو تباہ و پامال نکرو ۔۔۔ ورنہ، خوب کان کھول کر سن لو، جب ہندوستان آزاد ہو جائیگا اُس وقت سب سے زیادہ نرم دل ہندوستانی بھی تمہیں معاف کرنے پر آمادہ نہو سکے گا، اور بہت ممکن ہے، خدا نکرے کہ ایسا ہو، مگر بہت قوی اندیشہ ہے کہ آزاد ہندوستان تم سے وہی سلوک کرے گا جو آریوں نے گونڈوں اور بھیلوں سے کیا تھا ۔۔۔ یعنی تم جنگلوں کی طرف ہانک دئے جاؤ گے، اور جب تم جنگلوں سے اپنے نجات دلانے والے عبا پوش، علی بابا! چالیس چوروں والے یا دریوں کو امداد کے لئے پکارو گے، تو تمہاری آواز بھی اُن کے کانوں تک نہ جا سکے گی۔ کیونکہ وہ اُس وقت دُور، تم سے بہت دُور، انگلستان کے کسی صحرائی کنارے میں آلوکھو دکھود کر انڈیا او انڈیا" "انڈیا او انڈیا" کے دردناک نعرے لگا رہے ہوں گے۔

کاش کوئی غور کرے کہ یہ کتنا پُرہول و دردناک انجام ہوگا !

حیف اُس نامراد کوّے پر جو ہنس تو بن نہ سکا ۔۔۔ اور کوّا بھی نہ رہا!!

اسلام سے انکار

لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک مسلمان طالب علم نے کوئی دو ماہ ہوئے ہوں گے کہ اسلام سے انکار کر دیا ہے جس پر مسلمانوں کے مطبع و منبر سے سخت غیظ اور شدید اکراہ کا اظہار کیا جا رہا ہے؟

مجھے اپنے بھائیوں کے جذبات سے ہمدردی ہے اور میں اُن کی غیرتِ دینی کا احترام کرتا ہوں —— لیکن جب اُس مسلمان نوجوان کے انکار پر غور کرتا ہوں تو مجھے اُس پر قطعی غصہ نہیں آتا، بلکہ میں اُس کے انکار کو محمول کرتا ہوں مسلمانوں اور خصوصاً علمائے کرام کی اُس روش پر جو صدیوں سے اُنھوں نے اختیار کر رکھی ہے، اور جسے دیکھکر ناواقف لوگوں کو اسلام سے شدید اکراہ پیدا ہو جاتا ہے۔

واضح رہے کہ اس مسلمان طالب کو شیطان ملعون نے نہیں بلکہ دینداراً مسلمانوں، اور انبیائے بنی اسرائیل سے مُماثلت رکھنے والے مقدّس "عالموں" "مجتہدوں" "صوفیوں" اور "پیروں" نے بہکا کر "کافر" بنا دیا ہے۔ اور اگر "حشر" کے دن اس کی پرسش ہوگی، تو اس غریب طالب علم کے عوض، اگر گرفتاری کے وارنٹ جاری کئے جائیں گے، ان دراز دست بزرگواروں کے نام جن کی عبائیں اور ڈاڑھیاں طویل اور آستینیں کوتاہ ہوا کرتی ہیں۔

معلوم نہیں عام مسلمانوں نے اپنے "علمائے کرام" کو بگاڑا ہے، یا اِن "علمائے کرام" نے مسلمانوں کو مسخ فرمایا ہے۔

اگر یہ سچ ہے کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے تو میرے نزدیک ایک طرف تو مسلمانوں نے جہالت، جمود اور تقلید کے باعث "علمائے کرام" کا احتساب نہ کرکے اُنھیں بگاڑ دیا ہے، اور دوسری جانب "علمائے کرام" نے تن آسانی، عیش پسندی، اور جھوٹی عزت کی خاطر مسلمانوں کو مسخ فرما دیا ہے —— یہ بات بالکل ایسی معلوم ہوتی ہے کہ "مسلمان" اور "علماء" دونوں اپنے اپنے گھوروں پر سے ایک دوسرے پر غلاظتیں اُچھالتے رہے ہیں۔ اور اب اِن دونوں کا یہ عالم ہے کہ اِن کی جانب دیکھنے سے جی متلانے لگتا ہے۔

عقائد و اعمال صرف دو ہی چیزیں ہیں جن کا مطالعہ کرکے قوموں کے اچھے بُرے ہونے کے متعلق رائے قایم کی جا سکتی ہے۔

مسلمان، خُدا کے فضل سے اِن دونوں نعمتوں سے مُدّت ہوئی کہ محروم ہو چکے ہیں۔

عقائد کا تو یہ عالم ہے کہ مسلمانوں میں وہ بنیادی چیز جسے توحید کہتے ہیں، اور جس پر اسلام کی پوری تعمیر کا مدار ہے، قطعی طور پر باقی نہیں رہی ہے۔

اور اعمال کے متعلق تو کچھ پوچھئے ہی نہیں۔ اُن کا تو یہ عالم ہے کہ اب مسلمانوں کو کوئی دوسری قوم برداشت ہی نہیں کر سکتی ہے۔

مجھے مسلمانوں سے سب سے بڑی شکایت ہے کہ وہ انتہائے زیادہ مغلوب الجذبات واقع ہوئے ہیں، اور اپنے خلاف کوئی بات، خواہ وہ کتنی ہی صحیح و مدلّل کیوں نہ ہو، سُننے پر آمادہ ہی نہیں ہوتے، اس لئے مسلمانوں کے سامنے سچی بات کہتے ہوئے خوف معلوم ہوتا ہے کہ وہ جامے سے باہر ہو جائے گا، اور مُنھ نوچنے لگے گا۔

یہ کتنی عبرتناک بات ہے کہ جس اسلام کے نامور ترین اکابر، کافروں تک کی سچی بات کے سامنے سر جھکا دیتے تھے، آج اُسی کے فرزند، دنیا میں اگر کوئی چیز برداشت نہیں کر سکتے ہیں تو وہ سچی بات ہے —— لیکن میں جسارت کرکے مسلمانوں کی خدمت میں عرض کروں گا کہ ذرا وہ اپنے اپنے گریبانوں میں منھ ڈال کر تو دیکھیں۔ اور ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ کیا وہ، اور اُن کے "علمائے کرام" اُسی اسلام کے پابند ہیں، جو قرآن کریم کے اندر موجود ہے، اور کیا اُسی لاثانی سیرت کا نمونہ ہیں جو اُن کے پیغمبرِ اعظم کی تھی؟

"ہٹیلے کے مُرغے" اور "شیخ سدّو کے بکرے" کو تو آپ یہ کہکر رد کر دیں گے کہ یہ جُہلا کا فعل ہے، لیکن آپ کے پڑھے لکھے اور مہذب "حضرات" کے کارنامے کیا ہیں؟

کیا آپ گنڈے، تعویذ، نذر و نیاز، اور جھاڑ پھونک کے معتقد نہیں ہیں؟

کیا آپ "چار یار" "پنجتن" "مدحِ صحابہ" اور "آمین بالجہر" پر خون نہیں بہایا کرتے؟

کیا آپ میں سے اکثر و بیشتر حضرات رسولِ اکرمؐ کو بشریت سے خارج کرکے الوہیت کے رنگ میں نہیں دیکھتے ؟

کیا آپ نے "خدا" کو ایک خاص مزاج کا پیرِ مرد نہیں سمجھ رکھا ہے ؟

کیا آپ شبِ برات کے موقعے پر آتشبازی نہیں چھوڑاتے ، اور عید کے دن سوئیاں نوش نہیں فرماتے ہیں ۔

کیا آپ قبوُر کی زیارت کے واسطے طویل سفر نہیں کرتے ۔ مزارات کو غسل دے کر ، اُن کا پانی نہیں پیتے ، مزارات پر سجدے نہیں کرتے ، اور صاحبانِ مزار سے اعانت طلب کرکے شرک کا ارتکاب نہیں فرماتے ؟

کیا آپ بھیک مانگ کر ، یا مقروض ہونے کے باوصف حج کرکے اپنے اُس روپے کو برباد نہیں کرتے جو آپ کے اور آپ کے اہل وعیال کے کام آسکتا تھا ؟

کیا آپ تعزیوں ، چھڑوں اور علموں کے سامنے گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں نہیں مانگتے ، اور ذوالجناح کی پُشت یا دُم کو مُقدس سمجھکر اُس پر ہات نہیں پھیرتے ؟

کیا آپ "خواجہ کا صندل" اور "نال صاحب" کا جلوس نہیں نکالتے ہیں ؟

کیا آپ قوالیوں میں ناچتے ، اُچھلتے ، کوُدتے ، اور بھاؤ نہیں بتاتے ہیں ؟

کیا آپ مہکتی ہوئی زُلفوں کے خطرناک اور عیاش سجادہ نشینوں کے قدموں پر سر نہیں جُھکاتے ، اور نذریں دے دے کر اُنھیں اس قدر فارغ البال نہیں بناتے رہتے کہ وہ باسانی طوائفوں کو ملازم رکھ سکیں ؟

کیا آپ اپنے بھائیوں کی غیبت ، اور اپنے پڑوسیوں کی عیب جوئی میں مصروف نہیں رہا کرتے ہیں ؟

کیا آپ کاہل ، کام چور ، سُست ، بدعہد ، اور حاسد نہیں ہیں ۔

کیا آپ مہینوں غسل نہیں فرماتے ، میلے کُچیلے نہیں رہتے ، اور چوراہوں پر استنجے کے بہانے بہیترے بدل بدل کر تمام دنیا کے سامنے قینچیاں مارتے ہوئے نہیں دیکھے جاتے ہیں ؟

یہ تو تھے آپ کے اعمالِ حسنہ ، اب ذرا اپنے مجتہدوں ، اور عالموں کی طرف نگاہ ڈالئے ۔

کیا آپ ملاحظہ نہیں فرماتے کہ وہ نرم گدوں اور اُونچے تکیوں پر دراز رہتے ہیں ؟ رزقِ کریم سے محروم رہتے ہوئے آپ کی خیرات پر زندگی بسر کرتے ہیں ـــ جھوٹے فتوے دیا کرتے ہیں ۔ اوقاف کا مال کھاتے رہتے ہیں ۔ مسلمانوں کے دینی ، اخلاقی ، معاشری ، اقتصادی اور سیاسی حالات کی پرواہ نہیں کرتے ۔ اسلامی ریاستوں کی گلیوں میں ، رئیسِ وقت کا قرب اور ملازمت حاصل کرنے کے لئے ، مارے مارے پھرا کرتے اور حصولِ مقاصد کے واسطے افترا پردازیاں اور سازشیں کرتے پائے جاتے ہیں ـــ اور سب سے بڑھکر یہ کہ یہ حضرات سُنیوں ، شیعوں ، حنفیوں ، وہابیوں اور قادیانیوں کو لڑا لڑا کر خفیہ وظائف اور علانیہ خطابات حاصل کرتے رہتے ہیں ۔ سچی بات کے کہنے سے ڈرتے ہیں ، اور باطل جب اُن کے سامنے سے اپنا جلوُس نکالتا ہوا گزرتا ہے تو وہ سلام کرنے کو کھڑے ہوجاتے ہیں ۔

آپ غصہ تھوک کر ، برائے "خدا و رسول" خود ہی انصاف سے کہئے کیا اسلام یہی ہے ؟

کیا رسالت مآب نے اِسی اسلام کی تعلیم دی تھی ؟

کیا اِسی اسلام نے دنیا کو مسخر کرکے رکھ دیا تھا ؟

کیا قرونِ اولیٰ کے مسلمان آپ ہی کی طرح نرم و نازک اور غیر مسلح رہتے تھے ، اور کیا اُنھوں نے کسی غیر کی غلامی پر ایک لمحے کے لئے بھی قناعت کرلی تھی ؟

مجھے یکایک ایک واقعہ یاد آگیا ۔ لگے ہاتھوں اُسے بھی سُن لیجئے ـــ ایک انگریز نے جو قرآن کریم کے مطالعے سے اسلام پر ایمان لے آیا تھا ، اپنے ایک دوست سے کہا کہ اب وہ اپنے اسلام کا اعلان کرنا چاہتا ہے ، اور اُس کی یہ تمنا ہے کہ وہ اُسے کسی مستند عالم کے پاس لے چلے ، تاکہ اُس کے سامنے وہ اپنے اسلام کا باقاعدہ اعلان کردے ۔

چنانچہ وہ دوست اُسی انگریز کو ایک خانقاہ میں لے گیا ، جہاں قوالی کی "آہے وا" پر بڑی بڑی ڈاڑھیوں والے ناچ رہے تھے ۔

انگریز اس تمام تماشائے رقص و سرود کو بڑے غور اور انتہائی حیرانی کے ساتھ دیکھتا رہا ، اور جب قوالی کے اختتام پر اُس کے دوست نے فرمائش کی کہ وہ "میاں صاحب" کے پاس چل کر اُن کے "دستِ مبارک" پر اسلام لے آئے ، تو اُس کا چہرہ سُرخ ہوگیا ، اور اُس نے انکار کرتے ہوئے یہ کہا کہ کتاب کے اندر تو تمہارا اسلام بہت اچھا ہے ، مگر تمہاری

سوسائٹی اس قدر خراب ہے کہ میں مسلمان ہونا نہیں چاہتا، ورنہ میں بڑا بدمعاش بن جاؤں گا۔

یہ ہے آپ کی، اور آپ کی سوسائٹی کی حالت۔

ان حالات میں کیا آپ یہ توقع کرسکتے ہیں کہ جس مکروہ اور بھیانک اسلام کو آپ پیش فرماتے ہیں اُسے اِس بیسویں صدی کے تعلیم یافتہ نوجوان ایک لمحے کے لئے بھی برداشت کرسکیں گے؟

خدا کی قسم اگر اسلام یہی ہے جسے آپ اور آپ کے "علمائے کرام" پیش فرماتے ہیں تو صرف از روئے تفکر و تدبر ہی نہیں، از روئے خودداری و شرافت بھی وہ اس قابل ہے کہ بہانگ دُہل جلد سے جلد اِس کا اعلان کردیا جائے، کہ حاشا ہم مسلمان نہیں ہیں ـــــ اور ہمیں اِس اسلام سے کوئی دُور کا بھی تعلق باقی نہیں رہا ہے۔

ہمیں تم کافر کہو، زندیق کہو، مُرتد کہو، جو جی میں آئے کہو، مگر ہم تمہاری طرف واپس نہیں آئیں گے۔ تمہاری گندگیاں، اور تمہاری وہم پرستیاں ہماری برداشت سے باہر ہوچکی ہیں، اور ایک شریف انسان کی طرح ہمیں شرم آتی ہے کہ ہمارا نام تمہارے رجسٹروں میں لکھا ہوا پایا جائے، اور ہم تمہاری محفلوں میں بیٹھے ہوئے پکڑے جائیں۔

اگر تمہارا اسلام، اسلام ہے، تو اُس خدائے بزرگ و برتر کی قسم جس کے قبضے میں ہماری جانیں ہیں، اور اُس رسول اکرمؐ کی قسم جس کا ثانی زمین آج تک پیدا نہیں کرسکی ہے، ہم ہرگز ہرگز مسلمان نہیں ہیں۔ ہم کافر ہیں، کافر ہیں، کافر ہیں، اور کافر ـــــ

تم ہمیں مار ڈالو، ہلاک کردو، پیس دو، جلادو، ہمارے ٹکڑے اُڑادو، مگر ہم کافر ہیں، کافر ہیں، اور کافر ـــــ

گر مسلمانی ہمیں است کہ حافظ دارد
وائے گر درپس امروز بود فردائے!

کانگریس اور انسدادِ مے نوشی

غالباً یہ مرض ہم ہندوستانیوں میں بہت عام ہے کہ ہم میں سے جب کوئی فرد، یا گروہ، زندگی کے کسی شعبے میں نمود و شہرت حاصل کرلیتا ہے تو اُس منزل پر پہونچتے ہی اُس کے دل میں یہ خواہش بیجا پیدا ہوجاتی ہے، کہ وہ ہر میدان کا مرد اور ہر فن کا مولیٰ مان لیا جائے، اور اس خواہش کے پیدا ہوتے ہی وہ زندگی کے اُن تمام بعید و قریب مسائل میں بے تکلف ہات ڈالنے لگتا ہے، جو اُس کے موضوع سے قطعاً خارج ہوتے ہیں۔

اِس وقت میرے ذہن میں میرے بہت سے معاصرین ایسے ہیں، جو اِسی مُوذی مرض میں مدت سے گرفتار ہیں اور شاید تادم مرگ گرفتار رہیں گے۔ جن میں سے ایک پرچے کے ایڈیٹر صاحب اُن مریضوں میں سب سے زیادہ اُبھرے ہوئے نظر آرہے ہیں، یہ پہلے پہل "ادب لطیف" کے ذریعے سے مُلک میں رُوشناس ہوئے تھے، اور ان کے "شکریں، دَم مریں" الفاظ نے بالخصوص ہمارے ٹیگور ریت پسند نوجوانوں کو اُن کا بہت عقیدت مند بنا دیا تھا۔ لیکن جب اُنھیں اپنے "ادب لطیف" کے میدان میں کافی شہرت حاصل ہوگئی تو وہ ہر فن اور ہر شعبے میں نمود حاصل کرنے کے مرض میں یکایک گرفتار ہوگئے اور اس وقت وہ اِس موذی مرض کے اُس درجے میں ہے، جہاں مریض گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختا رہتا ہے کہ جسے جو پوچھنا ہو، مجھ سے پوچھ لے، اور جو معمّا حل کرانا ہو مجھ سے حل کرالے۔ چنانچہ آج وہی ایک ایسے فرد ہیں جو قرآن، وید، انجیل، توریت اور زبُور کے مفسر اعظم ہونے کے ساتھ ساتھ ماشاء اللہ بٹیر بازی، مُرغ بازی، پتنگ بازی اور ہر "بازی" میں ید طولیٰ رکھنے کے مُدعی ہیں ـــــ ان کے بعد ایک صاحب اور بھی ہیں جو پہلے پہل ایک سیاسی راہنما کی صورت سے رونما ہوئے تھے، اور جب اُنھیں اس میدان میں انتہا سے زیادہ شہرت حاصل ہوگئی تو اُنھیں یکایک مذہبی ولی بن جانے کا مرض لاحق ہوگیا، اور اب وہ جو کچھ ارشاد فرماتے ہیں ایک اوتار ہی کی طرح ارشاد فرماتے ہیں، اور اس کا دعویٰ کرنے لگے ہیں کہ اُن کے کانوں میں غیب سے آوازیں آتی رہتی ہیں۔

ہر چند یہ ایک نہایت ہی شرمناک اوچھا پن ہے، مگر ہم کیا کریں کہ یہ اوچھا پن ہمارے اکثر و بیشتر نمایاں افراد میں پایا جاتا ہے اور اِس سے ہماری قوم کو ناقابل تلافی نقصان پہونچ رہا ہے، کیونکہ اُس مرض کے ہاتھوں ہمارے قابل افراد کی دماغی قوتیں مختلف شعبوں میں تقسیم ہو کر اس قدر کمزور ہو جاتی ہیں کہ اُن سے کوئی تعمیری یا تخلیقی

کام نہیں لیا جاسکتا ہے۔

چنانچہ اسی طرح ہمارے ملک کی قابلِ ناز اور ہندوستانی قومیت کی واحد نمائندہ جماعت یعنی کانگریس بھی اس موذی مرض کا شکار ہوچکی یا ہو رہی ہے۔

کانگریس قائم ہوئی تھی حکومت سے ہندوستانیوں کے حقوق کا مطالبہ کرنے، اور اُس کے بعد اُس کا مطمحِ نظر ہوگیا کامل آزادی ——— مطالبۂ حقوق سے کامل آزادی تک آنا، یہ اُس کی یک جہتی اور قدرتی رفتار تھی، جسے ہر صورت سے سراہا اور پسند کیا جاتا ہے، مگر اب وہ تحریکِ انسدادِ مے نوشی وغیرہ کے قضیئوں میں گرفتار ہوکر اپنے دائرۂ عمل کو سیاسیات ہی تک محدود رکھتی معلوم نہیں ہو رہی ہے، بلکہ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ وہ رشد و ہدایت اور پیمبری کے منصب پر فائز ہونے کے بھی خواب دیکھ رہی ہے ———

میں کانگریس کے متعلق اِس سے زیادہ کیا لکھ سکتا ہوں کہ میں اُس کے پرستاروں میں سے ہوں۔ اور میرا یہ عقیدہ ہے کہ کانگریس اور صرف کانگریس ہی ہمارے مظلوم برِاعظم کی نجات کا ذریعہ بن سکتی ہے ——— مگر کانگریس کو اپنے سیاسی حدود سے تجاوز کرکے نوعِ انسانی کے ازلی رجحانات میں دخل دینے کا ارتکاب ہرگز نہ کرنا چاہئیے، ورنہ اُس کی ہر دل عزیزی میں سخت فرق آجانے کا شدید اندیشہ ہے، اور اِس نازک لمحے میں کہ ہندوستان کروٹ لے رہا ہے، کانگریس کی ہر دل عزیزی میں ذرہ برابر بھی فرق آجانے سے ملک کو شدید نقصان پہونچ جانے کا خطرہ ہے ——— کانگریس کو شاید علم نہیں کہ نوعِ انسانی کے واسطے کوئی ضابطۂ اخلاق، یا نظامِ روحانی مرتب کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔

عظیم الشان پیمبروں کی حسرتناک تاریخیں اور اُن کی "پاک" زندگی کے حوصلہ شکن حالات ہمارے سامنے ہیں —— اور ہم صاف الفاظ میں کہہ رہے ہیں کہ انسان کی دکھتی ہوئی رگ کا چھیڑنا کس قدر بے نتیجہ اور خطرناک ہوا کرتا ہے۔ انسان اُس کو برداشت نہیں کرسکتا کہ اُس کے قدرتی رجحانات اور فطری میلانات میں کوئی دخل دے، اور جب کوئی اِن امور میں دخل دیتا ہے، تو خواہ وہ باپ ہی کیوں نہ ہو وہ اُس کی زندگی تک کو ختم کردینے پر آمادہ ہوجاتا ہے۔

مذہب کا یہ بیان ہے کہ "خدا" نے انبیاء کے ذریعے سے نوعِ انسانی کی اصلاح کرنا چاہی تھی، اور اِس سلسلے میں ہزاروں نہیں، لاکھوں انبیاء مبعوث فرمائے گئے تھے، مگر نتیجہ کیا ہوا؟ مجھ سے جواب نہ طلب فرمائیے، عام انسانی حالات و میلانات کو دیکھ کر خود اندازہ کرلیجئے کہ انسانیت کا سوادِ اعظم اِس وقت کس راستے پر گامزن ہے۔

جب اِن امور میں حالات کی رفتار اِس شدت کے ساتھ حوصلہ شکن اور یاس انگیز رہی ہے، تو کانگریس کو خود غور کرنا چاہئیے کہ اِس شعبے میں اُس کے مساعی کہاں تک مشکور ہوسکتے ہیں۔

کانگریس کے سامنے ایک تازہ مثال بھی ہے اور وہ امریکہ کی تحریکِ انسدادِ مے نوشی ہے۔ شاید کانگریس کو بھی معلوم ہوگا کہ حکومت کے تمام جابرانہ احکام، اور قاہرانہ قوانین کے باوصف اہلِ امریکہ کی تری کسی طرح بھی خشکی سے نہ بدل سکی، اور آخر کار حکومت کو سپر انداختہ ہوکر اپنا وہ قانون جسے اُس نے پورے شاہی طمطراق، اور کامل پیمبرانہ تقدس سے جاری فرمایا تھا واپس لینا پڑا

ان امور پر نظر رکھتے ہوئے میں کانگریس کی خدمت میں پھر عرض کرونگا کہ وہ اپنے دائرۂ عمل کو محض سیاسیات تک محدود رکھے، اور رُشد و ہدایت کے دائرے میں داخل ہونے کی کوشش سے ہات اُٹھالے ——— رُشد و ہدایت کا مطلع بڑے بڑے زبردست آفتاب پیدا کرچکا ہے، ایسے آفتاب جن کی تابانی کا کانگریس بیچاری تصور بھی نہیں کرسکتی، وہ تمام آفتاب جس شئے کو "تیرگی" سمجھکر اُسے دفع کرنے کی خاطر طلوع ہوئے تھے، وہ شئے یا یوں کہئے کہ وہ "تیرگی" اُن کے زمانے سے بہت پہلے بھی تھی، اُن کے زمانے میں بھی بڑی تابانی کے ساتھ قائم رہی اور اُن کے بعد آج بھی اُسی تیرگی میں وہی پُرانی چمک دمک اور وہی پُرانا دم خم باقی ہے ——— یہ معاملہ ہے انسانی سرشت و جبلت کا، سرشت و جبلت سے وہ لڑے جو سرشت و جبلت کو محو و معدوم کرنے کی قوت رکھتا ہو ——— کیا کانگریس کے حلقے میں ہے کوئی ایسا سورما جو خم ٹھونک کر سامنے آئے اور یہ دعوے کرے کہ میں انسان کی قلبِ ماہیت کرسکتا ہوں؟

ہاں شغلۂ جام و سبو جاری ہے — اب تک وہی رسمِ ہاؤ ہو جاری ہے
کھائی ہے کچھ انسان سے ٹکر ایسی — ہر دین کے ماتھے سے لہو جاری ہے

وہ جھوٹ، بار بار جو بولا گیا ہے آج — اِس وقت جس کے نام سے ہوتا ہے اختلاج
حق کی قلیل فوج سے کرتا رہے گا جنگ — بھرتا رہے گا ریب میں ربّانیت کا رنگ
ڈھلتا رہے گا قالبِ صوت و کلام میں — چھپتا رہے گا مطبعِ تبلیغِ عام میں
دائم رہے گا گرمِ سفر ایک حال پر — مخلوق کی حدیث و روایت کی تال پر
کھوتا رہے گا اپنی ضلالت گزیدگی — پاتا رہے گا شام و سحر سے رسیدگی
آتا رہے گا اہلِ جہاں کی زبان پر — چڑھتا رہے گا نشر و اشاعت کی سان پر
پکتا رہے گا ذہن کے مطبخ میں صبح و شام — گاتا رہے گا سانس کی نَے پر بہ التزام
بنتا رہے گا موجۂ تکرار میں گہر — سُلگتا رہے گا حرف و حکایت کی آنچ پر
چڑھتا رہے گا اوجِ نظر پر بصد حشم — کاندھے پہ ماہ و سال کے رکھتا ہوا قدم
گاتا رہے گا وہم کی بزمِ سرود میں — پلتا رہے گا وقت کی نادیدہ گود میں
لیتا رہے گا جائزہ نزدیک و دُور کا — پیتا رہے گا دودھ سنین و شہور کا
دامانِ عقل و جیبِ نظر پھاڑتا ہوا — ذہنوں کی رفعتوں پہ عَلَم گاڑتا ہوا
تا آنکہ ایک روز وُہی ناسزا دروغ — حاصل کرے گا حلقۂ عالم میں وہ فروغ

اُس جھوٹ کو صداقتِ اعلیٰ کہیں گے لوگ
آفاق کی حقیقتِ کُبریٰ کہیں گے لوگ!

(جوش)

انسانی زندگی اور اُس کی دواہمیت

ناظر

تمام حیوانات کے مقابلے میں حیاتِ انسانی کی امتیازی صفت اُس کا اخلاقی پہلو ہے۔ (اخلاقی پہلو سے مراد یہاں لازمی طور پر خوش خلقی یا علمی اخلاق سے نہیں ہے، بلکہ انسان کی اخلاقی ذہنیت سے ہے) کیونکہ واجبی اور غیر واجبی۔ مناسب اور غیر مناسب، صحیح اور غلط، بھلے اور بُرے کا احساس، اُس شعوری کیفیت سے تعلق رکھتا ہے جو انسانی زندگی کا خاصہ ہے، یہ شعوری کیفیت یا اپنی ہستی سے باخبری اور آگاہی انسان کو دیگر مخلوقات سے متمیز کرتی ہے، حیات کی اور جس قدر صورتیں ہیں اُن میں یہ صفت تقریبًا مفقود ہے۔ تمام ذی حیات ہستیوں میں انسان صاحب و قوف ہے، عقل اور استدلال اِسی شعور کے لوازم ہیں۔ تمام کائنات کا ارتقا اِسی شعوری کیفیت میں آکر منتہی ہوتا ہے، جس کا مظہر انسان ہے، یہی شعور اخلاق کی بُنیاد ہے اور ہمارے اختیار، ارادے اور آزادیٔ عمل کا سرچشمہ اور ہمارے مخصوص کیرکٹر کا ذمہ دار۔ حیاتِ انسانی کی یہ نفسیاتی خصوصیت تمام طبعی اور میکانیکل قوانین سے ماورا ہے، جس کی توجیہہ محض حرکتِ سالمی کی بنا پر بعید از فہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان دیگر بے زبان مخلوق کی طرح مادّی قوانین کی زنجیروں میں چار و ناچار اور اندھا دُھند طور پر جکڑ بند نہیں ہے، بلکہ اس کا ارادہ اور اختیار حقیقی اور اصلی شے ہیں، جو اس کو فاعل کی حیثیت بخشتی ہیں، اگرچہ اپنے مادّی جسم کے باعث اُس کو طبعی قوانین سے کلیتہً نجات حاصل نہیں، اور اُس کے بیشتر افعال قانونِ حرکت کے تسلسل لازمی کا ایک جز ہوتے ہیں، مگر بعض افعال کسی نصب العین یا مقصدِ پیش نظر کی پیروی اور متابعت میں ہوتے ہیں۔ جو میکانیکل افعال سے بالکل مختلف بلکہ برعکس ہوتے ہیں اور اِن انتخابی افعال میں اس کی حیثیت ایک فاعل کی ہوتی ہے، یہ سچ ہے کہ اس کا انتخاب خود اپنی جگہ پر نتیجہ ہوتا ہے، پیشرو حالات واسباب کا، اور یہ بھی سچ ہے کہ وہ تسلسلِ لازمی کی ہمہ گیری سے بالکل آزاد نہیں ہوسکتا، اور مقدر و معین کائنات میں اس کے افعال مستثنیٰ نہیں ہوسکتے۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ کیفیتِ شعوری کے تقاضے سے اس کے افعال میں ایک انتخابی عُنصر پایا جاتا ہے جو کائنات میں دوسری جگہ نہیں ملتا۔ اور اگرچہ اُس کے افعال میں اختیار کا دائرہ کتنا ہی محدود اور تنگ ہو، مگر اُس کے وجود سے قطعی انکار نہیں کیا جاسکتا، اس تمام بیان کا ماحصل یہ ہے کہ شعور انسانی زندگی کی مخصوص صفت ہے، جو ارتقائے حیات کی انتہائی منزل ہے، جس انسان میں یہ شعور جس قدر ترقی یافتہ ہوگا، اُس کی انسانیت اُسی قدر بلند اور ارفع ہوگی، اُس کی قوت مدرکہ ایسی چیزوں کا ادراک کرسکے گی جو محض طبعی نظام کے ماتحت ناممکن ہے، ایک فطری شاعر یا پیغمبر کی بصیرت اُسی شعوری کیفیت کی ترقی یافتہ صورت ہے اور یہ کہنا شاید مبالغہ نہو کہ اس شعور کی حد کمال عبادت ہے خدا سے۔ اسی شعور کی بنا پر انسان کو خدا کا خلیفہ یا نائب کا لقب ملا۔

یہاں پر ضمنی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مختلف آدمیوں کی کیفیتِ شعوری کے کم و بیش ہونے کی کیا وجہ ہے، کیا اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ جس آدمی کی کیفیتِ شعوری زیادہ ترقی یافتہ ہے وہ پہلے بہت سی زندگیاں طے کر چکا ہے، اس سوال کا جواب تناسخ کے مسئلہ کے سلسلے میں آگے آئیگا یہاں پر صرف اسی قدر کہہ دینا کافی ہوگا کہ کسی انسان کے نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ شعور کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ خود متعدد زندگیاں طے کر چکا ہو، بلکہ اس کے آباء اجداد کی زندگیاں اور متمدن ماحول میں اُن کا سلسلہ وار ارتقا اور دیگر مخصوص حالات اس اختلاف اور عدم مساوات کی توجیہہ کرنے کے لئے کافی ہیں۔

غرض یہ شعوری کیفیت انسانی زندگی کی ممتاز ترین صفت ہے اور اخلاقی احساس کی جڑ۔ اگرچہ ہر سوسائٹی میں "اچھا اور بُرا" "جائز اور ناجائز" "درست اور غلط" کا معیار مختلف ہے، مگر اس کا احساس انسانی زندگی کا لازمہ ہے، انسانی زندگی کے اِسی اخلاقی پہلو کو استوار کرنے کے لئے مذہب نے کار فرمائی کی، اِسی لئے انسانی زندگی کے لئے مذہب کی ضرورت کسی نہ کسی شکل میں تسلیم کی جاتی رہی۔ اور تہذیب و تمدن کے ارتقا میں اُس نے بہت بڑا حصّہ لیا۔ اور اگرچہ اُن رسم و رواج اور روایات نے جو مذہب کے نام سے قائم ہوئیں، مذہب کو بدنام کر دیا۔ مگر مذہب کا تعلق جہاں تک تہذیب اخلاق سے ہے وہ ضروری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نیک آدمی بننے کے لئے انسان کو غیر فطری زندگی بسر کرنا چاہیئے۔ مگر ایسے معترضین کے ذہن میں فطری زندگی کا جو تصور ہے وہ اُس حیوانی زندگی کا ہے جو بظاہر مطلق العنان اور تمام قیود سے بری ہے۔ یہ بھی ایک غلط فہمی ہے، انسان کی فطرت حیوان کی فطرت سے مختلف ہے اور اس لئے ایک کی فطری زندگی وہی نہیں ہو سکتی جو دوسرے کی ہے۔ اگر انسان میں شعور نہ ہوتا تو بے شک وہ حیوانی زندگی کی سطح سے بلند نہ ہوتا۔ اور اس کو نیک بنانے کے لئے غیر فطری زندگی پر مجبور کیا جاتا جس طرح پالتو جانوروں کے ساتھ برتاؤ کیا جاتا ہے۔ مگر شعور انسانی زندگی کی فطرت ہے۔ اور اس لئے اخلاقی زندگی جو شعور سے متعلق ہے، انسان کے لئے عین فطری ہے۔ حیوان کی ظاہری مطلق العنانی اور آزادی بعض لوگوں کے لئے قابلِ رشک ہے، مگر حقیقت میں وہ مجبورِ محض ہے۔ وہ بہی اور مادّی قوانین کی زنجیروں میں انسان کے مقابلے میں زیادہ جکڑا ہوا ہے۔ انسان کو اپنے شعور کے باعث کسی حد تک آزادی حاصل ہے۔ پھر اس کی مدنیت بھی فطری ہے اور یہ حیوان کی طرح مطلق العنانی کی روادار نہیں ہو سکتی۔ غرض انسانی زندگی کے لئے کوئی اخلاقی معیار مقرر کرنا عین فطرت ہے اور یہی اس کی فطری زندگی ہے،

بعض لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ انسانی زندگی جس نہج پر گامزن ہو وہی اُس کی فطرت ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو نہ صرف انسانی زندگی بلکہ تمام دُنیا جس نہج پر چل رہی ہے، وہی اصلیت، حقیقت اور فطرت ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور حقیقت نہیں ہے جس کی تلاش ہو۔ حقیقت کوئی ایک شے نہیں ہے، جو تنگ اور محدود ہو، نہ وہ کوئی خیالی چیز ہے، اُس کے بے شمار پہلو ہیں اور دُنیا کی یہی گوناگونی عین حق ہے۔ گویا واقعیت ہی حق کی مرادف ہے اور اس لحاظ سے اخلاقی معیار فضول شے ہے، اور غلط اور صحیح۔ مناسب اور نامناسب، واجبی اور غیر واجبی۔ جائز اور ناجائز۔ بھلا اور بُرا۔ یہ سب الفاظ دھوکہ پر مبنی ہیں، نیز مذہب کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، اور اِن حالات میں اگر کسی مذہبی تلقین کی ضرورت رہتی ہے تو یہی کہ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ مقدر ہے یعنی ایسے پیشتر اسباب کا نتیجہ ہے جو انسان کے قابو سے باہر ہے۔ ازل سے ایسا ہی ہونے والا تھا۔ یہی عین حق ہے اور انسان کے لئے بہترین مسلک یہ ہے کہ وہ راضی برضا رہے۔

لیکن اس خیال کی رُو سے انسانی زندگی بالکل میکانیکل رہ جاتی ہے اور یہ خود واقعیت کے خلاف ہے، کیونکہ انسان کے ارادے، اختیار اور انتخاب کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اور کیفیت شعوری کے موجود ہوتے ہوئے انسانی اعمال و افعال کو خالص میکانیکل قرار دینا لغو ہے، پھر انسان کی اپنے اعمال کی ذمہ داری اور ان کی سزا اور جزا سب بے معنی چیزیں رہ جاتی ہیں۔ اور تمام نظامِ عمل درہم برہم ہو جاتا ہے۔ واقعیت کو حقیقت قرار دینا غلط نہیں، مگر کسی چیز کے واقع ہونے میں جس قدر اسباب کارفرما ہوتے ہیں اُن میں انسان کا ارادہ اور قوتِ فاعلی بھی شامل ہے، خواہ اُس کی قوتِ فاعلی دیگر اسباب و علل سے متاثر ہوئی ہو۔ مگر جب تک کسی فعل کے ارتکاب میں وہ بھی شامل ہے اس سے اغماض نہیں کیا جا سکتا، اور فعل کو بہتر بنانے کی کوشش کسی دھوکے پر مبنی قرار نہیں دی جا سکتی۔ اور اُس کو معطل کرنے کا مشورہ دینا خود انسانی فطرت کے خلاف ہے۔

ہرچندکہ جبریت (Determinism) کا دائرہ انسانی آزادیٔ عمل کو بہت محدود کئے ہوئے ہے۔ مگر آزادی کا ایک شائبہ بھی اخلاقی معیار کا متقاضی ہے۔

انسانی زندگی کا اخلاقی پہلو ایسا پہلو ہے جس کی توجیہہ سائنس کے نظریات کے ذریعہ نہیں کی جاسکتی۔ ایک ظاہر بین عالم طبعیات انسان کے ہر فعل کی توجیہہ قانونِ حرکت کے تحت میں کرتا ہے، جس میں آزادی کی گنجائش نہیں، اور ایک باطن بین ماہرِ نفسیات اُن کو اختیار، ارادے اور شعور کا مظاہرہ سمجھتا ہے، جو ساری کائنات کی علت غائی اور روحِ رواں ہے، ہمارا شعور، عقل، قوتِ تمیز اور انتخاب ہمارے لئے ہر وقت ایک مطمحِ نظر تجویز کرتے رہتے ہیں، اور یہی ہماری زندگی کا اخلاقی پہلو ہیں۔ جو کچھ "ہے" ہمارے حواس اس کا ادراک کرتے رہتے ہیں، اور جو "ہونا چاہیئے" اس کا حکم عقل و شعور دیتے رہتے ہیں، اور اس طرح تہذیب و تمدن کی ترقی عمل میں آتی رہتی ہے، ہمارا تقاضائے عقلی ہماری اخلاقی زندگی کی اساس ہے۔ اس طرح پر مذہب کا انسانی زندگی سے گہرا تعلق ہے۔ اور وہ اِس اخلاقی پہلو پر اس قدر زور دیتا ہے کہ معاشرت کی تمام ضروریات کو اُسی کے تابع کرنا چاہتا ہے اور یہ ایک حدتک حق بجانب ہے۔ کیونکہ انسانیت کے لحاظ سے یہی پہلو اہم اور ارفع ہے، زندگی کا اقتصادی پہلو پیٹ اور تن کی ضروریات سے متعلق ہے، اور وہ ادنیٰ تر ہے، سیاسی پہلو حفاظتِ خود اختیاری کی اجتماعی صورت ہے، تعلیمی پہلو جامع ہے، اور اس لئے انسان کی جملہ ضروریات سے متعلق ہے، مگر سب سے زیادہ اخلاقی پہلو سے۔ فنونِ لطیفہ جو رُوح کی غذا سمجھے جاتے ہیں، اُن کے لئے بھی مذہب نے اخلاقی معیار مقرر کر دئیے ہیں، غرض مذہب ہماری زندگی پر مسلّط ہے اور اگرچہ ہم نے عبادات۔ رسومات اور عقائد کی بیخ کُنی کرکے مذہب کی صورت مسخ کر دی ہے۔ مگر ہم اِس سے بالکل خلاصی حاصل نہیں کرسکے ہیں اور نہ کرسکتے ہیں۔ کیونکہ شعور ہماری ذات اور وجود کا خاصہ ہے، عقل اس کا لازمہ ہے، اور اقتضائے عقل اخلاق ہے، اور مذہب تہذیبِ اخلاق کا ذریعہ۔

عبادات مذہب کے قائم کردہ اخلاقی معیار کو برقرار رکھنے کے لئے تھیں اور عقائد عبادات کو قائم رکھنے کے لئے۔ تہذیب اور تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ عبادت کی ضرورت کم ہوتی چلی گئی۔ اور اُسی کے ساتھ عقائد میں بھی اضمحلال آتا گیا۔ مگر سزا اور جزا کا عقیدہ چونکہ اہم اخلاقی پہلو رکھتا تھا۔ اس لئے وہ انسان کی فطرت سے قریب تر تھا، اور کسی نہ کسی صورت میں برقرار رہا، سزا اور جزا کے عقیدے کے لئے حیات بعد الممات کا عقیدہ لازمی ہے، انسان بالطبع فطرت کے تمام مظاہر کی توجیہہ اخلاقی نقطۂ نظر سے کرنی چاہتا ہے، وہ دنیا کی ہر چیز کو "صحیح اور غلط" "بھلے اور بُرے" کی عینک سے دیکھتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اُمور جو محض قانونِ طبعی کے تحت میں وقُوع پذیر ہوتے ہیں، اُن کو بھی وہ اخلاقی ضابطہ کے تحت میں لانا چاہتا ہے، دُنیا میں عدم مساوات اور تفرقِ مراتب، مفلسی اور تمول، صحت اور بیماری۔ قوت اور کمزوری۔ معذوری اور توانائی۔ ان سب اُمور کی اخلاقی توجیہہ نظریۂ تناسخ کے ذریعہ کی گئی۔ فطرت کو اُس کے ظاہرا ظلم و ناانصافی کے الزام سے بری کرنے کے لئے انسان کو متعدد زندگیوں کا مالک قرار دیا گیا۔ اور دنیا کا تمام کارخانہ مکافات عمل کا مظاہرہ سمجھا گیا۔ کیونکہ انسانی زندگی بالکل بے معنی شے رہ جاتی ہے۔ اگر موت کے ذریعہ ہمیشہ کے لئے اس کا اختتام ہو جائے، خدا کی کائنات بہت ہی نامعقول سمجھی جانی چاہیئے، اگر انسانی زندگی کی بھلی اور بُری تمام عملی سرگرمیاں موت کی ایک ہی ضرب سے ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہو جائیں، کیونکہ اس صورت میں اس کے عمل کے نتائج کس پر مترتب ہوں گے، اور اعمال کا نتائج کے بغیر رہ جانا لغویت ہے، اس لئے حیاتِ انسانی کا سلسلہ جاری رہنا چاہیئے۔ اور اس لئے انسان کے لئے متعدد زندگیاں ناگزیر ہیں، اور پھر انسانی زندگی کا اگر کوئی مقصد ہے تو وہ ایک محدود زندگی میں پورا نہیں ہوسکتا۔ اُس کو تکمیلِ مقصد کے لئے دنیا میں بار بار آنے کی ضرورت ہے چنانچہ ایک ہی والدین کے متعدد بچوں میں ذہنی قوا کا برابر نہونا درحالیکہ وہ تقریباً یکساں حالات میں پرورش کئے گئے ہیں، جاہل ماں باپ کے ہاں غیر معمولی ذہانت والے بچہ کا پیدا ہو جانا۔ ہماری بعض چیزوں سے قدرتی مناسبت اور عدم مناسبت یعنی رغبت اور نفرت کے مبہم رجحانات وغیرہ وغیرہ۔ ان سب باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان پیشتر متعدد زندگیوں کے سلسلہ میں سے گزر چکا ہے۔ اگرچہ ان تمام باتوں کی کبھی وجوہات بیان کی جاسکتی ہیں۔ مگر پیدائشی نفع و نقصان اور کمی و بیشی کسی ایسے اخلاقی قانون کے ماتحت ہونی چاہیئے، جس میں حق تلفی اور ناانصافی کی توجیہہ ہوسکے۔ اور تلافی کی صورت مضمر ہو۔ بالفاظِ دیگر ہماری اخلاقی فطرت کی تشفی ہونی چاہیئے۔

انسانی زندگی کوئی مہمل اور بے معنی چیز نہیں ہے۔ اس کا شعور و وقوف۔

اس کی عقل و تمیز۔ اس کا اختیار و ارادہ۔ اس کی زندگی کو ایسی معنی خیز اصلیت اور حقیقت بخشتی ہیں۔ جو حیات کی دیگر صورتوں کو حاصل نہیں ہے۔ انسانی زندگی محض ایک مادی ہیولے نہیں ہے۔ اس کی کیفیت شعوری۔ اس کا وقوف و آگہی اس کو تمام کائنات میں فائق ہستی کا درجہ عطا کرتی ہے جس کی نفسیاتی خصوصیات میں حسِ اخلاقی مضمر ہے، جو اس کی زندگی کا امتیازی وصف ہے، اور اس لئے لازماً اور فطرتاً اس کے نزدیک نظامِ عالم کی کوئی توجیہہ معقول اور دل نشین نہیں ہوسکتی، تاوقتیکہ وہ اخلاقی پہلو پر مبنی نہو، مگر بعینہٖ وہی وجوہات جو مکرر زندگی کے نظریئے کی اختراع کا باعث ہوئیں، اس کی تکذیب کے درپے ہیں۔ ہماری عقل، شعور اور تقاضائے انصاف جس نے فطری ناانصافی کی توجیہہ تکرار پیدائش کے ذریعہ کرکے اپنی تشفی کرنی چاہی، اس نظریہ نے خود ان ہی چیزوں کے حق میں کمال بے اعتنائی سے کام لیا، کیونکہ اُس کو اپنے گذشتہ وجود کے متعلق کوئی شعور اور آگاہی نہیں، اور یہ عجیب انصاف ہے کہ ایک شخص کو ایسے اعمال کی سزا دی جائے۔ جن کے ارتکاب کا اُس غریب کو مطلق علم نہیں۔ ایک پیدائشی اندھے، لُولے، لنگڑے کے ساتھ فطرت کی ناانصافی کی تاویل اس طرح کرنا کہ وہ اپنی گزشتہ زندگی کے اعمال کی سزا پا رہا ہے عجیب قسم کا استدلال ہے، ایک ناانصافی کی توجیہہ دوسری ناانصافی سے کرنا مضحکہ خیز ہے۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ ہر شخص کو بتا دیا جائے کہ اس کو کس جرم اور گناہ کی سزا دی جا رہی ہے نہ صرف انصافاً یہ ضروری ہے، بلکہ اس لئے بھی کہ وہ آئندہ اس سے اجتناب کرے۔ ہر قانونی اور اخلاقی ضابطہ کی رُو سے اس کو متنبہ کرنا لازم ہے، مگر یہ گزشتہ زندگی کے اعمال کا مجرم ارتقائے حیات کے کسی درجہ پر بھی اپنے گناہ کی نوعیت سے آگاہ نہیں کیا جاتا۔ زندگی کا ایسا تسلسل عملی مقاصد کے لئے بیکار ہے، جس میں ہر انتقال پر شعور زائل ہو جائے۔ اور اس اندھی مکافاتِ عمل سے اُس اخلاقی تقاضے کی تسلی نہیں ہوتی جس کے لئے اس کے اختراع کی ضرورت پیش آئی، اور پھر یہ عجیب بات ہے کہ انسان کا شعور اس کے مادی جسم سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ نفسیاتی خصوصیت ہے جو اس کی رُوح سے متعلق ہے اور حامیانِ نظریہ کے نزدیک موت کے ذریعہ اُس کی رُوح فنا نہیں ہوتی، مگر پھر بھی اس کو اپنے گزشتہ وجود کا شعور نہ ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔

اگر کہا جائے کہ انسان کی نادانی اور ناواقفیت اور اپنے گذشتہ وجود اور اس کے اعمال کو بھول جانا اُس کو عقوبت اور مکافات سے نہیں بچا سکتا۔ ہر عمل کا نتیجہ اور اثر ضرور مترتب ہوتا ہے اور کرنے والے کا جہل اور نادانی لازمی نتائج کو وقوع پذیر ہونے سے باز نہیں رکھ سکتے۔ اگر آگ میں ہاتھ ڈالا جائے گا تو وہ ضرور جل جائے گا۔ ناواقفیت کا عذر کچھ کام نہ دے گا، مگر یہاں پر یہ غلطی ہے کہ جس چیز کو ثابت کیا جا رہا ہے اس کو پہلے سے فرض کر لیا گیا ہے اور اس فرضی عقیدے کی دلیل اس طرح پیش کی جا رہی ہے جس طرح ایک حتمی طبعی قانون ہوتا ہے، پھر اس طرح کے استدلال میں طبعی قانون اور اخلاقی قانون میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ وہ اخلاقی جواز اور انصاف کی توجیہہ باد رہوا ہو جاتی ہے، جس سے متاثر ہو کر نظریہ کا اختراع کیا گیا تھا۔ طبعی فطرت نادانی اور لاعلمی، سہو اور دھوکے کے افعال میں کوئی تمیز نہیں کرسکتی، مگر ایک ذی شعور فطرت کے لئے یہ تمیز ضروری ہے اور انصاف کا تقاضا ہے کہ دونوں صورتوں میں مختلف سلوک کیا جائے۔ مادی عالم کے قوانین کو علم اور لاعلمی سے کوئی سروکار نہیں، اس معاملے میں وہ اندھے ہیں اور اسی باعث انسان کی ذی شعور ہستی اُن سے مطمئن نہیں ہوتی، اور اخلاقی توجیہہ ڈھونڈتی ہے۔ اور اگر اخلاقی ضابطہ بھی ویسا ہی ہو جیسا طبعی ضابطہ تو پھر اخلاقی نظریئے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

کہا جاتا ہے کہ خود انسان کا بنایا ہوا قانون بھی نادانی کے عذر کو قابلِ سماعت نہیں سمجھتا، مگر یہ اُس کی اپنی معذوری کا اعتراف ہے کیونکہ اصلی اور بناوٹی لاعلمی میں امتیاز کرنے کا اس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں اور ایسی صورت میں اگر اس عذر کو تسلیم کر لیا جائے تو ہر شخص جھوٹ بول کر گلو خلاصی کرسکتا ہے اور ارتکابِ جرم پر زیادہ دلیر ہو جائے گا۔

امتیاز اور تفریق انصافاً ناروا ہے اور ذی شعور ہستی کے لئے عدمِ مساوات کی اخلاقی توجیہہ ضروری ہے، اگر اس تفریق کی وجہ گذشتہ نیک و بد اعمال ہیں تو ایک کے اعمال کا دوسرے سے نیک تر یا بدتر ہونا کس وجہ سے ہے، اگر اُس کی وجہ شعوری کیفیت کا کسی میں کم اور کسی میں زیادہ ہونا ہے اور شعور میں کمی بیشی کی وجہ ایک وجود کا دوسرے کے مقابلے میں ارتقائی سفر میں زیادہ زندگیاں طے کرنا ہے تو یہ فرق

کس طرح ہوا کہ ایک وجود نے دوسرے سے زیادہ زندگیاں طے کرلیں، متعاقبۃً زیادہ زندگیاں طے کرنے کی تین ہی وجوہات ہوسکتی ہیں یا تو یہ کہ ایک رُوح دوسری سے پہلے پیدا ہوئی اور اس لئے وہ زیادہ زندگیاں طے کرسکی یا یہ کہ روحوں کے جوہر میں کوئی ازلی اور قدرتی فرق تھا جس سے ایک نے دوسرے کے مقابلے میں زیادہ زندگیاں طے کرلیں اور یا یہ کہ اُن خارجی اسباب وحالات میں فرق تھا، جن سے ہر ایک رُوح کو مخصوص طور پر سابقہ پڑتا رہا۔ مگر یہ تینوں صورتیں تفریق اور ناانصافی کی ہیں اور جس چیز کی توجیہہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی وہ پھر بھی باقی رہ جاتی ہے۔

پھر چونکہ اس نظریئے کی رُو سے انسان کی موجودہ زندگی کی نوعیت اس کی گزشتہ زندگی کے اعمال کا نتیجہ ہے۔ اس لئے اس کے موجودہ کوائف مثلاً حالات واسباب کے ذریعے سے مقدر ہوچکے ہیں اس کی حرکات وسکنات، اعمال وافعال وہی راستہ اختیار کریں گے، جو حالاتِ ماسبق نے پہلے سے اُن کے لئے معین کردیا ہے، اور اُس کے حق میں واقعات کی رَو کو اُس سمت سے رُوگرداں نہیں کیا جاسکتا جو ازل سے اس کے لئے مقرر ہوچکی ہے اس کے لئے وعظ وپند، نصیحت و ہدایت سب بیکار ہے، کیونکہ وہ تسلسل لازمی کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے، اس کا اختیار وارادہ باطل ہے، وہ اپنے فعل کا مختار نہیں۔ اور ایسی حالت میں اخلاقی پہلو کا ذکر بے معنی ہے، اس حالت میں مصیبت زدہ کے ساتھ ہمدردی اور سلوک بھی روا نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ اپنی سزا بھگت رہا ہے، اور مجرم کی اعانت ودستگیری ٹھیک نہیں، جو نظریہ انسان کی ارفع ہستی کو اس قدر پستی کی طرف لے جائے، اور اس کو دیگر مخلوقات کی طرح مجبورِ محض ٹھیرائے، وہ یقیناً اخلاقی توجیہ کا مدعی نہیں ہوسکتا، بلکہ ایسی مجبور حالت میں اخلاق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تمام کائنات کے ارتقا کی انتہا کیفیت شعوری کا حصول ہے اور جب وہ حاصل ہوجائے تو اس کا فنا ہوجانا ارتقا کا بطلان ہے۔ اس کی دوامیت اور تسلسل لازمی ہے اور چونکہ وہ کیفیت وجودِ انسانی میں جلوہ گر ہوتی ہے، اس لئے انسانی زندگی کا تسلسل ضروری ہے، مگر مکرر زندگی کے مذکورہ نظریہ میں جہاں حیاتِ انسانی کے تسلسل کو نبھانے کی کوشش کی گئی ہے، وہاں کیفیت شعوری کے تسلسل کو نظر انداز کردیا گیا ہے جو اصل مقصد تھا، لیکن جب یہ نظریہ غلط ہے تو پھر کونسی صورت ہے جس میں شعورِ انسانی کی دوامیت پائی جاتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب تک انسانی وجود کی انفرادی حیثیت پر زور دیا جائے گا، یہ معمہ حل نہیں ہوگا، منفرد زندگی نہیں بلکہ سوسائٹی کی زندگی صحیح معنوں میں مسلسل زندگی ہے، چنانچہ جب زندگی کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بتدریج ارتقائی منازل طے کررہی ہے، تو اس کا مقصد اجتماعی زندگی سے ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے انسانی زندگی کی انفرادی حیثیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ اخلاق کا تعلق منفرد انسان ہی سے ہے۔ اور انفرادی اعمال کی سزا اور جزا کے لحاظ سے انفرادی زندگی کے جاری رہنے کی ضرورت ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے، اور اس کی انفرادی زندگی اپنے تمام افعال میں سوشل اہمیت رکھتی ہے، اور جب اس کے انفرادی افعال کے متعلق اخلاقی نقطۂ نظر سے فیصلہ کیا جاتا ہے، یعنی اُس کے اچھے یا بُرے ہونے کا حکم لگایا جاتا ہے تو وہ بھی سوشل اثرات ونتائج کی بنا پر ہوتا ہے، اور جب اس نظر سے دیکھا جائے تو دستِ اجل سے نہ تو اُس کے اچھے اعمال ضائع ہوتے ہیں اور نہ بُرے اعمال عقوبت سے بچنے پاتے ہیں، کیونکہ اُن کے اچھے اور بُرے نتائج اور اثرات سوسائٹی پر مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ خود اُس کی ذات تو زندگی کے اختتام پر عواقب اور سزا اور جزا سے بچ جاتی ہے۔ تو یہ غلط ہے، کیونکہ مسئلۂ زیر بحث میں جسمانی انفرادیت سے مراد نہیں ہے بلکہ اُس کے شعور سے مراد ہے اور اعلیٰ سوسائٹی میں انفرادی شعوریت سوسائٹی کے شعور کا جزو ہوتی ہے۔ ہم جان بُوجھ کر ارادتاً سختیاں اُٹھاتے ہیں اور تکالیف مول لیتے ہیں محض اس لئے کہ ہماری آئندہ نسلیں مستفید ہوسکیں۔ نفسانیت اور انفرادیت کے لئے اجتماعی زندگی میں کہیں جگہ نہیں ہے۔ ایک ترقی یافتہ سوسائٹی میں ذاتی مفاد اجتماعی مفاد کے ہم آہنگ ہوتا ہے۔ علوم وفنون کی ترقی میں انفرادی کوشش موت سے ختم نہیں ہوجاتی بلکہ سوسائٹی کے دوسرے ارکان اس سلسلے کو ٹوٹنے نہیں دیتے، اور اس طرح حیاتِ انسانی کی ارتقائی منزلیں ہر حیثیت سے طے ہوتی رہتی ہیں، اور اس متحدہ زندگی میں فطرت کی ناانصافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہر ایک چیز کا بدل

خود بخود ہوتا رہتا ہے۔ کیونکہ ہر چیز کی بازگشت کا دائرہ انفرادی زندگی کے مقابلے میں سوسائٹی کی زندگی میں کہیں زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ سوسائٹی کے افراد جس قدر آپس میں مربوط ہوں گے اسی قدر زندگی خوش حال ہوگی، یہی وہ زندگی ہے جس کو شعور انسانی کی معراج کہنا چاہیئے۔

نعرۂ بغاوت

ضیاء الدین احمد سلہری

بھول جاؤ ——

خدا کو کہ وہ سرمایہ داروں کا خدا ہے۔
بہار کے بعد خزاں اور موت کے بعد حیات
کی اُلجھنوں کو اُس نے افسانہ بنا دیا ہے۔
غریب کے احساسات کو خاک سمجھتا ہے۔
اور امیر کی خوشی کو مقدم

ہاں خاموش کر دو
مدحِ فیضانِ قدرت کے ساز کو
کہ اُس کے تاروں سے
مہیب چیخیں نکل رہی ہیں
اُس کی حمد و ثنا بیکار ہے۔
اُس کے گُن گانا فضول

قدرت نے مفلسوں کو کیا دیا؟
پامال احساسات!
مردہ حسرتیں!
دردناک آہیں!
سُوکھے ہوئے ہاتھ!
اور خشک لب

اے غریبو! قدرت بے پرواہ ہے
تم اپنی پیشانیاں کیوں رگڑ رہے ہو
تمہارے سجدے بیکار ہیں

اُسے صحرا میں پسند نہیں
اُسے دلسوز حقیقتوں سے نفرت ہے
اُسے اگر دلچسپی ہے
تو امیروں کے محلوں سے!
سرمایہ داروں کے افتخار سے!
مغروں کے ناز سے

ہاں سرمایہ داری اور قدرت ایک ہے
توڑ دو نازک سہائے سمع خراش کو
کہ اُن سے خوشامد کی راگنیاں نکل رہی ہیں
دفن کر دو اپنی چیخوں میں اُس کی نفیری کو
کہ یہ اُسے مغرور بنا رہی ہیں
انسانیت شیطنت بن رہی ہے
اور قدرت اُس کی پشت پناہ ہے
اے روندی ہوئی مخلوق
اُٹھ کہ قدرت کی حکومت تیرے لئے موجبِ ہلاکت ہے
اُس کے دیار میں صرف موسیقی کی ہم آہنگ و دلفریب آواز ہی داخل ہو سکتی ہے
جاہ و جلال کی زلیخائیں ہی وہاں قدم رکھ سکتی ہیں
تو پھر تو کیوں اپنی افلاس سے دبی ہوئی آواز سے اُس کو پکار رہا ہے
تیری دعاؤں کے لئے وہاں انگاروں سے مسلح فرشتوں کا پہرہ ہے
تیرا قدرت پر اعتماد ہے؟
اُٹھ کہ تو اپنے مستقبل کا مالک ہونا چاہتا ہے
اپنی قسمت کا آقا بن
اور قدرت سے انتقام لے ——— انتقام ——— !
انتقام! ——— انتقام!

انسانیت سے ارفع و اعلیٰ کوئی مذہب نہیں

محمد خلیق ابراہیم لکھنوی

(۱)

سیٹھ شنکر چند نے اپنی لڑکی اُوشا کو انٹرنس کرا کے ولایت بھیجدیا، اُوشا اُن کی اکلوتی لڑکی تھی۔ لڑکے کی آرزو میں سیٹھ جی کی تمام عمر گزر گئی، مگر لڑکا نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ اوشا کو وہ اپنے لڑکے ہی کی جگہ پر سمجھتے تھے، بیحد چاہتے تھے، اور اُس کی تعلیم پر بیدریغ روپیہ اُٹھا رہے تھے۔ اُوشا کی منگنی اُنھوں نے اُس کی شیر خوارگی کے زمانے ہی میں اپنے ایک دوست جسٹس مہندر پرتاب کے لڑکے کے ساتھ کر دی تھی۔ مہندر پرتاب نے لڑکپن ہی سے لڑکے کو امریکہ بھجوا دیا تھا، وہ کہتے تھے کہ تعلیم و تربیت امریکہ میں بہ نسبت انگلستان کے زیادہ بہتر ہوتی ہے، سیٹھ شنکر چند بڑی سوجھ بوجھ کے آدمی تھے۔ اُنھوں نے خیال کیا کہ اگر اوشا کو معمولی تعلیم دلواتے ہیں تو شاید شادی کے بعد اُس سے اور نریندر سے نہ بنے، اُن کے خیال میں میاں بیوی کا ہمخیال اور ہم معاشرت ہونا بیحد ضروری تھا، یہی خیال کر کے انٹرنس کے بعد اُنھوں نے اُوشا کو آکسفورڈ بھیج دیا، اُوشا کی ماں سیٹھ جی کے اس عمل سے بیحد ناراض تھیں۔ مہینوں اُنھوں نے سیٹھ جی کو طعنے دے دے کر اور باتیں سُنا سُنا کر اُن کی زندگی اجیرن کر دی، وہ کہتی تھیں "بھیجا تو ہے بٹیا کو ولایت، کرسٹانی ہو کر نہ آئے تو جو کہو سو ہار دوں"

سیٹھ جی بڑے پریشان تھے، اور کبھی کبھی پچھتاتے بھی تھے کہ آخر اُنھوں نے لڑکی کو کیوں ولایت بھیجا۔ پھر یہ خیال کر کے کہ "اوشا کی ماں تو جاہل ہے۔ میں اُس کی وجہ سے اپنی لڑکی کی زندگی تھوڑی برباد کر دوں گا۔ میں نے جو کچھ کیا بالکل ٹھیک کیا" اپنے دل کو ڈھارس دے لیا کرتے تھے۔

(۲)

اُوشا صورت و سیرت کے لحاظ سے بہترین لڑکی کہی جانے کے قابل تھی۔ وہ بیحد خوبصورت تھی، بالکل دیوی کی طرح۔ اُس کا جسم نرم تھا، اور نازک، سرتاپا وہ ایک ملائم پنکھڑی تھی۔ گلاب کی سی پنکھڑی، سیرتاً بیحد نیک اور خلیق، جس شخص سے ایک بار ملتی ناممکن تھا کہ وہ اُس کا شیدا نہ ہو جاتا۔ صورت و سیرت کے علاوہ دماغی ارتقا میں بھی اپنا جواب نہ رکھتی تھی۔ بلا کی ذہین اور سُلجھے ہوئے دماغ کی مالک تھی۔ نہایت تیز اور بامحاورہ انگریزی بولتی اور انگریزی کے چوٹی کے رسائل میں اپنے مضامین بھیجتی جن کو پڑھ کر پبلک بیحد محظوظ ہوتی تھی۔ اُس کے مضامین میں ایک نمایاں خصوصیت تھی وہ مشرقی اور خاصکر ہندوستانی تخیلات کو اس خوبصورتی سے انگریزی کا جامہ پہناتی تھی کہ وہ انگریزی کے ادب لطیف میں ایک خاص حیثیت

رکھتے تھے۔

آکسفورڈ میں داخل ہوتے ہی تمام یونیورسٹی میں اُس کی دُھوم مچگئی۔ پروفیسر اُس پر فخر کرنے لگے۔ اور وہ انگریز طلباجن کی دھاک یونیورسٹی میں اُس کے آنے سے پیشتر بیٹھی ہوئی تھی دل ہی دل میں اُس سے جلنے لگے۔ وہ ہندوستانیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے کے عادی تھے۔ اُن کے خیال میں ہندوستان عمدہ دماغ پیدا ہی نہیں کرسکتا تھا۔ اُنھوں نے اُوشا کی تعریفوں کو اپنی توہین و تذلیل خیال کیا۔

بورڈنگ میں اُوشا کے کمرہ سے ملا ہوا کمرہ ایک ہندوستانی طالبعلم کا تھا۔ شاہد آکسفورڈ میں فلسفہ کا طالب علم تھا۔ اُس کے والد سرگرم کانگریسی تھے۔ اور اُسے سیاسیات کی لائن میں لانا چاہتے تھے۔ مگر فلسفہ کی طرف اُس کا بڑھتا ہوا ذوق دیکھکر اُنھوں نے اُسے آکسفورڈ بھیج دیا۔ شاہد کوئی خوبصورت نوجوان نہ تھا۔ لیکن پھر بھی یونیورسٹی کی لڑکیاں اُس کی بجد گرویدہ تھیں۔ اس کی دو وجہیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ اُسے عورتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اُن سے بچا بچا رہنا چاہتا تھا۔ نسوانی فطرت ہے کہ عورت اُس کی طرف زیادہ رجوع ہوتی ہے جو اُس سے بے اعتنائی برتے۔ نسوانی فطرت شکاری اسپرٹ رکھنے والی فطرت ہے۔ ہر نوجوان مرد کو اپنے دامِ حُسن میں پھانس لینا چاہتی ہے۔ لیکن ایسے لوگ جو جال کے اندر پڑے ہوئے دانے کے متمنی ہی نہ ہوں، اُسے ضد دلا دیتے ہیں اور وہ ہر امکانی کوشش اُن کو زیر کرنے کی کرتی ہے۔ شاہد کی اُسی بے رُخی نے یونیورسٹی کی لڑکیوں کو اُس کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔ دوسری خاص وجہ اُس کی مقبولیت کی نہ صرف لڑکیوں بلکہ تمام یونیورسٹی میں اُس کی فلسفہ دانی اور علمی قابلیت تھی۔ اُوشا کی طرح شاہد سے بھی بہت سے خود غرض طلبا رشک و حسد سے جلتے تھے۔ لیکن زیادہ تعداد اُن مخلص طلبا کی تھی جو اُس کی صحبت میں بیٹھنا فخر خیال کرتے تھے۔ فلسفہ میں اُس کی قابلیت لامحدود تھی۔ اکثر پروفیسر جو اِز بھی جو ایک مشہور فلسفی تھے اُس سے مشورے اور رائیں لیا کرتے تھے۔ یونیورسٹی میں تو یہاں تک مشہور تھا کہ پروفیسر اُس کو پڑھاتے ہوئے گھبراتے تھے کیونکہ بہت سے مسائل جن کو وہ بالکل درست اور ٹھیک سمجھتے تھے، شاہد اُن کو غلط ثابت کر دیتا تھا۔

اوشا کے یونیورسٹی میں داخل ہونے پر شاہد کو اُس سے باوجود عورتوں سے الگ تھلگ رہنے کے ایک دلچسپی سی پیدا ہوگئی۔ اس دلچسپی کا باعث دو باتیں تھیں۔ ایک تو اوشا کا علمی ذوق اور ذہانت۔ دوسرے اُس کا ہندوستانی ہونا۔ اوشا بھی ایک تو اپنی فطرت کے تقاضے، دوسرے شاہد کی علمی قابلیت، اور تیسرے ہموطن ہونے کی وجہ سے شاہد میں ایک خاص دلچسپی لینے لگی۔ اُس کی دلچسپی شاہد کی دلچسپی سے مختلف تھی۔ شاہد کے دل میں اوشا کی وقعت تھی، محبت نہیں، اوشا کے دل میں اُس کی فطرت کے مطابق جذباتِ محبت نشوونما پا رہے تھے گو اُسے اس کا احساس نہ تھا۔

(۳)

یونیورسٹی کے اوقات کے علاوہ اب دونوں کا زیادہ تر وقت ساتھ گزرتا جس میں علمی بحثیں ہوا کرتیں۔ شاہد کی صحبت نے اوشا کو بھی فلسفہ سے تھوڑا سا لگاؤ پیدا کر دیا تھا، اور اُسے شاہد کی فلسفیانہ باتوں میں بڑا لطف حاصل ہوتا تھا۔ اسی دوران میں اُوشا اس کوشش میں بھی لگی تھی کہ شاہد کو اپنا گرویدہ بنا لے۔ وہ ہر ممکن طریقہ سے شاہد کو مسحور کر لینا چاہتی تھی۔ وہ ہر علمی یا فلسفیانہ بحث میں موضوع کو توڑ مروڑ کر، محبت پر لے آئی تھی۔ شاہد کہتا تھا کہ وہ محبت وغیرہ کے بیکار موضوعات پر اپنا دماغ اور قیمتی وقت صرف نہیں کرسکتا۔ اُس نے محبت کے فلسفہ کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی، فلسفہ حاصل کرنے کا ذوق اُس کے دماغ پر اس قدر چھایا ہوا تھا کہ وہ دوسری چیزوں کی طرف متوجہ ہی نہ ہوتا تھا۔ اکثر اوقات اُس سے بالکل غیر فطری حرکات سرزد ہو جاتی تھیں۔ لیکن اوشا کی فطرت کے پے درپے حملوں نے اُس کے دل پر اثر کئے بغیر نہ چھوڑا۔ عورت کی فطرت مرد کی فطرت سے زیادہ نرم و نازک اور لطیف واقع ہوئی ہے۔ اُس کی رنگینی میں وہ طاقت ہے جو مرد کی فطرت کو اُس کے آگے سرنگوں کر دیتی ہے، وہ ایک خوبصورت اور حسین آبگینہ ہے جس کو دیکھتے ہی انسان دونوں ہاتھوں سے اُسے تھام لینے پر مجبور ہو جاتا ہے، اوشا نے آخر شاہد کو راضی کر ہی لیا کہ وہ فلسفۂ محبت پر غور و فکر کرے۔ یونیورسٹی کی اور لڑکیاں اس میں ناکامیاب رہی تھیں۔ کیونکہ شاہد اُن کو ایسے موقعے ہی نہ دیتا تھا کہ وہ کھل کر بات کرسکیں۔ ایک روز شام کو دونوں میں باتیں ہو رہی تھیں کہ اُوشا نے سوال کیا "شاہد آخر انسان کی کیا حقیقت ہے؟"

شاہد بولا "بس یہی کہ وہ خدا کی مکمل ترین ارتقائی مخلوق ہے، اور

اشرف المخلوقات کا درجہ رکھتی ہے۔"

اُوشا۔ لیکن اشرف المخلوقات تو دیوتاؤں یا تمہارے مذہب کے لحاظ سے فرشتوں کو ہونا چاہیئے۔ انسان صرف مجسمۂ نیکی تو ہے نہیں۔ خیر و شر دونوں اس میں موجود ہیں۔

شاہد۔ خیر و شر دونوں کا مظہر ہونا ہی تو اشرف المخلوقاتی کا سبب ہے۔

اوشا۔ یہ کیونکر؟

شاہد۔ میں اسے اسلامی نقطۂ نظر سے سمجھا ہوں۔ خدا نے پہلے صرف فرشتے پیدا کئے۔ شیطان کو نہیں پیدا کیا۔ معلم الملکوت وہی تھا جو سب سے زیادہ مکمل اور اکمل ترین فرشتہ تھا۔ اس کے بعد کے نتائج پر غور کرو جن کو تم اسلامی کتب میں مطالعہ کر چکی ہو تو تم کو معلوم ہوگا کہ در اصل ارتقائی اصول کے ماتحت فرشتہ کی انتہا اور معراج یہ ہے کہ شیطان ہو جائے۔ معلم الملکوت اکمل ترین فرشتہ تھا۔ اپنی معراج پر پہونچ کر شیطان ہو گیا۔ خدا جانتا تھا کہ ملکوتیت میں شیطنت کے اجزا مخفی ہیں اور اسی لئے اُس نے شیطان اور فرشتے ساتھ ساتھ نہیں پیدا کئے۔ گویا خیر کی انتہا یہ ہے کہ شر ہو جائے لیکن انتہا اچھی نظر سے نہیں دیکھی جاتی۔ لطف تو بین بین میں حاصل ہوتا ہے اور اسی لئے خدا نے انسان کی تخلیق کی جس میں ملکوتی اور شیطانی دونوں صفات موجود ہیں۔ گویا انسان خیر اور شر دونوں پر قابو رکھتا ہے اور یہی وجہ کائنات میں اُس کے اشرف ہونے کی ہے۔

اُوشا۔ تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ انسانی جذبات و احساسات کی تحریک یا تو خیر سے ہوتی ہے یا شر سے یا دونوں محرک ہوتے ہیں۔

شاہد۔ ہاں۔

اوشا۔ اور تم جانتے ہو کہ محبت بھی ایک جذبہ ہے خواہ وہ تمہارے خیال میں واہمہ ہی سے کیوں نہ پیدا ہوتا ہو۔

شاہد۔ ہاں، تو پھر۔

اوشا۔ تو یہ جذبہ خیر سے پیدا ہوتا ہے یا شر سے۔ یا دونوں برابر کے حصہ دار ہیں۔

شاہد۔ تم تو اُلٹ پُلٹ کر وہی اپنے بے تکے آئیڈیل پر کھینچ لاتی ہو۔

اوشا۔ اور تم ہمیشہ اس سے بھاگتے ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ محبت کی قوت اور عظمت کے تم بھی قائل ہو مگر اس ڈر سے کہ اس کا اثر تم پر نہ ہونے پائے اُس سے بچنا چاہتے ہو۔

شاہد۔ یہ تمہارا محض خیال ہے۔

اوشا۔ خیال ہی تو حقیقت ہے۔ تم کہتے تھے نا کہ دماغ میں کوئی ایسی بات آتی ہی نہیں جس میں حقیقت کا کچھ نہ کچھ شائبہ نہ ہو۔

شاہد۔ ہاں ٹھیک ہے، لیکن ـــــــــ

اوشا۔ (روٹھ کر) تم تو ذرا سا دوستی کا خیال نہیں کرتے۔ میں نے ایک بات پوچھی۔ اُس پر غور کر کے سمجھا دو تو کیا تمہارا علم کم ہو جائے گا؟ اور معلومات بڑھ ہی جائیں گی۔

شاہد۔ (ہنس کر) اچھا تو رُوٹھی کیوں جاتی ہو۔ دیکھو میں اس پر غور کروں گا۔

اوشا۔ بس اب تم میرے پکے دوست ہو

اوشا کے اس خاص ادا سے کہنے پر شاہد نے جو جواب دیا اُوشا اس سے سمجھ گئی کہ اُس کا جادو اب شاہد پر رفتہ رفتہ اپنا اثر کر رہا ہے۔

(۴)

اب شاہد نے فلسفۂ محبت پر غور کرنا شروع کیا۔ سینکڑوں کتابیں پڑھیں اور پروفیسروں سے اس موضوع پر مباحثے کئے۔ جس قدر زیادہ وہ غور کرتا اُسی قدر زیادہ اُس کے خیالات اور عقائد میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہوتا جاتا۔ اب وہ اُوشا کی اُن باتوں پر جو وہ محبت کے بارے میں کہتی مضحکہ نہیں اُڑاتا تھا۔ بلکہ کان دھر کے سنتا تھا۔ وہ صرف ایک خیال میں غرق رہتا تھا۔ محبت کیا ہے؟ وہ محبت کی حقیقت و ماہیت جاننا چاہتا تھا۔ اُس کے دل میں اوشا کے لئے ایک نئی جگہ پیدا ہو رہی تھی۔ وہ اوشا میں ایک کہربائی قوت۔ ایک مقناطیسی طاقت محسوس کر رہا تھا۔ وہ روز بروز اُس کو اپنے سے نزدیک تر پاتا تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نامعلوم طاقت اُس کی رُوح کو اوشا کی روح میں آہستہ آہستہ جذب کر رہی ہے۔ اُسے اب اوشا میں ایک کشش، ایک طلسمی کشش دکھائی دیتی تھی۔ وہ اُس کی غیر موجودگی میں اپنے کو کھویا ہوا سا پاتا تھا۔ اُوشا اُس کے دل و دماغ میں بس گئی تھی۔ اُس شیریں اور محبت آمیز باتیں اُس پر اور زیادہ طلسمی اثر کرتی تھیں۔ اُسے ایسا نظر آتا تھا گویا اُوشا عورت کے رُوپ میں محبت کا ایک مجسمہ ہے۔ اوشا اس اثر کو محسوس کر رہی تھی۔ اور اپنی کامیابی پر پھُولوں نہیں سماتی تھی۔ اُس نے

اپنی کوششوں میں اور زیادتی کر رہی تھی۔ ایک طرف تو وہ شاہد کو بیخود بنائے دیتی تھی اور دوسری طرف خود شاہد سے مسحور ہوئی جاتی تھی۔ تھوڑے عرصہ بعد خیر و شر کا فلسفہ تو دھرا رہ گیا اور میاں شاہد اپنے کو اوشا کا عاشق پانے لگے مگر عاشق بھی فلسفیانہ رنگ کے۔

ایک روز شاہد اوشا سے کہنے لگا کہ "تم کو دیکھتا ہوں تو ساری کائنات حسین و خوبصورت معلوم ہونے لگتی ہے۔" اوشا نے کہا "واہ۔ کیا فلسفہ ہے آپکا، میری خوبصورتی سے دنیا کیسے خوبصورت ہو سکتی۔" شاہد بولا "خوبصورت پھولوں کے گلدستے کمرہ میں رکھو تو کمرہ کیوں خوشنما معلوم ہوتا ہے؟ اوشا! تم میرے لئے کائنات کی زینت اور سجاوٹ ہو۔ تمہاری صورت لطفِ حُسن پیدا کرتی ہے۔ اُس کے بعد میں ہوں اور میرا لطف۔ شراب تم نے دی اور مست ہونے والا میں۔ جب میں مست ہوا تو میرے لئے ساری کائنات مست ہو گئی۔"

اوشا۔ تم مست ہو گئے۔ تمہارے لئے کائنات مست ہو گئی۔ مگر مجھے کیا فائدہ پہنچا؟ کاش تم محبت میں اپنے رُوکھے فلسفے کو دخل نہ دیتے۔ فطرت کے مطابق انسانوں کی طرح محبت کرتے۔

شاہد۔ فائدہ نقصان تو ادنیٰ درجہ کا خیال ہے۔ میں تو نہایت خود غرض ہوں۔ اپنے مزہ میں اپنے جسم تک کو تو شریک نہیں کرنا چاہتا اور تم چاہتی ہو تم کو بھی اس مزہ میں شریک کر لوں۔ پرستش کا مزہ بت نہیں جانتا اور نہ بُت پرست اپنے بُت کو پجاری بنانا چاہتا ہے۔

اوشا۔ خیر میں بُت بننا نہیں چاہتی۔

شاہد۔ تو پھر کیا چاہتی ہو؟

اوشا۔ تم نہیں جانتے؟

شاہد۔ نہیں۔ اور نہ جاننا چاہتا ہوں؟

اوشا۔ پھر پوچھا کیوں؟

شاہد۔ غلطی ہوئی۔

اوشا۔ تو اُس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

شاہد۔ دیکھو اوشا! تم مجھے تباہ و برباد نہ کرو۔

اوشا۔ واہ! میں نے کیا کیا؟

شاہد۔ تمہارا کچھ نہ کرنا ہی تو قیامت ہے۔ تم عین دنیا ہو۔ تمہاری کشش۔ خدا کی پناہ!

اوشا۔ میرے لئے تم عین دنیا ہو۔ فطرت کی قوت سے پناہ محال ہے

شاہد۔ مگر انسانیت تو اسی قوت پر قابو پانے کا نام ہے۔

اوشا۔ فطرت کے ماتحت رہنے میں لطف و مزہ ہے۔ اس حالت کو بدلنا حماقت ہے۔

شاہد۔ لطف اور مزہ کی تلاش تھک جانے کے آثار ہیں۔ تھکنا مادۂ حیات کی کمی ہے۔ جو عیش و مسرت کی تلاش کرے اُسے سمجھو کہ معنوی موت مر گیا۔

اوشا۔ تمہاری باتوں سے دماغ چکرانے لگا۔ سمجھتی ہوں مگر دماغ نہیں جمتا۔ بلند مینار پر چڑھ کر نیچے دیکھو تو دل چاہتا ہے اپنے کو نیچے پھینک دو۔ پیر نہیں جمتے۔ جی چاہتا ہے تم کو بھی اپنے ساتھ نیچے گھسیٹ لاؤں۔

شاہد۔ مگر میری تنزلی سے تمہیں فائدہ؟

اوشا۔ تمہارے خیال میں یہ تنزلی ہے۔ میرے خیال میں فطرت کے ماتحت رہنا ہی ترقی کی معراج ہے۔ دوسرے فائدہ نقصان تو بقول تمہارے ادنیٰ درجہ کا خیال ہے۔ میں تو اپنے شوق کی رَو میں یہ چاہتی ہوں۔ مجھے نہ تمہارے نقصان کا خیال ہے نہ اپنے فائدے کا۔

شاہد۔ تمہاری نسوانیت کا تقاضا ہی یہی ہے۔ اُف! عورت کتنے بلند پرواز مردوں کو برباد کر چکی ہے، اور اُس پر ستم ظریفی یہ کہ معصومیت کا دعویٰ کرتی ہے۔

اوشا۔ مرد کیوں ایسے لاچار و بے بس ہو گئے کہ شیر کے صرف سایہ پر ہاتھ ڈالنے ہی سے درخت کی ڈال چھوڑ دیں۔ اور نیچے آ رہیں۔ اگر گر کا دلوں سے ڈرتے ہو تو بلندی پر چڑھنے کا خیال ہی کیوں کیا، گوشہ نشین ہو کر مخلوقِ خدا کو کوستے اور فریاد کرتے کہ عورتیں تجھ تک آنے نہیں دیتیں۔ اِن کو ہٹائے تو اُڑ کر آ جاؤں۔

شاہد۔ یہ تم کہہ رہی ہو کہ غیب سے آواز آ رہی ہے۔

اوشا۔ غیب کے علاوہ بھی کہیں سے آواز آتی ہے۔ تم کو اب میرا چیلا ہو جانا چاہیئے۔

شاہد۔ ہوں تو چیلا۔

اوشا۔ کہاں ہو، کہا تو مانتے نہیں میرا۔

شاہد۔ خدا کب اپنا کہا منواتا ہے۔

اوشا۔ پھر گمراہی کی طرف ڈھلکے۔

شاہد۔ دیکھو نا۔ کھیر پکانے کے لئے دودھ اور چاول پتیلی میں ڈال کے آگ سلگا دو۔ کیا چاولوں کو زبانی یا تحریری حکم دوگی کہ گھُٹ کر کھیر بنجاؤ؟ کیا چاول کے امکان میں ہے کہ نہ گھٹے اور کھیر نہ بنے۔ چاول کی گمراہی یہی اور صرف یہی ہے۔ کہ وہ یہ نہ سمجھے کہ ایک بالاتر قوت کے ہاتھوں کوئی دوسری چیز بن رہا ہوں۔

اوشا۔ ارے، تم تو پھر چلے ہوگئے۔

اُس نے اپنا سر شاہد کے بازو پر رکھدیا۔ شاہد نے جذبات سے مغلوب ہوکر پیار کرلیا۔ اوشا مسکرائی اور کہا: "فطرت کی قوت بے پناہ ہے"۔

(۵)

ان واقعات کو چار سال سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا۔ شاہد اور اوشا دونوں کی تعلیم سے فراغت کو صرف چھ ماہ رہ گئے۔ ان چھ مہینوں میں دونوں کا جوشِ محبت اور زیادہ ترقی کرتا گیا۔ دونوں ایک دوسرے میں کھوگئے، محبت کے عہد و پیمان ہوگئے۔ چونکہ ہندوستان کی فرقہ وارانہ فضا سے دُور تھے اور اپنے خیالات و جذبات کی رَو میں سب کچھ اپنے دماغ سے محو کئے ہوئے تھے۔ اس لئے دونوں میں سے کسی کو ذرا بھی خیال نہ آیا کہ وطن واپس جاکر اُن کی راہ میں کتنی دقتیں حائل ہوں گی۔ اب جو وطن واپس ہونے کا زمانہ قریب آیا تو ایک روز شاہد نے اوشا سے کہا "اوشا پیاری! دیکھو ہماری محبت کا کیا انجام ہوتا ہے"۔

اوشا۔ (گھبراکر) کیوں؟

شاہد۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ تمہارے والدین تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں دینا پسند کریں گے؟ میرے والد تو خیر بڑے روشن خیال ہیں۔ اُنکا خیال ہے کہ قومی یگانگت اور طاقتور ہندوستانی قوم بنانے کے لئے ہندو مسلم شادیوں کا رواج دینا بہت ضروری ہے۔ مگر تم کیا کروگی؟

اوشا۔ میرا ذاتی خیال بھی بالکل تمہارے والد جیسا ہے (پھر متفکر ہوکر) ہاں اب یہ سوچنا ہے کہ میں اپنے والدین کو کس طرح رضامند کروں (تھوڑی دیر بعد) خیر۔ والدین کے رضامند کرنے کا خیال بیکار اور عبث ہے۔ وہ لوگ حد درجہ کے فرقہ پرست اور متعصب ہیں ——— مگر ——— میں سب سے کنارہ کش ہوجاؤں گی۔ میں اپنے پریم کی بھینٹ اُن کی فرقہ پرستی اور تعصب پر نہیں چڑھا سکتی۔ میں اب قانوناً بالغ ہوں، لہٰذا وہ مجھ سے کسی بات میں زبردستی نہیں کرسکتے۔ گو مجھے کافی رنج انھیں چھوڑنے میں ہوگا ——— شاہد پیارے! تم کو متفکر ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اوشا نے یہ کہکر اپنے دل کو بہلا لیا۔ اُس کے دماغ میں آنے والے واقعات کے خاکے آتے تھے مگر وہ سب کو لاپرواہی سے اپنے دماغ سے نکال دیتی تھی۔ اُس نے خیال کیا کہ ہندوستان چل کر ان باتوں پر غور کروں گی۔ اتنے دن کیوں اپنا دماغ بیکار کے واسطے پریشان کروں۔

آخرکار نتیجہ معلوم ہونے کا دن آیا، شاہد اور اوشا اچھے ڈویژن میں کامیاب ہوئے۔ اُوشا نے سیٹھ شنکر چند کو کراچی تار دیا کہ وہ ہوائی جہاز سے دوسرے روز ہندوستان کے لئے روانہ ہوجائے گی۔ شاہد نے بھی اُس کے ساتھ ہی رختِ سفر باندھ لیا۔ وہ لکھنؤ کا رہنے والا تھا۔ اُس نے کہا کہ کراچی ایروڈروم سے لکھنؤ اپنی آمد کا تار دوں گا اور ریل کے ذریعہ سے لکھنؤ پہونچوں گا۔

دوسرے روز شاہد اور اوشا "امپیریل ایرویز" کے ایک جہاز پر ہندوستان روانہ ہوئے۔ جہاز کا ایک کمرہ اُن کے لئے ریزرو تھا، رات کو اوشا نے شاہد کے گلے میں ہاتھ ڈال دئے، اور اُس کے گلے کا ہار ہوگئی۔ شاہد کا ضبطِ نفس جواب دے گیا۔ جذبۂ محبت کا فعل جسم پر زوروشور سے ہونے لگا۔ پہلے دونوں کے گال ملے۔ پیار شروع ہوئے، پہلے چند پیار انسانیت کے تھے، تہذیب و شائستگی اُن میں تھی۔ مگر اوشا کے سینے کی گدازگی سے جب شاہد کا جسم مَس ہوا تو اس سربستہ راز اور اُس کی مسرتوں کی تلاش میں وہ مصروف ہوگیا۔ اب جو پیار شروع ہوئے وہ انسانیت سے خارج تھے۔ شاہد اور اوشا دونوں غیر انسان تھے، عالمِ لذّات میں دونوں غائب تھے جسم جو جہاز پر دکھائی دیتے تھے وہ اُن کی غائب شدہ ہستی کی پرچھائیاں تھیں۔

(۶)

ساتویں روز صبح چھ بجے ہوائی جہاز کراچی ایروڈروم پر اترا، سیٹھ شنکر چند، سُریندر جو امریکہ سے واپس آچکا تھا اور بہت سے لوگ استقبال کے لئے موجود تھے۔ سیٹھ جی اُوشا کو دیکھتے ہی باغ باغ ہوگئے

اُس نے شاہد کا سب سے تعارف کرایا اور کہا کہ تم آج شام تک ہمارے ہی یہاں ٹھیرو۔ رات کی گاڑی سے لکھنؤ چلے جانا۔ سیٹھ جی نے شاہد کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا۔ خاصکر جب اوشا سریندر سے رُکی رُکی ہی تو اُن کو سخت تعجب اور بیحد غصہ آیا۔ مگر اپنے غصے کو دبائے رہے۔

دن بھر اوشا زیادہ تر شاہد سے باتیں کرتی رہی جس کو اُس کے والدین اور سریندر وغیرہ نے اچھی نگاہ سے نہ دیکھا۔ اُس کی ماں نے سیٹھ جی سے کہا "اچھا بٹیا نے ملچھ سے دل لگایا ہے۔ باتوں سے فرصت ہی نہیں" سیٹھ جی بولے "روشن خیال لڑکی ہے کوئی بات نہیں۔ وہ لڑکا آج رات کو تو چلا ہی جائے گا۔

اُوشا کی ماں۔ ہاں، بٹیا ولایت کیا ہو آئیں کہ باپ پھولے ہی نہیں سماتے۔ وہ جو کچھ کریں سب ٹھیک ہے۔ خیر۔ مجھے کیا؛ خود ہی پچھتاؤگے۔

سیٹھ جی۔ تم تو پاگل پن کی باتیں کرتی ہو۔ یہ کہہ کر وہ باہر چلے گئے۔

شام کو شاہد لکھنؤ روانہ ہوگیا۔ جانے سے پیشتر اوشا میں اور اُس میں قریباً ایک گھنٹہ تک راز دارانہ طور پر گفتگو ہوتی رہی۔ اوشا اُسے اسٹیشن پہنچانے گئی۔ اسٹیشن ہی پر سے شاہد نے اپنے والد کو اپنی آمد کی اطلاع بذریعہ تار دے دی۔

دو تین روز بعد سیٹھ جی نے اوشا سے کہا کہ اُن کا ارادہ ہے کہ اُسکی شادی ایک ہی آدھ ماہ کے اندر سُریندر سے کر دیں۔

اوشا بولی۔ ابھی جلدی کاہے کی ہے؟

سیٹھ جی۔ نہیں میری خوشی یہی ہے کہ جلد از جلد شادی ہو جائے۔

اوشا۔ پتاجی! میں آپ کو زیادہ عرصہ تک دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتی۔ بات دراصل یہ ہے کہ مجھے سُریندر سے ذرا بھی لگاؤ نہیں ہے۔

سیٹھ جی حیرت زدہ اور ہکا بکا ہو کر اُسے دیکھنے لگے۔ اُس کی ماں بولیں "دیکھا بٹیا کو ولایت بھیجنے کا نتیجہ۔ کیوں نہ ہو، روشن خیال لڑکی ہے (غصہ میں اوشا سے) اری اوشا! تجھ کو یہ کہتے شرم نہیں آتی۔ ہندو کنیا اور اتنی دیدہ دلیر۔ آنکھ کا پانی مر گیا۔ ایک تو آپ کے والد صاحب کو آپ کے مشورہ ہی کی کیا ضرورت تھی۔ ہمارا جو دستور ہے ہم اُسی پر عمل کریں گے۔ شادی بیاہ کے معاملہ میں تجھے دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں"

اوشا۔ واہ ماتاجی! میں ایسی باتوں میں آنے والی نہیں ہوں۔ اگر ایسا ہی تھا تو مجھے پڑھایا لکھایا ہی کیوں!

سیٹھ جی۔ نہیں بیٹی، کوئی زبردستی نہیں کر رہا ہے۔ مگر یہ تو سوچ کہ شادی سے پہلے تو کسی کو بھی اپنے پتی سے لگاؤ نہیں ہوتا۔ بیاہ بعد سب لگاؤ اور پریم ہو جاتا ہے۔

اوشا۔ نہیں پتاجی، میں سُریندر سے ہرگز شادی نہیں کرنا چاہتی۔

اوشا کی ماں۔ تجھکو کرنا پڑے گی۔ ہم برادری میں ذلیل اور کلمنھے تھوڑی بنیں گے۔

اوشا۔ نہیں ماتاجی، یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔

سیٹھ جی۔ اچھا تو پھر تو ہی بتا تو کس سے بیاہ رچانا چاہتی ہے۔

اوشا کی ماں۔ ارے رام رام۔ ذرا سی چھوکری اور یہ باتیں۔ اجی تم اور اُسے سر چڑھا رہے ہو۔

اوشا۔ ماتاجی، آپ اس بیچ میں نہ بولئے۔ پتاجی! سچ پوچھئے تو مجھے شاہد سے پریم ہے۔ میں اُس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اگر آپ میری زندگی چاہتے ہیں تو مجھے شاہد سے سول میرج، کرنے دیجئے۔ ہمارے بچے خالص قوم پرست بچے ہوں گے - - - - - - - - - -

یہ سننا تھا کہ سیٹھ جی اور اُن کی بیوی کا پارہ بیحد چڑھ گیا۔ لڑکی کو بہت مارا۔ اپنی بیوی سے سیٹھ جی بولے "بیاہ کا سامان کرو۔ پرسوں ہی سُریندر سے زبردستی اِس کا وِواہ کئے دیتا ہوں۔ ورنہ آگے بات بہت بڑھ جائے گی"

اوشا۔ (رو کر) پتاجی میں خودکشی کر لوں گی۔

سیٹھ جی۔ مر تو کہیں کلنکنی۔ یہ کہہ کر پنڈت جی غصہ میں باہر چلے گئے۔

دن بھر اوشا پر تھو تھو پھٹکار پڑتی رہی۔ رات کو باہر سے اُس کے کمرے میں قفل ڈال دیا گیا۔ مگر اتفاقاً دوسرا دروازہ جو باہر پائیں باغ میں کھلتا تھا کھلا رہ گیا۔

دوسرے روز صبح جب سب لوگ اُٹھے تو اوشا غائب تھی اور پائیں باغ والا دروازہ کھلا پڑا تھا۔ کمرہ میں سیٹھ جی کے نام حسبِ ذیل خط تھا۔

پتاجی! میں پہلے ہی ٹھان چکی تھی کہ فرقہ پرستی اور تعصب پر اپنے پریم کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتی۔ آپ لوگوں نے مجھ پر بیحد ظلم کیا۔ میں شاہد کے پاس جا رہی ہوں۔ امید ہے

کہ آپ اس واقعہ کا ہلڑ مچا کر اپنے کو بدنام نہ کریں گے۔
اگر آپ نے عدالتی چارہ جوئی کی تو میں صاف صاف
آپ کے خلاف بیان دوں گی۔ میں چونکہ اب قانوناً نابالغ
ہوں۔ لہٰذا آپ کو میرے معاملات میں دخل دینے کا کوئی
مجاز نہیں ہے۔

اوشا

سیٹھ جی کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اپنی بیوی کو خط پڑھ کر سنایا۔ گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ نریندر آیا ہوا تھا۔ وہ بولا "چاچا جی، جانے دیجئے، ایسی کلنکنی کا چلا جانا ہی اچھا ہے" مگر لڑکی کی محبت بغیر آنسو بہائے نہ رہ سکی۔ دونوں میاں بیوی کی عجیب حالت ہوگئی۔ چونکہ بیحد متعصب اور کٹر سناتنی تھے۔ اس لئے لڑکی کی محبت پر تعصب نے غلبہ پالیا اور چپکے ہو بیٹھے۔ گو اکلوتی لڑکی کے اس طرح نکل جانے کا صدمہ اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ مگر چہرے سے کوئی بات ایسی ظاہر نہیں ہوئی تھی جس سے پتہ چلتا کہ اُن کو اپنی لڑکی کے لئے تشویش ہے۔

(۷)

شاہد جب لکھنؤ پہنچا تو اُس کا زبردست استقبال اُس کے احباب کی طرف سے ہوا۔ اپنے باپ کے ساتھ چونکہ اکثر قومی پلیٹ فارم پر آچکا تھا اس لئے کافی ہر دلعزیز ہو چکا تھا اور ایک وسیع حلقۂ احباب رکھتا تھا۔ اُس کی آمد کی خبر سنکر لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے جو اُس کے استاد رہ چکے تھے اُس کا نام شعبۂ فلسفہ کے ہیڈ کی جگہ کے لئے جو خالی تھی نامزد کردیا، دوسرے ماہ سے اُس کی باقاعدہ تقرری اس جگہ پر ہونے والی تھی۔ باپ نے اُس سے کہا کہ وہ قومی کاموں میں بھی نمایاں حصہ لے۔ اُس نے کہا کہ میرا دماغ اور طبیعت اس کے لئے موزوں نہیں ہے کہ میں لیڈری کروں میں اپنے طور پر اپنے دوستوں میں اور ملنے والوں میں ضرور قومی خیالات کی تبلیغ صحبتوں کے ذریعہ سے کروں گا اور سماجی انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کروں گا۔

چند روز بعد اُس نے باپ کا عندیہ لینے کے لئے اُوشا کا حال بیان کیا، اور اُس نے اپنی محبت کا ذکر کیا۔ باپ بولے "بیٹا، یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ مسلمان لڑکا ہندو لڑکی سے محبت کرے، نہایت ذلیل خیال ہے۔ تم اُس کا خیال چھوڑ دو۔ خدا کے فضل و کرم سے تم ماشاء اللہ قابل و لائق ہو، ایک سے ایک اچھی مسلمان لڑکیاں تمہیں مل جائیں گی" شاہد باپ کی یہ گفتگو سنکر حیرت زدہ رہ گیا۔ اُس نے کہا "آپ ہی تو چند سال اُدھر اپنی تقریروں میں ہندو مسلم اتحاد پر زور دیتے تھے اور مخلوط شادیوں کو سراہتے تھے"

باپ۔ یہ تو میری پالیسی تھی۔ پبلک پلیٹ فارموں پر تقریریں عمل کیلئے نہیں کی جاتی ہیں۔ تم ہی سوچو میں کافروں کے ساتھ مسلمانوں کی شادیوں کو کیسے انگیز کرسکتا ہوں۔

شاہد۔ معاف فرمائیے گا۔ میں اس کو پالیسی، نہیں ریاکاری سمجھتا ہوں۔ اپنے نام و نمود کے لئے گرگٹ کے سے رنگ بدلنے کو سیاست اور پالیسی کا لقب دینا۔ میں ایسی سیاست اور پالیسی کا قائل نہیں ہوں۔

باپ۔ شاہد، تم نہایت بدتمیز ہوگئے ہو۔ کہدیا تم سیاست میں ابھی طفلِ مکتب بھی نہیں ہو۔ تم ان چالوں کو کیا جانو۔

شاہد۔ جناب میں خوب جانتا ہوں۔ ایسے ہی لیڈروں نے تو ملک کو تباہ کیا ہے۔

باپ۔ بس بس، جتنا خاموش رہتا ہوں اُتنا ہی سر چڑھا آتا ہے، نابکار! مجھے کیا معلوم تھا ولایت سے عیاش ہو کر آئے گا۔ میں اب تیری زبان سے اُس کافر بچی کا نام نہ سنوں۔

شاہد۔ ابا جان! اس معاملہ میں میں بالکل مجبور ہوں، اپنے ضمیر کو کسی غلط اصول پر قربان نہیں کرسکتا۔ اوشا میری ہے اور میری ہی رہیگی۔

باپ۔ ناخلف۔ اگر ایسا ہی ہے تو میرے گھر میں تیرے لئے ٹھکانا نہیں ہے۔

شاہد۔ (غصہ میں) بہت اچھا۔ اگر یہی حکم ہے تو میں تعمیل کو تیار ہوں۔

اس گفتگو کے تھوڑی دیر بعد شاہد اپنا سامان لے کر اپنے ایک دوست کے ہاں چلا گیا۔ اُس کے چلے جانے پر اُس کی ماں بیحد روئیں۔ اور باپ سے بولیں "لو خوش ہوئے جوان بیٹے کو گھر سے نکال کر"

باپ۔ ہاں تو بیٹے کو بٹھائے رکھتا اور ہندنی بیاہ لاتا۔

ماں۔ ہندنی کیسی۔ میں تو اُسے سمجھا بجھا لیتی۔

باپ۔ میں نے کوئی کم سمجھایا۔ وہ تو تم جانتی ہی ہو بچپن سے بیحد ضدی ہے۔

ماں۔ تو تمہارے سمجھانے پر وہ کیا بولا۔

باپ ۔ بولا کیا ۔ کہنے لگا میں بغیر اُس کے نہیں رہ سکتا ۔ ورنہ خودکشی کرلوں گا ۔

ماں ۔ خیر یہ بات بہت دن نبھنے کی نہیں ۔ چند روز بعد آپ ہی آجائیگا ۔ اور اگر نہ آئے تو میری جُوتی سے ۔ ہندنی کو تو میں کبھی اپنی بہو بناکر اس گھر میں نہیں لاسکتی ۔

(۸)

اُوشارات کو اپنے کمرہ سے ایک بیگ میں چند جوڑے کپڑے اور کچھ روپیہ اور زیورات لے کر سیدھی اسٹیشن پہنچی ۔ چونکہ اس وقت لکھنؤ کوئی گاڑی نہ جاتی تھی ۔ لہٰذا لاہور کا ٹکٹ لیا ۔ دوسرے روز شام کو لاہور سے سوار ہوئی ۔ اور تیسرے روز سہ پہر کو چار باغ پر اُتری ۔ ٹانگہ کیا شاہد کے والد کے مکان پر پہونچی ۔ وہ موجود نہ تھے ۔ نوکر سے شاہد کے اپنے دوست کے یہاں جانے کا حال معلوم ہوا ۔ پتہ پوچھکر وہاں پہنچی ۔ شاہد باہر ہی ٹہل رہا تھا ۔ اُسے دیکھتے ہی دوڑ کر لپٹ گیا ۔ اپنے دوست سے اوشا کا تعارف کرایا ۔ دونوں نے اپنی اپنی بپتیاں بیان کیں اور عہد کیا کہ اپنے سابقہ پیمان پر ثابت قدم رہیں گے ۔

دوسرے روز شاہد اور اُوشا کی سول میرج ہوگئی ۔ اُس کے بہت سے احباب ، یونیورسٹی کے پروفیسران اور وائس چانسلر صاحب تقریب میں شریک تھے ۔ وائس چانسلر نے دونوں کو بہت مبارکباد دی اور شاہد کی یونیورسٹی میں تقرری ہونے تک دونوں میاں بیوی کو اپنا مہمان بنایا ۔ شہر کے سوشلسٹوں اور روشن خیال لوگوں نے امین الدولہ پارک میں ایک عام جلسہ منعقد کرکے شاہد اور اوشا کو سماجی زندگی کے اس انقلابی قدم پر مبارکباد دی اور سماجی اصلاحات پر پُرمغز اور زبردست تقاریر کی گئیں ۔

شادی کے دوسرے روز ہندوستان بھر کے اخبارات نے نہایت جلی سرخیوں سے خبریں شائع کیں ۔ اوشا کی ماں اپنی بیٹی کی ایک مسلمان کیساتھ شادی کی اس تشہیر کو برداشت نہ کرسکیں اور زہر کھالیا ۔ سیٹھ جی کو بیحد غم ہوا ۔ لیکن مرد کی فطرت قوی ہوتی ہے ۔ وہ اپنے غم و غصہ کو ضبط کئے رہے ۔

شاہد کے باپ نے اُسے عاق کردیا ۔ اُن کے اس فعل پر اُن کی ساری سیاسی زندگی اور نام و نمود اکارت ہوگیا ۔ لوگوں نے کہا کہ کل یہی حضرت اس فعل کی تلقین کرتے تھے ، اور آج جب بیٹے نے اُس پر عمل کیا تو ایک دم سیدھے سادے مرد مسلمان بن بیٹھے ۔ اُن کی سوشل لائف بالکل بیکار ہوگئی اور وہ اپنی ریاست کے انتظام کی دیکھ بھال کے لئے دیہات چلے گئے ۔ شاہد نے کہا "ایسے لیڈروں کا ریٹائر ہوجانا ہی اچھا ہے" ۔ شاہد کی ماں غضب کے دل و جگر کی عورت تھی ۔ شاہد کو دیکھنے کی خواہش اُس کے دل میں رہ رہ کر اُٹھتی تھی ۔ اور بیٹے کی محبت دل میں چٹکیاں لیتی تھی ۔ مگر اُس نے اپنے دل پر پتھر رکھ لیا ۔ وہ حد درجہ کی متعصب عورت تھی تعصب نے بیٹے کی الفت کو ظاہرا دبا دیا ۔ مگر دل کے اندر کی چنگاری برابر سلگتی رہی ، اور چھ ماہ بعد ہی اس کا انتقال ہوگیا ۔ اس خبر کو سنکر شاہد نے اوشا سے کہا "اوشا پیاری ! دیکھو عورتوں کی تعلیم کی کس قدر زیادہ ضرورت ہے مرد اپنی فطرت کی وجہ سے پھر بھی راہِ راست پر جلد آسکتے ہیں ۔ مگر عورت کو سمجھانا ـــــ خدا کی پناہ ! ـــــ کسی کامل نے کہا ہے عورت قوموں کی بنانے والی ہے ۔ بھلا جس ملک کی عورتوں کے تعصب اور جہل کا یہ حال ہو کہ وہ تعصب کی بنا پر اپنی جانیں دیسکتی ہوں اُس ملک کے باشندوں کا کیا حال ہوگا" ؟

اوشا ۔ ہاں پیارے ۔ تعلیم نسواں واقعی ملک کے لئے سب سے زیادہ اہم مسئلہ ہے ۔

شاہد ۔ تو تم خواتین کی ایک انجمن قائم کرو ۔ ہر طبقہ اور ہر اعتقاد کی عورتوں کو اس کا ممبر بناؤ ۔ اپنے کو اُن میں ہر دلعزیز کرو اور پھر اپنے خیالات کا پرچار کرو ۔ اگر عورتوں پر تعلیم کی اہمیت ظاہر ہوگئی تو پھر دیکھو کیا رنگ ہوتا ہے ۔ ہر بیوی اپنے میاں پر مسلط ہوگی ۔ کہ لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کو بھی ضرور تعلیم دلاؤ ۔ قدیم خیالات کے مردوں کے بھی اس طرح سے درست ہوجانے کی امید ہے ۔

اوشا ۔ ہاں ، یہ بڑا مبارک خیال ہے ۔ تم وائس چانسلر صاحب سے بھی اُس کا ذکر کرو ۔ پھر ہم لوگ مل کر اس کارِ عظیم کو انجام دینے کی کوشش کریں ۔

(۹)

بیوی کے مرجانے سے سیٹھ شکھر چند کا دل ٹوٹ گیا ۔ کاروبار سے لاپرواہی برتنا شروع کردی ۔ دوستوں نے کوشش کی کہ کسی طرح یہ رنج کم

ہوجائے۔ اُن کی پے درپے کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیٹھ جی کو دُنیا سے دوبارہ لگاؤ پیدا ہونا شروع ہوا۔ مگر یہ لگاؤ پہلے لگاؤ سے مختلف تھا۔ پہلے وہ ایک گرہست آدمی تھا۔ اب گھر سے لاپرواہ۔ پہلے اُن کا دُکھ سُکھ بیوی کے دُکھ سُکھ میں ممزوج تھا۔ اب اُن کو دنیا کے "جو فروش گندم نما" لوگوں سے واسطہ تھا۔ پہلے اگر وہ غم سے متاثر ہوتے تھے تو اب کسی کو غمگین دیکھکر منہ پھیر لیتے ہیں۔ اب اُن کو دُنیا میں ہر طرف مسرت کی تلاش تھی۔ وہ عیش وعشرت میں اپنے کو فنا کر دینا چاہتے تھے۔ اُنھوں نے جُوا کھیلنا شروع کر دیا۔ شراب بھی اب اُن کے لئے آبِ حیات سے کم نہ تھی۔ لوگ اُن کی یہ حالت دیکھکر اُن کو بُرا بھلا کہتے تھے۔ عورتیں اُن پر نام رکھتی تھیں۔ ہر شخص یہی کہتا کہ دیکھو تو بڈھے کو کیا جنون سوار ہوا ہے۔ لیکن کیا واقعی وہ خطاوار تھے؟ سنگدل سماج جو کچھ کہے لیکن میں اُسے نہیں مان سکتا۔ سماجی بندشوں نے اُن کی بیٹی کو اُن سے علیحدہ کیا۔ اُن کی بیوی کو اُن سے ہمیشہ کے لئے جُدا کیا۔ اور اب اُنھیں بندشوں کو سراہنے والی سماج اُن کو موردِ الزام ٹھیرا رہی تھی۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ اگر ایک مرتبہ دلدوز اور متاثر کُن واقعات کی وجہ سے کوئی شخص تارکِ الدنیا ہو جائے اور اُس کے بعد پھر کسی طریقہ سے دُنیا کی طرف رجوع ہو تو وہ ہرگز ہرگز رنج وغم کا نام بھی نہ سُننا چاہے گا۔ وہ اُن کے تلخ تجربات خوب اُٹھا کے ہوتا ہے۔ وہ اب دنیا کو مسرت میں رنگی ہوئی دیکھنا چاہتا ہے۔ اس وقت بھی اگر کوئی شخص بغیر سختیاں جھیلے راہِ راست پر آ جائے تو وہ انسان نہیں کچھ اور ہی ہے۔ فرشتہ یا ابلیس!

غرضکہ یہ کہ اب سیٹھ لُکھم چند ہر وقت شراب کے نشہ میں مست یا تو جُوا کھیلتے رہتے تھے۔ یا ایک طوائف کے یہاں، جس سے اُنھوں نئی نئی راہ ورسم پیدا کی تھی۔ بڑے خوش گپیوں میں مصروف رہتے تھے۔ تھوڑے عرصہ کے بعد اُنھوں نے جُوئے کے ساتھ ساتھ طوائف پر سے بھی اپنی دولت بے اندازہ نچھاور کرنا شروع کر دی۔ خود حساب کتاب نہ دیکھنے کی وجہ سے کاروبار پہلے ہی بیٹھا جا رہا تھا، اب اور بدتر حالت ہو گئی۔ اُن کے مختار نے بہتر سمجھا یا مگر وہ اپنے آپے ہی میں کب تھے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ کاروبار بالکل بیٹھ گیا۔ قرض لینا شروع کیا گیا۔ دو تین سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ روپیہ یوں آسانی سے وصول ہونے کی امید نہیں ہے تو دعوے دائر کر دئے۔ بیسیوں مقدمات لڑے جاتے۔ رہا سہا سرمایہ اُن کی نذر ہو گیا۔ انجام بانیجا رسید کہ ڈگری ہو گئی۔ سیٹھ جی نشہ کی حالت میں مکان سے نکال باہر کئے گئے۔ اس وقت کوئی نہ تھا جس کو اُن پر رحم آیا ہو۔ اور جو ان کو پناہ دینے کے لئے تیار ہوا ہو۔ سماج کس قدر ظالم ہے۔ خود ہی انسان کو تباہ کرتی ہے اور خود ہی اُسے موردِ الزام بناتی ہے۔ سماج انسانیت کے خلاف ایک عظیم نظام ہے۔ دھوکا اور فریب سے لبریز۔

اسی نشہ کی حالت میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ٹھوکریں کھاتے ہوئے وہ اپنی طوائف کے یہاں پہونچے۔ اُسے پہلے ہی خبر ہو چکی تھی کہ سیٹھ جی کا دیوالہ نکل گیا ہے۔ کمرہ میں اُن کے قدم رکھتے ہی اُس نے "بدمعاش! بدچلن!" چلانا شروع کر دیا۔ بھڑووں اور سازندوں نے مار مار کر اور گالیاں دے دے کر سیٹھ جی کو کوٹھے سے دھکے دے دے کے باہر نکال دیا۔ مار کھا کر سیٹھ جی کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ اب اُن کی سمجھ میں واقعات کا سلسلہ آیا۔ آدمی سمجھدار اور ذہین تھے۔ اپنی بدقسمتی اور سماج کی سنگدلی پر بے انتہا پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ ظاہراً یہ فطرت کے خلاف ہے کہ کوئی عیاش شخص اس قدر جلد سنبھل جائے۔ لیکن عظیم الشان واقعات فوری انقلاب پیدا کرتے ہیں۔ گھڑی کی گھڑی میں سیٹھ جی کا قلاش ہو جانا اور بے گھر و بار ہو جانا اور اُس پر مزید اضافہ یہ کہ دُنیا کا ایک دم اُن سے آنکھیں پھیر لینا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ شروع سے اپنی زندگی کا پورا خاکہ اُن کے دماغ میں آیا اور نکل گیا۔ آج اُن کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ سماج کتنی سنگدل اور ظالم ہے۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہنے لگے" اوشا کتنا سچ کہتی تھی کہ پتاجی سماج ایک دھوکہ ہے۔ ایک رنگین دھوکہ۔ اس کی بندشیں مکروفریب سے پُر اور تعصب وبربریت سے لبریز ہیں"۔

اس حالت میں دن بھر سیٹھ جی ایک ایک کر کے اپنے دوستوں کے یہاں گئے کہ شاید کوئی رحم کھا کر اُن کو پناہ دینے پر تیار ہو جائے۔ بہتوں نے تو ملنے تک سے انکار کر دیا۔ اور جو ملے انھوں نے جھڑک کر کہا "ایسے بدمعاشوں کا ہمارے یہاں گزر نہیں، ہمیں اپنا گھر تھوڑی برباد کرنا ہے"۔ اسی آیند و روند میں رات ہو گئی۔ بھوک کے مارے سیٹھ جی کو چلنے کا یارا نہ رہا۔ سر چھپانے کو بھی کوئی جگہ نہ تھی۔ آدمی غیرتدار تھے۔ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ سڑک پر ایک دوکان کے آگے چبوترے پر لیٹ گئے اور

رات گزار دی۔ دوسرے دن دوپہر تک اپنی خودداری پر اڑے رہے، بھیک مانگنے کی ہمت نہ پڑی۔ جب بھوک نے بالکل بیتاب کر دیا۔ تو اُن کے دل میں سماج سے بغاوت کی آگ بھڑکنا شروع ہوئی۔ اُنھوں نے کہا "خودداری! خودداری کس کے سامنے برتی جائے۔ کوئی انسان بھی ہو" اب اُنھیں اپنی عزت ذلت کا بالکل خیال نہ رہا۔ اُنھوں نے تہیہ کر لیا کہ سماج کی اس سنگدلی کا زبردست انتقام لیں گے۔ انتقامی جذبہ نے اُن میں پھر سے قوت و طاقت پیدا کر دی۔ اُنھوں نے بھاگنا شروع کیا۔ بھاگتے ہوئے وہ اپنے ایک مالدار دوست کے یہاں پہونچے۔ وہ اپنی کوٹھی کے باہر باغ میں ٹہل رہا تھا۔ پہنچتے ہی اُنھوں نے لپک کر اُس کا گلا پکڑ لیا اور اسی ہئیت میں کہ کف منہ سے جاری تھا کہنا شروع کیا "نابکار! تجھے کیا حق ہے کہ غریبوں کے سرمایہ کو چوس چوس کر اپنی تن پروری کرے۔ میں اپنے احسانات تجھ پر نہیں جتانا چاہتا۔ لیکن غریبوں کے سرمایہ کو غصب کر لینے کا تجھے کیا حق ہے۔ حرامزادے کتے! تجھے کیا حق ہے کہ میرے بھوکا رہتے ہوئے خود شکم سیر ہو۔ او بدنام کنندۂ انسانیت! تو کس منہ سے اپنے کو انسان کہتا ہے۔ بدمعاش! تو جانور ہے! جانور سے بدتر! - - - - - - - - - - " اُس نے یہ کہکر "پہلے اپنے ماضی پر تو نظر کر" نوکروں کو حکم دیا کہ اسے گردن پکڑ کر نکال دو"

سیٹھ جی لاکھ گالیاں دیتے رہے اور سماج کو کوستے رہے لیکن نوکروں نے زبردستی دھکے دے دے کے اور مار مار کے باہر نکال دیا۔ اُن کے اس قدر کافی چوٹ لگ گئی تھی کہ وہیں سڑک کے کنارے کراہتے ہوئے گر پڑے۔ اس مکان کے قریب ہی ایک غریب مسلمان کلرک کا مکان تھا۔ وہ ولائت کا گریجویٹ لیکن زمانہ کی گردش کا پسا ہوا تھا۔ سنگدل سماج کا کسی زمانہ میں وہ بھی شکار رہ چکا تھا۔ کراچی بھر میں وہ اکیلا انسان تھا جسے سیٹھ جی کی حالت پر ترس آیا ہو۔ اس وقت وہ دفتر سے گھر واپس جا رہا تھا۔ چونکہ خود تکلیفیں اُٹھا چکا تھا اور سوسائٹی کے بے پناہ مظالم کا شکار ہو چکا تھا لہٰذا سیٹھ جی کو اس ہئیت میں دیکھکر اُس کا دل بھر آیا۔ آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور یہ کہتے ہوئے ع

دیکھنا اے اہلِ عبرت آسماں کے ظلم کو

وہ سیٹھ جی کے قریب آیا۔ اُن کے سر کو اپنے زانو پر رکھ لیا۔ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا اور کہنے لگا "سیٹھ جی! شاید اب آپ کی آنکھیں کھل گئی ہوں سماج اور اُس کے بنائے ہوئے مذہب پر جاں نثار کرنے والوں نے آپ کو امن و شانتی کا خوب پیغام دیا۔ مذہب کے نام پر اپنی جانیں قربان کر دینے والوں نے اپنے ایک ہندو بھائی کے ساتھ کیسا اچھا برتاؤ کیا"

سیٹھ جی۔ بھیا کیا دُنیا میں ابتک تمہارے جیسے پُرش باقی ہیں۔ سماج اور اُس کے بنائے ہوئے مذہبی تفرقے ایک دھوکا ہیں۔ کسی ہندو کو مجھ پر رحم نہ آیا۔ سچ ہے اچھے لوگ ہر دھرم میں ہوتے ہیں۔

وہ۔ سیٹھ جی۔ ہندو مسلمان کیا؟ انسانیت سے بلند اور عظیم کوئی مذہب نہیں ہے۔ انسان انسان میں تفرقہ کیسا؟ یہ سب پُرفریب سماج کے بنائے ہوئے ڈھونگ ہیں۔ مذہب کا کام گمراہوں کو راہِ راست پر لانا اور اُنھیں ہدایت کرنا ہے نہ کہ اُنھیں انسانی برادری سے خارج کرکے مجرمانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دینا۔

وہ شخص سیٹھ جی کو اپنے مکان پر لے گیا۔ کھانا اُن کے سامنے رکھا وہ ذرا ہچکچائے۔ اُس نے کہا "سیٹھ جی۔ یاد رکھئے انسانیت سے بڑھ کر کوئی مذہب نہیں ہے"

سیٹھ جی جب کھانا کھا چکے تو وہ بولا "اب آپ کو اندازہ ہوا ہوگا کہ اپنی بیٹی کو چھوڑ دینے سے آپ نے کتنی عظیم غلطی کی، انسان انسان سب ایک ہیں۔ سماج نے تو اس قدر بندشیں عاید کر دی ہیں کہ ہندو ہندو میں بیر اور مسلمان مسلمان میں دشمنی۔ اگر آپ کی لڑکی ان سماجی بندشوں کو توڑ کر ہندو مسلمان میں محبت کی تخم ریزی کرنا چاہتی تھی تو یہ کیا بُرا خیال تھا۔ آپ کی لڑکی تعلیم یافتہ تھی۔ اُسے سماج کی حقیقت و ماہیت کا بخوبی علم تھا۔ مذہبی تفرقے سماج کے بنائے ہوئے رنگین دھوکے ہیں۔ انسانیت ان میں جکڑی نہیں جا سکتی۔ وہ ان قیود سے آزاد اور ان ذہنیتوں سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے"

سیٹھ جی۔ بھیا! انسان کچھ کھو کے سیکھتا ہے۔ سچ ہے مذہبی تفرقے دھوکوں کی ٹٹیاں ہیں۔ خدا ان کے مکر و فریب سے بچائے۔ تمہارا یہ جملہ مجھے بہت پسند آیا کہ "انسانیت سے ارفع و اعلیٰ کوئی مذہب نہیں ہے۔"

وہ۔ تو سیٹھ جی! آپ اب اپنی لڑکی کے پاس کیوں نہیں چلے جاتے، شاید لکھنؤ میں رہتا ہے۔ لکھنؤ میں اُن کی شادی بھی ہوئی۔ وہاں تک کا کرایہ میں حاضر کر دوں گا۔

سیٹھ جی۔ بیٹا میں تمہارے احسانات سے کسی طرح سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ سچ ہے انسانیت تمام مذاہب سے ارفع و اعلیٰ ہے۔ میں آج ہی شام کو لکھنؤ روانہ ہوتا ہوں۔ اپنی لڑکی کا میں نے بڑا دل دکھایا ہے۔ اُس سے معافی مانگوں گا۔ شاہد کو اپنا بیٹا سمجھوں گا۔ سُریندر سے مجھے نفرت ہو گئی۔ کل اُس کے باپ نے اور اُس نے ملنے تک سے انکار کر دیا۔ سچ ہے انسانیت سب مذہبوں سے بلند اور عظیم ہے۔

(۱۰)

تیسرے روز صبح کو سیٹھ جی چار باغ اسٹیشن پر لکھنؤ یونیورسٹی تک کے لئے تانگہ چکا رہے تھے۔ یونیورسٹی جا کر اُنھوں نے مسٹر شاہد "ڈین آف دی فیکلٹی آف فلاسفی" کی کوٹھی کا پتہ پوچھا۔ کوٹھی پر پہنچے تو دیکھا شاہد اور اوشا باہر ہی ٹہل رہے تھے۔ اخبارات سے اوشا کو سیٹھ جی کے حالات کا پتہ چل چکا تھا، لہٰذا کچھ رنجیدہ سی تھی۔ باپ کو دیکھتے ہی محبتِ دخترانہ نے جوش مارا۔ دوڑی۔ اُدھر سے باپ دوڑے۔ دونوں لپٹ گئے۔ سیٹھ جی بولے "بیٹیا، سچ ہے انسانیت سے بڑھ کر کوئی مذہب نہیں"۔ بیٹی کو گلے لگا کر شاہد کو لپٹا لیا۔ دونوں میاں بیوی ان کی اس ذہنیت کے انقلاب پر خوش بھی تھے اور متعجب بھی۔ تھوڑی دیر بعد سیٹھ جی نے اطمینان سے بیٹھ کر ساری آپ بیتی سنائی، اور بیٹی سے بولے "اوشا! میں اس جملہ کا عاشق ہوں کہ انسانیت عظیم ترین مذہب ہے"۔ اوشا بولی، "سچ ہے پتا جی! انسانیت عظیم ترین مذہب ہے"۔

شاہد کے باپ عرصہ سے بیٹے کے پاس آنے جانے لگے تھے مسلمان انسانیت کے رموز جلد اور بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ ہندو آریوں کی نسل سے ہیں۔ آریہ قوم کا رجحانِ طبیعت تقسیم اور تفریق کی جانب اس شدت کے ساتھ تھا کہ انسانی زندگی کو خانوں میں تقسیم کیا کرتے تھے، اُن پر "شُدر" رہنے کا شیطان سوار رہا کرتا تھا۔ اس قدر کہ دکنی برہمن قنوجی برہمن سے ازدواجی تعلقات نہیں پیدا کر سکتا تھا۔ قوم کے بہتے ہوئے خون کو ذاتوں میں جکڑ بند کر کے قوم میں وہ وہ تفرقے ڈالے کہ خدا کی پناہ۔ یہی باتیں سناتنیوں میں ابتک باقی تھیں۔ مسلمان ان سے ناآشنا تھا، وہ مساوات و اخوت کا دلدادہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شاہد کے والد جلد ہی اپنی غلطیوں پر نادم ہو گئے اور بیٹے سے میل کر لیا۔

اوشا کے پتا کے آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ بھی آئے، اوشا نے اپنے باپ کا اُن سے تعارف کرایا۔ سیٹھ جی نے خود ہی اپنی تمام کہانی انھیں کہہ سنائی۔

سارا قصہ سنکر شاہد کے والد اور وہ ایک دوسرے سے خوب زور سے بھینچ کر بغل گیر ہوئے اور شاہد کے والد نے کہا "لاریب، انسانیت سے ارفع و اعلیٰ کوئی مذہب نہیں ہے"۔ آج کا دن شاہد اور اوشا کے لئے عید سے بڑھ کر تھا۔ دونوں خوشی میں پھُولے نہیں سماتے تھے، رات کو شاہد اوشا سے کہنے لگا "اوشا پیاری یہ ہماری سچی محبت کا نتیجہ ہے"۔

اوشا۔ ہاں۔ آج ہمارے سامنے حقیقی انسانیت اپنے میٹھے میٹھے ملاروں سے ہمارا دل بہلا رہی ہے۔

اپنے بچّے سے آخری باتیں

غنچۂ نورس! مبارک ہو تجھے سیرِ حیات　　نوبہارِ سرمدی ہو اور تیری کائنات
میں رہا ہوں مدّتوں اس راہ میں گرمِ ستیز　　میری آنکھیں دیکھتی ہیں وقت کی رفتارِ تیز
جانتا ہوں تھک چکی ہے دانشِ سعی و عمل　　میری بالیں پر کھڑی اب مسکراتی ہے اجل
موت کا آئینِ مستحکم بدل سکتا نہیں　　زندگی کے دل سے یہ کانٹا نکل سکتا نہیں
موت ہے تنہا امینِ عرصۂ سود و ضرر　　خاک ہو یا پھول، ذرّے ہوں کہ ہو موجِ گہر
موت ہے تنہا کلیدِ رازِ عمرِ مختصر　　میں ہوں یا تو ہو کوئی قاروں ہو یا دریوزہ گر
الغرض جب زمزمے چونکیں گے تیرے ساز میں　　اک نشاطِ بے خبر ہوگی ترے انداز میں

موت مرہم رکھ چکی ہوگی دلِ صد چاک پر
عبرتیں روتی ملیں گی تجھ کو میری خاک پر

میرے بچّے! اپنی دُنیا کا تماشا دیکھنا　　شب کی خاموشی، سحر کا مسکرانا دیکھنا
ہاں نقاب اُلٹے عروسِ شادمانی آئے گی　　وہ بھی کیا دن ہوں گے، جب تیری جوانی آئے گی
زندگی کی وہ درخشاں فصل، وہ عہدِ جمیل　　سینۂ طوفاں میں جیسے رقص جوئے سلسبیل
زندگی کا وہ لطیف احساس، وہ پنہاں اُمنگ　　خاک کی تاریک ترنجیوں میں جیسے موجِ رنگ
زندگی کا وہ خیالِ حُسن، وہ حسنِ خیال　　تشنگی میں جیسے ساغر کی کھنک، مے کا اُچھال
زندگی کے وہ طپش آمیز ایّامِ سکوں　　عقل جن ایّام میں کرتی ہے تعمیرِ جنوں
کاش میں بھی دیکھتا نورس کلی! تیری بہار　　اپنی اس رعنائیِ حُسنِ تخیّل کے نثار!
ولولے دل میں مچلتے ہوں گے آنکھوں میں سرور　　آسماں کو خاک جانے گا جوانی کا غرور
اس چمن میں شادمانی بھی تجھے مل جائے گی　　ہر کلی تیرے نفس کی آگ سے کھل جائے گی

آہ لیکن گھر کے جب اُٹھّے گا ابرِ نوبہار
جانے کس عالم میں ہوگی یہ مری مشتِ غبار

میرے بچّے! رازِ ہستی ہے ابھی زیرِ نقاب　　جس کو ہم سمجھے ہیں دُنیا ہے وہ بیداری کا خواب
ساحرہ دُنیائے فانی کی بصد حُسن و جمال　　پھینکتی ہے رُوحِ انساں پر تمنّاؤں کا جال

اور پھر چہرے پہ اپنے ڈال لیتی ہے نقاب
آدمی ہوتا ہے، یہ قیدِ زبوں، اور اضطراب!

چھا رہا ہے اِس کُرّے پر دردِ عبرت کا دُھواں
عشرتوں کے کچھ اُدھورے خواب کچھ مایوسیاں

زندگی اُن کی ہے جو آئین شناسِ روزگار
جبر کے اجزا سے رکھتے ہیں بنائے اختیار

رُوح کی تعمیر ہے بیداریٔ سعی و عمل
صف بہ صف موجوں کے جزر و مد میں کھلتا ہے کنول

سینۂ انساں ہے اک دریائے ناپید اکنار
جس کی وسعت میں ہیں بے اندازہ موجیں بیقرار

اہلِ بینش حلقۂ امواج میں رہتے نہیں
رُخ بدل دیتے ہیں طوفانوں کا خود بہتے نہیں

میں بتاتا ہوں تجھے رازِ سکونِ بے خلل
ہر قدم منزل شناسی، ہر نفس فکر و عمل

وقت کی ناسازگاری پر نہ جانا چاہیئے
کھیل ہے یہ رنج کیسا مسکرانا چاہیئے

یوں تو ہے ہر موجِ ہستی دشمنِ صبر و شکیب
سب سے گہرا ہے جہاں میں علم و دانش کا فریب

علم کیا ہے، فاطرِ ہستی کا ایسا فیضِ عام
جس سے ہو جائے گوارا زندگی کا تلخ جام

علم کیا ہے، ظلمتوں میں ناتواں سی موجِ نُور
چند دن اِس درد کی دُنیا میں جینے کا شعور

بے نیازِ حکمت و منطق ہے شرحِ کائنات
علم کی حد سے بہت آگے ہیں اسرارِ حیات

درسِ دانش لے مگر اندازِ نادانی نہ سیکھ
سیر کر لیکن اِس آئینہ سے حیرانی نہ سیکھ

شاعری دنیا میں ہے گو اک مقدّس فن ضرور
بچ کے رہنا اِس کے سائے سے مری آنکھوں کے نُور

دیکھتا ہے اُن کو شاعر کی نظر کا اضطراب
زندگی کے جو حقائق ہیں نقاب اندر نقاب

اور ہے سرنامۂ ہستی فریبِ اعتبار
چند ذرّے خاک کے ہیں ورنہ اجزائے بہار

شاعر اوروں کو پلا سکتا ہے پی سکتا نہیں
زندگی کا درس دے سکتا ہے جی سکتا نہیں

میرے بچے! دشمنِ علم و یقیں ہے روزگار
ذرہ تا خورشید سب ہیں ایک پیکاں کے شکار

عقل کی رَو میں بہا جاتا ہے انسانِ حقیر
رُوح کی آواز سے بیگانہ، محرومِ ضمیر

کچھ کھلونے ہیں زمانے کے نشانِ امتیاز
چند اوہامِ زبوں جن پر ہے اس دنیا کو ناز

اک نہ اک دن زندگی سے ہاتھ دھونے ہی تو ہیں
قصر و ایواں کیا ہیں، مٹی کے کھلونے ہی تو ہیں

اِن میں دب کر رہ گئی دانش کہ تھی انجم طراز
اِن میں پھنس کر کھو گیا انساں کہ تھا دانائے راز

چھوڑتا ہوں میں تجھے تنہا یہاں میرے یتیم
آہ وہ غنچہ کہ ہو بیگانۂ لطفِ نسیم!

زندگی بھر کشتۂ بے مہریٔ دوراں رہا — میں رہا لیکن رہینِ کاوشِ پنہاں رہا
دردِ محرومی سے تھی آباد میری کائنات — صرف اک غم تھا مری دُنیا میں آئینِ حیات
صبح کو جب مُسکراتا تھا جہانِ رنگ و بُو — میری آنکھوں سے برستا تھا مرے دل کا لہُو
جب سُناتی تھی عروسِ شام رودادِ طرب — میرے سینے میں تڑپ جاتا تھا احساسِ تعب
ہر نفس تھا آتشِ پنہاں سے کمہلایا ہوا — کچھ دُھواں سا میری دُنیا پر رہا چھایا ہوا

میری اِس حالت کا شاہد ہے خداوندِ قدیر — میں نے اِس عالم میں بھی بیچا نہیں اپنا ضمیر
خم ہوئی گردن نہ میری ماسوا کے سامنے — سر جھکایا تو جھکایا ہے خدا کے سامنے
میں رہا گو عمر بھر تلخی کشِ رندِ سیاہ — میری پیشانی پہ لیکن کج رہی میری کلاہ
نامرادی پھینکتی تھی گو مرے دل پر کمند — اور بھی لیکن ابھرتا تھا مرا عزم بلند
جس قدر اُٹھتا تھا گھر کر ابرِ دہشت آفریں — میرے سینے میں چمک جاتا تھا ایمان و یقیں

دیدۂ بینا ضمیرِ بے ریا رکھتا تھا میں
کیوں فریبِ ناخدا کھاتا، خدا رکھتا تھا میں

سازِ ہستی میں نوائے درد گو پاتا نہیں — میں تری تعمیرِ مستقبل سے گھبراتا نہیں
جانتا ہوں یوں تو ہیں اِسکی جفائیں بے پناہ — دہر میں بخشا نہیں جاتا یتیمی کا گناہ
جانتا ہوں، بیکسوں کو آسرا ملتا نہیں — آہ کیا ملتا ہے اس دُنیا میں کیا ملتا نہیں!
تیری مونس ہوں گی اے آسائشِ قلبِ تباہ — وہ دعائیں جن کی بے اندازہ راتیں ہیں گواہ
اُن عزیزوں سے اُمیدِ دلنوازی کیا کروں — قاتلوں پر اعتمادِ چارہ سازی کیا کروں
جنگی وخانی پہ ہے جن کی محبت کا مدار — جن کی پیغمبر ہے دولت، جن کا خالق روزگار
جو مرے زخمِ جگر پر مُسکراتے ہی رہے — نفس کے بندے! فریبِ نفس کھاتے ہی رہے
میں خدا کو سونپتا ہوں تجھکو اے جانِ پدر — جس کی رحمت ہے طرازِ محفلِ نوعِ بشر
ہو سکے تو قوم کے غم سے نہ کرنا احتراز — بن پڑے تو ملک کی خدمت سے ہونا سرفراز
مضمحل ہونے نہ پائے کلفتوں میں قلبِ شاد — اور اپنی قوتِ بازو پہ رکھنا اعتماد

تو نہ ہونا عمر بھر منت پذیرِ ناخدا
تیری کشتی ہے یہ دریا تو ہے اور تیرا خدا

سید علی اختر، اختر، حیدرآباد

تحقیق اصلاح

سید رضا قاسم مختار

محترمی عبدالاحد صاحب شرف الدین پوری، رکن ادارہ تحریر پٹنہ کے مضامین رسالہ "ندیم گیا" نیز دیگر موقر رسائل میں بعنوان اصلاح اکثر شائع ہوتے رہے ہیں، جن میں موصوف نے زبانِ اُردو میں بعض الفاظ کے غلط استعمال کی طرف اُردو داں طبقے کی توجہ مبذول کرائی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ممدوح کی اس قسم کی نکتہ چینیاں قابلِ صد ستائش ہیں اور اردو بحیثیت زبان اپنی وسعت کے لحاظ سے ابھی بہت کچھ قابل توجہ اور مستحق امداد ہے، اکثر و بیشتر خامیاں اس میں پائی جاتی ہیں۔ شدید ضرورت ہے کہ اس کی خامیوں کو دُور کرکے ترقی کی راہیں پیدا کی جائیں، نیز اُس کی وسعت کو بڑھا کر اس پایہ کی بنا دی جائے کہ دنیا کی متمدن زبانوں کی ہم سری کرسکے ؎

گیسوئے اردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائیِ دل سوزیِ پروانہ ہے　　　اقبال

فاضل صلاح کار نے لفظ مشکور کا استعمال زبانِ اردو میں بمعنی شکر گزار غلط بتایا ہے جس کی نسبت کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

لفظ مشکور عربی میں پسندیدہ، ستودہ اور شکر کیا گیا کے معنی میں مستعمل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس لفظ کی جو ترکیب ہے اس لحاظ سے اس کی نسبت اُس شخص کی طرف ہوتی ہے جس نے احسان کیا ہے، نہ یہ کہ جس پر احسان کیا گیا ہے۔ لیکن اردو کے روزمرہ میں یہ لفظ شکر گزار کے معنی میں رائج ہوگیا ہے۔ چاہے وہ غلط ہو۔ مگر اب سوال یہ ہے کہ ہماری زبان کا روزمرہ اس غلطی کی وجہ سے بدل سکتا ہے۔ اور مشکور کے بجائے عربی قاعدے سے متشکر یا شاکر ہی لکھنا جائز ہوگا!

"قاعدہ ہے کہ جب ایک زبان میں دوسری زبان کا کوئی لفظ جس تلفظ، املا، ترکیب کے ساتھ اور جس معنی میں رائج ہوجاتا ہے۔ تو اُس زبان میں وہ لفظ اپنے نئے معنی، املا اور ترکیب استعمال کے ساتھ صحیح مانا جاتا ہے۔"

بطور مثال عربی کے دو لفظ خاطر و تواضع کو میں پیش کرنا چاہتا ہوں جو قاعدۂ مذکور الصدر کو اپنی جگہ پر درست و اٹل ثابت کرنے میں یقینی ممد و معین ہوں گے۔ تواضع عربی میں عاجزی او سفروتنی کے معنی پر آتا ہے۔ لیکن اردو میں دعوت، مدارات۔ مہمان نوازی اور ضیافت کے معنی میں مستعمل ہے۔ اسی طرح لفظ خاطر کے عربی معنی کو اردو زبان سے چنداں لگاؤ نہیں ہے۔

غرضیکہ خاطر تواضع، یہ دونوں الفاظ عربی میں ہرگز ایک ساتھ استعمال نہیں ہوتے، لیکن اردو میں چونکہ یہ دونوں الفاظ ہم معنی ہیں اس لئے ایک ساتھ ان کے استعمال میں کوئی قباحت پیدا نہیں ہوتی۔ اردو میں جس معنی کے لئے یہ دونوں الفاظ آتے ہیں اس کو ان کے اصلی معانی سے کوئی تعلق نہیں ہے، آؤ بھگت اور آدر مان کے معنی پر الفاظ خاطر تواضع عربی نہیں رہے۔ بلکہ وہ اردو ہیں۔

الفاظ خاطر تواضع ہی پر کیا موقوف ہے دوسری زبان کے بہت سے الفاظ ایسے ملیں گے جن کے معانی میں ہماری زبان نے زبردست تغیر و

وتبدل پیدا کر کے ان کو اردو بنا لیا ہے۔ چنانچہ لفظ حُقّہ جو کہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ لیکن جس معنی میں یہ لفظ اردو زبان میں بولا جاتا ہے اس کو اس کے اصلی معانی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ قارورہ عربی میں شیشے (GLASS) کے معنی میں مستعمل ہے۔ لیکن اُردو میں کچھ اور ہی معنی رکھتا ہے جس کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں اس لفظ کے عربی معنی کا لحاظ رکھتے ہوئے کسی کے سوالِ آب پر اگر کوئی اس طرح استفسار کرے کہ جناب کو قارورے میں پانی پینا مرغوب ہے یا فلزاتی ظروف میں، تو یقینی یہ استفسار خلافِ روزمرّہ ہوگا۔

اب سوال یہ ہے کہ ہمارے روزمرّہ کو غلط ٹھہرا کر اور اس لفظ کے مروجہ معنی کو ترک کر کے محض شیشے ہی کے معنی میں استعمال کرنا جائز ہوگا۔ یا ہماری زبان کے روزمرّہ کا لحاظ کرتے ہوئے اس لفظ کے مروجہ معنی کو بھی کوئی اہمیت دی جاسکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ اُردو زبان میں جس معنی میں لفظ قارورہ استعمال کیا جاتا ہے اُس معنی میں یہ لفظ عربی نہیں رہا بلکہ اردو بن گیا۔ اسی طرح لفظ مشکور بھی جو عام طور پر شکر گزار کے معنی میں مستعمل ہے وہ اس معنی میں اب عربی نہیں رہا۔ بلکہ اردو بن گیا۔ اور وہ اس معنی میں صحیح ہے جو زبانِ اردو میں رائج ہو چکا ہے۔

خواجہ آتش نے لکھنؤ کے کسی مشاعرے میں لفظ المضاعف کو المضاف اور بیگم کو غم اور نم کے قافئے میں کافِ فارسی کے فتحہ کے ساتھ باندھا تھا۔

زہر پرہیز ہو گیا مجکو درد درماں سے المضاف ہوا

دخترِ رز مری مونس ہے مری ہمدم ہے
میں جہانگیر ہوں وہ نور جہاں بیگم ہے

اس پر اُن کے حریفوں نے سرِ مشاعرہ انھیں ٹوکا کہ المضاعف عربی ہے اور بیگم ترکی۔ اہلِ عرب المضاعف بولتے ہیں نہ کہ المضاف اور ترکی زبان میں بیگم بضمہ کاف فارسی بروزن گندم ہے۔ نہ کہ بہ فتحہ کاف فارسی بروزن ہمدم، خواجہ صاحب نے جواب میں فرمایا کہ ہم عربی یا ترکی نہیں بولتے اور جب اِن زبانوں میں گفتگو کریں گے تو المضاعف اور بیگم کہیں گے۔ اسی طرح جب خواجہ صاحب نے یہ مصرع کہا ع

اس خوان کی نمش کفِ یارِ سیاہ ہے

تو لوگوں نے کہا کہ قبلہ! یہ لفظ فارسی ہے اور اصل میں نشک ہے، خواجہ صاحب نے کہا کہ جب ہم ایران جائیں گے تو ہم بھی نشک کہیں گے۔ یہاں نمش ہی کہتے ہیں تو نمش ہی شعر میں باندھنا چاہیئے ——

(ملاحظہ ہو آبِ حیات)

مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے (جن کی شخصیت عربی و اردو دونوں زبانوں میں تسلیم شدہ ہے) اپنی تحریر میں لفظ مشکور کو شکر گزار کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ تحقیق کے لئے "خطوطِ شبلی" مرتبہ محمد امین زُبیری ملاحظہ فرمائیے۔ صفحہ ۱۱۶ پر مولٰنا مرحوم کی یہ تحریر موجود ہے۔

"آپ کی تکلیف فرمائی کا بہت مشکور ہوں"

ان مثالوں اور نظریوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اردو زبان میں لفظ مشکور کا شکر گزار کے معنی پر بولنا یا لکھنا صحیح ہے اور اس کی ترکیب اردو لفظ ہو جانے کی حیثیت سے بالکل درست ہے ع

ہر چیز کہ در کانِ نمک رفت نمک شد

مگر ہاں جب ہم عربی میں گفتگو کریں یا عربی عبارت لکھیں تو البتہ لفظ مشکور کا استعمال اس معنی میں سراسر غلط ہوگا اور اس کی جگہ عربی قاعدے سے شاکر یا متشکر ہی لکھنا جائز ہوگا۔

"ممنون و مرہون" یہ دونوں الفاظ بھی تو لفظ مشکور کی طرح مفعولی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کا استعمال فاعلی معنوں میں کیا جاتا ہے ماسوا اس کے دوسرے فاعلی الفاظ کا استعمال مفعولی معنوں میں کیا جاتا ہے تو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ مثلاً میں معقول ہو گیا کی جگہ عام طور پر اربابِ علم "میں قائل ہو گیا"[1] بولتے اور لکھتے ہیں۔

تعجب ہے کہ قابلِ صلاح کار نے نہ معلوم کن اصولوں کی بنا پر لفظ مشکور کا استعمال زبانِ اردو میں احسانمند کے معنی پر غلط ٹھیرایا ہے۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ اب بھی جبکہ اردو زبان کو آسان سے آسان تر بنانے کی کوششیں جاری ہیں ----------

---------- بعض حضرات اردو زبان کو بھی عربی قاعدوں پر چلانا چاہتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہماری زبان عربی زبان کے امتزاج سے بنی ہے۔ مگر ہم کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ دریا کو اُس کے ماخذ کی طرف بہنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ہر زبان کا قاعدہ جداگانہ ہے ایک زبان کسی دوسری زبان

---

[1] "قاعل" نہیں۔ بلکہ "قائل" کہا جاتا ہے۔ مدیر

کے قاعدے کی پابند نہیں ہے بلکہ قواعد وضوابط زبان کے تابع ہیں۔ اول زبان بنتی ہے بعد کو اُس سے قواعد اخذ کئے جاتے ہیں ؎

ہنر بچشمِ عداوت بزرگ تر عیبے ست
گل است سعدی و در چشمِ دشمناں خار است

ریل انگریزی میں پٹری کو کہتے ہیں۔ مگر اُردو میں یہ لفظ گاڑی کے معنی میں مستعمل ہے۔ آپ خیال فرمائیں کہ انگریزی زبان کے جو الفاظ اردو عبارت میں مستعمل ہیں کیا اُن الفاظ پر انگریزی زبان کے قواعد کا دست رس ہو سکتا ہے؟ اردو زبان اُن الفاظ پر قابض ہو چکی ہے اور جس طرح چاہتی ہے اپنے قواعد وضوابط کے زیرِ تحت رکھ کر اُن سے کام لیتی ہے۔ اب ماہرینِ زبان انگریزی کو اس اعتراض کا کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ انگریزی الفاظ جس طریقے پر اردو عبارت میں استعمال کئے جاتے ہیں وہ انگریزی کے قاعدے سے غلط ہیں ؎

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں؟
پابستگیٔ رسم و رہِ عام بہت ہے!

اسی طرح لفظ مشکور اردو زبان میں احسان مند کے معنی پر بالکل صحیح ہے، اور عربی زبان کے قاعدوں کا اُس پر کوئی تصرف نہیں ہو سکتا، ہماری زبان اس پر قابض ہو کر اس کو اپنا لفظ بنا چکی اور ہمارے روزمرّہ میں یہ لفظ اردو ہو جانے کی حیثیت سے شکرگزار کے معنی پر زباں زد خلائق ہے۔ ہمارا روزمرّہ اب ہرگز بدل نہیں سکتا، اور بمصداق "غلط العام[1] فصیح" زبانِ اردو میں لفظ مشکور کا استعمال احسان مند کے معنی میں جائز اور صحیح ہے ؎

گر نیاید بگوشِ رغبت کس
بر رسولاں بلاغ باشد و بس

[1] لیکن "غلط العام" اور "غلط العوام" میں امتیاز کرنا بھی بہت ضروری ہے۔ مدیر

نعرۂ حُرّیت

(یہ نظم محض اپنی معنوی حیثیت کے لحاظ سے شائع کی جا رہی ہے۔ مدیر)

دلِ سوختہ کے غضبناک نالو
غلامانِ خفتہ کو بیدار کر دو

خودی اپنی پامال جو کر چکے ہیں
خدا کے لئے ان کو خوددار کر دو

نکالو غلامی سے بچنے کی راہیں
جو مجبور ہیں ان کو مختار کر دو

ہلا دو کبھی عرشِ اعظم کو جا کر
خمیدہ کبھی پشتِ کہسار کر دو

کبھی دیوِ گردوں سے زور آزما ہو
نظامِ ثوابت کو سیار کر دو

کبھی تیغ بن کر کبھی تیر بن کر
حریفوں کو مجروح و افگار کر دو

کرو حلِ مشکل کے اسباب پیدا
کسی طرح بیڑے کو خود پار کر دو

وگرنہ صبا کا تخیل بدل کر
اسے خوگرِ رنج و آزار کر دو

صبا اخگری

ڈپٹی صاحب

اختر انصاری دہلوی، بی اے

یہ تقریباً پانچ سال پہلے کا ذکر ہے۔ ڈپٹی صاحب نینی تال میں تھے اور اُن کی ملازمت کا آخری زمانہ تھا۔

اُس زمانے میں قاضی عبد الغفار کے "لیلیٰ کے خطوط" لاہور کے ایک ماہوار رسالے میں بالاقساط چھپ رہے تھے۔ اور ہم سب ـــــ اردو زبان کی علمی و ادبی دنیا کے افراد ـــــ متفقہ طور پر یہ محسوس کر رہے تھے کہ ایک کہنہ مشق اور بلند پایہ ادیب نئی آن بان سے جلوہ گر ہوا ہے۔ نئے افکار، نئے اسالیب بیان، اور نئی سحر طرازیوں کے ساتھ بیدار ہوا ہے، اور یہ کہ ہمارے۔۔۔۔۔۔ ادب میں ایک شاندار اور عہد آفرین تصنیف کا اضافہ ہونے والا ہے۔ ہر طرف "لیلیٰ کے خطوط" کے چرچے تھے۔ ہر ادبی محفل میں اِسی کارنامۂ نثر کے بے شمار محاسن پر اظہارِ خیال کیا جاتا تھا۔ میں گرمیوں کی چھٹیوں میں نینی تال گیا تو ایک مدت کے بعد ڈپٹی صاحب سے ملا۔ اُن کے ادبی ذوق سے میں واقف تھا ہی، پہلی ہی ملاقات میں دوچار اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد ادب اور ادبی مسائل پر گفتگو ہونے لگی۔ اور قبل اس کے کہ میں اُن سے پوچھوں کہ "لیلیٰ کے خطوط" بھی آپ کی نظر سے گزرے یا نہیں۔ اُنھوں نے خود یہی ذکر چھیڑ دیا اور لگے نہایت جوش کے ساتھ خطوط کی عظمت پر روشنی ڈالنے۔

ڈپٹی صاحب ایک ایسے طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو حد سے زیادہ جامد اور بےحس ہوتا ہے۔ یہ لوگ اپنے عہد کے بہترین رجحانات اور اپنے زمانے کے بلند ترین تصورات سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتے۔ اُن کے وجود سے کبھی باخبر نہیں ہوتے۔ حکمرانی اور دولت اندوزی کے نشے میں چُور رہتے ہیں۔ اور باہر کی دنیا ـــــ تکلیفوں، مصیبتوں، محکومیوں اور مظلومیوں کی دنیا ـــــ اِن کے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ یوں کہلانے کو صاحبِ علم اور صاحبِ فضل کہلاتے ہیں، لیکن مطالعۂ ادب کو اِن کی زندگی میں کوئی جگہ نہیں ملتی۔ یہ کبھی کوئی ادبی کتاب نہیں خریدتے۔ کبھی کوئی حقیر سے حقیر رقم ایک ادبی رسالے کی سرپرستی میں خرچ کرنے کے روادار نہیں ہوتے۔ جب میں نے ڈپٹی صاحب کو ـــــ اسی طبقے کے ایک فرد کو ـــــ "لیلیٰ کے خطوط" کی تعریف میں رطب اللسان پایا تو مجھے خوشی ہوئی۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ کچھ بھی ہو اس شخص میں اتنی صلاحیت تو ہے کہ یہ ایک انقلابی اور احتجاجی تصنیف سے باخبر ہی نہیں، اس کی قدر بھی کرتا ہے۔

نینی تال میں میرے جاننے والے بہت کم تھے۔ اس لئے ڈپٹی صاحب سے تقریباً روزانہ ملاقات رہنے لگی۔ اور پھر مجھے معلوم ہوا کہ ڈپٹی صاحب کو تو "لیلیٰ کے خطوط" کا جنون ہو گیا ہے۔ یہ چیز ہر وقت ان کے دماغ پر مسلط رہتی ہے۔ اِس کے سوا ادبی گفتگو کا کوئی اور موضوع اُن کے پاس ہے ہی نہیں۔ اُنھوں نے خطوط کی سب قسطیں رسالے سے جدا کر لی تھیں اور اُن کو نتھی کر کے یکجا کر لیا تھا۔ اوراقِ پریشاں کا یہ مجموعہ ہر وقت اُن کی میز پر رہتا تھا اور وہ بار بار اُس کا مطالعہ کرتے تھے۔ اُنھوں نے اپنی سُرخ پنسل کو اِن صفحات پر بیت

شدت کے ساتھ استعمال کیا تھا اور اس طرح صفحے کے صفحے رنگین نظر آتے تھے، میں ان کے ہاں جاتا تو اکثر دیکھتا کہ لوگ اُن کے گرد حلقہ بنائے بیٹھے ہیں اور وہ خطوط کے مختلف حصّے اُن کو پڑھکر سنا رہے ہیں۔ وہ ہر شخص سے "لیلیٰ کے خطوط" کا تعارف کراتے تھے، ہر اُس شخص سے جو اُن کے پاس آتا اور تعلیم یافتہ بھی ہوتا۔ اُن کے تعارفی الفاظ کچھ اِس طرح کے ہوتے۔

"یہ ایک بازاری عورت کے خطوط ہیں جو وہ اپنے ایک چاہنے والے کو لکھتی ہے۔ اِن خطوط میں مصنف نے عصمت فروش عورتوں کی زندگی پر ہمدردانہ اور رواداراںہ انداز میں بحث کی ہے اور بتاتا ہے کہ مردوں کی نفس پرستی ہی اس مظلوم طبقے کے وجود کی ذمہ دار ہے، ہم ان ناموس باختہ عورتوں کو ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، اور یہ نہیں جانتے کہ ان میں بہت سی ایسی ہیں جو کبھی شریف گھرانوں کی بہو بیٹیاں تھیں۔ ہماری ہی جنس کے بعض ہوسناک افراد کی ہوس کا نشانہ بنیں اور گناہ کی دنیا میں دھکیل دی گئیں۔ اور پھر یہ سب کچھ ایسی پُر زور زبان میں لکھا گیا ہے کہ اِس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ جب لیلیٰ اپنی گزشتہ اور موجودہ زندگی کا ذکر کرتی ہے تو اُس کے بیان میں بے انتہا غمگینی پائی جاتی ہے، اور جب وہ مرد کی نفس پرستی پر روشنی ڈالتی ہے تو اُس کے انداز میں ایک زہرناک طنز پایا جاتا ہے۔" اس قدر کہنے کے بعد ڈپٹی صاحب خطوط میں سے بہت سے اقتباسات پیش کرتے۔ مجھے وہ ٹکڑے اچھی طرح یاد ہیں جو اُن کو بہت زیادہ پسند تھے۔ کتاب میرے پاس موجود ہے۔ اُن میں سے چند یہاں نقل کرتا ہوں۔

"آپ اپنے اظہار التفات کو اس ناچیز پر کیوں ضائع کرتے ہیں۔ شب کا لطف و التفات ضروری نہیں کہ صبح کو بھی باقی رہے۔ آپ اپنی جگہ پر رہیئے اور مجھے میری جگہ پر رہنے دیجئے۔ آپ یوں سمجھیں کہ آپ نے ایک کھلونا خریدا تھا جس سے آپ دل بہلاتے رہے اور میں یہ سمجھوں کہ جو کچھ آپ کی جیب سے نکال لائی وہ میرا مایۂ تجارت ہے۔ اس کے علاوہ آپ جو کچھ شاعرانہ انداز میں فرماتے ہیں وہ سب محض تضیعِ اوقات ہے۔ آپ کی جیب اور میرا جسم، یہی دو چیزیں ہیں۔ آپ کے عیش کا مدار آپ کی جیب پر اور میری آسائش کا انحصار میرے جسم کی خوبصورتی پر ——— مجھے آپ پسند کرتے ہیں تو اس کھیل کو کھیل ہی سمجھکر کھیلئے۔ میں اپنی نسوانیت تنا کرچکی، آپ کا جی چاہے تو اپنی جوانی اور اُس کے ساتھ اپنا روپیہ خرچ کیجئے۔ مگر اندازِ عاشقانہ کی شعریت سے مجھے معاف رکھئے۔

پیارے دوست! تمہارے اظہارِ عشق سے متاثر نہیں ہوتی۔ مگر یہ نہ سمجھو کہ میں تمہارے آغوش میں اپنے لئے کوئی راحت نہیں پاتی۔ سوائے اک چند نقرئی اور طلائی سکّوں کے۔ جو تمہارے ہاتھ سے میرے ہاتھ میں آتے ہیں۔ "قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں" میری زندگی ناپاک ہے۔ لیکن اِس عشوہ فروشی کے بازار میں آنے سے پہلے مجھے علم و تہذیب و شرافت کی اتنی دولت حاصل ہو چکی تھی، جتنی کہ عام طور پر شاید اچھے گھرانوں کی بہو بیٹیوں کو بھی حاصل نہ ہوتی ہو۔ اس بیان کو خود فریبی اور پندار پر محمول نہ کرنا۔ جوہرِ اصلی کچھ میرے پاس بھی تھا۔ مگر میرے قلب کو میری زندگی نے تلخ کام کر دیا ہے۔ میں دل ہی دل میں اپنے وجود سے شرمایا کرتی ہوں۔ مگر اس نگردہ دنیا اور نگردہ اثر دنیا والوں نے جہاں پھینک دیا جس گندگی میں ڈال دیا اُسی میں مبتلا ہوں، اور اب گناہ کی بھاری زنجیریں میرے پاؤں میں ہیں ———"

آج کی شب خالی ہے۔ میرا یہ خاص مشغلہ ہے کہ جب میرے سوا میری خلوت میں کوئی نہیں ہوتا۔ چاہنے والوں کے ہجوم سے نجات پاتی ہوں اور بستر میں (جو مجھ کمبخت کو بہت کم خالی ملتا ہے) جا کر لیٹتی ہوں تو خود اپنے وجود کو اپنے آغوش میں لیتی ہوں۔ اُس وقت میں عاشق ہوتی ہوں اور میرا وجود معنوی معشوق۔ گویا ایک دوسرا کوئی ہوتا ہے جس کا سر میں اپنے بازو پر رکھتی ہوں، لیلیٰ! کمبخت، بدنصیب لیلیٰ! کیا آج فرصت ہے؟ تھک گئی ہے؟ کچھ ڈھونڈھتی ہے؟ کوئی یاد آتا ہے؟ یہ رات تو خالی ہے۔ جا سو جا! کل پھر دوکان لگانی ہوگی۔ خریدار آئیں گے۔ سودا چکایا جائے گا۔ تہی دست قسمت! سو جا!!

اگر آپ عورت اور اُس کے حُسن سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔ جس طرح شکاری محض اس لئے ہرن کے گولی مارتا ہے کہ اُس کے بہانہ تو نئی اپنی قوّتِ حیوانی کی مستی کا نظارہ کریں۔

اور اُس کا نفس مسرور رہو۔ تو اس چمن میں تنگ داماں نہ ہو جیئے، پھول بہت ہیں۔

جب تم میری طرف دستِ طلب بڑھاتے ہو تو اپنے نفسِ لیئم سے یہ کیوں نہیں پوچھتے کہ یہ عورت جو اپنی نسوانیت کا اعلیٰ ترین جوہر نذر کئے دیتی ہے۔ کبھی وہ سمجھتی کہ کسی گھر کا اجالا ہوتی۔ اور انسان کی ایک نسل کو اپنی گود میں پالتی۔ آج شب کو وہ اپنے بستر کی آرائش ہے اور کل صبح منظرِ عام پر آپ اُس کی طرف دیکھکر ہاتھ اُٹھانا بھی پسند نہ فرمائیں گے:

تم کبھی کبھی روتے ہو اور سمجھتے ہو کہ یہ عشق ہے۔ مگر میں ہنستی ہوں، اس لئے کہ ہنسنا میرا پیشہ ہے اور اس لئے کہ رو نہیں سکتی —— آنسو کہاں سے لاؤں؟ ——"

غرض ڈپٹی صاحب اس قسم کے بہت سے ٹکڑے مزے لے لے کر پڑھتے اور اپنے دوستوں کو سناتے۔ کبھی میں بیچ میں بول اُٹھتا۔ "صاحب! بازاری عورتوں کی زندگی پر ہی کیا موقوف ہے، قاضی عبدالغفار صاحب نے نسوانی دنیا کی عام پستی، ذلت اور محکومی کو بے نقاب کیا ہے اور مرد کے جبر اور تفوق کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔" ڈپٹی صاحب اس پر مزید روشنی ڈالتے اور اس سلسلے میں کبھی خطوط کے بعض حصے پڑھکر سناتے۔ مثلاً:

"مرد جب عورت کو مستقلاً اپنے نفس کی خادمہ بنانا چاہتا ہے تو نکاح پڑھوا لیتا ہے۔ مگر عورت جب سر جھکائے ہوئے، آنکھیں بند کئے ہوئے، اپنے سر کے اشارے سے کسی مرد کو اپنا شوہر قبول کرتی ہے تو اس بدنصیب کو خبر نہیں ہوتی کہ مرد کیا چیز ہے، کیا جنس ہے، کیا قیامت ہے، کیا بلا ہے، اگر وہ اپنے ہونے والے شوہر سے محبت بھی کرتی ہو تب بھی اُس کو خبر نہیں ہوتی کہ بکری کی کھال کے نیچے جو بھیڑیا چھپا ہوا ہے اُس کے دانت کس قدر تیز ہیں —— سوسائٹی اور مذہب نے جس کے ٹھیکیدار صرف مرد ہیں عورت کو اس قدر گھیر لیا ہے اور بے دست و پا کر دیا ہے کہ نکاح عورت کی آخری شکست اور مرد کی فیصلہ کُن فتح بن جاتا ہے۔ اللہ اور اللہ کے رسول کے نام پر عورت مرد کی ملکیت بنا دی جاتی ہے ——"

میرے دوست! زنا بہت بڑا اخلاقی گناہ ہے، مگر صرف عورتیں کے لئے۔ مرد زانی ہو تو بھی معصوم ہے۔ عورت زانی نہ بھی ہو مگر غیر مردوں کے ساتھ کچھ ارتباط رکھتی ہو تو وہ گردن زدنی۔ یہ مرد کا قانون ہے۔ ہر زانی اور بدکار شرفا کے گھروں میں شریف بہو بیٹیوں سے ارتباط رکھ سکتا ہے۔ لیکن ایک زانیہ تائب ہونے کے بعد بھی شریفوں کے دروازے پر نہیں جا سکتی۔ یہ مردوں کا قانون ہے —— سوسائٹی ہر بدمعاش مرد کی چادر کے دھبوں کو بآسانی نظر انداز کر سکتی ہے، مگر عورت کی چادر کی ہر شکن اُس کو گناہ اور مکر سے آلودہ نظر آتی ہے۔ یہ مرد کا قانونِ زندگی ہے! بڑی سی داڑھی لگا کر، بڑا سا عمامہ باندھکر، لمبا سا چغہ پہن کر تم اپنے حجرے میں گناہ کرو۔ لوگ کہیں گے تم عبادت کر رہے ہو، وہ تمہارے ہاتھ چومیں گے۔ مگر وہ عورت جو تمہارے بنائے ہوئے قانون کی خلاف ورزی کرے گی تمہاری نظر میں بلاشبہ فاحشہ ہو گی۔

دراصل گھر کی چہار دیواری میں بیویاں ذرا اونچے درجے کی کنیزیں ہوتی ہیں۔ "سرکار" ان کو اپنے دسترخوان پر بٹھا لیتے ہیں اپنے بستر میں سُلا لیتے ہیں۔ اچھے اچھے لباس اور زیور عطا فرماتے ہیں۔ یہ سب "سرکار" کا کرم ہے۔ بیویوں کا کام یہ ہے کہ عاجزانہ شکریئے کے ساتھ اِن نوازشوں کو قبول کریں اور ہمیشہ دست بہ عا رہیں۔ اس لئے کہ سرکار ہی کے دم سے اِن کا سہاگ قائم ہے ——"

ہندوستان میں کم از کم اور غالباً تمام ایشیا میں عورت ایک دفعہ مرد کے تفوق کے خلاف ایسی خوفناک بغاوت کرنے والی ہے جو تمہاری سوسائٹی کے خود ساختہ شیرازے کو درہم و برہم کر دے گی۔ ہم تم غالباً دنیا میں زندہ نہ ہوں گے۔ جب وہ طوفانِ نوح آئے گا۔ لیکن ہماری آئندہ نسلیں عورتوں کو مردوں سے جگہ بدلتے ہوئے دیکھیں گی۔ وہ نسلیں ظالموں سے مظلوموں کا بدلہ لیں گی۔ اور بلاشبہ جفاکار مردوں کے لئے وہ یوم الحساب بہت سخت ہوگا ——"

کبھی ڈپٹی صاحب کہتے "بھئی حقیقت یہ ہے کہ "لیلےٰ کے خطوط" میں لکھنے

والے کا موضوع بے حد وسیع ہے، یعنی ان میں نسوانیات سے ہٹکر زندگی کے بہت سے دوسرے مسائل پر بھی نہایت فلسفیانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔" اس دعوے کے ثبوت میں وہ اس نوع کے اقتباسات پیش کرتے ہیں:۔

"زندگی کا یہ ہنگامہ۔ انسان کے گناہ۔ اُس کی کمزوریاں۔ قوی کا ظلم ضعیف پر۔ طاقتور کا پنجہ کمزور پر۔ بڑی مچھلیوں کا کھلا ہوا منہ چھوٹی مچھلیوں کے لئے۔

چیونٹیوں پر ہاتھی کے پاؤں کا فنا کر دینے والا وزن مغرور شہسوار کا بدلگام گھوڑا اور سڑک پر چلنے والے اندھے بہرے، کیا یہ سب تقدیر الٰہی ہے؟ کیا یہ سب تقدیر الٰہی ہے؟ یہ اشرف المخلوقات کیا اسی لئے پیدا کئے گئے تھے کہ ایک دوسرے کا گوشت اور پوست نوچیں اور کھائیں۔ روٹی کے ایک ایک ٹکڑے پر، گیہوں کے ایک ایک دانے پر خون کی ندیاں بہا دیں۔ کیا قدرت نے ساری دنیا کو انسان صورت درندوں سے اس لئے بھر دیا ہے کہ وہ خدا کی زمین پر کسی ایک گھر میں بھی سکون و اطمینان باقی نہ رہنے دیں؟

یہ حقوق ملکیت جس کا اعلان کیا جاتا ہے جس کے جزو مذہب و تمدن بنایا جاتا ہے، یہ تفوق و فضیلت جس کا اشتہار دیا جاتا ہو، مسجدوں میں، مدرسوں میں، خانقاہوں میں، یہ سب زیر دستوں کی زبردستی کا اعلان و اشتہار ہے۔

یہ سب لوگ جو مذہب مذہب پکارتے ہیں، درحقیقت ایک قسم کے بُت پرست ہیں۔ اُن کا بُت پتھر یا سونے چاندی کا نہیں ہے تخیل اور توہم اُن کا دیوتا ہے، جو مندر اور شوالے کے طاق میں نہیں، بلکہ اُن کے دماغ کے سومنات میں رہتا ہے، ہم سب اُسی دیوتا کے غلام ہیں۔ کوئی پوچھے کہ مذہب نے ہمارے احساس و ادراک کے کتنے پردے اُٹھا دئے، لاکھوں قرن گزر گئے، ہزاروں صدیاں گزر گئیں، اور اُس سیاہ پردے کا ایک کونا بھی نہ اُٹھ سکا، جو کائنات کے وجود پر پڑا ہوا ہے۔ میں اس مذہب کے دیوتا سے بیزار ہوں کہ اُس کے پجاریوں نے دنیا میں جس قدر فساد برپا کیا جس قدر خون بہایا کسی نے نہیں بہایا"

"بات یہ ہے کہ دنیا میں گناہ کوئی چیز ہے نہ ثواب۔ ساری انسانی زندگی کی بُنیاد صرف دو چیزوں پر ہے۔ قوی اور ضعیف، قوی ثواب ہے، ضعیف گناہ ہے، قوت یکسر خیر ہے، اور ضعیف یکسر شر۔ صرف دو ہی قانون ہیں، دو ہی مذہب ہے، دو ہی مسلک ہیں، انسانیت کے دو ہی اصول ہیں۔ ترازو کے دو ہی پلّے ہیں۔ بس! قوی اور ضعیف! قوی اور ضعیف! قوی اور ضعیف!!۔۔"

ہماری دنیا میں اعلیٰ دماغ وہ کہلاتے ہیں جو دوسروں کو غلام بنانے کا فن جانتے ہوں۔ سیاست اُس کو کہتے ہیں کہ ایک فرد اور ایک قوم کے وسیع پیٹ میں دوسرا فرد اور دوسری اقوام ہضم کی جاسکیں۔ معاشرت اُس کو کہتے ہیں کہ ایک چھوٹا، دولتمند اور چالاک طبقہ باقی تمام طبقوں پر جابرانہ حکومت کرسکے۔۔۔۔"

غرض یہ کہ ڈپٹی صاحب قاضی عبد الغفار کی اس تصنیف کے بڑے مداح تھے۔ ہر شخص سے اُس کی تعریف کرتے، اُس کی خوبیوں پر تبصرہ کرتے، اور اُس کے مختلف حصے پڑھکر سناتے۔ خود مجھ سے آئے دن اسی موضوع پر گفتگو کرتے اور کہتے "میرا خیال ہے کہ اردو زبان میں شاید ہی اس سے زیادہ شاندار اور بلند ادبی تصنیف پیش کی گئی ہو۔ اگر محض انشا پردازی کے لحاظ سے دیکھئے تو اس نثر کا جواب کہیں نہیں ملتا۔ "بہترین الفاظ کی بہترین ترتیب" یہیں نظر آتی ہے۔ اردو زبان کے کسی دوسرے ادیب کو یہ زور بیان اور یہ حسن نگارش نصیب نہیں ہوا" مجھے یہ دعویٰ مبالغہ آمیز معلوم ہوتا لیکن جب وہ مندرجۂ ذیل قسم کے ترشے ترشائے جملے پڑھکر سناتے تو مجھے اُن کے الفاظ کی صداقت کو ماننا ہی پڑتا۔

"کمہار نے ایک خوبصورت آبخورہ بنایا، لوگوں نے اُس کو جام صہبا بنا لیا۔ یا کمہار نے ایک جام صہبا بنایا اور لوگوں نے اُس کو آبخورہ سمجھکر مسجد کی دیوار پر رکھدیا۔ تو پھر کیا اس مٹی کی حقیقت بدل گئی؟ جام میں چاہے شراب بھر دیجئے چاہے زمزم! عورت کو بیسوا بنا دیجئے یا گھر کی ملکہ۔۔۔۔۔۔"

"جب زندگی کا مدار غذا کے چند لقموں پر ہو اور جسم و روح کا تعلق منحصر ہو معدے کی اعانت پر، جب ہوس پیٹ کے لئے اچھا کھانا مانگے، اور جسم کے لئے سامان زینت، تو پھر اتنی مہلت کہاں

کہ بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے۔۔۔۔۔۔

اگر آپ پانی کی مچھلی سے کہیں کہ وہ خشکی پر دوڑا کرے، یا اگر ہرن سے کہیں وہ پانی کے اندر تیرا کرے تو معاف کیجئے غلطی آپ کی ہی ہوگی۔ جو شخص میخانے میں جاکر وضو کے لئے پانی مانگے، یا مسجد میں بیٹھکر مئے گلفام کی صراحی جیب سے نکالے اُس کو دنیا کیا کہے گی؟۔۔۔۔۔۔"

ایک دن میں ڈپٹی صاحب سے ملنے گیا تو دیکھا کہ مسہری پر دراز ہیں اور "لیلےٰ کے خطوط" پڑھ رہے ہیں۔ میں نے کہا "ڈپٹی صاحب! کیا اس کو حفظ کرنے کا ارادہ ہے؟" وہ میرے سوال کا جواب دئے بلند آواز سے پڑھنے لگے۔۔۔۔۔۔

"جب ازدواجی زندگی کی بوجھل گاڑی نہیں چل سکتی اور مرد کی ہوسناکی کے مظلوم شکار دم دیتے ہیں، مرد کس قدر روتا ہے اور سینہ کوبی کرتا ہے! ہائے میرا گھر تباہ ہوگیا، ہائے میں اکیلا رہ گیا، چند روز تو اس طرح چیختا اور چلاتا ہے کہ گویا عنقریب یہ بھی مرحومہ کی قبر کے اندر اپنا گھر بنائے گا۔ لیکن دو ہی تین ماہ کے بعد عقدِ ثانی کی گفتگو شروع ہوجاتی ہے۔ کہتا ہے، کیا کروں، دوسرے نکاح پر مجبور ہوں۔ روٹی پانی کی تکلیف ہے، بچے بے آرام ہوگئے ہیں، تنہائی میرے لئے عذابِ جان ہوگئی ہے، حالانکہ ان عذرات کے پردے میں نفس کا ایک شدید تقاضا روپوش ہوتا ہے جو ستر اسی برس کے بوڑھوں کو بھی عقدِ ثانی کی مزدواں کے خواب دکھاتا ہے۔۔۔۔۔:

مجھے شرارت سوجھی۔ محض مذاق کے طور پر کہنے لگا "آپ کیا ان بیکار باتوں پر سر دھنتے ہیں۔ ارے صاحب کوئی ایسی چیز پڑھئے جس سے خیالات میں بلندی پیدا ہو، دماغ کو روحانی مسرت حاصل ہو۔ میر و مرزا کا کلام پڑھئے۔ "نگارستان" اور "خیالستان" پڑھئے۔ اس "عقدِ ثانی" اور "تقاضائے نفس" کی داستان میں کیا ملے گا۔ اگر ایک ستر یا اسّی برس کا بوڑھا کسی نوعمر دوشیزہ سے نکاح کرتا ہے تو ایک ادیب کو اس سے کیا۔ اور اگر سوسائٹی عورت پر ظلم کرتی ہے تو ایک شاعر اِس سے کیوں متاثر ہو؟ یہ سب سطحی چیزیں ہیں، ہنگامی اور وقتی مسائل ہیں۔ آج ہیں کل نہ ہوں گے۔ ادب کو اِن سے کوئی سروکار نہ ہونا چاہیے۔"

ڈپٹی صاحب تڑپ کر بولے "آپ کا خیال بالکل غلط ہے، ادب کو زندگی کا ترجمان ہونا چاہیے۔ اور زندگی عبارت ہے، انہی وقتی ہنگامی مسائل سے۔ اگر ادب اِن مسائل کو نظر انداز کرتا ہے، تو زندگی کو نظر انداز کرتا ہے، اس لئے بے جان ہے، بے بنیاد ہے، ایسے ادب سے ہمیں کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا۔"

"ادب سے آپ فائدے کی امید کیوں رکھیں؟" میں نے اُنھیں چڑانے کے لئے کہا۔

ڈپٹی صاحب نے جواب میں وہ کہا جس سے میری طبیعت خوش ہوگئی، کہنے لگے "میں مانتا ہوں کہ ادب اور آرٹ کا ایک مقام وہ بھی ہے جہاں اُس کا مقصد "تخلیقِ حسن" اور "تلاشِ حسن" کے سوا کچھ نہیں ہوتا، جہاں وہ کوئی اصلاحی خدمت انجام نہیں دیتا، اور صرف زندگی کے بعض مناظر کو صداقت کے ساتھ پیش کر دینے پر اکتفا کرتا ہے، لیکن اگر کسی بیکار چیز کو کارآمد اور غیر مفید چیز کو مفید بنا لیا جائے تو اچھا ہی ہے، بُرا کیا ہے، اور پھر آج کل ہم اپنی اجتماعی زندگی کے ایک نازک دور سے گزر رہے ہیں اہم مسائل اور شدید دشواریوں سے دوچار ہیں، ہمیں اِن مسائل کو حل کرنا ہی ہوگا، اِن دشواریوں کو آسان بنانا ہی ہوگا، ہم کیونکر اِن سے بے پرواہ ہوسکتے ہیں۔ سوسائٹی کو انقلاب کی ضرورت ہے، اِس لئے ادب کا انقلابی ہونا لازمی ہے، یاد رکھئے کہ موجودہ زمانے میں جو ادب انقلابی نہیں وہ ادب نہیں کچھ اور ہے۔"

"کیا خوب" میں نے قدرے طنز کے ساتھ کہا۔

"اِس کو اِس طرح دیکھئے" ڈپٹی صاحب نے پھر ابتدا کی، "ایک طرف تو یہ مسلمہ امر ہے کہ ہم ادب میں زندگی کا عکس پیش کرتے ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہم اپنی زندگی سے مطمئن نہیں ہیں، اب ہمارے ادب میں اِس بے اطمینانی کا جھلک جانا ضروری ہے، اور جونہی ادب میں بے اطمینانی کی جھلک پیدا ہوئی وہ انقلابی ادب بن گیا۔ اب تک جو ہمارے ادب میں یہ چیز نہیں پائی گئی تو اُس کا سبب یہ تھا کہ وہ صرف ایک خوشحال اور مطمئن طبقے کی زندگی کا آئینہ تھا۔ اب اِس بات کی ضرورت ہے کہ ادب ایک محدود سماجی طبقے کا ادب نہ رہے بلکہ عوام کا ادب بن جائے، اُس کا ایک

خاص متعین مقصد ہو، یعنی یہ کہ وہ سماج کے مظلوم طبقوں کے نقطۂ نظر سے زندگی پر نقد و تبصرہ کرے، اور اُس ظلم، بے انصافی اور لوٹ مار کو بے نقاب کرے جس پر یہ نظامِ زندگی قائم ہے۔ میں "لیلیٰ کے خطوط" کو اِس دَور کی اہم ترین تصنیف اسی لئے خیال کرتا ہوں کہ اُس نے ادبِ عالیہ کی تمام شاندار روایات کو برقرار رکھتے ہوئے زندگی اور ادب کو یکجا کر دیا ہے،

وہ "لیلیٰ کے خطوط" کی تعریف میں بہت کچھ کہتے مگر میں نے اُن کی بات کاٹ کر کہا: "ڈپٹی صاحب! میرا مذاق ختم ہوا۔ آپ نے جو کچھ فرمایا میں اُس کے ایک ایک لفظ سے متفق ہوں، لیکن اِس سلسلے میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں، میری خواہش تھی کہ اِسی وقت جبکہ وہ ادب کا ایک انقلابی تصور پیش کر رہے تھے، میں اُن کی متوسط طبقے والی ذہنیت اور زندگی کا ایک رُخ بھی بے نقاب کر دوں۔

"کیا؟"

"مجھے یہ بتائیے کہ ادب ہماری زندگی کا ترجمان ہوتے ہوئے بھی، ایک مخصوص نصب العین رکھتے ہوئے بھی، ہماری زندگی پر اثر انداز کیوں نہیں ہوتا؟"

"ہماری زندگی پر اثر انداز کیوں نہیں ہوتا!"

"ہاں ہمارے عمل کو کیوں نہیں متاثر کرتا؟"

"یہ آپ کیسے کہتے ہیں کہ ادب ہمارے عمل کو متاثر نہیں کرتا۔" ڈپٹی صاحب نے کہا "میرے خیال میں ضرور متاثر کرتا ہے۔"

"یہ میں اس لئے کہتا ہوں" میں نے جواب دیا "کہ ہم افسانے پڑھتے ہیں، نظمیں پڑھتے ہیں۔ ایسی نظمیں اور ایسے افسانے جو انقلابی خیالات کے حامل ہوتے ہیں۔ جن میں غریبوں کی مصیبتیں اور دولت مندوں کی عیش پرستیاں بیان کی جاتی ہیں، جن میں رجعت، قدامت، اور فرسودگی کے خلاف قلمی جہاد کیا جاتا ہے۔ ہم یہ سب کچھ پڑھتے ہیں، لیکن اس کے باوجود اپنی جگہ پر جوں کے توں قائم رہتے ہیں۔ ہماری تاریک خیالی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ ہمارے عقائد کی کٹھنگی میں ذرا فرق نہیں آتا۔ ہمارے اندر کوئی ایسا ولولہ پیدا نہیں ہوتا جو ہمیں جہالت اور ظلم کے خلاف عملی جد و جہد پر آمادہ کرے۔ "لیلیٰ کے خطوط" ہزاروں انسانوں نے پڑھے ہوں گے، بہت سمجھ کر پڑھے ہوں گے۔ لیکن اُن میں سے کتنے ایسے ہیں جنھوں نے کوئی مستقل اثر لیا ہو، اور جن کی زندگی میں اور خیالات میں واقعی کوئی تبدیلی پیدا ہوئی ہو۔ ہمارا ادب پانی کے اُن قطروں کی طرح ہے جو ریگستان کی تپتی ہوئی زمین پر گرتے ہیں اور جذب ہو جاتے ہیں۔"

ڈپٹی صاحب بولے "نہیں صاحب! میرا خیال ہے کہ ادب کو ہماری زندگی پر ضرور اثر ڈالنا چاہیئے۔"

میں نے کہا "ڈالنا چاہیئے، لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہے، یہ تو صحیح ہے کہ ادب ایک عہد کے سماجی اور معاشری ماحول سے بنتا ہے اور پھر اُس ماحول کو بناتا بھی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ ہمارے ساتھ ایسا کیوں نہیں۔ ہمارا ماحول ہمارے ادب سے متاثر کیوں نہیں ہوتا؟"

ڈپٹی صاحب سوچنے لگے۔

میں نے بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا "میرے خیال میں اِس کا سبب صرف یہ ہے کہ ہم جس نظام کے ماتحت زندگی بسر کرتے ہیں اُس سے ہمیں کچھ اُمیدیں ہیں، توقعات ہیں، جنھیں ہم کسی طرح منقطع کر لینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہم نہایت ڈھٹائی کے ساتھ خود غرضی اور خود پرستی کا راستہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ گویا قصور ادب کا نہیں، ہمارا ہے، اگر ہم چاہتے ہیں کہ ادب ہماری رہنمائی کرے، ہمیں زندگی کی تاریک بھول بھلیوں سے نکال کر ایک روشن شاہراہ پر ڈال دے تو پہلے ہمیں اپنی زندگی کے بنیادی اصولوں کو تبدیل کرنا ہوگا۔"

اس کے بعد بہت دیر تک گفتگو رہی۔ بلکہ جتنے دن میں نینی تال رہا۔ یہی مسئلہ زیرِ بحث رہا۔ ڈپٹی صاحب کی ذاتی زندگی کو معرضِ بحث میں نہ لاتے ہوئے مجھ سے اپنے نقطۂ نظر کی جس قدر وضاحت ہو سکی میں نے کی لیکن وہ میری بات کو کبھی اچھی طرح نہ سمجھ سکے، اور صرف اِتنا کہے گئے کہ ادب ہماری زندگی پر ضرور اثر ڈالتا ہے۔

میں لکھنؤ میں تھا۔ نینی تال کی سیر کو پانچ مہینے گزر چکے تھے۔ ایک صاحب کے ذریعے معلوم ہوا کہ شروعِ جاڑوں میں ڈپٹی صاحب کی بیوی اپنے پوتے کی موت کے غم میں پاگل ہو کر مر گئیں، اور اس واقعہ کے ڈیڑھ مہینے بعد ڈپٹی صاحب نے ایک نو عمر پہاڑی دوشیزہ سے نکاح کر لیا۔

میرے لئے متعجب ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

انقلاب

وجاہت سندیلوی، بی اے

اُن نڈر خوددار کیرٹروں کے نام جو باوجود اپنے حقیر جسم اور ناچیز طاقت کے زیادہ پریشان اور تنگ کئے جانے پر اپنے ایذا رساں پر پلٹ پڑتے ہیں۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ ہر طرف اندھیرا چھا رہا تھا، گاؤں میں سنّاٹا تھا۔ چرواہے گھر پلٹ چکے تھے اور دن بھر کی محنت مزدوری کے بعد گاؤں کے لوگ اپنے گھروں میں گھُسے چُولہے کے ارد گرد کھانے کے منتظر تھے۔ لڑکے تالاب کے کنارے کھیل رہے تھے۔ اُن کی آوازیں اور درخت پر کوّوں کی کائیں کائیں احساس خموشی بڑھا رہی تھی۔ گاؤں کا جمود اور معنی خیز سنّاٹا دیکھکر خیال ہوتا تھا گویا کوئی مزدور بڑی محنت کا کام کرنے کے بعد تھوڑی دیر کے لئے تھک کر بیٹھ گیا ہو۔

ایک طرف درختوں کے جھُنڈ سے جن پر نہ معلوم کتنے سیاہ دیو دل کا بار لدا ہوا تھا کلّو سر جھکائے مغموم چلا آرہا تھا۔ اُس نے تالاب کی طرف نظر اُٹھائی تو اُس میں گاؤں کے اِکّا دُکّا چراغ جھلملا رہے تھے۔ اُسے یہ منظر بُرا معلوم ہوا۔ اُس نے فوراً اپنے گھر کی طرف نظر اُٹھائی، وہاں اندھیرا پاکر اُس نے اپنا سر جھکا لیا۔ گھر کے دروازے پر پہونچکر پہلے وہ ٹھٹکا، پھر اندر داخل ہوگیا۔ اُسے اپنا گھر قبرستان سے بھی بدتر معلوم ہوا۔ چولھا ٹھنڈا تھا۔ صحن میں دو ٹوٹی کھٹیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک پر اُس کی بڈھی ماں کراہ رہی تھی اور دوسری پر اُس کی بیوی ایک روتے ہوئے بچّے کو تھپکا تھپکا کر سُلا رہی تھی، اور ایک کو گود میں لئے ہوئے تھی۔ بیوی نے پہلے بڑی اُمید سے کلّو کے چہرے کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھا، پھر اُس پر پریشانی اور مایوسی کے آثار دیکھکر فوراً دوسری طرف دیکھنے لگی۔ کیا میاں سے آنکھیں چار کرکے اُس کو ذلیل کرتی؟

وہ گود کے بچّے کو لئے ہوئے پلنگ سے اُٹھ گئی۔ کلّو پلنگ پر بیٹھ گیا، تھوڑی دیر بعد اُس نے پیر جھاڑے، اور پیر پکڑ کر لیٹ گیا، جیسے بہت تھک گیا ہو۔ ایک دوسرے سے ایک لفظ بھی نہ بولے، لیکن دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے مطالب سے پوری پوری طرح واقف تھے "کلّو، کلّو" دروازہ پر ایک کرخت آواز سنائی دی۔

بیوی نے میاں کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا "ہیں نہیں ابھی کام سے نہیں آئے"۔ "ایسی تیسی اس کے کام کی بڑا کام کرنے والا بنا ہے، حرامزادہ، اب ہم نہیں رُک سکتے، ابھی اسی وقت لٹیا تھریا" لیجائیں گے، یہ بھی کوئی بات ہے" پھر آواز آئی۔ بیوی نے گڑگڑا کر کہا "مہاراج کل وہ آجائیں گے تب" مہاراج نے اس کو بات بھی نہ کرنے دی اور ہزارہا مغلظات سنا ڈالیں، اور اُس کے بعد ایک فاتحانہ کھنکار کے ساتھ گھر میں داخل ہوگئے۔ کلّو نے

کمرے میں چھپ جانے کی ناکام کوشش کی وہ بیچ صحن ہی میں تھا کہ مہاراج نے اُسے دیکھ لیا۔ پھر کیا تھا۔ "کیوں بے سالے" کہہ کر انھوں نے اُس کو پکڑ لیا اور مارنا شروع کر دیا۔ چانٹوں، گھونسوں، لاتوں۔ جوتوں سے اُسے مارتے جاتے اور ہزار ہا گالیاں دیتے جاتے۔ بیمار ماں جاگ پڑی، اور اپنے لڑکے کا یہ حال دیکھکر پرمیشر کی دہائی دینے لگی، بچے اپنی ماں سے چمٹ گئے اور وہ بیچاری غیرت اور شرمندگی سے رونے لگی۔ بیچارہ کلّو، مہاراج کے ہاتھوں میں ایک کھلونا بنا ہوا تھا۔ کبھی ہاتھ جوڑتا، کبھی پیروں پڑتا، کبھی دُہائی دیتا، لیکن مہاراج بالکل متاثر نہ ہوتے، اور اُن کی مصروفیت میں ذرا بھی فرق نہ آتا، بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا کوئی بُھوکا درندہ اپنے مردہ شکار کو جھنجھوڑ رہا ہو۔ جب کلّو بیہوش ہوکر ایک طرف گر پڑا تو مہاراج سینکڑوں گالیوں کے ساتھ یہ کہتے ہوئے چلے گئے کہ اگر کل تک ان کا حساب آنے پائی سے بیباق نہ ہو گیا تو آج تو انھوں نے چھوڑ دیا، لیکن کل خیر نہیں۔

مہاراج چلے گئے تو بیوی نے آکر کلّو کو پلنگ پر لٹایا اور پنکھا جھلنے لگی۔ رات کو گھر میں سب سو گئے لیکن کلّو جاگتا رہا۔ قریب بارہ بجے کے وہ اُٹھا اور کُنڈی کھول کر دروازے کے باہر نکل گیا۔ دروازے سے نکلتے وقت اُس کے چہرے پر پڑوس کے چراغ کی لو جھلملائی اور اس کی آنکھیں بڑی خوفناک معلوم ہوئیں۔ یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ یہ اُسی کلّو کی آنکھیں ہیں جو شام کو مہاراج کے قدموں پر لوٹ لوٹ کر ہاتھ جوڑ رہا تھا۔

~~~

دوسرے دن سویرے تڑکے گاؤں بھر میں بجلی کی طرح یہ خبر دوڑ گئی کہ رات کو کسی نے مہاراج کا گلا گھونٹ دیا اور اُن کا روپیہ والا بکس لے کر چمپت ہو گیا۔ گاؤں بھر کے لوگ مہاراج کے مکان پر جمع ہو گئے اور طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرنے لگے، کلّو ان سب سے الگ، ایک لٹھ کندھے پر رکھے بانکی پگڑی باندھے شہر کی طرف جا رہا تھا، ایک ہلکی سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی، وہ بازار سے ماں کے لئے دوا، بیوی کے لئے کپڑے اور بچوں کے لئے کھلونے لینے جا رہا تھا۔

~~~

"عشق" اور "وطن"

یہ سچ ہے عشق سے بنجائیگی مری ہستی
بلندیوں سے گزر جائے گی مری پستی

یہ سچ ہے عشق سے قائم ہے کائنات کا نظم
اِسی کے دم سے ہے وابستہ جوشِ گرمیٔ بزم

یہ سچ ہے ماہ نے بھی اس سے بھیک مانگی ہے
یہ سچ ہے مہر نے بھی اس سے روشنی لی ہے

یہ سچ ہے پائی ہے گلشن نے تازگی اس سے
کلی کلی نے طلب کی ہے دلکشی اس سے

غرضکہ عشق مجسّم لطافت و رحمت
مرے ندیم! مگر مجھکو تو نہیں فرصت

کہ مجھکو اس سے اہم ایک کام کرنا ہے
خزاں کے نقش میں رنگِ بہار بھرنا ہے

دین و ملّت کو سلام

مل گئے کل راستے میں اک معزز شہر کے — آرہے تھے کرکے اربابِ حکومت کو سلام
مجھ سے فرمایا کہ "گو تم ہو بہت قابل مگر — جو نہ آئے کام ایسی قابلیت کو سلام
سجدہ گاہِ اہلِ دل ہے یہ تمہارا آستاں — آسماں کرتا تھا جھک کر جس کی رفعت کو سلام
شہر میں تم دیکھتے ہو آدمی کوئی نہیں — کرلیا ہے کس لئے تم نے سیاست کو سلام
حاکمانِ شہر شاکی ہیں کہ تم ملتے نہیں — کبر سے کرتے نہیں اربابِ دولت کو سلام
ہوکے عالم دین کے چلتے ہو راہِ عقل پر — ہوکے صوفی حلقۂ اہلِ طریقت کو سلام
یہ تمہاری وضع و صورت یہ تمہارے رنگ ڈھنگ — اک نہ اک دن تم کروگے دین و ملت کو سلام"

سلسلہ اُن کی ہدایت کا جو پہونچا دین تک — عرض کی میں نے بھی پھر کرکے متانت کو سلام
مشفقِ من! شہر میں جب آدمی کوئی نہیں — آپ ہی کہئے نہ کرلوں کیوں سیاست کو سلام
جس میں حق سننے کی استعداد بھی باقی نہیں — ایسی باطل قوم کی باطل قیادت کو سلام
حاکموں سے جھوٹ بولوں بیچ ڈالوں قوم کو — آپ کا منشا یہ ہے کرلوں شرافت کو سلام
خود لڑاؤں جاہلوں کو خود کروں تبلیغِ امن — لوں حکومت سے خطاب ایسی سیاست کو سلام
مجھکو اپنے نفس کی ذلت بھی ہے دل سے عزیز — غیر سے جو مانگئے ہر ایسی عزت کو سلام
جس کی پاپوشیں بنی ہوں مفلسوں کی کھال سے — دور سے اُس وارثِ قاروں کی دولت کو سلام
جس کے ہاتھوں سے ٹپکتا ہو شہیدوں کا لہو — سُن رکھیں اہلِ حکومت اُس حکومت کو سلام
رند ہی اچھا، نہ دو ذوقِ ریاکاری مجھے — قید جو حلقے میں ہو ایسی طریقت کو سلام
دین بھی فطری ہے میرا عقل بھی فطرت مری — ہو جو فطرت کے مخالف اس شریعت کو سلام
ناصحا جس دین و ملت کے نمائندے ہیں آپ — میکشِ بے دین کا اس دین و ملت کو سلام

(میکش اکبرآبادی)

پتنگے کی آزادی

محمد عبدالکریم آزاد (اشرفی)

جون کی ایک شام تھی۔ گذشتہ شب کافی بارش ہوئی تھی۔ نالے، گڈھے، جھیل، تالاب، سب بھر گئے تھے، مینڈکوں کے ٹرٹر کرنے کی سامعہ خراش آواز سنائی دے رہی تھی۔ جھینگر کی طبیعت اُکتا دینے والی آواز تو نہ تھی، لیکن اسی قسم کے دوسرے حشرات الارض قبل از وقت پانی کے برس جانے کی خوشیاں منا رہے تھے۔ بعض دھیمی اور بعض کچھ تیز آوازیں، انگریزی باجے کی طرح موٹے، بھدے، بُرے مینڈکوں کی کرخت موسیقی کے ساتھ ملا رہے تھے، حبس تو اُس روز بھی تھا، لیکن گذشتہ رات کا سا نہ تھا، کبھی کبھی ہوا کے دو ایک ٹھنڈے جھونکے کچھ پھولوں کے خوشبو لئے ہوئے دروازے کی کوٹھری میں آجاتے، بارش کا نتیجہ تھا کہ دو چار سیاہ، اور دو چار مضبوط پروں والے پتنگے ولایتی لالٹین کے گرد چکر لگانے لگے، میں مطالعے کے کمرے میں بیٹھا ایک مضمون بعنوان "مسولینی کی بتدریج ترقی" کا مطالعہ کر رہا تھا۔ جس کا پہلا جملہ اس طرح شروع ہوتا ہے "گرجکر! آؤ!! ہم فتح کریں۔ یقین مانو ہم ضرور فتح یاب ہوں گے ——— زندہ باد! اٹلی زندہ باد!!"

میں سوچ رہا تھا کہ کاش! ایسا کوئی بہادر ہندوستان میں بھی جنم لیتا۔ اور غول بیابانی کی طرح، جس طرح اٹلی میں لوگ مسولینی کی پیروی کرتے ہیں ہندوستان میں بھی لوگ اس کی پیروی کرتے۔

دو تین دفعہ اس جملے کو پڑھا۔ ایک بیخودی کی کیفیت طاری ہوگئی، مجبور غصہ ور انسان کی طرح آپ ہی آپ گرجنے لگا "آزاد نسل کا بچہ ہوں۔ گو پنجرے میں ہوں۔ لوگو! اُٹھو!! عَلَم آزادی ہاتھ میں لو ——— بجلی کی تیز روشنی کی طرح سارے ملک میں پھیل جاؤ ——— طوفان میں گُل نہو! موسلا دھار پانی میں سرد نہ پڑ جاؤ! ——— انسان کے روکے نہ رُکو ——— کم ہمتوں کے دل میں ہمت ——— اور ہمت ور کے دل میں اور زیادہ ہمت و جوش پیدا کر دو! بلا خوف و خطر سمندر میں کود پڑو! پہاڑوں کو اُکھاڑ پھینکو! ——— اور پھر جنگل کے آزاد سردار کی طرح زندگی بسر کرو! ——— اگر ایسا نہیں کروگے تو ہمیشہ تمہیں نچلے طبقے کے غلام کی طرح نظریں نیچی کرکے چلنا ہوگا ——— ہمیشہ ہمیشہ تمہارے ہاتھوں میں ہتھکڑی ——— اور پاؤں میں لوہے کی مضبوط بیڑیاں ہوں گی ——— کچھ غم، کچھ غصہ۔ کچھ جھنجھلاہٹ، کچھ دورِ موجودہ کی لاانتہا مصیبتوں کو یاد کرکے رونے لگا ——— رونے لگا بالکل پاگل کی طرح۔ بالکل پاگل کی طرح ہنسنے لگا۔ آنسو کے دو چار قطرے کتاب کے صفحے پر بکھرے پڑے تھے ——— دو ایک رخسار پر تھے، ایک دو پلکوں کو بھاری کئے آنکھوں میں ناچ رہے تھے ——— ناچ رہے تھے کہ ساڑھے نو بجے ——— گھڑی کی دوہری آواز سے خیال کا سلسلہ ٹوٹ گیا ———

آنسو پونچھے اور دوسرا صفحہ اُلٹا ——— اُلٹے ہوئے ورق کی بمشکل دو سطریں پڑھی ہوں گی کہ آہستہ آہستہ پڑھا ہوا ورق اُٹھنے لگا ——— میں نے آہستہ سے دبا دیا ——— ڈیڑھ سطر پڑھنے کے بعد پھر وہی کیفیت پیدا ہوئی ——— "یا خدا" کہتا ہوا پھر صفحہ برابر کر دیا ——— اور مطالعے میں مشغول ہوگیا ——— اب سرسراہٹ کی آواز پیدا ہونے لگی ——— اس کا خیال نہ کرتے ہوئے اب کی ذرا زور سے دبا دیا ——— نتیجہ یہ ہوا کہ ———

"صندی بچے کی طرح" اور زور سے سرسراہٹ کی آواز نکلنے لگی ـــــ تنگ آکر مجھکو مطالعہ چھوڑ دینا پڑا ـــــ اور چپ چاپ ایک ہاتھ سے سر ٹیکے پتنگوں کا "رقص مجنونانہ" دیکھنے لگا ـــــ پتنگے بجلی سے اُڑ رہے تھے ـــــ بتی تیز تھی ـــــ کتاب کھلی ہوئی تھی، بھنبھناہٹ کی آواز صفحے کے نیچے سے برابر آرہی تھی ـــــ آنکھیں ٹکٹکی لگائے اس کا تماشا دیکھ رہی تھیں۔ آواز میں پہلے سے زیادہ تیزی تھی ـــــ ورق کچھ اوپر کی طرف اُٹھنے لگا ڈرامے کے پردے کی طرح ـــــ اندر سے وہی بھنبھناہٹ کی آواز جیسے کوئی مصیبت میں کراہ رہا ہو برابر آرہی تھی ـــــ چند لمحے میں آواز تیز تر ہو گئی۔ اور اُس کے بعد بھنبھناہٹ ہوا میں گونج رہی تھی ـــــ پتنگا اب آزاد تھا ـــــ پہلے کی طرح ـــــ اس کے ساتھ ہی اور چند پتنگے نکل بھاگے ـــــ گویا اُس نے انقلاب کا پرچم لہرایا تھا ـــــ اور کئی چھوٹے، بڑے، پتنگے اس پرچم کے نیچے سے آزادی کا راگ الاپتے ہوئے نکل گئے ـــــ اور بہت خوش خوش وہ میرے منہ، کان، اور سر پر اچھلنے اور میرے کان میں "آزادی" کا افسانہ کہنے لگے۔ وہ سب اپنے عادات واطوار سے بتا رہے تھے کہ اب وہ سب ہر طرح سے آزاد ہیں ـــــ اور اُنھیں کامل آزادی مل گئی ہے۔ ہر طرف کی گھڑیوں میں دس بجنے لگے ـــــ کوئی آہستہ آہستہ کوئی زور زور سے شہر کے گھنٹہ گھر کا گجر بجنا شروع ہوا، اور اُس کے بعد شہر کے تمام گھنٹے یکے بعد دیگرے بجنے لگے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے جیل کا کوئی قیدی بھاگ گیا ہے، ـــــ اور اس کی تفتیش کے لئے لوگوں کو بیدار کیا جا رہا ہے۔ اور کبھی ایسا محسوس ہوتا کہ سارے شہر میں آگ لگی ہوئی ہے ـــــ اور آگ بجھانے کے لئے گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ میرا دل اب زیادہ دھڑکنے لگا ـــــ گھنٹیاں بدستور بج رہی تھیں ـــــ آخرش یہ خیال دماغ میں زہریلے گیس کی طرح گھس گیا کہ ـــــ ضرور یہ "انقلابی گھنٹیاں" ہی ہیں ـــــ اور ہمیں بیدار ہو جانا چاہیئے ـــــ اور صرف یہی نہیں بلکہ ان کی مدد کے لئے دوڑ پڑنا چاہیئے ـــــ ذہن میں ایسا نقشہ کھنچ گیا کہ ـــــ "انقلابی گھنٹیاں" بج رہی ہیں ـــــ اور لوگ پریشان صورت، اُلجھے ہوئے بال، خوابیدہ چہرے، آنکھیں ملتے ہوئے بوڑھے، جوان، لڑکے، بچے، مرد، عورت، دوڑتے، ہانپتے، گرتے پڑتے ہوئے ـــــ کسی کے ہاتھ میں کچھ ہے، کسی کے ہاتھ میں کچھ ـــــ سب ایک جگہ جمع ہو رہے ہیں ـــــ ایک ہنگامہ ہے، دکھائی نہیں پڑ رہا ہے کہ کون سردار ہے اور کون سپہ سالار ـــــ سب کی زبان پر انقلاب ہی انقلاب ہے۔ غول کے بیچ سے کوئی چیخ چیخ کر اور گلا پھاڑ پھاڑ کر کہہ رہا ہے ـــــ "صف بندی کرو! ـــــ صف بندی کرو! ایک قطار میں ہو جاؤ! ـــــ ہو جاؤ! نوجوانوں کو آگے کرو! جلدی کرو! پھرتی کرو! لائن بناؤ! اُف دیکھتے نہیں! دشمن قریب آگیا ـــــ غالباً شہر پناہ کے اُس پار ہے ـــــ سنو! میرے شیرو! میرے بہادرو! میرے قابل قدر نوجوانو! میرے جنگجوؤ! ڈرنا مت! ہرگز ہرگز مت ڈرنا ـــــ نپولین کی طرح بلا خوف خطر لڑ پڑو، ڈٹ کر مقابلہ کرو! ٹوٹ پڑو! بھائیو! دیکھو، دیکھو، دشمن کی فوجی مشعل کی روشنی قریب تر ہو رہی ہے ـــــ ہوشیار! ہوشیار!! ـــــ ہو ـــــ ش ـــــ ش ـــــ یا ـــــ یا ـــــ ر ـــــ ر ـــــ ر ـــــ ر ـــــ ر ـــــ ر ـــــ ر"

گھنٹیوں کی آواز آنی ختم ہو گئی ـــــ لیکن "ر" کی آواز ہنوز فضا میں گونج رہی تھی ـــــ اب ہر طرف سناٹا چھا گیا ـــــ بالکل سناٹا۔ جیسے نصف رات بھیگ چکی ہے ـــــ ہمارے تخیلات کا سلسلہ ختم ہو گیا ـــــ میں تن تنہا اپنے کمرے میں بیٹھا تھا وہی میگزین ـــــ وہی مضمون ـــــ وہی "ولائتی لالٹین" ـــــ وہی "آزاد پتنگے" ـــــ اور وہی غلام ہندوستان ـــــ کیا میں جاگ رہا تھا؟ کیا میں سو رہا تھا؟۔

جب رات کو چھوٹتے ہیں بادل کالے
ظلمت میں ٹپکتے ہیں دلوں کے چھالے
قربان ترے اس وقت کی تاریکی میں
انگشت سحر سے دل کو چھونے والے!

([illegible])

انسانی فرائض کے متعلق جوزف میزنی کے گرانقدر خیالات

سید اختر علی تلہری

جوزف میزنی انیسویں صدی کی ایک نامور شخصیت ہے۔ اٹلی کی سرزمین کو اس کے مولد و مسکن ہونے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ اگر ایک طرف یہ زبردست مفکر اور اہل قلم تھا تو دوسری طرف عملی سیاسیات میں بھی بہت زیادہ منہمک رہنے والا، چنانچہ اپنی اس سیاسی جد و جہد کی وجہ سے قید اور جلا وطنی کی مصیبتیں بھی اسے برابر جھیلنا پڑیں۔ اس کے مقالات عام طور سے نہایت پُرمغز اور دانش و خرد کا گرانبہا ذخیرہ ہیں۔ اُن کے مطالعہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ غور و فکر کے سنگلاخ میدانوں میں اس کی عقل کا بادپا کس سبک خرامی کے ساتھ دوڑتا ہے۔

چونکہ عملی سیاسیات اس کی زندگی کا جز بن چکے تھے اس لئے وہ مجبور تھا کہ بحث و نظر کے لئے وہی مباحث چنے جن سے فعل و عمل کی دنیا میں فائدے اٹھائے جا سکیں۔ اس کا عنوان بحث اُن علمی موشگافیوں سے یقیناً خالی ہے۔ جو مابعد الطبیعاتی مباحث کے لئے طغرائے امتیاز ہیں، تاہم اس کے خیالات میں ایک حد تک فلسفیانہ استحکام موجود ہے اور وہ اس کی علامت رکھتے ہیں کہ اس "فکری ذوق" کو تسلی دے سکیں۔ جو عمل سے بیگانہ بننا نہیں چاہتا۔ اس میں بھی شک نہیں کہ وہ ایک خیال کو بہت بڑے پھیلاؤ کے ساتھ بیان کرتا ہے، مگر یہ اس کی خطابت کا کمال ہے کہ بیان کا یہ پھیلاؤ طبیعتوں پر گراں نہیں ہوتا۔

انسانی فرائض کے متعلق اس کا یہ طویل الذیل مقالہ ہے جس میں اس نے بہت سی تمدنی و اخلاقی حقیقتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ میزنی کا نظریۂ فرائض کوئی نیا نظریہ نہیں ہے۔ یہ وہ صداقت ہے جس کی تبلیغ مختلف شکلوں میں اخلاقی و روحانی سرمایہ داروں کی طرف سے ہوتی رہتی ہے، تاہم جہاں تک کہ اس نظریہ کا تعلق ہے اس نے "پرانی شراب" کو نئی خوشنما بوتلوں میں سلیقہ سے بھر کر پیش کیا ہے۔

میزنی نے مسیحیت کی آغوش میں تربیت پائی ہے۔ ایسی صورت میں وہ اپنے اُن خیالات کو جن پر مذہبی رنگ چڑھا ہوا ہے "عیسائی اصطلاحات" سے بے نیاز کیونکر بنا سکتا تھا؟ اس نے جا بجا بعض عیسائی نظریوں کی حکیمانہ ترجمانی کی بھی سعی کی ہے اور اس کا یہ رنگ اس مقام پر خصوصیت سے جھلک آتا ہے جہاں اس نے ان فرائض کا تذکرہ کیا ہے جو خدا سے متعلق ہیں، مگر ان باتوں سے متوحش ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ دیکھنے کی بات صرف اتنی ہے کہ میزنی جو اٹلی کے مفکرین کا میر قافلہ ہے بعض اہم اخلاقی و سیاسی مسائل کے متعلق کن خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میزنی نے نظریۂ فرائض کی تبلیغ جس حکیمانہ بلند آہنگی سے کی ہے اس کی معقولیت کو خالص سے خالص عقلیت پسند انسان کو بھی ماننا پڑے گا۔ اٹلی کے مزدوروں کو خطاب کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

میں تمہارے فرائض کے متعلق تم سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں، ہمارے دائرۂ معلومات میں جو مقدس ترین چیزیں ہیں یعنی خدا۔ انسانیت، وطن اور خاندان انھیں کے متعلق اپنے دل کی ہدایتوں کے مطابق میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ اُسی محبت کے ساتھ تم میری باتیں سنو جس محبت کے ساتھ میں انھیں تم سے کہہ رہا ہوں۔ میرے الفاظ اس عقیدہ کے آئینہ دار ہیں جس میں برسوں کے رنج و غم مشاہدہ اور مطالعہ نے پختگی پیدا کردی ہے، جن فرائض کو تمہیں بتانا چاہتا ہوں اُن کے انجام دہی کی حتی الوسع کوشش کرتا رہا ہوں، اور جب تک زندہ ہوں کوشش کروں گا۔ ممکن ہے کہ مجھ سے غلطی ہو جائے۔ لیکن میرا قلب سچا ہے۔ ممکن ہے کہ میں اپنے نفس کو فریب میں مبتلا کرلوں، لیکن تمہیں فریب نہیں دوں گا۔ ایک بھائی کی طرح میری باتیں سنو اور آپس میں آزادی سے اس کا فیصلہ کرو کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ تمہیں سچ معلوم ہوتا ہے یا نہیں؛ اگر وہ باتیں جنھیں میں تمہیں سُنا رہا ہوں تم کو جھوٹی معلوم ہوں تو مجھے چھوڑ دو۔ لیکن اگر اُنھیں سچ سمجھو تو میری پیروی کرو اور میری تعلیم کے مطابق عمل کرو۔ غلطی میں مبتلا ہو جانا ایک بدنصیبی ہے، جو رحم کے قابل ہے۔ لیکن سچائی کا علم ہو جانے کے بعد اپنے افعال کو اُس کے مطابق نہ بنانا ایسا جرم ہے جو دنیا و عقبیٰ دونوں میں قابل لعن و سرزنش ہے۔

حقوق طلبی پر فرائض کی انجام دہی مقدم ہے

میں کیوں "تمہارے حقوق" پر گفتگو کرنے سے پیشتر تمہارے فرائض پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں؟ میں کیوں ایسی سوسائٹی میں جس میں ہر چیز اختیاری یا اضطراری طور سے تم پر ظلم کر رہی ہے۔ جس میں کسی انسانی حق کے برتنے کے تم مجاز نہیں ہو۔ جس میں صرف تکلیف و مصیبت تمہارا حصہ ہے، اور جس میں خوش وقتی و خوشحالی دوسرے انسانی طبقوں کا حق ہے۔ ایسے سماج میں فتوحات حاصل کرنے کے بجائے قربانی و ایثار کی، مادی بہتری کے بجائے نیکی، اخلاقی ارتقا اور تعلیم کی تمہیں تبلیغ کر رہا ہوں؟

یہ وہ سوال ہے جس کا جواب مجھے سلسلۂ کلام کے آگے بڑھانے سے پہلے دیدینا چاہئیے، کیونکہ یہی وہ مقام ہے جہاں ہمارے سیاسی خیالات اور اُن دوسرے سیاسی خیالات میں جن کی آج یورپ میں تلقین کی جارہی ہے، فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہی وہ سوال ہے جو مصیبت زدہ مزدوروں کے خشمگیں دماغوں میں برابر پیدا ہوتا ہے۔ وہ پوچھتے ہیں "ہم غریب ہیں، غلام ہیں، تکلیف میں ہیں۔ ہم سے ہماری مادی حالت کی بہتری، آزادی اور خوشحالی کے متعلق گفتگو کرو۔ ہمیں یہ بتاؤ کہ آیا ہم اُنھیں مصیبتوں کو ہمیشہ جھیلتے رہیں گے یا کبھی زندگی کی مسرتوں سے بھی بہرہ اندوز ہو سکیں گے۔ ہمارے آقاؤں کو اور اُن اونچے طبقہ والوں کو فرائض کی تعلیم دو جنھوں نے ہمیں مشین بنا رکھا ہے، اور جنھوں نے اُن تمام نعمتوں پر جو سب کا حصہ ہیں تنہا اپنا اجارہ قائم کر لیا ہے، ہم سے تو ہمارے حقوق کے متعلق بات چیت کرو۔ ہمیں تو وہ ذرائع بتاؤ جن سے ہم انھیں حاصل کرسکیں۔ ہمیں تو قوت و طاقت کی تعلیم دو۔ ہمیں پہلے اپنا وجود تو منوا لینے دو پھر فرائض اور قربانی کی تعلیم دینا"۔

یہ وہ باتیں ہیں جنھیں ہمارے بہت سے مزدور پیشہ کہتے اور اُن معلموں اور جماعتوں کی پیروی کرتے ہیں، جنھیں اُن کی ان خواہشوں سے عملی ہمدردی ہے، لیکن وہ ایک بات بھول جاتے ہیں یعنی جس نظریہ کو وہ اس شد و مد سے پیش کرتے ہیں، اُس کی پچاس برس سے تلقین کی جارہی ہے، لیکن اُس سے مزدور پیشہ جماعت کی حالت میں ذرا سی بھی مادی ترقی پیدا نہیں ہوسکی ہے۔

گزشتہ پچاس سال میں مطلق العنان حکومتوں اور خاندانی امیروں کے خلاف (عام انسانی) ترقی اور بہتری کی خاطر جو کچھ کیا گیا وہ انسانی حقوق کے نام سے کیا گیا ہے، آزادی کو ذریعہ بتایا گیا تھا، اور خوشحالی و بہبود کو زندگی کا مقصد ——

—— وہ تمام افعال جو انقلاب فرانس اور بعد کے دوسرے تقلیدی انقلابات کے دوران میں کئے گئے ہیں "اعلان حقوقِ انسانی" ہی کا نتیجہ تھے۔

ان تمام فلسفیوں کے مصنفات کی بنیا جنھوں نے ان انقلابات کی زمین طیار کی تھی "آزادی" کے نظریہ پر اور اس امر کی ضرورت پر تھی کہ ہر شخص کو اُس کے حقوق جتا دئے جائیں۔ جتنی انقلابی جماعتیں تھیں وہ اسی کی تبلیغ کرتی تھیں کہ انسان خوش حالی اور خوش وقتی کے لئے پیدا ہوا ہے، اُسے اُس کا حق ہے کہ وہ اس خوشحالی کے حاصل کرنے کی تمام امکانی ذریعے

سے کوشش کرے کوئی شخص اس کا مجاز نہیں ہے کہ اُس کی اس تلاش میں رکاوٹیں ڈالے (اگر رکاوٹیں ڈالی جائیں) تو وہ حق رکھتا ہے کہ وہ اُن تمام موانع اور رکاوٹوں کو راستہ سے ہٹا دے۔ چنانچہ یہ موانع راستہ سے ہٹا دئے بھی گئے اور آزادی حاصل بھی کی گئی۔ بہت سے ملکوں میں وہ برسوں تک قائم رہی۔ بعض میں وہ ابھی تک قائم ہے۔ لیکن کیا عام اشخاص کی حالت میں ترقی ہوگئی؟ کیا اُن لاکھوں آدمیوں کو جو روزانہ محنت و مزدوری کرکے پیٹ پال رہے ہیں۔ اُس خوشحالی کا کوئی حصہ بھی ملا جس کی اُنھیں توقعات تھیں اور جس کا اُن سے وعدہ کیا گیا تھا؟ نہیں۔

عام اشخاص کی حالت میں کوئی ترقی نہیں ہوئی بلکہ قریب قریب ہر ملک میں[*] اُن کی حالت کچھ اور بھی خراب ہوگئی۔

[*] خصوصاً اُس مقام پر جہاں کہ میں لکھ رہا ہوں۔ (لندن)

ضروریات زندگی کی قیمتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ مزدوروں کی اجرتیں بہت سی حرفتوں میں کم ہوتی جا رہی ہیں۔ اور آبادی میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ قریب قریب ہر ملک میں مزدوروں کی حالت کچھ زیادہ غیر پائدار اور خراب ہی ہوگئی ہے۔ ایسی اسٹرائکیں جن سے ہزارہا مزدور یک وقت بیکار ہو جاتے ہیں، آئے دن ہوتی رہتی ہیں۔ ایک ملک سے دوسرے ملک میں چلے جانے اور یورپ سے دنیا کے دوسرے حصوں میں منتقل ہو جانے کی رفتار میں زیادتی۔ عام فائدہ رساں اداروں کی تعداد میں ترقی پذیر اضافہ۔ مفلسوں اور غریبوں کے سامان خورش اور حفاظت کی فکر میں روز افزوں ترقی ہمارے دعوے کے ثبوت کے لئے کافی ہیں۔ موخر الذکر امر سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ پبلک کی توجہ برابر غریبوں کی تکلیفوں اور مصیبتوں کی طرف بڑھتی جا رہی ہے۔ لیکن اُن کی تکلیفوں اور پریشانیوں کو کسی محسوس حد تک کم نہ کر سکنے سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ ان طبقوں میں جن کی وہ مدد کرنا چاہتے ہیں افلاس بھی اُسی تیزی سے ترقی کرتا جا رہا ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ ان آخری پچاس برسوں میں تمدنی دولت اور مادی برکتوں کے حصول کے ذریعوں میں نہایت تیزی سے اضافہ ہوا ہے، پیداوار دوگنی ہوگئی ہے، تجارت کا بازار متواتر مواقع خطرات کے پیش آنے کے باوجود جن کا سامنا تنظیم کی عدم موجودگی کی حالت میں ناگزیر تھا۔ برابر رونق پکڑتا جا رہا ہے، اور اُس کے حدود میں وسعت ہوتی جا رہی ہے۔ ذرائع آمد و رفت ہر جگہ محفوظ اور سریع ہوگئے ہیں۔ روانگی اشیا کے محصول کی کمی کی وجہ سے چیزوں کی قیمتیں بھی بہت گھٹ گئی ہیں۔ اس کے ساتھ حقوق کا تخیل جو انسانی فطرت میں داخل ہے، آج عام طور سے قبول کیا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو عملاً اس سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں اُسے لسانًا منافقانہ طور ہی سے بھی ضرور تسلیم کرتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مزدوروں کی حالت نہیں سدھرتی ہے؟ اس کا کیا سبب ہے کہ پیداوار کی تقسیم یورپ کی تمدنی جماعتوں میں مساویانہ طور سے نہیں ہوتی، بلکہ اُس کی جگہ صرف چند اشخاص کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے جس سے ایک نئی "جماعت الامرا" کا وجود ہوتا جا رہا ہے؟ اس کا کیا باعث ہے کہ صنعت و حرفت و تجارت میں جو نئی روح پیدا ہوگئی ہے اُس نے اکثریت کی بہبود کا سامان مہیا کرنے کے بجائے چند افراد کی عیش پسندیوں میں اضافہ کر دیا ہے؟

ان تمام سوالات کا جواب اُن لوگوں کے لئے بالکل واضح ہے جو ان تمام معاملات پر ذرا غور سے نظر کرتے ہیں۔

حقوق کا تصادم

انسان تعلیم کا آفریدہ ہے۔ وہ جس قسم کے تعلیمی اصولوں سے مستفید ہوتا ہے اُنھیں کے مطابق عمل کرتا ہے۔ جن اشخاص نے انقلابات کو اب تک ترقی دی ہے، اُنھوں نے ان کی بنیاد "انفرادی حقوق" پر رکھی ہے۔ انقلابات نے آزادی حاصل کر لی، انفرادی آزادی، تعلیمی آزادی، اعتقادی آزادی، تجارتی آزادی، غرضکہ ہر چیز میں آزادی اور ہر شخص کے لئے آزادی، لیکن اپنے ان حقوق کا احساس اُن لوگوں کے واسطے کیا مفید ہو سکتا ہے، جن کے پاس اُن کے برتنے کے ذرائع ہی نہیں ہیں؟ آزادی تعلیم سے اُن کو کیا فائدہ پہونچتا جن کے پاس نہ تو وقت ہے اور نہ دوسرے ذرائع کہ وہ اُس سے نفع اُٹھائیں؟ آزادی تجارت سے اُنھیں کیا نفع جن کی نہ تو کوئی ساکھ ہے اور نہ جن کے پاس کوئی سرمایہ؟ اُن تمام ملکوں میں جہاں اس اصول کا اعلان کیا گیا تھا سوسائٹی کی ترکیب دو قسم کے افراد سے تھی قلیل افراد تو وہ تھے جن کے قبضے میں زمین اور سرمایہ تھا، لیکن کثیر تعداد ان افراد کی تھی جن کے قبضے میں اپنے ہاتھوں کے سوا اور کچھ نہ تھا اور جو اس پر مجبور

تھے کہ اپنے زندہ رہنے کے لئے پہلے طبقہ کی عائد کردہ شرائط پر تمام دن ایک
طرح کی محنت و مزدوری کریں اور اُن کے ثمرات سے اپنے آقاؤں کو فائدہ
پہونچائیں۔ اُس طبقہ کے لئے جو بھوک سے جنگ کرنے پر برابر مجبور رہتا
تھا آزادی سوائے ایک فریب نظر اور تکلیف دہ طنز کے اور کیا ہوسکتی ہے؟
اس حالت کے بدلنے کی خاطر پہلے طبقہ کے افراد کے لئے یہ ضروری
تھا کہ وہ مزدوری کے اوقات کم کریں۔ اجرت میں اضافہ کریں۔ عوام کے
لئے مفت [illegible]ر ایک طرح کے تعلیمی ادارے قائم کریں اور اچھے اور نیک
کردار مزدوروں کے لئے بونس فنڈ (انعام) مہیا کریں۔ لیکن وہ طبقہ
ایسا کیوں کرے؟ کیا بہبودی زندگی کا عام مقصد نہیں تھا؟ کیا مادی نعمتیں
دوسری چیزوں سے پہلے قابل خواہش نہیں تھیں؟ وہ کیوں اپنی مسرتوں
اور عیش پسندیوں کو دوسروں کے فائدے کے لئے کم کریں؟ وہ لوگ
جو اپنی مدد کرسکتے ہیں خود اپنی مدد کریں، جب کہ سوسائٹی نے ہر شخص کے
لئے جو ان "انسانی حقوق" سے فائدہ اُٹھاسکتا ہے اُس کی آزادی محفوظ
کردی ہے کہ وہ ان حقوق کو برتے تو اب اُس سے اور کس بات کی خواہش
کی جاسکتی ہے؟ اگر کوئی شخص اپنے حالات کے عدم مساعدت کی وجہ سے
ان حقوق کو برت نہیں سکتا، اور اُن سے فائدہ نہیں اُٹھاسکتا تو اُسے
صبر کرنا چاہئے اور دوسروں کو الزام نہیں دینا چاہئے۔ یہ بالکل فطری
تھا کہ خوشحال طبقہ یہ باتیں کہے اور چنانچہ اُس نے کہیں بھی۔

غربا کے بارے میں خوش نصیب و خوش طالع طبقوں کا یہ دماغی
رجحان پھیلا، اور بہت جلد یہی کیفیت ہر فرد کی دوسرے فرد کے متعلق
ہوگئی۔ ہر شخص اپنے ہی حقوق اور اپنی ہی حالت کے سدھارنے کی فکر
کرتا رہا۔ دوسروں کی اُسے کوئی فکر نہیں رہی اور جب کبھی اُس کے حقوق
دوسروں کے حقوق سے متصادم ہوئے تو لڑائی چھڑ گئی۔ خون بہانے والی
لڑائی نہیں، بلکہ سونے (دولت) اور مکر و فریب کی لڑائی۔ اگرچہ یہ لڑائی
"خونریز لڑائی" کے مقابلہ میں مردانہ نہیں تھی، لیکن اُسی کے برابر تباہ کن
ضرور تھی۔ اس بے رحمانہ لڑائی میں اُن لوگوں نے جن کے پاس ذرائع
تھے اور جو مضبوط تھے کمزوروں اور بغیر سلیقہ مندوں کو بیدردی سے
کچل ڈالا۔

اس ختم نہ ہونے والی جنگ میں لوگوں کو انانیت و خود پرستی
کی خوب تعلیم ہوئی اور اُن میں اپنی مادی بہتری کی حرص و طمع پیدا ہوگئی۔
مذہبی آزادی نے تمام مذاہب تباہ کردئے۔ تعلیم کی آزادی نے اخلاقی
سرکشی پیدا کردی۔ افراد میں کوئی رشتۂ اتحاد نہیں رہا۔ مذہبی عقائد و
مقاصد میں یکسانی باقی نہیں رہی۔ صرف ایک مقصد رہ گیا کہ ذاتی و
انفرادی مسرتوں اور لذتوں کے حاصل کرنے میں انہاک رکھا جائے،
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شخص نے اپنا الگ راستہ اختیار کیا بغیر اس کی
پروا کئے ہوئے کہ وہ اس راستہ کے چلنے میں کتنے بھائیوں کے سر کچلتا
جا رہا ہے، یہ بھائی نام کے ہیں اور حقیقت میں ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔

تصادم حقوق کی صورت میں کون چیز مفید ہوسکتی ہے؟

یقیناً "حقوق" کا وجود ہے، لیکن جہاں کہیں ایک فرد کے حقوق
دوسرے فرد کے حقوق سے متصادم ہوں وہاں کیونکر ہم اُن میں مصالحت
پیدا کرسکتے ہیں، جب تک کہ حقوق سے بالاتر کسی اور چیز سے اپیل نہ
کی جائے؟ ایسے ہی جہاں کہیں ایک فرد یا بہت سے افراد کے حقوق
ملک کے حقوق سے متصادم ہوں وہاں کونسی وہ عدالت ہے جس سے ہم
اپیل کریں؟ اگر امکانی حدود تک اچھی حالت میں رہنے کا حق ہر متنفس
کو پہونچتا ہے تو پھر وہ کون شخص ہے جو مزدوروں اور کارخانہ داروں کے
درمیان میں پیش آنے والی دقتوں اور دشواریوں کا فیصلہ کرسکے؟
اگر وجود کا حق ہر شخص کا اولین اور مقدس ترین حق ہے تو پھر اس کا مطالبہ
کون کرسکتا ہے کہ دوسروں کے فائدے کے لئے اُس کے وجود کو قربان
کردیا جائے؟ کیا تم ملک کے نام سے سوسائٹی کے نام سے یا اپنے بھائیوں
کی جماعت کے نام سے اس کا مطالبہ کرسکتے ہو؟ اُن لوگوں کی رائے میں
جن کا میں اس وقت تذکرہ کر رہا ہوں، ملک اُس مقام سے عبارت ہے،
جہاں ہمارے "انفرادی حقوق" پورے طور سے محفوظ ہوں، ان کی نگاہوں
میں سوسائٹی ایسے انسانوں کے مجموعہ کا نام ہے جنھوں نے اس امر پر اتفاق
کرلیا ہے کہ اکثریت کی قوت انفرادی حقوق کی تائید میں استعمال کی جائے،
جب تم اپنی ہر فرد کو پچاس برس سے یہ تعلیم دے رہے ہو کہ سوسائٹی کا
قیام ہی اس لئے ہوا ہے کہ وہ ہر شخص کے لئے اپنے حقوق کے استعمال کا حق
یقینی بنادے تو کیا ایسی صورت میں اُس سے یہ مطالبہ کیا جاسکتا ہے کہ

سوسائٹی کی خاطر وہ ان سب حقوق کو قربان کردے، اور اگر ضرورت ہو تو وہ اپنے کو مسلسل تکلیفوں جیل اور جلاوطنی کے لئے سوسائٹی کے بہتر بنانے کے واسطے پیش کر دے؟ ہر موقع پر یہ تبلیغ کرنے کے بعد کہ زندگی کا مقصد خوشحالی ہے کیا تم دفعۃً کسی فرد سے یہ کہہ سکتے ہو کہ وہ اپنی خوشحالی اور اپنی زندگی اس لئے قربان کردے کہ اُس کا ملک غیر ملکیوں کے پنجہ سے آزاد ہو جائے یا اُس جماعت کی حالت اچھی ہو جائے جس سے کہ اُس کا کوئی تعلق نہو؛ تم نے اُس سے برسوں مادی اغراض و مقاصد کی گفتگو کی ہے۔ اب جبکہ دولت و قوت اُس کے رستہ میں آچکی ہے اُس سے کیونکر کہہ سکتے ہو کہ وہ اپنا ہاتھ اُس پر قبضے کے لئے نہ بڑھائے؟

اٹلی کے مزدورو! یہ میرے دماغ کا وقتی خیال نہیں ہے جس کی بنیاد واقعات پر نہو۔ یہ تاریخی حقیقتیں ہیں۔ ہمارے خاص زمانے کی تاریخی حقیقتیں جن کے صفحات انسانوں کے خون سے رنگین ہو رہے ہیں۔ اُن تمام لوگوں سے دریافت کرو جنھوں نے سنہ ۱۸۳۰ء کے انقلاب کو اس شکل میں کہ افراد کا ایک مجموعہ دوسرے مجموعہ کے قائم مقام ہو جائے، تبدیل کر دیا۔ (مثال کے طور پر) تمہارے اُن فرانسیسی رفقا کے جسموں کو جو تین دن میں لڑتے ہوئے قتل کئے گئے تھے اُنھوں نے اپنے عروج و ترقی کا آئینہ بنا لیا۔ سنہ ۱۸۳۰ء سے پہلے اُن کے تمام نظریوں کی بنیاد اسی پرانے نظریہ "انسانی حقوق" پر تھی۔ اُن کے نظریوں کو "انسانی فرائض" سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ تم آج اُنھیں غدار اور دشمن جماعت و وطن قرار دیتے ہو، لیکن اصل یہ ہے کہ اُن کا عمل اُن کے نظریوں کے بالکل مطابق تھا۔ وہ چارلس دہم کی حکومت کے خلاف نہایت صداقت سے جنگ آزما ہوئے تھے، کیونکہ وہ حکومت براہِ راست اُس طبقہ کے مخالف تھی جس سے اُن کا تعلق تھا اور اُس حکومت کی یہ برابر کوشش تھی کہ وہ اس طبقہ کے حقوق پامال کر دے۔ اُن لوگوں نے اُسی بہبودی و خوشحالی کے نام پر جنگ کی تھی جو اُنھیں اُن کے حسب خواہش حاصل نہیں تھی۔ ان میں سے کچھ لوگوں کو "حریت خیال" کی بنا پر مصیبتوں میں مبتلا کیا گیا تھا، کچھ لوگ جو طاقتور دماغوں والے تھے اُنھوں نے محسوس کیا کہ اُن سے غفلت و بے توجہی برتی جا رہی ہے، اُن پر مختلف اعلیٰ عہدوں کے دروازے بند کر دئے گئے ہیں، حالانکہ جو لوگ اُن سے دماغی قابلیت میں کم ہیں وہ اُن پر فائز ہیں، اس کے علاوہ عام افراد کے ساتھ جو زیادتیاں اور بے رحمیاں روا رکھی جا رہی تھیں اُن سے بھی اُن میں برافروختگی پیدا ہو رہی تھی۔ ان تمام باتوں سے متاثر ہو کر اُنھوں نے سچائی اور دلیری کے ساتھ انفرادی حقوق کے متعلق لکھنا شروع کیا اور جب اُن کے سیاسی و ذہنی حقوق محفوظ ہو گئے، اعلیٰ عہدوں کے دروازے اُن کے لئے کھل گئے اور اُنھوں نے اُس خوشحالی و بہبودی کو حاصل کر لیا جس کی وہ تلاش میں تھے تو اُنھوں نے عام لوگوں کو بھلا دیا اور اسے وہ قطعی فراموش کر گئے، کہ لاکھوں آدمی جو اُن سے تعلیم اور حوصلوں میں پست ہیں وہ اپنے حقوق کے استعمال کی آزادی تلاش کر رہے ہیں اور وہ دوسرے قسم کی بہبودی اور فارغ البالی ڈھونڈھ رہے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے دماغوں کو سکون دے لیا اور اپنے سوا کسی دوسرے کی فکر سے اپنے کو پریشان کرنا ترک کر دیا۔

ان لوگوں کو غدار وطن کیوں کہتے ہو؟ مناسب یہ ہے کہ ان کے نظریوں کو دغاباز اور غدار کہو۔

اُس زمانہ میں فرانس ایک ایسے شخص کا سکونت گاہ تھا جسے تمہیں کبھی نہیں بھولنا چاہیئے۔ اُس کی دماغی قوت فرانس کے تمام دماغوں کی مجموعی طاقت سے زیادہ تھی۔ وہ اُس وقت میں ہمارا مخالف تھا لیکن "انسانی فرلفیہ" کا ماننے والا۔ اُس کا یہ اعتقاد تھا کہ عام اچھائی کے لئے صداقت کی کامیابی حاصل کرنے کے لئے تمام چیزیں قربان کی جاسکتی ہیں۔ اُس نے انسانوں کا اور وقت کے تمام حالات کا نہایت عمیق مطالعہ کیا تھا۔ وہ نہ تو کبھی اپنی مدح وستائش کی وجہ سے غلط جادہ پر گام فرسا ہوتا تھا اور نہ کبھی ناکامیوں کی وجہ سے شکستہ دل۔ اگر وہ کسی راستہ پر چلتا اور اس میں کامیاب نہ ہوتا تو عام انسانوں کی حالت سدھارنے کے لئے دوسرا راستہ اختیار کر لیتا۔

واقعات کی رفتار نے جب اُس پر یہ واضح کر دیا کہ صرف ایک قوت یعنی احساس فرائض اُس کے حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، اور جب عام لوگوں نے اپنے کو عمل کے میدان میں اُن افراد کے مقابلہ میں جو اُن کی حمایت کا دم بھر رہے تھے زیادہ کارآمد اور زیادہ پختہ کار ثابت کر دیا تو وہ یعنی "لیمینیاس" جو "ایک معتقد کے کلمات" کا مصنف ہے اور جسے تم سب نے پڑھا ہوگا اس مقصد کا زبردست علمبردار بن گیا،

جس میں ہم سب شریک ہیں۔ لیمنیاس میں اور اُن لوگوں میں جن کا میں ابھی ذکر کر رہا تھا تم اُس فرق کو معلوم کرسکتے ہو جو "نظریۂ حقوق" اور "نظریۂ فرائض" کے قائلین میں ہے۔ نظریۂ حقوق کے معتقدین جب اپنے انفرادی حق حاصل کرلیتے ہیں تو اُن کا جوش جاتا رہتا ہے۔ اور اس طرح اُن کی آئندہ کی کوششیں بالکل رُک جاتی ہیں لیکن "نظریۂ فرائض" کے قائلین کی جد و جہد دنیا پر صرف زندگی کے خاتمہ کے ساتھ ختم ہوتی ہے۔

اُن قوموں میں جو مکمل طور سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہیں، اور جن میں اس قسم کے جھگڑوں کے خطرات کی نوعیت جداگانہ ہوتی ہے، جہاں کہ حالات کے بہتر بنانے کے متعلق جو قدم بھی اُٹھایا جاتا ہے وہ کسی نہ کسی شہید کے خون سے آلودہ ہوتا ہے۔ جہاں کہ اُن بے انصافیوں کے خلاف عملی کارروائیاں جو بڑی جگہوں سے تعلق رکھتی ہیں، لازمی طور سے خفیہ ہوتی ہیں۔ اور جن کو نہ تو شہرت ہی نصیب ہوتی ہے اور نہ مدح و ثنا ہی۔ ایسی قوموں میں کون سی وہ مجبوریاں یا عمل کے یکساں جاری رکھنے پر اُبھارنے والی قوت ہے جو اُن لوگوں کو ترقی کے راستہ پر قائم رکھے، جن کا مذاق یہ ہے کہ اس مقدس معاشرتی جنگ کو محض حقوق کی جنگ میں مسخ کردیں؟

اسے خوب سمجھ لینا چاہئیے کہ میں عام اشخاص کے متعلق ان خیالات کا اظہار کر رہا ہوں۔ اُن مستثنیات سے مجھے کوئی بحث نہیں ہے جو ہر جماعت میں موجود ہیں۔

نظریۂ فرائض کا اعتقاد ہی انسان کو سچی قربانی و ایثار پر آمادہ کرسکتا ہے

ظلم کے خلاف ردِ عمل کا گرم خون اور وہ جوش جو فطری طور سے نوجوانوں کو اس کشمکش میں کھینچ لیتا ہے، جب ٹھنڈا پڑ جاتا ہے تو وہ کونسی چیز ہے جو ان لوگوں کو چند برسوں کی ناکام کوششوں کے بعد جو ایسی مہم میں ناگزیر ہیں تھکنے سے روک سکے؟ آخر وہ کسی قسم کی راحت و آرام کو کیوں نہ ایسی بے اطمینانی کی زندگی پر ترجیح دیں جو مسلسل کشمکشوں اور خطروں کی وجہ سے اضطراب کی حالت میں رہتی ہے اور جس کے لئے ہر وقت اس کا خوف لاحق رہتا ہے کہ کہیں جیل میں یا پھانسی کے تختہ پر یا جلا وطنی میں ختم ہو،

اٹلی کے موجودہ باشندے جو فرانس کے پُرانے خیالات سے متاثر ہو رہے ہیں اُن کی یہ عام حالت ہے، اس میں شک نہیں کہ یہ بہت دردناک ہے۔ لیکن اُسے اُس وقت تک کیونکر بدلا جاسکتا ہے جب تک کہ اُس اصول کو نہ بدل دیا جائے۔ جسے راہنما بنا کر وہ اپنی زندگی شروع کرتے ہیں؟ کس طرح اور کس بنا پر اُن کو اس کا یقین دلایا جائے کہ خطروں اور ناکامیوں سے اُنھیں اور زیادہ مضبوط بننا چاہئیے؟ اُنھیں چند برسوں ہی کے لئے جنگ نہیں کرنا ہے بلکہ اپنی تمام زندگی بھر اُنھیں اس میں مشغول رہنا ہے؟ ایسی صورت میں کہ کشمکش میں مبتلا رہنا اُس سے علیحدہ ہو جانے کی بہ نسبت بہت زیادہ تکلیف دہ اور مصیبت خیز ہے کون شخص کسی دوسرے سے یہ کہہ سکتا ہے کہ اپنے حقوق کے لئے برابر جنگ کرتے رہو!

ایسی سوسائٹی میں بھی جس کی بنیاد ہماری سوسائٹی سے زیادہ عدل و انصاف پر ہو کون شخص "نظریۂ حقوق" کے معتقد کو اس کا یقین دلاسکتا ہے کہ اُسے عام بہبود کے لئے کام کرتا اور عام معاشرتی خیالات کے نشو و نما دینے میں منہمک رہنا چاہئیے؟ فرض کرو وہ بغاوت پر آمادہ ہو۔ فرض کرو وہ اپنے کو طاقتور محسوس کرے اور تم سے یہ کہے "میں اس معاشرتی اتحاد کو توڑنا چاہتا ہوں۔ میرے رجحانات، میری صلاحتیں مجھے دوسری طرف لے جا رہی ہیں، مجھے اس کا مقدس حق حاصل ہے کہ میں انھیں نشو و نما دوں اور اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ ہر شخص سے جنگ کروں"۔

اب تم اسے کیا جواب دے سکتے ہو؟ وہ بہر طور "نظریۂ حقوق" کا پابند ہے۔ تم اکثریت میں ہونے کی وجہ سے اس کا کیا حق رکھتے ہو کہ اُسے اُن قوانین کی اطاعت پر مجبور کرو جو اُس کی خواہشوں اور اُس کے انفرادی حوصلوں کے مطابق نہیں ہیں؟ اگر وہ ان قوانین کو توڑتا ہے تو اُسے سزا دینے کا تم کیا حق رکھتے ہو؟ حقوق کا تعلق ہر فرد سے یکساں ہے۔ ایک ساتھ ایک جماعت میں رہنے سے کسی "انفرادی وحدت" کی خلقت نہیں ہو جاتی۔ سوسائٹی میں زیادہ طاقت ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فرد کی بہ نسبت اُسے حقوق بھی زیادہ حاصل ہیں۔ ایسی صورت میں تم کیونکر کسی فرد پر یہ ثابت کرسکتے ہو کہ اُسے اپنی رضا کو ملکی و انسانی بھائیوں کی رضا میں مدغم کردینا چاہئیے۔

جلاد کے ذریعے سے؛ قید و بند کے ذریعے سے؛ سوسائٹیوں نے جن کا وجود اب تک ہے ان ذریعوں کو ضرور استعمال کیا ہے لیکن بہرحال یہ جنگ ہے۔ ہم آشتی چاہتے ہیں۔ یہ تشدد ہے اور ہم تعلیم و تربیت چاہتے ہیں۔

ہم نے تعلیم کا لفظ استعمال کیا ہے اور واقعاً یہ اتنا بڑا لفظ ہے، جو ہمارے پورے نظریئے پر مشتمل ہے۔ وہ اہم سوال جو ہمارے ملک میں اضطراب پیدا کئے ہوئے ہے۔

تعلیم ہی کا سوال ہے، ہمیں جو کچھ کرنا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ ہم ان چیزوں کو نئی ترتیب میں تشدد کے ذریعے سے لائیں۔ اس طریقے سے کوئی نئی ترتیب قائم کرنا ہمیشہ ظالمانہ ہوگا، خواہ وہ پہلے کی بہ نسبت بہتر ہی کیوں نہ ہو۔ ہمیں یہ کرنا چاہیئے کہ ہم اول پوری قوت سے اُس بہیمیت کو ختم کردیں، جو اس زمانہ میں ہر ترقی کی مخالف ہے اور پھر اُس قوم کی منظوری کے لئے جو اپنی رائے کے اظہار میں آزاد ہوگی، ان چیزوں کی اُس ترتیب کو پیش کریں گے جسے ہم بہتر سمجھتے ہیں، اور ہر ممکن ذریعے سے لوگوں کو تعلیم دینگے تاکہ اُسے نشو و نما ہو اور اس کے متعلق عمل درآمد ہوسکے۔ نظریۂ حقوق ہمیں اس قابل بناتا ہے کہ ہم اُبھریں اور اپنے راستے سے موانع دور کریں، لیکن اس سے قوم کے مختلف عناصر کے درمیان میں اتحاد و ہم آہنگی کی مستحکم بنیاد نہیں قائم ہوسکتی۔

نظریہ خوشحالی و بہبودی کو زندگی کا اعلیٰ مقصد قرار دے کر ہم خود پسند اشخاص اور "مادیت" کے پرستاروں کی تخلیق کرسکتے ہیں، جو پرانے جذبات کو اشیاء کی نئی ترتیب میں پورا کریں اور چند ماہ میں اُسے بھی برباد کردیں، اسی لئے ہمیں اس کی ضرورت ہے کہ ہم ایسے نظریہ کے مقابلہ میں کسی اعلیٰ نظریۂ تعلیم کی بنیاد ڈالیں جو انسانوں کی بہتر چیزوں کی طرف رہنمائی کرسکے جو اُنھیں قربانی میں تسلسل قائم رکھنے کی تعلیم دے سکے اور اور جو اُن میں جماعت میں اس طرح جذب ہوجانے کی صلاحیت پیدا کرسکے کہ کسی مخصوص فرد کے خیالات یا پوری جماعت کی قوت پر اُن کی زندگی کا انحصار نہ ہوجائے۔

اور یہ اصول "فرض" ہے، ہمیں اُنھیں اس کا یقین دلا دینا چاہیئے کہ وہ چونکہ ایک خدا کے بیٹے ہیں اُنھیں دنیا میں صرف ایک قانون کی اطاعت کرنا چاہیئے، اور اُن میں سے ہر ایک کو اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے زندہ رہنا چاہیئے۔ اُن کی زندگی کا مقصد یہ نہیں ہے کہ زیادہ یا کم خوشحال رہنے کی کوشش کریں، بلکہ اپنی اور دوسروں کی حالت بہتر بنائیں، اُنھیں معلوم ہوجائے کہ اپنے بھائیوں کے فائدہ کے لئے بے انصافی اور غلطی کے خلاف جنگ کرنا صرف حق ہی نہیں بلکہ ایک فریضہ ہے، اور ایسا فریضہ جس سے اغماض گناہ ہے اور جس سے زندگی بھر روگردانی ناجائز ہے۔

(باقی آئندہ)

(قطعات)

گناہ

جی کو ناحق بُرا بھلا کرتے ہیں

روح کو پائمال کرتے ہیں

آدمی اور گناہ سے پرہیز

ہم بھی اخترؔ کمال کرتے ہیں

(اختر انصاری، بی اے)

جوانی

نیند آتی ہے اس طرح جیسے

پینے میں نشہ چڑھتا ہے

صبح اس طرح ہو کے اُٹھتے ہیں

جیسے سیلاب آکے اُٹھتا ہے

(اختر انصاری، بی اے)

مولوی

از مولوی شناس

خیر نگر کے ایک مشہور خاندان کی عالی شان عمارت کے کشادہ صحن کے وسط میں ایک طویل شالباقی پردہ پڑا تھا۔ ایک جانب مولوی عبدالقدوس صاحب کرسی پر متمکن تھے اور دوسری طرف دو دیہاتی بیگمات۔ مولوی صاحب ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر حد درجہ متانت سے فرما رہے تھے "جی ہاں معظمہ! لیکن حج کے متعلق بیشمار احادیث و روایات موجود ہیں، فروع دین میں داخل ہے۔ اور ہر مسلم و مسلمہ پر چند شرائط کے ساتھ فرض کیا گیا ہے، آپ دونوں بہنیں ماشاءاللہ صاحبِ جائداد ہیں، کافی سے زیادہ سرمایہ پس انداز کر چکی ہیں، علائق دنیا سے آزاد ہیں، نہ شوہر، نہ بیٹا، نہ بیٹی۔ پھر سن بھی وہ آیا کہ اب توشۂ آخرت مہیا کرنا ضروری ہے۔ میری رائے ناقص میں حکم خدا اور رسول سے صریحی انحراف ہوگا، اگر اب بھی آپ اس فریضے سے سبکدوشی حاصل کرنے میں اغماض کریں گی!"

پردے کے اس طرف جو دو بیبیاں بیٹھی تھیں وہ دونوں کانپ اٹھیں۔ دونوں حقیقی بہنیں، بڑی کا سن اس وقت پچاس کے قریب ہوگا، سر کے بال آدھے سے زیادہ سفید ہو گئے تھے۔ بڑی بڑی آنکھوں کے گوشوں پر باریک باریک نشانات پڑ چکے تھے، چہرے کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں، اور صراحی دار گردن میں بڑھاپے کا دبلاپا آ چکا تھا۔ ان کا نام عالیہ بیگم تھا، عمر کے بارہویں سال میں قدم رکھتے ہی بیاہ دی گئی تھیں۔ چند ہی سال میں کئی لڑکوں لڑکیوں کی ماں بنیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچا، شوہر بھی شادی کے دس برس بعد داغ مفارقت دے گئے، جب سے آج تک جائداد کا انتظام، شوہر اور بچوں کا دلیا، اعمال، اوراد، وظائف ان چیزوں میں وقت صرف کرتیں یا چھوٹی بہن کی دلجوئی و تالیف قلب میں۔

ان کا نام رابعہ تھا، بچپنے ہی میں چیچک نے صرف ان کی صورت ہی نہ بگاڑی تھی بلکہ دونوں آنکھوں کا نور بھی لے لیا تھا، جب سے اب تک یہ یونہی کنواری بیٹھی رہیں۔ باپ کے پاس دولت و شرافت سب چیزیں تھیں، لیکن وہ ان کے جوان ہوتے ہی مر گئے، اور دیگر اعزا ار خاندان نے، جو ان کے غیر شادی شدہ ہونے اور لاولد مرنے سے منتفع ہونے والے تھے، اس طرح کے جوڑ توڑ لگائے کہ آج تک رابعہ کے لئے جب کہ ان کا سن چالیس کے قریب پہنچ چکا تھا، کوئی بر نہ مل سکا تھا، ان کی دنیا بھی بڑی بہن کی اطاعت، مولویوں کی پرستش، عبادت و ریاضت میں محدود ہو کر رہ گئی تھی، باوجود چیچک کے حد درجہ مکروہ داغوں کے ان کے چہرے پر وہ تازگی اب تک باقی تھی، جس میں شباب کی چنگاریاں دبی پڑی تھیں، اور ان کے جسم میں وہ گداز پن بھی باقی تھا جو کنوارپنے کی خصوصیت ہے۔

دونوں بہنیں قریب قریب ایک ہی طرح کا کپڑا پہنے تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ عالیہ کا دوپٹہ اور کرتا سپید تھا۔ اور رابعہ کا گلابی، ایک بیوہ تھی دوسری اب تک بن بیاہی۔ اس لئے وہ تمام انتظامات میں بھی آگے آگے رہتی اور اعزا و مولویوں سے گفتگو میں بھی وہی سبقت کرتی تھی۔

رابعہ بڑی بہن کے خیال سے زیادہ تر خاموش رہتی۔ نیز اسے گھر یا جائداد کے انتظامی معاملات سے زیادہ دلچسپی بھی نہ تھی۔ وہ باوجود چہل سالہ ہونے کے اب تک اسی طرح کی زندگی بسر کرتی تھی جیسے وہ اب تک چہار دہ سالہ ہے۔

مولوی عبد القدوس جو اس وقت ان بیویوں سے پردے کے اس طرف بیٹھے گفتگو کر رہے کوئی ایسے غیر نہ تھے۔ قصبے کے رہنے والے عالیہ کے ساتھ کے کھیلے، اور اپنی قابلیت، نیکی، اتقا اور سادہ دلی کے لئے دور دور مشہور تھے۔ جو شخص ان کا گول آفتابی چہرہ، چوڑی پیشانی، ستواں ناک، سفید رنگ، مہندی سے رنگی ڈاڑھی ایک بار دیکھ لیتا وہ اس امر کا یقین کر لیتا کہ مولوی صاحب سا باخدا آدمی دنیا کے پردے میں کم دکھائی دیگا۔ یہ دونوں بہنیں بھی یہی سمجھتی تھیں، اور اسی لئے جب کبھی مولوی صاحب اپنی نوکری سے قصبہ میں دو چار دن کے لئے بھی تشریف لاتے تو مولوی صاحب کی دعوت ضرور کی جاتی اور اُن کے موعظے سے یہ بیویاں بھی مثاب ضرور ہوتی تھیں۔

آج غیر معمولی بات یہ ضرور ہوئی تھی کہ مولوی صاحب حسب معمول بلائے نہیں گئے تھے، بلکہ بن بلائے ہی تشریف لائے تھے۔ اور آتے ہی انھوں نے یہ خوشخبری سنائی تھی کہ وہ حج کو تشریف لے جا رہے ہیں۔ پھر اسی سلسلے میں مولانا نے یہ بھی اصرار شروع فرمایا کہ یہ بیویاں بھی حج کے لئے تشریف لے چلیں۔

عالیہ بیگم نے کہا "قبلہ وکعبہ حج کے واجب ہونے میں شک نہیں لیکن جناب تو اس امر سے بھی واقف ہیں کہ ہم دونوں بہنوں کے لئے اتنا بڑا سفر کس قدر مشکل ہے۔ ہم پردہ دار، اعزا میں سوائے مبارز میاں کے کوئی نہیں، انھیں اپنی بیوی بچوں اور اپنے دوسرے کاموں سے فرصت نہیں، ہم کیونکر جا سکتے ہیں؟ بھلا ہماری قسمت میں یہ سعادت کہاں؟"

مولوی صاحب نے فرمایا "جی ہاں، ماشاء اللہ ان کے مشاغل تو کثیر ہیں۔ انھیں اس کی فکر کیوں ہونے لگی کہ آپ حضرات کی آخرت کیونکر درست ہوگی"

عالیہ بیگم نے کہا "نہیں قبلہ وہ لڑکا سعید تو ضرور ہے، اور اس نے کبھی ہماری خدمت واطاعت سے گریز نہیں کیا"

مولوی صاحب کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ذرا سی چمک پیدا ہوئی، مگر فوراً وہ جھکالی گئیں۔ وہ اپنے متین و دھیمے لب ولہجہ میں ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے، "جی ہاں صحیح ارشاد فرمایا آپ نے، اُن کی سعادت میں کیا اشکال ہے، لیکن حج آپ دونوں بہنوں پر واجب ہے نہ کہ اُن پر، آخرت میں باز پرس بھی آپ ہی سے ہوگی۔ خدا اس دن کے حساب سے ہم سب کو بچائے، جب سوا نیزے پر آفتاب ہوگا، اس دن نہ کوئی عزیز ہوگا نہ دوست، نہ باپ نہ بیٹا، نہ بھائی نہ بھتیجا، عجیب بے لبسی وبیکسی ہوگی، ہم گناہگاروں کی تو پوچھئے ہی نہیں، جو کچھ بھی گت بنے۔ بڑے بڑے انبیا ومرسلین کے چہروں پر ہوائیاں اُڑتی ہوں گی اور بند بند کانپتے ہوں گے، اس وقت سوائے اپنے اعمال کے کوئی کام نہ آئے گا"

مولوی صاحب نے اپنی رقت آور آواز میں یہ سماں کچھ اس انداز سے کھینچا کہ دونوں بیویوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور خوف سے لرزنے لگیں۔

مولوی صاحب نے اپنی تقریر کے اثر کو پردے کی دوسری جانب سے محسوس کیا۔ اور خاتمۂ کلام کے طور پر بولے "میں اسی لئے تو عرض کرتا ہوں کہ ہمیں چاہیئے کہ ہم سے اگر اور امورِ خیر نہ ہو سکیں تو کم از کم ہم واجبات تو ادا کرتے رہیں۔ ان میں تو تساہل نہ ہونا چاہیئے۔ حج آپ دونوں بیویوں پر واجب ہے، اس میں شرعی حیثیت سے نہ تو پردہ حائل ہے اور نہ کوئی اور امر!"

عالیہ نے خوفزدہ ہو کر کہا "تو کیا قبلہ وکعبہ میں حج کرنے کے لئے پردہ اٹھا دوں؟"

مولوی صاحب نے قدرے مسکرا کر کہا "جی میں نے یہ تو عرض نہیں کیا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ایسی صورتیں ہو سکتی ہیں کہ وہ دقتیں جو جناب معظمہ نے ابھی بتائی ہیں وہ سب رفع ہو جائیں"

عالیہ نے ذرا گھبرا کر پوچھا "تو قبلہ وکعبہ فرما دیں میں انھیں سر آنکھوں سے بجا لاؤں گی"

مولوی صاحب نے نظریں اُٹھا کر پردے کو دیکھا، گویا چاہتے تھے کہ جو بات کہنا چاہتے ہیں، اس کے قبل مخاطب کے قیافہ سے اچھی طرح اندازہ کرلیں کہ اسے کس پہلو سے پیش کریں کہ سنتے ہی دل میں لفظ لفظ اتر جائے۔

مولوی صاحب نے آہستہ سے کھانس کے گلا صاف کیا اور پھر بولے

"میرا اشارہ اس امر کی جانب ہے کہ رابعہ بیوی کا اب تک عقد نہیں ہوا ہے۔ یہ امر مستحب بھی ادا ہو سکتا ہے اور حج کا فریضہ بھی"

پردے کے اس طرف رابعہ بیگم نے ذرا جھرجھری لی اور گردن جھکالی۔

عالیہ بیگم بولیں "تو مولوی صاحب بیچاری رابعہ کے لئے کہاں بر موجود ہے کہ جھٹ منگنی پٹ بیاہ ہو جائے۔ اور ان کا میاں حج کے لئے انھیں لے کے چلا جائے؟"

مولوی صاحب کی آنکھوں کی چمک اور زیادہ بڑھی اور اُن کی انگلیاں ڈاڑھی کے بالوں پر اس تیزی سے چلنے لگیں جس تیزی سے استاد عنایت خاں کی انگلیاں ستار کے تار پر! وہ مہین آواز سے بولے "تو اگر آپ اسے معیوب نہ سمجھیں تو میں بادب عرض کردوں کہ یہ عبدِ ذلیل ہی حاضر ہے، میں جانتا ہوں کہ لوگ مجھ پر طرح طرح کے نام دھریں گے، اور جو لوگ احکامِ خدا، رسول سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں وہ اُسے میری شان کے منافی بھی سمجھیں گے، لیکن مجھے آپ حضرات کے فائدے کے سامنے اپنی کوئی پروا نہیں۔ آپ کی آخرت درست ہو، ہم مردوں کا کیا، ہمارے لئے تو بدنامیاں اور رسوائیاں ازل ہی سے مقدر ہیں۔"

عالیہ بیگم پہلے تو یہ تقریر سُن کر سناٹے میں آگئیں۔ استعجاب، غصہ اور خوف نے ان کی زبان بند کردی تھی۔ اندھی بہن جو کہ پہلو سے لگی بیٹھی تھی ان کی حرکات سے ان کے جذبات سمجھ گئی، اور بہن کا زانو دبا کر اُس نے نفی کے لئے سر ہلا دیا۔ عالیہ بیگم نے بہن کے چہرے کی طرف محبت سے دیکھا، پھر بھرائی ہوئی آواز سے بولیں۔

"مولانا یہ امر تجویز کرتے وقت شاید آپ یہ بھول گئے، کہ آپ ماشاء اللہ بیوی بچے والے ہیں، اور آپ کی بیگم صاحبہ بھی کوئی غیر نہیں، ہماری ہی برادری کی بیٹی ہیں۔ آخر ہم اُنھیں کیا منھ دکھائیں گے؟"

مولوی صاحب نے پھر وہی احتیاط والی مہین آواز میں جواب دیا، "میں نے تمام عواقب پر نظر کرلی ہے، البتہ ایک دشواری ضرور باقی رہی جاتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ باوجود اس عقد کے، اگر آپ اور رابعہ بیگم اسے منظور بھی کرلیں، میں آپ کا حسبِ شرع پھر بھی نامحرم باقی رہتا ہوں، اور حج کے لئے آپ کی ہمراہی میں پھر انھیں دقتوں کا سامنا ہوگا۔"

عالیہ بیگم نے اس طرح کی سانس لی، جیسے اُنھیں کوئی کھوئی ہوئی چیز مل گئی۔ وہ جلدی سے بولیں "جی ہاں یہ آپ نے صحیح فرمایا۔ سارے خاندان میں نکّو بھی بنے اور جس غرض سے یہ سارے پاپڑ بیلے تھے وہ پوری نہ ہوئی۔

مولوی صاحب پھر تھوڑی دیر داڑھی کے بالوں پر ستار بجاتے رہے۔ پھر آہستہ سے بولے "تو اس کی ایک صورت ہوسکتی ہے۔ وہ یہ کہ میرے دو نابالغ لڑکے موجود ہیں۔ اس فرض کے ادا کرنے کی غرض سے آپ دونوں صاحبان میری بہویں بن جائیں۔ میں دونوں کا محرم ہو جاؤں گا۔ اور اس طرح میرے ساتھ سفر میں کوئی قباحت اور کوئی شرعی خرابی نہ رہ جائے گی۔"

عالیہ بیگم نے کہا "مگر مولانا.........."

مولوی صاحب نے جلدی جلدی داڑھی پر ہاتھ پھیرنا شروع کیا اور بات کاٹ کر بولے "جی ہاں آپ پہلے میری بات تو پوری سُن لیں۔ واللہ، باللہ، اس امر میں سوائے آپ کے فائدے کے اور کوئی خیال نہیں۔ وہ دونوں بچے اتنے چھوٹے ہیں کہ جو بھی سُنے گا وہ یہی سمجھے گا کہ آپ سی عصمت مآب خواتین کی سوائے اس فریضہ کے ادا کرنے اور اس لئے سہولتیں بہم پہنچانے کے اور کوئی غرض نہیں ہوسکتی۔ زندگی انسان کی بہت ہی بے اعتبار ہے، اوسط عمر انسانی بہت قلیل ہے۔ آپ ماشاء اللہ میری ہمسن ہیں اور رابعہ بیگم آپ سے دو چار برس چھوٹی ہوں گی۔"

عالیہ بیگم بولیں "جی نہیں، وہ مجھ سے دس برس چھوٹی ہے۔"

مولوی صاحب نے فرمایا "جی تو بھی کافی عمر آچکی ہے۔ بچوں میں سے ایک کا سن دس برس کا ہے اور ایک آٹھ برس کا ہے، جب تک وہ جوان ہوں گے خدا جانے کیا سے کیا ہو جائے گا۔ آپ پر قبل بلوغ و رشد ان کے کوئی حقوق نہیں، اور نہ میری حیات تک ان کی مجال ہے کہ وہ میرے خلافِ حکم کرسکیں۔ پھر خطرہ کا ہے کا ہے، دین، مہر، نان و نفقہ مرد پر واجب ہے نہ کہ عورت پر!"

عالیہ بیگم نے کہا "قبلہ و کعبہ آپ ہم لوگوں کے مجتہد ہیں، ہم ہمیشہ آپ ہی کی تقلید میں رہے، اس لئے آپ کا فرمانا ہمارے لئے حکمِ خدا و رسول ہے، لیکن یہ بات کسی طرح حلق سے نہیں اُترتی۔ میں بوڑھی، چونکہ

پکا کے اب اپنا عقد کرنے چلوں اور پھر وہ بھی ایک چھوکرے سے۔ ہاں
رابعہ کے ابھی دن سن ہیں۔ ان کے لئے کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔ پھر
وہ بھی جب میں ان کے سر پر موجود ہوں۔۔۔۔۔۔"

رابعہ خاتون نے پھر بہن کا زانو دبایا۔ بہن نے جھک کر ان
کی طرف دیکھا، انھوں نے ان کے کان میں چپ کے سے جھینپتے جھینپتے کہا
"باجی میں بغیر آپ کے شادی نہیں کروں گی"

عالیہ نے فوراً جھنجلا کے کہا "لڑکی سٹرن تو نہیں ہو گئی"

مگر جب رابعہ نے بہت سختی سے سر ہلا کے اپنی بات پر اصرار کیا تو
کچھ نرم پڑیں۔

اِدھر مولوی صاحب کے ستار سے پھر آواز شروع ہوئی "میں
کہتا ہوں کہ جناب بیگم صاحبہ اس میں خرابی ہی کیا ہے۔ دنیا میں آپ کے
محارم میں سوائے مبارز میاں کے اور کوئی موجود نہیں۔ انھیں اپنے ہی
جھگڑوں سے فرصت نہیں کہ وہ ان امور کی طرف توجہ کر سکیں اور سچ
پوچھئے تو اُن کی ساری ہمدردی بس اسی میں ہے کہ آپ دونوں بہنیں
خزانے جمع کر کے ان کے لئے چھوڑ جائیں۔ خواہ اس صورت میں آپ کے
خود فرائض ادا ہوں یا نہ ہوں، آپ احکام خداوندی پورے طور پر
بجا لا سکیں یا نہ لا سکیں!" پردے کی دوسری جانب ذرا حرکت پیدا ہوئی
تو مولوی صاحب نے بایاں ہاتھ اُٹھا کر روکا اور بولے "میں ان تمام
دشواریوں کو سمجھتا ہوں جو آپ کے پیش نظر ہیں۔ لیکن عوام کے خوش
اور ناخوش ہونے سے کسی فریضہ کے بجا لانے پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا،
پھر یہ بھی خیال رہے کہ میں نے جو صورت آپ کی خدمت میں پیش کی ہے،
اس میں کوئی پہلو مطعون کرنے کا نہیں ہے،

آپ حضرات پر حج واجب ہے۔ آپ بغیر کسی مرد کی مدد کے اسے
ادا نہیں کر سکتیں۔ آپ اس لئے دو بچوں سے عقد کر لیتی ہیں اور یوں اُن
کے باپ کی محرم بن کر اس فریضہ کو ادا کر لیتی ہیں۔ خداوند عالم کی خوشنودی
دیکھنا چاہیئے۔ انسانوں کی خوشی کیا چیز ہے۔ آپ کے فعل سے خدا خوش،
رسول خوش، اہلِ ایمان خوش۔ اب اگر دو چار جہلا ناخوش ہوں گے
تو ہوں۔ ان کی ناخوشی سے آپ کے ثواب میں اور اضافہ ہوگا، اور
جنت النعیم میں قصر ہائے زریں ملیں گے!"

عالیہ بیگم پر مولوی صاحب کی اس مسحور کن تقریر کا یہ اثر ہوا کہ
وہ ہندی آباؤ اجداد کے طریقے بھول گئیں، اُنھوں نے پھر بھی اپنا پہلو
بچایا اور بولیں "مولانا۔ میں آپ کا حکم بجا لانے کے لئے تیار ہوں مگر
ایک شرط سے بڑے کا عقد رابعہ سے ہو اور چھوٹے کا میرے ساتھ!"

مولوی صاحب کا چہرہ گلنار ہو گیا، اور وہ بہت ہی مسرت
سے بولے "خدا آپ کی نیت میں برکت عطا فرمائے، اور آپ کو اعلیٰ
علیین میں جگہ مرحمت فرمائے! آپ ہی کی باعفت و با ایثار بیویوں سے
اسلام زندہ ہے! چھوٹے بڑے کی شرط ہی بیکار ہے۔ اس لئے کہ یہ عقد
دنیا داری کے لئے نہیں کیا جاتا ہے بلکہ اس کی غرض تو محض حمایتِ دین
ہے۔ بہر نوع آپ کی خاطر مجھے یہ منظور ہے۔ چھوٹے کا عقد آپ کے ساتھ
اور بڑے کا رابعہ بیگم صاحبہ کے ساتھ ہوگا۔ اب آپ مجھے اجازت دیں،
میں دونوں کا ولی ہوں، میں آپ کا وکیل بن لوں تو خطبہ پڑھ دوں"۔

عالیہ بیگم نے گھبرا کر کہا "تو کیا اسی وقت؟"

مولوی صاحب نے ذرا تیکھے تیوروں سے کہا "معظمہ خدا اور
رسول کے کاموں کی انجام دہی کے بارے میں اسلام نے یہ فرمایا ہے کہ
لبیک کہتے ہوئے دوڑنا چاہیئے، آپ پھر پس و پیش فرماتی ہیں۔ اس سے
ثواب میں کمی ہوتی ہے، آپ مجھے اجازت دیں"

عالیہ بیگم نے بڑی بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ماما، دائیاں
آج پہلے ہی سے ہٹا دی گئی تھیں۔ ڈوبتے ہوئے کو تنکے کا سہارا بھی نہ ملا!

مولوی صاحب نے پھر فرمایا کہ "جناب بیگم صاحبہ میں آپ کا
عقد اپنے لڑکے حمید اللہ سے مہر فاطمی پر پڑھ دوں؟ اجازت ہے؟

وہ بڑھیا ہونٹ چاٹ کر بولی "بہت خوب، جیسی آپ کی مرضی!

مولوی صاحب ذرا مسکرائے پھر بولے "اور آپ جناب رابعہ بیگم
صاحبہ، آپ اجازت دیتی ہیں کہ آپ کا عقد میں اپنے بیٹے عبید اللہ سے
مہر فاطمی پر پڑھ دوں۔ منظور ہے"؟

اُنھوں نے بہن کے ٹھوکا دینے پر لجائی ہوئی آواز میں "ہوں"
کہا اور بہن کے زانو پر سر رکھ کر رونے لگیں۔

مولوی صاحب نے صیغہ جاری کر دیا!

مبارز شہر سے جب واپس آیا تو اسے باہر مردانہ حصہ مکان میں خبر ملی کہ مولوی صاحب تشریف لائے ہیں، اور بڑی دیر سے زنانخانے کے اس حصہ میں تشریف فرما ہیں جدھر اس کی پھوپھیاں رہتی ہیں۔ وہ مولوی صاحب کے اشتیاق زیارت میں ورّانہ اندر چلا آیا۔ دیکھا تو پھوپھیاں کچھ جھینپی کچھ سہمی بیٹھی ہیں، ہر ایک کے سامنے پانچ پانچ روپے رکھے ہیں، مولوی صاحب داڑھی پر ہاتھ پھیرتے جاتے ہیں اور فرماتے جاتے ہیں "تم دونوں میری بیٹیاں ہو، میری لخت جگر ہو۔ تم اطمینان رکھو، انشاء اللہ میری زندگی تک تمہیں کوئی زحمت نہیں ہو سکتی۔ خداوند کریم تم سی بیویوں کی خود بھی حفاظت فرماتا ہے۔"

مبارز کی یہ حالت کہ یہ سماں دیکھکر اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ غیرت قومی سے زمین میں گڑجائے یا آسمان پر اُڑجائے۔ جس کے خاندان میں تمام غیر محارم سے، خواہ وہ کیسے ہی عزیز قریب کیوں نہ ہوں پردہ کیا جاتا ہو، اس کے گھر کی سربرآوردہ خواتین یوں ایک غیر مرد کے سامنے بے پردہ بیٹھی ہوئی ہوں! وہ عجیب غم و غصہ کی حالت میں چیخ کر بولا "پھوپھی امّاں! یہ آخر کیا معاملہ ہے؟ یہ میں خواب دیکھ رہا ہوں یا آپ لوگوں نے سچ مچ مولانا سے پردہ اٹھا دیا؟"

پھوپھیاں بھتیجے کے اس سوال پر اور سہم گئیں۔ مگر مولوی صاحب نے اپنی مہین آواز میں کہا "مبارز میاں اب آپ کی پھوپھیاں میری محارم میں سے ہیں، وہ میری بیویں ہیں، اب وہ مجھ سے کیوں پردہ کرنے لگیں؟"

مبارز اور بوکھلا گیا اور پلنگ پر اس طرح بھد سے گر پڑا جیسے کسی نے اس کی دونوں ٹانگیں کاٹ دی ہوں۔ وہ تھوڑی دیر سر پکڑے مولوی صاحب کی پہیلیاں بوجھنے کی کوشش کرتا رہا۔

قبلہ و کعبہ کی گفتگو کا سلسلہ جاری تھا، وہ حج کا فرض ہونا، پھوپھیوں کا دولت مند ہونا، حیلۂ شرعی کا ضروری ہونا، جنت کا قریب اور دوزخ کا دور ہونا یہ سب کچھ بتا رہے تھے، لیکن مبارز یہ دیکھ رہا تھا کہ جس جس طرح پھوپھیوں سے جنت قریب ہوتی جاتی تھی، اسی قدر اس سے ریاست و امارت دور! وہ ایک بار گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور اس نے اپنی بڑی پھوپھی سے ڈانٹ کے پوچھا۔

"آپ کا دفعتہً دماغ کیسے خراب ہو گیا تھا کہ آپ اس پاجی مولوی کے کہنے میں آگئیں؟"

قبل اس کے کہ وہ کچھ بولیں مولوی صاحب نے فرمایا "مبارز میاں دیکھیئے غصہ حرام ہے۔ میں آپ کا ہر طرح بزرگ ہوں، سن میں بھی، دینی حیثیت سے بھی، اور اب رشتے میں بھی! آپ اپنی پھوپھیوں کے روپوں کے لالچ میں دیوانے ہو رہے ہیں۔"

مبارز پلٹ پڑا، بولا "جی ہاں۔ میں ان کے روپیوں کا، ان کی دولت کا مستحق ہوں، آپ اتنی آسانی سے میرے گھر کی دولت۔ عزت نہیں لے جا سکتے۔" یہ کہتے کہتے وہ اندر کمرے میں گھس گیا۔ اور وہاں سے بندوق اُٹھا لایا۔ مولوی صاحب کا شلجمی رنگ پھیکا پڑ گیا۔ جوڑ جوڑ بولنے لگے۔ زبان میں کانٹے پڑنے لگے۔ مبارز دانت پیس کر بولا۔

"مولوی صاحب۔ بس اسی میں جان کی خیر ہے کہ چپ کے سے جس طرح آپ نے نکاح پڑھا ہے ویسے ہی طلاق بھی پڑھ دیجئے۔ اور یہاں سے ٹھنڈے ٹھنڈے سدھائیے۔ ورنہ میں آپ کو حج کی ساری زحمتوں سے بچا دوں گا۔ ایک منٹ میں آپ جنت کے ان قصروں میں سے ایک میں سے ہوں گے، جو آپ اپنے مطالب کے پورا ہونے کی غرض سے زندگی بھر بانٹتے رہے ہیں، پڑھیئے صیغۂ طلاق!"

مولوی صاحب نے دو تین مرتبہ زبان خشک ہونٹوں پر پھرائی، جلدی جلدی طلاق پڑھی، اور مبارز کے انگلی سے اشارہ کرنے پر کفش بر سوار السرعت تمام باہر تشریف لے گئے۔

دوسرے دن جب لوگ انھیں مع صاحبزادگان اسٹیشن پر حج کے سفر کے سلسلے میں رخصت کر رہے تھے تو اُنھوں نے ایک ملفوف خط مبارز صاحب کے نام ان کے ایک عزیز کو دیا۔

خط میں لکھا تھا۔

"مبارز صاحب!

"بندوق سے دھمکا کے طلاق پڑھوا لینے سے طلاق نہیں ہوتی، نابالغ کی طرف سے ولی نکاح کر سکتا ہے لیکن طلاق نہیں دے سکتا۔ آپ کی پھوپھیاں شرعی اور قانونی حیثیت سے اب بھی میری بیویں ہیں،

میں حجِ بیت اللہ سے واپس آلوں تو عدالتی چارہ جوئی کرکے ان کو رخصت کراؤں گا۔ اور آپ سے ایک ایک پیسہ کا حساب لوں گا۔

"عبدالقدوس"

مبارز خط پڑھ کے بڑی دیر تک غصے سے بوٹیاں کو... اس نے اپنے انھیں عزیز کی طرف خط بڑھا دیا کہ "دیکھئے!" انھوں خط پڑھا، مسکرائے، پھر بولے، "میاں تم نے ایک مولوی کی مخالفت کی ہے۔ بس اب کیا ہے۔ "خسر الدنیا والآخرۃ!"

تلاشِ حیات

خانقاہوں میں سوز و ساز کہاں　　اب مشائخ میں وہ گداز کہاں؟

دَیر سے گرمیاں ہوئیں رخصت　　اہلِ کعبہ کے دل سے دیں رخصت

گلستاں سے نکل گیا لالہ!　　بے اثر عندلیب کا نالہ

شاعروں کے دلوں میں سوز نہیں　　تیر اب اُن کے سینہ دوز نہیں

میکدوں میں سبو ہوئے خالی　　ہندیوں کے کدو ہوئے خالی

مطربوں کی صدائیں بے معنی　　مہ رخوں کی ادائیں بے معنی

اہلِ مکتب میں اب کہاں وہ مذاق　　جس سے ہر اک عشا ہوئی اشراق

واعظوں کی تمام تقریریں　　پیٹ بھرنے کی صرف تدبیریں!

اہلِ مشرق میں ذوقِ فکر نہیں　　اہلِ مغرب میں شوقِ ذکر نہیں

مل سکے اب کہاں سے سوز و گداز!

کس سے پوچھے کوئی حیات کا راز؟

نعیم صدیقی
(نعیم صدیقی)

باغی

مظہر انصاری، بی اے، آنرز

یہ رپورٹ تربیت گاہ (یتیم خانہ) کے ایک لڑکے رحیم کی ہے، جسے پیار سے "ریو" کہتے تھے، ایک ہفتہ ہوتا ہے وہ تربیت گاہ سے بھاگ گیا، لڑکا غیر معمولی ذہانت رکھتا ہے، پکڑے جانے پر اپنے فرار کی ذمہ داری کسی نہ کسی عجیب و غریب دلیل سے تربیت گاہ کے سر تھوپنے کی کوشش کرے گا، اس لئے مہتمم کی طرف سے نگراں کی خدمت میں اس کی گذشتہ عجیب و غریب حرکات کی سرگذشت پیش کی جاتی ہے۔ اس تذکرے میں ایک لڑکی کا نام آنا ناگزیر ہے، جس کا اصلی نام شمیمہ تھا اور جسے عرفِ عام میں "میمہ" کہتے تھے، ابتدا ہی سے جب یہ لڑکی یتیم خانہ میں لائی گئی، ریو کو اس سے غیر معمولی تعلق ہوگیا، اور اسی وقت سے اُس نے شرارتیں شروع کیں۔ ریکارڈ میں اس کی سب سے پہلی شرارت کا حال یوں درج ہے۔

"اس لڑکے کا سنبھالنا بہت دشوار ہو رہا ہے۔ تمام وقت "میمہ" نامی لڑکی کے ہمراہ رہنا چاہتا ہے۔ کل اُسے باز رکھنے کی کوشش کی گئی۔ آج صبح احتجاج کے طور پر اُس نے بھوک ہڑتال کردی۔ اصلاحاً سزا دی جائے تو فرضی طور پر بیہوش ہوجاتا ہے۔"

پھر دو تین ماہ بعد کے ریکارڈ میں درج ہے کہ

"ریو نے بہت پریشان کر رکھا ہے، کپڑے اور گوٹے کے گڈے گڑیوں سے نہیں کھیلتا۔ کہتا ہے، یہ منہ سے تو بولتی ہی نہیں۔ میں تو میمہ سے کھیلوں گا۔ وہ مجھ سے باتیں بھی کرتی ہے ------- پڑھائی کی جماعت سے بھاگ گیا، اور باہر نکل کر فاختاؤں کو پکڑنے لگا، وجہ پوچھی گئی تو بولا میں میمہ کے لئے فاختہ پکڑنے گیا تھا۔"

بطور سزا منتظمہ نے ریو کو دن بھر کمرے میں بند رکھا اور شام کو کھانا نہیں دیا۔ دوسرے دن صبح اس سے پوچھا گیا، کیا تم اپنے فعل پر نادم ہو؟ بولا۔ جی نہیں، آخر کار زبانی تنبیہہ کرکے چھوڑ دیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ باز نہیں آیا۔ چند دن بعد کا ریکارڈ یہ ہے کہ۔

"اُس نے ایک لڑکی کے ریشمی تاگے کے گولے چرا لئے، جب چوری پکڑی گئی اور اُس سے پوچھا، کیوں چرائے تھے؟ تو کہنے لگا، میں قوس قزح بنانی چاہتا تھا، سوال کیا گیا۔ قوس قزح بنانے کی تمہیں ایسی کیا ضرورت پڑی تھی۔ کہنے لگا۔ واہ! میں اور میمہ اس میں بیٹھیں گے نہ؟"

یہ سب سے پہلی منتظمہ کے دَور کا ریکارڈ تھا، سابق منتظمہ کو بھی ریو کے سلسلے میں دشواریاں پیش آئیں۔ اُس نے ریو کے ریکارڈ میں پہلی شکایت یہ لکھی ہے۔

"آج سب بچوں کو تحفے بانٹے گئے۔ مگر ریو نامی لڑکے نے تحفہ لینے سے انکار کر دیا، کہنے لگا، میں تو بانسری لونگا کسی کو بانسری بجاتے دیکھ آیا ہوگا۔ اُسی کے لئے ضد کرنے لگا۔ بار بار کہتا تھا، میمہ کے سامنے بانسری بجاؤں گا۔ یہ بچہ صرف چار سال کا ہے، مگر بہت ذہین ہے۔ میں نے

اُسے بالنسری منگا دی۔"

موجودہ منتظمہ کی رائے ہے کہ سابق منتظمہ کی اسی نرمی نے ریو کی عادتیں بگاڑ دیں ایک جگہ ریکارڈ میں لکھا ہے کہ

"ریو اور میمہ کی بڑی گہری دوستی ہے اصولاً میں اس کے خلاف نہیں ہوں۔ مگر یہ بڑی مشکل ہے کہ وہ ہر وقت میمہ کو اپنے ہی پاس رکھنا چاہتا ہے۔ جس سے انتظام میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے۔ کل دسترخوان پر کھانا کھاتے کھاتے اپنا سالن اٹھا کر میمہ کی طشتری میں الٹنے کے لئے اپنی جگہ سے اُٹھنے لگا۔ اور سارا سالن اپنے کپڑوں پر گرا لیا ایک دن رات کے وقت جب سب بچوں کو سلا دیا گیا تو ریو اپنی چارپائی سے اُٹھ کر میمہ کی چارپائی کی طرف جانے لگا۔ اس سے وجہ پوچھی گئی تو بولا میرا جی چاہتا ہے کہ میں میمہ کے پاس سوؤں۔ میمہ کے بال ریو کو بہت پسند ہیں۔ اس سے ایک بڑی عجیب و غریب مشکل پیدا ہوتی ہے۔ میمہ کی گندھی ہوئی مینڈھیاں کھول کر وہ اس کے بالوں سے کھیلنا چاہتا ہے۔"

سابق منتظمہ نے ان باتوں پر تنبیہ کرنے کے عوض ریو کو ڈھیل دی۔ اس سے لڑکے کی عادات اور بھی بگڑتی چلی گئیں۔ سابق منتظمہ نے ایک جگہ ریکارڈ میں لکھا ہے

"ریو کسی دن فنِ موسیقی کا ماہر بنے گا۔ تربیت گاہ کو چاہیئے کہ ایسے بچوں کی ہمت افزائی کرے۔ میں نے اسے ایک چھوٹا سا ہارمونیم منگا دیا تھا۔ مگر بہت جلد وہ ریو سے واپس لے لینا پڑا۔ کیونکہ وہ ایک رات ہارمونیم اپنے ساتھ ہی لیکر سو گیا۔ اور رات کو تین بجے اُٹھ کر ہارمونیم بجانے لگا۔"

موجودہ منتظمہ کی رائے ہے کہ سابق منتظمہ کو ریو کے لئے ہارمونیم کبھی مہیا نہیں کرنا چاہیئے تھا انھیں باتوں سے اس کی عادات بگڑیں۔ سابق منتظمہ آگے چل کر لکھتی ہے۔

"آج کی رپورٹ میں میں ریو کی ایک خوبی کا ذکر کرنا چاہتی ہوں۔ اس میں بہت سی خرابیاں ہیں۔ مگر اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ بعض وقت وہ حیرت انگیز باتیں کرتا ہے۔ پرسوں عید میلاد کے اجتماع میں اُس نے ایسی خوش الحانی سے نعت پڑھی کہ لوگ وجد میں آگئے۔ مگر اس کے ساتھ ہی مجھے اس کی ایک افسوسناک حرکت کا ذکر بھی کرنا پڑتا ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ ایک بچے سے معروفِ جنگ ہو گیا۔ میمہ نے۔ جو اس لڑائی میں ریو کی مددگار تھی۔ بتایا کہ لڑائی کی وجہ یہ تھی کہ اس بچے نے ریو کو یتیم کہہ دیا تھا!"

اس کے بعد سابق منتظمہ بدل گئی اور یتیم خانے کا انتظام موجودہ منتظمہ کے سپرد کیا گیا۔ موجودہ منتظمہ کے خیالات سابق منتظمہ سے بہت مختلف ہیں۔ وہ یتیم خانے میں نظام دیکھنے کی مشتاق تھی اور چاہتی تھی کہ درسگاہ کے ہر بچے کو محنت و مشقت کا عادی بنایا جائے۔ چنانچہ اس نے انتظام ہاتھ میں لیتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ ہر بچے کے ذمّے کوئی نہ کوئی کام لگا دیا۔ ریو کو یہ کام دیا گیا کہ وہ منتظمہ کے دفتر کے کواڑ صاف کیا کرے۔ دیکھا جائے تو یہ کام کچھ بھی نہیں تھا، مگر ریو نے اُس معمولی سے کام سے بھی جان بوجھ کر گریز کیا۔ ایک دن وہ علی الصباح، جب جھاڑ پونچھ کرنے کا وقت تھا کمرے کے ایک قیمتی صوفے پر منتظمہ کا منہ پونچھنے کا تولیہ اوڑھے پایا گیا۔

موجودہ منتظمہ جب تربیت گاہ میں آئی تو اُس نے دیکھا کہ ریو اور میمہ بہت زیادہ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں۔ یہ بات اُسے قابلِ گرفت محسوس ہوئی اور اُس نے یہ حکم جاری کر دیا کہ لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے سے میل جول نہ رکھیں، اُس وقت کے سوا جب دسترخوان پر ہوں۔ ریکارڈ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ریو نے اس حکم کی مسلسل خلاف ورزی کی۔ باربار اُسے میمہ سے گفتگو کرتے پایا گیا اور بیتوں کی سزا دی گئی اس سزا سے بچنے کی ریو نے یہ ترکیب سوچی کہ پڑھائی کے گھنٹوں میں جماعت سے بھاگ جاتا۔ اُس نے باغیچے میں ایک مقام مقرر کر لیا تھا۔ وہیں میمہ بھی پہنچ جاتی۔ جب ایک دفعہ دونوں کو وہاں پکڑا گیا تو ریو نے یہ عذر پیش کیا کہ ہم دونوں آپس میں باتیں نہیں کیا کرتے بلکہ آسمان کو دیکھا کرتے اور پرندوں کی آوازیں سنا کرتے ہیں۔

ریو، جتنا جتنا بڑا ہوتا گیا، اس لڑکے کی جھوٹ بولنے کی عادت ترقی پکڑتی گئی، ایک دفعہ ایک دائی نے سُنا، ریو دوسرے بچوں سے کہہ رہا تھا کہ جب درختوں میں ہوا سائیں سائیں کرتی ہے تو اُس کی آواز میں ایک یتیم بچے کی ماں کی چیخیں بھی ہوتی ہیں جو اپنے بچے کے لئے روتی ہے، ایک اور موقعے پر وہ بچوں سے یہ کہتے سنا گیا کہ یتیم بچے فرشتوں کے بیٹے ہوتے ہیں جو اُنھیں آسمانوں سے گرادیتے ہیں۔ اور پھر حوریں زمین پر آتی ہیں اور ان بچّوں کو لوگوں کے دروازوں پر ڈال جاتی ہیں۔ ایک مرتبہ منتظمہ نے خود اپنے کانوں سے سُنا ریو میمہ سے کہہ رہا تھا میری ماں سمندر کی ملکہ ہے، بہت جلد وہ مجھے لینے کے لئے ایک چاندی کی کشتی بھیجے گی۔ اور میں تمہیں بھی اس میں بٹھلاکر اپنے ساتھ لے چلوں گا۔

جب ذرا اور بڑا ہوا تو اُس نے تربیت گاہ کے معاملات میں بھی دخل اندازی شروع کر دی۔ ایک دفعہ ایک صاحب جو بے اولاد تھے اس خیال سے تربیت گاہ میں تشریف لائے کہ ایک لڑکی کو گود لے کر پال لیں۔ اُنھوں نے میمہ کو پسند کیا۔ جب اس بات کا ریو کا پتا چلا تو اُس نے میمہ کو ہدایت کردی کہ اب کی مرتبہ جب تم ان صاحب کے پاس جاؤ تو رونے لگنا اور بگڑ جانا اور مچل جانا اور اُن کا منہ نوچنا اور لاتیں چلانا۔ اس نے ایسا ہی کیا اور وہ صاحب مایوس ہوکر چلے گئے۔ جب میمہ کو سزا دی گئی تو ریو جو کہیں سے یہ سب دیکھ رہا تھا دوڑا ہوا آیا اور روایہ کو لاتیں مارنے لگا۔ اسی طرح اور بھی کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ صاحبِ استطاعت لوگوں نے میمہ کو لے کر پالنا چاہا اور ریو نے اسے بہکا کر اس سے ایسی حرکتیں کرائیں جنھوں نے لوگوں کے دلوں میں اس کی طرف سے نفرت پیدا کردی۔ دیکھا دیکھی یہ جذبۂ بغاوت دوسرے بچوں میں بھی پیدا ہوگیا اور اُنھوں نے بھی نوواردوں کے سامنے ایسی ہی حرکتیں شروع کردیں۔ ایک دفعہ ایک خاتون ایک لڑکے کو گود لینے کے خیال سے آئیں اور اُنھوں نے ایک بچہ پسند بھی کر لیا، مگر ریو نے اُن کو یہ کہہ کر ڈرا دیا کہ جس بچے کو آپ نے پسند کیا ہے وہ بڑا شریر ہے، اور وہ خاتون مایوس ہوکر چلی گئیں۔

منتظمہ ان حرکتوں سے بہت نالاں تھی اُس نے تربیت گاہ سے دُور کرنے کے لئے ریو کو ایک دوکان پر کام کاج کے واسطے بھیج دیا جاتے وقت ریو نے میمہ کو ایسا بھڑکا دیا کہ وہ سارے دن ریو کے لئے روتی رہی اور کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔ دوسرے ہی دن دوکاندار ریو کو واپس کرگیا، وہ کہہ گیا، جناب یہ لڑکا بہت شریر ہے میں اسے نہیں رکھ سکتا۔ اصلاح کے خیال سے زبانی سرزنش کرکے منتظمہ نے ریو کو پھر تربیت گاہ میں داخل کرلیا۔ مگر معلوم نہیں وہ اب اپنے آپ کو کیا سمجھنے لگا تھا۔ کیونکہ چند دن بعد منتظمہ نے معلوم کیا کہ ریو اور میمہ نے خود کو باقی بچوں کا لیڈر بنا لیا ہے اور خفیہ جلسے شروع کردئے ہیں۔ اور یہ جلسے پڑھائی کے اوقات میں ہوا کرتے ہیں، ان جلسوں میں یہ دونوں باقی بچوں سے قول لیا کرتے تھے کہ خواہ کچھ بھی بات ہو مگر جب ہم منتظمہ سے لڑنے لگیں تو تم سب ہمارا ساتھ دینا۔ ایک دن ریو نے منتظمہ سے کہا کہ کئی دن سے صبح کو دال پک رہی ہے، بس اب کل دال نہ پکے ورنہ میں مہتمم صاحب کو خط لکھ دونگا، اور دھمکی کے لہجے میں یہ بھی کہا کہ سب بچے میرے ساتھ ہیں۔ اس پر منتظمہ نے بطور سزا کئی روز تک اُسے دال کھلائی۔

چونکہ منتظمہ کو اُس کی اصلاح مدنظر تھی پڑھائی کے اوقات سے پہلے اور بعد ریو کے لئے اخبار بھیجنے کا انتظام کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ اخبار بیچتا نہیں پڑھتا رہتا ہے۔ جب چاہا گیا کہ وہ اس سے باز رہے، اس نے ہڑتال کرنے کی دھمکی دی۔ یہ خیال اُس کے دماغ میں اخبار پڑھنے سے آیا ہوگا۔ ایک دن جب بچے ورزش کے لئے جارہے تھے میمہ نے سیٹی بجائی تو سب استانی کے قابو سے باہر ہوکر باغیچے میں پھیل گئے۔ منتظمہ خود اُنھیں منانے گئی تو ریو نے سخت کلامی کی اور کہا جب تک تم میرے ساتھ صلح کی گفتگو نہ کروگی ہڑتال ختم نہ ہوگی اور جب اُس کی یہ شرط پوری کی گئی اُس وقت ہڑتال ختم ہوئی۔

یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اب ریو ہمارے قابو کا نہیں ہے، منتظمہ نے مہتمم سے درخواست کی کہ وہ ریو کا کوئی اور بندوبست کردیں۔ محترم ممبرانِ بورڈ کو یاد ہوگا کہ یہ درخواست اُن کی خدمت میں پیش ہوئی تھی، اور ریو اور میمہ دونوں نے ممبران کے سامنے پیش ہوکر روتے ہوئے یہ بیان دیا تھا کہ اُنھیں تربیت گاہ کے بچوں سے بے انتہا محبت ہے اور اس لئے وہ یہاں سے جانا نہیں چاہتے۔ اس پر محترم ممبران نے اُنھیں یہاں رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ اصل میں ریو اور میمہ نے بڑی چالاکی سے بیان

دیا تھا، اُن کا رونا بھی بناوٹی تھا اور تربیت گاہ کے بچوں سے اظہارِ محبت بھی بناوٹی تھا۔ مطلب فقط منتظمہ کی درخواست کو نامنظور کرانا تھا، اِس کا ثبوت یہ ہے کہ جس دن درخواست نامنظور ہوئی ہے اُسی رات وہ تربیت گاہ کے صدر دروازے کی چھت پر چڑھے اور دروازے کے اوپر کے پتھر پر جو سامنے سے نظر آتا ہے یہ کھود دا " ریو اور میمہ کی فتح کی یادگار میں اگست ۳۴ء"

منتظمہ کو جب خبر لگی تو اس نے مالی کو حکم دیا کہ اس پر سمنٹ لگا دے، بارش سے سمنٹ دُھل گیا اور آج تک یہ فقرہ دروازے کی سِل پر کُھدا ہوا ہے۔

اِس کے بعد یہ انتظام ہوا کہ لڑکے اور لڑکیوں کو علیحدہ علیحدہ رکھا گیا تاکہ ریو اور میمہ دونوں ایک دوسرے سے مل کر کسی نئی شرارت کی بنیاد نہ ڈال سکیں۔ اِسی اثنا میں ایک صاحب مسٹر نعمان آئے اور اُنھوں نے بتایا کہ اب سے چند سال پہلے میں اور میری بیوی الہ آباد میں رہتے تھے۔ میری بیوی کے یہاں بچہ ہونے والا تھا، اور بچے کے لئے جو کپڑے تیار کئے گئے تھے اور اُن پر ایک خاص قسم کا نشان بنا دیا گیا تھا، بعض گھریلو رنجشوں کی وجہ مجھ سے اور مرحومہ سے تکرار ہوگئی، وہ ذرا سی کشش تھیں گھر سے نکل کھڑی ہوئیں اور خبر نہیں کہاں گئیں۔ مجھے تلاش کے باوجود اُنکا پتہ نہ لگا۔ کئی سال کی چھان بین کے بعد یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ اس شہر میں آ گئی تھیں اور دورانِ زچگی میں یہیں اُن کا انتقال ہوگیا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اُن کے ایک بچہ بھی ہوا جو پیدائش کے ایک دو ہفتے بعد ایک مقامی یتیم خانے کو دیدیا گیا۔

مسٹر نعمان کی یہ گفتگو سن کر منتظمہ نے اُن سے وعدہ کرلیا کہ آپ کو وہ کپڑے دکھا دئے جائیں گے جو پہلے دن بچوں کے جسم پر سے اُتار کر محفوظ کرلئے جاتے ہیں۔ اتفاق سے یہ گفتگو ریو بھی سن رہا تھا۔ اس نے ضد کی کہ پہلے مجھے میرے کپڑے دکھائے جائیں، شاید اُن پر کوئی نشان ہو۔ منتظمہ کو ریو کی یہ بات کچھ زیادہ بری نہیں معلوم ہوئی۔ اور ریکارڈ روم میں داخل ہونے کی اجازت دیدی گئی، جہاں بچوں کے کپڑے چھوٹے چھوٹے بکسوں میں رکھے تھے۔ مگر چند منٹ بعد ریکارڈ روم میں داخل ہونے پر اُسے ریو کی مجرمانہ نیت کا پتہ چلا۔ ریو نے دو بکس کھول رکھے تھے ایک میمہ کا اور دوسرا کسی اور بچے کا۔ اُس بچے کے کپڑے میمہ کے بکس میں رکھ رہا تھا اور میمہ کے کپڑے جن پر سُرخ تاگے سے ایک نشان بنا تھا دوسرے بچے کے بکس میں۔ ابھی وہ اپنے جرم کا مکمل طور پر ارتکاب نہ کرسکا تھا کہ منتظمہ جا پہونچی۔ اُس نے بچوں کے کپڑے حسبِ سابق کردئے اور ریو کو دھتکار کر کمرے سے باہر نکال دیا۔ میمہ کے کپڑے سامنے آنے پر مسٹر نعمان نے اپنی بچی کو جان لیا اور وہ اپنے باپ کے حوالے کردی گئی۔ ریو جاتے وقت اُس سے گلے مل کر رویا اور اُس کے جانے کے بعد جب تک یہاں رہا روتا رہا۔ دو دن ہوتے ہیں وہ یہاں سے بھاگ گیا اور اب تک لاپتہ ہے، حالات کی رپورٹ محترم ممبران کی خدمت میں پیش کردی گئی ہے۔

جاپان کے کسان

محمد ہاشم مولیدینا، میونسپل کونسلر۔ پونہ

ہمارے ہندوستانی کسان کا خمیر چار چیزوں سے مل کر بنا ہے، اونٹ کی قناعت۔ گائے کا بھولا پن۔ بھیڑ کی اندھی چال۔ اور کتے کی قدامت پسندی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تقدیر کا اس حد تک قائل ہو چکا ہے کہ مجسم "ایشور کی مرضی" بن کر رہ گیا ہے۔ اس کا ایشور مہربان اور رحیم چیز نہیں بلکہ قہار اور جبّار واقع ہوا ہے اس لئے اس کی عبادت ڈرنا اور گڑگڑانا ہے۔

شہری اور متمدن انسانوں میں چونکہ تخلیق کا مادہ مقابلتہً زیادہ ہوتا ہے اس لئے یہ بھولا انسان ان سے بھی ڈرتا ہے اور ان کو "مائی باپ" کہہ کر پکارتا ہے۔ اس طرح اس نے اپنی انفرادیت۔ قدرت۔ حکومت اور سماج کے ہاتھوں بہت کم قیمت پر بیچ کر اپنے وجود کو خود اپنے لئے وبالِ دوش بنا لیا ہے۔ ان تمام باتوں کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ قدرت اس سے تمسخر کرتی ہے۔ حکومت ستم ظریفیاں اور سماج ظلم۔ اور یہ بھولا شکار میمنہ میسرہ اور قلب کی طرف سے پسپا ہو کر زندگی کی بھاگ دوڑ میں برابر پیچھے ہٹتا چلا آرہا ہے۔

اب آئیے اس کا مقابلہ ہم جاپان کے کسان سے کریں۔ سب سے بہتر ذریعہ کسی قوم کی فطرت کو جانچنے کا یہ ہے کہ مخصوص حالات کے اندر اس کے طرزِ عمل کا مشاہدہ کیا جائے اور اس سے نتائج اخذ کئے جائیں۔ چنانچہ ذیل کا واقعہ جاپانی کسان کی فطرت پر پوری روشنی ڈالتا ہے۔

الکشن کے زمانے میں مختلف امیدوار گاؤں گاؤں گھومتے پھرتے تھے۔ ایک گاؤں میں ایک پارٹی نے ایک جلسہ کیا جس میں تقریباً ساٹھ دیہاتی موجود تھے اور اُن سے اپیل کی کہ وہ ایک امیدوار کو ووٹ دیں کیونکہ وہ بہت جہاندیدہ ہے۔ یورپ اور امریکہ کا سفر کر چکا ہے اور اس کے علاوہ انگریزی بھی بہت اچھی طرح بول لیتا ہے۔

یہ سنتے ہی حاضرین میں سے ایک شخص جو مخالف پارٹی سے تعلق رکھتا تھا کھڑا ہو گیا اور اس امیدوار پر اعتراض کرتے ہوئے کہنے لگا کہ ——

" اگر اس جگہ کے لئے سیر و سیاحت ایک لازمی قابلیت ہے تو کیوں نہ اس امیدوار کے بجائے کسی جہاز کے کپتان کو کھڑا کر دیا جائے۔ اور اگر انگریزی بول لینا دوسری شرط ہے تو وہ بھی اس طرح پوری ہو سکتی ہے کہ جاپان کے کسی بندرگاہ میں جا کر کسی مترجم کا ہاتھ پکڑ کر اسکو پارلیمنٹ میں بھیج دیا جائے، نہیں جناب۔ ایسے امیدوار جو اپنی تمام عمر یورپ اور امریکہ کے سیر سپاٹے میں گنوا کے پھریں اور انگریزی بول لینے کو اپنی ذات کے لئے قابلِ صد افتخار سمجھیں، ہمارے لئے بیکارِ محض ہیں۔ میں جس امیدوار کی موافقت کر رہا ہوں وہ دوسرے ہی قسم کا ہے، وہ ایک بڑی یونیورسٹی میں تعلیم پانے کے بعد ایک مدت تک دھان کے کھیتوں میں کام کرتا رہا ہے اور اس طرح وہ ہماری زندگی کے تمام پہلوؤں سے پوری طرح واقف ہو چکا ہے"

اس تقریر نے پہلے امیدوار کو زندہ درگور ہی کر دیا ہوتا، اگر فوراً ہی ایک بوڑھا کسان نہ کھڑا ہو جاتا —— وہ چیخ کر کہنے لگا کہ

"اچھا بھیا اگر تمہارے خیال میں پارلیمنٹ کے لئے یہی قابلیت ضروری ہے تو ہم خود ہی کیوں نہ اس جگہ کے لئے کھڑے ہو جائیں۔ کیونکہ ہم تو جب سے پیدا ہوئے اسی دم سے دھانوں کے کھیت میں کام کر رہے ہیں اور ہم نے تو اپنی عمر یونیورسٹی میں بھی برباد نہیں کی ——"

اس واقعے سے ہم جو کچھ نتائج اخذ کرسکتے ہیں وہ ہمارے دیہاتی تو کجا خود ہم ہی کو شرما دینے کے لئے کافی ہیں۔

کیا باوجود اس تمام تعلیم کے ہم اتنے نڈر۔ حاضر جواب، اور بذلہ سنج واقع ہوئے ہیں۔ اور کیا یہ واقعہ جاپانی کسان کی معاملہ فہمی اور حساس طبیعت کی طرف اشارہ نہیں کرتا۔ دوسرا واقعہ جو ذیل میں بیان کیا جاتا ہے اس سے زیادہ نتیجہ خیز ہے، اس کے راوی ایک انگریز سیاح مسٹر برنس اسکاٹ ہیں۔

جس طرح آج کل ہمارے ملک میں دیہات سدھار کے سلسلے میں محکمۂ زراعت کے افسر گاؤں گاؤں لکچر دیتے پھرتے ہیں، اسی طرح محکمۂ زراعت جاپان کی طرف سے بھی دیہاتیوں کی ترقی کے لئے مناسب موقعوں پر لکچروں کا انتظام کیا جاتا ہے، چنانچہ ایک گاؤں میں "دھان" کی پیداوار پر ایک افسر کے لکچر کا پروگرام تھا۔ لیکن اس مقرر کے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے حاضرین کی صفوں کو بالکل خالی پایا۔ ایک شخص کے علاوہ جو ایک بوڑھا کسان تھا، جب مقرر نے اس عمر رسیدہ کسان سے لوگوں کی غفلت اور عدم توجہی کی شکایت کی تو اس نے کہا کہ ــــ "دیکھیئے بابوجی ہم سب کامی آدمی ہیں اور خاص طور سے اس موسم میں تو ہمیں دم لینے کی بھی فرصت نہیں، چونکہ میں گاؤں بھر میں سب سے زیادہ بوڑھا ہوں۔ اس لئے اُنھوں نے مجھے انتخاب کرکے اپنے عوض لکچر سننے کو بھیجا ہے، میں اپنے وسیع تجربے اور معلومات کی بنا پر کہ سکوں گا کہ آیا آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ ہمارے لئے مفید بھی ہوگا یا نہیں۔ اس لئے اگر آپ نے مجھ کو مطمئن کر دیا تو گویا تمام گاؤں کو مطمئن کر دیا۔"

اس حکایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ جاپانی کس قدر محنتی ہیں کہ اپنے کام کے سوا دوسری باتوں کی پروا بھی نہیں کرتے۔ اُن کا اپنی طرف سے ایک بوڑھے آدمی کو انتخاب کرکے بھیجنا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ وہ کس قدر ہوشیار واقع ہوئے ہیں۔ اور اس بوڑھے کا بحث و مباحثہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اندھی تقلید کے قائل نہیں۔

جاپانیوں کی جفاشعاری اور قربانی کی مثال جس کا اندازہ ذیل کی حکایت سے ہوگا دنیا کے بہت کم کسانوں میں مل سکے گی۔ کاش ہم ایسا کیرکٹر اپنی یونیورسٹی اور کالج کے طلبہ ہی میں پیدا کرسکتے۔

ایک ذہین اور کفایت شعار کسان اس قدر بوڑھا ہوگیا کہ اس کے لڑکے نے اسے کام چھوڑ کر باقی ماندہ عمر کے لئے آرام کرنے پر مجبور کیا، لیکن اس بوڑھے نے اصرار کیا کہ اس کو بدستور کام کرنے دیا جائے۔ مگر لڑکا نہ مانا۔ آخر کار اُس نے اپنے کھیت پر جانا چھوڑ دیا۔ لیکن اپنے بیٹے کی نگاہ بچا کر وہ روزانہ ایک دور کی پہاڑی پر جو بالکل بنجر اور ویران تھی جانے لگا۔ وہاں اس کے ڈھلان پر اس نے آہستہ آہستہ ایک دیوار کھڑی کی۔ اپنے کمزور ہاتھوں سے اُس نے اس ڈھلان پر مٹی ڈالنا شروع کی، یہاں تک کہ وہاں ایک کھیت تیار ہوگیا۔ لیکن وہ صرف تیس مربع فٹ کی جگہ تھی مگر اس بوڑھے کا دل ہی جانتا تھا کہ اس نے کس قدر عرقریزی کی تھی۔ جب ایک دن اس لڑکے نے اس تیار شدہ آراضی کو دیکھا تو وہ بے ساختہ رونے لگا اور کہا کہ "تم نے خود کو کس لئے ہلکان کیا؟ آخر یہ کھیت کس کام آئے گا؟ اگر یہ گاؤں کے قریب ہوتا تو جوتا بویا جا سکتا تھا مگر آبادی سے اتنے دور کون اس کو بو سکے گا؟

یہ سنکر بوڑھے نے اپنے پائپ سے تنبا کو گراتے ہوئے کہنا شروع کیا کہ "اگر تم ٹوکیو جاؤ اور وہاں کے ایوما قبرستان کی سیر کرو تو تمہیں وہاں بڑے بڑے پتھر ملیں گے جن پر سپاہیوں اور افسروں کی یادگار میں وہ عبارتیں نقش ہیں کہ جنھوں نے ان کو غیر فانی بنا دیا ہے۔ لیکن ہم نے کبھی ان بہادروں کا نام بھی نہیں سنا۔ میرا خیال ہے کہ حیاتِ جاودانی کے لئے بڑے بڑے پتھروں کی ضرورت نہیں، میں شرط لگا کر کہتا ہوں کہ تم کو جاپان کے سب سے بڑے شاہ مردہ (HERO) کی قبر کا نشان تک نہیں معلوم، لیکن اس کے باوجود تم اس کو بھولے نہیں۔ بیٹا غیر فانی مقبولیت زندگی کے کارناموں سے حاصل ہوتی ہے۔ سنگِ مرمر کے کتبوں سے نہیں۔ یہ مصنوعی یادگاریں مٹ جاتی ہیں۔ لیکن جن بہادروں کی قبریں بنی نوعِ انسان کے دلوں میں بنی ہوئی ہوتی ہیں وہ امٹ ہو جاتی ہیں۔ ہم کسان بھی اپنے مخصوص انداز میں اپنی یادگاریں چھوڑ سکتے ہیں۔ اور وہ یادگاریں کونسی ہیں؟ بنجر پہاڑی کے ڈھلوان پر ایک نیا دھان کا کھیت تیار کرنا اور ایک باغ لگانا ہمارے بہترین کارنامے اور لازوال یادگاریں ہیں۔ مجھکو کس قدر ندامت اور افسوس ہوتا کہ میرے مر جانے کے بعد میرا نام فراموش کر دیا جاتا اور اب جبکہ اس کھیت میں مٹھی بھر

دھان بھی پیدا ہوگئے تو میرا نام زندہ رہ سکے گا۔ مجھے کس قدر مسرت اور اطمینان ہے، گویا میری زندگی بیکار نہیں گئی، اور اب تو میں اس پر ایک جنگل لگانے والا ہوں۔

وہ بڑھا اتنے عرصے تک زندہ رہا کہ وہ بنجر پہاڑی لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں تبدیل ہوگئی اور اس کے ہر چہار طرف گھنا جنگل اُگ آیا۔

اس کے بعد ہم جاپانی کسان کی مشکلات بیان کریں گے، جن میں "شاہ مجی" جس کے زمانے سے جاپان کا نشاۃ الثانیہ شروع ہوتا ہے برابر اضافہ ہوتا چلا آرہا ہے۔ شروع میں اس کو لگان نقد رقم میں ادا کرنا پڑا۔ حالانکہ وہ جنس دینے کا عادی تھا، اس لئے سکّہ کے دلالوں نے اس کو ننانوے کے پھیرے میں ڈال دیا۔ اس کے بعد اس کو "جدید زراعت" سکھائی گئی جس نے اس کا دیوالہ نکال دیا۔ اس نے آنکھ بند کرکے زراعت کے جدید آلات اور کیمیاوی اجزا خریدنا شروع کئے اور ان چیزوں کے سوداگروں نے ان کے دام بڑھانا شروع کئے۔ یہاں تک کہ اس نے جتنا خرچ کیا تھا اتنا وصول ہونا بھی مشکل ہوگیا۔ جب اُس نے دیکھا کہ جدید زراعت نے اس کا خاتمہ کردیا تو اس نے کھیتی باڑی کے ساتھ ہی ساتھ مرغیاں اور سور پالنا شروع کردئے تاکہ ایک کی کمی دوسرے سے پوری ہو جائے، اس میں اس نے اتنی ترقی کی کہ دس ہی سال میں جانوروں کی تعداد تمام جاپان میں دگنی ہوگئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ مرغی خانہ کے لوازم مثلاً مصنوعی بیضہ کش، جالیاں اور حد بندی کے تار وغیرہ کی قیمت بھی اسی تناسب سے بڑھتی گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہر دولتمند بنے اور گاؤں تباہ ہوگئے

اس کے علاوہ جاپانی کسان ہندوستانی کاشتکار کے برخلاف جو اپنے مکان کی دہلیز پھلانگنا بھی نہیں جانتا۔ اکثر سفر کرتا رہتا ہے اور اپنے قریب کے شہروں کو جاکر دیکھتا ہے۔ اس لئے ریلوے کمپنیاں دولتمند ہوتی چلی جاتی ہیں مگر کسان کے افلاس میں زیادتی ہوتی چلی جارہی ہے، موجودہ تہذیب و تمدن بھی بڑی حد تک اس کی بربادی کا باعث ہے، جاپان کے گاؤں میں اور کسانوں کی جھونپڑیوں میں جاہل آدمی اور فاضل پیسے ڈھونڈھے سے بھی نہ ملیں گے۔ تعلیم کو عام کرنے کے لئے بعض گاؤں میں کاشتکاروں کی آمدنی پر ستر سے اسّی فیصدی تک ٹیکس لگا دیا گیا ہے۔ ان تمام اخراجات کی وجہ سے اس کی کمر ٹوٹ چکی ہے۔ اس لئے اُس نے اپنے دھان کے کھیتوں میں کاشتکاری بند کردی اور ان میں شہتوت کے درخت لگانا شروع کئے تاکہ ریشم کے کیڑوں کی پرورش سے فائدہ اُٹھا سکیں مگر اس میں بھی ان کو نقصان ہوا۔ کیونکہ اس کے مقابلے پر مصنوعی ریشم کا کاروبار بڑھنے لگا۔

اب اگر وہ اپنی کاشتکاری کو قائم رکھنا چاہے تو اس کے لئے ایک ہی ذریعہ ہے، اور وہ یہ کہ اناج کی کاشت کے بجائے وہ ترکاریوں اور پھلوں کی پیداوار پر اپنی پوری توجہ منعطف کرے، جاپان میں مربے، اچار، چٹنی، تازہ پھل اور ترکاریاں ٹین کے ڈبوں میں بند کرکے باہر بھیجنے کا کام مستقل رکھتا ہے۔ جاپان کی زمین پھلوں کی کاشت کے لئے موافق بھی ہے اس لئے جہاں پہلے دھان پیدا ہوتا تھا۔ اب وہاں ناشپاتی، انگور، انجیر، آڑو، بیر، اور اسٹابری کے باغ لگے ہوئے ہیں، جاپان کی چائے کی کاشت زیادہ منافع نہیں دیتی، کیونکہ اس کا مقابلہ ہندوستان، لنکا، اور جاوا سے ہے، جہاں کی چائے کو دنیا پر فوقیت حاصل ہے۔

دورِ حاضرہ میں جاپانی کسان کے لئے دوسری راہ بھی کھلی ہوئی ہے اور وہ یہ کہ کھیت چھوڑ کر شہر میں آجائے اور اس پر عمل بھی بڑی تیزی کے ساتھ ہورہا ہے۔ شہروں کی آبادی کثرت سے بڑھ رہی ہے پچیس سال کے عرصے میں جاپان کے شہروں کی آبادی تین سو فیصدی بڑھی ہے اور گاؤں کی آبادی صرف سات فیصدی۔ یہ ایک دوسرا خطرہ ہے جو حکومت اور کسانوں کے لئے موجبِ فکر ہے۔ بہرحال ہم کو اس مختصر باب میں جاپانی کسانوں کی مشکلات کا تھوڑا بہت اندازہ ضرور ہوگیا ہوگا، اور ہم نے یہ بھی نظر انداز نہیں کیا ہوگا کہ باوجود ان تمام مشکلات کے جاپانی کسان کس قدر بہادر ہے کہ رفتارِ زمانہ کے ساتھ کتنی جلد جلد بدل رہا ہے۔ تاکہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے نہ رہ جائے۔ دائے ہے ہمارے ہندوستانی کاشتکار کے حال پر کہ وہ جہاں تھا وہیں ہے۔

حکومت اپنے فرائض سے غافل نہیں ہے۔ دیہات کی تباہی اور شہروں کی کثرتِ آبادی کو دیکھتے ہوئے اب یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ صنعت و حرفت غیر مرکزی صورت میں لائی جائے، یعنی کارخانے شہروں سے ہٹا کر گاؤں میں کھولے جائیں، تاکہ وہاں کی آبادی صنعت و حرفت

میں حصہ لینے کے باوجود اپنے کاشتکاری کے فرائض بھی انجام دے سکے۔ اس طرح شہروں کی آبادی کم ہو جائیگی، بے روزگاری گھٹ جائے گی۔ دیہاتیوں کو جو تکالیف شہری زندگی میں پیش آتی ہیں وہ بھی باقی نہ رہیں گی چونکہ جاپان میں ایک جگہ سے دوسری جگہ فاصلہ بہت کم ہے اس لئے مصنوعات کو گاؤں کے کارخانوں سے بندرگاہوں تک لے جانے میں خرچ بہت کم آئے گا۔

ایسے دیہی کارخانے جاپانی دیہاتوں میں تقریباً گیارہ ہزار ہیں، جو سب بجلی سے چلائے جاتے ہیں ان میں سے ۲۲۶ کارخانے میونسپلٹیاں چلاتی ہیں۔ ۱۷۴۱ کارخانے امدادی انجمنیں چلاتی ہیں۔ ۵۰۲۰ زراعتی انجمنوں کے زیر نگرانی ہیں اور ۴۱۳۱ کارخانے مشترکہ سرمائے سے چلتے ہیں۔ اسی سلسلے میں زراعتی کاروبار کو منظم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ گاؤں میں ریشم کے کیڑوں کی پرورش و پرداخت ان کے کویوں کی خرید و فروخت وغیرہ کے لئے گاؤں والوں کی مشترکہ انجمنیں تشکیل میں آ چکی ہیں اس طرح دوسری پیداواروں کے لئے بھی کیا جا رہا ہے، ہم ہندوستان میں بھی اس قسم کے بند و بست کی پرزور سفارش کریں گے تاکہ ملک کی دولت صرف چند شہروں ہی تک محدود نہ رہے بلکہ اس سے تمام آبادی مستفید ہو سکے۔ اس کو ترقی دینے کے لئے بجلی پیدا کرنے کے کارخانے کثرت سے کھولے جا رہے ہیں اور وہاں بہت سستی رو مہیا کی جاتی ہے۔

ملک اور حکومت اب تک صنعت و حرفت کی طرف اپنی تمام توجہ منعطف کئے ہوئے تھی۔ اور سیاست کی پیچیدگیوں میں اپنے دیہاتیوں کی پوری خدمت نہیں کر سکی تھی۔ لیکن اب تمام ملک کو اس بات کا احساس ہو چکا ہے کہ جاپان کی بنیاد زراعت پر ہے" اس لئے اس طبقے کا مستقبل اب بہت روشن نظر آ رہا ہے۔

علم و جہل

جب دل کو کوئی رہنما نہیں ہے واللہ
جب عقل کو کوئی دوا نہیں ہے واللہ
کاندھے پہ علوم کے جو ہوتا ہے سوار
اس جہل کی انتہا نہیں ہے واللہ

(جوش)

ہر نکتۂ الہام تو قہر بن جاتا ہے
ہر چیز کثیف زہر بن جاتا ہے
وہ علم کہ اکسیر ہے انساں کے لئے
گر ہضم نہ ہو تو زہر بن جاتا ہے

(جوش)

اک عمر میں ہوتی ہے بصیرت پیدا
ہوتا ہے خدا شناس دیدۂ دولت پیدا
گر کبر میں نفس کے نہ اتر جائے اگر
خود علم سے ہوتی ہے جہالت پیدا

(جوش)

ماں

مسعود حسن شمسی داناپوری (کلکتہ یونیورسٹی)

۱۹۲۲ء کا ذکر ہے جب میں انٹرمیڈیٹ کالج میں تعلیم پا رہا تھا اور خالو ابا کے ساتھ بانکی پور کے ایک محلہ مرادپور میں رہا کرتا تھا، اسی زمانہ میں یوپی کی ایک خاتون میرے پڑوس میں آکر مقیم ہوئیں جو بڑی خوش مزاج، نیک دل، اور فرشتہ سیرت واقع ہوئی تھیں۔ طبیعت میں حد درجہ لطافت اور سنجیدگی تھی۔ اچھی تعلیم اور بیسویں صدی کی دل و دماغ روشن کر دینے والی تربیت نے اُن میں چار چاند لگا دئے تھے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خلوص اور محبت کی پیکر جس سے ملتیں فراخ دلی اور گرمجوشی سے۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ محلہ میں آتے ہی گھر گھر اُن کا چرچا ہونے لگا تھا۔

شادی کے چند ہی دنوں بعد شوہر ہمیشہ کے لئے داغِ مفارقت دے کر جنت کو سدھار چکے تھے۔ اور تھوڑی سی جائداد اور ایک خوردسال بچہ بطور یادگار چھوڑ گئے تھے۔ خاتون کو اس بچے سے شدید محبت تھی۔ اور سچ پوچھئے تو رنج و غم اور بیوگی کی اس ہیبتناک تاریکی میں اگر بچے کی شعاعِ محبت کا اجالا نہ ہوتا تو وہ اپنی بے لطف اور سوگوار زندگی سے کب کی منہ موڑ لیتیں۔

بچہ جس کا نام حامد تھا نہایت خوبصورت اور حسین تھا۔ اس کے سرخی مائل گورے گورے گال، اور پیشانی کے اردگرد سُنہرے گھنگھریالے بال بہت دلفریب معلوم ہوتے تھے۔ بھرا ہوا پُر گوشت بدن، صاف رنگ، گلابی ہونٹ اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، وہ اپنے سرخ کنول جیسے نرم و نازک پیروں سے چھوٹے سے صحن کے ہزاروں چکر کر ڈالتا تھا، ذہین بھی بلا کا تھا۔ اس چھوٹی سی عمر میں سورۂ فاتحہ، سورۂ اخلاص اور اقبال کی متعدد چھوٹی چھوٹی نظمیں نوکِ زبان تھیں۔ گفتگو کرتا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی خوش الحان طائر گلاب کے خوشنما پودے پر جھوم جھوم کر نواسنجی کر رہا ہے۔

پڑوس میں ہونے کی وجہ سے خاتون اور ہمارے گھر کی عورتوں میں بہت جلد ارتباط قائم ہو گیا۔ وہ اکثر خالہ جان سے ملنے کے لئے آیا کرتی تھیں۔ میں بھی کالج کی حاضری، اور تعلیمی فرائض کی انجام دہی کے بعد اپنے وقت کا اکثر حصہ ان کی صحبت میں گذارتا تھا۔ خاتون کی نتھری ستھری زبان، ان کا دل کش اندازِ بیان اور اُن کے کلام کی دلکش رنگینی، میرے لئے بڑی دلچسپی کا باعث ہوتی۔ ننھا حامد بھی مجھ سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ وہ میرے قدم کی چاپ سُنتے ہی دُور ہی سے "ماموں آئے، ماموں آئے" کہتا ہوا ہونٹوں پر ایک معصوم مسکراہٹ لئے ہوئے میرے پیر سے لپٹ جاتا تھا۔ پھر میں اُسے گود میں اُٹھا لیتا تھا اور پیار کرنے لگتے تھا۔ مجھے اُس کی بھولی بھالی ادائیں اور میٹھی میٹھی باتیں بہت دلکش اور دلآویز معلوم ہوتی تھیں۔ میں اُس سے کبھی کہتا "گائے کی بولی بولو" کبھی کہتا "سورۂ فاتحہ سناؤ" اور کبھی کسی نظم کے سُنانے کی فرمائش کرتا۔

(۲)

گرمی کی ایک خوشگوار صبح تھی، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کا نرم و نازک جھونکا دروازے میں لگے ہوئے رنگین پردے کو حرکت دے رہا تھا، اور میں اپنی

خوبصورت داڑھی کی تزئین وآرائش میں مصروف تھا۔ میں اپنی داڑھی درست کر رہا تھا، اور برقؔ مرحوم کی دلکش نظم "نسیم صبح" کا یہ شعر گنگنا رہا تھا۔

گل کو چھیڑا طرۂ سنبل پریشاں کر دیا
غنچۂ نوخیز کو صد چاک داماں کر دیا

اتنے میں محلہ کی ایک عورت دوڑتی ہوئی آئی اور کہنے لگی "حامد بابو کنویں میں گر گئے ہیں جلد چلئے"۔ میرا نیچے کا سانس نیچے اور اوپر کا سانس اوپر رہ گیا۔ میں زبان سے ایک لفظ نکالے بغیر ایک مدہوشانہ عجلت کے ساتھ بھاگتا ہوا خاتون کے مکان تک پہنچا۔ میرے سر پر غم والم کا ایک گرانبار پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ جب میں نے دیکھا کہ پیارا حامد کنویں میں زندگی کا آخری سانس لے رہا ہے۔ اُسے کنویں سے زندہ نکالنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی، لیکن آہ، ساری کوششیں نقش برآب ثابت ہوئیں۔ ننھی سی جان اس جانگسل صدمہ کی تاب نہ لا سکی، اور افسوس، ظالم موت بیوہ کے لختِ جگر کو چھین لینے میں کامیاب ہو گئی۔

خاتون کے دل ودماغ پر اس ہوشربا سانحہ کا کیا اثر ہوا، کچھ نہ پوچھئے۔ اس واقعہ کے بعد میں نے کبھی اُنھیں ہنستے ہوئے نہیں پایا۔ وہ اکثر چپ رہتیں، بولتیں تو درمیان میں رُک جاتیں، جیسے کچھ سوچ رہی ہیں، میں نے اُن کا غم غلط کرنے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں کیں۔ لیکن مجھے بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اُن کی دلجوئی جوئے شیر لانے سے کچھ کم نہ تھی۔

حامد کے انتقال کے بعد میں پابندی کے ساتھ روزانہ ان کے یہاں جاتا رہا۔ لیکن وہ مجھ سے اور سب لوگوں سے بہت کم بولتی تھیں، دورانِ گفتگو میں حامد کا تذکرہ آجاتا تو اُن کے بدن میں کپکپی سی پیدا ہو جاتی، لبوں پر گو مُہرِ سکوت ہوتی، مگر آنکھوں سے ساون کی جھڑی کی طرح آنسوؤں کی بارش شروع ہو جاتی۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے مجھے یقین ہو گیا کہ حامد ماں سے زیادہ روز تک جدا رہنا نہیں چاہتا اور وہ دن دُور نہیں جب بچھڑے ماں بیٹے پھر ایک جگہ جمع ہو جائیں گے، اور شاید پھر کبھی جدا نہ ہوں گے۔

(۳)

جون جولائی کے مہینوں میں میرا کالج بند ہونے والا تھا۔ اور ابا جان کا اصرار تھا کہ اس تعطیل میں کلکتہ چلے آؤ۔ خود میں بھی ہارڈنگ پارک۔ لالن اور مراد پور کی سیر سے اُکتا گیا تھا۔ اس لئے کالج بند ہونے کے دوسرے ہی دن کلکتہ روانہ ہو گیا۔ کلکتہ کے دورانِ قیام میں مجھے خاتون کے حالات سے قطعاً لاعلمی رہی، کیونکہ سچ پوچھئے تو یہاں کی ہنگامہ آفریں فضا میں پہنچکر میں خود اپنے کو بھی بھول گیا تھا۔ گرمی کی طویل تعطیل ختم کر کے بانکی پور واپس آیا تو گھر کے لوگوں سے خاتون کی خیریت دریافت کی، مگر یہ لوگ کوئی تشفی بخش جواب نہ دے سکے۔ سیدھا خاتون کے مکان پر گیا، خلاف معمول دروازہ بند ملا۔ لوگوں سے معلوم ہوا کہ ایک ڈیڑھ ماہ سے یہ دروازہ یوں ہی بند رہتا ہے۔ دروازہ چونکہ اندر سے بند تھا۔ اس لئے بہت دیر تک باہر کی کُنڈی ہلایا، آوازدی، مگر کوئی جواب نہ ملنا تھا نہ ملا۔ آخر آس پاس کے لوگوں کے صلاح ومشورہ سے دروازہ توڑا گیا۔ گھر میں کسی کا پتہ نہ تھا، ہر شے پر افسردگی اور موت کی خموشی طاری تھی۔ تین چار چھوٹی چھوٹی پیالیاں، کوئی نصف درجن برتن، میلے کچیلے کپڑے، دو چار بوسیدہ کتابیں اِدھر اُدھر بڑی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے کسی نے برسوں سے انھیں ہاتھ نہیں لگایا ہے، خاتون کو ہر ہر کمرے میں تلاش کیا مگر کوئی سراغ نہ مل سکا۔ ناکام واپس ہونے لگا تو اتفاقاً کنویں کے ایک کنارے خاتون کی زیر پائی پر نظر پڑ گئی۔ پھر قریب ہی ایک چبوترے پر کاغذ کا ایک بوسیدہ ٹکڑا جو مردے کی کفنی کے مانند زرد ہو کر رہ گیا تھا ایک پتھر سے دبا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے اسے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُٹھا لیا، اس میں لکھا تھا،

"ننھے حامد سے ملنے جا رہی ہوں

حامد کی ماں"

میں نے اسی دن رات کو خواب دیکھا، دُور، دنیا اور اس کے ہنگاموں سے بہت دُور، ایک وسیع اور شاندار محل میں خاتون ایک زرنگار اور مرصع تخت پر بیٹھی ہوئی تھیں، اُن کی ممتا بھری آغوش آباد ہو چکی تھی۔ حامد ماں کی گود میں چودھویں رات کے چاند سے بھی زیادہ خوبصورت نظر آرہا تھا۔ اور خاتون کی گفتگو میں بلبل کے نغمے سے بھی زیادہ دلکشی پیدا ہو گئی تھی۔

"شعر مرا بمدرسہ کہ برد؟"

جعفر علی خاں اثر لکھنوی

جولائی ۳۷ء کے نگار میں رگھوپتی سہائے صاحب فراق گورکھپوری کا ایک مضمون "دورِ حاضر اور اردو غزل گوئی" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، یہ جواب ہے اُن اعتراضات کا جو کسی صاحب نے رسالۂ کلیم میں صنفِ غزل پر عائد کئے ہیں۔ میرا مقصود نفسِ مضمون سے معارضہ نہیں بلکہ حضرتِ یگانہ کے ایک شعر اور حضرتِ صفی کے دو شعروں کی جو مٹی پلید کی گئی ہے اُس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا ہے۔ حضرتِ یگانہ مرحوم کا شعر یہ ہے ؎

نشیمن پھونکنے والے ہماری زندگی یہ ہے
کبھی روئے، کبھی سجدے کئے خاکِ نشیمن پر

اس کے متعلق ارشاد ہوتا ہے :-

"موصوف نے غالباً یہ سمجھا ہوگا کہ وہ اس شعر کو انتخاب الفاظ، سلاست بیان، سادگی اور ترنم سے سوز و ساز کی آخری منزل پر لے گئے ہیں۔ گا یہی جزئی "خوبیاں" اس شعر کو ابتذال کے گڑھے میں گرا رہی ہیں۔ غزل میں رونے کا ذکر کرنا اپنے اوپر بڑی نازک ذمہ داری لینا ہے جس کی کامیاب مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

"بنال بلبل اگر بامنت سر یاریست
کہ ما دو عاشقِ زاریم و کار ما زاریست"

رونے سے اور عشق میں بیباک ہوگئے دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہوگئے"

"مگر حضرت یگانہ کے شعر میں تو رونے والے کے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ ہی بہتی ہوئی ناک اور منہ سے گرتی ہوئی رال، ناک کی سرخی اور تھرتھراہٹ، آنکھ کی سرخی اور گندگی بھی نظر آرہی ہے، جس سے شعر نہایت گھنونا ہو گیا ہے اور مظلوم کے غم کا احترام یا اس کے ساتھ ہمدردی پیدا ہونے کے بجائے اس ذلیل قسم کی رقت سے نفرت و بیزاری پیدا ہوتی ہے۔ یہ رونا نہیں ہے، یہ سوز و ساز نہیں ہے۔ یہ زخموں کی سینہ کوبی ہے، یہ اظہارِ غم نہیں یہ جھک مارنا ہے اور یہ ابتذال صرف لب و لہجہ سے پیدا ہو جاتا ہے۔"

حضرتِ فراق کا استدلال اُن کے سوا کسی کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ اُن کی عبارت کا ابتدائی حصہ بتاتا ہے کہ شعر کے ابتذال کا دار و مدار گھنونی محاکات پر ہے۔ مگر خاتمے پر فرماتے ہیں کہ شعر کا لب و لہجہ ابتذال پیدا کرتا ہے، حالانکہ لب و لہجہ کے متعلق خود ہی ابتدا میں ارشاد کر چکے ہیں کہ شعر میں انتخاب الفاظ کا سلیقہ، سلاست بیان، سادگی اور ترنم کے صفات موجود ہیں، ان کی موجودگی میں لب و لہجہ سے ابتذال پیدا ہونا ممکن ہی نہیں۔ حضرت معترض کا ایک قول اُن کے دوسرے قول کی تردید کرتا ہے۔ اب دوسرا پہلو لیجئے کہ شعر میں گھنونی محاکات ہے، اگر ایسا ہے تو جس شعر میں رونے کا لفظ آئے وہی گھنونا ہے، دور کیوں جائیے خود حضرت فراق کا ایک شعر لیجئے ؎

یہ کہہ کے کل کوئی بے اختیار روتا تھا وہ اک نگاہ سہی، کیوں کسی کو دیکھا تھا

بے اختیار روتا تھا یعنی ہچکیاں اُلٹی ہوئی تھیں ، جبڑے کھنچ گئے
تھے اور دانت نمایاں ہو گئے تھے ، گویا ایک کُتّا دوسرے کتے کو بھنبھوڑنے
سے پہلے بُری بُری آوازیں نکال رہا ہے - ناک سے رینٹ بہ رہا تھا جو کچھ
آستین پر پونچھا اور کچھ سُڑک لیا جاتا تھا ، ہُو ہُو اور ہُبُوں ہُبُوں کے بعد پھر
یہ مصرع پڑھتا تھا ع

وہ اک نگاہ سہی ، کیوں کسی کو دیکھا تھا

پھر منھ ایک خاص انداز سے پھیلا اور سُکڑا اور گدھے کی سی باٹ آ
آواز خارج ہوئی - خیر یہ تو فراق صاحب کے " بگڑے ہوئے چہرے " " بہتی ہوئی
ناک " " گرتی ہوئی رال " ، ناک اور آنکھ کی سُرخی و گندگی " کا ترکی بہ ترکی جواب
تھا اور خود انھیں کے شعر سے ، اب حضرت یگانہ کا شعر لیجئے - اس میں رونے
اور سجدے کرنے کا صرف ذکر ہے ، بیان واقعہ ہے ، نہ کہ صورت حال ، جس شخص
کا نشیمن پھونک دیا گیا ہے وہ نشیمن پھونکنے والے کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ اے
بے خانماں کرنے والے کیوں حال پوچھ کر جلے ہوؤں کو اور جلاتا ہے ، اب
ہماری زندگی یہ رہ گئی ہے کہ کبھی خاکِ نشیمن پر روتے ہیں اور کبھی انتہائے
غم و جوشِ محبت میں اس خاک پر سجدے کرتے ہیں - ظاہر ہے کہ قائل اُس وقت
نہ تو رو رہا ہے نہ سجدے کر رہا ہے - تخیلہ کہنے والے کی تصویر حزن و یاس
پیش نظر کرتا ہے نہ کہ رونے اور سجدے کرنے کی جس کو وہ بیان کر رہا ہے -
معلوم ہوتا ہے کہ شعر پر اعتراض کرتے وقت حضرتِ فراق کو اپنا لڑکپن
یاد آگیا اور اُسی کی تصویر کھینچ دی ورنہ شعر میں رال وال کچھ نہیں ہے - علاوہ
بریں یہ ضرور نہیں کہ جس وقت خاکِ نشیمن پر روئے اُسی وقت سجدے بھی کرے ،
خصوصاً جب شاعر نے دونوں حالتوں کے پہلے لفظ کبھی لاکر تفاوت زمانی
پیدا کر دیا - ایسا نہ بھی ہو تو بہنگام گریہ سجدہ کرنے سے وہ شکل نہیں بن سکتی
جو حضرتِ فراق کے ذہن میں ہے - یہ اور بات ہے کہ فراق صاحب نے
کوئی ایسا سجدہ وضع کیا ہو جس میں سر نیچے اور ٹانگیں اوپر ہوتی ہیں -

حضرتِ صفی کے وہ اشعار جن پر حضرتِ فراق نے مشقِ ستم کی ہے
یہ ہیں ؎

دیکھئے کیوں ؟ کوئی تربت ہوگی — آپ کو مفت ندامت ہوگی

؎

جب کبھی گورِ غریباں میں چراغاں کرنا — ایک ٹوٹی ہوئی تربت پہ بھی احساں کرنا

فرماتے ہیں کہ

" پہلے شعر میں ردیف کی شوخی اور مختصر انداز نے شاعر کو اس امر پر
غور کرنے کا موقع ہی نہیں دیا کہ آخر میں کہہ کیا رہا ہوں ، کتنی ذلیل جھکی لے
رہا ہوں ، کتنا بازاری طنز اس شعر میں آگیا ہے ، کتنی خباثتِ روح کا اظہار
کر رہا ہوں - دوسرا شعر غنیمت ہے ، گر شمع مزار کا ذکر کرنا بھی رونے کے ذکر
سے کم نازک ذمہ داری کا کام نہیں ہے - احسان کرنا کوئی بہت مستحسن انداز
بیان نہیں ہے .... سستے اور اوچھے طریقے سے رقت پیدا
کرنے کے یہی خطرات ہیں - پھر بھی حضرت یگانہ کی مبتذل سینہ کوبی سے
جناب صفی کے اشعار لب و لہجہ کے لحاظ سے غنیمت ہیں "

کہنا پڑتا ہے کہ ع

سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست

پہلا شعر ایک نشتر ہے جو دل میں پیرتا چلا جاتا ہے - ایک عاشق تھا جو
ناشاد و نامراد اس دُنیا سے اُٹھ گیا ، قبر پر جانا اور فاتحہ پڑھنا درکنار
معشوق نے اتنا بھی نہ پوچھا کہ غریب کو گور گڑھا کہاں نصیب ہوا - اتفاقاً
اس معشوق کا اُس طرف گزر ہوتا ہے جہاں اس عاشق کی تربت ہے -
جذب عشق متوجہ کرتا ہے - اس کشتۂ یاس و حرماں کا ایک راز داں دوست
جو اُس جگہ موجود ہے (شعر کے الفاظ مرنے والے سے جذبۂ رقابت کے
بجائے محبت و مودت کا پتا دیتے ہیں اور یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں
کہ یہ شخص معشوق کے ہمراہ تھا)

کہتا ہے ؎

دیکھئے کیوں ! کوئی تربت ہوگی
آپ کو مفت ندامت ہوگی

اس کہنے سے اُس کا مدّعا دل آزاری نہیں ہے بلکہ لطیف و نازک ترین
پیرایہ میں معشوق کے شبہ کو یقین میں بدل دیتا ہے کہ ہاں آپ کے
چاہنے والے ہی کی تربت ہے اور اُس کی محبت کی کشش ہے جو تربت
کی طرف دیکھنے کو مجبور کر رہی ہے - مگر نہ دیکھئے کیونکہ مفت ندامت ہوگی
اُس کی زندگی میں ندامت سے جور و تغافل کی تلافی ہو جاتی ، اب کیا حاصل ،
اس اسلوب بیان نے شعر کو درد و سوز و گداز کا مجسمہ بنا دیا - مگر لذّت یاب
ہونے کو وجدان اور ذوقِ سلیم درکار ہے جس سے اکثر لوگ بے بہرہ ہیں -

شعر میں ایک دنیائے معنی ہے، ممکن ہے کہ جب معشوق کو علم ہو جائے کہ اُس کے کشتۂ وفا کی تربت ہے تو وہ جذبِ محبت جو کارفرما ہے اور تربت پر ایک نظر ڈالنے کو مجبور کر رہا ہے مزید اثر دکھائے۔ آنکھ سے بے اختیار ایک آنسو ٹپک پڑے یا کم از کم مژہ نمناک ہو کر تمام گذشتہ مظالم کا کفارہ ہو جائے، اگر شعر کے الفاظ اس مطلب کی رہنمونی کرتے ہیں تو خدا جانے خباثتِ رُوح کا آئینہ شعر ہے یا تنقید۔

دوسرے شعر کے متعلق اتنا ہی ارشاد ہوا ہے کہ احسان کرنا کوئی بہت مستحسن اندازِ بیان نہیں ہے، حالانکہ اسی لفظ نے شعر میں نشتریت پیدا کی اور ظاہر کیا کہ ایسے بیکس و گمنام کی تربت ہے جس کا آشنا و غمخوار نہ جیتے جی تھا نہ مرنے کے بعد ہے۔ ورنہ تربت شکستہ و بوسیدہ نہ ہوتی۔ بربنائے محبت نہیں کہہ سکتے کہ چراغ جلاؤ۔ اگر جلا دوگے تو تمہارا احسان ہوگا —— دورِ حاضر کی ستم ظریفی دیکھئے کہ حضرتِ فراق کی ہرزہ سرائی کو "انتقادِ عالیہ" کا خطاب ملتا ہے۔

ینفع الناس

واللہ کہ بے علم و بے بصر ہیں وہ لوگ
اسلام سے وارستے باہر ہیں وہ لوگ
دنیا میں ہے نفع جن سے، جن کو انکار
از روئے کلامِ پاک کافر ہیں وہ لوگ

(جوش)

خدمتِ عقول

عقلوں سے جدا اختلاف کرتا ہوں میں
ذہنِ انساں کو صاف کرتا ہوں میں
کیا مجھکو پکارتا ہے کعبے کی طرف
ہر بار میں سے طواف کرتا ہوں میں

(جوش)

قطعات

کیفِ زندگی

آج موسم بدل رہا ہے رنگ
دل پہ چھائی ہوئی ہے ایک امنگ
اختر اس کیفِ زندگی پہ نثار
عقل، مذہب، رواج، نام و ننگ

(اختر انصاری)

قصیدہ گو

ہائے کیا مبتذل نوائی ہے
فن کی کس درجہ شکستہ پائی ہے
شاعری تیری اے قصیدہ گو!
اصل میں کاسہ گدائی ہے

(اختر انصاری)

منزلِ مقصود

صادق حسین کنبو

دونوں ایک ساتھ اسکول میں پڑھے، ایک ساتھ ہی کالج میں داخل ہوئے اور ہوسٹل میں ایک ہی کمرہ رہنے کو ملا۔ غرض طالب علمی کا سارا زمانہ دو سچے ساتھیوں کی طرح گذار دیا، ہاں "زندگی" میں داخل ہوئے تو رستے الگ الگ ہو گئے۔ راجکمار پولیس ٹریننگ میں چلا گیا، اوم پرکاش نے قومی خدمت کو اپنا مقصدِ حیات قرار دیا۔

گردشِ روزگار نے چند ہی سال میں پھر دونوں کو ملا دیا۔ راجکمار اسی قصبہ میں تھانیدار مقرر ہو کر آیا جو پرکاش کی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ بعد مدت کے دو بچھڑے ہوئے دل ملے تھے، خوب بھینچ بھینچ کر ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے لیکن تقدیر کا متبسم چہرہ کچھ کہتا سنائی دے رہا تھا۔

یہ ڈراما دکھائیگا کیا سین　　　پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

حسب الحکم راجکمار پہونچا۔ دیکھا کہ اوم پرکاش جلسہ میں کھڑا دھواں دھار تقریر کر رہا ہے، ٹھٹھک کر وہیں کا وہیں رہ گیا۔ تقریر دلچسپ تھی لیکن قابلِ گرفت اور حکومت کی زبان میں، باغیانہ "۔ اُس کا فرض تھا کہ مجرم کو گرفتار کرے، لیکن مجرم وہاں تھا کون؟ گردن جُھکاتا تو پلیٹ فارم سے مجرم کے باغیانہ الفاظ بجلی کی طرح کان میں آتے، لیکن گردن اُٹھاتا تو بچپن کا دوست پرکاش نظر آتا۔ کیسے یقین کرتا کہ اُس کا مجرم پرکاش ہے۔ دل، ضمیر تک انکاری تھے۔

اتنے میں مجمع ررر سے ایک کار آ کر رُکی۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس نیچے اُترے، مجمع کو دیکھا، مقرر کے باغیانہ کلمات سُنے اور راجکمار کو ایسی نظروں سے دیکھا جو سوال کر رہی تھیں "ایسے الفاظ استعمال کرنے والا ابھی آزاد ہے؟" راجکمار کی نگاہوں نے بھی زبانِ حال سے جواب دیا۔

"آج تعمیلِ حکم مشکل ہے"

حاکم کی تیوری پر بل پڑ گئے، خشمگین لہجہ میں حکم دیا "گرفتار کر لو"۔ راجکمار نے حسبِ عادت قدم اُٹھائے، لیکن نظر اوپر اُٹھی تھی کہ وہیں کا وہیں رہ گیا۔ "گرفتار کر لو! کسے؟ پرکاش کو! کیسے ممکن ہے"۔ حاکم کے غصّے کی کوئی انتہا نہ رہی، گونجتی ہوئی آواز میں ڈپٹ کر بولا "میں حکم دیتا ہوں گرفتار کر لو"۔

راجکمار کے ہاتھ پیر شل ہو گئے تھے، بدن کا رُواں رُواں باغی ہو رہا تھا، بارے خود پرکاش نے مشکل آسان کر دی، راجکمار کی طرف دیکھا، مسکرایا اور دونوں ہاتھ آگے بڑھا دئے۔ راجکمار نے آنکھیں بند کر لیں پیٹ کے غلام ہاتھوں نے کانپتے ہوئے تعمیل حکم کی۔ مجرم گرفتار ہو گیا۔ مجمع نے نعرہ لگایا،

"شریمان اوم پرکاش جی کی جے!!"

پرکاش ہنسی خوشی حوالات میں چلا گیا، لیکن راجکمار کے لئے گویا قیامت ہی آگئی۔ وہ پاگل سا ہو گیا۔ لوگ تعجب سے سُن رہے تھے کہ تھانیدار صاحب آخر کہہ کیا رہے ہیں "مجرم، مجرم۔ کون ہے مجرم۔ راجکمار۔ راجکمار! دنیا کا سب سے بڑا مجرم۔ پرکاش! ہرگز مجرم نہیں۔ وہ "دوست" ہے، مجرم نہیں۔ وہ بادشاہ ہے، میرے دل کا بادشاہ"۔ اِتنے میں اُس کا نوجوان لڑکا بھاگا ہوا آیا، باپ

کو دیکھا اور گردن ہلا کر خلافِ اُمید مسکرایا۔ پھر باپ کو گھر میں لے گیا۔

کافی دیر کے بعد راجکمار کے ہوش و حواس قائم ہوئے۔ اُس نے فوراً اپنے کپڑے درست کئے اور ایک لفظ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ گھر والے حیران تھے کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ لیکن وہ فوراً حوالات میں پہونچا۔ تھانیدار کو دیکھ کر پہرہ دار نے آہنی دروازہ کھول دیا۔ راجکمار گردن جھکائے اندر داخل ہوا اور دیکھتے ہی پرکاش کے قدموں میں گر پڑا۔ حسبِ عادت پرکاش مسکرایا "ہائیں راجکمار۔ اُٹھو کر بیٹھو بھئی۔ یہ کیا ——" لیکن راجکمار کو یونہی تسکین ہو رہی تھی۔ دنیوی عزّ و جاہ کی بگڑی دل کے بادشاہ کے قدموں کو بوسہ دے رہی تھی۔

پرکاش کے بہت اصرار کے بعد اُس نے سر اٹھایا، اور حوالات کی آہنی سلاخوں کو دیکھ کر بولا "یہ میں نے کیا کیا پرکاش!" پرکاش نے مسکرا کر جواب دیا "اپنا فرض ادا کیا تھانیدار صاحب!"

"تھانیدار صاحب"! راجکمار نے حیرت سے اُس کے الفاظ دہرائے "تم یہ کیا کہہ رہے ہو پرکاش۔ تم چاہتے ہو کہ میں ابھی اپنے آپ کو شوٹ کر لوں؟"

"نہیں نہیں اتنے غصّے کی ضرورت نہیں"

"پھر تم نے مجھے تھانیدار صاحب کیوں کہا۔ کیا میں تمہارا دوست راجکمار نہیں ہوں؟"

"ہو تو ضرور" پرکاش مسکرا کر بولا "لے ------ کن، مجھے تم سے ایک درخواست کرنی تھی اس لئے یوں مخاطب ہوا"

"مجھ سے! وہ کیا؟ فوراً کہو۔ میں اُسے پورا کرنے کو تیار ہوں چاہے اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے"

"جان دینے کی ابھی ضرورت نہیں۔ تم نے ایک شخص پر اپنی طرف سے بیجا پابندیاں عاید کر رکھی ہیں، میں چاہتا ہوں کہ وہ اُٹھالی جائیں"

"وہ کون ہے؟"

"میرا بھتیجا انندکمار"

"وہ بھتیجا نہیں، تمہارا اپنا بچہ ہے اور آج سے وہ تمہارے ہی گھر رہے گا"

"میرے گھر! قومی خادموں کے گھر یونہی ہیں۔ حوالات، جیل۔"

"میرا مطلب ہے کہ بھابی کے پاس"

"وہ بھی نینی جیل میں دیش کی سیوا کر رہی ہیں"

راجکمار نے حیرت سے گردن اُٹھا کر پرکاش کو دیکھا، پھر نظریں نیچی کر لیں۔ پھر دیکھا اور پھر۔ اُس کا ضمیر دونوں کے معیارِ زندگی کا میزان کر رہا تھا، لیکن ترازو کا ایک پلڑا زمین پر پڑا خاک چاٹ رہا تھا اور دوسرا آسمانی بلندیوں میں نظر آ رہا تھا۔

اگلے ہی دن اُس نے نوجوان انندکمار کو قومی جلسہ کے پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے دیکھا۔ حاضرین پُر جوش تالیوں سے اُس کا خیر مقدم کر رہے تھے، جذبات سے لبریز دلوں سے اس کی جے کے نعرے یوں بلند ہو رہے تھے جیسے پجاریوں کے حلقہ میں کوئی دیوتا۔ وہی انندکمار جو ایک کاہل اور ناکارہ مشہور تھا۔ جسے گھر والے کچھ نہ کر سکنے کے طعنے دیا کرتے تھے، آج ایک قومی ہیرو بنا ہوا تھا۔ راجکمار نے یہ سب کچھ تھانیدار کی نگاہ سے نہیں، باپ کی نظر سے دیکھا۔ دل نے مسرّت کا ایک فوّارہ چھوڑا اور رگ رگ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اتنے میں صدر نے ایک مختصر تقریر کے بعد روپیوں سے بھری ہوئی ایک تھیلی انندکمار کو نذر کی جو قصبہ کے نوجوانوں نے چندہ کر کے اُس کے خیر مقدم کے لئے جمع کی تھی۔ راجکمار کے دل و دماغ کے لئے یہی نظارہ کیا کم تھا کہ اُس نے دیکھا کہ انندکمار نے وہ تھیلی اُٹھائی۔ اپنے ہم عمروں کا شکریہ ادا کیا اور یہ کہتے ہوئے صدر کو واپس کر دی۔

"میں یہ روپیہ قوم کی سیوا کے لئے وقف کرتا ہوں"

آج راجکمار کو معلوم ہوا کہ روپیہ کی حقیقت کیا اور اس کا بہترین مصرف کیا ہے، اس روپیہ کا جس نے اُسے شروع زندگی سے غلام بنا رکھا تھا۔

دوسرے دن ٹھیک سوا دس بجے وہ پولیس کے حاکمِ اعلیٰ کے دفتر میں کھڑا ہوا تھا۔

"تھانیدار، تمہیں اپنے لڑکے کی حرکتوں کی خبر ہے؟"

"جی ہاں، وہ قومی کاموں میں زیادہ حصہ لیتا ہے"

"کیا کہتے ہو تھانیدار۔ قومی کاموں میں! یہ بہت بُرا ہے، اس کی سزا تمہیں بھگتنی پڑے گی"

"کیوں صاحب؟"

"اس لئے کہ تم پولیس کے آدمی ہو"

"تو کیا پولیس کا آدمی اپنی قوم کا آدمی نہیں ہوتا؟"

"اس کے معنی ہیں کہ تم حکومت سے بغاوت کرنا چاہتے ہو!"

"اگر اپنے ملک و قوم سے محبت کرنا بغاوت میں داخل کیا جائے۔"

"اچھا تو ــــــــ" فقرہ پورا ہونے سے پہلے راجکمار مطلب سمجھ چکا تھا۔ ارادہ اور عمل کی تمام قوتوں کو جمع کرکے اس نے جواب دیا:

"بہت بہتر۔ اگر آپ کی یہی مرضی ہے۔"

گھر پہونچا تو جذبات کا ایک طوفان اُمنڈ رہا تھا۔ خیالات تیزی سے چکر کھا رہے تھے، دل کی گہرائیوں میں بے پناہ تلاطم برپا تھا، کہ ایک دفعہ ہی نگاہیں انند کمار کے کمرے کی کھڑکی پر پڑیں۔ اندر دیکھا تو قوم کا نوجوان خادم ہتھیلی پر سر رکھے حسرت کے ساتھ دیوار میں لگے ہوئے ایک چوکٹے کو دیکھ رہا تھا جس میں بھارت ماتا غلامی کی سخت زنجیروں میں گرفتار دکھائی گئی تھیں۔ راجکمار کا جی بھر آیا، چاہتا تھا کہ کواڑ کھول کر اندر داخل ہو کہ انند کمار نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر چھت کی طرف دیکھا اور انتہائی حسرتناک لہجہ میں بولا "اب کیا ہوگا، پرمیشور؟" راجکمار گھبرا سا گیا۔ اُس نے خیال کیا کہ اس کی عدم موجودگی میں کوئی اہم واقعہ پیش آیا ہے۔ ایک دم کواڑ کھول کر اندر پہونچا اور پوچھا۔

"کیوں کیا ہوا انند کمار؟" انند کمار باپ کی خلاف اُمید آمد سے چونک پڑا، لیکن فوراً سنبھل کر بولا "کچھ نہیں پتاجی!"

"آخر کچھ تو انند کمار جلدی بتاؤ۔ میں بہت پریشان ہوں۔"

"ٹاؤن کمیٹی کا خیال پریشان کر رہا ہے۔"

"کیوں اسے کیا ہوا۔ کیا پولیس والوں نے کچھ ــــــــ؟"

"نہیں پتاجی، سوال یہ ہے کہ بغیر سر دھڑ کے کیسے کام چلے گا۔ یوں تو ہم نوجوان بہتیرے ہیں مگر بڑوں میں کوئی ایسا پڑھا لکھا نہیں جو ہمارا سرپرست بنے۔ پرکاش جی تھے وہ ــــــــ"

راجکمار کا دل بھر آیا، قوتِ ارادی کے ساتھ گردن بلند کی اور بولے، "فکر نہ کرو، اُن کی جگہ میں موجود ہوں۔"

انند کمار نے حیرت سے باپ کی طرف دیکھا۔ راجکمار نے مسکرا کر اسے گلے سے لگا لیا۔

قوم کا نام بھی لے دینا ایک پولیس والے کی گرفتاری کے لئے کافی ہو چہ جائیکہ پوری ایک پُرجوش تقریر۔ راجکمار اگلے ہی دن گرفتار ہو گئے۔ وہی تھانہ تھا، وہی عملہ لیکن راجکمار کی دنیا بدل چکی تھی، کبھی وہ اس حوالات اور اس میں بند ہونے والوں کو انتہائی حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے، لیکن آج اُسی کے آہنی دروازے میں اس شان اور تمکنت سے داخل ہو رہے تھے، جیسے دنیا کی پُرخطر راہگذر میں یہی اُن کی منزلِ مقصود تھی۔

خطِ رفتار!

دیکھ چشمِ غور سے راہوں میں قدموں کے نشاں
یہ لکیریں ہیں کہ جنبش میں ہے موجِ کارواں

بعض نقشِ پا ہیں کچھ سمٹے ہوئے سے مضمحل
جن سے ظاہر ہے کہ تھے پژمردہ ان لوگوں کے دل

اور کچھ اُبھرے نظر آتے ہیں فرشِ خاک پر
لے رہا ہے جن میں انگڑائی غرورِ مال و زر!

کچھ نشاں ہیں ہلکے ہلکے دلفریب و دل نشیں
جن سے ثابت ہے کہ یہ رہرو تھے شاید نازنیں

کچھ نشاں ایسے بھی ہیں پامال بارِ آرزو
جن کے ہر خط میں پر افشاں ہے تمنّا کا لہو

کچھ نشاں ایسے ہیں جیسے خون سارا جم گیا
فرطِ ناکامی سے دل دھڑکا، دھڑک کر رہ گیا

بعض ہیں آمادگی ہے مسکرانے کے لئے
اور کچھ بے چین ہیں آنسو بہانے کے لئے

کچھ ہیں یوں زیر و زبر، نغمے کے جیسے زیر و بم
جن سے ثابت ہے کہ یہ شاعر کے ہیں نقشِ قدم

اے مسافر دیکھ شانِ پیچ و تابِ زندگی
یہ نشانِ پا ہیں اوراقِ کتابِ زندگی

حرف ہیں ذروں کے دفترِ راہِ ناہموار کا
لکھ گیا ہے خاک پر کیا کیا قلم رفتار کا

دیدۂ احساس میں تسبیح کے دانے ہیں یہ
بزم گاہِ جادۂ ہستی کے افسانے ہیں یہ

(جوش)

رفتارِ وقت!

ادارہ

نزولِ اجلال جواہر لال!

۱۰ اکتوبر کی صبح کو پنڈت جواہر لال نہرو اک کوکبِ امید و نوید کی طرح پایۂ تخت دہلی کے افقِ اسٹیشن پر طلوع ہوئے! ع

خوش آمدی اے نگارِ سرمست!

پنڈت جواہر لال کے ورودِ مسعود، کانگریس کے پریزیڈنٹوں کے عام دَوروں سے کچھ مختلف واقع ہوئے ہیں! ملک کی سیاسیات کی "اعلیٰ کمان" کے دو سالہ حامل کی حیثیت سے اُن کی مساعیٔ حسنہ اور جذباتِ طلبیہ دو بنہایت درجہ اہم و قابلِ ذکر طغراہائے امتیاز رکھتی ہیں! ایک اُن کی مسلسل و غیر مختتم گردش چہار دانگِ ہند میں بلکہ بیرونِ ہند میں بھی، اور دوسری اُنکا مستقل و غیر متزلزل انعطافِ توجہ ہندوستانی مسئلہ سیاسی کے نمایاں ترین خط و خال کی طرف! یہ دونوں چیزیں متواتر دو سال سے اہلِ ملک کے سامنے ہیں۔ اس لئے اُن کی جدّت و ندرت اور قدر و قیمت میں ممکن ہے وہ تازگی باقی نہ رہی ہو جو اُن کے آغاز و اجرا کے وقت محسوس کی گئی تھی۔ لیکن یہ تو عوام کالانعام کی اعجوبہ پسندی کا محض اک شمار ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ وطنی سیاست میں پنڈت نہرو کے داخل کئے ہوئے یہ مذکورۂ بالا ہر دو عناصر اک دائم و قائم اہمیت و معنویت رکھتے ہیں! کسی معرکۂ حیات میں فاتح کار چیزیں "زیادہ" نہیں ہوا کرتیں، وہ صرف اپنی ماہیت میں "نادر" ہوا کرتی ہیں!

جہانبانی سے ہے دُشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اِس عقابِ نظری سے جب عنادل نازک دِل کی آنکھ مسلح ہو جاتی ہے تو اُس کی ایک ایک نگاہِ غلط انداز "طوفانِ فردش" و "صاعقہ بپا" و "حشر خیز" بن جاتی ہے! ؎

نوا پیرا ہوا اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

جواہر لال کو اپنے کسی آنی لمحۂ انکشاف میں ہندوستان کی مہم آزادی کے متعلق اسی انقلاب انگیز عمیق و ہمہ گیر ژرف نگاہی و بالغ نظری کی رسائی حاصل ہو چکی ہے! ؎

می شود پردۂ چشم پرِ کاہے گاہے
دیدہ ام ہر دو جہاں را بہ نگاہے گاہے

چنانچہ اب اس جواں سال و جواں بخت میرِ کارواں کے لئے مطلع صاف ہے، حقیقۃ الحقائق اُس کے زیرِ نظر ہے، اور منزلِ مقصود زیرِ قدم! اور معلوم ہے کہ ع

ترا علاج "نظر" کے سوا کچھ اور نہیں!

پنڈت جواہر لال نہرو کی قیادتِ اعلیٰ کے یہ فیصلہ کن عناصر کیا ہیں؟

مجملاً تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ ؎

چہ باید مرد را؟ طبعِ بلندے، مشربِ نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

لیکن اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اُنھوں نے کانگریس کی مسند پر متمکن ہوتے ہی بلکہ غالباً اُس سے بہت پہلے سے ہی، دیکھ لیا تھا کہ وطن کے جہادِ حریت کے محاذ میں چند رَخنے اور صفوفِ مُجاہدین میں چند خلے ہیں! نیز اِس جلوسِ یلغار کی آخری جائے نزول میں بھی کافی پستیاں ہیں! بلاشبہ وہ دیکھ چکا تھا کہ مُلک کو اتحاد کی ضرورت ہے، رُفقائے جنگ کو ایک ہی پرچم کے نیچے جمع ہونے کی دعوت دینی بھی ضروری ہے، مُلک کے بعض مخصوص مسائل اور عقدہائے مشکل بھی ہیں، لیکن .... نہ یہ وہ ہیں جو سمجھے جاتے ہیں۔ اور نہ کشود کار کی وہ راہیں ہیں، جن پر سالکانِ طریقت عرصے سے سرگرداں ہو رہے ہیں! اُس نے کہا کہ یقیناً ہم مسلمانوں کو پیامِ ائتلاف دیں گے، لیکن مُسلم سوادِ اعظم کو، نہ کہ اُن کے نام نہاد، خود ساختہ زعیموں کو! اس جدید نسخے کی تجویز کے تحت انڈین نیشنل کانگریس کے شعبۂ رابطۂ عوامِ مسلمین کا قیام عمل میں آیا! پھر مُلک نے دیکھا کہ "اس صحیح سمت میں اِس صحیح قدم" نے کتنے کہنہ مشق گُرگ زادوں کے قدم متزلزل کر دئے! مولانا شوکت علی کے لئے اب بمبئی کا "قصرِ خلافت" نہ اک حصنِ حصین ہے، نہ دہلی کی جامع مسجد اک محفوظ منبرِ خطابت اور حضرت امارت پناہ جناب جناح کی ہیٹ نما دستارِ امامت" تو اب اس درجہ خطرے میں نظر آتی ہے کہ اُس کے سر پر قائم رکھنے کے لئے اُنھیں ابھی حال میں بمقام لکھنؤ "علمِ اسلام" اپنے فرنگی ہیئت فرقِ مُبارک پر لہرانا پڑا! ع

دریغا آبروئے دیر گر غالبؔ مسلماں شد!

مولانا شوکت علی کا مجلسی وقار اِس وقت ماشاء اللہ جس "نقطۂ نصف النہار" پر ہے اُس کی پیمائش آپ یوں کیجئے کہ پنڈت جواہرلال کی اِسی زیرِ ذکر آمد و شد کی شام کو، جب کہ وہ فرانٹیر میل سے پنجاب کی طرف روانہ ہو رہے تھے تو مولانائے ممدوح کے فرزندِ اکبر مسٹر زاہد علی، مشایعت کنان ہجوم کے حلقے کو چیر کر دہلی کے مہمانِ محترم، کانگریس پریزیڈنٹ، کی خدمت میں "اپنی ہی قوتِ بازو سے" باریاب ہوگئے اور اُن کے روبرو یہ "دفعِ دخلِ مقدر" کیا کہ: "آپ کو یہ گمان نہ ہونا چاہیئے کہ چونکہ میرے والد، مولانا شوکت علی مسلم لیگ کے ارکانِ رکین میں سے ہیں، اس لئے میں بھی "لیگی" ہوں! ہرگز نہیں! میں کانگریسی ہوں، اور بجز کانگریسی کے کچھ ہو نہیں سکتا!"

یہ ہے المناک انجام مُسلم لیگ کی سلطنت کے شاہ و وزیر کی "آل انڈیا بے تاج کی بادشاہی" کے اُس عزمِ عظیم کا، جس کا پرچمِ افتتاح ابھی ماضیٔ قریب میں بلند کیا گیا تھا! ؎

اسی باعث تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو "یوسفِ بے کارواں" ہو کر!

بجز جواہرلال کے شاطرانہ فنِ جنگ کے یہ کس چیز کا کرشمہ ہے، جس نے اِن تکلیف دہ، خلل انداز، فرسودہ "متحجر (fossilised) لیڈروں کی سنگین کمینگاہوں کو اک "زیرِ زمین سُرنگ" کے ذریعے مسمار کر دیا! ہمارا رُوئے سخن "مُسلم ماس کانٹیکٹ" کے حربے کی طرف ہے!

مسلم لیگ کی متقابل مثیل ——— ہندو مہاسبھا ——— کا کریا کرم کانگریس اپنی گزشتہ انتخاباتِ عامہ والی مہم کی پہلی ضرب ہی میں کر چکی ہے، جب کہ بھارت کی ہندو جاتی کے اِن "نیتاؤں اور بھگتوں" کے کلہم بیس نمائندے مجالسِ قانون ساز کے لئے منتخب ہو سکے! ——— جن میں سے پورے دس صرف "زندہ دلانِ پنجاب" سے تھے!

اور پھر یہ وسیع تر قومی پیمانے پر "رابطۂ عوامِ ہند" ہی کی زنجیرِ آہنی تھی، جس نے برطانوی حکومتِ ہند کے "دیوِ استبداد" کو بالآخر ایسا پابند کر ڈالا کہ آج ہندوستان کے پورے سات صوبوں میں کانگریسی حکومتیں "کوس لمن الملک الیوم" بجا رہی ہیں، اور "ڈکٹیٹر گورنر" مجالِ دم نہیں رکھتے!

جواہرلال نے اپنی اک خیر مقدمی نظم کے اس مصرعے پر کہ ع

تمہارے نام کا سکہ رواں ہندوستاں میں ہو!

پُر لطف سخن سنجی کی! آپ نے کہا کہ "سکے کی روانی" کے کلمات نے میرا خیال شاہوں اور شاہنشاہوں کے زرّین ماضی کی طرف منتقل کر دیا! خدا نہ کرے کہ ملوکیت و قیصریت کی یہ سعادت کوئی "نشاۃِ ثانیہ" حاصل کرے! نسلِ آدم اِن سے اِتنی زیرِ بارِ منت ہو چکی ہے کہ اُنھیں مزید تکلیفِ التفات دینے کا کوئی میلان اپنے سینے میں نہیں پاتی! ؎

سر میرا ترے سر کی قسم اُٹھ نہیں سکتا
اِتنا ہوں تری تیغ کا شرمندۂ احساں

پایۂ تخت میں اپنے ورودِ مسعود کی ابتدائی ترین ساعتوں میں پنڈت جی کا دلّی کے سوختہ بخت "پتھر پھوڑوں" کی بستی میں قدم رنجہ فرما ہونا اُن کی درد آشنا فطرت کی مخصوص ادائے دلبری تھی:

دلِ شکستہ دراں کوچہ میکنند درست
چنانکہ خود نشاسی کہ از کجا بشکست

طبیہ کالج میں پنڈت جواہر لال کی اک آنی تشریف آوری اور مختصر حرفی اس صدائے غفلت شکن کی یادگار بنی کہ "آپ (کلمہ گویانِ طب یونانی و آیورویدہ) کو اپنی عصبیت اس امر کا مرتکب نہ بنائے کہ یوروپین میڈیسن کی خدمات و معجزات کے آپ منکر ہو جائیں! یونانی اور آیورویدہ اپنی کسمپرسی کے لئے اپنی ہی بے مائیگی اور جمود پرستی کی مرہونِ منت ہیں۔

(ا۔ ا۔ غ)

قادیان میں تحویلِ قبلہ!

مرزا البشیر الدین محمود ——— "ہیرو پرِ نبوتِ قادیان"!———

وامیر جماعتِ احمدیان" راسخ الاعتقاد" نے اوائلِ اکتوبر کی اک تاریخ سعید کو، باصطلاحِ صحافتِ جدیدہ، "اک درجۂ اوّل کا استعجاب برپا کیا" جب کہ آپ نے "قادیان دارالامان" سے بسواریٔ "خرِ دجال" لاہور میں نزولِ اجلال فرمایا، اور اپنے ہزارہا متبعین کے حلقہ و ہجوم میں، اور کثیر التعداد تماشائیانِ "غیر احمدیان" کے متحیر نظارے کے درمیان اک انقلاب انگیز خطبہ ارشاد فرمایا جس کے دوران میں اعلان کیا کہ میں مع اپنی جماعت کے، بطیبِ خاطر، انڈین نیشنل کانگریس کے مسلکِ سیاست و مشربِ حریت کو قبول کرتا ہوں، اور اپنے تمام مسلم و غیر مسلم سامعین و مخاطبین کو بھی یہی دعوتِ عام دیتا ہوں! ------- اس جدید تحریک کی تشکیل و تنظیم کے لئے "آل انڈیا نیشنل لیگ" کے عنوانِ جلی سے اک وسیع و "ہندوستان گیر" ادارے کا افتتاح عمل میں آ رہا ہے، جو اس نئے اقدام کو عملی جامہ پہنائیگا، اور "آل انڈیا نیشنل کانگریس" کے متوازی اک زبردست "رفیقِ جہاد" بہم پہونچائے گا! حسبِ صلائے عام صاحبزادہ صاحب اس "آل انڈیا نیشنل لیگ" کی رکنیت کا دروازہ بلا امتیازِ مذہب و ملت، فرقہ و جماعت، اُن تمام اہلِ ہند کے لئے کھلا رہے گا جو بحالتِ موجودہ کانگریس کی تنظیم سے منسلک نہیں ہیں، لیکن ملک و وطن کے سیاسی و تمدنی مستقبل کی تعمیر میں اپنا فرض اور حق دونوں حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور اپنی تقدیر کا پانسا ڈالنے میں اب کسی مزید تاخیر و تذبذب کو روا رکھنا مناسب نہیں سمجھتے۔

مرزا البشیر الدین محمود نے کانگریس کی خدمات کو اک خراجِ خوشنودیٔ مزاج بھی پیش کیا اور کانگریس کی حریف دوسری سیاسی جماعتوں کی روش پر نقد و جرح بھی فرمائی! یا دش بخیر مسلم لیگ اس "ذکرِ جمیل" کی خاص طور پر موضوع بنی! اُس کی بے مائیگی اور فضول کاری الم نشرح کی گئی، اور اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے کانگریس کے خلاف رقیبانہ و محتسبانہ تنظیموں کے قیام کو غیر ضروری خلط مبحث قرار دیا گیا۔ اس دلیل کی بنیاد پر کہ خود کانگریسی نظام ان "ضعفاء فی الارض" کا متولی ہے۔

خلیفۂ قادیان کی اس "ڈرامائی" لب کشائی کی ماہیت اور نیت کا جائزہ غالباً رائے عامہ کا بیتاب مطالبہ ہوگا! پہلے یہ سُن لیجئے ——— یا اسے اپنے حافظے میں تازہ کر لیجئے! ——— کہ مولینا حبیب الرحمٰن صاحب صدر مجلس احرار ہند نے مرزا محمود کے اس اعلان و اقدام پر کیا بیان شائع فرمایا ہے،

اس ماجرے کی پوری بوالعجبی اور صاحبزادہ صاحب کی ساری مظہر العجائبی کو مع اُس کے تمام غیر متوقع تغیرات کے امکانات کے تسلیم کرتے ہوئے ہم یہ جرأت بھی محسوس کرتے ہیں کہ شاید ہم قادیان کے اس نسخ شریعۃ کی "تاویل" کر سکتے ہیں! پھر یہ ہماری کوئی دُور کی کوڑی بھی نہ سمجھی جانی چاہئے! ہمارے خیال میں یہ ایک "تل اوٹ پہاڑ" والی نظیر ہے! قادیانی نبوت، بقول اقبال کے حقیقۃً اک سیاسی فتنے کا ظہور تھی، جس کا سرچشمۂ الہام عرش و کرسی نہ تھے، شملہ و لندن تھے! اور جس کے پیامبر جبریلِ امین نہ تھے، بلکہ پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے وسیسہ کار برطانوی افسر تھے!! جس کی غایت الغایات نجاتِ اُخروی نہ تھی، "فلاحِ دنیوی" تھی! جس کا نصب العین مسلمانانِ ہند کو از سر نو "عباد اللہ" بنانا نہ تھا، برٹش راج کی "وفادار رعایا" کی شکل میں اُنھیں ڈھال دینا تھا! ------- جس رسالت و شریعت کا سارا "الہامی پس منظر" یہ رہا ہو، اُس کے ہاں "پیر کے شجرے" کا جزوی یا کلّی نسخ و مسخ اک "بدعتِ حسنۂ عظیمہ" ہونا چاہئے! ایسے سیاسی ادیان اصولاً ارضی و مادی طاغوتوں کے ساتھ "یا بدستِ دگرے دست بدستِ دگرے" ہوا کرتے ہیں! پس اول الذکر کے اندر انتقالِ اقتدار کا کوئی حقیقی انقلاب معاً آخر الذکر کی صفوف میں

اک روحانی محاذ کی تبدیلی کا پیش خیمہ بن جایا کرتا ہے! اب یہ اک رازِ فاش ہے کہ براعظمِ ہند کی سرزمین اک صفِ اول کے سیاسی انقلاب کی "مہبط" بن رہی ہے، پس "رندِ ہزار شیوہ" کو "طاعتِ حق" سے کیا گریز ہو سکتا ہے؟!

تاہم سوال یہ ہے کہ "صنم" کانگریس اپنی "محرابِ سجدہ" میں اک ناصیۂ "مشترک" کو قبول کرنے کے لئے تیار بھی ہو گا؟!

بلاشبہ "پیرِ مغان" کانگریس کے سامنے قادیان کے "نو مرید" کا (بروایتِ مولانا حبیب الرحمٰن احراری) "پنجاہ سالہ اعمال نامہ" موجود ہے، لیکن ہمارا خیال ہے کہ کانگریس شاید غلطی کرے گی، اگر "توحید فی الایمان" کی شرط پر ضرورت سے زیادہ زور دے گی؛ خود سابقہ "خدائے قادیان" کو بھی یہ "مقامِ محمود" نصیب نہ تھا؛ وہاں بھی "طاعت میں مئے و انگبین کی لاگ" تھی؛ یہاں بھی "حلوے مانڈے کا ڈھنگ" ہے! اگر اول الذکر چیز سابقہ تعلق کو "اخلاص فی الدین" بخش سکتی تھی، تو آخر الذکر مواد سے بھی اِس جنس کی تخلیق کیوں نہیں ہو سکتی؟! ــــ ہمارا خیال ہے کہ اپنی قوم، اپنی مرزبوم، آزادی و سربلندی کا فطری مذاقِ انسانی، اور اِس دوسرے سودے میں بر اصل بہتر "فتوحِ روح" کے اسباب، اِن نو واردانِ "کاشیِ کانگریس" کے قلوب میں نئے مسلک کے لئے بہتر "شرحِ صدر" کے محرکات بہم پہنچائیں گے!!

تاہم ہمارا باادب مشورہ ہے کہ ابھی اک مختصر مدت تک اک "دورِ عبوری" کو تسلیم کرنا چاہیئے! اس درمیانی وقفے میں ہم اِن "یَدْخُلُونَ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا" کا خیر مقدم تو پوری ہمت افزائی سے کریں گے۔ لیکن اگر اِن مہربانوں نے اپنا رُعب زیادہ جمایا تو ہم چپکے سے اُن کے کان میں اِتنا عرض کریں گے، کہ "لَا تُؤْمِنُوْا! بَلْ تُسْلِمُوْا!!" ــــ بہر حال ع

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ!!

(ا۔ ا۔ خ)

یورپ!

فرانس نے اپنی شکست رگی سے، اور انگلستان نے اپنی مخصوص سرد مہری سے، اسپین کو، حبش کے بعد، "ہنگِ اطالیہ" مسولینی، کا صیدِ زبوں بنتے دیکھنا گوارا کیا، لیکن براعظم کی دو سرخیل سلطنتوں کی یہ مہیب فرض فراموشی اپنے نتائج کے دوسرے ہی قدم پر خود اُنہی کے لئے اک خطرناک کیفر کردار نکلی!

ہمارا روئے سخن اس حقیقت کی طرف ہے کہ یورپ کے برّو بحر میں اٹلی و جرمنی کو اک دورِ ہیبت انگیزی برپا کر دینے کا "لیسنس" ملنے کے بعد اُنہوں نے مہذب دُنیا کے اِس گوشے کو اپنی بے پناہ ترکتاز کی اک مستقل جولانگاہ ہی بنا لیا، جس کا سنگین ترین نتیجۂ آخریں یہ ہے کہ بحرالروم اب اٹلی اور جرمنی کی بحری قزاقی کی اک آسان "بازیگاہ" بن گیا ہے!! فرانس اور بالخصوص انگلستان کے لئے یہ موت و حیات کا اک مسئلہ ہو جانے والا ہے!

بحرالروم اِن دونوں "عالمگیر قیصری نظاموں" میں بمنزلہ "شہ رگ" کے ہے، جو اگر مسولینی و ہٹلر کے "تحت البحرون" کی پوری زد میں آجائے تو شاید قبل اِس کے کہ ہسپانوی جمہوریہ، اٹلی و جرمنی کی شکار بنے، فرانس و برطانیہ کے کوہ پیکر "فیلانِ قیصریت" مفلوج و پابزنجیر ہو کر رہ جائیں گے!!

گزشتہ ماہ کے یورپی شطرنجِ سیاست کی بساط کا یہی نقشہ تھا کہ اُسے دیکھ کر "ستیاگرہ کے فرنگستانی بھگت" ــــ انگلستان! ــــ کے "صبرِ ایوب" نے بھی جواب دیدیا؛ فرانس بھی حسبِ معمول لرزاں و ترساں اپنے اِسی "اخیٔ طریقت" کے پہلو میں موجود تھا! اب "نیان کانفرنس" وہ محفلِ صلح و آشتی تھی، جس پر اسپین و بحرالروم کے فاسستی و نازی "ترکانِ خوانِ یغما" کو دعوت دی گئی! "عقابِ رومہ" بھلا اِس "دامِ نرم" میں کب آنے والا تھا! نتیجہ یہ ہوا کہ "انجمنِ نیان" اک "مُردہ نو مولود" ثابت ہوئی! تاہم انگلستان کے پاس دوسرا افسون "غیر جنبہ داری کمیٹی" کا تھا، جس میں مسولینی بخوشی آگیا! یقیناً اِس باہمی اتفاق و اجتماع کا حشر بھی "نشستند و گفتند و برخاستند" ہی ہونے والا ہے، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ انگلستان اب اپنی جانبری کا اِسے آخری ممکن موقع و مہلت سمجھ چکا ہے! مسٹر ایڈن، برطانوی وزیر خارجہ، کا یہ اعلان کہ "اگر اِس مجوزہ گفت و شنیدِ مصالحت کا سقوط یا جمود ظہور میں آیا تو قضیۂ ہسپانیہ کے معاملے میں متعلقہ حکومتیں اپنی اپنی آزادیٔ عمل کو مُباح سمجھیں گی!" بڑا معنی خیز اور خطرات سے لبریز اک انتباہ ہے! ــــ اِس کے معنی کم از کم اسپین کے اکھاڑے میں اٹلی، جرمنی، اور روس کی کھلی، آرپار زور آزمائی کے ہیں! اِس معرکۂ یگانہ اور یورپ کے اک "بین البراعظمی" محاربۂ عظیم میں برائے نام ہی خلا یا زمانی وقفہ ہو گا! انگلستان، مسٹر ایڈن کی زبانی سے، جب اس عمومیت پذیر "آتش زدگی" کا خیر مقدم کر رہا ہے تو یہ امر

اک نتیجۂ صریح ہے کہ وہ خود بھی اِس خونی غسل کے "ہمان" میں "اشنان" کرنے کی نیت باندھ چکا ہے! برطانیہ کو اپنے سابقۂ طویل و مبسوط تجربے کے بعد اب یہ شرح صدر حاصل ہو چکا ہے کہ یورپ کے اُفق پر عرصے سے جنگ کا جو ابرِ غلیظ" چھایا ہوا ہے وہ غالباً اک لمعۂ "برقِ شمشیر ہی سے چھٹیگا! مسٹر ایڈن کی حوصلہ مندی اک نعرۂ تحسین کی مستحق بنی جب کہ اُنھوں نے اِسی زیرِ ذکر موقعے پر اِس ترکی بہ ترکی انداز کے آغاز کرنے کا اعلان کیا کہ "اگر ہمیں آئینِ جمہوریت کا قرار واقعی تحفظ کرنا ہے تو ہمیں بھی اُس کے لئے "تیغوں کا وہی سایہ" بہم پہنچانا پڑے گا جو" دوسرے مذاہبِ سیاست" کے علمبردار اپنی طرف سے قبل ازیں بہم پہنچا چکے ہیں!" ؎

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز

آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر!

تا حَدِّ قریب میں برطانیہ کی پالیسی اِن اُمور میں جیسی مذبذب رہی ہو وہ ناظرینِ سیاسیاتِ عالم کی اِس تشنگیٔ نظر کی حسرت رکھتی تھی کہ ع

معشوقیٔ و بیحوصلگی طرفہ بلا ہے!

واقعہ یہ ہے کہ انگلستان "بین الیوروپی توازنِ طاقت" میں مُدت سے اک مرکزِ ثقل بنا رہا ہے، پس جب وہ متزلزل ہوا تو لامحالہ اک "بین الاقوامی زلزلۃ الارض" وقوع میں آنا شروع ہوا! اب قبل اِس کے کہ یورپ میں انگلستان کی "ٹھکرائی" کی چوپال مُنہدم ہو وہ اپنی "موروثی دخیل کاری" کے قیام کے لئے نوظہور حریفوں پر اک ضرب کاری لگانا چاہتا ہے! پھر چاہے "تختِ سلطنت" ہو یا "تختۂ تابوت"!! ع

ہو چکے حشر کہیں قصہ بہ یکسو اپنا!

(ا۔ ا۔ غ)

اشارۂ مشیّت!

خدا گواہ کہ منشا ہے یہ مشیت کا　　کہ ہر نظام کے ہمراہ ابتری بھی رہے

موحدوں کو رہے اختیارِ بت شکنی　　برہمنوں کے لئے اذنِ آذری بھی رہے

طلسمِ کوثر و تسنیم بھی نہو باطل　　شرابِ ناب کی موجِ فسونگری بھی رہے

حدیثِ طاعت و آیاتِ حق کے دوش بدوش　　زمیں پہ کفر و بغاوت کی شاعری بھی رہے

فسوں طرازیٔ والّیل کے تقابل کو　　کرشمہ سازیٔ گیسوئے دلبری بھی رہے

شعارِ عجز و سرِ انکسار کے ہمراہ　　سرشتِ حضرتِ انساں میں خودسری بھی رہے

مذاقِ بندگی و ذوقِ سجدہ کے باوصف　　مزاجِ آدمِ خاکی میں داوری بھی رہے

غرضکہ حکمِ مشیت یہ ہے کہ دنیا میں

پیمبری بھی رہے اور کافری بھی رہے

جوش

نقد و نظر!

ادارہ

(۱) عصامی نامہ } عام کتابی تقطیع، ضخامت ۴۰ صفحات، کاغذ و کتابت اعلیٰ، طباعت بلاک کی، شائع کردہ اونیورسٹیہ مدراس

سید یوشع صاحب بی اے (علیگ) حیدر آبادی، جونیئر لیکچرار فارسی، مدراس یونیورسٹی، کا یہ اک منظوم "خراج تحسین" ہے منظوم "فتوح السلاطین" کے لئے، جو اک فارسی جنگنامہ ہے اسلامی فتح ہند کا، اور جس کا مصنف عصامی ہے!

فتوح السلاطین اک عظیم رزمیہ ہے جو کم و بیش چھ صدیوں سے اک "مہر زدہ کتاب" کی حیثیت سے رہی ہے! عصامی کے پورے نام کا سراغ نہ لگ سکا، جو کچھ حالات و واقعات دستیاب ہوئے ہیں، حسب ذیل ہیں۔

عصامی بمقام دہلی ۱۳۱۱ء میں پیدا ہوا۔ اُس کے مورثانِ اعلیٰ میں سے ایک شخص نعمان بن منذر کا حاجب رہ چکا ہے! عصامی کے اجداد میں سے ایک بزرگ، فخر الملک، آخری خلفائے عباسیہ کے اک وزیر تھے، پھر اسلامی ہندوستان میں منتقل ہو کر وہ سلطان التمش کے دربار میں اسی منصب عالی پر فائز ہوئے! عصامی کے دادا، عز الدین عصامی، عہد بلبن کے اک سپہ سالار تھے، سلطان محمد تغلق کے ڈکٹیٹرانہ فرمانِ انتقالِ پایۂ تخت از دہلی بہ دیوگری کے ہنگامۂ حشر و نشر میں یہ بوڑھا نوے سالہ سر عسکر اول منزل ہی پر جاں بحق ہو گیا! عصامی، غالباً حالتِ یتیمی میں، اور ۱۶ سال کی کمسنی میں، افتاں و خیزاں، دولت آباد پہنچا! اور چار و ناچار وہاں توطن گزین ہو گیا!

۴۲ سال تک عصامی سلطان تغلق کی جنون سامانیوں اور شہر آشوبیوں کا خون در جگر عینی شاہد بنا رہا۔ یہاں تک کہ ۵۰ھ/۱۳۴۹ء میں ان مناظر و حوادث سے برداشتہ خاطر ہو کر مکۂ معظمہ کے "بلداً آمناً" کو ہجرت کر گیا! عصامی چونکہ ننگ تعلق سے قطعاً آزاد اک غیر متاہل زندگی بسر کرتا تھا، اس لئے اس کے لئے ترک وطن کا یہ طویل انقلابی اقدام چنداں پُر ابتلا نہ ثابت ہوا، لیکن دکن و ہند کو خیر باد کہتے ہوئے وہ اپنی اک زندۂ جاوید نشانی اس سرزمین میں چھوڑ گیا! ہمارا اشارہ الیہ یہی "ہندوستانی شاہنامہ" ——— فتوح السلاطین ——— ہے! لیکن افسوس ہے کہ عصامی کے پورے دو دیوان دولت آباد کی تاراجی کی نذر ہوئے!

قاضی القضاۃ، بہاء الدین دولت آبادی، نے عصامی کو سلطان علاء الدین حسن بہمنی (۱۳۴۷ء-۵۹ھ) بانیٔ دولتِ بہمنیہ، کے دربار میں پیش کیا، اور سب کی مشترک تجویز پر عصامی کے ہاتھوں، ہندوستان کی اسلامی فتح (از محمود غزنوی تا حسن بہمنی!) کا یہ جنگنامہ لکھا جانا شروع ہوا، جو ۲۷ رمضان المبارک ۵۰ھ کو افتتاح پذیر ہو کر ۵ ماہ ۹ روز میں تمت بالخیر کو پہنچا! رزمیۂ مذکور بارہ ہزار ابیات پر مشتمل ہے!

یہ مثنوی نہایت فصیح و سلیس فارسی میں لکھی گئی ہے۔ شاعرانہ و مورخانہ ہر دو اعتبار سے وہ اک ممتاز پارۂ ادب ہے! عصامی اپنی تاریخی روایت کے بیان میں جابجا اپنے ذاتی تجربات اور اپنے داخلی جذبات کی طرف بھی اشارے کرتا جاتا ہے، اور اس طرح قیمتی عبرت و انتباہ کے روشن شرارے بکھیرتا جاتا ہے۔

"فتوح السلاطین" اپنے پورے متن میں "ایڈٹ" ہو کر عنقریب مدراس

یونیورسٹی کی طرف سے شائع ہونے والی ہے! سید یوشع صاحب کی یہ "ریسرچ" بہایت نادر و قابلِ داد ہے۔ (ا-ا-خ)

(۲) **ہدیۂ اخلاص بحضرتِ اقبال** } از محمد یحییٰ صاحب اعظم گڈھی مع مختصر تعارف از جناب عبد اللطیف صاحب اعظمی، رُکن مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر۔ اعظم گڈھ — تقریباً جیبی تقطیع۔ ضخامت ۲۴ صفحات، قیمت ۲ر بہ پتۂ بالا!

جناب محمد یحییٰ صاحب نے حضرتِ اقبال پر یہ منظوم تنقید ۱۹۳۴ء میں لکھی تھی، جو سال مذکور ہی کے اختتامی مہینے میں رسالۂ جامعہ، دہلی، میں شائع بھی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ناقدِ موصوف کا یہ کوئی آنی وفانی لمحۂ استقامت و لغاوت تھا جس کی طوفانی آمد و شد کے بعد وہ اس اُفتادِ بد کے خمیازہ کش بنے ع

کہ زود آخر شود ایں نشہ و من در خمار اُفتم!

چنانچہ اس "خطاب بہ شاعرِ حکیمِ ہند" کے بعد اُس کا "کفارۂ گناہ" (بالفاظ اعظمی صاحب!) وہ اک دوسری نظم — "شاعرِ مشرق اور فلسفۂ حیاتِ ملی" (داخل کتابچۂ زیرِ نقد، بطور ضمیمہ!) — کی تسوید سے فرماتے ہیں! ہم اس توبہ و انابت کی داد مبارکباد بجز اُس کے کس طرح دے سکتے ہیں، کہ ؎

دھمکی میں مرگیا جو نہ مردِ نبرد تھا

عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا!

"خطاب بہ شاعرِ حکیمِ ہند" کلیم کے مقالہ نگار المتخلص بہ "کشاف" (محررِ مضمونِ "اقبال و پیامِ اقبال" در جون جولائی مشترک نمبر کلیم) کا اچھا ہمصفیر ہوتا، لیکن اب تو "مصنفِ خطاب" اُس کی دوبارہ اشاعت بصورتِ کتاب سے بھی خائف ہیں! ؎

کیا غمخوار نے رُسوا، لگے آگ اِس محبت کو

نہ لائے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیونؑ!

"خطاب بشاعر" کے بعد "شاعرِ مشرق" علانیہ اک "خود رافضیحت" کی نظیر ہے! ہمارا خیال ہے اول الذکر حصۂ کتاب آج بھی عملاً ناقابلِ رجوع ہے! منقولۂ ذیل ابیات ملاحظہ ہوں:

بال تگرائے فیلسوف و شاعرِ جادو طراز — تیری خدمت میں مری اک عرض ہے باصد نیاز

یہ گہرہائے درخشاں صرف تیرے قال ہیں — تیری فطرت کے رُخِ روشن کے خط و خال ہیں

دوسرا رُخ ہے ابھی تک تشنۂ بحث و نظر — اک نظر اس پر بھی ہاں تیری اجازت ہو اگر!

بارگاہِ علم میں گر ہو یہ گستاخی معاف — تیری دنیائے عمل کا بھی ذرا کرلوں طواف!

آہ یہ نظارہ ہے میرے لئے صبر آزما! — یہ تماشا دیدۂ بینا کو ہے عبرت فزا!

دیکھتا کیا ہوں کہ ہے اک دشتِ ناپیدا کنار — جس میں کوسوں تک نہیں ملتا نشانِ سبزہ زار

کارواں کیا، مل نہیں سکتا یہاں اک نقشِ پا! — یہ زمیں ہے آج تک بیگانۂ بانگِ درا

راہبر کوئی یہاں محوِ سبک رانی نہیں — کوئی اعرابی یہاں وقفِ حُدی خوانی نہیں!

کچھ نظر آتے نہیں ہیں اسمیں آثارِ حیات — کوئی ذرہ تک نہیں سرگرمِ پیکارِ حیات!

رُخ اِدھر کرتا نہیں ابرِ گہربارِ حیات — نامیہ یاں ہو نہیں سکتا ہے "معمارِ حیات"

زندگی اس دشت میں ہے مرثیہ خوانِ خودی — خاک و خوں میں لوٹتا ہے بسمِ بیمانِ خودی

ہے یہاں کا ذرہ ذرہ سوگوارِ زندگی — اس زمیں کا چپہ چپہ ہے مزارِ زندگی!

ذوقِ بیداری یہاں پامال ہی مجروح ہے — رُوحِ آزادی یہاں مغلوب ہے مفتوح ہے

اِس سرابستاں میں کیسی جستجوئے زندگی؟ — جرم ہے یاں لب پہ لانا گفتگوئے زندگی

اس دیارِ خواب و خور میں زہر ہے جوشِ عمل — اِس خراباتِ وفا میں ننگ ہے ہوشِ عمل

کیا اُٹھے اس خاکِ دامنگیر میں پائے طلب! — آکے یاں کھویا گیا خود جادہ پیمائے طلب!

جس کے نغمے تھے نقیبِ مقدمِ فصلِ بہار — آہ وہ مرغِ چمن اب ہے خزاں کا سوگوار

برق کو جس نے سکھائی شوخیٔ طرزِ خرام — اُف کہ وہ خود منزلِ ہستی میں ہے اب سست گام

رہبری کرتا تھا سوئے عرش جس کا نقشِ پا — آہ اب وہ جا رہا ہے جانبِ تحت الثریٰ!

جس کے نغموں نے دیا تھا درسِ آزادی ہمیں — کر دیا تھا آشنائے ذوقِ "صیادی" ہمیں

اب عمل سے دے رہا ہے وہ غلامی کا سبق — شعلۂ رقصاں کو آہستہ خرامی کا سبق!

جس نے سکھلائے تھے اندازِ سناں بوسی ہمیں — دے رہا ہے اب وہ درسِ "آستاں بوسی" ہمیں!

جو پڑھاتا تھا "صداقت کا عدالت کا سبق" — جو ہمیں دیتا تھا "دنیا کی امامت" کا سبق

مل رہا ہے اب اُسی سے ضعفِ ہمت کا سبق — دے رہا ہے اب وہی فسخِ عزیمت کا سبق!

اے بہارِ باغِ ملت، طوطیٔ گلزارِ ہند! — آفتابِ اوجِ مشرق، یوسفِ بازارِ ہند

آج مسجودِ نظر ہے تیرا "ہر فیضِ قلم" — کیوں نہ تڑپے دل؟ غلط اُٹھے اگر تیرا قدم"!

نکتہ چینی یہ نہیں، اک داستانِ غم ہے یہ — آبروئے ملتِ اسلام کا ماتم ہے یہ!

اب "شاعرِ مشرق اور فلسفۂ حیاتِ ملی" والی اِس نرم و نیگرم معذرت کی ٹسک انجامی کو دیکھئے:

گاہ تیری آہِ سوزاں کے شرار — زندگی کے قصر کے نقش و نگار!

گاہ پہنچا تا سرِ عرشِ بریں | تیرا شورِ لا اُحِبُّ الآفلین!
آہ! پھر بھی اُمتِ خیر البشر | ہے مئے غفلت سے مست و بے خبر!
ہے وہی شغلِ مئے و مینا و جام | منتشر شیرازۂ ملت تمام!
بے نظامِ دیں سے سرتابی وہی | اب بھی طاری ہے گراں خوابی وہی
لذتِ آہِ سحر گاہی نہیں! | خود شناسی و خود آگاہی نہیں!
آہ کیا اس ملتِ خوابیدہ کو | آہ کیا اب مسلمِ شوریدہ کو
حاجتِ پیغمبر و جبریل ہے | انتظارِ صورِ اسرافیل ہے؟
اے خدا! اس عندلیبِ زار کو | گلشنِ مشرق کے خوش گفتار کو
آرزوئے حال و استقبال کو | ملتِ اسلام کے اقبالؔ کو

فطرتِ برق و شرر کر دے عطا
اور بھی "سوزِ جگر" کر دے عطا

ہم محمد یحییٰ صاحب کی اُس نقادانہ یلغار اور اِس سر فگندگانہ رجعتِ قہقری پر جوشؔ کی اِس رُباعی سے بڑھ کر کسی اور پیرائے میں محاکمہ نہیں کر سکتے کہ:

بگڑی ہوئی عقل سے حماقت بہتر | دھوکے کی محبت سے عداوت بہتر
شیطان و ابو جہل کی عظمت کی قسم! | سو بار غلامی سے بغاوت بہتر!

(ا۔ا۔خ)

(۳) ندیم، گیا } چوڑا رسالجاتی سائز، ضخامت ۰۷ صفحات، کاغذ اچھا سفید چکنا، کتابت و طباعت عمدہ، مع اک تصویر آرٹ پیپر پر۔

رسالۂ ندیم گیا ۵ سال سے صوبۂ بہار میں اُردو زبان اور اسلامی ثقافت کا مشہور علمبردار ہے! لیکن مسرت بالائے مسرت یہ ہے کہ اب وہ اک اصلاح کے دور سے گزر رہا ہے جس کا سب سے بڑا طغرائے امتیاز نامور ندوی فاضل، سید ریاست علی ندوی کے ہاتھوں میں اُس کی عنانِ ادارت کا انتقال ہے! اس جدید نظم و نسق کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم ندیم پر اک یکسر انقلاب طاری ہوتا ہوا پاتے ہیں! آج ندیم گیا اگر معارفِ اعظم گڑھ کا ہمپلہ نہیں۔ اپنی موجودہ حالت و ہیئت میں ندیم عملاً اک نیا اور بلند پایہ صحیفۂ علم و ادب ہے! جو لوگ اُس کے سابقہ دور کے واقف اور اُس کی بنا پر اُس سے کسی قدر غیر مطمئن رہے ہیں، وہ اِسے اپنے جدید پیکر میں دیکھیں، اور ہمارا دعویٰ ہے کہ وہ بے اختیار اُس کا خیر مقدم کریں گے۔

رسالے کے زیرِ نظر نمبر (بابۃ ستمبر ۱۹۳۴ء) کے "شذرات" میں، صوبۂ بہار کے اندر ماضیٔ قریب کی اردو ہندی نزاع کی روداد، اور "مقالات" میں "دو ہفتے میسور و مدراس میں" (از مولٰنا سید سلیمان ندوی) اور "دورِ عباسیہ کا اخلاقی اثر علوم و فنون پر" (از خامۂ جناب عبد السلام ندوی) گرانقدر نگارشیں ہیں۔ "میرا اعمالنامہ" (پروفیسر محمد مسلم) ممتاز اخلاقی افسانہ ہے،

حصۂ نظم میں سہیلؔ کی "تابشیں" اور شمیمؔ کی "نگہت بیزیاں" جنتِ نظارہ اور فردوس شامہ ہیں!

شروع میں میاں نظیرؔ اکبر آبادی کے زبان زدِ خاص و عام ترجیع بند "سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلیگا بنجارا!" کے اسی ٹیپ کے مصرعے کو اک فلاکت و ہلاکتِ مجسم درویشِ مُغنّی کے سراپے میں جس مصوّرانہ کمال سے منتقل کیا گیا ہے اُس نے اس آفاقی عبرت کو چند نقوش و سطور کے اندر مرکوز کر دیا ہے! اس کامیاب مُرقعے کی طرازش پر جناب مُصوّر کو، اور اُس کے انتخاب و اشاعت پر حضرتِ مُدیر کو ہم تہ دل سے مبارکباد پیش کرتے ہیں!

الغرض ندیم گیا ہماری خلوتِ ادبی کا مستقل "ندیم" ہونا چاہیئے!

(ا۔ا۔خ)

[illegible]

(جوشؔ)

کلیم کے ایجنٹ

دہلی کے علاوہ کلیم کہاں کہاں سے ملسکتا ہے؟

۱۔ عبدالرزاق صاحب نمبر ۷۶ کولوٹولا اسٹریٹ کلکتہ
۲۔ رحمت اللہ صاحب نمبر ۳ بینٹنگ اسٹریٹ کلکتہ
۳۔ علی رضا صاحب ایجنٹ ریلوے سٹیشن ہادرا
۴۔ عبدالرزاق صاحب نظامی نمبر ۱۷۲ بارسٹریٹ پوسٹ نمبر ۳۰ رنگون
۵۔ مکتبہ ابراہیمیہ۔ عابد روڈ حیدرآباد دکن
۶۔ صادق کمیشن ایجنسی قصہ خوانی پشاور
۷۔ سید محمود صاحب فردوسی بک ڈپو۔ اولڈ ہوز پور روڈ بنگلور چھاؤنی
۸۔ نورالدین صاحب کامل ایجنٹ اجین۔ گوالیار
۹۔ حبیبی میاں صاحب نیوز ایجنٹ آرہ شاہ آباد
۱۰۔ پریمیر بک ڈپو ھیسٹنگ سٹریٹ ملتان چھاؤنی
۱۱۔ مسعود احمد صاحب انصاری ملتان
۱۲۔ ربانی نیوز ایجنسی اورچھا دروازہ جھانسی
۱۳۔ عبدالغنی صاحب ایجنٹ اخبارات لائل پور
۱۴۔ ہلیقہ اینڈ الیغی شنسی شملہ
۱۵۔ سعید بک ایجنسی بھوپال
۱۶۔ محمد عمر خاں صاحب نیوز ایجنٹ کالج بک سٹال لاہور
۱۷۔ دیوان چند صاحب نارنگ سرگودھا
۱۸۔ ناردرن انڈیا پبلسٹی سروس امرتسر
۱۹۔ میسرز فضل الہٰی اینڈ سنز نیوز ایجنسی پشاور
۲۰۔ کازموپولٹین نیوز ایجنسی میرٹھ۔

شاعر کی راتیں

شاعرِ انقلاب نے چند راتوں کی مختلف کیفیتوں کو اپنے خاص وجد آفریں اور کیف آور انداز میں بیان کیا ہے، جنھیں پڑھ کر ہر شخص اپنے آپ کو اسی ماحول میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ راتوں کی تفصیل حسبِ ذیل ہے

مست رات	بدمست رات	راز و نیاز کی رات	انتظار کی رات
اندھیری رات	چاندنی رات	جدائی کی رات	تصورات کی رات
التفات کی رات	جدائی کی رات	اشکوں کی رات	برسات کی رات
ربودگی کی رات	بیخودی کی رات	سرشار رات	بھیگی ہوئی رات
تصورات کی رات	بیچین رات	پیا بن ناگن کالی رات	

قیمت صرف آٹھ آنے

کلیم بک ڈپو، جینتی نواس ۲۵، دریا گنج، دہلی

پیغمبرِ اسلام

خواجۂ دو جہاں سرورِ کائنات آنحضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور رسالت پر شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی کا وہ غیر فانی شہ پارہ جس کی رفعت و عظمت کے سامنے قصرِ کفر سرنگوں ہوتا ہے۔ ثبوتِ پیغمبری کے باب میں اس لافانی شاہکار کے انوکھے استدلال دل میں تیر کی طرح اترتے چلے جاتے ہیں، اس کے ازلی الہامات سے دماغ میں یزدانی نور سرایت کر جاتا ہے۔ اس کے دلائل قاطع کے سامنے ادراک منطق چھانٹنا بھول جاتا ہے ـــــ شاعرِ انقلاب پر جب ایک سرشاریت کا عالم طاری ہوا، اُسی وقت اُنھوں نے یہ نظم کہنا شروع کر دی۔ عالمِ بیخودی میں چار روز کی ریاضتِ شاقہ اور یکسوئی قلب سے جو کچھ حاصل ہوا صفحۂ قرطاس پر تحریر کیا گیا، جبتک یہ نظم مکمل نہ ہوئی حضرت جوش نے نہ کچھ کھایا نہ پیا اور نہ خلوت سے باہر تشریف لائے۔ قیمت صرف آٹھ آنے

کلیم بک ڈپو جینتی نواس نمبر ۲۵ دریا گنج، دہلی

شاعرِ انقلاب حضرتِ جوش ملیح آبادی

(کی)

چار پُرانی تصانیف

حضرت جوش نے ایک مدت ہوئی چار چھوٹے چھوٹے رسائل طبع کرائے تھے لیکن ان کی شاعرانہ بے نیازی نے اس کی اجازت نہ دی کہ اُنھیں شائع کرتے اتفاق سے یہ چیزیں میری نظر سے گذریں تو مناسب معلوم ہوا کہ اُن کی قیمت غیر معمولی طور پر کم کر کے اُنھیں شائقین کے ہاتھوں تک پہنچا دیا جائے۔

(۱) جذباتِ فطرت } حضرتِ جوش کی وہ معرکہ آرا نظم ہے، جس میں مظاہر قدرت کی طرف سے شعرائے اردو کی خدمت میں یہ اپیل کی گئی ہے کہ وہ پُرانی روش کو ترک کر دیں قیمت ۳ر رعایتی ۱ر

(۲) اوراقِ سحر } یہ حضرتِ جوش کے اُن لطیف چھوٹے چھوٹے جملوں کا مجموعہ ہے، جس میں سحر خیزی کے محاسن بہت لطیف پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت ۵ر رعایتی ۲ر

(۳) آوازۂ حق } یعنی معرکۂ تسلیم و رضا کے سب سے زبردست اور عدیم المثال ہیرو اور جنگِ حق و باطل کے سب سے بڑے سادنت حسینؑ ابنِ علیؑ کے خونِ ناحق اور صبر و استقلال کا ایک عظیم الشان مرقع اور آپ کی اخلاقی اور روحانی تعلیم کا ایک نہایت درخشاں آئینہ ہے۔ قیمت ۸ر رعایتی ۳ر

(۴) مقالاتِ زرّیں } یہ حضرتِ جوش کے نادر کلمات، فلسفیانہ اقوال اور ادبی لطائف کا دلچسپ اور کارآمد مجموعہ ہے۔ قیمت ۱۱ر رعایتی ۴ر

پورے سٹ کی رعایتی قیمت ۱۰ر محصول ڈاک ۲ر روی۔ پی منگانے کی زحمت نہ فرمائیں، بلکہ ڈاک کے ٹکٹ بھیج کر طلب کریں۔

ملنے کا پتہ

مینجر کلیم بک ڈپو، جینتی نواس نمبر ۲۵ دریا گنج دہلی

ذہنی اور سیاسی انقلاب

کا

پیغامبر

رسالہ کلیم دہلی

زیر ادارت

شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی

اگر واقعی آپ کی یہ دلی آرزو ہے کہ:—

(۱) آپ کے وطنِ عزیز کو پنڈتوں اور ملاؤں کے فساد سے نجات مل جائے۔

(۲) تقلید و رسوم کی عمارت پر حرّیتِ فکر و آزادیٔ خیال کا پھریرا لہرانے لگے۔

(۳) ہندو مسلم "انسان" بن کر، اپنے اتحاد کے ذریعے سے، ایک زندہ ہندوستانی قومیت کی بنیاد ڈال دیں۔

(۴) اور ہندوستان، غلامی کے طوقِ لعنت کو جس سے شیطان تک پناہ مانگتا ہے، اپنی گردن سے اُتار کر پھینک دے—

تو

پہلی فرصت میں کلیم کے خریدار بن جائیے

منیجر کلیم۔ چیمبر لاس، دریا گنج، دہلی

اطلاع

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر ضرور لکھئے، اور جواب طلب امور کے لئے ۱ر ٹکٹ ارسال فرمائیے۔

پرچہ نہ ملنے کی اطلاع ہر مہینے کی دس تاریخ تک آجانی چاہیے۔ ورنہ پرچہ قیمتاً ارسال ہوگا۔

نمونے کے لئے ۵ر کے ٹکٹ ارسال فرمائیے۔

منیجر کلیم دہلی

بنام قوت و حیات

کلیم

آئے گا نہ جانے کب زمانہ اپنا
قدرت سے ملا ہے مجھکو صد حیف یہ حکم

آگے گئی صدیوں ہے فسانہ اپنا
بہروں کو سنائے جا ترانہ اپنا

دہلی

سالانہ چندہ چھ روپے
ششماہی چندہ تین روپے آٹھ آنے

منظور شدہ
گورنمنٹ میسور، و پٹیالہ، و ممالک محروسہ سرکار نظام

سہ ماہی چندہ دو روپے
قیمت فی پرچہ نو آنے

جلد (۴) ‖ فہرست مضامین بابتہ ماہ دسمبر ۱۹۳۷ء ‖ نمبر (۶)

جوش ملیح آبادی پرنٹر و پبلشر نے محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر کلیم جنتر منتر روڈ [illegible] سے شائع کیا

اشارات

مُدیر

خطرناک جماعتیں

"کلیم" کی کسی گزشتہ اشاعت میں غالباً عرض کیا جا چکا ہے کہ ہندوستان کے سے ملک اور بالخصوص ہندوستان کی موجودہ سیاسی بدبختی کے دورِ نحوست میں ہر اُس انجمن سے پناہ مانگنا چاہیئے جو وطنِ عزیز کی متحدہ قومیت کے اہم ترین اور تنہا مسئلے کو پسِ پشت ڈال کر کسی خاص طبقے، کسی خاص گروہ، اور کسی خاص فرقے کے "حقوق" کی خاطر عالمِ وجود میں آئی ہو ——

ہندوستان میں آزادی کا جذبہ کم سے کم اس مقدار شدت سے تو ضرور بیدار ہو چکا ہے کہ اب بڑے سے بڑا غدار بھی اِس کے خلاف علانیہ لب کشائی کی جُرأت نہیں کر سکتا —— اِس لئے آزادی کے دُشمنوں، اور اغیار کے دوستوں نے اپنی حسرتیں نکالنے کا راستہ یہ اختیار کیا ہے کہ مذہب کے نام پر اپنی اپنی جماعتیں اور ٹولیاں علیحدہ علیحدہ بنا ڈالی ہیں، اور اُن ٹولیوں کے منبروں سے یہ آوازیں بلند کی جاتی ہیں کہ کانگریس ہماری جماعت اور ہمارے مذہب کی دُشمن ہے۔ جب تک کانگریس ہماری جماعت کو ہمارے مذہب اور ہمارے "حقوق" کی سلامتی کی ضمانت نہیں دے دیگی، اُس وقت تک ہم اُس میں شریک نہیں ہوں گے۔

ہندوستان ہنوز اِس عبرتناک حد تک جاہل اور اندھا ہے کہ یہاں مذہبی کھیل نہایت آسانی کے ساتھ کھیلا جا سکتا ہے، اور مذہب کا نام لے کر یہاں کے انسان نما حیوان ایک دوسرے کا خُون بہانے پر نہایت ہی سہولت کے ساتھ آمادہ کئے جا سکتے ہیں —— اس بدبخت ہندوستان میں "اللہ اکبر" اور "شری رام چندر جی کی جے" وہ آلہ ہے جو ہماری مجموعی قوت کو آنِ واحد میں ریزہ ریزہ کر کے رکھ دینے کی طاقت رکھتا ہے ——

—— چنانچہ انھیں اُمور کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، وطن دشمن ہندوؤں اور مسلمانوں نے "ہندو مہاسبھا" اور "مسلم لیگ" کے ناموں سے اپنی اپنی ٹولیاں بنا رکھی ہیں۔ اور اپنے اپنے جاہلوں اور اندھوں کے دلوں میں یہ زہر اُتارنا شروع کر دیا ہے کہ کانگریس تمہارے مذہب، تمہارے تمدن اور تمہاری زبان کی دشمن ہے۔ خدارا تم اپنے کو منظم بناؤ، ورنہ کانگریس تمہیں اپنے معدے میں رکھ کر ہضم کر جائے گی —— مہاسبھائی اور لیگی حضرات عوام کے دل موہ لینے کی خاطر اپنی اپنی تقریروں میں ویدوں کے اشلوک اور قرآن کی آیتوں کو اِس بازیگرانہ چالاکی سے استعمال کرتے ہیں کہ بیچارے عوام کو فرقہ وارانہ جنون، اور بے بنیاد مذہبی جوش و خروش دیوانہ بنا دیتا ہے، اور اِس تمام قابلِ ملامت اُچھل کود کا مدعا جیسا کہ بارہا عرض کیا جا چکا ہے، صرف اِس قدر ہوتا ہے کہ کانگریس کو ضعیف، اور جذبۂ آزادی کو زنگ خوردہ بنا کر ہندوستان کو ایک مشترکہ و متفقہ محاذ پیدا ہونے کے تمام امکانات و مواقع سے یکسر محروم کر دیا جائے۔

تقریباً دو مہینے ہوئے کہ مہاسبھائیوں اور لیگیوں نے اپنے اپنے جلسے بڑے طمطراق سے منعقد کئے تھے، اور دونوں نے کانگریس کے خلاف خوب زہر اُگلا تھا —— لیکن کانگریس کے خلاف اِن دونوں کی مخالفت

کو غور سے دیکھنے کے بعد صاف نظر آتا ہے کہ یہ دونوں آپس میں ملے ہوئے ہیں، اور پہلے ہی سے سرگوشیاں کرکے اپنی اپنی تقریروں کے حدود معیّن کر لیتے ہیں۔

عجیب مزے کی بات ہے جس پر رونا بھی آتا ہے اور ہنسی بھی یعنی لیگ تو کانگریس سے اس لئے بیزار ہے کہ وہ مسلم کش ہے، اور مہاسبھا کانگریس سے اس لئے نافر ہے کہ وہ مسلم نواز واقع ہوئی ہے۔

• بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست!

اِن کہی بدیہی باتوں کو صرف گرگ تاریخ نہ سمجھ سکیں گے ———

ورنہ صاف ظاہر ہے کہ مہاسبھائیوں اور لیگیوں نے پہلے ہی سے یہ مشورہ کر لیا تھا کہ ہم کانگریس کے خلاف یہ یہ کہیں گے، اور تم کانگریس کے خلاف یہ یہ کہنا۔

معلوم نہیں اپنے قول میں مسلم لیگ سچی ہے کہ مہاسبھا ——— ان دونوں نے اسلام کو آڑ بنا رکھا ہے، ایک تو یہ کہتی ہے کہ کانگریس اسلام کی دشمن ہے، اور دوسری کہتی ہے کہ کانگریس اسلام کی دوست ہے۔ گویا بہ الفاظ دیگر اُس راہنما گروہ سے جس کا نام کانگریس ہے، یہ کہا جا رہا ہو کہ

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا

یہ "لیگیے" اور "سبھائی" کیا واقعی مسلمان اور ہندو ہیں؟ اور کیا واقعی یہ اُن کا مذہبی جذبہ ہے جو اُنھیں کانگریس میں داخل ہونے سے روک رہا ہے؟

مجھ سے اس کا جواب طلب نہ فرمائیے۔ ذرا ان دونوں کو قریب جا کر دیکھئے، آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ ان کا مذہب انھیں خدمت وطن سے روک رہا ہے یا اس خوشنما پردے کے پیچھے کوئی اور ہی جذبہ کام کر رہا ہے۔

مسلم لیگ، اور مہاسبھا کے ارکان کی زبانوں سے اکثر سُنا گیا ہے کہ ہم "مسلمان" اور "ہندو" پہلے ہیں، اور "ہندوستانی" بعد کو۔ بات یہ ہے کہ اپنے کو ہندو یا مسلم کہنے میں کسی قسم کا خطرہ پیدا ہوتا ہی نہیں۔ لیکن اگر اس کے عوض اپنے کو ہندوستانی کہا جائے تو یہ قول ایک آن واحد میں سینکڑوں فرائض اور بے شمار خطرے پیدا کر دیتا ہے۔ جن کا یہ تن پرور ہندو مسلمان مقابلہ نہیں کر سکتے۔

سب جانتے ہیں کہ "ہندوؤں" اور "مسلمانوں" کو کوئی نہیں پکڑتا، لیکن "ہندوستانیوں" کو ہر وقت دار و رسن کا سامنا رہتا ہے، کیونکہ اپنے کو ہندوستانی وہی کہے گا جو ہندوستان کو ایک متحدہ قومیت کے ذریعے سے نجات دلانے کی ٹھان لے گا، اور ظاہر ہے کہ کسی ملک کو نجات دلانے کی راہ میں سب سے پہلی شرط یہ ہوتی ہے کہ کفن سر سے باندھ لیا جائے۔

اِس کے علاوہ اپنے کو مسلم یا ہندو پہلے، اور ہندوستانی بعد کو کہنا جغرافی صداقت، اور فطری قانون کے بھی خلاف ہے ——— یہ بات مدرسے کے طلاب تک کو معلوم ہے کہ مذہب، نام ہے عقائد کے ایک مجموعے کا، کوئی بچہ مذہب یا عقاید کے کسی مجموعے کو ماں کے پیٹ سے لے کر پیدا نہیں ہوتا، اور ہر وقت اُسے اِس کی آزادی حاصل رہتی ہے کہ جس لمحے اُس کا جی چاہے اپنے عقائد کو تبدیل کرکے اُن سے منحرف ہو جائے۔ یعنی یہ بات ہر وقت، ہر لحظہ، اور ہر آن ہمارے اختیار میں ہے کہ ہم اپنا مذہب تبدیل کرکے دوسرا مذہب اختیار کر لیں۔

آج جو شخص اپنے کو ہندو کہہ رہا ہے، کل بہت ممکن ہے کہ وہ مسلمان بن جائے۔ اسی طرح آج جو اپنے کو مسلمان کہہ رہا ہے، کل بہت ممکن ہے کہ وہ ہندو ہو جائے۔ لیکن ہم ہندوستان کے تمام و کمال تینتیس کروڑ عیسائیوں، پارسیوں، ہندوؤں اور مسلمانوں میں سے ایک فرد کی بھی یہ مجال نہیں ہے کہ وہ ہندوستانیت کو ترک کرکے انگریز یا فرانسیسی بن جائے۔

ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ قومیت و وطنیت ایک ایسی قدرتی چیز ہے جس کا تبدیل کر دینا طاقت بشری سے خارج ہے ——— اور اسی بنا پر کسی کا یہ کہنا کہ میں ہندو یا مسلمان پہلے ہوں، اور ہندوستانی بعد کو ہوں، ایک ایسی بات ہے جس کا نہ تو جغرافی صداقت ہی ساتھ دے سکتی ہے، نہ فطری قانون ———

مذہب، زیادہ سے زیادہ ایک ذہنی لباس ہے، لیکن قومیت اور وطنیت تو ہمارے بدن کی جلد ہے، بدن کی جلد کیسی۔ قومیت تو ہمارا گوشت پوست، اور ہمارا ضمیر ہے۔ لباس تو ہر وقت بدلا جا سکتا ہے لیکن پوست اور ضمیر کو کون تبدیل کر سکتا ہے؟

لیکن کہا جائے تو کس سے کہا جائے، اور سمجھایا جائے تو کیسے سمجھایا جائے؟

سوتے ہوئے کو تو جگا دینا بہت آسان ہے ۔ مگر جو جھوٹ موٹ سونے کا بہانہ کئے ہوئے پڑا ہو ، اُسے کون جگا سکتا ہے ۔

مسلم لیگ ، اور مہاسبھا کے ارکان کوئی بچے نہیں ہیں کہ انھیں مذہبیت و قومیت کا فرق بتایا جائے یا آزادی کی خوبیاں بیان کر کے انھیں غلامی سے نفرت دلائی جائے ۔

ان دونوں رجعت پسند جماعتوں کے ارباب حل و عقد سجھ بوجھ تمام باتوں کو سمجھتے ہیں ۔ اور دلوں میں اچھی طرح محسوس کرتے ہیں کہ وہ اپنی قوم کے واسطے ایک زبردست خطرہ بنے ہوئے ہیں ۔ لیکن خدا بھلا کرے ذاتی اغراض کا کہ وہ راہ راست پر آنے کی اجازت ہی نہیں دیتے ۔

میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مسلم لیگ اور مہاسبھا نے کانگریس میں اپنے شریک ہونے کے سلسلے میں جس قدر بھی شرطیں پیش کی ہیں ، وہ سب کی سب بے بنیاد اور فرضی ہیں ۔ اور یہ بھی میرا دعویٰ ہے کہ خود لیگ اور سبھا کے ارباب بست و کشاد بھی اپنی ان شرطوں کو پوچ اور لچر سمجھتے ہیں ، اور اُن پر محض اس لئے قائم ہیں کہ وہ ہندوستانیوں کی مجموعی قوت کے توڑنے میں اُن کا آلۂ کار بنی ہوئی ہیں ۔

میرا یہ ایمان ہے کہ کانگریس اگر آج "لیگ" اور "سبھا" کی تمام و کمال شرطیں ، ایک استثنیٰ کے بغیر بھی قبول کر لے ، پھر بھی خداوندانِ لیگ و سبھا ، کانگریس میں ہرگز شریک نہ ہوں گے اور جلد ہی جلد ہی جلسے کر کے دس ہزار ایسی نئی شرطیں پیش کر دیں گے جنھیں دنیا میں کوئی معقول انسان قبول ہی نہیں کر سکتا ۔

کاش کانگریس ، عقل و جرأت سے کام لے کر اتمام حجت کے واسطے لیگ و سبھا کی تمام شرطیں ایک سانس میں منظور کر کے اور پھر یہ تماشا دیکھ لے کہ یہ جماعتیں کس طرح قلا بازیاں کھاتی پھر رہی ہیں ۔

خوش بود گر محک تجربہ آید بمیاں
تا سیہ روئے شود ہر کہ دروغش باشد

رواداری

اگر آپ ایک ایسے شخص کو دیکھیں جو شیروانی کو بیحد عزیز رکھتا ہے اور تمام کوٹ پہننے والوں کو ہر صحبت ، اور ہر مجلس میں بد مذاق و بے حیا کہتا پھرتا ہے ۔

یا اگر آپ کو کوئی ایسا شخص ملے جو اُن تمام افراد سے نفرت کرتا ہے جو انگور کو سیب اور سفید کمر بند کو رنگین کمر بند پر ترجیح دیتے ہیں ——

یا اگر آپ کے علم میں یہ بات لائی جائے کہ فلاں شخص اس مزاج کا ہے کہ اگر اُس کے سامنے پیلے رنگ کی تعریف ، اور نیلے رنگ کی مذمت نہ کی جائے تو وہ ہاتا پائی کرنے لگتا ہے ۔

یا اگر آپ کو کوئی ایسا آدمی ملے جو اُن تمام اشخاص کو فاسق و ملحد اور دوزخی سمجھتا ہو جو ریشم کے کیڑوں کے سامنے سجدہ نہیں کرتے اور ہر آن اِس فکر میں رہتا ہو کہ کسی نہ کسی طرح ریشم کے کیڑوں کے منکرین پر توہینِ حق کا مقدمہ دائر کرا دے ۔

یا اگر آپ کے نوٹس میں یہ بات لائی جائے کہ آپ کے شہر میں ایک بزرگوار ایسے ہیں جو یہ سُنتے ہی کہ املی کوئی اچھا پھل نہیں ہے ، یکا یک فحش گالیاں دینے لگتے ہیں .... تو حواس کی سلامتی اور عقل کے ثبات کے نام پر میں آپ سے سوال کروں گا کہ آپ اُس شخص ، یا ایسے اشخاص کے باب میں کیا رائے قائم کریں گے ؟ اور اگر کوئی آپ سے سوسائٹی کے اِن معزز مہانوں کے قیام کی خاطر کسی مکان کے تجویز کرنے کے لئے کہے گا ، تو کیا آپ بے دھڑک آگرے ، اور بریلی کے کشادہ و ہوادار سرکاری مکانات کی طرف اشارہ نہیں کر دیں گے ؟

اس دُنیا کی ہر چھوٹی بات ، بڑی ۔ اور ہر بڑی بات ، چھوٹی ہو تی ، اور ہو سکتی ہے —— یہ محض حالات و مواقع ہوتے ہیں جو اشیائے عالم ، اور مسائل حیات کو چھوٹا بڑا ، یا اہم و غیر اہم بنایا کرتے ہیں —— باتیں چھوٹی ہوں کہ بڑی ، مسائل اصولی ہوں کہ فرُوعی —— بحث چھوٹے بڑے ، یا اصولی و فرُوعی کی نہیں ہے ، دیکھنے کی چیز تو صرف یہ ہے کہ ہم اپنے مسائل و عقائد کے باعث ، اپنے ابنائے زمانہ سے ، اُن ابنائے زمانہ سے جو ہم سے اُصولی اختلاف رکھتے ہیں کیا سلوک پسند کرتے ہیں ۔

اگر کوئی فرد ، یا جماعت ایسی ہے کہ ادنیٰ ترین اختلافات تک کو برداشت نہیں کر سکتی ، اور ہر اختلافِ رائے پر اس قدر جامے سے باہر ہو جاتی ہے کہ اُس کی شریعت خوُن ریزی کا فتویٰ دے دیتی ہے تو میں آپ سے

حواس کی سلامتی، اور عقل کے ثبات کا واسطہ دے کر پھر سوال کروں گا کہ آپ اُس فرد یا جماعت کے باب میں کیا رائے قائم کریں گے؟

وہ شخص جو الحاد کی مذمت سُنکر گالیاں دینے لگتا ہے، اور وہ گروہ جو اپنے عقائد کے خلاف ایک حرف سُنکر چھُری مار دیتا ہے، کیا ان دونوں کے حواس درست ہیں؟ اِن کی عقلیں صحیح ہیں؟ یا یہ کہ یہ دونوں شدید قسم کے پاگل ہیں؟ اور اِن کا پاگل پن اتنا عظیم الشان ہے، جیسا ہندوستان کا ہمالہ ——— یا اِن کا عقلی وجود اِس درجہ بیتکا ہے جیسا مصر کا ابوالہول؟

اسی طرح اب میں، کسی تمہید کے بغیر، براہِ راست آپ سے یہ بھی لگے ہاتھوں دریافت کر لینا موقع کی بات سمجھتا ہوں کہ مذہبی اُمور پر ایک دوسرے کو زندیق و کافر کہنے والے، اور عقائد کے اختلاف کی بنا پر ایک دوسرے کا خون تک پی لینے والے کس گروہ، اور کس طبقے میں شمار کئے جائیں؟

آپ اُس بیچارے کو تو بے دھڑک پاگل کہہ دیتے ہیں جو الحاد کی مذمت سنتے ہی گالیاں دینے لگتا ہے۔ لیکن نہیں معلوم کیا بھید ہے کہ جب کوئی شخص اختلافِ عقائد کی بنا پر کسی کے چھُری مار دیتا ہے تو آپ اُس کے پاگل خانے سے باہر ہونے پر قطعی اظہارِ حیرت نہیں فرماتے۔

یہ بات شاید دس ہزار بار مر کر زندہ ہونے کے بعد بھی میری عقل میں نہ آسکے گی کہ اگر کوئی بات کسی شخص کی سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ تو اُسے مجرم کیوں قرار دیا جاتا ہے؟

کیا ہر وہ بات جو زید کی سمجھ میں آچکی ہے، محض اِس بنا پر کہ وہ زید کی سمجھ میں آگئی ہے اِس قدر قابلِ قبول بن چکی ہے کہ وہ ہر شخص کی سمجھ میں آجائے؟ اور کیا وہ ہر پتھر جو زید سے اُٹھ گیا ہے، محض اِس بنا پر کہ وہ زید سے اُٹھ گیا ہے۔ لازماً وہ ہر شخص سے اُٹھ جانا چاہیئے؟

میں اربابِ تعصّب کی خدمت میں تفکّر و تدبّر، اور تامّل و تعقّل کی قسم کھا کر عرض کرتا ہوں کہ حضرات کسی بات کا کسی شخص کی سمجھ میں نہ آنا کوئی جرم، کوئی خطا، اور کوئی گناہ نہیں ہے ———

اِس بحث کو سر دست چھوڑیئے کہ عقلمند کون ہے جس طرح یہ ممکن ہے کہ مذہب پرست عقلمند ہوں۔ اُسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ لامذہب عقلمند ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں عقلمند نہ ہوں، بلکہ وہ گروہ عقلمند ہو جو اِن کے بین بین واقع ہوا ہے ——— لیکن رفعِ شر، اور اتمامِ حجّت کی خاطر میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مذہب اور متعلقاتِ مذہب جن لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتے ہیں، اُن کے متعلق اربابِ مذہب کی طرف سے اگر معقولیت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ کچھ کہا جاسکتا ہے تو صرف اِس قدر کہ اُن کی عقلیں کمزور ہیں ـــــ فرض کرلیجئے، جیسا کہ ابھی عرض کیا جاچکا ہے۔ اتمامِ حجّت و رفعِ شر کے واسطے فرض کرلیجئے کہ ایسا ہی ہے۔ لیکن کیا اہلِ مذاہب نے کبھی اِس امر پر بھی غور کرنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے کہ اگر لامذہبوں کی عقلیں کمزور واقع ہوئی ہیں تو اِس ضعفِ عقل کی ذمّہ داری کس پر عاید ہوتی ہے؟

کیا منکرانِ مذہب اپنی عقلوں کے خالق ہیں؟ اور اگر وہ اپنی عقلوں کے خالق نہیں ہیں تو اُن کی اُس بے دینی کا، جو ضعفِ عقل سے پیدا ہوئی ہے، کون جوابدہ قرار دیا جائے گا؟

گھوڑے کو لنگڑا پیدا کرکے اُسے دوڑنے کا حکم دینا، اور جب وہ دوڑ نہ سکے تو اُسے کوڑے مارنا کس شریعت میں روا رکھا گیا ہے؟

ظاہر ہے کہ مذہب، کوئی ذی حیات وجود نہیں ہے اور جب وہ کوئی ذی حیات وجود نہیں ہے تو اُس سے معاندانہ جذبات، یا مخاصمانہ واقعات کی بنا پر انکار کرنے کا کوئی خیال پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ جو کوئی انکار کرے گا، وہ محض اِس بنا پر انکار کرے گا کہ وہ اُس کی سمجھ میں نہیں آتا ہے، اور اِس صورتِ حال میں زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ منکر کا قصورِ فہم ہے ـــــ اور ظاہر ہے کہ قصورِ فہم نہ تو کوئی قانونی جُرم ہے، نہ مذہبی گناہ۔

میری سمجھ میں یہ بات مطلق نہیں آتی کہ اربابِ مذہب، جذبات کے دھارے پر اِس قدر کیوں بہتے رہتے ہیں، اور اپنے اِس بے بسی سے بہے چلے جانے کو کس طرح برداشت کرتے ہیں؟

آخر یہ حضرات، معاملات کو اُن کی صحیح روشنی میں دیکھنے کے خوگر کیوں نہیں ہیں، اور زندگی کے مسائل پر ٹھنڈے دل سے ایک مُفکّر کی صورت سے غور کیوں نہیں کرتے؟

فرض کیجئے کوئی شخص سوسائٹی کے تمام مفید ضوابط کا پابند ہے لیکن خدا کے وجود کو اِس طرح تسلیم نہیں کرتا جس طرح اہلِ مذاہب تسلیم کرتے ہیں،

تو اِس میں کسی کا کیا نقصان ہے، اِس سے کسی کے گھر سے کیا جاتا ہے، اِس سے کس کا نامۂ اعمال سیاہ ہوتا ہے، اور اِس سے کس کی عاقبت خراب ہوتی ہے؟ —— خُدا، اگر ہے تو سب کا خُدا ہے۔ صرف اہلِ مذاہب ہی کے واسطے ریزرود (مخصوص) ہو کر نہیں رہ گیا ہے، اگر کوئی خُدا کا منکر ہے تو اپنے خدا کا منکر ہے، اِس سے اہلِ مذاہب کو آخر واسطہ ہی کیا ہوسکتا ہے؟ سزا دے گا تو خدا سزا دے گا، یہ ارباب مذہب بیچ میں ٹانگ کیوں اڑاتے ہیں؟ —— کیا یہ خدا کے نمائندے ہیں؟ یہ کتنا ہولناک مغالطہ ہے!

ایک شخص بدبختی یا بے عقلی کے باعث فرض کیجیے اپنے کو حوروں کی ہم آغوشی کے تمام امکانات سے محروم کر رہا ہے تو اس سے کسی دوسرے کو کیا غرض، اُس کے محروم ہو جانے سے دوسروں کی حوریں تو چھین نہ جائیں گی —— اور اگر ارباب مذہب کا یہ قول ہے کہ نہیں یہ معاملہ نہیں ہے، ہم منکرانِ مذہب سے لڑتے ہیں صرف اُن کی ہوا خواہی و ہمدردی کی بنا پر —— سو بندہ پرور ہمدردی و ہوا خواہی کا فریضہ سب وشتم اور جنگ و پیکار سے نہیں، بلکہ تالیفِ قلب، دلسوزی، اور افہام و تفہیم کے ذریعے سے ادا ہوسکتا ہے۔ گالیوں اور تلواروں سے قلوب نہیں بدلا کرتے —— دلوں کو اگر کوئی شے موہ لے سکتی ہے تو وہ حکمت کی بات، اور محبت کی نگاہ ہوتی ہے ——

ابھی عرض کیا جا چکا ہے کہ اہلِ مذہب اگر معقولیت کے ساتھ لامذہبوں کے متعلق زیادہ سے زیادہ کچھ کہہ سکتے ہیں تو صرف اس قدر کہ اُن کی عقلیں کمزور ہیں —— اور یہی وہ خیال ہے کہ اگر قوی ہو جائے تو اہلِ مذہب، نفرت کے عوض، لامذہبوں پر اُسی طرح ترس کھانے لگیں گے جس طرح ایک تندرست بھائی اپنے بیمار بھائی پر ترس کھاتا ہے، اور ظاہر ہے کہ جب مذہبی حضرات، اپنے لامذہب بھائیوں کو علیل سمجھنے لگیں گے تو بد دعائیں، اور سزائیں دینے کے عوض اُنھیں بہتر دوائیں اور غذائیں دیں گے۔ اور اس طرح اِن دونوں میں ایک ایسی حقیقی یگانگی، اور ایک ایسی قوی محبت پیدا ہو جائے گی

- - - - - - - - - - - - -

کہ ایک، دوسرے کی بات کو ٹھنڈے دل سے سُننے اور قبول کرنے کے تمام امکانات پیدا ہو جائیں گے۔

میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ جس روز ارباب مذہب کی سمجھ میں یہ بات آجائے گی کہ لامذہبیت، اُن کے یا اُن کے خدا کے مقابلے میں کسی نوع کی سرکشی، گستاخی، زندیقیت، یا ارادی بے دینی نہیں ہے، بلکہ یہ یا تو ضعفِ عقل کا نتیجہ ہے، یا ایک ایماندارانہ اختلافِ رائے، معصومانہ استغنا بانتائج، اور حکیمانہ تصفیۂ عقلی ہے تو مجھے یقین کامل ہے کہ وہ کسی شرط پر بھی اس روشِ قدیم پر ایک لمحے کے لئے بھی قائم رہنے پر آمادہ نہ ہوسکیں گے۔ کہ نوعِ انسانی میں فتنہ برپا کیا جائے، اور بھائیوں کے خون میں ہات رنگے جائیں۔

جس دن اہلِ مذاہب اس حقیقتِ کُبریٰ کو پالیں گے، ایک بہت بڑے منارے پر یہ عبارت کندہ کی جائے گی کہ انسان سے بڑا کوئی مذہب نہیں، انسانیت سے بلند کوئی شریعت نہیں، اور جو شخص اپنے ذاتی مذہب کی بنا پر انسانی شریعت کے خلاف ایک کلمہ بھی زبان سے نکالے گا اُس پر قتلِ عمد کا مقدمہ چلایا جائے گا۔

ہاں اُسی دن انسانیت کے منبر سے پہلی مرتبہ یہ آوازہ بلند کیا جائیگا کہ آج کی تاریخ سے مذہبی منافرت کو حرام قرار دیا جاتا ہے، اور فرقہ وارانہ تعصبات کے پھاٹک کو جو انسانی خون سے سُرخ ہو رہا ہے ایک ایسے مسالے سے چُن دیا گیا ہے کہ کروروں صدیوں کے باد و باراں سے بھی اُس میں کوئی شگاف نہ پڑ سکے گا۔

ہماری آئندہ نسلیں اُس دن کو مفکرانہ سنہ کا روزِ آغاز، اور انسانی ذہن کے بلوغ کا یومِ اولیں قرار دے کر تعطیلیں منائیں گی —— اور ہر تعطیل کے موقع پر ایک ایسا جشنِ فتح منایا جائے گا کہ انسانیت اپنے ماتھے پر کلاہِ فخر کج کر کے اُن تمام فرشتوں پر قہقہے مارے گی جنھوں نے اُس کی تخلیق کے وقت اُسے زمین پر خون بہانے والی مخلوق کہا تھا۔

موجودہ ہندوستانی سیاسیات کے بعض رجحانات

احتشام رضوی ماہلی، ایم اے

تاریخ کے کسی عہد میں دنیا کے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی مسائل میں اتنی پیچیدگیاں نہیں تھیں جتنی آج ہیں۔ ہر واقعہ پر مدبروں اور سیاست دانوں کی نگاہیں مستفسرانہ انداز میں پڑتی ہیں اور وہ اُس کی کڑیاں تلاش کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ ماضی کی تمام روایات فلسفۂ سیاست و تمدن نئے علوم کی تیز روشنی میں دیکھے جا رہے ہیں اور اب دنیا کے بسنے والوں میں اتنی جرأت آ رہی ہے کہ وہ اُن تمام حقائق سے انکار کر دیں جو اُن کی سمجھ میں نہیں آتے۔ یا جو زندگی کے مسائل کا حل پیش نہیں کرتے۔ تغیر اور انقلاب کی مسلسل کشمکش ہر شعبۂ حیات میں نظر آ رہی ہے، اور اُس سے دلچسپی لینے والے اندھیرے اور اُجالے کے درمیان اپنا راستہ تلاش کر رہے ہیں۔

تاریخ کے فلسفۂ جدیدہ یعنی کارل مارکس کے نظریۂ تاریخ نے رفتارِ زمانہ کی تحلیل کا وہ حربہ ہمارے ہاتھ میں دے دیا ہے جس کی مدد سے واقعات کے اسباب و علل، نتائج اور اثرات کا بالکل صحیح تجزیہ ہو سکتا ہے، زندگی حرکت میں ہے! اور کائنات کو ایک لمحہ کے لئے سکون نہیں۔ دنیا کا چپہ چپہ اقتصادی طور پر ایک دوسرے سے منسلک ہے اور خواہ زمین کا کوئی حصہ غلامی کی کتنی ہی مضبوط زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہو، لیکن وہ بھی کسی دن زنجیر کا بوجھ محسوس کر کے اُس سے آزاد ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ ہندوستان ان انقلابات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اُس کے یہاں بھی زنجیر میں جھنکار پیدا ہوئی اور چونکہ وہ بوسیدہ ہو چکی تھی اس لئے اُس میں جا بجا رخنے بھی پیدا ہو گئے شہنشاہی اور سرمایہ داری کے پرانے اصول جو اُسے جکڑے ہوئے تھے دنیا سے اُٹھ رہے تھے اس لئے ہندوستان کے سامنے بھی ایک آزاد اور ترقی پسند جمہوریت کا تصور آ گیا۔

یوں تو غیر ملکی حکومت سے آزاد ہونے کی کوشش ہندوستان میں کیا بلکہ اس سے بھی پہلے ہی سے نظر آ رہی ہے لیکن اُس جد و جہد کا تعلق اس مضمون سے نہیں، ہمارے پیش نظر بیسویں صدی ہے اور اُس کا بھی وہ حصہ جسے سیاستِ جدیدہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، ۲۱-۱۹۲۰ء میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کے سامنے آزادی کا مطالبہ کچھ اس طرح آیا کہ سیاست اور آزادی کی لڑائی سرمایہ داروں اور متوسط طبقہ کے ہاتھ میں ہونے کے باوجود عوام تک اپنا اثر ڈالنے لگی اور عمل کے جذبے کچھ تو عوام میں اور زیادہ تر متوسط طبقہ کے لوگوں میں بیدار ہونے لگے۔ اُس وقت سے لے کر اگر ہم آج تک کے رجحانات کا اندازہ کرنا چاہیں تو اس سیاسی تحلیل کے لئے بھی ہمیں تاریخ کے اوراق کو جلد جلد اُلٹنا پڑے گا، یہاں تک کہ ہم ۱۹۲۹ء تک آ جائیں۔ مہاتما گاندھی اور دوسرے آزادی چاہنے والے ہندوستان کی غریبی، افلاس اور اقتصادی تاراجی سے اچھی طرح باخبر تھے، یہی وہ خیالات تھے جو انھیں اس جد و جہد کی طرف لے گئے، لیکن اتنا ہمیں یقیناً ماننا پڑے گا کہ اُن لوگوں کے سامنے آزاد ہندوستان کی کوئی منظم اور صاف تصویر نہ تھی، اُن کی سیاست ہندوستان سے متعلق تھی یا کبھی کبھی انگلستان کی تبدیلیوں پر بھی نظر پڑ جاتی ہوگی وہ بھی اس اُمید میں کہ وہاں کس جماعت کے لوگ برسرِ اقتدار ہو رہے ہیں اور اُن سے زیادہ سے زیادہ کیا حقوق ملنے کی امید ہو سکتی ہے۔ اس کے اثرات گو آج

بھی جا رہی ہیں، لیکن بہت کم، کیونکہ جب گاندھی جی وائسرائے سے ملنے جاتے ہیں تو بہت سے لوگ ایک اطمینان کا سانس لیتے ہیں اور اخبارات بڑی امید افزا سُرخیاں قائم کرکے یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اس قِرآن السعدین سے ہندوستان کے معاملات میں کوئی قابلِ ذکر تبدیلی ہوگی۔ بہرحال کہنا یہ ہے کہ ۱۹۲۹ء تک ہندوستانی مدبرین کو بین الاقوامی معاملات سے کوئی دلچسپی نہ تھی، وہ لڑتو رہے تھے لیکن اس طرح نہیں جیسے آج لڑ رہے ہیں۔

جب ہم ہندوستان اور اُس کی سیاسی تبدیلیوں یا آزادی کی جدّ و جہد کا تذکرہ کرتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں یہ جان لینا چاہیئے کہ اس میں اور دوسرے ملکوں میں بڑا فرق ہے۔ ایک مدت سے برطانوی سامراج کے تسلّط نے ذہنیت ہی بدل دی ہے، ہمارے سوچنے اور غور کرنے کا ڈھنگ ہی وہ نہ تھا جو دوسری جگہ کے لوگوں کا ہوا کرتا ہے۔ لیکن جیسا کہ بار بار لکھا جا چکا ہے اب اُس میں بڑا تغیر ہوگیا ہے اور اُسی کا تذکرہ ان آگے کے صفحات میں ہوگا۔ اس جگہ اتنا اور ذہن نشین ہو جانا چاہیئے کہ ہندوستان کی جو طبقاتی تقسیم ہے وہ کچھ اس طریقہ کی ہے کہ اس میں اِسی حالت کو قائم رکھتے ہوئے خود اپنے یہاں کے لوگوں کی حالت درست کرنے کی بھی صلاحیت نہیں ہے چہ جائیکہ اس میں اُمد ملکوں کا مفاد بھی شامل ہو، یہ برطانوی سرمایہ داروں کا اکھاڑہ ہو، امریکہ، جاپان اور جرمنی وغیرہ کے لئے بازار کا کام دے رہا ہو۔ بیرونی حکومت لاکھ ہمارا فائدہ چاہتی ہو، لیکن اپنے ذاتی نفع سے زیادہ نہیں چاہ سکتی۔ ہمارے تمام ذرائع آمدنی اور دولت پر اُس کا قبضہ ہے، اور ہماری حیثیت اُس لومڑی کی ہے جو صراحی کے اندر منہ ڈال کر کھانے والے سارس کے چونچ سے گری ہوئی چیزوں ہی سے بہرہ یاب ہو سکتی تھی۔

اب ہمیں ہندوستان کی سیاسی، مذہبی، اقتصادی اور معاشی جماعتوں کا جائزہ لینا چاہیئے، کیونکہ اُنھیں کی خواہشات اور نظریات کے تصادمات سے مختلف رجحان پیدا ہوتے ہیں، ایک کا دوسرے پر کیا ردِ عمل ہوتا ہے اور ان سب کی تہ میں وہ کون طوفانی لہریں ہیں جن پر ہندوستان کے مطالبات کی بنیاد ہے۔ یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ یہ رُجحانات اتنی تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں کہ ممکن ہے اس مضمون کے شائع ہونے تک کوئی بالکل نئی تبدیلی بین الاقوامی فضا میں پیدا ہو جائے، اور اس کا اثر ہندوستان پر بھی پوری طرح پڑنے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے کسی موقعہ پر کہا تھا کہ ہندوستان میں صرف دو جماعتیں ہیں — ایک آزادی چاہنے والی اور دوسری آزادی نہ چاہنے والی۔ اگر غور سے دیکھا جائے اور ہندوستان کی جماعتوں کا سیاسی نقطۂ نظر سے تجزیہ کیا جائے تو یہی بات بالکل سچ نظر آتی ہے۔ چونکہ یہ مضمون بالکل خارجی طریقہ پر پیش کیا جا رہا ہے، اس لئے کسی جماعت کے منشاء اور پروگرام (اگر کوئی ہو) سے زیادہ بحث نہ کی جائے گی بلکہ جیسا کہ خود عنوان سے ظاہر ہے، اس میں صرف رجحانات کا ذکر ہوگا اور اُن سے جو اثرات مترتب ہوں گے اُن پر بھی غیر جانبدارانہ نگاہ ڈالی جائے گی۔ سب سے پہلے ہمیں یہاں کی اُن جماعتوں کا جائزہ لینا چاہیئے جن کے کچھ سیاسی یا نیم سیاسی نظریات ہیں، اور جن پر قائم رہ کر وہ جماعتیں عوام کے لئے کوئی ایسا خاکہ تیار کرنے کی مدعی ہیں جس میں زندگی آرام اور چین سے بسر ہو۔

ایک ایسے طبقہ کی موجودگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا، جو ہر طرح برطانیہ کا خیر خواہ ہے اُن کی حیثیت اُن وفادار جماعتوں کی طرح ہے جو اپنے بادشاہ کے پسینہ پر خون بہانے کو تیار رہتی تھیں اور جنھیں (Loyalists) لائلسٹ کہتے تھے، یہاں اُن کی تعداد زیادہ تر برطانوی حکام سے بڑھتی ہے، ہندوستان کے بھی کچھ لوگ تو طبعاً اور فطرتاً اِس نقطۂ نظر کو پسند کرتے ہیں، لیکن زیادہ تعداد اُن لوگوں کی ہے جن کو مصلحتاً اِسی جماعت میں پناہ لینی پڑی۔ چونکہ یہ جماعت سیاسی حیثیت سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی، اور قومی مطالبات کے سامنے کوئی ایسی دلیل نہیں پیش کرتی جسے عوام اچھی نظر سے دیکھ سکیں، اس لئے اُن پر زیادہ وقت ضائع کرنا بیکار ہے، ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ ہندوستانی جو مصلحتاً اس جماعت کے حامیوں میں سے ہیں، فضا کے بدل جانے پر اپنی جگہیں دوسری سیاسی جماعتوں میں تلاش کرلیں گے۔

ایک دوسری سیاسی جماعت جس کی تعداد کم نہیں ہے "لبرل" (Liberals) کہی جا سکتی اِس جماعت کا سیاسی پروگرام اِس قدر غیر متعین ہے کہ اُس کی قوت اور جماعت کا صحیح اندازہ بھی نہیں ہوتا۔ تلک اور گوکھلے کے زمانہ میں اِسے عروج تھا اور فضا اِسی کی مقتضی تھی کہ اِسی غیر متعین پروگرام سے کام لے کر متوسط طبقہ میں قومی جذبات اُبھارے جائیں، لیکن زمانہ کی تبدیلیوں کے ساتھ یہ جماعت اپنے قدم نہ بڑھا سکی،

نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے قومی اور اقتصادی مطالبات تو کہیں سے کہیں پہونچ گئے لیکن اس جماعت کی نظر میں وسعت اور خیال میں ترقی نہ پیدا ہوئی۔ ان لوگوں نے اُنیسویں اور بیسویں صدی کے مطالبات میں کوئی امتیاز نہیں رکھا۔ اور دستوریت کے اُسی طرح شیدائی بنے رہے، چنانچہ آج جب انقلاب کی لہر عوام میں بھی بیداری اور زندگی کی رُوح پھونک رہی ہے۔ لبرل جماعت کے پاس صرف متوسط طبقہ کے دَرد کا علاج ہے، اس وقت کی ترقی پسند جماعتیں لبرل پارٹی سے تعلق رکھنے والوں کو رجعت پسند اور سامراج دوست تصور کرتی ہیں۔ اس جماعت کے حدود معین نہیں، اس میں ہر وہ اصلاح پسند شخص رکنیت پا سکتا ہے، جو ہندوستان کی آزادی بتدریج چاہتا ہے، جو دستور اور اصلاحات کے نفاذ ہی میں خوش ہو لیتا ہے جس کی نظریں عوام کے دُکھ درد سے آشنا نہیں، یہ جماعت اپنی کامیابی کے لئے صرف اخباروں اور کانفرنسوں، تقریروں اور تحریروں پر بھروسا رکھتی ہے عمل کی اس میں کہیں گنجائش نہیں، جب یہ عمل کی طرف آتے ہیں تو اُس کا تعلق بھی صرف بڑی اونچی عمارتوں کے ڈرائنگ روم سے ہوتا ہے، جس طرح یہ عوام سے بےخبر ہوتے ہیں اُسی طرح عوام بھی اُن سے واقف نہیں ہیں۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا اِن کا کوئی پروگرام متعین نہیں ہے اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ لبرل اخباروں میں کبھی کبھی ایک کانگریسی کی اعتدال پسندی پر خوشی منائی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ لبرل بھی یہی کہتے ہیں اور کبھی کبھی رجعت پسندوں کی حمایت میں صفحے سیاہ کئے جاتے ہیں اور سامراج کی تعریف کے پُل باندھے جاتے ہیں،

یہ دو جماعتیں جن کا ذکر اوپر ہوا اُس طبقہ سے تعلق رکھتی ہیں جن کے سامنے آزاد ہندوستان کا تصور نہیں بلکہ وہ اُن جماعتوں کی عملی جدّ و جہد کو بھی بُری نظر سے دیکھتی ہیں جو آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ فضا کے تقاضے کے ساتھ یہ کہاں تک ہم آہنگ ہیں۔

اب ہماری نظر آل انڈیا نیشنل کانگریس پر پڑتی ہے، یوں تو یہ جماعت جس کی بنیاد ہی میں غیر ملک والوں کا ہاتھ شریک تھا بہت سے انقلابات دیکھ چکی ہے۔ لیکن ۱۹۲۰ء کے بعد سے اس میں جتنی تیزی سے تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ اِس کا بہت بڑا ثبوت ہیں کہ کانگریس وقت کا ساتھ دے رہی ہے کانگریس عوام کے مطالبات کے ساتھ بدل رہی ہے اور بین الاقوامی مہمات سے متاثر ہو کر اپنی جگہ تاریخ میں حاصل کر رہی ہے۔ ۱۹۲۰ء کے بعد سے کانگریس لبرل جماعت کے اثر سے کسی حد تک باہر نکلی اور دن پر دن آگے ہی بڑھتی چلی گئی۔ اس کے بہت سے ساتھی پیچھے چھوٹ گئے۔ لیکن اس کے قدم زمانہ کا ساتھ دے رہے تھے، اِن اہم تبدیلیوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ اِن تغیرات میں کچھ لوگ تو آگے نکل گئے کچھ ساتھ نہ دے سکے مگر کانگریس کا دامن اُنھوں نے نہ چھوڑا اِسی لئے آج بھی جب ہم ذرا غور سے دیکھتے ہیں تو خود کانگریس میں مختلف درجے نظر آتے ہیں جیسے تھیئٹر دیکھنے کے لئے لوگ مختلف درجوں میں بیٹھے ہوں اُسی طرح ہندوستان کی آزادی اور دنیا کی تحریکات کا تماشا پوری کانگریس مختلف جگہوں سے کر رہی ہے، اگر زیادہ نہیں تو اِس کے دو بڑے ٹکڑے ہندوستانی سیاست کے ایک معمولی طالب علم کو بھی نظر آجائیں گے، آسانی کے لئے ہم پہلے طبقہ کو "گاندھی کا مقلد" اور دوسرے کو "ترقی پسند جماعت" کہہ سکتے ہیں۔ دونوں کی خصوصیتیں اِس قدر الگ الگ ہیں کہ ہم آسانی سے اُنھیں دو نام دے سکتے ہیں۔

مہاتما گاندھی نے افریقہ میں ہندوستانیوں کے لئے کارنمایاں کرنے کے بعد ہندوستان کی طرف نظر کی، اُن کی حیثیت ایک مصلح قوم سے زیادہ نہ تھی، لیکن سامراج اور سامراج سے تعلق رکھنے والوں نے اُنھیں ہمیشہ باغی سمجھا۔ اُنھوں نے عوام تک اپنی آواز پہونچانے میں پوری کامیابی حاصل کی، عدم تشدد اور اہنسا کے فلسفہ کی مدد سے قومی تحریک کو ایک باضابطہ انقلابی جماعت کی شکل دے دی، اُنھوں نے آزاد ہندوستان کا کوئی باقاعدہ تصور نہیں پیش کیا، لیکن آزادی کی تڑپ بہت سے دلوں میں پیدا کر دی، اُن کی سادہ زندگی، اُن کی تحریر اور تقریر کا زور، اُن کا استقلال اور ہندوستانیوں کی نبض شناسی نے اُنھیں صرف ایک سیاسی لیڈر اور قومی رہنما ہی نہیں مانا بلکہ ایک ہلکی سی مذہبی اہمیت بھی اُن کے نام کے ساتھ شریک کر دی گئی۔ لہٰذا لوگ صرف اُن کے سیاسی خیالات سے نہیں بلکہ اخلاقی تعلیمات سے بھی متاثر ہوئے اور ایک ایسی جماعت بن گئی جو اُن کی پوری مقلد کہی جا سکتی ہے۔ اس جماعت کے لوگوں نے درحقیقت خود کچھ نہیں سوچا بلکہ اُسی حال میں رہے گا جو گاندھی جی نے پھیلا دیا تھا۔ اُن کی زبردست شخصیت کا یہ جادو تھا کہ کچھ دنوں کے لئے اُن کی ذات اور کانگریس ایک سمجھی جانے لگی، یہاں اُن سے بحث نہیں بلکہ صرف بتانا یہ ہے کہ اُن کے

مُقلدین کا ایک گروہ تیار ہوگیا جو جان اور مال کی قربانیوں کے لئے تو ہر وقت تیار ہے مگر اُس کے سامنے کوئی ایسا پروگرام نہیں جسے تاریخی ارتقار کی روشنی میں دیکھا جائے۔ اُس جماعت میں خود کئی اونچے نیچے طبقے ہیں۔ ایک زینہ پر ہمیں مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی، ستیہ مورتی اور راجگوپال اچاریہ نظر آتے ہیں تو اُس سے کچھ اونچائی پر مولانا ابوالکلام آزاد اور بابو راجندر پرشاد کے سے لوگ دکھائی دیتے ہیں۔ ستیہ مورتی اور ڈیسائی ہندوستان کی بین الاقوامی حیثیت ذہن میں نہیں رکھتے۔ ممکن ہے ان کا اپنا کوئی ذاتی تصور ہو مگر یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ موجودہ تاریخی ارتقامیں کسی خاص مرتبہ پر نہیں رکھا جاسکتا۔ اس اختلاف کا ایک ادنیٰ ثبوت تو یہی ہے کہ ہندوستانی فوجوں کے شنگھائی بھیجے جانے میں ان حضرات کو اور دوسرے بہت سے کانگریسیوں کو کوئی بات نظر نہیں آتی۔ لیکن اور کانگریسی جن میں جواہر لال نہرو، سرت چندر بوس اور نوجوان طبقہ شریک ہے حکومت کے اس طرزِ عمل کو نہایت بُری نظر سے دیکھتے ہیں۔ میری نظر سے گاندھی کا بھی کوئی بیان اس پر نہیں گزرا، غالباً انھوں نے بھی اس کی سیاسی اور اقتصادی اہمیت پر غور نہیں کیا ہوگا۔ وہ سامراج کے دوست نہیں لیکن وہ اور اُن کے مقلدین کے دِلوں میں کہیں نہ کہیں دستوریت اور اصلاحات کے لئے اب بھی جگہ ہے۔

ترقی پسند جماعت کانگریس ہی کا ایک جزو ہے اور اُسے کانگریس سے علیحدہ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا۔ صرف فرق یہ ہے کہ اُس کے سوچنے اور غور کرنے کا انداز، اُس کا سیاسی اور آئینی تصور، اُس کا طریقۂ جنگ گاندھی کے مقلدوں سے جداگانہ ہے، اس میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جن کے پاس ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ہی ساتھ آزاد ہندوستان کے لئے بھی ایک باقاعدہ پروگرام ہے، وہ اشتراکیت اور اجتماعیت ہی میں دُنیا کا امن وسکون دیکھتے ہیں اور ہندوستان کو ایک لمحہ کے لئے بھی دنیا سے علیحدہ نہیں دیکھتے، کانگریس کا یہ ترقی پسند طبقہ اگرچہ متوسط طبقہ اور اُس میں بھی نیچے کے حصّے سے تعلق رکھتا ہے، مگر اس کا ہر قدم عوام کے لئے اُٹھتا ہے، وہ اس انقلاب کو مزدوروں اور کسانوں کے ہاتھ میں ایک سلاحِ جنگ کی طرح دے دینا چاہتا ہے، کیونکہ اُس کے سامنے تاریخ کا یہ سبق موجود ہے کہ طاقت کا سرچشمہ عوام ہی ہیں۔ اس جماعت کی راہ میں بڑی دقتیں ہیں کیونکہ ہندوستان کے عوام میں زیادہ تر تعداد اُن کسانوں کی ہے جو ذہنی طور پر آسانی سے کسی بڑے کام کے لئے اُبھارے نہیں جاسکتے، صدیوں کی غلامی نے اُن کے خون اور جسم میں کچھ بھی باقی نہیں رکھا، اُنھیں اپنی مصیبت اور اقتصادی پستی کا احساس بھی مشکل سے ہوتا ہے، وہ کوئی ایسی جد وجہد نہیں کرتے جس میں اجتماعی حیثیت سے اُن کا کوئی فائدہ ہو، وہ جاہل ہیں اور اُن تک آزادی اور مساوات کا پیغام پہونچانا آسان نہیں ہے، اگرچہ حالت بہت اُمید افزا ہے، مگر اب بھی اُن میں انقلابی شعور پیدا کرنے کے لئے وقت اور محنت کی ضرورت ہوگی، کانگریس کی یہ جماعت اپنی نگاہیں صرف عوام پر جمائے ہوئے ہے، تھوڑے سے زمیندار ناخوش ہوتے ہیں تو ہوں، کچھ فیکٹریوں کے مالک ناراض ہیں تو رہیں، مگر غریبی اور افلاس اُس وقت تک آرام اور سکون میں تبدیل نہیں ہوسکتا، جب تک بعض طبقے بعض طبقوں کے لئے کچھ قربانیاں نہ کریں، وہ اپنی خوشی سے ہو یا جبر کے ساتھ۔

یہ ترقی پسند جماعت ہندوستان کو دنیا کے نقشہ میں دیکھتی ہے اور تمام سامراج دشمن طاقتوں میں اپنے لئے ہمدردی پاتی ہے، اُسے اسپین کی حکومت سے محبت ہے کیونکہ وہ آزادی اور مساوات کی علمبردار ہے اور فرینکو کی باغی فوجیں وہاں پھر وہی دورِ متوسط کا سا شہید اور انحطار پذیر نظام قائم کرنا چاہتی ہیں، وہ چین کے سرفروش بہادروں سے ہمدردی رکھتی ہے، کیونکہ اُن کی کوشش جاپانی شہنشاہیت سے نجات پانے کی ہے، انھوں نے ابی سینیا کی فتح پر افسوس کا اظہار کیا تھا، وہ فلسطین کے عربوں سے اظہارِ ہمدردی کرتے ہیں، کیونکہ برطانوی سامراج اُن کے ساتھ بھی وہی کھیل کھیل رہا ہے جو ہندوستان کے ساتھ۔ اس طرح آزادی کی وہی جد وجہد جو گاندھی جی کے ساتھ صرف ہندوستان کی آزادی تک محدود تھی، اب سامراج دشمن بن گئی ہے، پورے زاویہ نگاہ میں فرق آگیا ہے۔ یہ سب کچھ پچھلے پانچ چھ برسوں میں ہوا، اس سے پہلے یہ عام تاریخی اور اقتصادی نقطۂ نظر چند پڑھے لکھے اشتراکیوں تک محدود تھا، وہ کانگریس کو ایک چھوٹے سرمایہ داروں اور متوسط طبقہ کے لوگوں کی نمائندہ جماعت سمجھتے تھے، وہ گاندھی اور اُن کے ہر طریق کار کو نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے، لیکن جب آہستہ آہستہ جواہر لال نہرو

کی سرکردگی میں کانگریس عوام سے بالکل قریب پہونچ گئی تو اُس فلسفہ سے دلچسپی لینے والے لوگ بھی اسی جھنڈے کے نیچے آگئے۔ اِس طرح کانگریس ہی کے اندر ایک ترقی پسند طبقہ پیدا ہو گیا۔

بہت سے سوشلسٹ جو کانگریس میں شریک ہوئے اس کے پورے پروگرام سے متفق نہ ہو سکے اور اس بڑی جماعت کے اندر ہی اندر اُنھوں نے اپنی ایک چھوٹی سی جماعت ادر بنالی اور اُس کا نام بھی کانگریس سوشلسٹ پارٹی رکھا۔ اس کا دامن ایک طرف تو کانگریس سے بندھا ہوا ہے دوسری طرف خود اُس کے پیشِ نظر کارل مارکس کا دیا ہوا وہ اقتصادی پروگرام ہے جسے کانگریس پوری طرح نہیں لے رہی ہے، اُن میں اور پرانے کانگریسیوں میں کافی اختلافات ہیں، جس کا سب سے بڑا ثبوت وزارتوں کے قبول کرنے اور نہ کرنے کا مسئلہ تھا۔ کانگریس کی مجلسِ انتظامیہ نے وزارتیں قبول کرلیں، لیکن سوشلسٹ پارٹی نے کانگریس میں ہونے کے باوجود اسے قبول نہیں کیا اور کئی شخص جو اچھے وزیر بنتے عوام کو اس طرح فائدہ نہ پہونچا سکے۔ یہ بحث اس مضمون سے خارج ہے کہ اس جماعت کا یہ طرزِ عمل کیسا رہا مگر اتنا ضرور کہا جائے گا کہ یہ موقع کی سیاسی مصلحت تھی کہ وزارتیں قبول کی جائیں۔ پُرانے کانگریسیوں (جھنوں نے وزارتیں بنائی ہیں) کے آسانی سے "اصلاحی اور آئینی" ہو جانے کا زیادہ اندیشہ ہے، مگر جو سوشلسٹ جاتے اُن کے پاس ایک مکمل فلسفۂ عمل تھا وہ اِس گڈھے سے اپنے تئیں بچا سکتے تھے۔ یہ خوف بالکل بجا تھا کہ ہمارا محاذِ جنگ سمٹ کر صرف اسمبلیوں پر چلا جائے گا، لیکن سوشلسٹ وزارتوں میں جا کر عوام کا اس سے زیادہ بھلا کر سکتے تھے، جتنا وہ اِس وقت باہر کر رہے ہیں۔

بہر حال ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ خود کانگریس کے اندر جو عناصر ہیں اُن میں یہی ترقی پسند جماعت آزادی کی جدوجہد میں سب سے آگے ہے کیونکہ اس نے ہندوستانی سیاست کو بین الاقوامی رنگ دے کر تاریخی ارتقاء سے ہم آہنگ بنا دیا ہے، یہ اُس طبقہ کو ساتھ لے کر آگے جانا چاہتی ہے جن پر کسی ملک کی قوت کا مدار ہوتا ہے۔

کچھ تعداد ایسے اشتراکیوں کی بِل جائے گی جو کسی وجہ سے کانگریس میں شریک نہیں ہیں۔ اُن کے علاوہ دہشت پسند اور کچھ دوسرے انتہا پسند بھی ہیں جو تشدد کے قائل ہیں، لیکن اُن کی قوت زیادہ نہیں ہے، اور وہ بھی آہستہ آہستہ کانگریس ہی میں شریک ہوتے جا رہے ہیں۔ کاکوری کی سازش کے سلسلہ میں جو لوگ قید تھے وہ چھوٹ گئے ہیں اور اُنھوں نے جو بیان دئے ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصلحت وقت کے لحاظ سے وہ کانگریس ہی کی صفوں کو مضبوط بنائیں گے اور اپنے الگ سیاسی نظریہ کو کانگریس کی ترقی میں کسی طرح کی رکاوٹ ڈالنے کا سبب نہ بنائیں گے، یہ تمام جماعتیں جن کا کانگریس کے سلسلہ میں ذکر ہوا ویسے لاکھ مختلف خیالات رکھتی ہوں، لیکن اس کے باوجود استعماریت کے خلاف سب کا محاذ ایک ہی ہے اور آہستہ آہستہ سب ایک ہوئی جا رہی ہیں، اِن نظریات کا تصادم تو درحقیقت ہندوستان کی آزادی کے بعد ہوگا، کیونکہ موجودہ انقلاب تو اصل میں سامراج سے چھٹکارا پانے کے لئے ہے۔

ہندوستان ایک ایسا ملک ہے کہ یہاں کے لوگوں کا نفسی تجزیہ کرنا آسان نہیں ہے، جذبات اور خیالات اتنے گوناگوں ہیں کہ اُن کی تحلیل سمجھ میں نہیں آتی۔ سیاسی اختلافات تو اتنے شدید نہیں لیکن ہندوستان پر اور اثرات جو کام کر رہے ہیں اُن کی وجہ سے ترقی کے راستہ میں بڑی رکاوٹیں نظر آتی ہیں۔ اگر اس ملک کی مذہبی جماعتوں کی تقسیم کی جائے اور اُن پر ایک نظر ڈالی جائے تو وہ کئی حیثیتوں سے دلچسپ ہوگی۔ اپنی اکثریت کی وجہ سے سب سے پہلے ہندو ہمارے سامنے آتے ہیں، لیکن چونکہ اس مضمون میں ہمیں صرف سیاسی رجحانات پر نظر ڈالنا ہے، اس لئے ہم مذہبی جماعتوں کا اتنا ہی ذکر کریں گے جتنا اُن کا ردِ عمل سیاسیات پر ہوتا ہے، جب مذہبی جماعتیں بنتی ہیں تو اُن میں بعض تو خالص مذہبی اور معاشرتی فرائض انجام دیتی ہیں اور بعض سیاسیات کو بھی اپنے پروگرام میں رکھتی ہیں، ایسی صورت میں ہمیں ہمیشہ یہی نظر آتا ہے کہ وہ جماعتیں رجعت پسند ہوتی ہیں، وہ ہمیشہ انحطاط پذیر روایات کے دامن میں پناہ لیتی ہیں، مہاسبھا یا مہاسبھائی ذہنیت کے سکھ، بنگال وغیرہ کی نیشنلسٹ پارٹی اس تقسیم کے تحت میں جگہ پاتی ہیں۔ اِن سے سیاسی میدان میں تو کچھ بڑی بات ہوتی نہیں ہاں کبھی کبھی ان کی وجہ سے فضا مکدّر ضرور ہو جاتی ہے: اور جو کام آسانی سے طے ہو جاتا وہ نہیں ہو سکتا، اس میں بالعموم یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ چند پڑھے لکھے لوگوں کی دلچسپی اور ذاتی مفاد کا مشغلہ ہوتا ہے اور عوام کو اس سے کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا۔ یہ لوگ صاف طرح یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ وہ کیا چاہتے ہیں، اُن کے یہاں مذہبی

مطالبات سیاسی مطالبات سے پہلے آتے ہیں، ان کے یہاں انسانوں کی اقتصادی اور معاشی زندگی مذہب کے بعد آتی ہے۔ مختصر یہ کہ ان میں کافی رجعت پسندی پائی جاتی ہے،

اِس طرح کی مذہبی تقسیم کرتے وقت اور بالخصوص ہندوؤں کے ذکر میں اچھوت ذاتوں کا نام نہ لینا بات کو نامکمل چھوڑ دینا ہے۔ اچھوتوں کی اصلاح کا مسئلہ تو عرصہ سے چلا آرہا تھا، لیکن گاندھی جی کے فاقہ کے بعد سے اِس نے بڑی سیاسی اہمیت اختیار کرلی، کچھ مسلمان اِسے محض مذہبی چیز سمجھتے ہیں اور کچھ سیاسی، خیال یہ ہے کہ سب اچھوت ہندوؤں کی طرح حقوق پاکر ہندو قوم کی طاقت اور تعداد میں اضافہ کردیں گے اور اس طرح مسلمانوں کا فیصدی تناسب اور بھی کم ہوجائے گا، ہندوؤں کے یہاں خود اِس مسئلہ پر کئی طرح سے نگاہ ڈالی جاتی ہے، بغیر تفصیل میں گئے ہوئے جہاں تک اِس مسئلہ پر سیاسی رُجحان کا تعلق ہے یہ کسی قدر یقین کے ساتھ کہا جاتا ہے، جداگانہ انتخاب کے لئے اُنھیں ہندوؤں میں شریک ہونا ہی پڑے گا، ورنہ اگر اُن کی نشستوں کا تعین بھی کیا گیا تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اور بہت سی اقلیتیں اپنے لئے الگ جگہیں مقرر نہ کرائیں، مخلوط انتخاب جس کا آنا ضروری ہے، غالبًا اِس تفرقہ کو مٹا کر رہے گا، اب تک اُن کے ساتھ جو مراعات رکھی گئی ہیں وہ اس کا پیش خیمہ ہیں کہ مستقبل میں انھیں عام ہندوستانیوں کے تمام حقوق ضرور ملیں گے، اُن کے یہاں بھی لیڈروں کی خود غرضیوں کی وجہ سے کوئی فیصلہ کُن رائے اب تک قائم نہ ہوسکی۔ اس سلسلہ میں یہ ضرور ہوا کہ چند ہندو، مسلمان اور عیسائی تبلیغی اداروں کے لئے ایک مشغلہ ہاتھ آگیا اور مذہبی اخباروں کو کچھ مضامین کے لئے مواد۔

ہندوؤں کے بعد ہماری نظر مسلمانوں پر پڑتی ہے اور مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ اقلیت میں ہونے کی وجہ سے زیادہ تر مسلمان کسی قدر کشمکش و پیچ کے عالم میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ چونکہ وہ مذہب کو بھی ساتھ رکھنا چاہتے ہیں اس لئے انھیں ہندو اکثریت سے خوف ہے، کانگریس کی تجویزیں اور دستور العمل، ہندوستانیوں کے بنیادی حقوق کی دفعات سب اُن کے سامنے ہیں لیکن پھر بھی وہ ہمت نہیں کرتے، اُن کے یہاں شیعہ سنی، وہابی اور قادیانی، مقلد اور غیر مقلد کے اتنے جھگڑے ہیں کہ سات آٹھ کروڑ کی جماعت انھیں مسائل میں پھنس کر رہ گئی ہے، اس میں کچھ تو یقینًا سنجیدگی اور سچائی کے ساتھ مذہب کو زندگی کا جزو سمجھ کر اختلاف رکھتے ہیں اور اُس کا اظہار کرتے ہیں، لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جنھیں صرف اہم معاملات سے کنارہ کشی اختیار کرنے کے لئے مذہبی مسائل کو قومی مسائل کے سامنے لاکر کھڑا کر دینے میں لطف آتا ہے، ہندو ذہنیت کے خوف کی وجہ سے مسلمان کوئی فوری فیصلہ نہیں کر رہے ہیں، ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان میں دو گروہ خاص طور پر نمایاں ہیں، ایک تو وہ جو جنگِ آزادی میں شریک ہونے سے پہلے اپنے حقوق متعین کرا لینا چاہتے ہیں، اور اِسے شرط کے طور پر پیش کرتے ہیں، لیکن کچھ وہ بھی ہیں جو بغیر شرط کے کانگریس میں شریک ہوجانا چاہتے ہیں۔ غالبًا ہندو ذہنیت کا خوف ایک وقتی چیز ہے اور مسلمان فضا کے تقاضوں سے مجبور ہو کر جد و جہد میں شریک ہوں گے، اور یہ صاف بات بھی ہے کہ جب تک مسلمان بڑی تعداد میں کانگریس میں شریک نہ ہوجائیں گے اُس وقت تک کانگریس میں ہندوؤں کی اکثریت کا تناسب کس طرح بدل سکتا ہے۔ جب مسلمان پُرزوں کی طرح کانگریس کی مشین میں لگ جائیں گے تو اُن کے حقوق نظر انداز کئے جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوسکے گا، جہاں تک مسلمانوں کی شرکت اور عدم شرکت کا تعلق ہے وہ اِس بحث سے خارج ہے، لیکن رجحان یہی معلوم ہوتا ہے کہ جس تیزی سے مسلمان عوام کانگریس کے ممبر بن رہے ہیں وہ اُن کے کانگریس میں پوری طرح مِل جانے کا پتہ دے رہی ہے۔ جہاں تک عوام الناس کی ضرورتوں کا تعلق ہے اُس میں ہندو اور مسلمان سب برابر ہیں، اس لئے جو جماعت اُن کا دُکھ دُور کرنے کا دعویٰ کرے گی وہی اُن کی نگاہوں اور خیالات کا مرکز بن جائیگی، اب تک مسلمانوں کی کسی جماعت نے کوئی اقتصادی اور معاشی پروگرام عوام کے سامنے نہیں پیش کیا، اس لئے کوئی جماعت اُن کی تمام ضرورتوں کے پورا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی، کانگریس مذہبی معاملات سے علیحدہ ہوکر اُن کی روٹی اور زمین کا خاکہ اُن کے سامنے لاتی ہے، اس لئے اُن کا ایسی جماعت سے ہمدردی رکھنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

اس مذہبی تقسیم میں اتنی جگہ نہ صرف ہونی چاہیئے تھی۔ مگر بات میں بات نکلتی آئی اور شاید اس میں بعض ضروری باتیں تھیں جن کے بغیر رُجحانات کا مکمل نقشہ نہیں نظر نہ آتا، اب ایک اقتصادی یا طبقاتی تقسیم کا اور ذکر کرکے ہم پورے مضمون کا جائزہ لیں گے۔

اس سلسلہ میں حکومت کے عمال اور حکام کا ذکر کچھ زیادہ نامناسب نہ ہوگا، کیونکہ اُن کا معیارِ زندگی اور سیاسی نقطۂ نظر عوام سے بالکل مختلف ہوتا ہے، لیکن صحیح اقتصادی تقسیم رجعت پسند امیر اور ترقی پسند غریب ہی میں ہوسکتی ہے۔ سماج کے یہ درجات ہندوستانی سیاست کی گتھیوں کو اور پیچیدہ بناتے ہیں، امرا میں دو بڑے گروہ زمینداروں اور بڑے سرمایہ داروں کے نظر آتے ہیں۔ ہمارے تمدن میں ان دو گروہوں کی خاص اہمیت ہے کیونکہ زمیندار زمین کا مالک ہوتا ہے، اُس کی پیدائش ہی ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد برطانیہ کی خیر خواہی کے سلسلہ میں ہوئی، چونکہ زمیندار طبقہ کے لوگ کسی قدر آرام سے رہتے ہیں، اُن کے ہاتھوں میں چھوٹے پیمانہ پر حکومت ہوتی ہے اور اُن کی خدمت کرنے کے لئے رعایا کا ایک پورا طبقہ ہوتا ہے، اس لئے اُن کی بات حکومت کی نظر میں عوام کے مقابلہ میں بہت اہم ہوتی ہے، اُن کو اپنے مفاد کا اتنا خیال ہوتا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں رعایا کے عیش و آرام سے بالکل غافل ہو جاتا ہے، اور بعض صورتوں میں تو اس کا اظہار غلامی سے زیادہ بُری شکلوں میں ہوتا ہے۔ یہ طبقہ چونکہ حکومت کا بنایا ہوا ہے اِس لئے اس نے ہر معاملہ میں حکومت کا ساتھ دیا اور حکومت نے بھی اس پر خاص نظر رکھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی ترقی پسند سیاسی جماعتوں اور سامراج دشمن طاقتوں نے زمینداری کو بھی حکومت کا ایک مستحکم قلعہ سمجھا اور ہر طرح اِس سے چھٹکارا پانے کی کوشش میں مصروف رہے، اِدھر چند ہفتوں سے جب کانگریس کے ہاتھ میں وزارتیں آگئیں تو اُن کا پہلا وار زمینداروں ہی پر ہوا۔ موجودہ گورنمنٹ کے اِس حکم میں کسانوں کی کھلی ہوئی طرفداری کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ عوام کے مقابلہ میں زمیندار کی ہمدردی نہیں کرسکتی۔ آج زمینداروں کو اس سے تکلیف یقیناً پہونچ رہی ہے، کیونکہ اُن کی حکومت اُن کے معیارِ زندگی اور اثرات میں فرق آرہا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اُسی سطح پر لائے جا رہے ہیں، جہاں غریب کسان ہیں۔ یہ ایک قدامت پرست طبقہ کے دل پر چوٹ لگانے کے لئے کافی ہے، لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جب تک دولت اور زمین کی یہ غیر مساوی تقسیم دنیا میں موجود ہے، کائنات کو امن و سکون نصیب نہیں ہوسکتا۔ جب تک دولت افضلیت کا معیار ہے اُس وقت تک انسانیت کو معراج حاصل نہیں ہوسکتی۔

بڑے بڑے سرمایہ دار فیکٹریوں اور ملوں کے مالک ہیں، ہزاروں لاکھوں مزدوروں کی جانیں اُن کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ اُن کی محنت کا معمولی حصہ انھیں مزدوری کے طور پر دیتے ہیں، اور بہت زیادہ منافع خود رکھتے ہیں۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام آج تقویم پارینہ بن رہا ہے ہندوستانی سیاست بھی اِس سے متاثر ہے اور آئے دن کی مزدور اور سرمایہ دار کی کشمکش اِسے مٹا دینے پر تُلی ہوئی ہے۔ اِس سلسلہ میں وہ چھوٹے چھوٹے مہاجن بھی ہیں جنھوں نے مزدوروں اور کسانوں کا خون چوس لیا ہے، اور جن کی اُمیدیں غریب کسانوں ہی سے وابستہ ہیں۔ یہ سب رجعت پسند طبقے اپنے مفاد کے خیال سے غربت اور افلاس کا خاتمہ ابھی نہیں دیکھنا چاہتے، لیکن طوفان اس قدر تیز ہے کہ اُن کی کمزور آواز اس سے اونچی نہیں جاسکتی۔

ان رجعت پسند طبقوں کے مقابلہ میں چھوٹے زمیندار اور تاجر، کسان اور مزدور ہیں۔ ان سب میں بیداری کی لہر نہایت تیزی سے دوڑ رہی ہے۔ اور چونکہ اُن کے سامنے ایک اچھا مستقبل ہے اس لئے وہ جدّ و جہد میں پوری طرح شریک بھی ہیں۔ اگرچہ صنعت کی کمی کی وجہ سے ہندوستان کے سے بڑے ملک میں مزدوروں کی بہت کمی ہے، لیکن جو ہیں وہ زندہ اور بیدار ہیں، وہ آگے بڑھ کر حکومت کی باگ سنبھالنا چاہتے ہیں۔ وہ دنیا کے اور مزدوروں کی طرح اپنے حقوق کے لئے ہر طرح کی قربانیاں کرنے پر تیار ہیں۔ اُن کی زندگی کا ثبوت بی، این، آر، کلکتہ جوٹ مِل اور کانپور کی اسٹرائک اور ہڑتال سے اچھی طرح مل جاتا ہے، اگر مزدوروں کی تعداد اور زیادہ بڑھتی جائے اور اُن کے مطالبات قوت کے ساتھ حکومت اور سرمایہ داروں کے سامنے آئیں تو آزادی کی ساعت قریب تر آسکتی ہے،

اوپر لکھی ہوئی باتوں کی روشنی میں ہم کو ہندوستان کی فضا کے سیاسی تقاضے اور رجحانات کی رَو کا صحیح اندازہ لگانے میں آسانی ہوگی، اب تک تو ہم نے صرف ہندوستانیوں کو مختلف زاویۂ نگاہ سے تقسیم کرکے اُن کے اثرات کا جائزہ لیا ہے، اب ہمیں اور زیادہ وسیع النظری کے ساتھ اُن پر تاریخی تنقید کی روشنی میں نظر ڈالنا چاہئے تاکہ اِس تحلیل کے نتائج سامنے آجائیں۔

اب ہندوستان کی سیاست سمندروں کو پار کرکے یورپ اور افریقہ کے واقعات سے اپنا رشتہ جوڑ رہی ہے، ہمالیہ کو عبور کرکے چین، روس اور فلسطین پر نظریں جمائے ہوئے ہے۔ ایسا کرکے وہ اس تاریخی حقیقت کا ثبوت پیش کر رہی ہے کہ دنیا کا چپہ چپہ ایک دوسرے سے وابستہ ہے، جہاں کہیں بھی استعماریت کے مظالم نظر آجاتے ہیں ہندوستان کے ترقی پسند لوگ اُسے اپنی حالت سے منطبق کرکے دیکھتے ہیں، اس رجحان سے یہ فائدہ ہوگا کہ عوام بھی اِن باتوں سے باخبر رہیں گے اور انھیں اس کا احساس ابھی سے ہوگا کہ ہندوستان آزاد ہوجانے پر اپنی حکمتِ خارجہ میں کن طاقتوں کا دوست اور کن کا دشمن ہوگا

جب ہم ہندوستان کی سیاست پر ذرا وسیع اور گہری نگاہ کرتے ہیں تو ہم کو صرف دو قوتیں ٹکراتی ہوئی نظر آتی ہیں —— شہنشاہی اور شہنشاہی سے اختلاف رکھنے والی جماعتیں —— ان کے علاوہ اور تو چھوٹی چھوٹی لہریں ہیں جو اسی طرح اُٹھتی ہی مٹتی رہتی ہیں۔ لوگ ایک طرف سے ٹوٹ کر دوسری طرف شریک ہوتے رہیں گے اور دونوں فریق کی قوتیں بدلتی رہیں گی لیکن وہی جماعت فتحمند اور کامیاب ہوگی جس کے پیچھے عوام کے جائز حقوق اور مطالبات کی طاقت ہے۔

ابھی یہاں اصلاحی ذہنیت (Reformist Mentality) بھی موجود ہے اور اکثر تو وہ لوگ اس میں مبتلا دیکھے جاتے ہیں جو اپنے کو ترقی پسند ظاہر کرتے ہیں۔ جب حکومت کی جانب سے تھوڑے سے مطالبات مل جاتے ہیں یا ملنے کی اُمید ہوتی ہے تو انقلابی شعور کی باڑھ کچھ ضرور کُند ہوجاتی ہے اور ذرا سے حقوق کے مل جانے سے فضا میں سکون اور مطالبات کی طلب میں کمزوری آجاتی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو زیر سایۂ برطانیہ آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اِن کی طاقت عوام کے مطالبات کے مقابلہ میں اتنی کمزور ہے کہ اسے کوئی اہمیت نہیں دی جاسکتی، اُن کے پاس کوئی اخلاقی یا قومی دلیل اس کی نہیں ہے کہ وہ کیوں ایسا چاہتے ہیں، یا تو وہ متعصب ہیں یا رجعت پسند۔ اِسی سلسلہ میں ایک بات اور کہتا چلوں جو میرے ذہن میں عرصہ سے ہے، اقلیتوں میں زیادہ تر مسلموں کے گروہ پائے جاتے ہیں جو اصلاح پسند رہنمائی (Reformist Leadership) کی وجہ سے ترقی پسند راستہ پر نہیں آجاتے۔ میں مسلم لیگ کو بھی ایک ایسی ہی انجمن تصور کرتا ہوں۔ جو عوام اُس میں شریک ہیں اُنھیں ترقی کے راستے ابھی دکھائے نہیں گئے، ورنہ وہ آسانی سے اُس انجمن میں شریک ہوجائیں گے جو اُن کی روٹی اور آزادی کا حل پیش کرتی ہے۔ اس وقت صرف آزادی یا تعین حقوق کا سوال نہیں ہے بلکہ بھوک اور کام کا سوال اُس سے زیادہ اہم اور خطرناک انداز میں اُٹھ رہا ہے۔ جو حکومت، وہ قومی ہو یا غیر ملکی، ان سوالات کا حل نہ بتائے گی اُسے انقلاب کا سامنا یقیناً کرنا پڑیگا۔

یہ خیال فضا میں پھیلا ہوا ہے کہ اب ہر طرح کی اجارہ داری کا خاتمہ ہوجانا چاہئیے۔ زمین کا مالک صرف زمیندار یا حکومت نہیں رہ سکتی، فیکٹریاں سرمایہ داروں کی ملکیت نہ رہیں اور تجارت اور پیداوار پر کسی طرح کی پابندیاں عاید نہ کی جائیں۔

اگر چہ یہ موقع نہیں لیکن چونکہ تشدد اور عدم تشدد ہندوستانی سیاست کا ایک جزو بن چکے ہیں، اس لئے دو لفظ اِن پر لکھ دینا چاہئیے۔ اس وقت قریب قریب تمام ہندوستانی اس بات پر متفق ہیں کہ مصلحتِ وقت کے لحاظ سے ہمیں عدم تشدد ہی کا پابند رہنا چاہئیے۔ جیسا کہ پہلے کسی جگہ کہا گیا وہ لوگ بھی جو تشدد کے ماننے والے تھے، اُسے چھوڑ رہے ہیں،

ہندوستانی سیاسی جماعتوں کے انتہا پسند طبقے بھی اپنے طریق کار میں مختلف راستے اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ اشتراکیت اور آزادی کے مطالبات کو ساتھ ساتھ چلنا چاہئیے یا پہلے آزادی حاصل کرکے اُن تمام مدارج کو طے کرنا چاہئیے جو ایسے انقلاب کے لئے ضروری ہیں، یہ مسئلہ روز بروز بڑی اہمیت حاصل کرتا جا رہا ہے۔ ہندوستان کے اشتراکیوں میں دونوں خیال کے لوگ موجود ہیں، دونوں اپنے لئے کارل مارکس اور لینن ہی کو سرچشمہ بنائے ہوئے ہیں، لیکن پھر بھی ان میں اختلاف کی خلیج نہایت وسیع ہے، کانگریس سوشلسٹ پارٹی سے تعلق رکھنے والے اور ایم این رائے کے متبعین ایک دوسرے کو غدار کی حیثیت دیتے ہیں، مسئلہ اہم ضرور ہے اور اشتراکیت کے پروپیگنڈے کی بھی بڑی ضرورت ہے۔ تاہم ابھی سیاسی ضرورت یہی ہے کہ عوام کی ذہنیت کو مختلف مسائل میں الجھا نہ دیا جائے، پہلا مطالبہ یقیناً آزادی کا ہونا چاہئیے، اور ساتھ ہی عوام کے ساتھ جس قدر بھی کیا جاسکے کیا جائے، قوت کے ہاتھ میں آجانے پر ضرورتِ وقت کا لحاظ رکھتے ہوئے عوام کے لئے نئی دنیا پیدا کی جائیگی۔

ہمیں کارل مارکس یا کسی اور کے اقتصادی نظریہ کو آنکھ بند کرکے نہ ماننا چاہئیے کیونکہ ہندوستان کئی حیثیتوں سے ابھی دنیا کے دوسرے ملکوں سے مختلف ہے، ترقی پسند سیاسی اور اقتصادی نظریوں کی روشنی میں ہندوستان کی خصوصیات کا لحاظ رکھ کر قدم اُٹھانا پڑے گا۔

ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے اختلافات کچھ بھی ہوں لیکن تقدیر کی انگلی اس شاہراہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے جس پر سب کو چلنا ہی وقت کا مطالبہ ہے کہ سامراج، غلامی، بھوک، بیکاری اور افلاس دنیا میں نہ رہیں اور انسانوں کی ایک بڑی برادری قائم ہو جس میں رنگ روپ اور قوم و نسل کے امتیازات مِٹ جائیں۔

محبوبہ کی شرط

تمہارے ہجر میں مرنا قبول کرلوں گی — غموں میں جی سے گزرنا قبول کرلوں گی

شبوں کو درد کے دریا میں ڈوب جاؤنگی — جگر کو سوز کے خنجر سے گدگداؤں گی

وفورِ گریہ سے آنکھیں خراب کرلوں گی — بہارِ زیست کو وقفِ عذاب کرلوں گی

غموں کی راہ پہ توڑے گا دم شباب مرا — جلے گا آہ کے نغمات سے رباب مرا

کسی سکھی کو کسی گودمیں جو پاؤں گی — جگر کو تھام کے چوکھٹ پہ بیٹھ جاؤں گی

کبھی جو کالی گھٹائیں فلک پہ چھائیں گی — تو بجلیاں سی رگ و پے میں دوڑ جائیں گی

یہ سب درست کہ تڑپا کروں گی راتوں کو — تمہارے ہجر میں آہیں بھروں گی راتوں کو

غرورِ غرب مگر جب تک نہ شرمائے
دیارِ ہند میں جب تک نہ پھر بہار آئے

اسیرِ دامِ غلامی نہ ہوں رہا جب تک — ملے نہ داغِ غلامی کا خوں بہا جب تک

شرابِ وصل کا اک گھونٹ بھی نہ پاؤگے
تڑپ تڑپ کے یونہی زندگی گنواؤگے

الطاف مشہدی

بلیدان

تقی، مہرولی

یہ اس وقت کی بات ہے، جب ہمارا بچپن تھا۔ ہم ایک ساتھ پڑھا کرتے تھے، پاس گھر ہونے کی وجہ سے ہمیشہ ایک ساتھ رہنا ہوتا تھا، پڑوس میں اور بھی ہم عمر ساتھی تھے۔ مگر ہم ایک دوسرے کے بغیر کسی کھیل کود میں حصہ نہ لیتے تھے۔ مدرسے سے بعد کا سارا وقت کھیل کود میں صرف ہوتا تھا، میں مٹی کے گھروندے بناتا تھا اور وہ پھول پتیوں سے ان کی سجاوٹ کرتی تھی۔ ایک دفعہ سنا تھا، کہ "جس کا مٹی کا گھر بگڑ گیا سمجھو، اس کا اصلی گھر بھی بگڑ گیا"۔ اس لئے ہم اپنے مٹی کے گھروندوں کی زیادہ حفاظت کرتے تھے، برسات کے دنوں میں ہماری مصروفیتوں میں زیادہ اضافہ ہو جاتا تھا، وہ جھولتی تھی اور میں جھلاتا تھا۔ اسے صرف دو گیت آتے تھے، اور وہ بھی ادھورے۔ "میرے پیا کا یہی پتہ ہے۔ سانوری صورت بانکی ادا ہے" جب وہ گاتی تھی تو نظریں نیچی اور لبوں پر مسکراہٹ ہوتی تھی۔ مگر "ساون آیا پی گھر جائیں" کا گیت گانے میں اس کی آواز بھرّا جاتی تھی، اور آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے تھے —— نہ معلوم کیوں! —— تہواروں میں ہماری خوشیوں کی انتہا ہوتی تھی، ہولی کی رنگ رلیاں، دیوالی اور اور بسنت کی مسرتیں نہ معلوم ہمیں کس دنیا میں پہنچا دیتی تھیں۔ دسہرے کے دنوں میں اس کا معصومانہ انداز سے سیتا بننا آج تک یاد ہے۔

وقت کو گزرتے کوئی دیر نہیں لگتی۔ کھیل ہی کھیل میں دس سال کا عرصہ گزر گیا۔ بچپن کی دلچسپ باتیں سنجیدگی اور بردباری میں تبدیل ہو گئیں۔ بڑھاپن نے اس کی مصروفیتوں میں اضافہ کر دیا۔ وہ اب گھر کے سارے کام کاج کی ذمہ دار تھی، سورج نکلنے سے پہلے ہی پیسنے اور گھر کی صفائی سے فارغ ہو جاتی تھی، اس کے بعد ماں کے ساتھ پانی لاتی اور بعد میں رسوئی کا کام کر کے سینے پرونے میں مشغول ہو جاتی تھی۔ مدرسہ چھوڑنے کے بعد یہ اس کا ہر روز کا پروگرام تھا جس میں کسی کمی کی گنجائش نہ تھی۔ وقت کے لحاظ سے ہماری راہ و رسم اور ملاقاتوں میں کوئی کمی نہ ہوئی تھی، ہم اب بھی ایک ساتھ مندر جاتے تھے۔ ایک ساتھ بیٹھ کر مختلف مسائل پر بات چیت کرتے تھے۔ ہر تہوار پر وہ میرے ٹیکہ لگاتی تھی، کشیدہ کاری کا اسے بہت شوق تھا۔ میں اسے کتابوں میں سے نئے نئے ڈیزائن بتاتا تھا۔

آخر وہ دن بھی آپہونچا جب مجھے کالج کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے گاؤں کو خیرباد کہنا پڑا، ہم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے میں گورنمنٹ کالج میں داخل ہو گیا، تھوڑے ہی عرصے میں شہر اور کالج کی فضا نے میری زندگی میں نمایاں تغیر پیدا کر دیا، ہندوستان کی تحریکِ آزادی کا زمانہ تھا، کالج میں آئے دن ہڑتالیں ہوتی رہتی تھیں، بڑے بڑے جلسوں اور جلوسوں میں شامل ہونے کا موقع ملتا تھا، لیڈروں کی تقریروں، مہلاؤں کی گرفتاریوں بچوں اور بوڑھوں کی قربانیوں نے مجھے اپنی ذمہ داری یاد دلائی، انگریزی سامراج سے بغاوت میں نے اپنا نصب العین بنا لیا۔ کالج کی تعلیم چھوڑ دیہاتوں میں گورنمنٹ کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا، آخر ایک روز کسانوں کو مالگزاری ادا نہ کرنے کی تلقین کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ مجسٹریٹ نے بغاوت کا جرم عائد کرتے ہوئے تین سال قید سخت کی سزا تجویز

کردی سزا کی مدت سنکر چہرے پر حزن وملال کے آثار نمایاں ہوگئے۔ تنہائی کے تصور نے سکونِ قلب اور دماغی توازن کو درہم برہم کردیا۔ یاس نے معافی مانگنے کو کہا، لیکن عزم واستقلال نے کچھ ڈھارس بندھائی، اس وقت لاکھوں پرش اور استریوں کی مصیبتوں کا خیال آیا، مادرِہند کی آزادی کے سپنے نے جسم میں ایک نئی روح پھونکدی "مرجانا اس ذلت سے ہزار درجہ بہتر ہے، وطن کی آن اور آزادی کے وقار کو صدمہ پہنچانا کمینہ اور ذلیل لوگوں کا کام ہے، اعلیٰ اور عمدہ مثالیں قائم کرکے دوسروں کو ترقی کا موقع دو" ان الفاظ کے ساتھ دل نے ترجمانی کی اور مجسٹریٹ کے معافی مانگنے کے سوال پر "نہیں" کہہ کر میں نے اپنا فرض ادا کردیا۔

اب میں جیل کی چار دیواری میں تھا۔ سیاسی قیدی کی حیثیت سے میری کڑی نگرانی کی جاتی تھی۔ مجھے کسی سے بات کرنے کی اجازت نہ تھی۔ میری تمام ڈاک اور خبروں پر سنسر تھا۔ ڈرانے اور بزدل بنانے کے لئے ہر طرح کی سختی کی جاتی تھی۔ بعض دفعہ جب دو دو دن تک کھانا نہ ملتا تھا، تو گھاس اور پتیوں سے پیٹ بھرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ جیل کی تنگ وتاریک کوٹھری میں رات کا زیادہ حصہ سانپ اور دیگر زہریلے جانوروں کے ڈر سے جاگنے میں بسر ہوتا تھا۔ زبانی طور پر بارہا اس کے خلاف احتجاج کیا۔ مگر کچھ پیش نہ چلی۔ آخر اس سے مخلصی حاصل کرنے کے لئے اپنی زندگی کی بازی لگادی، دو ماہ بعد جب میری حالت بہت نازک ہوگئی گورنمنٹ کی عرضداشت مجھے وصول ہوئی جس میں اُس نے میرا پہلا مطالبہ منظور کرلیا۔ اور باقی کے متعلق "مقاطعہ جوعی بند کرنے کی صورت ہی میں کچھ غور کیا جاسکتا ہے" میں نے بھوک ہڑتال بند کردی، میرے نزدیک پہلا مطالبہ زیادہ اہم تھا، مجھے اپنی تکالیف کی کچھ زیادہ پروا نہ تھی، لیکن میں یہ چاہتا تھا، کہ میرے نام کے خط انسپکٹر جیل کے پڑھنے کے بعد مجھے ضرور دیدئے جایا کریں۔ خواہ اُن کے جواب لکھنے کی اجازت دی جائے یا نہیں۔

علاج سے رفتہ رفتہ میری حالت ٹھیک ہوگئی، مجھے اب کسی بات کی خواہش نہ تھی، جیل کی سختیاں میری زندگی کے جزو بن گئی تھیں۔ میں انھیں خندہ پیشانی سے برداشت کرتا تھا۔ سختیوں کا جتنا زیادہ بوجھ اٹھاتا تھا اتنا ہی اپنے آپ کو زیادہ ہلکا محسوس کرتا تھا۔ مہینے میں دو دفعہ ڈاک آتی تھی، اور ہر ڈاک میں میرا کوئی نہ کوئی خط ضرور ہوتا تھا، گاہے گاہے کسی دوست کا خط آجاتا تھا۔ ورنہ تمام خط رشتہ داروں کے ہوتے تھے جس خط کی سب سے زیادہ خواہش تھی اور جس کے لئے یہ سب کیا گیا وہ ابھی تک وصول نہ ہوا تھا۔ اور لطف یہ ہے کہ گھر کے بھی تمام خط اس کے ذکر سے خالی ہوتے تھے، طبیعت میں ایک الجھن سی پیدا ہوگئی، دل میں طرح طرح کے شبہات جاگزین ہونے لگتے، خطوں کا پڑھنا بالکل بند کردیا۔ ایک روز جب میں خشک گھاس کے گٹھے باندھ رہا تھا، جیلر نے ایک کھلا لفافہ میرے سامنے لاکر ڈال دیا۔ میں نے جیلر کی طرف بے پروائی سے دیکھا اور پھر اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ گھاس سمیٹتے وقت میری نظر لفافہ کے پتے پر پڑی۔ پتہ ہندی میں تھا۔ میرا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔ خودبخود ہنسی آگئی، کام چھوڑکر فوراً خط پڑھنا شروع کردیا ——— خط پورا پڑھا یا نہیں، یہ مجھے معلوم نہیں۔ بیہوشی کی وجہ بھی میری سمجھ میں نہ آئی، خط کی عبارت کو دوبارہ یاد کرنے کی کوشش کی، لیکن وہ بھی یاد نہ آسکی، مجبوراً روشنی میں خط کو دوبارہ پڑھا، اس میں لکھا تھا،

سرمایۂ حیات!

سلام، نیاز، عقیدت!

تم جیل کی چار دیواری میں بیٹھے ہو، اور میں گھر کی، تم پر حکومت کی پابندیاں ہیں، مگر میں مذہب، سماج اور رسم درواج کی پابندیوں میں جکڑی ہوئی ہوں، شاید سمجھ گئے ہوگے کہ میرا کیا مطلب ہے، میرے اتنے عرصے تک خط نہ لکھنے کا کیا باعث تھا۔ اور آئندہ نہ لکھنے کا کیا باعث ہوگا، پیارے! میں ماضی کے واقعات سے خط کو طویل کرنا نہیں چاہتی، اس سے کیا فائدہ؟! وہ خوشیوں کے دن تھے جو بیت گئے۔ اب تو ہمیں مستقبل کا سوگ منانا ہے، اس دو سال کے عرصے میں کیا کیا واقعات پیش آئے ان سب کے لئے تو بہت وقت درکار ہے۔ میں تو صرف اہم واقعات بتانا چاہتی ہوں، تم یہ تو جانتے ہو کہ تمہارے کالج جانے سے پہلے ہی سے ہم پر مذہب اور سماج کی قیدیں شروع ہوگئی تھیں۔ ایک روز میں چندرمان کی چاندنی میں تمہارے سندیسے کا جواب لکھ رہی تھی۔ اس میں میں نے اپنے اور تمہارے مستقبل کو درخشاں بنایا تھا، اور وہ وہ باتیں کہہ ڈالی تھیں جو اب تک تم سے نہ کہی تھیں۔ بچپن کی معصوم باتوں کو ویواہ کے پریم بندھن میں باندھا تھا، خط کے لکھنے میں زیادہ دیر ہوگئی۔ پتا جی کو کچھ شبہ ہوا، اُنھوں نے

خط میرے ہاتھ میں سے لیکر پڑھنا شروع کر دیا۔ خط کے اصل مقصد کو پاکر انکا
چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ مجھے تمام رات نیند نہ آئی۔ بار بار خط کی عبارت کو
سوچا۔ ہر دفعہ کوئی غلطی نکالنے کی کوشش کی۔ مگر ناکامیاب رہی۔ میرے
ساتھ کیا سلوک ہوا۔ وہی جو ایک ہندوستانی لڑکی کے ساتھ ہوتا ہے،
میں اب اپرادھن تھی۔ ننگِ خاندان تھی، ان کے ناموس پر کلنک کا ٹیکہ
تھی، میری آنکھ کا پانی ڈھل گیا تھا —— لیکن یہ سب کچھ گھر کی
چار دیواری تک محدود تھا۔ باہر اس کا ذرا چرچا نہ تھا۔ وہ اپنی بدنامی
سے ڈرتے تھے۔ باہر چرچا ہونے کی صورت میں سارے سنسار کی انگلیاں
اٹھنے کا ڈر تھا۔ تمہارے گھر سے وہی تعلقات تھے، صرف میرا آنا جانا بند
ہو گیا تھا —— اب مکان تبدیل کئے ہوئے دو سال کے قریب
عرصہ ہو گیا ہے۔ گھر کی حالت کچھ سکون پذیر دکھائی دیتی ہے، میں اب بالکل
خاموش ہوں۔ اور میری یہ خاموشی میرے "تبدیلِ قلب" کے مترادف سمجھی
جا رہی ہے۔ تبدیلِ قلب کا سوال کہاں تک صحیح ہے۔ میں اسے زیادہ
واضح نہیں کر سکتی۔ ہاں اتنا جانتی ہوں کہ سماج اور مذہب سے نکلنے کا
کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ تاتاجی کا دن رات کا رونا بے چین کئے دیتا
ہے۔ اپنے بعد ان کی اور تاتاجی کی حالت کا تصور مجھے کسی فرض کی یاد
دلا رہا ہے، اور وہ فرض کیا ہے" فرمانبرداری، ان کی ہر آگیا کا پالن کرنا"
چاہتی تھی کہ کچھ تمہاری سیوا کرتی۔ تمہارے چرنوں میں اپنا جیون گزارتی،
مگر کیا کروں، مجبور ہوں۔ بے بس ہوں، مذہب اور سماج کی پابندیوں میں
جکڑی ہوئی ہوں۔

نہ معلوم اس بدنصیب ملک میں کتنے پریم والے دل سماج اور رسم
و رواج کا شکار ہوتے ہیں۔ کل تک کانوں سے دوسروں کی محبت کے
افسانے سنے اور آنکھوں نے سینکڑوں بردوش انسانوں کو مذہب
اور رسم و رواج کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھتے دیکھا۔ مگر آج ہم خود اپنے
آپ کو اس مقصدِ اعلیٰ کے لئے تیار پا رہے ہیں۔ نراشا ہونے کی کوئی وجہ
نہیں۔ ویروں کی دنیا میں نراشا مہا پاپ ہے، دیش کی سیوا اپنی
زندگی کا سب سے بڑا آدرش بنالو۔ اور بس —— بھول جاؤ۔ اس بات
کو بالکل بھول جاؤ، کہ تم نے کبھی کسی سے پریم کیا تھا۔ آزادی کی جدوجہد میں
اپنی زندگی جیل کی چار دیواری میں گزارنا، اور کبھی بھول کر بھی اس
سرزمین کا خیال نہ کرنا، جہاں تم نے عمر کے بیس سال کسی کے ساتھ مل جل کر بسر
کئے تھے۔ تمہارے بعد بستی کا نقشہ ہی بدل جائے گا۔ نہ وہ گلیاں ہوں گی،
جہاں تم نے اپنا بچپن گذارا۔ نہ وہ بازار جہاں تمہاری دلبستگی کا سامان
موجود تھا، اور نہ وہ باغ اور کھیت، جہاں ساون اور بسنت کے دن
گزرتے تھے۔ آج سے تمہارے بچپن کی کملا بھی رخصت ہو رہی ہے، اب
اگر تم یہاں آئے تو کیا فائدہ؟! کس سے ملاقات کرو گے، کس سے بولو گے
اور کسے دیکھو گے، سب اجنبی ہوں گے —— بستی اور بستی والے سب!!

تم آزادی کی دیوی کے چرن لو اور میں سماج اور رسم و رواج کی
قربان گاہ پر بھینٹ چڑھتی ہوں، مجھے بیوفا نہ کہنا۔ اس سے مجھے دکھ ہوگا،
غیر سے شادی ہو جانے پر بھی کملا تمہاری ہوگی —— صرف تمہاری،
ہمیشہ اپنے من کے مندر میں تمہاری مورتی کی پوجا کیا کرونگی۔ راتوں کے
سپنوں میں تم سے ملاقات ہوا کرے گی، برکھا کی بہاروں میں پپیہا اپنی پی
پی سے تمہاری یاد دلائے گا۔ اور میں تمہارے سمرن میں "برسات آئی برسات
نہیں" کا گیت گایا کروں گی۔

ایشور کرے ہمارا بلیدان آخری بلیدان ہو، سماج رسم و رواج
اور انگریزی سامراج سے آزاد ہو کر ہمارا دیش سچی قومیت کی جیتی جاگتی
تصویر بن جائے۔

بدنصیب

تمہاری داسی، کملا

کاش میں ہندو ہوتا! مگر کیوں؟! اگر ہمارا ایک مذہب نہیں تو
کیا ہوا۔ اس سے ہمارا ساتھ کیوں چھوٹے، دوسرے مذہب سے تعلق
رکھنا کیا گناہ ہے، مذہب کو محبت سے کیا واسطہ۔ سماج کو ہمیں جدا کرنیکا
کیا آدھیکار ہے، ان خیالات نے میرے دماغ پر تسلط پا لیا۔ خط نے
میری دنیا ہی بدل ڈالی۔ بغاوت کا جذبہ میری رگ رگ میں پیوست
ہو گیا۔ میں اب حکومت کا باغی تھا، سماج کا باغی تھا، اور ان سب سے
زیادہ مذہب کا باغی تھا، مگر اس وقت مجھے بدیشی حکومت کی موجودگی
میں ملک کا سماج اور مذہب سے نجات حاصل کرنا ذرا مشکل نظر آیا، اسلئے
سماج اور مذہب کے خلاف کوئی عملی قدم اٹھانے کا ارادہ ملتوی کر دیا،
اور اپنی ساری توجہ حکومت کے خلاف بغاوت کی اسکیم مرتب کرنے

میں صرف کردی۔ مجھے عدم تشدد پر اب کوئی اعتماد نہ تھا۔ میرے نزدیک دہشت انگیزی اور طاقت ہی بدیشی حکومت سے نجات کا ذریعہ تھی۔ رہائی کے فوراً بعد میں نے انقلابی پارٹی کی بنیاد ڈالی، اس کے قواعد مرتب کئے اور خفیہ طور پر سارے ملک میں اس کی شاخیں کھولیں۔ چند ہی دنوں میں اس کی طاقت بڑھ گئی۔ ممبروں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ ملک میں آئے دن دہشت انگیزی کے واقعات ہونے لگے، دہشت انگیزی کے ساتھ ساتھ پارٹی کا پروپگنڈا بھی ہوتا رہا۔ افسروں، فرقہ پرست لیڈروں اور سرمایہ داروں کے پاس ہزاروں خوف آمیز خطوط ڈالے جاتے تھے۔ روپیہ حاصل کرنے کے لئے بنکوں، ریلوں اور ڈاکخانوں پر ڈاکہ زنی کی جاتی تھی، اکثر موقعوں پر پولس اور فوج سے دست بدست جنگ ہوتی تھی، پارٹی کی طرف سے سرخ اشتہارات تقسیم ہوتے تھے جس میں پبلک کو حکومت سے بدظن کیا جاتا تھا، ان کو منظم بغاوت کی ترغیب دی جاتی تھی، دہشت انگیزی کے ساتھ ساتھ حکومت کی سخت گیری میں بھی اضافہ ہوگیا۔ تعزیری پولس کا بار شہروں اور قصبوں پر ڈال دیا گیا، خاص آرڈیننس جاری کئے گئے۔ نوجوانوں کی کڑی نگرانی کی جانے لگی، اُن کے چلنے پھرنے کے اوقات تک معین کر دئے گئے۔ تھوڑے ہی دنوں میں لاتعداد مقدماتِ سازش قائم ہوگئے۔ انقلابیوں کو عمر قید حبس دوام اور پھانسیوں کی سزائیں دی جانے لگی، کچھ عرصہ بعد حکومت کی ہمہ گیر پالیسی اور عوام کے تعاون نے دہشت انگیزی کی تحریک کو سست کر دیا، لیکن وہ ابھی تک مجھے گرفتار کرنے میں ناکامیاب رہی، میں برابر اس کے خلاف بغاوت کا علم بلند کرتا رہا۔ افسران اور تعاون پرست طبقے کے خلاف میری سرگرمیوں میں کسی قسم کی تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی سلطانی گواہوں کی مدد سے حکومت نے پارٹی کے تمام خفیہ اداروں کا پتہ چلا لیا تھا۔ میری گرفتاری کے لئے پچاس ہزار کا انعام مقرر کیا گیا، اسپیشل خفیہ پولیس مختلف جگہوں پر تعینات کر دی گئی۔ میں نے شہروں کو چھوڑ قصبوں اور گاؤں میں رہنا شروع کر دیا۔

دوپہر ڈھل چکی تھی، دیہات کے لوگ تالاب کے کنارے بسنت کا جشن منا رہے تھے۔ عورتیں بسنتی کپڑوں میں ملبوس پوجا کی تھالیاں ہاتھوں میں لئے مندر کی جانب چلی آرہی تھیں۔ بسنت کا دن تھا، مورتی سر سے پاتک سرسوں کے پھولوں میں ڈھنپی ہوئی تھی۔ عفت مآب دیویاں تیتلیوں کی طرح اس پر ٹوٹی پڑتی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے معصومانہ انداز میں دیوی کے چرن لے رہے تھے، شوخ و شریر لڑکیاں ایک دوسرے کے صندل کی ٹیکے لگا رہی تھیں ——— میں! — میں بھی ایک اجنبی کی حیثیت سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میری نگاہ بار بار بچوں کے خوبصورت مٹی کے گھروندوں پر پڑ رہی تھی، میں ان کی معصومانہ حرکتوں کو بڑے انہاک سے دیکھ رہا تھا۔ —— ناگاہ بھیڑ میں ابتری پیدا ہوئی لوگ بدحواس سے نظر آنے لگے۔ بچے سمٹ سمٹ کر ایک جا ہوگئے —— "سپاہی" ایک دیہاتی نے کہا — میرا ہاتھ ایک دم پستول پر پڑا، اور پیشتر اس کے کہ مسلح سپاہیوں کا دستہ مجھے گرفتار کرے میں نے فائر کرنے شروع کر دئے، پولس کی جانب سے بھی فائر شروع ہوگئے میلے میں گڑبڑ مچ گئی۔ عورتوں اور بچوں نے چیخنا شروع کر دیا۔ میں ایک درخت کی آڑ لئے فائر کر رہا تھا، پشت کی جانب سے میری پوزیشن خطرے میں تھی، اس طرف سے بار بار فائر ہو رہے تھے۔ مندر کا دروازہ بند تھا، عورتوں اور بچوں نے اس کے اندر پناہ لے رکھی تھی۔ میری حالت خراب ہوتی گئی۔ زخموں کی وجہ سے بایاں بازو بالکل بیکار ہوگیا۔ مندر کے سوا کوئی محفوظ جگہ نظر نہ آئی، دیوار تک آنے میں شدید مقابلہ کرنا پڑا۔ اس پر چڑھنے کی کوشش میں میرے ہاتھ سے پستول گر پڑا میں اب مندر کے اندر تھا، مگر نہتا، میری حالت بالکل ندھال ہوگئی تھی، جسم زخموں سے چور چور ہوگیا تھا، مگر میں نے اپنا فرض ادا کر دیا تھا، مجھے اب زندگی کے بچاؤ کی کوئی فکر نہ تھی —— اور جب ایک سپاہی نے اپنا پستول سنبھالا اور اس کا رُخ میری جانب کیا تو میں نے آنکھیں بند کرلیں، خاموش لبوں سے ہندوستان، ہندوستان، کے مبارک لفظ ادا کئے، دل نے اس کی پوجا کی، اور تصور نے اُسے پُرجنت نشان بنا دیا،

پستول کی آواز سے آنکھیں وا ہوئیں۔ میں ابھی تک زندہ تھا —— مگر —— کملا!

تم یہاں کہاں؟

آج تو بسنت کا دن ہے!

بسنتی کپڑوں کے ساتھ پوجا کرتی تھی؟! میں نے کہا

یہاں میری شادی ہوئی ہے۔ ساجن!

اب بسنت کہاں!!

بسنت تو بچپن میں منایا کرتے تھے۔
تمہارے ساتھ تو نا!! اس نے کہا۔
گولی سینہ سے پار ہو چکی تھی۔ ایک دفعہ پھر آنکھیں کھولیں۔ میری
طرف حسرت سے دیکھا۔ اور تشدد آزادی حاصل کرنے کا غلط راستہ تھا۔
پہلے دیش کی سماجی حالت کو درست کرو۔ اس کو رسم، رواج کے بندھن سے
چھڑاؤ" کہتے ہوئے آنکھیں بند کرلیں۔

عیّاشِ حرم

تان سے قوال کی گونجی ہوئی ہے خانقاہ — رونما ہے آنسوؤں کے بھیس میں شرمِ گناہ
قلب کو پگھلا رہا ہے زمزموں کا زیر و بم — فاقہ کش مزدور کے صبر و تحمّل کی قسم
آنکھ میں انگڑائیاں لیتا ہے طوفاں نوح کا — تپ رہا ہے آنچ سے نغمے کی سونا روح کا
مطربِ مستانہ ایسی برمحل دیتا ہے تال — ایک ہی سانچے میں ڈھل جاتے ہیں ماضی اور حال
لیکن اس محفل میں بھی رنگِ ریا پاتا ہوں میں — آہ اس مکروہ منظر سے گڑا جاتا ہوں میں

سامنے بیٹھا ہے وہ اک صوفیٔ احرام پوش — ظاہرا درویش اور باطن میں درویشی فروش
ابروؤں میں مکر کی جنبش، نگاہیں بے لگام — گفتگو میں رنگ بھرنے کے لئے وارث[1] کا نام
تشنگی اصنام کے بوسوں کی ہونٹوں سے عیاں — دل میں سیلابِ ہوس اشعارِ رنگیں برزباں
گندمی رنگ اور ہونٹوں میں تبسم کے چراغ — تجربوں کا دیدۂ بدبیں کے ڈوروں میں سراغ
عطرپاشی کرکے گیسوے سیہ پالے ہوئے — دامِ عیاشی پہ دانے فقر کے ڈالے ہوئے
پان کی سُرخی لبوں پر شاہدِ خونِ شباب — فطرتِ بیباک پر رنگِ تصوف کی نقاب
صندلی گنجان ڈاڑھی میں سفیدی کی نمود — ہرزہ گوئی کو چھپانے کے لئے وردِ درود

[1] حاجی وارث علی شاہ صاحبؒ

ہر نفس میں زخم خوردہ پارسائی نالہ ریز بے ادب خود بیں نگاہوں میں ہوس کی جست و خیز

معصیت کے ذوق پر بے چینیاں چھائی ہوئیں رُوح کی سب زردیاں احرام پر آئی ہوئیں

~~~~~~~~~~

ایک خوش گِل، خوش ادا، خوش رنگ شاہد درکنار چومتا ہے جس کی پیشانی کو جُھک کر بار بار

گفتگو ہے بندۂ بے دام کرنے کے لئے اپنی فطرت کی وَبا کو عام کرنے کے لئے

فقرہ فقرہ سے ریا کی پختہ کاری آشکار ہر تبسم شاطرانہ، ہر نظر عصمت شکار

فقر کی سنجیدگی پر بیخودی تزویر کوش دل میں دھڑکن، دست و پا میں تھرتھری، سینے میں جوش

یہ لباسِ فقر کے پردے میں دل چکٹا ہوا دشمنِ دیں جامۂ احرام میں لپٹا ہوا

آہ یہ صورت، یہ سیرت، شرم کر اے نابکار! کیا ہَوَس رانی بھی ہے تعلیمِ مرشد میں شمار؟

مرحبا اے نقش بندانِ تصوّف مرحبا! کیا اسی کو صوفیا کہتے ہیں تسلیم و رضا!

شمعِ ایمائی تمہاری جلوۂ اصنام ہے منہ سے کچھ پھوٹو! تصوّف کیا اسی کا نام ہے؟

کیا تمہیں ہو پیروانِ وارثِ عالم پناہ[1]؟ کیا ملا ہے تم کو ورثہ میں یہی ذوقِ گناہ؟

کیا فقیری ہے یہی تکمیلِ فنِ حرص و آز؟ منتقل ہوتا ہے سینوں میں یہی سوز و گداز؟

کیا اسی تعلیمِ صیادی پہ ہیں نازاں بزرگ رفتہ رفتہ جس سے آدم زاد بن جاتا ہے گرگ

راتدن گھولو گے آخر شیر میں شر کب تلک زہر دوڑائیں گے یہ زلفوں کے اژدر کب تلک

اب تمہارا یہ طلسمِ ہاؤ ہو توڑوں گا میں

رازہائے خرقہ پوشی کھول کر چھوڑوں گا میں

احسان دانش

[1] اللہ، اللہ، "وارث" اور "عالم پناہ" اللہ، اللہ، اللہ، اللہ
~~~~~~~~~~

مردِ مضحک

مترجمہ اسرائیل احمد خان

(سلسلے کے لئے جون، جولائی مشترک نمبر کلیم)

(۱۶)

تیر در کماں و صیاد در کمیں

جو زیانہ کے محاذِ مدافعت میں سب سے زیادہ کمزور نقطہ معلوم کرنا، اور اُس نقطے پر اک ضربِ کاری لگانا، یہ تھا بارکلفیڈرد کا مقصدِ وحید! اب سوال یہ تھا کہ اس منصوبے کو بروئے کار کیونکر لایا جائے؟ یہاں ایک ایک قدم اک "منزلِ قیامت" تھا! ؎

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک؟

خام کار و ناتجربہ کار بدمعاش اپنی کارستانیوں کا پہلے سے اک خاکہ تیار کر لیتے ہیں، اور اُسی لائحۂ عمل کے مطابق چلنا چاہتے ہیں۔ بخلاف اس کے جہاندیدہ اور سرد و گرم چشیدہ بانیانِ کار "قبل از وقت پروگرام" کی پالیسی پر عمل پیرا نہیں ہوا کرتے۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ اصول کار قابلِ عمل نہیں! ہم "بندگانِ جبر" مستقبل پر کوئی "اختیار" نہیں رکھتے! یہ کیونکر ممکن ہے کہ آنے والا کل، آج کی توقعات کا پابند ہوگا؟! لوحِ تقدیر ہمارے لئے ناقابلِ قرأت ہے۔ اور کارکنانِ قضا و قدر کے کاروبار ہماری پیشبینیوں سے غیر محکوم! الغرض وہ اپنی ریشہ دوانیوں کو "پیشگی" "اوقات نامے" سے وابستہ نہیں کیا کرتے، اپنی تجاویز کی ترتیب وہ واقعاتِ پیش آمدہ کی روشنی میں کرتے ہیں! اور حسبِ اقتضائے وقت و حالت اُس میں ترمیم و اصلاح، یا تنسیخ و اضافہ کرتے رہتے ہیں! بارکلفیڈرد انہی موخر الذکر پختہ مغز شاطروں کی جماعت کا اک حریف تھا، اور انہی کا ہم طریقت!

پس ایسے لوگ بلا غیر معمولی کاوش اور پس و پیش کے اپنی کارروائی شروع کر دیتے ہیں، اور تغیر پذیر موقت حالات کے اشاروں پر مختلف اطراف میں اپنی نقل و حرکت کا رُخ پھیرتے رہتے ہیں! وہ پہلے سے کوئی آر پار راہ طے نہیں کر لیتے، اس لئے کہ واقعاتی اُفتادوں کی نشان دہی کردہ شاہراہ سے وہ راہ لامحالہ انحراف کرتی رہتی ہے۔ وہ آج کے دن کوئی ایسا خاکۂ عمل نہیں بنا لیتے جو کل "تقویمِ پارینہ" ہو جائے! وہ کوئی ایسا نعل پہلے سے تراش خراش کر کے اپنی جیب میں نہیں رکھ لیتے، جو "ابلقِ ایام" کے سُم پر فٹ نہ پڑے! صرف لمحۂ موجودہ میں اک وقتی قدم اُٹھانا اور پیش پا اُفتادہ فائدے پر گرفت کر لینا، اور آئندہ کے تبدیل شدہ نقشۂ جنگ کے لئے اک تبدیل شدہ محاذ کے ساتھ تیار و منتظر رہنا، یہی کار آزمودہ بیکار آزمائی کا "سب سے چلتا ہوا حربہ" ہے۔

اک "کھلاڑی" کی گوفن میں وقت پر جو بھی پتھر آ جائے گا اُسے وہ تم پر کھینچ مارے گا! مگر نو آموز "سیانے" "غیر متوقع حالات" سے اپنی اُمیدیں وابستہ کئے رہتے ہیں، جو کبھی شرمندۂ ظہور نہیں ہوا کرتے! بساطِ شطرنج پر یہ بات بھی تمہارے پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ تمہارا سابقہ کس اور کیسے حریف سے ہے؟ پھر معرکہ گاہ کی پیمائش، معائنہ، اور مسلسل گرد آوری

بھی ضروری ہے ؛

بارکلفیڈرد، ملکۂ آین کو بھی کم از کم اپنا نشانۂ ابلہ فریبی بنانا چاہتا تھا، بعض اوقات اپنی کمینگاہی نشست میں وہ اپنے شکار کے اتنے قریب پہنچ جاتا تھا، کہ حضرتِ عُلیا کی سرگوشیاں تک اُسے سُنائی دیتی تھیں ! کبھی کبھی دونوں بہنیں ہمکلام ہوتیں، اور وہ اُن کے گویا پہلو ہی میں، کسی مخفی گوشے کے اندر کھڑا ہوا محوِ تجسس ہوتا ! وہ اُس کو اپنی باہمی مکالمت میں دخل در معقولات دینے سے بھی باز نہ رکھتی تھیں ! بعض موقعوں پر تو اُسے رائے دینے تک کی صاف صاف دعوت دی جاتی تھی ! مگر وہ ازراہِ خاکساری اپنی نااہلی کا عُذر پیش کرتا، اور اِس نمائشِ بلوثی و بے نیازی سے اور بھی اپنا اعتبار جماتا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ بارکلفیڈرد ڈچیز جوزیانہ کی پشت پر کھڑا ہوا تھا۔ ہیمپٹن کورٹ کے باغ میں وہ اِس وقت مصروفِ گلگشت تھی۔ ملکۂ آین بھی تشریف فرما تھیں۔ ملکۂ موصوفہ نے اپنے معمولی بھونڈے انداز میں اپنے جذبات کی بے نقابی اور تقدیر کی شکوہ سنجی شروع کردی ؛

"جانور بڑے مزے میں ہیں ؛ وہ دوزخ و جنت کے جھگڑوں سے آزاد ہیں ! کم از کم جہنم کا اُن کو کوئی دغدغہ نہیں ؛"

"اِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِهِمْ !" (جانور پہلے ہی سے جہنم میں گرفتار ہیں"!) جوزیانہ نے اک بصیرت افروز ریمارک کیا۔

اس جواب نے اک دینی مسئلے کو معاً اک فلسفیانہ موضوع میں بدل دیا ! ملکۂ آین کسی قدر منغّص ہو گئی ! جوزیانہ کے اس استدراک میں جو معنی خیزی تھی اُسے محسوس کرکے آین کو اک مغلوبانہ محجوبیت سی ہوئی ؛ تھوڑے توقف کے بعد وہ جوزیانہ سے یوں گویا ہوئی ؛

"عزیزہ من ؛ ہم طفلانہ طریقے سے اِن مسائلِ مُہمہ پر گفتگو کرکے اُن کی بے احترامی کیا کرتے ہیں ؛ ہم ہمہ دانی کے مُدعی بنا کرتے ہیں، حالانکہ ہم صِفر محض ہوتے ہیں ! بہتر ہو کہ اِس مذاکرے میں ہم بارکلفیڈرد کو بھی شریک کریں، اور اُس کی ذہانت و فراست سے مستفید ہوں ! اِن دانش فروشیوں کے بجائے ہمیں کچھ دانش اندوزی کی ضرورت ہے !"

"جی بجا ہے !" جوزیانہ بولی، "بارکلفیڈرد اِن مسائل کو ایسا ہی جانتا ہے جیسا کہ "معلم الملکوت" !"

"نہیں، جیسا کہ اک بے زبان جانور !" بارکلفیڈرد نے عرض کیا، اور ساتھ ہی سرخم کرکے کورنش بھی بجا لایا !

"خاتونِ محترم !" ملکہ نے فرمایا "یقین کیجئے کہ وہ اک دانا انسان ہے ! ہماری ذہنی نارسائی کو اُس کے مبلغ علم سے کوئی نسبت نہیں !"

جوزیانہ نے اِس سادہ لوحانہ جواب کو "نذرِ خاموشی" کر دیا !

بارکلفیڈرد کے سے آدمی کے لئے ملکۂ آین تک رسائی حاصل ہو جانا حضرتِ عُلیا پر گرفت حاصل کر لینے کے ہم معنی تھا ! واقعہ یہ ہے کہ وہ بجا طور پر ایسے ہی رسوخ و اقتدار کا مدعی ہو سکتا تھا ! اور اب وہ اپنے اس مقتدر موقف سے اپنے مخصوص عزائم کی تکمیل کے لئے فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا ! اُس نے دربار میں قبل ازیں قدم جما ہی لیا تھا، اور دربارِ شاہی کا داخلہ بڑی فاتحکار چیز ہوا کرتا ہے ! اب کوئی موقع اُس کے ہاتھ سے جا نہ سکتا تھا، متعدد بار وہ ملکہ کو اک بدباطنی کے انداز میں متبسم کر دینے میں کامیاب ہو گیا تھا : یہ گویا فیر کرنے کا پہلا لیسنس تھا ! لیکن کیا نقشۂ جنگ کے پورے خط و خال بالکل متشکل ہو گئے تھے ؟ کیا اِس اشارۂ چشم و ابرو میں خود ملکۂ معظمہ کی ہمشیرۂ عزیزہ کو نشانہ بنانے کا ایما مضمر تھا ؟

یہاں ذرا اک نازک و ذو معنی صورتِ حال تھی ! بارکلفیڈرد کسی قدر متشکک تھا اور نتیجۃً متذبذب ! پہلی تنقیح اُسے یہ یکسو کرنی تھی کہ آیا آین کو اپنی بہن سے محبت ہے یا نہیں ؟ ! اس لئے کہ اس قسم کے غایت درجہ مخدوش معاملات میں ایک غلط قدم بھی ساری مُہم کو درہم برہم کر دینے کے لئے کافی ہوا کرتا ہے !

حصولِ اطمینان کی خاطر، بارکلفیڈرد نے حقیقتِ نفس الامری کی قطعی ترصید کے لئے اک مزید مہلت لینی ضروری سمجھی !

اک ہوشمند گنجفہ باز کھیل شروع کرنے سے پہلے اپنے پتوں پر اک نظر ڈال لیتا ہے، جس میں اپنے ترپ کارڈوں کا خاص طور پر شمار کر لیتا ہے ! بارکلفیڈرد نے بھی اپنے تاش کا پیشگی جائزہ لیا، یہ عبارت تھی ملکہ اور ڈچیز کی عمروں کے تناسب کے اندازہ کرنے سے !! ـــــ جوزیانہ ۲۳ سال کی اک دوشیزۂ نورس تھی، درآنحالیکہ آین کا سن ۴۰ سال سے متجاوز ہو گیا تھا ! بساطِ سیاست کا یہ نقشہ بارکلفیڈرد کی دسیسہ کاریوں کے لئے اپنے اندر بہت سے ممکنات رکھتا تھا ! ملکہ کی جوانی کی فصلِ بہار

ڈھل چکی تھی، خزاں رسیدہ چمنستانِ حُسن میں شبابِ رفتہ کی جستہ جستہ باقیاتِ صالحات، گزشتہ عہدِ زریں کی خون درجگر کن یادگار حسرت آثار تھیں! اک گلبنِ قامت کے نوشگفتہ غنچے تاراجِ خزاں سے پامال شاخِ گل کے لئے اک جگرخراش خارزار کا منظر پیش کرتے ہیں! ع

گلِ شباب کہ در چشمِ شیب یک خار است!

رلیعانِ شباب کا نوروز کہولتِ سِن کے لئے اک عشرۂ محرم ہوتا ہے! شش جہت میں بہار کی رنگپاشیاں اور نکہت باریاں اُس کے کلبۂ احزاں کی تاریکی کو ظلماتِ یاس و حرماں میں مفقود کر دیتی ہیں! تختہائے گلاب بستر خار ہو جاتے ہیں! آفتابِ حسن و شباب جب نقطۂ نصف النہار سے ڈھلنے لگتا ہے تو اک طلوعِ صبحِ محشر کا منظر سامنے ہوتا ہے!—— ملکۂ این اب اسی منزلِ عمر میں تھی، اور یہی دردِ دل رکھتی تھی! بارکلفیڈ رو اس خالِ پیشانیٔ صورتِ حال کو کلیدِ قفلِ مشکل بنانا چاہتا ہے! چہل سالہ ملکۂ عالم کے چہرے کی جھرّیاں اور پیشانی کی شکنیں اُس کے عقدۂ دشوار کی گرہ کشائی کرتی معلوم ہوتی تھیں! این کے اندرونی تکدّرِ خاطر کی یہ بیرونی چین جبیں بارکلفیڈ رو کے لئے تنہا شعاعِ امید تھی!

جذبۂ رشک و حسد کی اک مبہم سی کاوش، غیظ و غضب کے اک پورے طوفان کو ہیجان میں لے آتی ہے۔ لبِ آب اک موشِ حقیر کی حرکتِ پا اک نہنگِ بحر کو اپنی خلیج سے نکال لیتی ہے۔

خیالات کے "تخم" اور جذبات کے "جنین" این کے "رحم و دماغ" میں جنباں تھے، یہ ابھی عالمِ وجود ہی میں آئے تھے، اور نہ بشکل اُنھوں نے کوئی متمائز صورت اختیار کی تھی۔ تاہم اُن کے وجود میں کلام نہ تھا، اگرچہ ہنوز وہ عالمِ ہیولیٰ میں تھے! خود ملکہ اپنے دل و دماغ سے کماحقہٗ واقف نہ تھی! وہ اپنے واردات کو محسوس کرتی تھی، اُن کے صاف و شفاف مشاہدے سے قاصر تھی! اک متلاطم اور گل آلود پانی کے تال کی سطح پر جو پیچ در پیچ تموج پیدا ہوا کرتے ہیں، اُن کی باہمدگر مخلوط و ژولیدہ اشکال کا صحیح تعین کر لینا آسان نہیں! این کی تاریک و توہم پرست روح پر بعض اوقات عجیب و غریب الہامات نازل ہوا کرتے تھے۔ بارکلفیڈ رو انہی اوقات میں سے کسی ایک لمحے کا منتظر تھا، اس لئے کہ یہی وہ موقعے تھے جن میں اُس کا فسوں ایک پُرعناد دل والے احمق پر کامیاب ہو سکتا تھا! ہاں اب سب سے پہلے ملکہ کے خانخانۂ دل کے اسی رازِ سربستہ کا سُراغ لگانا ضروری تھا کہ ڈچیز جوزیانہ کے بارے میں وہ کس قسم کے حسیات رکھتی ہے؟! یہی اس راہ کا اولین قدم تھا، اور اسی عقدہ کے خاطر خواہ طور سے حل ہونے پر تمام آئندہ نقل و حرکت معلق تھی!

ایک دن کا ذکر ہے کہ ملکۂ معظمہ گرجا سے مراجعت فرما ہو رہی تھیں۔ بارکلفیڈ رو بھی مع چند دیگر ندیموں کے ہمرکابی میں تھا، یہی موقع تھا کہ لارڈ ڈیوڈ یکبارگی خواتین کی صفوف کے سامنے سے گزرا، اور صنفِ لطیف کے سارے مجمع میں اپنے خوش جمال قامت و پیکر سے اک وقتی ہیجان پیدا کر گیا! اُس کا نمودار ہونا تھا کہ بے اختیار عورتوں کی زبانوں سے "احسنت و مرحبا" کے آوازے بلند ہوئے۔

"کتنا سجیلا، کیسا البیلا!"—— ایک بولی۔

"کتنا خوشرو، کیسا قدِ دل جُو!"—— ایک دوسری کا خراجِ تحسین تھا۔

"کتنا بدرو، کیسا مکروہ!"—— ملکۂ این کا عطیۂ داد تھا (زیرِ لب آواز میں)!

ظالم بارکلفیڈ رو نے سن پایا!—————— یہی وہ "حرفِ کاشف" تھا جس کے لئے وہ سالہا سال سے ہمہ تن گوش تھا! سہ

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر میخواست

آخر آمد زپسِ پردۂ تقدیر پدید!

اس ایک آنی و فانی "چشمکِ برق" نے اک مستقل "منارۂ سحر" کا کام دیا! اب گویا وہ ملکہ کا عتاب اپنے اوپر نازل کئے بغیر ڈچیز جوزیانہ پر وار کر سکتا تھا! پہلا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ لیکن اب دوسرا عقدہ دعوتِ طبع آزمائی دے رہا تھا!

بظاہر اب بھی وسیع اقدام کا دروازہ بند تھا، شبِ تاریں کوندے کی ایک لپک کے بعد مطلع پھر تاریک ہوتا نظر آیا—— "کلما اضاء لھم مشوفیہ، و اذا اظلم علیھم قاموا"!

(۱۷)

انگلستان، آئرستان، اور اسکاٹستان

جس طرح کوئن ایلزبتھ اک ناکتخدا ملکہ تھی، اسی طرح لیڈی جوزیانہ

اک دوشیزہ شہزادی تھی، وہ شاہانہ زندگی بسر کرتی تھی، کبھی شہر کی سیر کا لطف اٹھاتی، کبھی دیہات کی سکونت سے لذت اندوز ہوتی! سال کے مختلف موسموں کی مناسبت و رعایت سے وہ مختلف مقامات و مکانات میں نقلِ مکان کرتی رہتی تھی! اس کا دربار بھی اپنے ٹھاٹ باٹ میں قریب قریب بارگاہِ سلطانی کی شوکت و صولت کا رو کش تھا! جس میں اس کا سب سے مقرب ندیم لارڈ ڈیوڈ تھا! لارڈ ممدوح کے علاوہ متعدد اور امرا بھی اس کی بزمِ شہزادگی کے رتن تھے۔

لارڈ ڈیوڈ اور لیڈی جوزیانہ کی ہنوز شادی خانہ آبادی نہیں ہوئی ہے، تاہم مجوزہ جوڑا ئے محبت ایک دوسرے کی معیت میں بلا تکلف ہر تقریب پر رونق بزم و انجمن ہوا کرتا تھا! محض حبالۂ عقد زوجیت میں منسلک نہ ہونے کی وجہ سے انکا یہ آزادانہ اختلاط، آداب معاشرت کے منافی نہ سمجھا جاتا تھا! ان کی باہمی بے تکلف زندگی ہر قسم کے اشارہ و کنایہ سے بھی مامون تھی! وہ گھوڑ دوڑوں اور تماشا گاہوں میں ساتھ ساتھ جایا کرتے، اور اپنی سواری کی گاڑی میں بالکل ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو بیٹھتے! جب وہ اپنی معلق شادی کا خیال کرتے تو کم از کم لمحۂ اول پر ان کے قلبی واردات کی زبان سے یہ چیخ بلند ہو جاتی کہ ع

بس خوں ٹپک پڑا نگہِ انتظار سے!

لیکن اس شادی کا انعقاد نہ صرف یہ کہ ان کا فرضِ عین تھا بلکہ اس کی انھیں آزاد اجازت تھی، تاہم وصل و ہجر کے درمیان اس بین بین حالت میں اک نادر کیفِ لذت تھا کہ ع

وصدم با من و ہر لحظہ گریزاں از من!

اس مقام "اعراف" میں وہ "بہشتی لطف" اٹھا رہے تھے! اک منسوب شدہ جوڑے کے درمیان تخلیہ اک ایسا برائے نام "برزخ" ہے، جسے بآسانی عبور کیا جا سکتا ہے! لیکن وہ اس آسان فتح کے تمتع سے محترز رہتے تھے! آسان کام آسان ضرور ہوتے ہیں، لیکن "لطف" سے عاری بھی ہوتے ہیں! لارڈ ڈیوڈ کے لئے "پیچ دار و مریز" کی پیچیدگی رکھنے والا "ساغرِ سرشار" اک طرفہ لذتِ بے نام تھا! ؎

چہ کنم با کہ تواں گفت کہ او
در کنارِ من و من مہجورم!

جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اُس وقت مُکہ بازی کا سب سے بڑا مقابلہ مقام لیمبتھ میں ہوا کرتا تھا۔ یہ ایک کلیسائی مرکز ہے، جہاں کینٹربری کے قسیس اعظم کا اک محل بھی ہے، اگرچہ یہاں کی آب و ہوا سقیمِ صحت واقع ہوئی ہے، تاہم وہاں مختلف عمرانی دلچسپیوں کے سامان بہم ہو گئے ہیں۔ از انجملہ ایک کتب خانہ ہے جو اک عمدہ ذخیرۂ ادب سے مالا مال ہے، اور مخصوص اوقات میں صاحبِ ذوق لوگوں کے لئے کھلا رہتا ہے۔

جاڑوں کا موسم تھا، انہی ایام میں ایک دن شام کے وقت مقام مذکور کی اک نزہت گاہ کے اندر، جس کے حصار کی پھاٹک عموماً بند رہا کرتی تھی، مکہ بازی کی اک آویزش برپا ہوئی۔ اس موقعے پر ڈچیز جوزیانہ بھی نہضت فرما ہوئی تھیں، اور جوزیانہ کے ساتھ، حسبِ معمول، سائے کی طرح لارڈ ڈیوڈ بھی موجود تھا!

جوزیانہ نے اس تماشا گاہ میں داخل ہوتے ہوئے استفسار کیا۔

"کیا خواتین کو آنے کی اجازت ہے؟"

اس کا جواب، اک تفنن آمیز پیرائے میں، لارڈ ڈیوڈ نے اک ایسے فرانسیسی ذومعنی جملے میں دیا جس کا لفظی ترجمہ تو یہ تھا کہ

"معزز خواتین قدم رنجہ فرما ہو سکتی ہیں!"

لیکن محاورۂ زبان کے اعتبار سے دوسری تعبیر یہ بھی تھی کہ،

"دُکان نشینانِ (جلوہ فروشی) کا داخلہ ممنوع ہے!"

لیڈی جوزیانہ نے حاضرینِ مجلس کی اکثریت کی جنس (رجال) کی ہیئت سے قدرے مشابہت پیدا کرنے کے لئے، نیز آدابِ محفل کو مرعی رکھتے ہوئے، یہ کیا تھا کہ اس تقریب میں مردانہ لباس پہن لیا تھا! یہ بھی اس زمانے کا اک فیشنیبل دستورِ امارت تھا۔ اِس عہد میں خواتین شاذ و نادر ہی بجز مردانہ بھیس کے کسی اور وضع و پوشش میں بیرون خانہ سیر و گشت کے لئے جایا کرتی تھیں! لندن سے ونڈسر جاتے ہوئے کثیر التعداد زنانہ مسافروں میں بمشکل ایک یا دو عورتیں ایسی نظر آیا کرتی تھیں جو اپنے صنفی لباس میں ملبوس ہوں! شرفا کے خاندانوں کی خواتین کا یہ اک خاص طغرائے امتیاز تھا۔

لارڈ ڈیوڈ چونکہ جوزیانہ کی معیت و ملازمت میں تھا، اس لئے آج وہ خود کھیل کود میں کوئی حصہ نہ لے سکتا تھا، اُس کا تنہا فریضہ یہی تھا کہ لیڈی موصوف کی مصاحبت کی خدمات انجام دے!

جو زیانہ نے یہاں اپنی نسائی فطرت کی، اک خاص پیرائے میں نمائش کی، اُس نے تماشا دیکھنے کی اک خوشنما دُوربین نکالی، اور تماشا گاہ کا مشاہدہ کرنا شروع کیا! ؎

یقیں ہے دیدۂ باریک بیں سے
کرے عینک طلب یہ ناتوانی!

یہ چیز بھی اُس عہد کے شرفا کے لوازمِ معاشرت میں داخل تھی!

جسمانی ورزش اور شجرتی تماشا کی اس تقریب میں، جو کثیر التعداد خواصِ عالی نسب کی کشش کی باعث بنی تھی، لارڈ جرمَین کرسئ صدارت پرتمکن ہوا! یہ اُس لارڈ جرمَین کا دادا تھا جو اٹھارویں صدی کے اواخر کے سسپنین میں فوج میں اک کرنیل تھا، اور اپنی اسی عسکری زندگی کے دوران میں جس سے یہ ننگ سرزد ہوئی تھی کہ ایک خاص معرکۂ کارزار کے اندر پشت دکھائی تھی۔ یہی امیر بعد میں وزارتِ جنگ کے منصبِ عالیہ پر سرفراز کیا گیا! اور اگرچہ قبل ازیں بھی ان جنگ میں خوش قسمتی سے (یا بدقسمتی سے) دشمن کی تیغ و تفنگ سے بچ گیا تھا، لیکن مابعد کی "ترقئ درجات و درازئ عمر" کے دَور میں اُس کا حشر اس سے بھی زبوں تر ہوا! اس لئے کہ امارتِ حربیہ کی مسندِ اقتدار پر وہ انگلستان کے مشہور محتسب خطیب ــــ شیریڈن ــــ کے جانستان طعن و تشنیع کے تیر و سناں سے خونچکاں ہوا۔

مُکّہ بازی کے اس مقابلے میں جو دو حریف ہم نبرد تھے اُن میں سے ایک آئرلینڈ کا باشندہ تھا۔ یہ اپنے وطن کی سرزمین کے اک پہاڑ کے نام کے انتساب سے فیلم سیڈن کہلاتا تھا؛ دوسرا مُبارز اک ساکنِ اسکاٹستان تھا جس کا نام ٹیلگیل تھا۔

یہ دونوں قدمقابل نوجوان اپنے مُلک و وطن کے قومی فخر و عزہ کے علمبردار تھے! گویا خود آئرستان اور اسکاٹستان اکھاڑے میں اُتر رہے تھے! اصلی مقابلے کی ہارجیت کی رقم کے علاوہ، مختلف حاضرین و تماشائیاں کے آپس میں کوئی چالیس ہزار گنی سے زیادہ کی شرطیں بھی بدی گئی تھیں!

دونوں پہلوان قریبًا برہنہ تھے، اور صرف کوتاہ و چست قسم کے لنگر کسے ہوئے تھے، اُن کے پاؤں میں لمبے لمبے بوٹ تھے، جن کی ساخت بڑی بھدی اور جن کے اندر بعض لوازم غیر ضروری نظر آتے تھے۔

اِسکاٹستانی بچّہ ـــ ٹیلگیل ـــ اک نوخیز جوان تھا جو مشکل اُنیس سال کا ہوگا۔ بایں ہمہ اُس نے ابھی حال میں مکّہ بازی کے حلقوں میں اک پُرشور شہرت حاصل کر لی تھی؛ اسی کا نتیجہ یہ تھا کہ اس افتتاح پذیر مبارزت میں اُس کی طرف شرطوں کی رقوم کا تناسب دوچند سہ چند تھا! ابھی سابقہ مہینے ہی کی بات تھی کہ اُس نے ایک نامور مُکّہ باز ـــ "سکس مائلز واٹر" (چھ میل گہرا پانی) نامی ـــ کی پسلیاں توڑ کر قعرِ تہیگاہ میں اتار دی تھی، اور سارے گھونسوں کے اُس کے چشمہائے چشم خشک کر دئے تھے! ہونہار ٹیلگیل کی ذات تماشبین پبلک میں غیر معمولی گرمجوشی و پذیرائی کی محرک ہوا کرتی تھی۔ اُس نے اپنے اوپر شرط بدنے والوں کو ایک بارہ ہزار پونڈ جتائے تھے! انسانی جسم کے اعضا و جوارح کی شکست و ریخت اور زد و خورد کے ان پیہم تصادموں میں ٹیلگیل کا ایک جبڑا بھی ٹوٹ گیا تھا! اس وقت بھی اُس کی پیشانی کی صدمہ رسیدہ جلد پر ٹانکے لگے ہوئے تھے!

وہ بڑا سجیلا اور پُھرتیلا نوجوان تھا، وہ قدرے اک کوتاہ قامت، اگرچہ راست قد، پیکر رکھتا تھا، فطرت نے جسمانی جوڑبند اور بدنی طاقت و قوت کی جتنی امانتیں اُسے ودیعت کی تھیں اُن میں شمہ بھر اُس نے خیانت نہ کی تھی؛ تمام اعضا و عضلات میں ایک بھی ایسا نہ تھا جس کی پوری ورزش اور پرورش نہ کی گئی ہو، اور اُسے اپنی طبعی نشو و نما کے ممکنات نہ پہنچایا گیا ہو! اُس کا تمامی نظامِ جسمانی مُکّہ بازی کی معرکہ آرائیوں کے لئے وقف تھا، اُس کا مضبوط سینہ فولاد کا ایک تختہ تھا، اور زرہ بکتر کے چار آئینہ کی اک پلیٹ کی طرح چمکتا تھا! جب وہ ہنستا تھا تو تین شکستہ دانتوں کا خلا اُس کے جمالِ تبسم کی دلآویزی کو دوبالا کر دیتا تھا!

بخلاف ازیں، اُس کا فریقِ مقابل اک بھاری بھرکم، لمبا تڑنگا آدمی تھا۔ مُکّہ بازی کی اغراض کے لحاظ سے، کہنا چاہیئے کہ، وہ اک ناقص حریف تھا، فیلم سیڈن اک چہل سالہ پہلوان تھا، قد ۶ فیٹ بلند تھا، سینہ اک دریائی گھوڑے کا آگا معلوم ہوتا تھا، بایں ہمہ چہرہ بُشرہ ملائمت مائل تھا! اُس کا گھونسا اتنا مہیب اور قاہرانہ تھا کہ خیال ہوتا تھا کہ اگر اُس کی بھرپور ضرب پڑ جائے تو اک جہاز کا گوشہ تک ٹوٹ جائے! تاہم اپنے اس بے پناہ حربے کے استعمال سے وہ نابلد واقع ہوا تھا!

آئرستانی پہلوان بظاہر خالی الذہن ہو کر اکھاڑے میں اُترا، وہ بجائے حملے کے دفاع کا پہلو لئے ہوئے معلوم ہوتا تھا؛ سارے قرائن سے

یہی قیاس ہوتا تھا کہ اُس کی خوب ہی دُرگت بنے گی! اُس کے جسم و جثہ کی مثال ایسے گوشت کی سی تھی جو صرف آدھا گلا ہوا ہو! ——— جو چبانے میں سخت ہو، اور نگلنے میں مشکل! وہ کامیاب شکاری تو کسی طرح نہ تھا، لیکن اِسی طرح آسان شکار بھی بننے والا نہ تھا!

وہ مرعوبیت کی حالت میں اپنے ہَمنَبرد کو کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا، اُس کی بے اکڑی ہوئی گردن میں اک سرِ تسلیم خم ہوتا نظر آتا تھا! اُس کی خالی از عزم آنکھوں میں اعترافِ شکست کی آئینہ داری نمایاں تھی! وہ اِس رُوحِ بختاوگی کا مجسمہ معلوم ہوتا تھا کہ ع

بیا کہ ما سپر انداختیم گر جنگ است!

دونوں حریفوں نے گزشتہ شب ایک ہی بستر میں بسر کی تھی، اور ایک ہی جامِ شراب سے ہم مقدار "پورٹ وائن" نوش کی تھی! رات کو ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالنے والے اب صبح باہم دست و گریباں ہونے والے تھے! چند ساعت اُدھر کے ہم مشرب ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے! ——— یہ رنگ میں بھنگ؟! ع

دستانۂ مخمل میں ہے پنجۂ فولادی!

ہر اک پہلوان کے ساتھ اُس کے حمایتی کے آدمی تھے۔ یہ لوگ بڑے ہی وحشیانہ حلیئے رکھتے تھے! اُن کے خدمات یہ تھے کہ جب ضرورت ہو تو اپنے امیدوار کی پُشت گرمی و طرفداری میں اکھاڑے کے ثالثوں کو ڈرائیں دھمکائیں ہیلسگیل کے پشت پناہوں میں ایک خاص شخص "جان گروین" نظر آیا جس نے ایک دفعہ یہ محیر العقول کارنامہ انجام دیا تھا کہ اپنی گاؤں دری میں ایک بَیل کو اپنی پیٹھ پر اُٹھالے گیا تھا! اسی گروہ میں ایک دوسرا دیو ہیکل آدمی جان بَرے تھا، جس نے اپنے اک جوشِ جنون کے لمحے میں اپنی پشت پر ۱۰ بشیل۱؎ آردِ گندم مع ایک عدد آدمی کے رکھ لیا تھا، اور اس وزن کو لے کر دو سو قدم تک چلا گیا تھا!

دوسری طرف فیلم میڈن کا سرپرست، لارڈ ہائنڈ، اپنے ایک پَروَردے، "کلبٹ" نامی کو لایا تھا، یہ حصارِ گرین کیسل کا اک خانہ زاد تھا۔ اس کا کمال یہ تھا کہ وہ بیس پونڈ وزن کے اک پتھر کو قصرِ مذکور کے بلند ترین مینار کی چوٹی سے اونچا پھینک سکتا تھا!

کلبٹ، برے، اور گروین، یہ تینوں رویئں تن اپنے اپنے وطن کی تومندی اور زور آوری کے گویا لہراتے ہوئے پرچم تھے، جب کہ وہ اِدھر اُدھر خراماں خراماں پھرا کرتے تھے،

دوسرے اہالی و موالی بھی کم و بیش ایسی ہی بدوی و نیستانی ہیئتِ کذائی رکھنے والے آدم زاد تھے، اِن کے بر و دوش چوڑے چکلے تھے! ٹانگیں خمیدہ تھیں، مٹھیاں سنگ لُشت کی طرح سخت تھیں، اور چہرے بھدے اور بھونڈے! ---------- اور یہ سارے کے سارے کچھ ایسے جنات واقع ہوئے تھے جو کسی بَلا سے ڈرنا نہ جانتے تھے! قرینا یہ سب کے سب "مستقل طائرانِ قفسِ جیل" رہ چکے تھے!

اِن میں بیشتر افراد۔ پولیس والوں کو شراب پلا کر اپنے حسبِ مرضی ہر قسم کے حرکات و جرائم کا "لیسنس" حاصل کر لینے کے کام میں طاق تھے! کیوں نہو! عیب کرنے کو ہُنر چاہیئے، اور عرضِ ہنر کے لئے ایک خداداد استعداد! پھر اِس سب کے نتیجے میں شہرت اور قدر دانی کی آپ ضمانت ہو جاتی ہے! ع

کسبِ کمال کُن کہ عزیزِ جہاں شوی!

اِس مقابلے کے انعقاد کے لئے جو میدان منتخب کیا گیا تھا اُس کا موقع وہ تھا جو "ریچھوں کا باغ" کہلاتا تھا! اس مقام کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ کسی زمانے میں یہ جگہ ریچھوں، بیلوں، اور کتّوں کی ضیافت گاہ تھی! یہ مقام آبادی کے بیرونی مضافات سے بھی کچھ پرے واقع ہوا تھا "سینٹ میری اُوری" کی خانقاہ کے خرابے کے زیر سایہ اُس کی جائے وقوع تھی! خانقاہِ مذکور وہ مقامِ مقدس تھی جو شاہ ہنری ہشتم کے عہد میں حکمِ سلطانی سے مقفل کر دی گئی تھی!

اس وقت بادِ شمال چل رہی تھی، جو انگلستان میں ایک زمہریری ہوا ہے۔ کچھ ترشح بھی ہو گیا تھا، جب کہ بارش کے قطرات زمین سے مَس ہوتے ہی ژالہائے جامد میں منتقل ہو گئے تھے۔

حاضرینِ مجلس میں اکثر لوگ بزرگانِ خاندان معلوم ہوتے تھے، اُن کو چھتریاں لگائے ہوئے دیکھنے سے یہ نتیجۂ صریح آسانی سے نکالا جا سکتا تھا!

فیلم میڈن کی طرف سے کرنل مانکرف لطور "امپائر" (حَکَم) کے تھا۔ کلبٹ اُس کی ہمت آموزی اور پُشت گرمی کے لئے موجود تھا۔

ہیلسگیل کی طرف علی الترتیب یہی فرائض ادا کرنے کے لئے "آنریبل

۱؎ "بُشیل": ۳۲ سیر کا پیمانہ!

پیوگے بیٹو میرس اور لارڈ ڈیزرٹم متعین ونگمن تھے:

دونوں حریف چند ثانیے (سیکنڈ) تک اکھاڑے کے اندر بلاکسی نقل و حرکت کے کھڑے رہے! تعطل کے ان چند لمحوں میں حاضرین نے اپنی اپنی گھڑیاں ایک دوسرے سے مقابلہ کرکے درست کیں، معاً دونوں پہلوان پیش قدمی کرکے ایک دوسرے سے قریب ہوئے اور پہلے ہاتھ ملے:

فیلم میڈن نے اپنے فریقِ مقابل ہیلیگیل، سے کہا:

"میرے لئے تو یہ بات قابلِ ترجیح ہے کہ اپنے گھر چلا جاؤں!"

ہیلیگیل نے اس کا جواب بڑی خوبصورتی سے یہ دیا:

"جو اصحاب یہاں تشریف لائے ہیں، اُن کے ذوقِ تماشا کو مایوس نہ کرنا چاہیئے!"

سردی بڑی شدید تھی، اور دونوں پہلوان قریبًا برہنہ تھے! فیلم میڈن کے عضلات کانپنے لگے، اور دانت بجنے!

ڈاکٹر الینر شارپ نے، جو آرک بشپ آف یارک کا بھتیجا تھا، حوصلہ انگیزی کے لہجے میں بآوازِ بلند کہا:

"جُٹ جاؤ شیرو! دیکھتے کیا ہو؟ -------- تمہارا بدن بھی اسی طرح گرم ہو جائے گا!

ان گرم کلمات نے پہلوانوں کے منجمد ارادوں میں اک عملِ گداختن شروع کر دیا! وہ جلد دست و گریبان ہو گئے!

لیکن ابھی تک کسی کو غصہ نہ آیا تھا! تین پیترے ہوئے لیکن بدونِ تصادم! اس پر ریورینڈ ڈاکٹر مگڈریتھ نے جو "مدرسۂ عالیۂ ارواحِ عامہ" کے "مرشدانِ جہل" میں سے تھا، بالجہر کہا:

"ان کو تھوڑی تھوڑی جن (شراب) پلاؤ! تب ان پر "جنگ کا جن" سوار ہوگا!"

تاہم "ثالثانِ بالخیر" نے کھیل کے مسلمہ دستور العمل سے انحراف کو پسند نہ کیا، اور "مسالکِ باخبر" کا ارشاد معرضِ تعمیل میں نہ آیا! اس سب کے علی الرغم زمہریری سردی کے حکم کا حکم ناحق ہی معلوم ہوتا تھا! ؎

بیمارِ موسیم و بو وسے دوائے ما
بیمار را حدیثِ حلال و حرام چیست؟

بالآخر اُن کی رگہائے خون میں جنبش ہوئی۔ وہ پھر ایک دوسرے کے بالمقابل ہوئے، ایک دوسرے کی طرف بڑھے، اپنے اپنے بازو پھیلائے، اور دونوں کی مٹھیاں آپس میں مَس ہوئیں، لیکن معاً پھر پسپا ہوگئے۔

یکبارگی چھوٹے حریف ہیلیگیل، نے اپنی جگہ سے اک پُرعزیمت جست کی، اور اس نے عملی معرکہ کا افتتاح کر دیا!

فیلم میڈن کی دونوں آنکھوں کے بیچ میں پیشانی پر اک ضرب پڑی! اُس کا سارا چہرہ چو رنگ ہو گیا! مجمعے سے اک آواز بلند ہوئی!

"ہیلیگیل نے اپنے قلم مُشت سے اپنے حریف کے خون کی روشنائی سے اُسی کے ماتھے پر اپنی فتح کی پہلی مُہر ثبت کر دی!"

"شاباش، زندہ باش!" کے بکثرت نعروں نے ہیلیگیل کو خراجِ تحسین پیش کیا۔

فیلم میڈن نے اپنے لمبے چوڑے بازوؤں کو اک پَوَن چکی کے بادبانوں کی طرح چاروں طرف حرکت دی، اور بادہوائی انداز میں اُنھیں اِدھر اُدھر گھمانا شروع کیا!

"این کیا نیلم اندھا ہو گیا ہے!" ------ زُمرۂ امراء میں سے ایک لارڈ نے اُس کے اِس دو دراز کار کرتب کو دیکھ کر کہا!

لیکن یہ صحیح نہ تھا! فیلم میڈن کی آنکھیں ہنوز سلامت تھیں۔ تاہم یہ اُس کی دماغی نابینائی ضرور تھی، جس کی بدحواسی میں اُس سے یہ حرکتِ مذبوحی سرزد ہوئی تھی!

کثیر التعداد زبانوں نے، اعتماد افروز لہجے میں، ہیلیگیل سے یہ فرمائش کرنی شروع کر دی:

"ہاں بچّے! پھر فیلم میڈن کے ان رہے سہے دریچوں کو بالکل چوپٹ ہی کر دے نا؟!"

طرفین کے سارے عناصرِ ضعف و قوت کو محسوب کرتے ہوئے یہ کہنا صحیح تھا کہ جوڑی عمومًا متوازن تھی، اور اگرچہ موسم بارد و مرطوب تھا، تاہم اُمید تھی کہ مقابلہ گرم رہے گا!

کوہ پیکر میڈن کو اپنی "فربہیِ تن" کی "شبکی" محسوس ہونے لگی! اُس کا دیو ہیکل بدن اُس کے لئے مصیبت ہو رہا تھا! اُسے اپنے بوجھل اور لدّھڑ جسم کے ساتھ نقل و حرکت کرنا دوبھر معلوم ہو رہا تھا! اُس کے بازو دو شہتیروں کی طرح جسیم تھے، لیکن اُس کا سینہ اک مُضغۂ گوشت کی طرح پلپلا ہو رہا تھا!

اُس کا کم قامت حریف بڑی سُرعت و عجلت سے ہر چہار طرف جست و خیز، داؤں کی پیچ، زدو خورد کرتا، آویزش کی جوششش میں وہ اپنے دانت پیستا، اور اپنی تیز رَو و شتاب کار حرکات سے اپنی قوت کو دو بالا کرتا! جنبش نُمائی اور طاقت اندوزی کے اِس باہمی فعل و انفعال کے قانونِ ورزش سے وہ خوب واقف تھا!

ایک طرف اناڑیوں کے سے بے تکُے ہاتھ تھے، اور دوسری طرف فاتحکارشاطرانہ ضربیں! ہَیلمگیل جتنا اپنے "عضلات" سے لڑ رہا تھا، اُتنا ہی اپنے "اعصاب" سے بھی پیکار آزما ہو رہا تھا! نیلم میڈن اک شست رگ، لیکن گراں بار موگری باز تھا، اگرچہ ابھی تک وہ اپنے اِس گُرزِ گراں کے استعمال کے موقعے کا بیسود ہی جُویا رہا تھا! بلکہ اُلٹا خود ہی کوفتہ بخیۃ ہوتا رہا تھا! ——— قصہ مختصر، بدنِ حیوانی اور فنِ انسانی، کُندۂ ناتراش وحشت اور ساختہ و پرداختہ تربیت، ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے!!

یہ اک پیشگی طور پر بے نقاب تقدیر تھی کہ اول الذکر شئے آخر کار شکست کھائے گی ——— لیکن آسانی سے نہیں! اور اِسی بات کے اندر اِس مقابلے کے ساری دلچسپی مضمر تھی!

اک چھوٹے اور بڑے پہلوان کی کُشتی میں جیت عموماً چھوٹے کی ہوا کرتی ہے! کتے اور بلّی کی لڑائی میں فتح کا سہرا "بلی بلّی" ہی کے سر بندھا کرتا ہے! ——— یہاں اِن آثار کو مزید تقویت ملی، ہَیلمگیل کی کامیاب بزن و بشکن" پر حاضرین کی طرف سے داد آمیز و جوش آور کلمات کی اک بارش ہوگئی!

"خوب! کیا خوب!! شاباش! مرحبا!! ——— واہ رے سطحِ مرتفع (اسکاٹستان) کے عقابِ بَرق تاب!

اِس پر ہمدردان و ہَوا خواہانِ آئرستان بھی اک لہجۂ آوردیں بولے:

"ہاں نیلم میڈن! تو ہی کیا دیکھتا ہے اب؟! کسی "مُشتے بعد از جنگ" کو کیوں اُٹھائے رکھتا ہے؟!"

ہَیلمگیل کے نام لیوا اپنے فاتحکار نعرے میں گرجے:

"ارے پھوڑ بھی دے اپنے حریف کی آنکھوں کو بھی، کہ غلط بینوں کی آنکھیں کھل جائیں!"

ہَیلمگیل نے اور بھی کمال کے ہاتھ نکالنے شروع کئے۔ دو ایک نقل و حرکت کے بعد معاً سانپ کا سا پیچ و تاب کھا کر وہ پہلے یکبارگی پیچھے ہٹا، پھر دفعتہً آگے تڑپا، اور نیلم میڈن کی بیچ چھاتی میں ایک مُکہ ایسا رسید کیا کہ اُس کی بے پناہ ضرب سے دیو ہیکل نیلم متزلزل ہوگیا!

"بےقاعدہ ہاتھ!" ——— وائیکونٹ برنارڈ نے للکار کر ٹوکا!

میڈن سرنگوں ہوگیا! اُس کی زبان سے اک ماندہ و تکان زدہ لہجے میں یہ الفاظ مسموع ہوئے:

"مجھے اپنے دل پر بڑی گرمی معلوم ہو رہی ہے!"

لارڈ ڈینزرٹم نے ثالثوں سے اُن کی ماہرانہ رائے پوچھی، اور پھر اپنا فیصلہ یوں دیا:

"اختتام وقت سے پانچ منٹ پہلے!"

نیلم پر نقاہت کا غلبہ ہو رہا تھا کلٹر نے اُس کے مضروب و مجروح بدن کا خون اور پسینا اک فلالین کے پارچے سے پونچھا، اور قرابۂ شراب کا مُنھ اُس کے ہونٹوں سے لگا دیا! مقابلے کا اب گیارھواں "پانی" تھا۔ نیلم کی پیشانی پھر خونچکاں ہو رہی تھی۔ سینے کا منظر حریف کے مُکوں کی پیہم ضربات سے مسخ ہو گیا تھا! پیٹ نفخ زدہ ہو رہا تھا، اور سر کا اگلا حصہ یکسر چُور ہو گیا تھا! ——— لیکن اُدھر ہَیلمگیل کا کہیں بال بھی بیکا نہوا تھا!

مجمعے میں اک شور و غوغا مچ گیا۔ لارڈ برنارڈ نے اِس ہنگامے میں اپنے ابتدائی احتجاج کا اعادہ کیا:

"یہ ہاتھ یقیناً غلط لگایا گیا ہے!"

"اور اِس مقابلے پر جو شرطیں بدی گئی تھیں وہ کالعدم!" اک خاص تنبیہہ گوش زد ہوئی!

"لیکن میں اپنی جیتی ہوئی رقم لے لوں گا!" ——— سر ٹامس کول پیپر نے "اشارِ فتح" کے ساتھ اپنی دلدادگی کام و دہن کا ثبوت دیا!

"اجی مجھے میری پانسو گنی واپس کر دیجئے، کہ میں چلا جاؤں! اب یہ کھیل ختم ہو جانا چاہیئے!" ——— سر پارتھالومیو نے دادِ آشتی دیتے ہوئے کہا!

کیا دیکھتے ہیں کہ نیلم میڈن پھر کھڑا ہو رہا ہے۔ اک مخمور کی طرح اُس کے پاؤں میں لغزش تھی، لیکن اک پُر استقامت لہجۂ زبان میں وہ لب کشا ہوا:

"اچھا، ہم دونوں کو پھر لڑنے دیجئے! لیکن شرط یہ ہے کہ میں بھی اک ایسا

ہی بضابطہ ہاتھ مارنے کا حق رکھوں گا!"

"منظور، منظور!" اکھاڑے کے چاروں گوشوں سے دِل دِہانہ آوازیں آئیں!

ہیلمسگیل نے اک معنی خیز پھُریری لی!

دونوں حریف دوبارہ مصروفِ آویزش ہونے لگے!

جو لڑائی فیلم کے لئے اک "وبال" تھی وہ ہیلمسگیل کے لئے اک کھیل تھی! مار، پیچ اور گرلاگ کی بھی بلا دُور ہے!

آخر کار اِس پَرکالۂ آفت نے قصائی والا داؤں چلایا! یعنی اپنے حریف کی گردن یکبارگی اپنی کُہنی کے آہنی خَم کے اندر لے لی، اور اک گلوگیر و جانستان سختی و تنگی سے اُس کے سر کو اپنی بغل میں دبایا! اور پھر دوسرے ہاتھ کی مٹھی سے نیچے ہی نیچے تابڑ توڑ ضربیں لگانی شروع کیں! ہیلمسگیل کا مُکہ اک فولادی ہتھوڑے کی طرح فیلم میڈن کے منھ پر پڑ رہا تھا!

جب فیلم اِس خون آشام گرفت سے چھُوٹا ہے تو اُس کے چہرے پر بمشکل "چہرے" کے لفظ کا اطلاق ہو سکتا تھا! —— جو چیزیں پہلے مُنھ، آنکھ، ناک تھیں، اُن کا اب یہ حلیہ ہو رہا تھا کہ گویا وہ اک سیاہ اسفنج ہے، جس میں خون جذب کیا گیا ہے! اِسی عالم میں فیلم نے تھوکا تو پورے چار دانت زمین پر آرہے! اب وہ تیورا کر پھر گرا، لیکن کلنٹر آڑے آگیا اور اپنے زانو پر اُسے لے لیا!

اس تمام حرب و ضرب اور زد و خورد کے بعد بھی ہیلمسگیل عموماً اچھوتا ہی تھا، اُس کو چند خفیف جراحتیں آئی تھیں، اور ہنسلی کی ہڈی پر اک چھوٹا سا خراش!

لڑائی کا نتیجہ اب قطعاً فیصلہ کُن تھا! ہیری کارلٹن نے کہا:

"فیلم میڈن کا کام تمام ہے، آج سے ہیلمسگیل ہی کے سر پر "رستمِ برطانیۂ عظمیٰ" کا تاج ہے!"

کلنٹر نے فیلم کا سارا خستہ و خون آلودہ بدن عرق شراب میں اک کپڑے کو تر کر کے دھویا۔ خاک و خون کی نقاب سے فیلم کا چہرہ پھر نکلا! اُس نے آنکھ کا اک پٹ کھولا!

"بس ایک ہی پانی اور، میرے شیر!" کلنٹر نے التجا کی، "اپنے وطنِ عزیز کی عزت کے لئے!!"

ویلز اور آئرلینڈ کے لوگ ایک دوسرے کی زبان سمجھ لیتے ہیں! لیکن فیلم میڈن اب بالکل مبہوت و لاعقل معلوم ہوتا تھا! کلنٹر کی اثر آفرینی کے جواب میں اُس نے دست و زبان کی کوئی ایسی حرکت نہ کی جس سے معلوم ہو کہ اس میں ہوش و حواس کا کوئی شمہ باقی ہے!

بااینہمہ فیلم پھر اُٹھا! ایسی حالت میں کہ کلنٹر اُسے سہارا دئے ہوئے تھا! اب یہ چھپیواں دَور تھا! جس طرح یہ یکچشم آدمی کھڑا ہوا، اُس سے مترشح ہوتا تھا کہ یہ دَور آخری دَور ہوگا! وہ ایسی خستگی و فتادگی کی ہئیت کذائی سے استادہ تھا کہ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ آئندہ ضرب کے اولین مَس ہی سے فرشِ خاک پر دراز ہو جائے گا!

ہیلمسگیل جس کی جلدِ بدن بمشکل عرق آلود بھی ہوئی تھی، فاتحانہ جوش کے بُحران سے چِلّا اُٹھا:

"میں خود اپنی طرف سے "ایک ہزار" اور اپنے حریف کی طرف سے "صرف ایک" پر شرط لگاتا ہوں!"

اِس کے ساتھ ہی ہیلمسگیل نے اپنا بے پناہ بازو اُٹھایا اور معاً پھر تصادم کا آغاز کر دیا!

دیکھنے والوں کے لئے یہ نقشہ کس درجہ ناقابلِ فہم، اور اپنی ہی آنکھوں کی یہ شہادت کس قدر ناقابلِ یقین تھی کہ اب کی دفعہ دونوں فریق بیک وقت زمین بوس نظر آئے!!!

اک جاں بلب انسان کے حلق سے نکلا ہوا اک عجیب السماعت نحیف قہقہہ سنائی دیا:

یہ فیلم میڈن کا منتقمانہ اعلانِ مسرت تھا!!!

اس مرتبہ ہوا یہ کہ جُونہی ہیلمسگیل نے اک، شاید آخری مہلک، ضرب فیلم کے سر پر لگانی چاہی، فیلم نے بھی موقع پا کر اک بقاعدہ مُکہ، ہیلمسگیل کی "ناف" پر رسید کیا!

فیلم کا یہ اناڑی ہاتھ ایسا کاری پڑا کہ ہیلمسگیل چاروں شانے چت ہوگیا۔

اُس کے نرخرے سے "خرخر" کی آوازیں آنے لگیں!!

تماشبین گھبرا کر اُسے دیکھنے کے لئے اُس پر جھُک پڑے!

"مل گیا ناڑی کا ٹکہ!" —— بعض لوگوں نے "نقد" کیا!

اب سب تالیاں پیٹنے لگے، حتیٰ کہ اس اظہارِ مسرت کے عمل میں اُن لوگوں نے بھی اضطراراً شرکت کی جو شرطیں ہار رہے تھے، اور جن کا اُمیدوار ہیلمسگیل تھا۔

شانتی

وجاہت سندیلوی بی اے

(نیک اور معصوم ارادوں کی اُن کمزور دوشیزاؤں کے نام جو آئے دن مجبوری کے بھیانک خدا کی بھینٹ چڑھتی ہیں!)

موضع نرائن پور ایک چھوٹی سی آبادی تھی جہاں زیادہ تر غریب کاشتکار رہتے تھے۔ میں گاؤں میں وہ تھا جو ہر ایک بنیا تھوڑے عرصہ میں ہو جاتا ہے یعنی مہاجن۔ اپنی دوکان کے ساتھ ساتھ میں لین دین کا بھی کام کرتا۔ اگرچہ میری عمر ابھی کچھ زیادہ نہ تھی، یعنی یہی پچیس چھبیس سال لیکن میرے تول کی وجہ سے گاؤں بھر میری عزت کرتا اور ہر جگہ میری آؤ بھگت ہوتی۔

جاڑوں کی ایک دوپہر میں دوکان کا کام ختم کر کے میں اپنے مکان کے احاطہ میں سود بیاج روپیہ آنہ پائی کے حساب میں محو اپنے آپ سے بے خبر دھوپ میں بیٹھا تھا۔ دفعتاً میرے کان میں ایک لڑکی کی آواز آئی۔ میں چونک پڑا۔ شیو نرائن مالی کی لڑکی شانتی مجھ سے کہہ رہی تھی "لالہ جی پتا جی نے کہا ہے کہ ہمارے یہاں پاہُن آ گئے ہیں آپ ایک روپیہ دید یجئے، روپیہ ابھی اُن کے پاس نہیں ہے وہ کل دیدیں گے۔" میں چاہتا تھا کہ اس لڑکی سے مہربانی سے بات چیت کروں، لیکن مہاجنی کے بندھے ٹکے جملے میرے منھ سے بے اختیارانہ اُبل ہی پڑے "شیو نرائن کو تو جب دیکھو اُدھار کی پڑی رہتی ہے۔ آخر پھر ہمارا کام کیسے چلے اور وہ ابھی پچھلا ہی حساب صاف نہیں ہوا ہے۔ تمہاری ماتا کے کریا کرم ہی کے روپے ابھی نہیں ملے۔ میں تو تقاضے کے لئے آج خود ہی آنے والا تھا۔"

شانتی کا منھ اُتر گیا، وہ چپ چاپ کھڑی رہی۔ اس کے ہونٹ ہلے مگر وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ شیو نرائن بہت ہی غریب مالی تھا، بڑھاپے کی وجہ سے محنت مزدوری بھی نہ کر پاتا۔ شانتی جوان تھی لیکن بیچارے پاس پیسا ہی نہ تھا جو شادی کی کہیں بات چیت کرتا۔ مجھ سے اُس نے کئی بار کہا "لالہ جی بس پچاس روپیہ میں شانتی کے کام سے نپٹ جاؤں گا۔ آپ دیدیجئے، میں عمر بھر آپ کا غلام رہوں گا اور ایک ایک پیسہ کر کے آپ کو ادا کر دوں گا۔" لیکن میں مہاجن ہو کر بھلا کب ایسی باتوں میں آنے والا تھا۔ میں ہمیشہ نفرت سے اُسے ٹال دیتا "بھائی ایسا روپیہ ہوتا تو سونے کی دیواریں نہ کھڑی ہوتیں؟" شیو نرائن خاموشی سے روتا ہوا چلا جاتا اور کہتا "شانتی مجھے مرنے نہ دے گی۔" اُس کی بیوی شانتی کی ماں اِسی غم میں گھل گھل کر مر گئی۔ لیکن شانتی کی شادی دیکھنا اُسے نصیب نہ ہوا۔

میں اس وقت شانتی کو دیکھ رہا تھا اور وہ سر جھکائے خاموش کھڑی تھی، دفعتاً میرے دل میں نہ معلوم کیا سے کیا خیال آیا اور میں اُسے کسی اور ہی نظر سے دیکھنے لگا۔ میری بیوی کملا جوان اور حسین تھی۔ میں اُس سے بہت خوش تھا اور شادی کے بعد آج تک میں نے کسی عورت کو بُری نگاہ سے بھی نہ دیکھا تھا۔ لیکن اُس وقت میرا دل نہ معلوم کیسے کیسے گمراہ کن خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ جوانی سے بھرپور نازک حسین شانتی میرے پاس اپنی غرض لئے کھڑی تھی اور میں تھا اور میرا اکیلا احاطہ۔

میں نے سر سے پاؤں تک اُسے ایک جذبۂ بے اختیار سے دیکھا، اور دل سے اُس کے حُسن اور حُسن سے زیادہ اُس کی جوانی کی داد دی، وہ بیچاری

خاموش کھڑی رہی۔ میں نے پوچھا "شانتی تمہاری شادی کب ہوگی؟"

پہلے تو اُس کا چہرہ شرم و حجاب سے سُرخ ہو گیا، پھر اُس کی آنکھوں سے کچھ ایسی حسرت برسنے لگی کہ میرا ایسا سخت دل بھی بےچین ہو گیا، معلوم ہوتا تھا جیسے میرے اس سوال سے اُس کی خودداری کو ٹھیس لگی ہو۔ اور میں خود ہی اپنے دل میں نادم ہو گیا۔ مجھے خیال آیا کہ دیکھو میرے بھی تو ایک لڑکی ہے یہ تو محض حادثۂ پیدائش ہے کہ شانتی میری لڑکی نہیں، لاؤ میں شیو نرائن کو پچاس روپے دے دوں۔ تاکہ وہ شانتی کی شادی کر دے۔ لیکن پھر میرے نفس نے مجھکو سمجھایا کہ ایسے غریب تو بیسیوں ہیں۔ میرے روپے کی لالچ پھر عود کر آئی میں نے کہا "یوں تو میں روپیہ دے نہیں سکتا، ہاں اگر تمہارے پاس کوئی چیز ہو تو اچھے داموں رکھ لوں۔"

اب کے تو شانتی کے آنسو ہی نکل آئے۔ گھبرائی ہوئی آواز میں بولی "ہمارے پاس لالہ جی کوئی چیز کہاں؟"

اب تو مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر اُس کے سامنے ڈال دیا۔ اُس نے روپیہ اُٹھالیا۔ اور اپنی آنسو بھری آنکھوں سے مجھے بڑی احسان مندی سے دیکھا۔ میرے دل میں نشتر سا چبھ گیا۔

کسی وقت انسان نہیں جانتا کہ وہ گناہ سے کس قدر قریب ہے۔

ابھی تو میں نے نیک نیتی سے شانتی کو روپیہ دیا تھا اور ابھی میرے دل میں کیا کچھ خیالات آنے لگے۔ شانتی احاطے کے دروازے تک جا چکی تھی کہ میں نے پکارا، "ذرا کھاری سے بھوسہ نکال دے" وہ بڑی خوشی سے ڈلیا اُٹھا کر کھاری میں چلی گئی۔ اُس کے پیچھے پیچھے میں بھی کھاری میں جا پہنچا۔ "شانتی" کہہ کر میں نے ایک دم سے اُسے چمٹا لیا۔ اور اُسے بے قابو کر کے اُس کی آنکھوں اور رخساروں پر کئی بوسے دئے۔ اُس نے تڑپنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ بہت مضبوطی سے میری گرفت میں تھی۔ میں نے اور زور سے اُسے بھینچ لیا۔ میرا نفس تیز تھا۔ میں نے رُک رُک کر کہا "شانتی میں تمہاری شادی کا روپیہ دے دوں گا۔"

شانتی ایک دفعہ زور سے تڑپی، اور تڑپ کر میرے آغوش سے نکل گئی۔

"تم بھاگ نہیں سکتیں شانتی! دیکھو میں تمہاری شادی کا روپیہ دیدونگا۔" میں اُس کی طرف بڑھا۔ مجھ پر بھوت سوار تھا۔ شانتی غصے اور خوف سے کانپ رہی تھی۔ "لالہ جی ہم غریب ہیں، لیکن۔۔۔۔۔۔۔۔" اُس کی آواز سسکیوں میں ڈوب گئی اور وہ آگے کہہ نہ سکی۔ وہ اپنی جگہ سے نہ ہٹی اور میں اُس کے بالکل قریب پہونچ گیا۔ میں نے پھر دیوانگی سے اُسے لپٹا لیا اب کی اُس نے مجھے اس زور سے دھکا دیا کہ میں بھوسے پر گر پڑا۔ اور قبل اس کے کہ میں سنبھلوں وہ بھاگی۔ میں اپنے جوش میں دیوانہ اُس کے پیچھے دوڑا۔ احاطے میں ایک پُرانا جوتا پڑا تھا اُس نے اُٹھا کر اس زور سے میرے منھ پر مارا کہ میں چکرا کر بیٹھ گیا اور میری ناک سے خون جاری ہو گیا اور وہ لپک کر دروازہ کے باہر ہو گئی۔

تھوڑی دیر بعد جب میرے ہوش ٹھکانے ہوئے تو میرے دل میں بس ایک جذبہ تھا، جذبۂ انتقام! ایک ضعیف اور غریب مالی کی کمزور لڑکی سے انتقام! مجھے معلوم ہوتا کہ بس یہ ہے میری زندگی کا مقصد میں اپنے دل میں کہتا میرا سارا روپیہ خرچ ہو جائے مجھے کچھ پروا نہیں، لیکن میں بس ایک دفعہ شانتی کو اُس کی احسان فراموشی اور بدتمیزی کا مزا چکھا دوں!

تین چار روز بعد شانتی کے چچا کی لڑکی روپتی میرا روپیہ واپس کرنے آئی۔ اُس نے کہا "شانتی نے دیا ہے" میرے دل میں انتقام کی آگ پھر بھڑک اُٹھی۔ میں نے دل میں کہا "رہ جا شانتی اگر تجھ سے بدلہ نہ لیا ہو تو میرا نام نہیں" میں نے روپتی سے پوچھا "کہاں ملی تھی تجھے شانتی" کہنے لگی "کل میرے ساتھ آلو کھودنے گئی تھی وہیں دیا تھا روپیہ" میں نے پوچھا "روز ملتی ہے تجھے؟" کہنے لگی "تینوں دن وہ میرے ہی ساتھ تو کام کرنے جاتی ہے" میں نے عجیب انداز سے روپتی کو دیکھا وہ نہ تو ایسی کچھ حسین تھی نہ جوان، اُس کی شادی کو بھی تین چار سال گزر گئے تھے۔ لیکن مجھے تو اپنا کام نکالنا تھا، اور بڑی ہوشیاری سے شانتی کو پھانسنے کے لئے اپنے جال کے پھندے مضبوط کرنا تھے، میں نے کہا "روپتی یہ روپیہ تو لے لے" وہ تعجب سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے مسکرا کر اُس سے کہا "دیکھ ذرا کھاری سے بھوسہ نکال دے۔ وہ کھاری چلی گئی، اور میں بھی اُس کے پیچھے پہنچ گیا،

ایک غریب عورت روپے کے لالچ میں کیا کچھ نہیں کر سکتی؟ مذہب

کے قیود صرف اُنھیں کے لیے ہو سکتے ہیں، جن کا پیٹ بھرا ہوا ہو، ورنہ بھوکے کا مذہب روٹی اور روٹی ہے۔ جب وہ جانے لگی تو میں نے اس سے بہت دیر تک باتیں کرکے وعدہ لے لیا کہ وہ کسی نہ کسی طریقے سے شانتی کو میرے چنگل میں پھنسا دے گی، اور اُس کا انعام میں نے پانچ روپے مقرر کردیا۔

تیسرے روز سویرے روپتی پھر آئی۔ اور مجھ سے کہہ گئی کہ "آج شانتی میرے ساتھ جنگل میں گھاس چھیلنے جائے گی"، میں نے اُس سے طے کرلیا، کہ وہ گھاس چھیلتے چھیلتے شانتی سے دُور نکل جائے گی۔ مجھے کیا دیر تھی اُس کے جاتے ہی میں نے جلدی سے دوکان کا کام ختم کیا، اور جنگل کی طرف روانہ ہو گیا جنگل کیا تھا آبادی سے کوئی ڈیڑھ کوس پر راستے سے ہٹ کر جنگلی درختوں کا ایک چھوٹا سا کنج تھا، جو چاروں طرف سے گھنی جنگلی جھاڑیوں اور ڈھاک کے درختوں سے گھرا ہوا تھا، گاؤں والے اُسے جنگل کہتے، میں جب جنگل پہنچا، تو اُس وقت تک شانتی اور روپمتی وہاں نہیں پہونچی تھیں، میں ایک طرف جھاڑی میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ اور اپنے انتقام لینے کے طرح طرح کے منصوبے باندھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ شانتی تنہا جنگل میں داخل ہوئی، اور روپتی اُس سے بہت دُور ڈھاک کے درختوں کی آڑ میں گھاس چھیلنے بیٹھ گئی۔ شانتی دھیمے سُروں میں کچھ گنگناتی بڑے والہانہ انداز سے چل رہی تھی۔ جیسے ہی میرے قریب آئی، میں ایک دم سے جھپٹ پڑا۔ پہلے تو وہ جھجکی، لیکن پھر تیزی سے اُس نے اپنا کھرپا تان لیا اور بڑی زور سے چیخکر روپتی کو آواز دی۔

چور کا دل ہی کتنا میں گھبرا گیا "اب بھی خفا ہو شانتی، میں تو اپنے کام سے آیا تھا یہاں۔ لو میں جا رہا ہوں"۔

شانتی میرے راستے سے ہٹ گئی، لیکن کھرپا اب بھی تانے رہی، کہنے لگی "لالہ جی تم امیر ہوا پنے گھر کے، غریب بھی آخر آبرو رکھتے ہیں" میں اپنے دل میں بہت نادم ہوا، اور اُس سے معافی مانگنے لگا۔ پھر کہنے لگی "لالہ جی اگر جاکر کہدوں گاؤں میں اور تمہارے گھر میں"۔

اب تو میری نانی ہی مر گئی، میں بات بنانے لگا۔ "اُس روز کا خیال نہ کرنا میں نے اُس روز شراب پی لی تھی"۔ یہ کہہ کر مجھ سے جس طرح ہو سکا میں جنگل سے بھاگا۔ ایک دفعہ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ اپنی ساری کے آنچل میں اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔ میرا دل کٹ گیا، راستے بھر اپنی شیطانیت اور بزدلی پر میں اپنے آپ کو ملامت کرتا رہا۔

اس واقعہ کے دو ماہ بعد شانتی کا باپ شیو نرائن مر گیا، میں اس عرصے میں روپتی کے ذریعہ شانتی کو اپنے دام میں لانے کی برابر کوشش کر رہا تھا۔ اس واقعے سے میں خوش ہوا کہ شاید اب شانتی کا غرور ٹوٹ جائے۔ اور روپے کے زور سے وہ میرے ہاتھ لگ جائے۔ لیکن باپ کی موت کے بعد وہ گاؤں سے کچھ ایسی غائب ہوئی کہ پتہ ہی نہ چلا کہ اُسے زمین کھا گئی یا آسمان۔ یوں تو میں شانتی کو بھول جاتا، لیکن اکثر آئینے میں اپنی ناک پر زخم کا نشان دیکھکر شانتی کو یاد کرلیتا۔

بارہ سال گزر گئے۔

رات کے دس بج چکے تھے، اور میں ایک طوائف کے کوٹھے پر چڑھ رہا تھا جیسے ہی میں کمرے میں داخل ہوا میں تعجب سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا "ایں، شانتی!"

"آئیے لالہ جی" کہہ کر شانتی کھڑی ہو گئی، اپنی ایک شال مجھے اُڑھا دی اور کہنے لگی، "اِدھر لالہ جی اطمینان سے بیٹھیے تکیہ کے قریب" میں بیٹھ گیا۔ کمرے کا ساز و سامان دیکھکر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ دروازوں پر ریشمی پردے پڑے ہوئے تھے۔ دیواروں پر سنہرے چوکھٹوں کی خوبصورت تصویریں آویزاں تھیں۔ چھت سے ایک بہت قیمتی بجلی کا فانوس لٹک رہا تھا، اور فرش پر قالین میں گھٹنوں تک پیر گھُسے جاتے، شانتی نے ملازمہ کو آواز دی "لالہ جی کے لئے حقہ بھر لاؤ" ملازمہ نے چاندی کا ایک حقہ لاکر میرے سامنے رکھ دیا۔ تھوڑی دیر تک میں امیرانہ ٹھاٹھ سے مرعوب رہا۔ لیکن دفعتاً میری نظر سامنے دیوار پر لگے ہوئے آئینے پر پڑ گئی، اور میں نے اپنی ناک پر زخم کا نشان دیکھ لیا۔ بارہ برس اُدھر کے واقعات بجلی کی طرح میرے دماغ میں کوند گئے اور حسد نے آتشِ انتقام کو اور بھی بھڑکا دیا۔

"تو اب شانتی تم یہ کرتی ہو" میں نے نفرت سے مسکرا کر پوچھا۔

"جی ہاں" اُس نے متانت سے آنکھیں نیچی کرکے کہا۔ اُس کے چہرے پر سُرخی کی لہر دوڑ گئی۔ اور اُس کا حُسن دیکھکر بیتاب ہو گیا۔ وہ اب پندرہ برس پیشتر سے زیادہ حسین تھی۔ کم از کم میرے لئے۔ مجھے اُٹھتی ہوئی

جوانی سے وہ جوانی زیادہ پسند ہے جو شباب کے آخری دَور میں انگڑائیاں لے رہی ہو۔

"روپتی کیا کرتی ہے" شانتی نے پوچھا۔

"کرتی کیا ہے وہی پسینا بیتی ہے۔ بیچاری بیوہ ہوگئی" میں نے کہا۔

"اور کیشری کیا کرتی ہے" اُس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں محنت مزدوری کرکے اپنا اور اپنے بچوں کو پیٹ پالتی ہے۔ اس کا شوہر تو بڑا لاابالی ہے کچھ کرتا دھرتا نہیں" میں نے کہا۔

"تو گاؤں میں سب وہی کرتے ہیں جو پہلے کرتے تھے"

"اور کیا"

"آپ بھی وہی کرتے ہیں" اُس نے نظریں اُٹھاکر دیکھا میں جھینپ گیا اور کچھ نہ بولا۔

"تم نے یہ کیا پاپ کیا شانتی" تھوڑی دیر بعد میں نے پوچھا۔

"پاپ۔ تم نے یہ کیا پاپ کیا کہ تم گھر میں بی بی بیٹی کو چھوڑ کر یہاں چلے آئے" اُس نے تیزی سے کہا۔

میں نے اپنی شرمندگی مٹانی چاہی "لیکن تم کو تو بڑا ناز تھا شانتی۔ اور اب یہ کیا کر بیٹھیں؟"

"اب بھی ناز ہے مجھکو۔ میں اب کیا کسی کے سامنے ذلیل ہوں، تمہاری سماج یونہی بکا کرتی ہے۔ ذلیل وہی ہے جو دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔ میں اس وقت ذلیل تھی جب میں تمہارے سامنے ہاتھ پھیلانے گئی تھی، اور آج میں کیسے ذلیل ہوں، آج تو تم میرے سامنے ہاتھ پھیلائے ہوئے آئے ہو" اُس نے جواب دیا۔

مجھے بڑا جل بل معلوم ہوا کہنے لگا "ذلیل وہ ہے جو خوددار نہیں، جسے اپنے آپ کی عزت نہیں۔ ایک تم ہو کہ خودداری بیچ کر یہاں گدّوں اور قالینوں پر اپنی عزت کی دوکان لگائے بیٹھی ہو۔ اور ایک تمہاری ہی بہن روپتی سردی میں ٹھٹھر ٹھٹھر کر اپنی روزی کما رہی ہے لیکن اپنی عزت نہیں بیچتی"

"یہ تو تمہاری سمجھ کا قصور ہے کہ تم عزت کس چیز کو سمجھتے ہو اور ذلت کس چیز کو۔ بیچاری روپتی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہوگی، اپنے پرائے سب کی ڈانٹ پھٹکار سنتی ہوگی۔ اُس بیچاری سے پوچھو تو جاکر خودداری اور عزت کہتے کسے ہیں۔ تم ہی جو آج یہاں بیٹھے اُسے خوددار اور عزت والی کہہ رہے ہو کل جاکر اُس کے جوتے لگاؤ گے۔ بڑے آئے خودداری لیکر عورت کو مجبور کرتے ہو اور پھر ڈھکوسلے لیکر چلتے ہو خودداری اور عزت کے۔ لالہ جی اب جائیے۔ راستہ بھر ٹھنڈے دل سے سوچیے گا کہ وہ زیادہ خوددار ہے جو بیچاری آپ کی ڈانٹ پھٹکار سنکر خاموش ہو جاتی ہے، یا وہ جو اپنی مرضی سے آپ کے ایسے بیسیوں کو اپنے گھر سے نکال دیتی ہے"—— میں چپ چاپ نیچے چلا آیا۔

قطعہ

اس اُداسی سے مہکتے ہوئے گلزاروں پر
ابر جاتی ہوئی برسات کا لہراتا ہے
جیسے اک کشمکشِ کرب سے ماں کے دل میں
طفل سے دودھ چھڑانے کا خیال آتا ہے

(جوشؔ)

قطعہ

ایک ہلکی سی مسرت، ایک مبہم سی خوشی
رُوح میں کچھ یوں مچلتی ہے بوقت پیچ و تاب
جیسے ہلکے ابر میں موہوم ساخطِ ہلال
یا کسی بیمار بچے کا تبسّم وقتِ خواب

(جوشؔ)

تعلیمِ آزاد

کیا کہیں کیوں ۔یوں روبہ قضا ہیں کیا کہیں کیوں غیروں سے خفا ہیں
کیا کہیں کیوں بیزارِ وفا ہیں ڈیڑھ صدی سے صرفِ جفا ہیں

آخر جبر گوارا کب تک
آخر صبر کا یارا کب تک

غفلت کرکے جی نہیں سکتے فاقے بھر کے جی نہیں سکتے
بھوکوں مرکے جی نہیں سکتے جی سے گزر کے جی نہیں سکتے

اب دل مرنے سے نہیں ڈرتا
آخر مرتا کیا نہیں کرتا

یارو حالِ ملک تو دیکھو رنگ و بالِ ملک تو دیکھو
فرطِ زوالِ ملک تو دیکھو قحطِ رجالِ ملک تو دیکھو

آنکھ ہے اور غم خیز مناظر
بالکل یاس انگیز مناظر

کوئی مائل کارِ غلامی کوئی حامل بارِ غلامی
جس کو دیکھو یارِ غلامی تین کروڑ اور غارِ غلامی

کیا کہیں کیا کہنے کی جگہ ہے
ڈوب کے مر رہنے کی جگہ ہے

اُٹھو ملک کے لالو اُٹھو — اُٹھو ہمت والو اُٹھو
اُٹھو کام سنبھالو اُٹھو — اُٹھو وقت نہ ٹالو اُٹھو

فتح کی جھلکی شان دکھاؤ
شان دکھاؤ آن دکھاؤ

کار عبث ہے جان نہ جائے — جان کا کیا غم آن نہ جائے
ملکی قومی شان نہ جائے — مرد بنو میدان نہ جائے

توپوں تنگ کے وار نہ مانو
جانیں دے دو ہار نہ مانو

بڈھو۔ جوانو۔ عورتو۔ مردو — کردو ترک غلامی کردو
گھر دو۔ در دو۔ زر دو۔ سر دو — بھر دو ملک کو حسن سے بھر دو

گھر گھر شمعیں روشن کردو
چپہ چپہ گلشن کردو

حکیم آزاد انصاری

غبار اک دوسرے پر پھینکتے ہیں تیز رو موٹر — مخالف سمت سے ہمدوش ہو کر جب گزرتے ہیں
یونہیں وو بدگہر اشخاص جب ملتے ہیں آپس میں — نئی تاریکیاں اک دوسرے سے اخذ کرتے ہیں

جوش

جامعۂ ملیۂ اسلامیہ، دہلی

اسرائیل احمد خاں

(گذشتہ سے پیوستہ)

(۷)

جامعۂ ملیۂ اسلامیہ پر جو مضمون کلیم کے اکتوبر نمبر میں سپردِ قلم کیا گیا تھا، اُس میں جامعہ کے زوالِ روح پر ہم نے جو باب باندھا تھا اُس کے بعض گوشے ہنوز تشنہ ہیں! ہم اِس قسط کے آغاز میں دو ایک تازہ ترین واقعات کا اور اضافہ کریں گے، جس سے یہ "بحث" تا تاریخ مکمل "(Uptodate) بھی ہو جائے گا، اور جامعۂ ملیہ کے جدید مشربِ ارتداد کی "معراج" (Climax) تک اُس کا تعاقب بھی ہو جائے گا! ؎

جفائیں دیکھ لیاں، بیوفائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں "دیکھیں!

دو تین مہینے اُدھر کی بات ہے کہ سید عطار اللہ شاہ صاحب بخاری مجلسِ احرارِ ہند کے مشہور زعیم و خطیب، دہلی میں تشریف فرما ہوئے تھے۔ جامعہ نے حسبِ معمول شاہ صاحب کی اک تقریر اپنے ہاں کرا کے اپنے پروپیگنڈے کے طبلِ بلند بانگ میں ایک اور آہنگ کا اضافہ کرنا اور اپنے "وسیع تر علمِ معیشت" کا اک تازہ شکار کھیلنا چاہا! لیکن احتیاط پسند اربابِ حل و عقدِ جامعہ کو شاہ صاحب اک "تیغ ذوالفقار" نظر آئے! وہ صاحب موصوف کو بُلانا بھی چاہتے تھے اور اُن کی لائی ہوئی ممکن آفت سے بھی محفوظ رہنا بھی ضروری سمجھتے تھے: ع

معشوقیٔ و بیحوصلگی طُرفہ بلا ہے!

پس سید صاحب کو دعوت دینے میں وہ شاطرانہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ ع

پرسش ہے، اور پائے سخن درمیاں نہیں!

دیر تک طلبہ اور اسٹاف کے درمیان اک حیص بیص رہی! اک نووارد طالب علم نے جو "نامحرم" ہونے کی وجہ سے اہلِ جامعہ کی اس گو مگو کو سمجھنے سے قاصر تھا، دخل در معقولات دیتے ہوئے کہہ دیا کہ "حضرت! اس قدر تذبذب و تامل کی ضرورت ہی کیا ہے؟ آپ اُنھیں بُلانا چاہتے ہیں۔ بس بُلا لیجئے! کارِ خیر میں کسی استخارے کے معنی کیا ہیں؟!" ——— اس پر جامعہ ملیہ کے اک "خضرِ راہ" نے ارشاد فرمایا کہ "ہمارے لئے کسی قدر پُر اشکال سوال یہ آن پڑا ہے کہ سید عطار اللہ شاہ صاحب کا داعی ہم میں سے کون بنے؟ جامعہ کے "ادارے" کی طرف سے شاہ صاحب کو دعوت دینا قرینِ مصلحت نہ ہوگا، اس لئے کہ وہ مسلّمہ طور پر گرم سیاست کے اک علمبردار ہیں، جن سے ہمیں اپنا دامنِ (عصمت!) بچانا ضروری ہے! پس مناسب یہ ہوگا کہ اصطلاحاً بلاوا تو طلبہ کی انجمن کی طرف سے دیدیا جائے، اور پھر درپردہ تو ہم سب شریک ہی ہیں!"

اللہ اللہ، "دو عملی سیاسیات" کی یہ اختراعِ فائقہ ؟! ؎

دو دل بودن دریں رہ سخت ترعیبیست سالک را

خجل ہستم ز کفرِ خود، کہ دارد "بوئے ایماں" ہم!

اچھا، اب دوسرا مرحلۂ صعب، موضوعِ تقریر کا تھا جو "مہمانِ خطیب" کے لئے تجویز کیا جائے! جامعۂ ملیہ کے صدرِ اول کے اک رُکنِ تعلیم نے، جن کے دل و دماغ میں اپنی "حرارتِ ملیت و اسلامیت" کی کافی باقیاتِ صالحات موجود ہیں۔ بے تکلف رائے دے دی کہ "مبحثِ وعظ بلاشبہ کوئی سیاسی مضمون ہونا چاہئیے!" —— جامعہ کے اک جہاندیدہ —— اگرچہ خدانخواستہ اک "سرد و گرم چشیدہ" نہیں ب—— بزرگ مضطرب ہو کر بول اُٹھے کہ "سید عطار اللہ شاہ صاحب کی کسی سیاسی تقریر سے کیا، ہم بیٹھے بٹھائے کسی آفتِ ناگہانی کو دعوت دیں گے ؟!..........

جی نہیں! سیاست و بارت لِس تہ کر کے رکھئے! انسب یہی ہے کہ سید صاحب کا کوئی دینی وعظ ہو جائے۔ اور باقی ختم!"

گو یا اگر :

در دَیرِ مغاں آئی، مضمونِ بلند آور

لیکن :

در خانقہِ "صوفی" "افسانۂ و افسوں" بر!

اور پھر کیا آپ کو معلوم ہے کہ "شعبۂ دینیات" کے حدودِ اربعہ کے اندر بھی وہ کونسا برمحل عنوان تھا جو سید عطار اللہ شاہ صاحب کے لئے محتسبینِ جامعہ نے اِملا کرایا ؟ —— مسئلۂ ختمِ نبوت !

انا للہ !

"ختمِ نبوت" کے کلمات کیا اہلِ جامعہ کے سامعہ کو اس وجہ سے خوشنوا معلوم ہوئے کہ اُن میں جامعۂ ملیۂ اسلامیہ کے پیامِ "ملیت و اسلامیت" کے اُس "خاتمۂ بالخیر" کے ساتھ اک بر خود غلط ہمنوائی سی مسموع ہوتی ہے۔ جو جامعہ کے اربابِ حل و عقد کے ہاتھوں عمل میں آچکا ہے! ختم اللہ علیٰ قلوبہم

جامعہ کے فضلاء و مجتہدین کو معلوم ہونا چاہئیے کہ نہ پیامِ اسلام کا کام ابھی اتمام کو پہنچا ہے نہ جامعۂ ملیۂ اسلامیہ کے نصب العین نے ہنوز عملی جامہ پہنا ہے !

چونکہ لے دل! کہ ابھی تک ہے وہ محفل باقی | وہی محمل ہے وہی لیلیٰ محمل باقی !
راہ کو منزلِ مقصود سمجھنے والے! | جانتا ہے ابھی کتنے ہیں مراحل باقی ؟
غور کرنے سے اُلجھتا ہے ترا دل ورنہ | اب بھی ہے کشمکشِ حلِ مسائل باقی ؟
سُن! کہ ابتک ہے بیابانیں جرس گرمِ فغاں | اُٹھ! کہ ابتک ہیں بہت واقفِ منزل باقی
تُو نے سننے کی قسم کھائی ہے ناداں، ورنہ | اب بھی گلشن میں ہے گلبانگِ عنادل باقی
آج تک کشمکشِ عشق کا محکم ہے نظام | وہی ناخن ہے وہی عقدۂ مشکل باقی!
اب بھی ہر دل پہ ہے اُس کاکلِ شبرنگ کا دام | اب بھی ہر روح میں ہے شورِ سلاسل باقی!
تو نے کیا سوچ کے یوں میان میں رکھ لی تلوار | دیکھ ابتک ہے نزاعِ حق و باطل باقی!

نبضِ ہستی کی دھمک جوش ہو کیونکر محسوس ؟

جو دھڑکتا تھا وہ پہلو میں نہیں دل باقی! —— جوشؔ

جامعہ کی زندگی کے ماضیٔ قریب ہی کا اک واقعۂ شگفت یہاں اور قابلِ ذکر ہے! جامعہ کی جس "بزمِ اتحاد" (Students Union) میں کبھی کنور محمد اشرف (حال ڈاکٹر محمد اشرف، پی ایچ ڈی، صدر شعبۂ سیاسیات و معاشیات کانگریس) ایسے جواں سال و جواں دل طلبہ گرجا کرتے تھے، جن کی شعلہ زبانی و آتش خواری کی مرعوبانہ داد اچاریا پی سی رائے ایسے اکابرِ علم و عمل دیا کرتے تھے، اور جامعہ کی "انجمنِ مناظرہ" میں جن کے موضوعات بحث اس سے کم گرم یا تنگ ہوا کرتے تھے کہ مثلاً "ہندوستان کی تحریکِ آزادی کو "ہندوستانیت" کے اندر ہی محدود رہنا چاہئیے، یا اُسے وسیع تر آلِ ایشیا جہادِ حریت کے ہمرکاب ہونا چاہئیے ؟" اور پھر جن مناظروں کا فیصلہ آخر الذکر قسم کے مسلکوں کی موافقت میں ہوا کرتا تھا۔ اُس جامعۂ ملیہ اسلامیہ کی موجودہ "ننگِ وجود" "بزمِ اتحاد" کا اعجاز یہ ہے کہ اُس کے اندر ابھی حال میں بحث و نظر کے لئے یہ مسئلہ (Proposition) پیش کیا گیا کہ "مسلمانانِ ہند کو کانگریس کی تحریک سے منسلک ہونا چاہئیے یا نہیں ؟!"

آنچہ می شنوم بہ بیداری ست یا رب یا بخواب ؟!

جامعہ کے اندر، اور یہ سوال متنازعہ فیہ ؟!

یہ تنقیح تو، بالفاظِ دیگر، بعینہ اس استفسار کے ہم معنی ہے کہ "آیا جامعۂ ملیۂ اسلامیہ کا نام —— "ملیۂ اسلامیہ" —— باقی رہنا چاہئیے یا اُسے تقویمِ پارینہ سمجھکر اک حرفِ غلط کی طرح مٹا دینا چاہئیے ؟!"

ہم مولینا محمود حسن قدس اللہ سرہٗ اور مولینا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ کی مولودِ قلب و روح —— جامعہ ملیہ مرحومہ —— کی روحِ عفیف

کا یہ جگر دوز نالہ اپنے سامعۂ تخیل سے سُن رہے ہیں کہ یَا لَیْتَنِیْ مُتُّ قَبْلَ هٰذَا وَ كُنْتُ نَسْیًا مَّنْسِیًّا!"

جس طائفۂ شریفہ کو اپنا نام نامی و اسم سامی ہی خیر سے مُحِلِّ نظر نظر آتا ہو اُن کی انقلابی فکر و رائے کا آئندہ ہدف اگر اُن کا "شجرۂ نسب" بھی بن جائے تو کیا کوئی امر مستبعد ہوگا؟!

حیف گر در پس امروز بود فردائے!

پھر قارئینِ کرام کو مژدہ ہو کہ جامعہ کی "بزمِ ہمتاہ" کا مذکورۂ بالا بحث اپنے تمام "مالہٗ و ماعلیہ" کے ساتھ منقح و متحقق ہو کر جب معرضِ انفصال میں آیا تو اک "زبردست غلبۂ آراء" سے بصورتِ "نفی" پاس ہوا! ع

تفو! بر تو اے چرخِ گرداں، تفو!!

کیا مسٹر محمد علی جناح اِس امر کے استحسان پر غور فرمائیں گے کہ کیوں نہ چودھری فضل الحق، وزیرِ اعظم حکومتِ بنگال، اور سر سکندر حیات خاں، صدر سرکارِ صوبہ پنجاب کے بعد وہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب، آمرِ جامعۂ ملیۂ اسلامیہ دہلی کو بھی اپنی سیاسی حرم سرا میں داخل فرمالیں!

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا!!

یہ تھیں وہ شرمناکیاں اور رجعت پرستیاں جن کو دیکھکر ہمارا معہودِ ذہنی اک نووارد طالب علم جامعہ کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا، اور اُس کے والد کا حجابِ حسنِ ظن پارہ پارہ ہوگیا؛ اور دونوں باپ بیٹے جامعہ کو خیرباد کہتے ہوئے اپنے وطنِ مالوف کو مراجعت کر گئے! ے

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل

جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا!

جامعہ کے محیرِ العقول، بیمثال روحانی زوال نے اُسے جس نوبت کو پہنچا دیا ہے اُس کا اک نظارۂ طائرہ اِس لمحۂ حال پر کر لیجئے!——

اک عام افسردگی و مردنی کا ابرِ تاریک اُس پر چھایا ہوا نظر آتا ہے۔

وہ اُداسی، وہ فضائے گریہ ساماں ہائے ہائے!

یہ نو آبادی، بجائے نو آبادی کے اک "نئی شمشان بھومی" دکھائی دیتی ہے! اوکھلے کا زیرِ تعمیر —— یا معلق ما بینِ ارتفاع و انہدام —— "جامعہ نگر"، جہاں استہاربازانِ جامعہ کی فقرہ طراز زبان میں "زرین مستقبل کا نو بنو ہندوستان اک دیدنی شانِ بروز سے اُبھر رہا ہے"!

وابستگانِ سر رشتۂ دفترِ جامعہ ہی کے اک مبالغہ و فرد کے طریق تسمیہ میں جامعہ نگر، "اوکھلا نہیں"، "کھوکھلا" ہے بس —— تف ہے اِس جدید ہندوستان کی "اُٹھان" پر جس کی طرف اک نظر فریب فوٹو کی تشہیر کے ساتھ ساتھ جب الفاظ میں دعوتِ نظر دی جاتی ہے تو معاً بعد ہی کے جملے میں ارسالِ چندہ کی فرمائش بھی جڑ دی جاتی ہے! تاکہ یہ بے پناہ سُرعتِ نہضت سے اُٹھنے والا ہندوستان قلہائے ہمالہ کی رفعتوں کو جلد از جلد پہنچ جائے!

در پس ہر گریہ آخر خندہ ایست

لعذ ہر اپیل "آخر "چندہ" ایست!

ہر طرف اک نہایت بند و تنگ، فشار آمیز و عمیق اور فضائے استبداد محسوس ہوتی ہے! جامعہ کے ادارات و کاروبار کے اعضاء و جوارح کی ساری روح سلب ہو کر اُس کے پیکر کے اک گوشۂ قلب میں آکر مرکوز ہوگئی ہے، اور یہاں بھی وہ حرارتِ حیات کا کوئی "گلخن" روشن نہیں رکھتی، زندگی پر اک سخت گلوگیر "قدغن" عاید کئے ہوئے ہے! سارے مشہر جامعہ کی عنانِ اقتدار معدودے چند بزرگوں کے اک "جتھے" (Clique) کے ہاتھ میں ہے، جو "خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ" بنے ہوئے ہیں! جامعہ عبارت ہے اِنہی افراد سے، اِن کے علاوہ جامعہ کی تعلیمی آبادی کی جو بقیۃ "اکثریت" ہے خود اس "فاسٹ گرانڈ کاؤنسل" کی "ڈکٹیٹر شپ" کے اک کنسنٹریشن کیمپ (Concentration Camp) کی سی زندگی بسر کر رہی ہے! کوئی شخص "ڈاکٹر صاحب" کے دربار کے "بادشاہ گرد" کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں کر سکتا! حد یہ ہے کہ اعلیٰ عملۂ تعلیم کے ارکان (بیرونِ "بزمِ خاص"!) بعض "ناک کے بال" ہیڈ کلارکوں کے سامنے پانی بھرتے ہیں: اور آخر الذکر کی "خرمغزیوں" کے صیدِ زبوں ہیں! محض اپنی اخلاقی جرأت کی کمی اور اپنی معاشی بینوائی کی ناچاری سے وہ یہاں کے بعض عالی نسب نو دولتوں کے دامِ سخت میں پڑے پھڑک رہے ہیں، اور دَم نہیں مارتے! اگر کبھی اُن کا ضبطِ فغاں جواب بھی دے جاتا ہے تو ایسے تمام موقعوں کو ٹالنے کے لئے سالارِ کارواں (حضرت شیخ الجامعہ) کو یہ کلمۂ رَدِّ بلا رواں ہے کہ:

"جامعہ میں جو چند لوگ کام کے پائے جاتے ہیں، آپ لوگ اپنی بدگوئیوں اور مطعونیوں سے اُنہی کو بھگا دینا چاہتے ہیں، تاکہ اُن کے تخلیئے کے بعد جامعہ کا مطلعِ عمل صاف ہو جائے!"

قارئین کے لئے یہ معلومات دلچسپ ہوگی کہ جن "مردانِ عمل" کی "گریزپائی" کے متعلق جناب شیخ تلمیح فرمایا کرتے ہیں وہ جامعہ کی تختگاہ و حکومت میں "قطب از جا نہ جنبند" کی استقامت کے حامل رہے ہیں! اور جن مظلوم فریادیوں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اُن کی زاغ صفت قیل وقال اِن "بیداغ بلبلوں" کی آشیاں ویرانی کا باعث ہوجائے گی، اُن کی کثیر تعداد ماضی میں شکستہ دل اور برداشتہ خاطر ہوکر جامعہ سے ہجرت کرچکی ہے! ؎

چو پردہ دار بشمشیر می زند ہمہ را
کسے مقیم حریم حرم نخواہد ماند!

ناقابلِ شمار ارکانِ اساتذہ اور افرادِ سر رشتۂ دفاتر جامعہ کی آمد و شد، جامعہ کی تاریخِ ماضی کا عنوانِ جلی رہی ہے! اس ماجرے کی علت یہی رہی ہے کہ کوئی آدمی، جو حقیقتہً قابل اور خود دار تھا، اس رنگِ محفل کو زیادہ عرصے تک برداشت نہ کرسکا، اور جب جامعہ کے نظام کا استبداد نمایاں اور اُس کے اعیانِ دربارِ خاص کی بافندگی عُریاں ہوگئی تو خون درجگر ہو ہو کر یہاں سے رخصت ہوگئے۔ زیرِ لب پیچ میں یہ فریاد کرتے ہوئے کہ ؎

یارب! ز سیلِ حادثہ طوفاں رسیدہ باد
بُت خانۂ کہ غالب نقش نام کردہ اند

اور اب جو لوگ جم کر رہ گئے ہیں، وہ ہیں بھی اک "دُردِ تہ نشین" کی مثال! باقی بادۂ "سرجوش" کی جتنی امواج تھیں وہ جس تیزی سے آئی تھیں اُسی تیزی سے آگے بڑھ گئیں! ع

ہمہ شوق آمدہ بودم، ہمہ حرماں "رفتم"!

ذوقِ ایمان کو کھو دینے والے اربابِ حل وعقدِ جامعہ سے ہم کس اُمید پر یہ شکوۂ رنگیں کریں کہ :-

تیری محفل بھی گئی، چاہنے والے بھی گئے — شب کی آہیں بھی گئیں، صبح کے نالے بھی گئے!
دل تجھے دے بھی گئے، اپنا صلہ لے بھی گئے — آکے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے!
آئے عشاق، گئے وعدۂ فردا لے کر
اب اُنھیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر!

ہمیں اُمید نہیں کہ موجودہ عاملین کاروبارِ جامعہ کے خط وخال کے اندر یہ اعادۂ حُسن ظہور میں آسکے گا، لیکن ع شاید کہ بجوئے خشک باز آید آب!

جامعۂ ملیہ کا قلب وجگر، جس نے یہ غلامانہ فضا اپنے گرداگرد پیدا کردی ہے، بالکل فاسد ومسموم ہوچکا ہے! "شیخ الجامعہ آج اک پورے با پروبال" بڑے آدمی ہیں! —— "بڑے آدمی" نکہ آدمی! ؎

گویند ایں کہ شیخ ملائک سرشت ہست
آرے، من اعتراف کنم "آدمی" نہ است!

آٹھ دس سال اُدھر وہ جن ہمسایوں کی نشستگاہ پر آتے جاتے صبح وشام گھنٹوں نشست وبرخاست رکھا کرتے تھے اور پوری برادرانہ بے تکلفی کی فضا نظر آیا کرتی تھی، آج وہ اُنھیں محسنوں کو اک عمیق لہجۂ تمکنت میں انتباہ فرمایا کرتے ہیں محض اس فروگذاشت کی پاداش میں کہ وہ غریب پانچ دن میں پوری پانچ دفعہ دربار کی حاضری دینے سے کیوں قاصر رہے! —— کیوں نہ ہو ان الصلٰوۃ کانت علی المومنین کتاباً

موقوتا!

اُن کے ماتحتین، دفتری خط وکتابت میں بھی اُنھیں "حضرت..... مدظلہ" سے خطاب کیا کرتے ہیں اور اپنے تئیں "خادم......" کی حیثیت سے پیش کیا کرتے ہیں! —— اگرچہ موخر الذکر جماعتِ "خدام" کا ایک فرد، جامعہ کے تعلیمی مرکز نمبر ا کا "سربراہکار نمبر ایک" ہے!

جامعہ کے اربابِ حل وعقد کے اک رُکنِ رکین، جو جامعہ کی قریباً نصف آبادی کے لئے اک "فرعونِ بے ساماں" بنے ہوئے ہیں، جب اپنے بُت خانۂ استبداد کے "صنمِ کبیر" کے روبرو کھڑے ہوتے ہیں تو بعض خاص ساعاتِ ارادت وعقیدت میں "دست بستہ ایستادہ" پائے جاتے ہیں!

بندہ پرور! مگر خدا شُدہ!!

ماضیٔ قریب میں بعض ایسے معنی خیز آثار دیکھنے میں آئے ہیں جو کچھ ایسے مستقبل کی غمازی کرتے نظر آتے ہیں کہ شیخ الجامعہ شاید رفیع الدرجات شخصیتوں کے مقام سے متجاوز ومترفع ہوکر خاصانِ خدا، بلکہ "مامورین من اللہ" کے زُمرے میں داخل ہورہے ہیں! ہمارا رُوئے سخن اس حقیقت کی طرف ہے کہ جامعہ کے بعض "مُوقت الشیوع" پروپگینڈا لٹریچر" (مثل رسالۂ "ہمدرد جامعہ" وغیرہ) میں اب "حضرتِ شیخ الجامعہ" کے "مزاج وہاج" اور "خاطرِ عاطر" کے تولہ ماشہ اُتار چڑھاؤ کی خبریں بھی "اطلاعِ عام" کے لئے، شائع ہوا کرتی ہیں!........ براعظم ہندوستان کی

سیاسیاتِ عالیہ میں یہ "رتبۂ بلند" ابھی تک مولٰینا ابوالکلام آزاد، مہاتما گاندھی، اور پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی نصیب نہیں ہوا ہے! یہ مقتدر آل انڈیا ہستیاں بھی، جہاں تک کہ اُن کی جسمانی صحت وحالت کا تعلق ہے، نارمل (طبعی) حالات میں اخبارات کا "موضوع" نہیں بنا کرتیں! اور جب تک کہ خاصی صاحب فراش نہ ہو جائیں، "ایسوسی ایٹڈ پریس" کے نمائندگان کی نظرِ التفات حاصل نہیں کیا کرتیں! تاہم شیخ الجامعہ صاحب جامعہ کے "بلیٹن" "بیوریو" کے اعلانات وبیانات کا عنوانِ جلی بنتے ہیں! اور سالانہ تعطیلات کے "ایام خالی" میں بھی اُن کی محض "روزانہ آمد وشد دفتر" کے نزولِ اجلال کا واقعہ "بھی" براڈ کاسٹ" کیا جاتا ہے! ع

تو و قطعِ منازل ما من و یک لغزش پائے!

ہم کو یہ پرمعنی نشو ونمائے حالات کچھ پیش خیمہ نظر آتی ہے۔ مرزا بشیر الدین محمود احمد بہین لو رنبوت" و خلیفہ راشد" دارالخلافت قادیان کے روحانی ٹھاٹ باٹ کی! جن کے "صحیفۂ الفضل" میں اہلِ بیت نبوی" کے اکابراطہار کے شب وروز کے خواب وخور کے نادر اخبار، اُمت کی "تشحیذ الاذہان" کے لئے اشاعت پذیر ہوا کرتے ہیں!

اگر حضرت شیخ الجامعہ کے "مریدانِ پراندگان" اُنھیں تقدس وکبریائی کے اس کوچے کی سیر کرانا چاہتے ہیں تو ہم بھی اپنے پیشگی قصیدۂ نعت وترانۂ حمد کے اس مطلعے کے ساتھ خیر مقدم کرنے کو طیار رہیں کہ ؎

"شیخ" ما امسال دعوائے "نبوت" می کُند
سالِ دیگر گر خدا خواہد "خدا" خواہد شدن!

ایک آدھ سال میں شیخ کے آو کھلے والے "جامعہ نگر" کی دُور و دراز اور ساموں ومعشوں فضا میں منتقل ہو جانے کے بعد، اُن کا وہاں کے قلعۂ "الموت" کا "شیخ الجبل" بن جانا کم از کم چنداں بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتا! ؎

اے گرامی! تُرا شناسم من!
چہ بلا بود؟ پارسا شدہ؟!

قبل ازیں، جامعہ کے "صوفیانِ صافی" کے حلقے میں سرمایہ داریت اور امارت کے کافی کاروبار وادارات پیدا ہو چکے ہیں! ان "اخوانِ طریقت" میں آج آپ "طبقاتِ عالیات" اور "عوام کالانعام" (Classes & Masses) کو صاف صاف پہچان سکتے ہیں! مزید ستم ظریفی یہ ہے کہ "معاشیاتِ معیاری" کے تحت جو یہ جدید ہیئتِ اجتماعیہ ظہور میں آئی ہے اُس میں متوسط طبقے (Middle Classes) کا عنصر برائے نام ہی پایا جاتا ہے! جامعہ کے اندر قدم رنجہ فرما ہونے والے والیانِ ریاست واکابر دولت وملوک التجارت کی ضیافتوں کے جو "خوانِ یغما" آراستہ کئے جاتے ہیں اُن کی بُو بھی "غربائے جامعہ نگر" پر حرام رہتی ہے! اِن دعوتگاہوں میں داخلہ "بذریعہ ٹکٹ اور بمقدارِ چندہ" ہوا کرتا ہے!

یہ ہے انجام اُس آغاز کا کہ اہلِ جامعہ کو اُن کے دَورِ عُسرت میں جب ڈاکٹر انصاری مرحوم اپنے وسیع الوانِ نعمت سے خوان کے خوان بھیج دیا کرتے تھے تو سارے شرکائے رنج وراحت، بلاتمیز "شیخ وشاب" اُن سے "کامیاب" ہوا کرتے تھے! ع

جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی!

پاکبازانِ جامعہ کو یہ بات کہاں تک زیبا ہے کہ وہ ابھی سے "لارڈز اور کامنرز" ("Lords & Commoners") کی تمدنی تقسیموں کی اختراعاتِ فائقہ انجام دینے لگیں! کوئی چیز مساوات واخوت سے زیادہ باسعادت نہیں! ؎

بنازم بہ بزمِ محبت کہ آنجا
گدائے بشاہے مقابل نشیند

(۸)

جامعہ کی پیداوار

اس فصل میں ہم جامعۂ ملیہ کے دَورِ زوال وظہورِ فتن کی تعلیمی پیداوار کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ یہ فرزندانِ تعلیم بڑی دلچسپ ذہنیت کی مخلوق رہے ہیں! اپنی مادرِ علمی کی گود سے نکلتے ہی وہ معاش و ملازمتِ سرکار کی شاہراہ پر شُدرحال کُناں ہو گئے! گویا جامعہ کا ایوانِ تعلیم کسی بنیے کی دوکان تھا جس سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ان تربیت یافتگان کی قدرتی منزل گاہ بازار یا دفاتر سرکار تھی! اول تو جامعہ کے "بالغ الفن" منتہیان علوم وعرفان کا یہ مذاق اِن کی بڑی پست فطرتی، دونی ہمتی اور بیمائگی تھی! اس لئے کہ قومی تعلیم کا تصور کچھ یہ نہ تھا کہ ہم بدستور وہی سرکاری

"غلام خانوں" کے بندگانِ شکم رہیں، اور صرف اپنے کاسۂ گدائی کو بدل لیں! یعنی سرکاری ڈگری کے بجائے قومی درسگاہوں کی سندیں اب مملکتِ روزی و مُلکِ رزق کے "پاسپورٹ" بنیں!........ جامعۂ ملیہ کے تربیت یافتہ دماغوں کے اندر اِس واہمے کا حلول اک بڑی "کامک ٹریجڈی" تھی! جامعہ کا قلب و روح کچھ اِس درجہ معاشیاتِ عالیہ کے "ہیروں" کے سایۂ زبوں میں رہا ہے کہ اُس کے نونہالوں کا شب و روز کا خواب ہی "معاش" رہا ہے، ——— بجائے "معاد" کے! جامعہ کی "عبائے فضیلت" اور سرکاری یونیورسٹیوں کے "(graduate's gown) دونوں کو اُنھوں نے "فقیر کی کملی اور جھولی" کے ہی دو نمونے سمجھا! علمی سند کا تخیل اور مصرف اُن کے ہاں بھی شاید وہی رہا جو حکومتی تعلیم گاہوں کی شرمناکی تھی! یعنی:

مل گئی رو دھو کے اک کاغذ کے پرزے پر سند
اُس سند کو پا کے تو اپنے کو سمجھا مستند
جو سند ہے محنتِ بیہودہ کرنے کے لئے
جو سند ہے "بھوک" کو آسودہ کرنے کیلئے!

آزاد قومی تعلیم گاہوں اور اخلاقی تربیت گاہوں کے نصب العین کے معنی اک مختلف نظامِ تعلیم ہی نہ تھے، اک یکسر انقلاب انگیز مطمح نظرِ حیات تھے، اِن نونہالانِ تعلیم کو دورانِ تعلیم ہی میں سرکاری درسگاہوں کے طلبہ سے اپنی جداگانہ نشست نہ رکھنی تھی، بعد فراغِ تعلیم بھی اُن سے الگ اک جادۂ حیات پر چلنا تھا! ایامِ تعلیم میں یہ تقابل ناقص تعلیم اور صالح تعلیم کا تھا، بعد فراغ یہی تضاد خود پروری اور خلق نوازی، ملازمت اور خدمت کا ہو جانا چاہیئے تھا: واقعہ یہ ہے کہ برادرانِ وطن کے ہاں، جامعۂ ملیہ کے معاصر اداراتِ تعلیم کی حیثیت سے جو تربیت گاہیں معرضِ قیام میں آئی تھیں اُن کے دامن و صحن سے یہ اولادِ صالح پل کر نکلی بھی! گجرات و دیا پیٹھ اور کاشی و دیا پیٹھ کے فارغ التحصیل خدامِ خلق و رہنمایانِ سیاست کا ذکر اِس مضمون کی سابقہ قسط میں آچکا ہے! ہم اُس کی طرف یہاں اک اشارے ہی پر اکتفا کریں گے، اِس لئے کہ اِن "جوانانِ نوخاستہ و لبصدق و صفا دل بیاراستہ" کی سیاسی، نیز عام تمدنی، مساعیٔ حسنہ و خدماتِ جلیلہ اتنی روشناسِ ملک ہیں کہ صرف پرلے درجے کے بیخبرانِ وطن اُن سے ناواقف، اور محض اول درجے کے فرزندان و بزرگانِ جامعہ ہی اُن کے منکر ہو سکتے ہیں! الغرض قومی تعلیم گاہوں کے سند یافتگان، قومی خدمت و مجلسی تطہیر ہی کے لئے اپنے اِن علمی آلات سے مسلح ہوئے تھے!

باینہمہ جامعۂ ملیۂ اسلامیہ کے نابالغانِ دل و دماغ اِس تصور سے بُری طرح ناآشنا ثابت ہوئے! ع

پروردگار! طفلِ مسلماں کو کیا ہوا!

(واضح رہے کہ ہم جامعہ کے عہدِ ارتداد کی ذُریتہ کا ذکر کر رہے ہیں! اُس کے صدرِ اول کا خیر القرون ہمارا موضوعِ سخن نہیں! ہماری تنقید کی مئے تُند کے چھینٹوں سے مردانِ صدق و صفا کا دامنِ پاک پورا مامون و مصئون ہے! ؎

جوشؔ اگرچہ میکدے کا والی ہوں
بندۂ بندگانِ عالی ہوں!)

الغرض ہمارے معصوم جوانانِ جامعہ بشیتر حالات میں سرکاری یا تحتِ سرکاری یا نیم سرکاری ادارات کو اپنا معاشی ملجا و ماویٰ سمجھنے کی علمی ناخلفی کا ثبوت دیتے رہے ہیں! لیکن جیسی کہ توقع کی جانی چاہیئے۔ ان جگہوں میں انھیں "دور باش" کا پیغام سُنایا گیا! اور جب اُنھوں نے اپنی محترم مادرِ علمی کی سند پیش کی تو اُسے "ردی کی ٹوکری" میں پھینک دیا گیا، لاریب کہ اپنی اِس تذلیل کے لئے اُنھیں اپنا ہی ممنون ہونا چاہیئے! جب خود اُنہی نے اپنے اِس قابلِ عزت تمغائے علمی کی قدر نہ کی تو حریفوں سے اُس سے بہتر سلوک کی توقع گویا ضلالت پر حماقت کا بھی اضافہ تھا! جوانانِ جامعہ، اور حکام عالی مقام کے درِ دولت پر دریوزۂ ملازمت! ؎

تیرے فقیر، اور دیں کوچۂ کفر میں صدا؟
تیرے غلام، اور کریں اہلِ جفا کی چاکری!

معاملے کی بدبختیاں اور شرمناکیاں یہیں ختم نہیں ہوتیں! سرکاری محاکم و دفاتر کے افسران نے "طیلسانینِ جامعہ" کی سندات کو جب رَدّ کر دیا تو اِن غیر متندوں نے ظالم اغیار کے اِس "رَدّ" کو "قبول" کر لیا! "فردوسِ ملازمت" میں بہرحال داخل ہونے کے لئے اُنھوں نے سرکاری یا سکمہ سرکار کالجوں اور یونیورسٹیوں کی سمت میں گویا اک "تحویلِ قبلہ" انجام دیا۔ اور وہاں شاگردانہ ——— یا شاگرد پیشگانہ! ——— درجۂ رجسٹر

ہو کر اپنی تجدیدِ ایمانِ علمی کرنے لگے: ؎

باز آمدم کہ سجدۂ آں خاک پا کنم
گر طاعتے، قضا شدہ باشد ادا کنم!

اگر جامعۂ ملیۂ اسلامیہ کی سند کی ایسی ہی نا سخ علی گڈھ وغیرہ کی ڈگری تھی تو یہ صاحبزادگانِ جامعۂ ملیہ کے کیوں متبنیٰ بنے تھے؟ اُن کے نوجوان دماغوں کو کیا اُس ناقابلِ برداشت اہانت کا خیال ہے جو صومعۂ طاغوت کی محراب میں اُن کے اِس "سجدۂ سہو" سے لازم آتی ہے؟! افسوس! ؎

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے!

جامعہ کے بعض "فرزندانِ رشید" نے اپنی دلدادگیٔ ملازمتِ سلطانی کی ایسی آیاتِ قاہرہ پیش کی ہیں کہ ہم اُن کی روداد سنکر انگشت بدنداں ہی رہ گئے ہیں: جامعہ کے اک پیرِ نابالغ ـــــ "old boy" ـــــ نے اک بڑی ہندوستانی ریاست میں اپنے کو اک "علیگ" گریجوایٹ کی حیثیت سے پیش کیا! اور پھر وہاں اپنے ازدیادِ رسوخ اور ترقیٔ درجات کے کچھ ایسے پے در پے مراتب طے کئے کہ ریاستِ مشارٌالیہ کے صیغۂ نظم و نسق کے "سول سروس" میں اپنی نامزدگی کرالی! ـــــ معاملہ اِس مرحلے پر پہنچا تھا کہ اِس "جامعیٔ جعل" کا پردہ چاک ہو گیا! خیر، یہ جامعہ نگر کا سپوت تو اپنی محترم مادرِ علمی کی "نسبتِ بزرگ" سے نہیں شرمایا تھا، لیکن پھر دوسروں ہی کو اُس کی طرف سے شرمانا پڑا! تاہم اِتنا افسوس ضرور رہا کہ اک جامعی نوجوان کی انقلاب انگیز ترکتازِ تسخیرِ ملازمتِ اعلیٰ کی مُہم عین اپنے مرحلۂ تکملہ میں "ساقط الحمل" ہو کر رہ گئی! ؎

شکست و فتح تو قسمت سے ہے و لے اے میر
"مجاہدہ" تو دلِ "نوجواں" نے خوب کیا!

ہمارا خیال ہے کہ ہمارے معہودِ ذہنی فرزندِ جامعی کی "سکینتِ قلبی" کے لئے اِس حدیثِ نبوی کا ورد کافی شافی ثابت ہوگا کہ "السعی منی والاتمام من اللہ تعالیٰ"!

اِسی قسم کے روز ہائے بد کو روکنے کے لئے جامعۂ ملیۂ اسلامیہ کے بعض ہوا خواہوں اور اُس کے آبگینۂ ناموس کے قرار واقعی تحفظ پر اصرار کرنے والوں نے جامعہ کی گزشتہ زندگی کے بکثرت موقعوں پر امینانِ جامعہ کی خدمتوں میں بار بار یہ تجویز پیش کی کہ جامعہ کو معیشۃً "خود کفیل" بنا لیا جائے! اِس تقریب سے اکثر "دیال باغ آگرہ" کے تخیل کی طرف جامعہ کے اربابِ حل و عقد کی توجہ مبذول کی گئی! لیکن "قرول باغ" کے اکابرِ تعلیم اور اقطابِ تربیت نے کنایۃً بھی اِس نوع کی اثر آفرینیوں کو گستاخی گردانا! اور "ڈاکٹریٹ" کی پوری شانِ کبریائی سے ارشاد ہوا کہ:

"جامعہ، علومِ عالیہ کی اک یونیورسٹی ہے! اُسے "کارخانۂ آہنگری" کے غوغا میں تبدیل نہیں کیا جاسکتا"!

صَدَقْتُمْ یا شُیُوْخِ جَامِعَہ! لیکن کیا ہمیں اِتنا عرض کرنے پر جاں بخشی نصیب ہوگی کہ:

"جامعہ کوئی "تکیۂ درویشاں" بھی نہیں ہے! جہاں سے دستارِ فضیلت باندھ باندھ کے طلبہ نکلا کریں، اور سرکار دولت مدار کے آستانۂ دولت پر "شیئاً للہ" کا نعرۂ پیشکشِ صبحگاہ" کیا کریں! اور اِسی طرح جامعہ "تعلیمیافتہ جرائم پیشہ" نوجوانوں کی کوئی "کمینگاہ" بھی نہیں ہے۔ جہاں سے "وسیع ترعلمِ معیشت" کے "ریسرچ اسکالرز" اُٹھا کریں اور ریاستوں کے سول سروس کے مناصبِ عالیہ پر ایسا دن دہاڑے ڈاکا ڈالا کریں!"

اسلام میں معاشی بے نیازی و استقلالِ ذاتی کا جو غیر معمولی ـــــ بلکہ یکسر عدیم النظیر ـــــ اہتمام و التزام پایا جاتا ہے اُس کا اندازہ جامعہ کرسکتی، بشرطیکہ وہ حقیقۃً "ملیہ و اسلامیہ" ہوتی! اسلامی تاریخ کے صدرِ اول میں خود حضرت داعیٔ اسلام کی مسند نشینی میں اسلامی ہیئتِ اجتماعیہ کی جو تشکیل و تنظیم کی گئی اُس کے معاشی گوشے دقیق بصیرتوں اور عمیق عبرتوں کی جلوہ گاہیں ہیں! ہم کو قرآنِ عظیم کا یہ دانشگاف اعلان (دربارۂ عدمِ مماثلت و مساوات مابین فرزندِ صُلبی و فرزندِ متبنیٰ!) معلوم ہے کہ: "ماجعل اللہ لرجل من قلبین فی جوفہ"! یعنی ع

سینے میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے!

تاہم آپ کو معلوم ہے کہ "ہجرۃِ مدینہ" کے بعد ـــــ یعنی تحریکِ اسلام کے عملی جامہ پہننے کے اولین اقدام پر! ـــــ اِس ناموسِ فطرت میں کتنا

فوق العادۃ تصرف کیا گیا! اسلام کی مدنی زندگی کا افتتاح جس "عقدِ مواخاۃ" کے ذریعے ہوا، اُس کے تحت مہاجرینِ مکہ اور انصارِ مدینہ ایسے دو گروہ اجانب و اغیار ایسے "اخوانِ طریقت" کے خاندان میں ڈھال دیے گئے، کہ برادرانِ حقیقی کی دنیا بھی اس سلوکِ اخوت اور اس گرم جوش صلۂ رحمی کے مظاہر و مناظر سے خالی ہے! "غیر طبعی حالات" کے تحت اس غیر معمولی انصرامِ اُمور (dispensation) کا فرمان یہ تھا کہ ایک ایک مکی اور مدنی ہم رشتۂ "مواخاۃ" مکان کی سکونت، رقم جیب کے تصرف، جائدادِ غیر منقولہ کے تمتع وغیرہ وغیرہ میں برابر کا شریک و سہیم ہو گا!--------- حد یہ ہے کہ بعض انصار مومنین قانتین اس پیشکش تک پر طیار تھے کہ اپنی دو بیویوں میں سے ایک کو طلاق دے کر اپنے مہاجر بھائی کے حبالۂ زوجیت سے منسلک کر دیں! (اگرچہ اس چیز کو شریعت کے مختص الحال احکام کی رخصتوں سے بھی متجاوز کہہ کر مسترد کر دیا گیا!)----

بہر حال معاملے کی ساری "کلیدِ آہنگ" (key-note) یہ ہے کہ اک معاشی طور پر آسان و مطمئن سوسائٹی کے مزاج اقتصادی کو "صحیح الاخلاط" رکھنے کے لئے شریعتِ محمدیؐ کا "دین تمدن" وقتی تصرف و تغیر کی کتنی بعید حدود تک جا سکتا ہے! پھر ہمیں معلوم ہے کہ "اصحابِ صفہ" کیسے فانی فی اللہ اور وقف فی سبیل اللہ بزرگ واقع ہوئے تھے! تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ انھیں بھی "حبیبُ اللّٰہ" کسب سے بالاتر نہیں رکھا گیا! اور خود رسول اللہ صلعم کے ارشاد کے تحت اِن لوگوں کو دن کی ساعاتِ مقررہ میں جنگل میں جا کر لکڑیاں جمع کرنا اور اُنھیں بازار میں بیچ کر اپنے آزادی قوت لایموت کا بند و بست کرنا پڑتا تھا!------ اور پھر بعد وصالِ آنحضرتؐ جب فتنۂ ارتداد کا ظہور ہوا تو یہ اسلامی نظامِ مجلسی کے "معاشی سنگِ بنیاد" کے متزلزل ہو جانے کا سنگین خطرہ ہی تھا جس نے "مانعین زکوٰۃ"------ منکرین ادائے "محصول غربا"!------ کے سارے "سرمایۂ دارانہ نماز و روزہ و حج و جہاد" (!) کو مردود قرار دے دیا تھا، اور زکوٰۃ کا نعم البدل کسی دوسری چیز کو نہ تسلیم کیا تھا! اِن سارے کاروبار کی علت و غایت بجز اس کے کیا تھی کہ فرزندانِ توحید اپنی ضروریات مادی کے لئے اربابِ دول کے دست نگر نہ بنیں! ورنہ جن کے سامنے اُن کا دستِ تہی دراز ہو گا، اُنہی کے سنگِ آستان پر اُن کی پیشانی تذلل نگونسار ہو گی! جس کے بعد پھر وہ در و دیوار کی اِس لعنت و حقارت کی جائز مدعی بنے گی کہ ؎

بزمیں چو سجدہ کردم، ز زمیں ندا بر آمد

کہ مرا خراب کردی تو ز سجدۂ ریائی!

اس طرح آپ دیکھیں کہ مردانِ صدق و صفا نے اپنی "غیر مشترک نامیہ" کی عفت و عصمت کے تحفظ کے لئے کیا کیا پاپڑ بیلے ہیں! محض مسجد کی سقف و محراب کے نیچے نماز گزاری و قرآن خوانی کے مشاغل سے یہ مہمات بر اِحل پڑائے واقع ہوئے ہیں! آپ اپنے اس کلمۂ طیبہ کا ورد کر کر کے کہ "ہم صرف اک تعلیمی جماعت ہیں" ملیت و اسلامیت، کے سارے فکری و عملی و تنظیمی و احتسابی و شفائی و حفظ ما تقدمی و تعمیری "ہفت خوان" سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے!! ؎

آسودہ نمی گردد آں دل کہ گسست از دوست

با قرأتِ مسجد ہا، با دانشِ مکتب ہا!

پیغمبرِ اسلام، علیہ الف الف صلوٰۃ و سلام، نے مدینے میں اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی "اولین فرصت" میں یہ "استقلال معاشی" (economic independence) کا مرحلہ طے کر لیا تھا! اور لاگ اور لوث سے ایسے پاک رہ کر کہ تعمیرِ "مسجد نبوی" کے جائے وقوع کی اراضی کی قیمت خرید کی پائی پائی اُس کے یتیم مالکوں کو ادا فرمائی تھی! جامعۂ ملیۂ اسلامیہ، اوکھلے میں جو قلعۂ معلّیٰ تعمیر کر رہی ہے اُس کا سارا مایۂ خمیر قارونوں اور فرعونوں کی آستان بوسی کا حاصل دریوزہ گری ہے! ع

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا!

غالباً "جامعہ نگر" کی مجوزہ مسجد جب چندے سے بن جائے گی تو اُس کی محرابِ قبلہ نما کا کتبہ قرآنِ مقدس کی اِس آیۂ شریفہ کی دوسری شانِ نزول بنے گا کہ: "لمسجد اسس علی التقوی من اول یوم"! ؎

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت

دامن کو ذرا دیکھ، ذرا بندِ قبا دیکھ!

ممکن ہے "مشتہرینِ جامعہ" کی طرف سے یہ دعویٰ کیا جائے کہ جامعہ ملیہ کا مکتبہ "معاشی آزادی" ہی کے مطمحِ نظر کا اک مولود ہے جو تقریباً روزِ اول

سے جامعہ کے ساتھ اُس کے "ہمجولی" کی حیثیت سے نظر آتا ہے"! بلاشبہ مکتبہ، جامعہ کے لئے اک اچھا "معدہ" ہوتا، لیکن اپنے بعض ضرورت سے زیادہ ہوشیار سربراہکاروں کی رہنمائی میں اُس نے اک بے لاگ دکاندار کے بجائے اک بازاری "دلال" کا "رول" اختیار کیا! ——— جس کا اک شُستہ نمونہ از خروارے کرشمہ یہ ہے کہ مکتبہ کا جدید الاجرا رکتابی اخبار —— "کتاب نما" ——— اس قدر "کتاب نمائی" نہیں کرتا جس قدر کہ "کتاب فروشی"! وہ "انتقادِ کتب" اور "اشتہارِ کتب" کے درمیان کوئی فرقِ مراتب ملحوظ رکھنا نہیں چاہتا! جامعہ کی نشر کردہ بعض کتابوں کی نہایت معتدل تنقیدوں کی بھی وہ تاب نہیں لایا ہے، اور ایسے اک خاص موقعے پر اُس کے "پیرِ مغاں" نے اک "مضحکہ خیز" عذرِ گناہ" کا تماشا دکھایا ہے! (ہم اس اجمال کی تفصیل اور اس ابہام کی تصریح کسی اور موزوں تر موقعے کے لئے اُٹھائے رکھتے ہیں!)

یہی حال جامعۂ ملیہ کی تشہیر کردہ "اتحادی دوکان" اور "اتحادی بنک" کا ہے! "معیشت وکفایت" کے ان جامعی ادارات سے بڑھکر "ننگِ وجود" کونسی چیز ہوگی جو طالب علموں کو "عملی اقتصادیات" کی تربیت دیتے ہیں، درآنحالیکہ وہ خود دوسروں کے "مقروض" ہیں! واقعہ یہ ہے کہ جامعہ کی یہ دُوکان اور بنک بچوں کو اس قدر "بڑھانے" کے لئے نہیں ہیں جس قدر کہ ان بچوں کے "بوڑھے والدین کو ٹھلانے" کے لئے ہیں! ؎

یہ کہنے سننے کی باتیں نہیں ہیں برخوردار
وگرنہ "علم معیشت" وسیع ہے واللہ!

دلی میں منظم پروپگنڈے کی بساطِ شطرنج کی حیثیت سے "جامونگر" آدکھلا، صرف نظام الدین اولیار والے "رین بسیرے" ہی سے دوسرے نمبر پر ہے! "وفی ذالک فالیتنافس المتنافسون!"

اِس مرحلے پر ہمیں اک ممکن شُبہے کے صاف کر دینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے! ہم نے باوقاتِ مختلف، معاش کے خیال کے ابتذال اور اُس کی ضرورتِ لایزال کا ذکر کیا ہے! دونوں کے درمیان راہِ تطبیق یہ ہے کہ روزی قطعًا ناگزیر ہے، لیکن ہر وسیلۂ رزق جائز نہیں! بلاشبہ آدمی محتاجِ آب ونان ہے، تاہم وہ "رزق کا کیڑا" بھی نہیں! اُسے صبح وشام کھانے کو چاہیئے، لیکن اُسے یہ بھی معلوم رہنا چاہیئے کہ آدمی کی غذا اُس کا مادۂ ترکیبی ہوتی ہے، جو لقمے اُس کے معدہ وامعار کو پُر کرتے ہیں، وہی اُس کے دل ودماغ کے رگ وریشہ کو بناتے ہیں، پس "صدقِ مقال" اور "فراغ بال" کے لئے "اکلِ حلال" ضروری ٹھیرا ہے۔ بقولِ حضرتِ مسیحؑ کے "ابنِ آدم تنہا روٹی سے نہ جیے گا"! اُس کا اک بالائے گوشت وپوست حصۂ وجود بھی ہے! جس کا تغذیہ صرف "کلمۂ حق" سے ہوتاہے!

جامعہ کے "میکائیل" نے "عشق ورزق" کے درمیان ضروری امتزاج کو ملحوظ نہ رکھا! ذراسی ابتلائے عسرت میں اُن پر وہ اُفتاد بیتنے لگی کہ ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ "یاراں" فراموش کردند عشق!

اِن "اہلِ عشق" نے بلا امتیاز "ہر بابِ رزق" پر دستک دی، اُس گدائے مبرم کی طرح جس کی صدا یہ تھی کہ ؎

قسم خدا کی میں کچھ آج لے کے اُٹھوں گا!
کہ میں غریب ہوں، خواجہ مرا غریب نواز!

اپنے ماضیٔ بعید کے "دورِ عسرت" میں اہلِ جامعہ کی "غربت" میں شک نہ تھا! مگر اِس مشکل کے حل کے سارے آغاز وانجام کا ماجرا یہ ہے کہ پہلے اُنھوں نے ڈرتے ڈرتے اپنے لئے "قوتِ لایموت" بہم پہنچایا اور پھر منہ کو خون لگ جانے کی وجہ سے اُس "خوانِ یغما" پر شکم سیر ہونے لگے جس پر اُنھوں نے یہ بے محل آیتِ کشائشِ رزق پڑھی کہ "اللہ یرزق من یشاء بغیر حساب"!

جامعہ کے اربابِ تعلیم کو رزق کی اِن دو تقسیموں، اور اُن کے الگ الگ خواص وافعال کو بھولنا نہ چاہیئے تھا کہ ؎

جانور فربہ شود از "نای و نوش"
آدمی فربہ شود از "راہِ گوش"

جامعہ سے نکلے ہوئے طالب علموں کی اک محدود تعداد مُلک کی (عمومًا اُردو) صحافت میں داخل ہوئی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ جامعہ کی تاریخی طور پر بہترین پیداوار ہے! عام طور پر جامعہ کے یہ فرزند سیاسیات میں قومیت پسند اور عمومی ثقافت میں حریت دوست

اور ترقی خواہ مسلک کے قائل اور عامل رہے ہیں، تاہم یہ نکتہ نظر انداز نہ ہو کہ جامعہ کے یہ سیاسی اور صحافی فرزند اپنی مادرِ علمی کے دورِ شباب کے اثمارِ شیریں ہیں! اب اپنے ایامِ کہولت میں عرصے سے جامعہ کے شجرۂ نسب کی رفتار جیسی رہی ہے اُس کے اعتبار سے اول تو کثرتِ ذہنی اسقاطِ حمل کے حوادث پیش آتے رہے ہیں! اور باقی جس قدر ولادتیں عمل میں آئی ہیں، اُن میں "فرزندِ نرینہ" خال خال ہی نکلے ہیں! اور اب آئندہ جیسے "گندے انڈے" دیکھے جانے کا اندیشہ کیا جا رہا ہے اُس کا اندازہ آپ اِس مضحک حقیقت سے کیجئے کہ ابھی حال میں، جب کہ اک صحبت کے اندر مستقبل کے مقاصدِ حیات کی قیاس آرائی موضوعِ ذکر و فکر تھی، متعدد بلوغ پذیر طلبائے جامعہ کے منھ سے اک معنی خیز لب و لہجہ میں یہ بشارت ہمارے سامعہ نواز ہوئی کہ :-

"ہم لیڈر بنیں گے!"

جو سادہ لوحی و سفاہت اِن صاحبزادگانِ جامعہ کے منقولہ بالا کلمات میں سموئی ہوتی ہے۔ اُس سے ہمیں انکار نہیں، لیکن ہمارا خیال ہے کہ یہ یقیناً طفلانہ اعلان اک اور حقیقت کا بھی ترجمان ہے! ممکن ہے جامعی نابالغان کے واہمے میں "لیڈری" سے مُراد جامعہ کے موجودہ کاروان سالاروں کی نوابانہ حکمرانی و کامجوئی ہو جس کا مشاہدہ وہ شب و روز کیا کرتے ہیں، اور کون کہہ سکتا ہے کہ اِس آسان پسند و خود پسند قومی لیڈری کی لہر اُن کے لبشری سینوں میں نہ پیدا ہوتی ہو؟! ع

کہ نتواں ازیں خوبتر راہ رفت!

جامعہ کی گود میں ایسے شہزادگانِ بلند اقبال پل رہے ہیں، اور شیخ الجامعہ پر اُدھر مولود شریف کی محفلوں میں، اپنی ساری ادا ہائے نشست سے، "حال" طاری ہونے کے آثار ہویدا ہیں! ؎

ساقیا! برخیز و در دہ جام را
خاک برسر کن غمِ ایام را!

کسی وقت کی کثیر الاولاد اور قوی النسل جامعہ کی یہ عقیمی کیسی عبرت ناک ہے! ؎

آج ہیں خاموش وہ دشتِ جنوں پرور جہاں
رقص میں لیلیٰ رہی، لیلیٰ کے دیوانے رہے

"جامعۂ ملیۂ اسلامیہ" کی ماشاء اللہ اک پیداوار اور ہے جس کا ذکرِ خیر ہم اگرچہ "سب سے پیچھے" کر رہے ہیں، لیکن جو اپنی ندرت میں کسی سے نیچے "نہیں"! یہ مادرِ جامعہ کے وہ علمی "سہراب و افراسیاب" ہیں جنھیں ذہنی بلوغ برلن و لندن، پیرس و ہائیڈلبرگ میں جا کر حاصل ہوا کرتا ہے! جہاں سے وہ "پی ایچ، ڈی" کی ڈگری کا سُرخاب کا پر لگا کر آتے ہیں، اور جامعہ کی "سرزمینِ زیرین" پر کچھ اس طرح "نزولِ اجلال" فرمایا کرتے ہیں کہ گویا چودھویں صدی ہجری کے وہ معراج رسیدہ علمی پیمبرانِ اولوالعزم ہوں! جو "فلاک الافلاکِ فرنگ" کی آخری عرفانی "آیاتِ کبریٰ" دیکھ کر آئے ہوں! اور پیرس و برلن کی "عرش و کرسی" کے خداوندانِ اسرار و رموز کے سامنے "زانوِ ادب" تہ کر کے گویا مقامِ "قابَ قوسین او ادنیٰ" سے مشرف و مفتخر ہو چکے ہوں! اور ع

گویا وہ خدا ہیں اور ہم بندے ہیں!

ہم ایسے "مڈل پاس" ذرۂ بے مقدار اِن "شموسِ علم" اور "اقمارِ عرفان" کے سامنے کہاں سے جسارت کریں کہ جوش کی یہ رُباعی پڑھ سکیں :

"جُزِ دل" کو کوئی رہنما نہیں ہے واللہ — "جُزِ عقل" کوئی دوا نہیں ہے واللہ
"کاندھے پہ علوم کے" جو ہوتا ہے سوار — اُس "جہل" کی انتہا نہیں ہے واللہ

"ڈاکٹریٹ" کی ڈگری جامعہ کی نجیب الطرفین روح کی اس قدر پیداوار نہیں جس قدر کہ جامعہ کے موجودہ پرنسپل، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب قبلہ کی شخصی سُنت! تاہم ہم فی نفسہٖ اسے کچھ بُرا نہیں سمجھتے! ؎

سخن کز بہرِ دیں گوئی، چہ عبرانی چہ سُریانی
مکاں کز بہرِ حق جوئی، چہ جابلقا چہ جابلسا

تاہم اتنا ضرور عرض کیا جا سکتا ہے کہ جامعہ کے اِن فضلاء و کملاء سے تشنگانِ جامعہ کو اِتنی توقع بالکل بجا تھی کہ ارضِ یورپ میں اپنی علمی تاجپوشی کے بعد وہ اول الذکر خاک نشینانِ شاگردی کو اُن کی گہن زدہ تاریکی سے نکالنے کے لئے جامعہ میں مستقل قیام کر کے اُن پر ضیا باری فرمائیں گے! ؎

اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی
سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے!

خاصکر جبکہ یہ اقطابِ علم، جامعہ کے اولڈ بوائے رہ چکے تھے، جامعہ

ہی کے اندر اک الوداعی ضیافت کے بعد اُن کا شُدِ رحال ان قبلہائے علم مغرب کی طرف عمل میں آیا تھا، جامعہ ہی کے نام نیک سے فائدہ اُٹھا کر اُنھوں نے یوروپین یونیورسٹیوں میں داخلہ حاصل کیا تھا. اور جامعہ کے اندر اپنی زندگی اُن کا سارا علمی "پس منظر" تھی! تو اُنھیں زیبا نہ تھا کہ اپنی سابقہ مادرِ علمی کو ایسا مایوس التفات فرماتے! تاہم ہم نے دیکھا کہ ان ڈاکٹران میں سے کوئی تو کسی جرمن پیٹنٹ دوا کا ہندوستانی ایجنٹ بنا! کسی نے اک ایسی جگہ کہ اک یونیورسٹی کالج میں مسندِ درس سنبھالی جو "ڈبل سلیوری" کا اک قلعۂ مُعلیٰ ہے! اور کوئی اک ایسے کالج کی پروفیسر چیئر پر متمکن ہوئے جو جامعہ کی قدیم زبان میں اک سرکاری غلام خانہ تھا! پھر اِن میں دو آخر الذکر بزرگ شیخ الجامعہ کے برادرانِ خورد اور جدّہ جامعہ کے سابق "ابن علم" (old boy) واقع ہوئے ہیں!— اس کے خلاف جامعہ کے لئے "تازیست جو اپنی زندگی وقف کرنے کی توفیق پاتے ہیں تو وہ عابد صاحب اور مجیب صاحب ہیں، جنھیں سے کسی کو بھی اپنے علمی ماضی میں جامعہ سے کوئی واسطہ نہ رہا تھا! ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ ع

زخاکِ مکّہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی است؟!

کیا جامعہ کا کوئی ہمدرد اِن بمہر فرزندانِ جامعہ کی طرف روئے سخن کرکے یہ "سُوز" نہیں پڑھ سکتا کہ ؎

غنی! روزِ سیاہِ پیرِ کنعاں را تماشا کُن:
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را!

ساری بیدردیوں کی خاتم یہ ستم ظریفی ہے کہ حضرتِ شیخ الجامعہ کے برادرزادے، جو اُنھی کی ولایت و سرپرستی میں ہیں، جامعہ میں نہیں پڑھا کرتے، بلکہ اک سرکاری کالج کے طالبِ علم ہیں!

غالباً یہ عملی تفسیر ہے اس آیۂ بینہ کی کہ "وانذر عشیرتك الاقربین"!

کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ ع

توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند؟

(باقی آئندہ)

پھول

یہ کس نے جوشؔ کو بھیجے ہیں نازپرور پھول
شگفتہ پھول، جواں پھول، خلد پیکر پھول

ہوائے ناز سے چٹکے ہوئے سُبک غنچے
شمیمِ زلف سے مہکے ہوئے معطّر پھول

شعاعِ حُسن سے دہکے ہوئے خنک شعلے
لبِ نگار کے چُومے ہوئے سخنور پھول

نسیم کاکُلِ شب گوں سے پرفشاں گلبرگ
فروغِ نرگسِ شیریں سے خواب آور پھول

اِرم سے آئی ہوئی حرفِ آرزو کلیاں
خدائے ناز کے بھیجے ہوئے پیمبر پھول

پلٹ کے، اے خلشِ نوکِ خار کے شاکی
اُسے بھی دیکھ، جسے ڈس رہے ہیں کافر پھول

جوشؔ

اِنتظار

کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟

کب تک یوں ترساؤ گی تم
پیاری پیاری باتیں ہے ہے
کب تک دل تڑپاؤ گی تم
رنگیں رنگیں گھاتیں ہے ہے
جلوہ کب دکھلاؤ گی تم
اُف وہ مہکتی راتیں ہے ہے

کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟

کالی کالی گھٹائیں آئیں
کھوئی ہوئی سی باتیں میری
شورِ نغمہ و مستی لائیں
سونی سونی راتیں میری
دل پر غم بن بن کر چھائیں
جیتیں تمہاری ماتیں میری

کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟

گوری گوری رنگت ہے ہے | آؤ للہ جلدی آؤ

پیاری پیاری مورت ہے ہے | آکر اپنا رُوپ دکھاؤ

چاند کا ٹکڑا صورت ہے ہے | روپ دکھا کر جی بہلاؤ

کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟

(جلدی آکر جوتے لگاؤ / جوتے لگا کر گال سہلاؤ)

(جی بہلا کر لات لگاؤ / لات لگا کر پھر بہلاؤ)

آہ وہ کافر مست نگاہیں | تم کو میں دل میں بٹھلاؤں

آہ وہ گوری گوری باہیں | غم کے تم کو گیت سناؤں

آہ وہ میرے دل میں راہیں | خود روؤں، تم کو بھی رُلاؤں

کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟

اُف رنگ بسنتی ساری کا | یاد تمہاری آفتِ جاں ہے

طوفان سا اک گل کاری کا | نام تمہارا لب پہ رواں ہے

فرمانِ حسیں مے خواری کا | یہی وظیفہ وردِ زباں ہے

کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟ کب آؤ گی تم؟

محمد ضیاء الاسلام، بی، ایس سی۔ پی سی ایس
سی۔ ایچ۔ یل
ڈپٹی کلکٹر، بجنور (لندن)

سی - ایچ - یل

اب کے بھی دن بہار کے یُونہیں گزر گئے

گوہر سلطان صدیقی، منشی فاضل پشاور

بادِ صبا کے سرد اور عنبریں جھونکو! تم جو ہر صبح اپنے ساتھ بھینی بھینی خوشبو کا تحفہ لاتے ہو، بادِ بہار کے خوشگوار اور دل خوش کن جھونکو! تم جو ہر صبح ہزاروں حسینوں کی خوابگاہوں تک پہنچکر ان کے ساتھ شوخیاں کرکے جگا دیتے ہو اور انھیں صبح کا پیام پہنچاتے ہو۔ ہاں ہاں بادِ صبا کے راحت افزا جھونکو! تم نے کیا اپنا معمول بنا لیا ہے کہ علی الصباح ہی سنگدل اور جفا پیشہ لوگوں کے درِ دولت پر حاضر ہوکر ان کو بھی مجبور کر دیتے ہو کہ وہ تمہاری اٹھکھیلیوں سے پریشان ہوکر اپنے چہروں کو ہاتھ سے ڈھانپ لیا کریں۔

حیات آفرین نسیم بہار! تیرے انتظار میں گلہائے نازک تارے گن گن کر رات گزار دیتے ہیں اور ننھی ننھی کلیاں دست بستہ کھڑی رہتی ہیں کہ کب تو چلے اور یہ فرطِ محبت میں آکر اپنا اپنا آغوش کھول دیں۔ حیف صد حیف آج تو بھی میرے درد کا درماں نہیں بن سکتی اور میرے دلِ حزیں کی مرجھائی ہوئی کلی کو شگفتہ نہیں کر سکتی کیونکہ آج حسرت نصیب کی نگاہوں سے وہ مستور ہے۔

گلہائے رنگارنگ و پرندہائے خوشرنگ! تم ہاں تم چمن کو باہم خاص لاؤ لگاؤ ہے۔ زائرین کے لئے فردوس نظر ہو۔ ناظرین کے لئے خوش منظر ہو۔ کس دل ربائی کے سامان مہیا کئے ہوئے ہو۔

پیاری خوشنما بلبل! کس شوخی سے ڈالی ڈالی جھوم جھوم کر فکرِ فردا سے بے نیاز ہوکر پیارے گلہائے شگفتہ کو چومے جا رہی ہے۔

اے عندلیب ہزار داستان! تو کہ اپنی شیریں صدا سے عاشقِ مہجور کی تسلی قلب اور تسکین روح کے سامان مہیا کرکے اُسے بہلا رہی ہے، شمشاد و چنار کے سرسبز درختو! خوب ہنس ہنس کر علی الصباح تالیاں بجایا کرو جبکہ کوئل تمہاری ٹہنیوں پر مٹھار راگ الاپ رہی ہو۔

مگر!

پھر بھی تم مجھے مسرور نہیں کر سکتے، کیونکہ میرے کاشانۂ دل کا مکین آج مجھ غمزدہ سے کوسوں دور ہے۔

رنگین قوس قزح! تیرے سامنے شفق کی سرخی ماند پڑ جاتی ہے تو کہ معشوقہائے زنگاری کی سبزی و سرخی چرائے ہوئے ہے اور دنیا کے لئے جاذبِ نظر ہے۔

اے مہتاب کی صاف اور شفاف مرمریں کرنو! تم کہ اپنی دھیمی دھیمی روشنی سے ایک جہان پر نور پاشی کر رہی ہوتی ہو، مضطرب اور غمگین دلوں کے لئے سکون بخش اور خواب آور ثابت ہوئی ہو۔

خوشرنگ اور دیدہ زیب پھولوں کے مددگار! تیری نورانی دنیا میں پھل اور پھول اپنے نصیبوں پر نازاں ہیں، کیونکہ تو ان کے حسن کو مشاطہ بن کر دوبالا کر رہا ہوتا ہے۔

او ملکۂ سحر کے دل پارے! تو کہ ابروؤں کے معمولی اشاروں سے تمام بحر ناپیدا کنار میں بے پناہ تلاطم پیدا کر سکتا ہے۔

او لق و دق صحراؤں اور بیابانوں کی نورانی مشعل! تیری ضیاپاشی

سے بھولے بھٹکے مسافر اپنا کھویا ہوا راستہ پا لیتے ہیں۔

آج تو میرے دکھ اور درد کا درماں نہیں بن رہا ہے جو اس تک پہنچنے میں میری رہنمائی کرے، جس کے ساتھ محفلہائے خلوت میں میری آرزوؤں کے سمندر میں ایک مد و جزر پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ مگر آہ ....

اے برق رفتار غزالو! تم کہ دم کے دم میں چوکڑیاں بھرتے بھرتے صیاد کے پنجے سے جانبِ شمال سے جانبِ جنوب غائب ہو جاتے ہو۔

اے سحر آگین نگاہوں والے آہو! تو کہ آنکھوں میں خاص کشش مقناطیسی پنہاں کئے ہوئے شعرا کے لئے موقع فکر پیدا کر دیتا ہے۔

اے سبک خرام آہو! تو کہ دشت نوردی میں طاق ہے اور قیس کو لیلئے چشم بن کر دشتوں میں بہلاتا رہا ہے۔ آج آہ آج تمہارا نافہ کس کام کا ہے۔ تیری یہ مقناطیسی آنکھیں کس کام کی جو مجھ مہجور کے لئے باعث علاج نہ بن سکیں کیونکہ میں جس کی تلاش میں ہوں اُس کا ملنا محال۔

سبزہ پرور خوشنما دلفریب وادیو! تم کہ سبزہ کے فرش فروشوں سے دل لبھاتی ہو تیرے دلپسند نظاروں سے بلالحاظ ملک و ملت ہر ایک زائر تم سے یکساں طور پر لطف اندوز ہو رہا ہے صاف اور شیریں پانی مرمریں کنکریوں پر سے نہایت سکون کی حالت میں دائیں بائیں کناروں سے اٹکھیلیاں کرتی مست خرامی سے دن رات اپنی منزلِ مقصود کی جانب رواں ہیں۔

نکہت بار اور دلکش وادیو! تمہارے آبشار کے کنارے بید مجنوں جُھک جُھک کر ہر رہ گزر کو دلربا انداز سے ایک نہ ایک درس دے رہا ہے، جس سے ہر نیاز مند فیضیاب ہوا جاتا ہے، مجھ دل فگار کے لئے یہ سماں بھی موجبِ تسکین نہ بن سکے، کیونکہ میں اپنے فرحت و انبساط کے چشمے سے مہجور ہوں۔

آسمان میں تیرنے والے بادلو! تم جو عین خشک سالی اور قحط کے دوران میں بارانِ رحمت برسا کر روتوں کو ہنسا دیتے ہو۔

ہوا کے دوش پر تیرنے والے خوشنما بادلو! جب کہ معمولی ترشح سے گرمی کی شدت کو کافور کر سکتے ہو۔ بھرپور بارش برسا کر سیپ کے منہ سچے موتیوں سے بھر سکتے ہو۔

شبِ مہتاب میں چاندنی سے ہم آغوش ہونے والے بادلو! تمہارا جھوم جھوم کر اور امڈ امڈ کر آنا بلاکشانِ محبت کے حزن و ملال کو دُور کرتا ہے اس وقت ساغر مینا حرکت میں ہیں ساقی سرگرم محفل ہیں مغنی اپنے دل پسند اور سُریلے سروں سے کہے جائے ہے ؎

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

مگر!

اے نسیم صبحگاہی!! اے سحاب بادرفتار!! اے غزالِ برق رفتار!! اے نکہت بار وادی!! تم میں سے کوئی اُٹھے اور جا کر اس غزالِ چشم سے فقط اتنا ہی کہدے کہ ؎

صبا، بہ لطف بگو آں غزالِ رعنا را   کہ سر بکوہ و بیاباں تو دادۂ ما را

قطعہ

وداعِ طفلی و قربِ شباب سے باعث
تری نگاہ ہے یا وہ خیالِ دل افروز
بدل رہا ہے جو پہلو ضمیرِ شاعر میں
اور آب و تاب سے معمور دل نہیں ہے ہنوز

([illegible])

قطعہ

مسکرا رہا ہے جواب میں اس طرح اک طفلِ صبیح
جس طرح صہبا کی لرزش سے ہو ساغر و ایاغ
اور اس نرمی سے جیسے نیم شب کے طاق میں
جھلملا ہوتے ہی روشن کر دیا جائے چراغ

([illegible])

آرزوئے محروم

فریاد ہے اے خلوتیٔ پردۂ ناموس — کب سے ہوں تری دُھن میں گریباں دریدہ

واقف ہے کہ کس طرح سرِ بالش و بستر؟ — راتوں کو تڑپتا ہے ترا زُلف گزیدہ؟

دم بھر کے لئے تو کبھی آغوش میں آجا — اے عُمرِ رواں! سایۂ آہوئے رمیدہ

ممکن ہو تو اب خاکِ مذلت سے اُٹھا لے — میں کب سے پڑا ہوں صفتِ اشک چکیدہ

وہ سجدہ کروں، سر ہی نہیں، روح بھی جھک جائے — دے اِذن اگر جنبشِ ابروئے خمیدہ

قسمت کی طرح دستِ طلب بھی تو ہے کوتاہ — افسوس ہے اے میوۂ شاداب و رسیدہ

جوشؔ کا کسی رُت میں بھی جی خوش نہیں ہوتا — فریاد ہے اے افسرِ گلہائے دمیدہ

سونے کو ترستی ہیں برستی ہوئی آنکھیں — بیدار ہو اے تُرکِ محبت نچشیدہ

ظالم ترے دیوانۂ محروم کے سر پر — ہر آن ملامت کی کمانیں ہیں کشیدہ

آتا ہوں ترے شہر میں پامالِ ملامت — جاتا ہوں تری راہ سے دُشنام شنیدہ

"در کوئے تو معروفم و از روئے تو محروم
گُرگِ دہن آلودہ و یوسف ندریدہ" (سعدی)

جوشؔ ملیح آبادی

رفتارِ وقت!

ادارہ

اجلاس جمعیۃ طلبہ دہلی

زیرِ تبصرہ مہینے (نومبر) کا پہلا ہفتہ دہلی میں "اسٹوڈنٹس کانفرنس" کے پُرشور و خروش انعقاد، بصدارت مسز کملا دیوی چٹو پادھیائے، کا شاہد بنا! اجلاسِ جمعیۃ کے افتتاح کے لئے سر وزیر حسن، سابق چیف جج اودھ چیف کورٹ، کو بُلایا گیا تھا، اور یہ حُسنِ انتخاب قابلِ داد بلکہ یادگار ثابت ہوا!

کانفرنس طلبہ کے سرپرست و سرخیل کی حیثیت سے مُسِن وزیر حسن نے مُجاہد و مجتہد نوجوان طلبہ کے حلقے میں وہ بے پناہ اور نادر مقبولیت و محبوبیت حاصل کی کہ بلاشبہ وہ اِس ماجرائے شگفت کی مصداق تھی کہ ؎

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں
دیرینہ سال پیرے بُردش بیک نگاہے!

لاریب کہ سر وزیر حسن پر اک اعادۂ شباب کے دَور کی آمد آمد ہے! اُنکا سر پھڑک اُٹھا ہے، اور سینہ اک آتشکدہ بن گیا ہے! سید موصوف کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے سر آصف علی کا یہ استعجاب بالکل برمحل تھا کہ "یہ آگ، اِس خاکسترِ پیری میں؟!"

سچ ہے کہ ؎

جب اِس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کرلیتا ہے وہ بال و پرِ رُوح الامیں پیدا!

سر سید وزیر حسن کے اِس دیدنی مظاہرۂ قوت و جلال و جدال میں ہمیں اُن کی عام شانِ اسلامیت اور خاص جوہرِ سیادت کے عناصر کی بھی کچھ کم کارفرمائی و کرشمہ سازی نظر نہ آئی! اک مومنِ صادق اور نجیب الطرفین سید اپنی ساری سرد مہری اور بے عملی کے باوجود کسی بھی لمحے اک افسردہ کوہِ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑنے کا احتمال رکھتا ہے! سر وزیر حسن کے واردات کچھ ایسے ہی ثابت ہوئے! ؎

نجھے پڑے ہیں زمانے کے ہاتھ سے ہر چند
مگر ہمیں برق و شرار ہیں ہم لوگ!

حقیقت یہ ہے کہ بڑھاپا ضعف و قوت کا مرکب ہوتا ہے! وہ پُختہ مغزی اور فکرِ فرزند و زن کی کمزوری کا جامع ضدین ہوا کرتا ہے! لیکن اگر آخر الذکر تزلزل اور عنصر انسان کو کسی طرح نجات دیدے، تو اول الذکر جوہر بے پناہ قوت سے یلغار اختیار کرتا ہے! ابراہیم خلیل اللہ اپنی شبوں میں مسلسل و متواتر خوابیں دیکھتے ہیں، تاہم دغدغہ یہ عارض حال ہے کہ خود نیا اس معاملے میں کہاں تک شرحِ صدر کا ثبوت دے گا! چنانچہ یہ کلمات ان تذبذب کی صاف آواز ہیں کہ "فَانْظُرْ مَاذَا تَرَىٰ؟" لیکن جب "یَا اَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ!" کی بیباک ولدہی گوش زد ہوتی ہے تو اک پیر نود سالہ اک گلوئے شانزدہ سالہ پر خنجر بکف ہوجاتا ہے! ؎

فرزند زیرِ تیغِ پدر می نہد گلو
گر خود پدر در آتش نمرود می رود!

اسی نوع کی سعادت سید وزیر حسن اور اُن کے فرزند ارجمند کے حصے میں آئی! سیدِ ممدوح کے لختِ جگر سید سجاد ظہیر نے "سنتِ سجاد" پوری کی۔ تو اِدھر پدرِ پیر میں بھی معاً اعادۂ شباب کا منظر نظر آیا! ؎

گرچہ پیرم تو شبے تنگ در آغوشم گیر
تا سحر گہ ز کنارِ تو جواں برخیزم!

"آزاد پارک" کی اسٹوڈینٹس کانفرنس کی معرکہ گاہ میں اس کہن سال وجوان دل بڈھے کی فی البدیہہ تقریر گویا آتش سیال کا اک طوفان تھی! نوجوان طالب علموں کو آپ نے "جنگِ آزادی کے سپاہی" کہا! اپنی موجودہ دورانِ کار زندگی میں اُنھیں ہیچمیرز کاشتکار سے بھی حقیر تر وجود قرار دیا، لیکن اک معیاری طالب علم کو وطن کی بہترین متاع بتایا، پھر جو لوگ اِن نونہالانِ ملک وقوم کی ذہنی وقلبی نشو ونما میں سنگِ راہ بن رہے ہیں، اُنھیں مجرمینِ ملت گردانا، اور اُن پر دانشگاف تبرّے بھیجا! اُن کے شمشیر برہنہ خطبے کا یہ حصہ کتنا پُرجوش، حق طراز، سختگیر، پردہ در، تندی آمیز، اور فاتحانہ واقع ہوا ہے:۔

"وہ معنی (ڈسپلن کے) جو میرے قیاس اور دعوے میں اِس لفظ کے صحیح معنی ہیں وہ، وہ نہیں ہیں جو طالب علموں کے قلب وروح پر ضبط وتحکم استعمال کرنے والے لوگ اس کلمے کے ساتھ وابستہ کیا کرتے ہیں! یہ لوگ ان نوجوانوں کی جائز جولانیوں کو بھی پابزنجیر کرسکتے ہیں! وہ اُن کی فکر انفرادی پر بھی قدغن عائد کرسکتے ہیں! وہ ضبط وتنظم کے نام سے اُس شریف ترین اور جلیل ترین جذبے کو بھی محبوس کرسکتے ہیں، جو نوعِ انسانی کو فطرۃً ودیعت ہوا ہے! اگر یہی اِس لفظ کے معنی ہیں، اگر یہی وہ انداز ہیں جن سے ہمارے پروفیسر صاحبان اور ہمارے معرکۂ فردا کے سرہنگوں کے امینانِ امروز کلمۂ "ڈسپلن" کا واسطہ دیا کرتے ہیں، تو پھر میں (بیدھڑک) کہوں گا کہ یہ بزرگ بُرے درجے کی غرض پرست ذاتہائے شریف واقع ہوئے ہیں! اور آزادی کی منزلِ مقصود کی طرف ہماری مادرِ وطن کا جو کاروانِ عزیمت وسبقت رواں ہے اس کی راہ میں دیدہ ودانستہ سنگ راہ بہم پہنچا رہے ہیں!

"تاہم وہ ایسا "کہا" نہیں کرتے!۔۔۔ کم از کم ایسی شرح وبسط سے! وہ صیغۂ راز میں کام کیا کرتے ہیں! وہ اپنے چہرے پر اک نقابِ فریب ڈال کر یہ جلوہ فروشی کیا کرتے ہیں! وہ سرگوشیوں میں یہ طاغوتی تلقینیں کیا کرتے ہیں! یہی تنہا وہ ممکن طریقہ ہے جس سے باطل جی سکتا ہے! یہ انداز قطعاً صادقانہ نہیں! صداقت کی یہ عادت نہیں کہ وہ روپوشی اختیار کرے! آفتابِ حقیقت اپنی طلعتِ جلیل پر کسی نقابِ ابر کی تاب نہیں لاسکتا! (ہاں سُن لو کہ) یہ لوگ بدباطن ہیں! لیکن اِن سارے جنود شیاطین کے علی الرغم ہم نے اب آزاد ہوجانے کا عزم بالجزم کرلیا ہے! (سنو، سنو!) جس شے کو وہ اپنے مراعاتِ مخصوص کہہ کر پکارتے ہیں اُس سے وہ اپنی کامجوئیوں کو اب بھی جاری رکھنا چاہتے ہیں!۔۔۔ اور اُسی "باطل" کے بھیس میں! اُسی "ڈسپلن" کے سایۂ مقلوب میں! لیکن یہ حضرات اب بے نقاب کردیئے گئے ہیں! اُن کی مزید برہنگی آئندہ بھی جاری رہے گی! یہ میری ذاتِ حقیر نہیں جس کے قبضۂ قدرت میں یہ معرکہ سر کرنا ہے! پھر یہ نقاب کشا لوگ میرے وہ نوجوان ہمصفیر بھی نہیں جو آج یہاں سینکڑوں کی تعداد میں جمع ہوئے ہیں!۔۔۔ ریاکاری کی یہ پردہ در ذات وہ غیر مرئی قوتیں ہیں جو آج سارے عالم بشری پر فرمانروائی کررہی ہیں! (صدا ہائے احسنت ومرحبا) خوش قسمتی یہ ہے کہ ہم اک ایسے عہد میں واقع ہوئے ہیں جب کہ یہ معرکۂ آزادی نہ صرف برپا ہے، بلکہ عین گھمسان کا رَن پڑا ہوا ہے! اور واللہ مجھے آرزو نہیں، کسی اور زمانے میں پیدا ہونے کی بجز اُس دَور کے جس میں سے میں اور آپ گزر رہے ہیں! (شورِ تحسین) ہاں تو "ڈسپلن" کے نام سے، اور ہر اُس چیز کا واسطہ دے کے جو کہ پاک ومقدس ہے، یہ "غدارانِ ملک" نوجوان طلبہ کو ہتھکڑیاں بیڑیاں پہنارہے ہیں اور قوم کی رُوح کو اسیر وپابزنجیر کررہے ہیں!"

اسی مہینے کے ختم ہونے سے پہلے پہلے حکومت صوبۂ متحدہ کا اعلان (دربارۂ عطائے آزادی بہ طلبہ برائے شرکت کانگرس وتنسیخ سابق فرمانِ گورنر یو، پی، بصیغۂ راز متعلق امتناع شرکت طلبہ در سیاسیاتِ ملک) اِس کانگرس نائٹ کے نعرۂ حق کی بڑی فاتحکار صدائے بازگشت ہے! ع

کشیم نالہ خدا آسماں نگہ دارد!

اصل صدر کانفرنس، مسز کملا دیوی کا خطبۂ صدارت مردانہ حقگوئی حکیمانہ تشخیصِ صورتِ حال، سالکانہ خبردہیٔ راہ ورسمِ منزل کا آمیزہ تھا! آپ کی بحث کا ماحصل ومآل مندرجۂ ذیل ہے۔

"آپ کی ساری تعلیم وتلقین وتربیت ونہضت قطعاً غلط اُصولوں پر

اور قابلِ اعتراض مخفی اغراضِ دفتریت وقیصریت کے تحت ہوئی ہے! اسکولوں اور کالجوں کی پیداوار جو نوجوان ہیں وہ نہ گھر کے ہیں نہ گھاٹ کے! اِن کا ڈگری پاکر برسرِ معاش و ملازمت ہوجانا ایسا ہی نادرالوجود حُسنِ اتفاق ہوگیا ہے جیسا کہ کسی نصیبے کے سکندر کے سر پر ہُما کا بیٹھ جانا! تاہم یاد رکھئے کہ یہ شباب انجامی اور زبوں کاری ہندوستان کے سررشتۂ تعلیم ہی سے مخصوص نہیں! مغرب میں نظامِ تعلیم کہیں بہتر ہے، تاہم نتائج (بیکاری و بے روزگاری) کم و بیش یہی ہیں! حقیقت یہ ہے کہ تعلیم کی پشت پر اک اور چیز ہمارا آئینِ حکومت موجود ہے، اور اُس کی بھی بنیاد و اساس "اصل البلیات" ہمارا دستورِ مجلسی اور ہمارا سنگِ بُنیادِ تمدن واقع ہوا ہے! اِس تمام پشتے اور پس منظر کے ہوتے ہوئے تعلیم کو لامحالہ ویسا ہی ہونا چاہیئے جیسی کہ وہ ہے! ہمارا معاملہ اک شجرِ خبیث سے ہے، نہ کہ اُس کے ثمرِ خبیث سے! چونکہ ہر چیز کی اصل و بیخ ہمارے معاشی و مجلسی مقدرات بلشگی میں سرایت کئے ہوئے ہے! اِس لئے ہمارے تعلیمیافتہ نوجوانوں کے مسئلے کا تعلق بھی بالواسطہ سیاسیات و اجتماعیات سے ہے، نہ کہ محکمۂ تعلیم سے! مبدءٔ و مخرج کے ساتھ ساتھ اُس کی نوعیت بھی بدل جاتی ہے، یعنی وہ اصلاح و تجدیدِ تعلیم کے ڈرائنگ روم والے مذاکروں کے بجائے میدانِ سیاست اور معرکۂ انقلابِ مجلسی کا اک مُحاربہ بنجاتا ہے! بس مسئلۃ المسائل یہی ہے، ہر درد کا درماں یہیں ہے، اور سارے معاملے کا مرکزِ ثقل یہی نقطہ ہے! کُرۂ ارضی کے تمامی عالمِ انسانی کو اپنی ساری ہستی اور ایک ایک قطرۂ خون ریزی اِسی اصلِ عظیم پر وقف و مرکوز کر دینا چاہیئے"!

مصلحت دیدِ من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگذارند و سرِ طرۂ یارے گیرند!

(ا - ا - خ)

چین وجاپان اور دُولِ عالم!

چین وجاپان کی باہمی خونریز آویزش کے مجوزہ خاتمے کے بارے میں جاپان کی طرف سے فریقینِ جنگ کے درمیان "براہِ راست گفت و شنید" کے استحسان کا نظریہ پیش کیا گیا ہے! جاپان کا عشقِ چین قابلِ داد ہے! اُس کا پیامِ الفت و خلوت، محبوب چین کو یہ ہے کہ ع

اے کاش میں ہوں، تم ہو، اک گوشۂ سکوں ہو!

وہ دُولِ یورپ و امریکہ کو اپنی اور اپنی مدخولہ "چین" کی خلوتِ صحیحہ کے حرم کی پاسبانی کی زحمت دینا نہیں چاہتا، وہ جانبینِ عشق کے مابین کچھ ایسے محرمانہ تعلقات کا طالب ہے کہ ؎

میانِ عاشق و معشوق رازیست
"کراماً کاتبیں" را ہم خبر نیست!

اِس میں کیا شک ہے کہ "شیر و حلوان" کے درمیان سے اگر سارے حجاب و حصار اُٹھ جائیں تو "درید و بُرید و شکست و بہ بست" کے سارے مراتب بہت جلد طے ہوجاسکتے ہیں! اور اِس بنا پر مُدبّرینِ جاپان کی اِس "صلاح کی بات" کی داد دینی ہی پڑے گی کہ "بلاواسطہ گفتگو" کا طریقہ اِس قضیئے کے تصفیئے میں نہایت قاطع و ناتج رہے گا! لاریب کہ "قاضیِ شمشیر" سے بڑھکر کس کا فیصلہ ناطق و خاتم ہوسکتا ہے؟!

لیکن ہم دُولِ فرنگ کے نقطۂ نظر کی وکالت میں کہنا چاہتے ہیں کہ یہ بزرگ بھی اِس نزاع میں کم از کم "ترتیبِ مدعا علیہم" کی فہرست سے خارج نہیں ہیں! جو "مجرم چین" اِس وقت جاپانی امپیریلزم کے زندان میں "دائم الحبس" کئے جانے کے لئے کشاں کشاں لے جایا جا رہا ہے اُسے یہ دوسرے "قرضخواہان" راہ میں روک کر دامنگیر ہو رہے ہیں کہ "ہم لوگوں کی ڈگریوں کی ادائی اور ہمارے دخلی رہن ناموں کے انفکاک کی کیا سبیل ہوگی"! ——

دراصل اِس مواخذے میں روئے سخن بجائے چین کے جاپان ہی کی طرف ہے کہ "جاگیرِ چین" کے آئندہ قانونی وارث کی حیثیت سے وہ اِن دوسرے اربابِ "قبضۂ مخالفانہ" کے "حقوق ساقط الملکیت" کے بارے میں کچھ "حق حساب" کرنے کے لئے تیار ہے یا نہیں؟! —— لیکن یہ فرنگی "جنٹلمین" جو "سائلانہ" انداز پیش کر رہے ہیں اُس کی روشنی میں اُن کے سارے "حقوق و مراعات" کی "ضبطی" کا سنگین اندیشہ کیا جاسکتا ہے! چنانچہ "برُوسیلز کی تازہ "کانفرنسِ مشرقِ بعید" جو خیر سے "معاہدۂ دُولِ تسعہ" اور "مقدس میثاقِ مجلسِ اقوام" کے زیرِ سایہ منعقد ہوئی اُس میں جو "بعد ادائے آدابِ فدویانہ" اک عرضداشت نما "نوٹ" جاپان کی جنابِ عالی میں ارسال کیا گیا، اُس کی بسم اللہ ہی میں اپنی "تلخ نوائی" کی لمبی چوڑی معذرت کی گئی ہے! اور پھر چین وجاپان کے اِس سارے قضیۂ نامرضیہ

میں لازماً اک "پُر امن طریقِ کار" سے وابستۂ دامن رہنے کی تشفی کی گئی ہے! اللہ اللہ! ؎

اسدِ بسمل ہے کس انداز کا؟ قاتل سے کہتا ہے
تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر!

ایسے حالات میں جاپان کی زبانِ حال کا یہ "غیر ملفوظ" جواب کیا غلط ہے کہ ؎

نہ خنجر اُٹھیگا نہ تلوار تم سے
یہ بازو مرے آزمائے ہوئے ہیں!

تاہم سست رگ و عاری از عمل دُولِ مغرب پر یہ امر بھی واضح رہے کہ ؎

سرچشمہ باید گرفتن بہ میل
چو پُر شد نہ شاید گرفتن بہ پیل!

جاپان کی موجودہ چنگیزیانہ یلغار میں ان سارے دُولِ عظمیٰ کے "چینی منافع و مصالح" سوختہ ہو کر رہ جائیں گے! اور پھر اُس کے بعد بہت جلد فتحمند و حوصلہ مند جاپان کی قوت کی روز افزوں امواج کا تصادم سواحلِ آسٹریلیا و سرحداتِ ہند سے ہونے لگے گا! جو دُول آج چین کے مقتل میں "تماشائے رقصِ بسمل" دیکھ رہے ہیں وہ کل خود اِسی دیدنی عرصۂ دار و گیر میں دوسروں کو اپنی گلوگیری کا تماشا دکھانے والے ہیں! اگر حبش نہیں تو چین کی تخریب ضرور اَمنِ عالم کی تباہی ثابت ہوگی! ع

اے زنِ صحت بیخبر در ہر چہ باشی زود باش! (ا-ا-خ)

محشرِ فلسطین!

فلسطین کا معاملہ علانیہ اک "طوالت پذیر کشمکش" میں تبدیل ہو گیا ہے! یہ اُفتادِ حوادث عین اِس تاریخی سرزمینِ خون آشام کی روایات کے شایانِ شان ہے! فلسطین مشرق و مغرب کی "بین البرِّ اعظمی آویزش کا اکھاڑہ" رہا ہے! وہ "جنگہائے صلیبی" کی رزمگاہ ہے، جو صدیوں جاری رہی ہیں! پھر ماشاء اللہ انگلستان کو بھی اپنے "رچرڈ شیر دل" کے سپوت ہونے کی لاج ہے! لیکن پھر ناگزیر طور پر ارضِ مصر و قدس کو بھی اپنا "صلاح الدین" پیدا کرنا پڑے گا! مسجدِ اقصیٰ کے اندر اور باہر جو رستخیز بپا ہے اُس میں "قُمْ یَا عُمَرُ!" کی نوائیں صاف گوش زد ہو رہی ہیں! اور پھر انشاء اللہ مستقبل، ماضی ہی کا اعادہ ثابت ہوگا!

انگلستان نے فلسطینی گورنر و ڈکٹیٹر کو "آخری صلیبی فاتح" بننے کا پورا ارمان نکال لینے دو! قبل ازیں لارڈ اللنبائی آنجہانی کا یہی خود ساختہ خطاب باطل ہو چکا ہے! ہاں فلسطین کی ارضِ انبیاء و رسل پر تقسیم کے آرے چلنے دو! فلسطین کے عرب نوجوان بھی یہ عہد کر چکے ہیں کہ "وطنِ مقدس کی قطع و بُرید سے پہلے اُن کے اجسام کے دو دو ٹکڑے کرنے پڑیں گے"! ؎

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز
آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر! (ا-ا-خ)

مولینا فضل الحق کی پیغمبرانہ وعید

عالیجناب مستطاب حضرت فضل الحق، وزیر اعظم بنگال نے مسلم لیگ کے ماضیٔ قریب کے تاریخی اجلاسِ لکھنؤ کی تقریبِ سعید پر پیغمبرانہ لب و لہجہ میں یہ پیام براڈکاسٹ کیا کہ "کفر کے لئے کوئی ممکن مستقبل نہیں ہے اور اگر مسلمانانِ ہند (گویا میری طاغوتی بد آزموزیوں کے تحت) چند روز اور ہندو کانگریس اور اُس کے دور از کار کاروبار سے مجتنب رہیں تو سارے برِ اعظم ہند پر اسلام کا پرچم لہرانے لگے گا!" ——— مسٹر فضل الحق کو چونکہ بنگال کے چاول کے خطے میں "شکم سیر خشکہ" ملتا ہے، اس لئے اُنھیں حدودِ دار الوزارتِ بنگال کے باہر سارے ہندوستان میں "ہرا ہی ہرا" سوجھتا ہے! اب رہا برادرانِ وطن کی تقدیر کے بارے میں اُن کا "پیامِ بومِ شوم"، تو ہم اِس "فرنگی مولوی" کو کیسے بتائیں کہ مذہب کی ساری گزشتہ تاریخ میں مستقبل اگر نصیب ہوا ہے تو کُفر و اہلِ کُفر ہی کو! عرب کا "انقلابِ اسلام" کیا عین کفار و مشرکینِ عرب کی خاطر نہ ثابت ہو گیا؟! پھر شاید مسٹر فضل الحق کو کسی انگریزی تاریخ ہی کی تلاوت سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ اسی عرب میں اسی دینی تجدید کی تحریک نے "پشتینی کلید بردارانِ دین" ——— یہود و نصاریٰ ——— کی روحانی و مادی دونوں قسم کی قسمتوں پر صدیوں کے لئے مہر کر دی! ہم کس اُمید پر حضرت مجتہد العصر مولینا "فضل الحق" کے سامنے قرآن عظیم کی یہ آیۂ نادرہ تلاوت کریں کہ

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ!

(ا-ا-خ)

نقد و نظر

احد امرہ

(۱) انور ۔ ایک ناول، مجلد، ضخامت ۵۰۰ صفحات، کاغذ و کتابت و طباعت و عام گیٹ اَپ بہت عمدہ، مع متعدد تصاویرِ اشخاصِ ناول و مناظرِ قصہ و نقش برلوح، شائع کردہ انڈین پریس، الہ آباد، قیمت ؏

انور، فنِ افسانہ میں جناب فیاض علی صاحب کا نقشِ ثانی ہے! نقشِ اول "شمیم" تھا، جو ۱۰ سال اُدھر شائع ہوا تھا۔ اُردو ادب، نثر میں بمقابلہ نظم کے کم مایہ واقع ہوا ہے ۔۔۔۔ کم و کیف ہر دو اعتبار سے! زیرِ نظر ناول اسی حقیقت کی اک اور تلخ یاد دہانی ہے! سچ یہ ہے کہ بہت ہی کم اُردو ناول ایسے ہیں جن پر "ناول" کا لفظ شائستہ اطلاق کیا جا سکتا ہے! اُردو ناول کا جو ذخیرۂ ادب اِس وقت تک پیدا ہوا ہے اُس کی ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ وہ عموماً تخیل سے محروم ہے، پلاٹ کے ربط و ضبط سے بے نیاز ہے، کرداروں کی ترجمانی اور شخصیتوں کی تحلیلِ نفسی سے عاری ہے، اور حقائقِ زندگی اور مسائلِ مجلسی کے مَس سے بیگانہ! وہ مدت العمر کے بعض اساطیری آداب و مراسم سے پا بزنجیر ہے، اور معدودے چند ناگزیر نمونہائے طربیہ و حزنیہ کی فرسودگی سے زنگ آلود! ہم اپنی نام نہاد "ادبی نشاۃ ثانیہ" میں الف لیلہ اور داستان امیر حمزہ ہی کے گویا "تازہ ایڈیشن" نکالتے رہے ہیں! ہمارے دفاترِ ناول میں جدید العہد معاشرتی مسائل کے تذکرے، یا اِن مہمات کے حل کی تلاش مفقود ہوگی! ہم نے فیاض علی صاحب کی زیرِ ذکر قلمکاری میں اُمید دارانہ اِن عناصر و جواہر کی توقع کی، لیکن بدقسمتی سے ہماری آرزوئیں کم و بیش تشنہ رہیں! مصنفِ موصوف کے سابق مولودِ فکر و نگارش ۔۔۔۔ "شمیم" ۔۔۔۔ کی بعض ادبی خامیوں کا مکرر ظہور ہم "انور" میں بھی پاتے ہیں!

چنانچہ سارے کردار ماشاء اللہ "فرشتہ صفتی" کی عبا میں ملبوس پائے جاتے ہیں! ۔۔۔۔ اور کچھ اس شان سے کہ "قبائے حقیقت و معقولیت" پارہ پارہ ہوگئی ہے! ؎

گویند ایں کہ شیخ ملائک سرشت ہست
آرے، من اعتراف کنم "آدمی" نہ ایست!

حشو و زائد، مجلسی تنقید ۔۔۔۔ براہِ راست ہو یا ضمناً ۔۔۔۔ کا کامل فقدان، کسی تمدنی مسئلے کے حل کی جرات کی عدم موجودگی "انور" کی یاس انگیز خصوصیات ہیں! مصنف نے مقدمے میں، نیز اثنائے ناول میں ایک کردار کی زبان سے اس استحسان کو بیان کیا ہے کہ ناول کو زندگی کا ترجمان ہونا چاہیئے۔ لیکن پھر خود ہی اپنی اس بشارت کو تشنۂ ظہور رکھا! ہر کردار کچھ ایسا نظر آتا ہے کہ ؏

یا آدم نیست، یا دریں عالم نیست!

"دنیائے دنی" کے سارے مسائل و مشکلات اِن "برتر انسانوں" کے لئے بے معنی ہیں! "برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن" رکھنے والی لڑکیاں فلسفۂ عالیہ پر وہ وہ خطبات دیتی ہیں کہ ؏

خاموش ہیں ارسطو و فلاطوں مرے آگے!

حُسنِ کمسن کے یہ کیا کرشمے ہیں! ؎

نگارِ من کہ بمکتب نرفت و خط ننوشت
بغمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

اِن فوق الفطرۃ کرداروں میں عالمِ سفلی کا تنہا متنفس ممتاز نظر آتا ہے (ہیرو کا دوست) نیز اُس کی بیوی عذرا۔

تمام دوسرے کردار غیر جاذب توجہ واقع ہوئے ہیں، باوجودیکہ

کہ اُن میں سے ہر ایک کی ہستی و شخصیت، ذہانت و حکمت کا مجسمہ پائی جاتی ہے! سارے طویل و لا طائل پلاٹ سے اک لق و دق بیابان سا پیدا ہوگیا ہے، ہمارے زندہ دل مصنف نے قیس و فرہاد کے عہدِ زرین کے مذہبِ عشق کا اک حرم تعمیر کیا ہے! حوادث و اشخاص کی کثرت کا ہجوم قصے کی وحدتِ اثر کو فنا کر دیتا ہے!

تاہم مسٹر فیاض علی ہماری ضیافتِ طبع کے معاملے میں کامیاب رہے ہیں! وہ آبِ رواں کی طرح سلیس اُردو لکھتے ہیں۔ اُن کی تحریر جوش و جذبہ کی غماز ہے! اک خاص ہجوِ ملیح کا سر رشتہ بھی سارے طول و عرضِ ناول میں جاری و ساری پایا جاتا ہے! "آلزر" کی بہرحال اُردو کی رومانی ادبیات میں اک ناگزیر جگہ ہے! (ا-ا-خ)

---

(۲) جدید دستور کا خاکہ

عام رسالجاتی قامت، ضخامت ۱۴۳ صفحات، کتابت و طباعت بدرجۂ اوسط،

مؤلفہ (در انگریزی) جناب زین العابدین صاحب، پی ایچ، ڈی، (لندن)۔ مترجمۂ مولوی شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی۔

——"طبع ثانی" از رسالۂ جامعہ، نمبر ۴ سلسلۂ سیاسی و معاشی مسائل، شائع کردہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی قیمت ۲ر

ملنے کا پتہ۔ مکتبۂ جامعہ، قرول باغ، نئی دہلی،

"قانونِ ہند ۱۹۳۵ء" پر مصنفِ علام و نقادِ بالغ نگاہ کا یہ اک جامع نیز واضح تبصرہ ہے جسے مولوی شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی (جامعی) کی ترجمانی نے اردو پبلک کے لئے قابلِ رسائی بنا دیا ہے! اس رسوائے ہند قانون کے نظام، دستور العمل، مطالب و مقاصد، نیز منشائے مضمر کی سیر حاصل شرح و بسط کے بعد اُس کا لبِ لباب، صاحبِ مقالہ نے جیسا خاتمۂ سخن میں دیا ہے وہ اصل تالیف، اُس کے اُردو ترجمے، اور سارے مسئلۂ متعلقہ کے کامیاب مطالعہ و تفتیش کا بجائے خود بڑا اچھا ترجمان ہے! ہم اس حصے کو یہاں بجنسہٖ نقل کر دینے سے بہتر کوئی دوسرا طریقِ تنقید نہیں پاتے! چنانچہ ملاحظہ فرمائیے:

"مذکورۂ بالا تشریح سے یہ صاف ظاہر ہوگیا ہوگا کہ مجوزہ دستور اپنے جملہ تحفظات، خصوصی ذمہ داریوں، اور گورنرز و گورنر جنرل کے مزید اختیارات کی وجہ سے سامراجی جبر و تشدد کا اک نیا حربہ ہے! اور ہندوستان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کے لئے اک نئی تدبیر ہے! تمام اختیارات، خواہ وہ قانون سازی کے متعلق ہوں یا مالیات، عدالت، فوج اور پولیس کے، وہ سب سامراجی نظام کے اختیار میں ہیں! علاوہ ازیں رجعت پسند جاگیردار طبقے، یعنی زمینداروں اور دیسی ریاستوں کی قوت کو منظم و مستحکم کیا جائے گا، تاکہ اُن کا رشتۂ اتحاد سامراج کے ساتھ جوڑا جائے

"جدید دستور کے آغاز سے ملک کی آزادی کے لئے قومی جد و جہد کا اک نیا دور شروع ہوگا! برطانوی سامراج چونکہ قومی تحریک کو دبانے میں کامیاب نہیں ہوا ہے، اس لئے وہ اپنی گرفت کو اس ملک کے مستقل حقوق رکھنے والوں کی کھلم کھلا امداد سے اور زیادہ مضبوط کریگا! اس سے بہت سے مسائل صاف اور واضح ہوجائیں گے:- ایک طرف تو سامراج اور جاگیردار طبقہ ہوگا، جو یہ طے کر چکا ہے کہ باشندگانِ ہند کی ہر اُس خواہش اور کوشش کو ناکام بنا یا جائے جو معاشی اور سیاسی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لئے کی جائے —— اور دوسری طرف وہ تمام عناصر ہیں جو فاقہ مست ہیں اور جنھیں خوب لوٹا گیا ہے! یعنی کسان، مزدور، اور متوسط طبقے، جو موجودہ سامراجی نظام سے نجات حاصل کرنے کی کوشش اور جد و جہد کر رہے ہیں۔

"سامراجی اور جاگیرداری اتحاد کو موثر طریقے پر شکست دی جاسکتی ہے، اگر سامراج کی مخالف تمام قوتیں کانگرس کے اندر مجتمع اور متحد ہوجائیں! اس لئے اُن تمام لوگوں کو جو سامراج کا شکار ہوئے ہیں اپنے (باہمی) اختلافات کو دور کر دینا چاہیئے، تاکہ اس جدید مطلق العنانی کا مقابلہ کیا جائے! جس کی ابتدا نئے دستور سے ہونے والی ہے! قومی آزادی کی تحریک کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ عوام کی سیاسی اور معاشی تکالیف کو رفع کیا جائے، اور یہی جد و جہد اُس کی تمام تر قوت کا سرچشمہ ہونا چاہئے اس طرح اُس کی قوت میں اضافہ ہوگا اور مقاصد میں صفائی پیدا ہوگی!

"انتخاب کے معرکے میں اک اچھا موقع ملتا ہے کہ عام باشندگان میں سامراج کے خلاف احساس پیدا کیا جائے! اور قومی مطالبات کو عام طور پر پھیلا یا جائے۔ مجالسِ قانون ساز کے اندر دستور کی سامراجی نوعیت کا بھانڈا اس طرح پھوڑا جا سکتا ہے کہ کسانوں کے مطالبات،

مزدوروں کے مطالبات اور غریب متوسط طبقے کے مطالبات ۔۔۔۔ غرض عام باشندگان کے مطالبات کو زور دے کر پیش کیا جائے۔ لیکن اس رُجحان کو بہرحال روکنا چاہیئے کہ انتخابات اور پارلیمنٹری پروگرام ہی کو اصل مقصد سمجھ لیا جائے۔ انھیں تو اک بڑی لڑائی کا صرف اک حصہ سمجھنا چاہیئے! اسے جدید دستور کے خلاف زیادہ سے زیادہ شدید اضطراب اور بےچینی پیدا کرنے کا اک ذریعہ بنانا چاہیئے۔ اِس کے علاوہ صاف طور پر یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ حقیقی جد و جہد مجالسِ قانون ساز کے باہر ہوگی، اور مجالس کے اندر مخالفت کا موثر ہونا بالکل اُس مخالفت پر موقوف ہے جو باہر عام باشندگان کی طرف سے ہوگی! چنانچہ (یہ) باہر کی قوت اتنی بڑھنا چاہیئے کہ لاکھوں نہیں، کروڑوں انسانوں تک وہ پہنچ جائے، اور اُن میں سامراج اور اُس کے استادیوں کی مخالفت کے لئے اک تحریک پیدا ہو جائے!

"باشندگانِ ہند کی طرف سے سامراجی دستور کا جو بدل تجویز کیا گیا ہے وہ نمائندہ اسمبلی کا مُطالبہ ہے! اِس مطالبے پر سامراج کی مخالف جملہ قوتوں کو مجتمع ہو جانا چاہیئے، اور اسی کو قومی تحریک کا نعرہ بنانا چاہیئے! یہ بہرحال اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ مجلسِ آئین ساز صرف باشندگانِ ہند کی اپنی قوت سے پیدا ہو سکتی ہے! اور سامراجی اثرات سے اُس کو پاک اور آزاد ہو جانا چاہیئے، چونکہ اُس کے انتخاب میں ہر عاقل و بالغ کو عام طور پر حقِ رائے حاصل ہوگا۔ اس لئے یہی نہیں کہ مجموعی حیثیت سے باشندگانِ ہند کی خواہشِ آزادی کا اظہار ہوگا، بلکہ اُن کی فرمانروائی کے قیام کی طرف اک قدم اُٹھایا جائے گا!"

اِس دل نشین تفہیم و تلقین پر کونسی مزید روشنی ڈالی جا سکتی ہے؟ ع

تصنیف را مصنف نیکو کند بیاں

~~~~~~~~~~ (ا۔ا۔خ)

(۳) **دُنیا کے بچے** (مولفہ محمد حسین حسّان صاحب، ایڈیٹر پیامِ تعلیم) "ننھی مرغابی"، "لال مرغی" (از عبدالواحد صاحب سندھی، اُستادِ جامعہ) "چھوٹا چُو" (حسّان صاحب) "چھچھُو" (از رقیہ ریحانہ وغیرہم!)

جامعۂ ملیہ کے شعبۂ تصنیف و تالیف کی موسومۂ بالا تمام بچکانہ کتابوں پر ہم شاید یکجائی ریویو کر سکتے ہیں، اس لئے کہ اُن کی عام حیثیت و نوعیت، قامت و ضخامت، صورت و ہیئت، زبان و بیان، اور مقصد و غایت اُصولاً یکساں واقع ہوئے ہیں! سب کے صفحات کا اوسط ۳۲، ۴۰ ہے، ٹائٹل پیج مصور و تخیل پرور ہے، اور قیمت ۳ر سے لے کر ۴ر (اول الذکر جلد ۱۲ر کی ہے!)

نمبر (۱) دنیا کے مختلف ملکوں کے بچوں، اُن کے قومی ناموں، اُن کی پوششوں اور وضعوں، اُن کے جداگانہ شغلوں اور دلچسپیوں، اور عام زندگی و معاشرت پر اک حقیقتہً دلچسپ، معلومات افروز، اور نہایت مفید کتاب ہے، ہم اسے اپنے جرح و قدح سے مستثنیٰ کرنے پر مجبور ہیں، اور سوائے داد و تعریف کے ہمارے پاس اُس کے لئے کچھ نہیں! ۔۔۔۔ بجز اِس ضمنی ریمارک کے کہ کتابچۂ زیرِ ذکر، اِسی موضوع پر غالباً انگریزی کی کسی کتاب یا سلسلۂ کتب کا آزاد ترجمہ یا ملخص ہے، اور اِس لئے مطالب کی نوعیت، دلچسپی، اور ترتیبِ بیان کی ساری خوبی کے لئے اصل مصنف یا سیاح ہی عموماً مستحقِ شکریہ ہے! تاہم حسین حسّان صاحب کی اتنی خدمت بھی (بشرطیکہ وہ اتنی ہی ہو!) قابلِ مرحبا ہے کہ اُن کی نظرِ انتخاب اک ایسے اچھے سرچشمۂ ادبیات پر پڑی، اور زبانِ اردو کو اِس معصوم گُلدستے سے گل بدامن کیا!

باقی کتابوں کا ہم بادب خُردہ گیرانہ جائزہ لینا چاہتے ہیں: یہ سب "کتبیاں" آسان روزمرہ زبان میں لکھی گئی ہیں، اور کم از کم شمالی ہند کے اُردو داں بچوں کے علم و فہم کی رسائی کے اندر واقع ہوئی ہیں، لیکن ہمارا خیال ہے کہ صرف سہل گھریلو بولی بچوں سے خطاب کے مقتضیات میں اگرچہ اولین چیز ہے، لیکن اہم ترین چیز نہیں! زبان کا اِشکال بلاشبہ بچے کے لئے اک پردہ ہے، لیکن اسی پر سارے حجابات اور مشکلات ختم نہیں ہو جاتے، ہمارے دوستوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ مشکل کی اک قسم "سہلِ ممتنع" بھی کہلاتی ہے! بچے کے لئے بعض نفسیاتی اُلجھنیں "بھی" ہوتی ہیں! جن کی ماہیت نہایت پیچیدہ اور پوشیدہ اور بغایت عمیق و دقیق واقع ہوئی ہے! "نفسیاتِ اطفال" میں بڑی زیرکانہ بالغ نظری ہی اک "مصنفِ بچگان" کو اُس کا محرمِ راز بنا سکتی ہے! صرف آسان زبان اور پدرانہ لہجۂ خطاب و بیان اِس ہفتخواں کا قدمِ اول بھی نہیں اُٹھوا سکتے!

هزار نکتۂ باریک‌تر ز مو اینجاست!
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند!

سارے برِّ اعظم یورپ میں بین البرِّ اعظمی سندِ کامل العیاری رکھنے والے "بچوں کے داستان گو" شاید دو سے زیادہ نہیں! ۔۔۔۔ بندر رسکن
~~~~~~~~~~

اور گرم! جامعۂ ملیہ کے شعبۂ تصنیف و تالیف کی بلاشبہ یہ قابلِ رشک کثیر الاولادی ہے کہ اُن کے ہاں بچوں کے مصنفوں کا گویا اک "دریا" کھل گیا ہے! جس میں سے "ننھی مرغابی" اور "ننھی مرغی" اور "مرغی اجمیر علی" اور نہ معلوم اور کیا کیا "مجبولیں" چوں چوں کرتی نکل پڑی ہیں! —— سچ ہے "آسان پسندوں" کے لئے کوئی چیز "مشکل" نہیں! مولینا اسمٰعیل میرٹھی مرحوم (جامعہ کی لغت میں "بچوں کے اسمٰعیل") غالباً اپنی بہشتی آرامگاہ میں مضطرب ہو کر یہ وِرد کر رہے ہوں گے کہ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی!

لطف یہ ہے کہ ان مصنفین میں بعض "کمسن بچیاں" تک واقع ہوئی ہیں —— اگرچہ بچوں کی کتابیں لکھنے کا اہل ہر کہنہ مشق و تجربہ سال مصنف بھی نہیں ہوتا! ع

تو و قطعِ مناز لہا من و یک لغزشِ پائے!

اقبال نے گوئٹے کے مقابل آکر اس کے "مغربی دیوان" کا جواب "پیامِ مشرق" سے دیا، لیکن ہینس اینڈرسین اور گرم کی کلہم دو یورپی صداؤں کی "صدا ہائے بازگشت" تنہا ایک مشرقی نقطے —— جامعہ —— سے اتنی کثیر تعداد میں اُٹھی ہیں کہ انھیں "ریکارڈ" کرنا مشکل ہے! ع

خدا کی دین کا "موسیٰ" سے پوچھیے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں "پیمبری" مل جائے!

ہم اربابِ جامعہ کی ہمت شکنی کرنا نہیں چاہتے: انھیں "بچوں کا ادب" شوق سے تیار کرنا چاہیئے۔ لیکن اس منصبِ ممتاز کی اہم و نازک ذمہ داریوں کو کماحقہ مرعی رکھکر! اس لئے کہ ع

ہر "مدعی" کے واسطے دار و رسن کہاں؟

(ا۔ا۔خ)

(۴۴) "شاعر کے سو شعر" } مکتبۂ جامعۂ ملیہ دہلی کے جاری کردہ سلسلے کی قبیل پر، اور کم و بیش اسی کی قامت و ضخامت و صورت و ہئیت پر، جناب "افسر الشعراء" آغا شاعر قزلباش دہلوی کے کلام کا یہ ایک "صد بیتی" انتخاب ہے، جو اُن کے فرزندِ ارجمند جناب مسرور آغا کے اہتمام سے شائع ہوا ہے۔

حضرتِ آغا شاعر ہمارے عہد کے "میر جگر سوختہ" ہیں! پھر اُردو زبان و محاورہ پر انھیں جو مالکانہ قدرت حاصل ہے اُس کی بنا پر وہ میر ہی کے "مسلّمہ چیلنج" کے لب و لہجہ میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ؎

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر
یہ ہماری زبان ہے پیارے!

"افسر الشعراء" کی ادبی ٹکسال کے اک سکّے کی کامل العیاری ملاحظہ فرمائیے!؎

خالِ سیہ ہے کعبۂ ابرو میں جلوہ گر
"کافر" کہاں سے "حفظِ الٰہی" میں آگیا!

آغا شاعر اپنی موجودہ "خاکسترِ پیری" کی پُشت پر اک "طوفانی شبابِ عشق و رومان" رکھتے ہیں۔ اُن کے قال میں اُن کے اِس حال کی صدائے بازگشت اک ناگزیر چیز ہے! پھر صرف "۱۰۰ اشعر" کے عطر میں اِس سارے "آتشِ گل سے دہکے ہوئے چمنستان" کی "روح الروح" ہی مُقطر ہو گئی ہے!

انتخاب پر "شاعرِ انقلاب" حضرت جوش ملیح آبادی کا مقدمہ بجائے خود تعارف و انتقاد کا ایک شہپارہ ہے! اک "میر" کو اک "سودا" پیش کرے، اِس حسنِ اتفاق کی ندرتیں اور کیفیتیں دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ بہرحال آغا کے "سوزِ شعر" اور جوش کے "سازِ نثر" ہر دو آہنگوں کو اس ایک ہی "ارغنون" میں سنئے!

ملنے کا پتا، نگارستان ایجنسی، کشمیری دروازہ، دہلی۔ (ا۔ا۔خ)

ایک ضروری تصحیح

ہمیں افسوس ہے کہ "کلیم" کے کسی نمبر میں ایک افسانہ مولانا قطب الدین عبدالوالی صاحب فرنگی محلی کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔ حالانکہ وہ حکیم عبدالوالی صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ قارئین کرام تصحیح فرمالیں۔

ضروری اطلاع

کلیم پہلی تاریخ کو شائع ہو جاتا ہے لہٰذا کلیم نہ پہونچنے کی اطلاع ایک ہفتہ کے اندر اندر کر دینی چاہیئے ورنہ بعد میعاد تعمیل نہیں کی جائے گی: مینیجر

شاعر کی راتیں

شاعرِ انقلاب نے چند راتوں کی مختلف کیفیتوں کو اپنے خاص وجد آفرین اور مس محرس کیف آور انداز میں بیان کیا ہے جنھیں پڑھکر ہر شخص اپنے آپ کو اسی ماحول میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ راتوں کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

مست رات ۔ بدمست رات ۔ راز و نیاز کی رات ۔ انتظار کی رات
اندھیری رات ۔ چاندنی رات ۔ جوانی کی رات ۔ تصورات کی رات
التفات کی رات ۔ جدائی کی رات ۔ اشکوں کی رات ۔ برسات کی رات
ریلوے گاڑی کی رات ۔ بیخودی کی رات ۔ سرشار رات ۔ بھیگی ہوئی رات
تصورات کی رات ۔ بےچین رات ۔ بیابان ناگن کالی رات

قیمت صرف آٹھ آنے

کلیم بک ڈپو، چنیتی لواس نمبر ۴۔ دریا گنج، دہلی

پیغمبرِ اسلام

خواجۂ دوجہاں سرورِ کائنات آنحضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اور رسالت پر شاعرِ انقلاب جوش ملیح آبادی کا وہ غیر فانی شہ پارہ جس کی رفعت و عظمت کے سامنے قصرِ کفر سرنگوں ہوتا ہے۔ ثبوت پیغمبری کے باب میں اس لافانی شاہکار کے انوکھے استدلال دل میں تیر کی طرح اُترتے چلے جاتے ہیں اس کے ازلی الہامات سے دماغ میں یزدانی نور سرایت کر جاتا ہے۔ اس کے دلائل قاطع کے سامنے ادراک منطق ہمہ دانی بھول جاتا ہے ـــــ شاعرِ انقلاب پر جب ایک سرشاریت کا عالم طاری ہوا اسی وقت اُنھوں نے یہ نظم کہنا شروع کر دی، عالمِ بیخودی میں چار روز کی ریاضتِ شاقہ اور یکسوئی قلب سے جو کچھ حاصل ہوا صرف وہی صفحۂ قرطاس پر تحریر کیا گیا۔ جب تک یہ نظم مکمل نہ ہوئی حضرتِ جوش نے نہ کچھ کھایا نہ پیا اور نہ خلوت سے باہر تشریف لائے قیمت صرف ۸ر

کلیم بک ڈپو، چنیتی لواس نمبر ۴۔ دریا گنج۔ دہلی

شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

کی

چار پرانی تصانیف

حضرتِ جوش نے ایک مدت ہوئی چار چھوٹے چھوٹے رسائل طبع کرائے تھے، لیکن اُن کی شاعرانہ بے نیازی نے اس کی اجازت نہ دی کہ اُنھیں شائع کرتے اتفاق سے یہ چیزیں میری نظر سے گزریں تو مناسب معلوم ہوا کہ اُن کی قیمت غیر معمولی طور پر کم کر کے اُنھیں شائقین کے ہاتھوں تک پہنچا دیا جائے۔

(۱) **جذباتِ فطرت** حضرتِ جوش کی وہ معرکہ آرا نظم ہے جس میں مظاہر قدرت کی طرف سے شعرائے اردو کی خدمت میں یہ اپیل کی گئی ہے کہ وہ پرانی روش کو ترک کر دیں۔ قیمت ۴ر رعایتی ار

(۲) **اوراقِ سحر** یہ حضرتِ جوش کے اُن لطیف چھوٹے چھوٹے جملوں کا مجموعہ ہے جس میں سحر خیزی کے محاسن بہت لطیف پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں قیمت ۵ر رعایتی ۲ر

(۳) **آوازۂ حق** یعنی معرکۂ تسلیم و رضا کے سب سے زبردست اور عدیم المثال ہیرو اور جنگِ حق و باطل کے سب سے بڑے سادنت حسینؑ ابن علیؑ کے خونِ ناحق اور صبر و استقلال کا ایک عظیم الشان مرقع اور آپ کی اخلاقی اور روحانی تعلیم کا ایک نہایت درخشاں آئینہ ہے۔ قیمت ۸ر رعایتی ۳ر

(۴) **مقالاتِ زرین** یہ حضرتِ جوش کے نادر کلمات فلسفیانہ اقوال اور ادبی لطائف کا دلچسپ اور کار آمد مجموعہ ہے، قیمت ۱۱ر رعایتی ۴ر

پورے سٹ کی رعایتی قیمت ۱۰ر محصول ڈاک ۳ر وی۔ پی منگانے کی زحمت نہ فرمائیں۔ بلکہ ڈاک کے ٹکٹ بھیج کر طلب کریں۔

ملنے کا پتہ

کلیم بک ڈپو، چنیتی لواس نمبر ۴ دریا گنج، دہلی

اس کو ضرور پڑھیئے

خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر ضرور لکھئے، اور جواب طلب امور کے لئے ایک آنہ کے ٹکٹ ارسال فرمائیے۔ پرچہ نہ ملنے کی اطلاع ہر مہینے کی دس تاریخ تک آجانی چاہیئے۔ ورنہ پرچہ قیمتاً ارسال ہوگا۔ نمونہ کے لئے ساڑھے نو آنے کے ٹکٹ ارسال فرمائیے۔

منیجر کلیم دہلی

مستند اور مجرب ادویات

ہندوستانی دواخانہ دہلی سے طلب کیجیے، جسے ملک و قوم کے شیدائی طبی دنیا کے شہنشاہ حضرت مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب مرحوم نے ۱۹۰۳ء میں قائم کیا تھا، اور جو آپ کے خلف الرشید عالی جناب مسیح الملک حکیم محمد جمیل خاں صاحب کی سرپرستی میں بدستور جاری ہے۔

ہندوستانی دواخانہ دہلی نے اپنے پینتیس سالہ دورِ زندگی میں ملک میں بہترین مجرب دوائیں پیش کر کے جو عزت و وقار حاصل کیا ہے، اس کے لحاظ سے یہ دیسی دواؤں کا لاجواب کارخانہ ہے، علاوہ ازیں اس دواخانہ کا ایک خاص امتیاز یہ بھی ہے کہ اس سے کسی کا ذاتی مفاد وابستہ نہیں ہے، بلکہ یہ ملک و قوم کی ملکیت ہے، اس کا منافع جو تقریباً دو لاکھ روپیہ سالانہ ہے مردانہ و زنانہ طبیہ کالج اور اس کے متعلقہ شفاخانوں پر خرچ ہوتا ہے۔

ہندوستانی دواخانہ دہلی کی ہزارہا مستند و مجرب دواؤں میں سے مندرجۂ ذیل چار دوائیں بطور نمونہ پیش کی جاتی ہیں ان کو طلب کر کے فائدہ حاصل کیجیے۔

جمیلان

جریان اور رقت و سرعت کی لاجواب دوا ہے۔ مادۂ تولید کی اصلاح کرتی ہے اور قدرتی امساک پیدا کرتی ہے

ترکیب استعمال۔ دو قرص صبح کو نہار منہ دودھ کے ساتھ کھائیں، تیل ترشی اور گرم چیزوں سے پرہیز رکھیں، قیمت فی شیشی ۳۲ قرص چار روپے آٹھ آنے

قرص مفاصل

گٹھیا (جوڑوں کا درد) عرق النساء (ٹانگ کا درد) کے لئے نہایت مفید ہے، یہ بیماریاں خواہ کیسی ہی پرانی ہوں اس دوا کے ۲۱ روز کے استعمال سے بالکل دور ہو جاتی ہیں، **ترکیب استعمال** ایک قرص رات کو سوتے وقت نیم گرم پانی سے کھائیں، تیل ترشی اور ٹھنڈی چیزوں سے پرہیز فی شیشی ۲۱ قرص ے

قرص جسد

غذا کو ہضم کرتے ہیں، بھوک لگاتے ہیں ریاح کو خارج کرتے اور نفخ اور قراقر کو زائل کرتے ہیں۔

ترکیب استعمال۔ ایک قرص دونوں وقت بعد غذا کھائیں۔ قابض بادی اور نفاخ چیزوں سے پرہیز، قیمت ۱۰۰ قرص ایک روپیہ دو آنہ

قرص بواسیر

بادی بواسیر کے لئے نہایت مفید دوا ہے اس کے چند روزہ استعمال سے یہ مرض بالکل دور ہو جاتا ہے۔

ترکیب استعمال اس کے دو دو قرص صبح و شام پانی سے کھائیں، قابض، بادی، اور نفاخ چیزوں سے پرہیز، قیمت ۶۴ قرص دو روپیہ

تار کا پتہ: ہمیڈی سنز دہلی　　**منیجر ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس نمبر ۲۲ دہلی**　　ٹیلیفون نمبر ۵۵۶۶